سری گورو گوبند سنگھ صاحب

معزز ناظرین کو سال ۱۹۳۱ء اور اپنے رسالہ رہنمائے تعلیم کی جوبلی مبارک ہو!

ناظرین باتمکین!

خدائے پاک کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں جس نے اپنی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ سے اس ذرۂ بےمقدار اور ناچیز کو یہ شرف بخشا - کہ اس نے اپنے خیال کے موافق جس رسالہ کی بنیاد رکھی تھی - اسے نہ صرف اپنے مقاصد میں کامیابی عطا فرما کر ناظرینِ کرام کا منظورِ نظر بنایا - بلکہ آج اِسے اپنی جوبلی منانے کا زرّیں موقعہ عطا فرما کر ہمچشموں اور ہم عصروں میں ممتاز فرمایا - رسالہ کے اجرا پر یہ شان و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا - کہ وُہ پروان چڑھکر ایک دن ایسا رنگ لائیگا - کہ ادبی اور تعلیمی دُنیا اسکی کامیابی کو سراہیگی - اور اسکی ذات احباب کیلئے مایۂ ناز ہوگی - اُسکی شانِ رحیمی کے صدقے میں آج اس قابل ہوا ہوں - کہ کسی اُستاد کے اس شعر کو اپنا ترجمان کر سکوں ؎

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم
حاصلِ عمر نثارِ پئے یارے کردم

مجھے رسالہ کی پچیس سالہ زندگی میں اسکی خدمتگذاری کیلئے جس صبر و استقلال سے کام لینا پڑا ہے وہ ایک طویل داستان ہے - صرف یہی کہنا کافی ہوگا - کہ ڈاک کے جواب اور تعمیل کے ساتھ مینجر کے کلّہم فرائض کا بار مجھے ہی اٹھانا پڑا - اور بلا امدادِ احدے دفتر کی تمام ضروریات اور احباب کی فرمائشات بہم پہنچاتا رہا - شاید یہ اسی خدمتگذاری اور نفس کُشی کا نتیجہ ہو - کہ خدائے پاک نے اپنی عنایاتِ بے غایات سے مجھے یہ سنہری موقعہ عطا فرمایا اور میرے لگائے ہوئے پودے

کو بارور فرمایا۔

حضرات! جوبلی نمبر کا اعلان اکتوبر ۱۹۲۹ء میں کیا گیا۔ اور باوجود کافی تگ و دَو سال ۱۹۳۰ء کی پہلی سہ ماہی تک یہ تشویش بلائے جان رہی۔ کہ اعلان کے موافق جوبلی کی شان کے شایاں سامان کیونکر مہیا ہو سکیگا ؟ رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ کہیں جگ ہنسائی نہ ہو۔ مگر احباب کی عنایات اور رسالہ کے سرپرستوں اور بہی خواہوں کی توجہات میرے آڑے آئیں۔ جنہوں نے مجھے یہ عزت بخشی۔ کہ اتنا ضخیم رسالہ نذرِ ناظرین کرتے ہوئے بھی کئی کرمفرما تقاضا کر رہے ہیں کہ " ہمارا کوئی مضمون جوبلی نمبر میں کیوں نہیں دیا "

چونکہ جوبلی نمبر کیلئے یہی مناسب سمجھا گیا تھا۔ کہ اسکے تمام مضمون مکمل۔ جامع اور" باقی آئندہ" کے اثر سے مُبرا اور پاک ہوں۔ اسلئے ہر شعبہ کے کئی مضامین بامرِ مجبوری نہ دیئے جا سکے۔ اور قابل مضامین نگار اصحاب سے مجھے شرمساری نصیب ہوئی۔ اور بعض حالات میں راقم معذور بھی تھا۔ کہ کئی مضمون وقت پر نہ آئے۔ بلکہ بہت دیر سے موصول ہوئے۔ بااین ہمہ ارکانِ ادارہ اور میرے اکثر کرمفرما اس امر پر مُصر ہیں۔ کہ اتنا ضخیم اور قابل قدر پرچہ اس قدر اخراجاتِ کثیر کا متحمل ہو کر مُفت اور ایک ہی دفعہ بہم پہنچانا جہاں تجارتی اصولوں کے منافی ہے۔ وہاں رسالہ اور اس کے پروپرائٹر کی فضول خرچی پر دال ہے۔ اگرچہ وہ درستی پر ہیں۔ مگر میری حمیت گوارا نہیں کرتی کہ اعلان کر کے ہمت کہ قدم آگے بڑھانے کی بجائے پیچھے ہٹایا جائے۔ رسالہ اپنے مستقل خریداروں کی خدمت میں بدستور سالانہ پرچوں کی ذیل میں ہی حاضر کرتا ہوں۔ ممکن ہے یہ شعر اس کے حال پر صادق آسکے ؎

سُرمۂ مُفت نذر ہوں، میری قیمت یہ ہے کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

البتہ اس میں صرف ایک ایزادی کی ہے۔ کہ رسالہ محفوظ پہنچانے اور اپنا ہاتھ بٹانے کی

غرض سے وی۔پی ارسال کرتا ہوں۔ تاکہ پنجابی مثل "جنے جنے کی لاکڑی ایک جنے کا بوجھ" کے مطابق مجھے مالی اخراجات سے گونہ سہولت ہو جائے۔ اور آپ کو رسالہ بلاخدشہ پہنچ جائے

اکثر اصحاب کا سالِ خریداری جنوری کے علاوہ دیگر مہینوں سے شروع ہوتا ہوگا۔ ان کی طمانیت کیلئے یہی کہنا کافی ہوگا۔ کہ سال ۱۹۳۲ء کا رسالہ بدستور ان کے اپنے مہینے میں وی۔پی کیا جائیگا گویا وُہ اس عرصہ تک رسالہ کے خریدار متصوّر ہونگے اور رسالہ ان کی خدمتیں برابر پہنچتا رہے گا۔

رسالہ کی ضخامت کو مدِنظر رکھ کر اب میں اختصار سے کام لیتا ہوں۔ اور اپنے اُن مربّیوں کا جنہوں نے مجھے نہائت قیمتی مضمون عطا فرمائے۔ اور رسالہ کے تمام ہمعصروں کا، جو بلی نمبر کے اعلان کی اشاعت کے علاوہ معاصرانہ امداد اور مضامین کی عطائگی کیلئے نہایت صدق دل سے شکریہ بجا لاتا ہوں۔ اور اپنے اُن کرمفرماؤں سے جن کے مضامین جوبلی نمبر میں بامرمجبوری نہ دیئے جاسکے۔ معافی کا خواستگار ہوں۔ اُن کی طمانیت کیلئے یہ ضرور کہونگا۔ کہ اُن کے مضامین شائع شدہ تمام مضامین کی طرح نہایت قابلِ قدر اور سر آنکھوں پر لینے کے قابل تھے۔ مگر عدم گنجائش اور رسالہ کی بے حد طوالت مانع آئی۔ انشاء اللہ عنقریب دیگر نمبروں میں نہائت ممتاز جگہوں پر ان کی اشاعت سے سرخرو ہونگا۔

جوبلی نمبر کا ملاحظہ اس امر کا ثبوت ہوگا۔ کہ اسکی تکمیل پر کس قدر زرِکثیر صرف ہؤا ہے احباب کی دریادِلی اور عنایت سے توقع ہے کہ وُہ اسکی مالی حالت کو محفوظ رکھنے اور مجھے کسی کا دستِ نگر ہونے کی عار سے بچانے کیلئے جہاں اسکے وی۔پی وصول فرمائیں گے۔ وہاں اپنے حلقۂ احباب سے کم ازکم ایک ایک خریدار بہم پہنچا کر مجھے بدام ممنون فرمائیں گے۔ اور اپنے رسالہ کی دلچسپیوں کو مزید بڑھائینگے۔ مختصر نوٹ اور کارروائیوں کے کالم بھی جوبلی نمبر کی اعتدال سے بہت متجاوز ضخامت کے باعث اس نمبر میں نہ دیئے جاسکے۔ کرمفرما معاف

رکھیں۔ ان کی کارروائیاں اگلے نمبر میں شائع کی جائینگی۔

میرا بیان ادھورا رہے گا۔ اگر میں اپنے معزز ہمراہیوں کی توجہات اور دلی امداد کا اعتراف نہ کروں۔ جوبلی نمبر ہرگز مکمل نہ ہوسکتا۔ اگر وہ اس قدر دلچسپی کا اظہار نہ فرماتے۔ ودیارتھی جی اتنی مسافت سے باوجود ناسازئ طبیعت محض جوبلی نمبر کی تکمیل اور دید کے شوق سے لاہور پہنچے حضرت جوش ملسیانی نے خانگی تکالیف اور علالت کے ہوتے ہوئے بھی جوبلی نمبر کو اس کی شان کے شایاں بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مسٹر سچدیوا بھی اپنے سب سے چھوٹے بچے کی طویل علالت اور تکلیف کے باوجود میری ہمراہی کا دم بھرتے رہے۔ اور ہر امر میں میرے دستِ راست بنے رہے۔ رسالہ کے سرپرست تاج الشعرا حضرت نوح کی عنایات جو رسالہ اور میرے حال پر مبذول ہیں۔ میرے لئے خضرِ راہ ثابت ہوئیں۔ اور جوبلی نمبر کی شان کو چار چاند لگانے کا موجب ہوئیں۔ خدائے پاک تمام اصحاب کو ہمت اور موقع عطا فرمائے کہ وہ اپنے رسالہ کو آئے دن بہتر سے بہترین صورت میں جلوہ گر کرتے رہیں۔

خادم

جگت سنگھ

مینیجنگ پروپرائٹر رسالہ رہنمائے تعلیم۔ رام گلی

لاہور

بیلانی لیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام مہتہ ایشر داس پرنٹر چھپا۔ اور ماسٹر جگت سنگھ پروپرائیٹر رسالہ رہنمائے تعلیم نے رام گلی لاہور سے شائع کیا

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست
آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

غالباً ملک بھر کے تعلیمی رسائل میں رہنمائے تعلیم کی خوش قسمتی قابل رشک ہے جسے پچیس سالہ نمایاں خدمات کی بجا آوری کا فخر حاصل ہے! اور وہ اس خدمتگذاری کی خوشی میں اپنی جوبلی منا رہا ہے۔ یوں تو ہر سال اس کا سالگرہ نمبر ایک قابل دید نمبر ہوا کرتا تھا مگر جوبلی نمبر کو جس پر بلا مبالغہ یہ مقولہ صادق آتا ہے" دھوم ہے گلشن آفاق میں اس نمبر کی" پیش کرتے ہوئے ہمیں دلی مسرت حاصل ہو رہی ہے۔ رسالہ ہذا نے جیسا کہ اس کے مختصر دورِ حیات میں عرض کیا گیا ہے جہاں اپنے ناظرین میں اخبار بینی اور مضمون نگاری کا مذاق پیدا کیا وہاں اپنے احساس خدمتگذاری سے اپنے مربیوں اور کرم فرماؤں کے دلوں میں گھر کیا جن کی عنایت اور پرورش کا بدیہی نتیجہ اس کے جوبلی نمبر کے نایاب اور بے بہا مضامین ہیں۔ جو سب کے سب اپنی اپنی جگہ پر بے نظیر اور نہایت قابل قدر و مفید ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ان کا بار بار کا مطالعہ ناظرین کرام کی دلچسپی اور دلبستگی کا موجب ہوگا! اور ہر سکول اور تعلیمی انسٹی ٹیوشن میں اس نمبر کی موجودگی بلا مبالغہ ایک تعلیمی انسائیکلو پیڈیا کا کام دیگی اور تعلیم یافتہ بزرگوار کی میز پر علمی خوان یغما کی موجودگی کا ثبوت ہوگی۔ اور اپنے لئے جذبۂ قدردانی پیدا کرنے کی قدرتاً کشش اور اپیل ہوگی اُسے اپنے ہمعصروں سے جو دستور کے موافق اپنے عظیم الشان سالگرہ نمبر شائع کیا کرتے ہیں اس وجہ سے خصوصیت حاصل ہے کہ وہ محض ایک شعبۂ علمی یا ادبی تک اپنی کوششیں محدود رکھتے ہیں برخلاف رہنمائے تعلیم کے جو مختلف شعبوں کا نہایت دلچسپ مجموعہ ہو کر بجائے خود کئی سالگرہ نمبروں کا مجموعہ ہو رہا ہے طوالت کو پسند نہ کرتے ہوئے ہم مختصراً اس کے مضامین کا ذکر خیر کرتے ہیں :-

تعلیمی شعبہ میں "بہشت کی تلاش" اس کے دلی کرمفرما خانصاحب راجہ فاضل محمد خاں صاحب ڈپٹی انسپکٹر مدارس جالندھر کے تجربات کا بہترین نچوڑ ہے راجہ صاحب ماشاء اللہ افسران معائین میں سے ایک مقتدر و مسلمہ قابلیت کے مالک ہیں اور آپ کا مضمون اساتذہ کرام کے لئے عموماً اور ہیڈ ماسٹر اصحاب کے لئے مخصوصاً مشعل ہدایت ہے۔ ہم آرزومند ہیں کہ تمام استاد اصحاب راجہ صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں جن کے لئے مدرسین کے پیر طریقت کا خطاب بجا طور پر موزوں ہے اپنے سکولوں کو حقیقی معنوں میں بہشت بنا کر زیر تربیت بچوں اور نوجوانوں کو قابل شہری بنا کر ملک اور قوم کا بیڑا پار کرنے میں مساعی مشکور کو کام فرمائیں اور ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہوں۔

لیڈیز ٹریننگ کالج میں جناب شیخ خادم محی الدین صاحب ایم۔ اے۔ ڈی نے اپنے چشم دید واقعات اور کالج کے طریقِ تعلیم کو نہایت واضح الفاظ میں سپردِ قلم کیا ہے کالج کے متعلق مختلف تصاویر مضمون کی خوبیوں میں مزید اضافہ کا موجب ہو رہی ہیں اور مہذب ممالک کے اساتذہ پیدا کرنے والی انسٹی ٹیوشن کی خصوصیتوں کی شاہد حال ہیں۔

تدریس اردو۔ صوبہ میں پنجابی زبان گھروں میں بولی جاتی ہے۔ اس لئے بعض حلقوں میں اردو زبان بھی غیر زبان ہو کر اساتذہ کی راہ میں مشکلات کا روڑا اٹکائے ہوئے ہے۔ رسالہ کے ادبی مشیر اور دلی عنایت فرما صوفی غلام مصطفیٰ صاحب نے اپنے اعلیٰ مضمون میں اردو زبان کے اساتذہ کی پورے طور پر رہنمائی کی ہے زیرِ تربیت اور اردو زبان سے مذاق رکھنے والے نوجوان بھی اس سے بہت حد تک مستفیض ہو سکتے ہیں۔

ہندوستان میں فارسی تعلیم اور اس کے طریقہ تعلیم میں پرشین ٹیچروں کے مایۂ ناز مولوی امام الدین صاحب منشی فاضل نے اپنے تجربات تعلیمی کو بمصداق "صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے" فارسی خوان دنیا اور فارسی تعلیم کے ذمہ وار مدرسین پر بابِ حکمت کھول دیا ہے۔ زبان فارسی کی اہمیت اور ضرورت کو نہایت برجستہ اور دلکش الفاظ میں ادا فرما کر اس کی وکالت کا حق نہایت عمدگی سے ادا کیا ہے۔

جناب لالہ موہن لعل صاحب بھلّہ نے **عملی ہندسہ** کے ایک سوال کی خامی کو واضح فرما کر جیومیٹری پڑھانے والے اساتذہ اور طلباء متعلقہ پر خاص احسان فرمایا ہے۔ سوال کی صحت کے دوران میں جن قواعد کی توضیح فرمائی ہے ان سے کئی دیگر مشکل سوالات کے حل کا طریق واضح کیا گیا ہے اور انہیں مزید احسان مند فرمایا ہے۔

مولانا محمد وحید صاحب کیلانی نے اپنے فاضلانہ مضمون میں فن تحریر کی ضرورت اور اہمیت کو نہایت خوبی سے واضح فرمایا ہے اور حق یہ ہے کہ اپنی قابلیت کا سکہ بہترین طور پر ناظرین کے دلوں پر بٹھایا ہے فن تحریر کی ابتدا اور اس میں مختلف تبدیلیوں کو بتدریج جس دلچسپ طریق پر آپ نے جلوہ گر فرمایا ہے بلا مبالغہ ایک بحرِ ذخّار کو کوزے میں بند کر دیا ہے آپ کی دلچسپی اور عنایت کے ہم خاص ممنون ہیں۔

لالہ رامچند صاحب ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس کی مدرس و طلبا سے "دو دو باتیں" زیرِ تربیت نوجوانوں کی زندگیوں کو سانچے میں ڈھالنے اور انہیں اپنے فرائض سے باخبر کرنے اور بہترین شہری بنانے کیلئے ناصح مشفق کا کام دینگی اور مدرسین کیلئے بلاشبہ خضرِ راہ ہونگی۔ کیا ہمارے نوجوان ان باتوں سے متاثر ہو کر ان پر عمل پیرا ہونا فرض موقت خیال کرینگے؟

حیدرآباد دکن اردو یونیورسٹی کے قیام اور اردو کی غور پرداخت کے دیگر ساز و سامان سے جو خدمت اردو زبان کی بجا لا رہا ہے محتاج بیان نہیں عثمانیہ یونیورسٹی کے مایۂ ناز فاضل پرنسپل صاحب نے جس فاضلانہ پیرائے میں وہاں کے تعلیمی مستقبل کو بیان فرمایا ہے اس امر کا بجا شاہد ہے۔ کہ حیدرآباد دکن اردو زبان کی شادابی میں ملک کے تمام صوبجات سے گوئے سبقت لیجائیگا۔ اور اسے پایۂ تکمیل پر پہنچانے میں ہمعصروں سے قابل رشک پوزیشن حاصل کریگا۔

ہمارا ذریعۂ تعلیم - مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم - اے - ایل - ایل - بی ایڈیٹر مکتبہ حیدرآباد دکن پرنسپل صاحب عثمانیہ یونیورسٹی کی طرح چوٹی کے ادیب ہیں جن پر سررشتۂ تعلیم دکن بجا ناز کر سکتا ہے آپ نے اپنے قابل قدر مضمون میں جو کام کی باتیں واضح فرمائی ہیں تعلیمی دنیا کی رہنمائی کا موجب ہیں حق یہ ہے کہ ذریعۂ تعلیم ہی تعلیم کی اہمیت اور عظمت سے زیر تربیت تلامذہ کو کامل طور پر بہرہ ور کر سکتا ہے غلط ذریعۂ تعلیم تو بدقسمتی سے اندھے کی طرح ادھر اُدھر ٹٹولتا ہے تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب اس مضمون کے ذریعہ حقیقت سے آگاہ ہو کر صحیح و غلط ذریعۂ تعلیم میں امتیاز کر کے راہ راست کے حصول کے لئے آواز بلند کریں تو بہتر ہوگا۔

قصر تعلیم کا سنگ بنیاد میں مولوی عبدالغنی صاحب نے جماعت کی تعلیم پر معقول رائے زنی ہی نہیں فرمائی بلکہ ذمہ دار مدرسین اور ہیڈ ماسٹر اصحاب کے لئے ایک شاہراہ مستقیم قائم کر دی ہے جس سے ہر دو اصحاب مفید مطلب نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔

ایک ضروری گذارش کے ذریعے سردار بکرم سنگھ صاحب ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس نے اساتذہ کی توجہ نہایت ضروری امور پر دلائی ہے جو سب کے سب اساتذہ کی فوری توجہ کے قابل ہیں سردار صاحب افسران معائین میں اعلیٰ پایہ اور عظمت کے مالک ہیں اور ہماری آرزو ہے کہ متعلقین آپ کی گذارش کے مفید نتائج سے جلد از جلد متمتع ہوں۔

پنجاب میں لڑکیوں کی تعلیم پر لالہ تلوک چند صاحب نے خوب زور قلم دکھایا ہے اور تعلیم نسواں کی موجودہ اور سابقہ حالت کا موازنہ سرکاری رپورٹوں سے کر کے اس کی ضرورت کو پبلک میں پیش کیا ہے کسی ملک کی حالت سدھر نہیں سکتی تاوقتیکہ صنف نازک کو بھی تعلیم سے بہرہ ور ہونے کا پورا موقعہ نہ دیا جائے۔ وہ صداقت ہے جس کے لئے کسی شہادت کی ضرورت نہیں اور حق یہ ہے کہ لالہ صاحب نے اپنے جامع مضمون میں تعلیم نسواں کے ہر پہلو پر کافی سے زیادہ توجہ دلائی ہے۔

ہماری تعلیم حضرت کھوسٹ کے قلم معجز رقم کی شرمندہ احسان ہے جن کے طرز تحریر سے آشنا خود بخود بھانپ لینگے

ع کون معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

آپ جس پیرائے میں درد دل کا اظہار کیا کرتے ہیں آپ ہی کا حصہ ہے چنانچہ موجودہ تعلیم کے حسن و قبیح پر آپ نے بلا مبالغہ دلکش طریق میں اصل حقیقت کو واضح فرمایا ہے اور کامل فن جراح کی طرح اس کے فضول مادوں کو طشت از بام کر کے مفید اور ضروری امور کے اجرا کی آرزو کی ہے۔

سید اشفاق حسین صاحب نے ہمارے امتحانات کا صحیح خاکہ پبلک کے پیش کیا ہے اگرچہ آزمائش کیلئے امتحانات کا وجود بے حد ضروری اور منفعت بخش ہے مگر موجودہ امتحانات سے جو مراد لی جا رہی ہے۔ اس کی حقیقت آپ کی تحریر سے صاف طور پر عیاں ہو رہی ہے اگر آپ کی رائے سے اتفاق کر کے امتحانات میں ضروری ترمیم و تنسیخ روا رکھی جائے تو بہت حد تک مناسب ہے۔

معلم اور متعلم کی ذیل میں جناب ذمی جگت سنگھ صاحب ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس نے متعلم کے خواص بالتفصیل بیان کر کے معلم کیلئے رستہ صاف کر دیا ہے کہ ان خواص کے طلباء سے کس طرح پر سلوک مرعی رکھے کہ وہ راہ راست پر رہ کر جادہ اعتدال سے سر مو انحراف نہ کر سکیں اور معلم کا طریق تعلیم ایسا موثر کہلائے کہ ہر کہ و مہ اس کا نادیدہ غلام اور اس کی خوبیوں کا معترف ہو جائے۔

تعلیم میں حسِ مذہبی کی پرداخت میں سید اصغر علی صاحب بی اے بی ٹی نے اپنے تجربات کی بنا پر مذہبی تعلیم کی ضرورت اہمیت اور فوائد پر اظہار خیال فرمایا ہے موجودہ تعلیم میں یہ نقص ضروری ہے کہ طلبا بہت حد تک اپنے آپ کو بھی نہیں جانتے مذہبی تعلیم اس پہلو میں ضروری شے ہے آپ کا فاضلانہ طرز بیان تعریف سے مستغنی ہے

جناب پنڈت مرلی دھر صاحب موگل ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس نے جو سکاؤٹنگ کی دنیا کے درخشندہ آفتاب ہیں اپنے مضمون "سکاوٹ کیا ہوتا ہے؟" میں اس مشہور عالم تحریک کے فوائد پورے طور پر بیان فرمائے ہیں اور بنی نوع انسان کی خدمت کی بجاآوری میں اپنی عظمت کے راز کو جلوہ گر دکھایا ہے صرف سکاوٹس اور سکاؤٹ ماسٹر اصحاب ہی اس سے بہرہ اندوز نہ ہوں بلکہ اساتذہ کرام تمام طلبا کو یہ مضمون سُنا کر انہیں دل سے اس تحریک کا قایل کریں۔

قدیم ہندوستان میں ہندوؤں کا طریقہ تعلیم۔ سید خادم حسین صاحب رضوی نے اس مشہور عالم طریق پر جس کی دید اس وقت کی مہذب دنیا کے سیاحوں اور شتاقوں کو ہندوستان میں کھینچ لاتی تھی نہایت مناسب طریق میں رائے زنی کی ہے اور اس طریق کی حقیقت کو منکشف فرمانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

حساب کی درست تعلیم۔ پروفیسر برکت رام صاحب کھوسلہ نہ صرف حساب کے ماہر ہیں بلکہ اس فن کے کامل استاد ہو کر کئی مفید کتب حساب کے مصنف ہیں جو آپ کی حسابی دلچسپیوں کی زندہ شہادت ہے ایسے کامل فن استاد نے ایسے ضروری مضمون کی درست تعلیم کے لئے جو ہدایات درج فرمائی ہیں حساب کے اساتذہ اور تمام تلامذہ کے لئے خضر راہ ہیں یقین ہے کہ ان سے وہی فائدہ حاصل کیا جائیگا جس کے لئے وہ مخصوص کی گئی ہیں۔

تعلیم بچگان مسٹر مہر شنچید رسہگل نے پر فیسر ڈیوی صاحب کے تجربات تعلیمی کو واضح فرما کر اپنے صوبہ کے اساتذہ سے بجا آرزو کی ہے کہ وہ بھی ان تجربات سے فائدہ اُٹھا کر اپنے آپ کو نامی اور اپنے شاگردوں کو مفید امورات سے مالا مال فرمائیں۔

انٹیلیجنس ٹیسٹ اور پہلیوں کے ذریعے جناب لالہ دھرپال صاحب چوہڑہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس نے اساتذہ اور افسران معائنہ کے سامنے ایک نیا تجربہ پیش کیا ہے جو صرف تجربہ ہی نہیں بلکہ اس حقیقت کا انکشاف ہے جو چند سال پہلے ہمارے ہاں عام طور پر رائج تھی اساتذہ اگر اعتدال سے انحراف نہ کر کے اس تجربہ کی تعمیل میں طلبا سے مشق کرائیں تو ان کے حافظہ کو مجلا کرنیکے علاوہ ان میں سوچنے کا مادہ پیدا کرینگے اور فن تقریر کی تعلیم دے سکینگے طلبا کیلئے بیکاری کی بجائے دل لگی کا بہترین مشغلہ ہوگا افسران معائنہ بھی بچوں کی حوصلہ افزائی اور شوق پیدا کرنیکی خاطر اس تجربہ سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جسے وہ بہر نوع مفید پائیں گے۔

تعلیم کا اصل مدعا چودہری پران ناتھ صاحب ورت ایم اے کے زورِ طبع کا بہترین نتیجہ ہے آپ نے نہایت فاضلانہ طریق سے اس مدعا کو واضح فرمایا ہے اور بلا مبالغہ مضمون کے اندر فصاحت اور بلاغت کوٹ کوٹ کر بھری ہے جس سے آپکا مضمون ناظرین کرام سے بے اختیار خراج تحسین و آفرین حاصل کریگا۔

ہمارا تعلیمی معیار کیوں گر رہا ہے؟ کے زیر عنوان جناب ایس ایس شرما صاحب نے حق شناسی گفتن الا کشکار کے مقولہ کی صداقت کو ظاہر فرمایا ہے

اساتذہ کی معمولی اور بے نام تنخواہوں سے حقیقت میں جو نقصان عظیم ملک و قوم کو برداشت کرنا پڑا ہے بڑی وضاحت سے دکھایا ہے کیا یہ امر قابل افسوس نہیں کہ ہم اپنے گھوڑوں کے سدھانے کیلئے بہترین چابک سوار تلاش کریں اور بچوں کیلئے جو ہمارے جائز وارث اور نام روشن کرنے والے ہیں سستے اور کم قیمت استاد تلاش کریں خدائے پاک متعلقین کو اس حقیقت سے آشنائی کی طاقت عطا کریں۔

اسکولوں میں مضامین کی تقسیم۔ مولوی غلام ناصر خان صاحب مضمون نگار نے اپنے مضمون میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے جس سے تجربہ کار اساتذہ آشنا ہیں کہ ہر ایک انسان کا اپنا مذاق الگ ہوتا ہے کسی کو زباندانی سے محبت ہے کسی کو حساب سے کسی کو سائنس سے لگاؤ ہے کسی کو جنرل نالج سے اسلئے ہر استاد کو اسکے مذاق کا مضمون دینا سکول، طلبا اور اس استاد سے انصاف کرنا ہے ورنہ نتیجہ صفر ہوگا انسٹی ٹیوشن کو خاص نقصان ہوگا ہیڈ ماسٹر صاحبان کا ادھر متوجہ ہونا ضروری ہے۔

دیہاتی رقبہ میں جماعت اول کی حالت لالہ رام کشن صاحب ڈھنڈہ نے جس طریق سے اس حالت کو پیش کیا ہے انہی کا حصہ ہے لالہ صاحب اول جماعت کو بنیادی جماعت مانکر اسکی ترقی تعلیم کیلئے جو نئے سے نئے طریق اور دلچسپی کے مشغلے رہنمائے تعلیم کے صفحات میں پیشتر ازیں نذر ناظرین کرتے رہے ہیں متعلقین سے خراج تحسین حاصل کئے بغیر نہیں رہ سکے ہمارا یقین ہے کہ آپکی یہ کوشش بھی بدستور سر آنکھوں پر لی جائیگی۔

اساتذہ اور قومی ترقی میں استاد اور شاگرد کے باہمی تعلقات کا ذکر کرکے چودھری محمد عبداللہ صاحب نے استاد کے اوصاف ظاہر کئے ہیں اور قوم سے بحیثیت مجموعی اپیل کی ہے کہ اساتذہ کی رکاوٹوں کا انسداد ان کا فرض ہے۔ طلبا کے والدین اور تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب بغور ملاحظہ فرمائیں اور مستفید ہوں۔

معجزہ کے اثرات وغیرہ کو مسٹر طلیش مگوی نے وضع فرماکر ناظرین کی توجہ کے قابل بنایا ہے اور بلا مبالغہ اپنی انشاپردازی کا ثبوت دیا ہے ع اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

مسئلہ فیثاغورث کا ریاضی پر احسان مولوی محمد عزیز الدین صاحب موجودہ تعلیمی دنیا میں ریاضی کی خاص قابلیت کے مالک ہیں ریاضی کی مشکلات کی گرہ کشائی جس طریق سے آپ فرماتے ہیں محتاج بیان نہیں جوبلی نمبر بھی خوشی کی بات ہے کہ آپکے مفید تجارب سے محروم نہیں رہا اور آپنے ایک ضروری و مشہور مسئلہ پر جس عجیب اور دلکش پیرایہ میں خامہ فرسائی کی ہے ناظرین کی دلچسپی کا خاص موجب ہوگی۔

تعلیمی رپورٹ سررشتہ تعلیم پنجاب کی خدمتگذاری کا صحیح فوٹو اور ریکارڈ پیش کرتی ہے طریق تعلیم کی ترقی میں مختلف طریقوں کا مجملاً ذکر کیا گیا ہے اور ہر ایک کے حسن و قبح پر رائے زنی کی گئی ہے اسطرح پنجاب کی تعلیمی حالت اسکی موجودہ کارگذاری کا خاکہ پیش کررہی ہے لالہ بہاری لال صاحب ان ہر ضروری مضامین کی تیاری کیلئے ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔

اردو انشاپردازی کی تعلیم و تدریس میں قاضی فتح محمد صاحب نے اپنے حسن مذاق کا پورا ثبوت بہم پہنچایا ہے اور انشاپردازی ایسے ضروری مضمون کے متعلق اساتذہ کی پوری رہنمائی فرماکر انہیں اپنا گرویدہ کیا ہے آپکا طرز بیان بہت دلچسپ اور موثر ہے۔

سررشتہ تعلیم پنجاب کی ہسٹری سنہ ۱۸۴۹ء سے سنہ ۱۹۲۲ء تک کے حالات کا مجملاً مجموعہ ہے جس کا مطالعہ سررشتہ کے تمام حالات سے آگاہی کا موجب ہوگا۔

شعبہ ادب و اخلاق کو گو بادی النظر میں ادبی رسائل کیلئے مخصوص کیا جاسکتا ہے مگر رہنمائے تعلیم کی ادبی دلچسپیوں اور اسکے احساس خدمتگذاری کا جذبہ ہے کہ وہ اپنے ناظرین کے تفنن طبع کیلئے اس شعبہ میں بہتر سے بہتر مضامین مہیا کررہا ہے اور اس حیثیت میں بذات خود ایک ادبی رسالہ کا وجود پیش کررہا ہے چنانچہ ذیل کے قیمتی مضامین زبان حال سے اس امر کی تائید کرینگے۔

حضرت داغ کے حالات مولانا عبدالعزیز صاحب نے جس خوبی اور فصاحت سے قلمبند فرمائے ہیں ادبی دنیا میں بیحد پسند کئے جائینگے مولانا موصوف

رہنمائے تعلیم کے ولی کرمفرما اور اسکے ادبی شعبہ کیلئے وقتاً فوقتاً اعلےٰ پایہ کے مضامین بہم پہنچا کر اسے مفتخر فرمایا کرتے ہیں۔

کامیابی معزز ہمعصر رسالہ زمانہ کانپور کے محترم اڈیٹر منشی دیا نرائن صاحب نگم بی اے کے تبرکات سے ہے آپ نے کامیابی اور اس کے ذرائع پر نہایت عمدگی سے اظہار خیالات فرمایا ہے۔

مولوی محمد نوح صاحب نوح ۔ رہنمائے تعلیم کے سرپرست تاج الشعرا حضرت نوح ناروی کے سوانح حیات اور انکی شاعری پر تبصرہ ہے جسے رسالہ کے مایہ ناز فاضل بے بدل مدیر حضرت جوش ملسیانی نے اپنی سحر بیانی اور جادو نگار قلم سے تیار فرمایا ہے جس کیلئے یہی کہنا اسکی خوبیوں کی کافی سے بڑھ کر ضمانت ہے کہ وہ حضرت جوش کے اپنے رنگ میں لکھا ہوا ہے جس سے بہتر رنگ شاید میسر نہ آسکتا۔

نیک و بد کی تمیز پروفیسر محمد الدین صاحب تاثیر ایم اے کا اعلےٰ علمی شاہکار ہے اور بڑے کام کی چیز ہے جس کا مطالعہ ناظرین پر عالم وجدی طاری کردیگا

آبحیات یعنی حضرت جلیل کی شاعری پر تبصرہ ہمارے ولی کرمفرما سید دل محمد صاحب صفا کی علمی دلچسپیوں کا بہترین نتیجہ ہے قابل مضمون نگار نے نہایت کاوش اور کوشش سے مضمون کو دلچسپیوں کا مخزن بنا دیا ہے جس کا مطالعہ جی میں امنگ اور نیا جوش پیدا کرتا ہے اور حضرت جلیل کے سراپا اعجاز کلام سے پوری واقفیت بخشتا ہے۔

ارمغان عزیز عزیز لکھنوی کے کلام پر رسالہ کے واجب الاحترام سرپرست حضرت نوح کے تبرکات کا بہترین کرشمہ اور ادبیات کی جان ہے رہنمائے تعلیم کی خوش قسمتی قابل داد ہے جسے حضرت نے اپنی سرپرستی میں لیا ہوا ہے سعدی صاحب کا مقولہ اسکے حسب حال ہے ؎

چہ غم دیوار اُمّت را کہ باشد چوں تو پشتیباں   چہ باک از موج بحر آں را کہ دارد نوح کشتیباں

رام گلی مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی کے تبرکات سے ہے یہ رام گلی آج رہنمائے تعلیم کے وجود مسعود سے شہرہ آفاق ہو کر حضرت کی نظر کیمیا اثر میں جچ گئی ہے سچ ہے ؎ صحبت صالح ترا صالح کند۔ رام گلی کی خوش قسمتی قابل رشک ہے کہ وہ مصور فطرت کے صوفیانہ تبرک سے متبرک ہو گئی ہے۔

بچے اپنے بڑوں سے جو آرزوئیں کرسکتے ہیں ان کا بہترین خلاصہ مسٹر منصور احمد جائنٹ اڈیٹر ہمایوں کے قلم جادو رقم کا عطیہ ہے۔

میری حماقتیں ۔ سید خورشید حسن صاحب کی ترجمان اور حقیقت و صداقت سے مملو ہیں۔

اخلاق و موعظت شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی ان کرمفرماؤں سے ہیں جو رہنمائے تعلیم کی بہتری اور فلاح دل سے چاہتے ہیں آپ نے جہاں جوبلی نمبر کیلئے مفید مشوروں سے مالا مال فرمایا وہاں اسکیلئے نہایت کارآمد اور اعلےٰ پایہ کے مفید مضامین بھی عنایت فرمائے جو تمام و کمال بیحد دلچسپ اور آپ کی محنت پسند طبیعت کے بہترین شاہد ہیں۔ اخلاق و موعظت ان میں سے ایک ادبی شاہکارہ ہے اور بلا مبالغہ رسالہ کے ادبی شعبہ کی روح رواں ہے۔

شریر لڑکے کس طرح سدھر سکتے ہیں اور انکو قابو میں لا کر کس طرح شرافت کے خراد پر چڑھایا جاتا ہے بھائی کشن داس صاحب بلوری ایم اے کے تجربات کا شاہد حال ہے۔

تخیل کے کرشمے دوسرا ادبی مضمون ہے جو ہمارے محترم رہنما حضرت جوش ملسیانی کا عطیہ ہے اور ہماری تعریف سے مستغنی ہے۔

صرف نحو اردو میں حضرت خواجہ محمد عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی نے گرامر کی سرپرستی کا پورا ثبوت دیا ہے جسے موجودہ دنیا تقریباً بھلا

پشت رکھے ہوئے ہے ایسے ضروری مضمون پر روشنی ڈالنا خواجہ صاحب کے کمال کا شاہد اور ادبی دنیا کی رہنمائی کا موجب ہے۔

تعلیم و ہنر کو حسن فصاحت اور ظرافت سے ضیاء الملک حضرت ملا رموزی نے لازم و ملزوم ثابت کیا ہے زیر تربیت اور فارغ التحصیل نوجوان اس سے یکساں مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ وہ انہیں ہنر کی عظمت جتلا کر کسی نہ کسی کسب و ہنر میں رجوع فرمانے کی دعوت دیتا ہے ملک کی بدقسمتی ہے کہ نوجوان ملازمت کے ہاتھ بک چکے ہیں یہ مضمون انہیں گمراہی کے تاریک گڑھے سے نکال کر راہ راست پر گامزن ہونے کی تلقین کریگا۔

صحت مقدم ہے یا تہذیب کے مصنف سید غضنفر علی صاحب نقوی بی اے ہیں جنکی مقبول عام نظم "مدرس کے کھانے کو کافی ہوا ہے" بہت سے ناظرین مطالعہ کر چکے ہیں آپ کی فوٹو درباری لباس میں اس زمانہ کی یادگار ہے جب آپ ڈائمنڈ جوبلی ہائی سکول مالیر کوٹلہ میں ملازم تھے اگرچہ اس مضمون کو بھی تصویر کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے مگر ہم اسے ڈائمنڈ جوبلی ہائی سکول کی رعایت سے بھی رسالہ کے جوبلی نمبر میں ہدیہ ناظرین کرتے ہیں آپکا مضمون بیحد مفید اور ضروری ہے ناظرین کرام اس کے مطالعہ سے بہت محظوظ ہونگے اور مستفیض بھی۔

دیہات سدھار کے شعبہ میں اگرچہ تین مضمون ہی شائع ہوئے ہیں مگر وہ سب بڑے کام کے اور اس شعبہ کی جان ہیں مسٹر برائن سابق ڈپٹی کمشنر ضلع گوڑگانوہ حال ضلع جہلم کا نام نامی ہی دیہات سدھار کی کافی سے بڑھ کر ضمانت ہے اس مضمون کیلئے شاید آپ سے بڑھ کر کوئی مستند اہل الرائے صوبہ میں ڈھونڈے سے نہ مل سکیگا مولوی **فضل محی الدین** صاحب قادری نے بھی اپنے مضمون میں جس تحقیقات اور کوشش کا ثبوت بہم پہنچایا ہے آپ ہی کا حصہ ہے اسی طرح **الٰہی ہونری** صاحب کے مفید نکات بھی دیہات سدھار کے مفید مطلب امور کے لئے بیحد ضروری ہیں اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اس شعبہ کیلئے خوبترین مضمون بہم پہنچائے گئے ہیں جن سے بہتر کیا کوئی بیان کریگا۔

تاریخ و سیر کی ذیل میں ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ایم اے پی ایچ ڈی نے شہر آگرہ جہانگیر کے عہد میں ناظرین کی ضیافت طبع کیلئے صفحہ قرطاس پر جلوہ گر دکھایا ہے جس کا مطالعہ انہیں آگرہ کی اس عظمت اور عروج کی سیر کرائیگا جو اس نے شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں حاصل کیا تھا

تعلیم جغرافیہ میں کھلے میدان میں کام کرنے اور سیر و سیاحت کرنے میں اہمیت کے ذریعہ رائے صاحب لالہ سوہن لعل صاحب نے جو مضمون جغرافیہ میں نئی جان اور روح پھونک رہے ہیں ایک نئے تجربہ کی دعوت دی ہے اور اس کی اہمیت کو ایسے سانچے میں ڈھالا ہے کہ اس کے مطالعہ سے طبیعت خود بخود شگفتہ اور شاداب ہو کر نفس مضمون کی حقیقی علت غائی کی قائل ہو جاتی ہے ماشاء اللہ آپ اس علم میں آپ ملک کے مستند اور مسلم الثبوت اساتذہ سے ہیں اور علم جغرافیہ کی وکالت آپ سے بڑھ کر کون کر سکیگا؟

سیام کے رسم و رواج اور حالات رائے بہادر پنڈت شو نرائن صاحب شمیم ایڈوکیٹ لاہور کے تجربات کا نچوڑ ہیں۔ پنڈت جی ادبی دنیا میں اپنی شہرہ آفاق تصنیف "ایم اے بنا کے کیوں میری مٹی پلید کی" کی وجہ سے نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور ایک دنیا آپ کے فیضان صحبت سے مستفید ہونے کی متمنی رہتی ہے رہنمائے تعلیم کی درخواست کو پذیرا فرما کر آپ نے ادبی دنیا کو مرہون منت بنایا ہے۔

ریاست ٹراونکور کے حالات۔ پادری جے علی بخش صاحب لاہوری نے ریاست کے چشم دید عجیب و قابل دید حالات تحریر فرما کر ناظرین کو گھر بیٹھے ٹراونکور کی سیر کرا دی ہے۔

قریب منزل مقصود میں منشی منوہر لال صاحب طالب نے سفر کشمیر کے حالات حوالۂ قلم کئے ہیں کشمیر جنت نظیر کی بیر قدرت کی دلفریب نیرنگیوں کا عجیب تکلفانہ دکھا کر شائقین کو سیر ہونے نہیں دیتی طالب صاحب نے کوشش کی ہے کہ اس سیر کا لب لباب اس کی دیا سے محروم احباب تک پہنچا کر انہیں دعوت دیں کہ فرصت کا وقت نکال کر کشمیر کی سیر سے محظوظ ہوں۔

قدیم ہندوستان کی خوفناک رسم ستی - شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی نے اس مشہور عالم رسم ستی کی ابتدا و انتہا پر نہایت فاضلانہ طریق سے روشنی ڈالی ہے اور شائقان تاریخ کے لئے ایک کام کی چیز بہم پہنچائی ہے۔

مزار سعدی - حیات سعدی میں مولانا حالی مرحوم نے شیخ سعدی کی مزار کا کچھ ذکر فرمایا تھا فرید الزمان پروفیسر محمد شجاع صاحب منعمی نے گذشتہ تعطیلات گرما میں شیراز پہنچکر اسکی موجودہ حالت ناظرین پر منکشف فرمائی ہے اور اپنی دلچسپیوں کا ثبوت بہم پہنچایا ہے

پہاڑ کی سیر کے طفیل لالہ کو تو رام صاحب گپتا نے ناظرین کو اس سیر کے فوائد سے آگاہ کرنے اور انہیں اس سے متمتع ہونے کے آرزومند ہیں۔ پہاڑ قدرت کی نیرنگیوں کا بیحد ذخیرہ لئے ہوتے ہیں جن کی سیر سے انسان کئی تجربے اور صحت جسمانی کو صحیح کرنے کے کئی گر معلوم کر سکتا ہے۔

علمی مضامین کے شعبہ میں متحرک تصاویر (سینما) کو لالہ بہاری لعل صاحب سہگل نے سائنس کے نقطہ نگاہ سے پورے طور پر واضح فرمایا ہے اور سائنس سے ناآشنا برادری پر باب حکمت کھول دیا ہے۔

مسٹر کارپر کی کہانی اسکی اپنی زبانی - سچ ہے تصنیف را مصنف نیکو کند بیان تاہم ایسی مفید دھات کی آپ بیتی اور سائنس میں اسکی ضرورت کو لالہ دلباغ رائے صاحب نے ناظرین کی دلچسپی بڑھانے کیلئے وہ رنگ دیا ہے کہ اسکا مطالعہ گوناگوں طبائع پر بھی اپنا پرتو ڈالے بغیر نہیں رہیگا۔

خوف جعفر بھٹی بی۔ اے (آنرز) کے علمی مذاق کا گواہ ہے جسے فلسفیانہ طرز میں بیان کرکے وہ ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا کے مقولہ کی یاد کو تازہ کر دیا ہے۔

میں کون ہوں - نیرنگ خیال کے قابل مدیر کی علمی قابلیت کا مرقع ہے اور مطالعہ کے از بس قابل مضمون کی ماہیت مطالعہ کے بعد خود بخود واضح ہو جائے گی اور ناظرین کے تفنن طبع کا موجب ہوگی۔

معلومات کا ابتدائی ورق حضرت عشرت رحمانی رامپوری مدیر نیرنگ دہلی کے علمی دستر خوان کا عطیہ ہے جس سے انسان کی تقسیم - اس کے سوچنے کا طریق اور سوچنے کے وقت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

لاسلکی کے معجزے - وائرلیس (بے تار برقی) کے معجزے اسکی ضرورت ابتدا اور فائدہ بخش حالات پر ناقدانہ رائے زنی ہوئی ہے پروفیسر گمبھی شامداس صاحب کی توجہ سے سائنس دان نوجوان خوب محظوظ ہونگے۔

حفظان صحت کے شعبہ کو نذر ناظرین کرنے سے پہلے ہمیں اس امر پر بڑا افسوس کرنا ہے کہ مولوی محمد شریف صاحب قریشی کا مفید عام مضمون فارورڈ عدم گنجائش کی بعینہٖ ہوا یہ مضمون بھی آپکے مشہور عالم مضمون تحفظ صیاں کیطرح نہایت پسند کیا جاتا انشاءاللہ عنقریب شائع کیا جائیگا۔

صحت طلباء وہ قیمتی اور ضروری مضمون ہے جس سے تعلیمی دنیا بالخصوص استاد و شاگرد سب کے سب یکساں طور پر بہرہ ور ہونگے اور مضمون کی مندرجہ ہدایات اُنکی پوری رہنمائی کا موجب ہونگی۔ لالہ موہن لال صاحب ایم اے بی ٹی کی عنایات کا شکریہ واجب ہے جنہوں نے اپنے مفید اور قابل قدر مضمون سے جوبلی نمبر کی دلچسپیوں میں خاص اضافہ فرمایا ہے۔

چاء اور برف۔ ڈاکٹر شیاما چرن صاحب ورما رہنمائے تعلیم کے حقیقی عنایت فرما اور اس کے مشیر طبی ہیں۔ ہر دو اشیاء متذکرہ صدر اگرچہ آجکل کے فیشن کا ضروری لازمہ ہیں مگر آپ کا دعوےٰ ہے کہ دونوں کی دونو ہماری طبائع کے سخت برخلاف ہیں اور ان کا استعمال آخر ہماری صحت کو خراب کئے بغیر نہ رہیگا ضرورت ہے کہ فیشن پرست اصحاب وقت پر باخبر ہوں تاکہ بعد میں انہیں پچھتانا نہ پڑے اور آپ کے مفید مشورے سے مستفیض ہوں۔

صنعت و حرفت اور زراعت کے شعبہ میں نصاب تعلیم اور اس میں ترقی کے ذریعے سے رائےصاحب لالہ مدن گوپال صاحب نے صنعت و حرفت کی ترویج پر خاص زور دیا ہے اور **ملک سے بے روزگاری دُور کرنے کے حل** میں لالہ ہر رام صاحب نے بدستور ایسے عملی طریق بیان فرمائے ہیں جن سے نوجوان اپنی حالت بہتر سے بہترین بنا سکتے ہیں **جناب لالہ لچھمن داس صاحب** زراعت انسپکٹر نے پنجاب کے ورنیکلر مڈل مدارس میں زراعت کی تعلیم کی وساطت سے زراعت کی وکالت کا حق بخوبی ادا فرمایا ہے **ہنری فورڈ** جنہیں موٹروں کا شہنشاہ کہنا بجا ہے ایک زندہ مثال صنعت و حرفت سے ترقی حاصل کرنے کی ہے آپ موجودہ وقت میں دنیا کے سب سے بڑے مالدار اور ارب پتی ہیں جن کی ترقی کا راز محض صنعت و حرفت کی دلچسپی میں مضمر ہے پنڈت **بال مکند صاحب عرش ملسیانی** جو رسالہ کے قابل مدیر حضرت جوش ملسیانی کے خلف اکبر اور ہم سب کے محبوب القلوب ہیں موٹروں کے اس شہنشاہ کے سوانح حیات سے نوجوانوں کے طبائع میں انقلاب پیدا کرنے اور ملازمت کے غلط شوق سے ہٹا کر ملک کی صحیح خدمتگذاری پر لگانے میں مساعی جمیلہ فرما رہے ہیں آپ کا دلچسپ مضمون بلاشک و شبہ اپنا رنگ لائیگا اور نوجوانوں کے دلوں میں صحیح انقلاب پیدا کریگا۔ یعنی وہ کسب ہنر کے شیدائی ہو کر اپنی معاش آزادانہ طور پر حاصل کرنے کو ملازمت پر ترجیح دینگے۔

افسانے اور ڈرامے آجکل کی ادبی دنیا کے بے حد منظور اور محبوب ترین چیزیں ہیں۔ رہنمائے تعلیم کی کوششیں قابل داد ہیں جسے اس ذیل میں بھی چوٹی کے افسانہ اور ڈرامہ نویسوں کے اعلےٰ پایہ کے شاہکارے حاصل ہوئے ہیں چنانچہ منشی پریم چند صاحب بی۔ اے لکھنوی کا **تحریک** نامی ڈرامہ اس امر کا شاہد ہے کہ انسانی زندگی میں تبدیلی رونما ہو کر اُسے کیا سے کچھ بنا دیتی ہے ایک نکما اور ناکارہ طالب علم جس سے تعلیم گاہ کے در و دیوار پناہ مانگتے ہیں استاد بھی اُسے بلائے بے درماں بتاتے ہیں طلبا بھی لرزہ براندام اور اسکے احکام کے برخلاف چون و چرا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے قدرت اس کی خضر راہ بنتی ہے اور اُسے ایک بے ماں کے ماموں زاد بھائی کی سرپرستی سے کام کرنے کا ایسا شوق پیدا ہوتا ہے کہ ہوشیار طالب علم بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ آئے دن مجموعہ محاسن ہوتا جاتا ہے اور وقت پا کر ولایت میں اعلےٰ تعلیم حاصل کر کے اپنی علمی قابلیت کی داد حاصل کرتا ہے یعنی انڈین سول سروس کا امتحان پاس کر کے ڈپٹی کمشنر ہوتا ہے اور اپنے حالات ایک استاد سے جو استاد سے پرنسپل اور پرنسپل سے تارک الدنیا بنتا ہے بیان کرتا ہے۔ جو نوجوانوں کے لئے مرقع عبرت اور ان کی تحریک کا موجب

ہے منشی صاحب ملک کے مسلمہ افسانہ نویسوں کے سرتاج ہیں اور آپ کا شاہکارہ تعلیمی اور ادبی دنیا میں بیحد پسند کیا جائیگا۔

بھروسہ۔ مسٹر مدن شرما کی جولانئے طبع کا بہترین شاہد اور ان کے ہم خیالوں کیلئے دلچسپیوں کا مخزن ہے۔

تمنا سردار رام سنگھ صاحب بی اے (آنرز) ایس ڈی۔ آئی کا نہایت سبق آموز شاہکارہ ہے ایک بدنصیب باپ بیوی کی وفات کے بعد اپنے دونو بچوں کو کھو بیٹھتا ہے اور ان کی باز دید کی امید میں زندگی کے پچیس سال نہایت انتظار میں بسر کرکے حالت نزع میں بڑے بچے کو پاکر شادی مرگ ہو جاتا ہے ؎

امید بستہ برآمد ولے چہ فائدہ زانکہ　　　امید نیست کہ عمر گذشتہ باز آید

کے مقولہ کی صداقت صاف اس سے عیاں ہوتی ہے۔

مرجان خانم محترمہ بلقیس بیگم کے تخیلات کی بلند پروازی کا اپنی مثال آپ شاہکارہ ہے اور اس امر کا شاہد ہے کہ جب صنف نازک اپنی عفت اور عصمت کی حفاظت پر جو نسوانی بے بہا زیور ہے۔ آمادہ ہو جاتی ہیں تو کوئی خطرہ یا عتاب انہیں متزلزل نہیں کرسکتا۔ مرجان خانم نے خلیفہ ہارون الرشید سے ازدواج کا وعدہ کرکے زمانہ کے جابر ڈاکو کی سختیوں کو پاؤں تلے روندا اور اس کی نعمتوں اور شان وشکوہ پر نگاہ تک کی اس کا قید سے نکلنا اور کڑے پہرے سے صحیح وسالم نکل کر خلیفہ کے دربار میں پہنچنا اور ڈاکو کیفر کردار تک پہنچانا اگرچہ محیر العقول نظر آتا ہے مگر بے اختیار یاد دلاتا ہے کہ رکھنے اور حفاظت کرنیوالے کے بچاؤ کے راہ نیارے ہیں محترمہ ہمشیرہ کی عنایت کے صدقے جوبلی نمبر نسوان کے فہم و فراست سے محروم نہ رہا بلکہ اسے وہ شاہکارہ حاصل ہوا جو ادبی دنیا میں تہلکہ مچانے والا ہے۔

درس عبرت کا نام ہی شاہد ہے۔ کہ افسانہ کیا ہوگا مصور جذبات اشرف قریشی لکھنوی نے فصاحت وبلاغت کا عملی ثبوت پیش کر دیا ہے۔ افسانہ ایک اسم بامسمیٰ افسانہ اور ناظرین کی دلچسپیوں کا لامتناہی سلسلہ ہے۔

سجدۂ شکر۔ مرقع عبرت ہے پہلی اولاد کی موجودگی میں جو باپ دوسری شادی کرتے ہیں اکثر اوقات وہ شادی فیمابین خانہ بربادی کا موجب ہوتی ہے۔ سجدۂ شکر میں دو زندہ مثالیں پیش کی گئی ہیں جو دو خاندانوں کی بربادی کا عبرت بخش انجام دکھاتی ہیں ایک نوجوان دوسرے ہمراہی کو اپنے سے بہتر سمجھ کر اس کی حالت پر رشک کرتا ہے مگر حقیقت سے آگاہ ہو کر اُسے اپنے سے زیادہ درد رسیدہ اور مظلوم پاکر سربسجود ہوتا ہے اور سجدۂ شکر بجالاتا ہے۔ شیخ محمد انعام الحق صاحب کی شیوہ بیانی قابل داد ہے۔

مشاہیر عالم کی ذیل میں چند بزرگوں کے دلچسپ اور سبق آموز حالات عدم گنجائش کا شکار ہوئے اس شعبہ میں **شری کرشن جی** کی لائف اور ان کی بے نظیر تصنیف گیتا پر جو ناقدانہ اظہار خیالات ہوا ہے مولوی محمد شریف صاحب قریشی کی بے تعصبی اور علمی مذاق کا شاہد ہے آپنے اپنے دلکش طرز بیان سے اس میں وہ جادو بھرا ہے کہ زبان بے اختیار چٹخارے لیتی ہے۔ شری کرشن ایسی بے نظیر ہستی اور ان کی یگانہ روزگار تصنیف کو ان کا کوئی نام لیوا قریشی صاحب

سے بہتر کیا تحریر کرے گا آپ نے یہ مضمون لکھ کر علمی دنیا میں ایک زندہ مثال پیش کی ہے اور اس امر کا بدیہی ثبوت دیا ہے کہ ہر ایک بزرگ کے خیالات کی قدر کرنا اور اس میں قومیت اور ملت کو دخل نہ دینا حقیقت کے ہر متلاشی کا فرض ہے! ور "**خذ ما صفا ودع ما کدر**" کے مقولہ کا عامل و قائل ہونا اس پر واجبات سے ہے۔

مہاکوی کالیداس کے سوانح حیات کو بالتفصیل اور ان کی بے نظیر تصنیفات پر بالتوضیح اظہار خیالات کرنے کا سہرہ قدرت کی طرف سے ہمارے کرمفرما شیخ محمد اسماعیل صاحب کے سر بندھا گیا ہے۔ شیخ صاحب نے ملک الشعرا کے حالات بیان کرنے سے اپنے ریسرچ سکالر ہونے کا بین ثبوت دیا ہے یہ علمی شاہکار زبان حال سے آپ کی علمی دلچسپیوں کی شہادت دے رہا ہے تاریخ اور ادب کے شائقین اس سے بے حد مستفیض ہونگے۔

سرہمفری ڈیوی ۔قندیل امن کے موجد اور بانی کے حالات اور اس کی طفیل بنی نوع انسان کو جو عظیم فائدہ حاصل ہوا ہے پنڈت پریم پرکاش صاحب نے بیان فرما کر اپنی قابلیت کا بخوبی اظہار کیا ہے۔ سرہمفری ایسے بزرگوار زندہ جاوید ہوتے ہیں جو اپنی تحقیقات اور علمی قابلیت کو ابنائے جنس کے مفاد کا موجب بناتے ہیں قندیل امن سے بلاشک وشبہ کان کنوں کو عام طور پر مگر کوئلہ کی کان میں کام کرنے والوں کو خاص طور پر فائدہ عظیم حاصل ہوا ہے۔ اور اس کے وجود سے تجارت صنعت وحرفت کو بے حد فائدہ پہنچا ہے۔

سسّی پنوں ۔ پنجاب کے مشہور عالم عشاق کی کہانی اور ان کے صحیح حالات کو جس تحقیقات سے جناب **قاضی فضل حق** صاحب ایم اے پروفیسر گورنمنٹ کالج نے حوالہ قلم فرمایا ہے آپ کے سابقہ مضمون ہیر رانجھا کی یاد دلاتا ہے جو رہنمائے تعلیم کے صفحات کی زینت ہو کر عوام کی رہنمائی کا موجب ہوا تھا! ور علمی وتحقیقاتی دنیا میں بہت پسند کیا گیا تھا۔ ہیر رانجھا کی طرح سسی پنوں کی سرگذشت بھی قابل شنید اور مرقع عبرت ہے جناب قاضی صاحب کو پنجابی شاعری سے جو شغف اور انہماک ہے اس کا بہترین ثبوت آپ کے یہ علمی شاہکارے ہیں جن کی ترتیب میں کافی سے زیادہ چھان بین کی گئی ہے اور پبلک کو خاص تاریخی حوالوں اور مستند کتابوں کی امداد سے ان کی اصل حقیقت سے آگاہ کیا گیا ہے۔

اخیر میں ہم مندرجہ ذیل اصحاب کرام سے معافی مانگتا ہے جنکے مضامین یا تو بہت دیر کے بعد موصول ہوئے یا ان کے تراجم میں مترجم نے تغافل سے کام لیا۔ اور یا بعض بہت طویل ہونے کی وجہ سے طباعت سے رہ گئے ورنہ ہم انہیں مطبوعہ مضامین سے کسی طرح بھی کم قیمتی نہیں سمجھتے۔ امید ہے کہ ہمیں اس گستاخی کیلئے معاف کیا جائیگا۔ بقایا مضامین جلد جلد آئندہ اشاعتوں میں چھپنا شروع ہو جائینگے۔

لالہ گوراندتہ مل صاحب بی اے پی ای ایس۔ مولوی محمد عبد العلی صاحب بی اے پی ای ایس۔ پروفیسر فیروز حسن صاحب بٹ ایم اے

منشی کنھیا لال صاحب ایم اے حضرت نسیم ایڈیٹر انکشاف حضرت ہدف اجتہادی حضرت عشرت رحمانی۔ پروفیسر عبدالباسط ایم اے ٹھاکر ستیہ پال سنگھ جرنلسٹ۔ سید محمود صاحب بی اے۔ حضرت خیر بہوروی۔ لالہ رتن چند جین بی اے بی ٹی حضرت جبرت ایڈیٹر سروش۔ سید منظور حسن رضوی۔ چوہدری سنت رام صاحب ریٹائرڈ پی۔ ای ایس حضرت ریاض خیر آبادی۔ ماسٹر سنت رام صاحب مگر بی اے۔ پنڈت دولت رام صاحب شرما۔ مولوی ظفر اقبال صاحب ایم اے پی ای ایس۔ پنڈت ہرچند صاحب اختر ایم اے۔ قاضی حبیب اللہ صاحب اخلاق وغیرہ شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی کے آٹھ نہایت اعلےٰ پایہ کے تحقیقاتی مضامین میں سے صرف دو مضمون دئے جاسکے ہیں۔ امید کہ یہ جملہ اصحاب ہماری مجبوریوں اور جوبلی نمبر کی کافی سے زیادہ ضخامت کو مدنظر رکھ کر ہمیں معاف کر دینگے۔ (رسچاپ یوا)

پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کی علمی سرپرستی

مولفوں اور مصنفوں کی حوصلہ افزائی کیلئے ایک فنڈ قائم ہے تاکہ اس صوبے کی دیسی بالوں یعنی اردو ہندی اور پنجابی کے اہل قلم کو مفید اور عمدہ کتابیں لکھنے کی ترغیب اور تحریک ہو اور علم ادب میں ترقی ہو۔ یہ انعام صرف اس صوبے کے رہنے والوں کیلئے ہیں اور صرف چیدہ اور خاص تعریف کے قابل کتابوں کیلئے دئے جاتے ہیں۔ ترجمے جبتک غیر معمولی اور انوکھی قابلیت کے نہ ہوں انتخاب انعام میں نہیں آسکتے۔ انتخاب انعام کمتعلق کمیٹی نے چند قواعد و ضوابط مرتب کر دئے ہیں اور انتخاب کے وقت ان پر عمل ہوتا ہے ان قواعد کی نقل دفتر پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی سے دستیاب ہوسکتی ہے واضح ہو کہ انعام دینے کی غرض سے کمیٹی ایسی تصانیف پر غور نہیں کرتی جس میں سیاسی اور مذہبی متنازعہ معاملات پر بحث مباحثہ ہو یا جو کسی خاص فرقہ کمتعلق ہوں۔ یا انمیں ایسے مضامین ہوں کہ جن سے کسیطرح قوموں میں باہمی نفرت پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ یا جن میں موجودہ فرقہ وارانہ سیاسی متنازعہ معاملات پر بحث کی گئی ہو۔ یا جو درسی کتابیں ہوں۔ یا جن کا کسی خاص پیشہ سے تعلق ہو۔ ترجیح ایسی کتب کو دی جاتی ہے جو عوام الناس کیواسطے مفید ہوں اور جو عام فہم سائنس۔ تاریخ سوانحعمری یعنی سیر اور سیاحت سے تعلق رکھتی ہوں یا جن کا مدعا یہ ہو کہ مدرسوں کے بچوں کیلئے آسان مفید اور دلچسپ علم ادب مہیا کیا جائے۔ یا جو کہ خاص طور پر لڑکیوں کے لئے لکھی گئی ہوں۔

ہر سال کے آغاز میں ٹیکسٹ بک کمیٹی کتب موصلہ پر غور کیا کرتی ہے اس ال ۱۹۳۰ء میں پہلی دفعہ چھپی ہوئی کتابیں برائے انتخاب ۲۸ فروری ۱۹۳۱ء تک دفتر میں آنی چاہئیں گویا یہ آخری دن ہے موجود قواعد کے رو سے بہترین کتاب کے لئے انعام ہزار روپے تک ہوسکتا ہے اور کوئی انعام پانسو سے کم نہ ہوگا۔

تفصیل انعامات سال ۱۹۲۹ء حسب ذیل ہے۔

نمبر شمار	نام	رقم
۱	ڈاکٹر بودھ راج چوپڑہ ایم۔ پی۔ سی۔ ایچ۔ بی مصنف ماں اور بچہ	۵۰۰ روپے
۲	لالہ شام داس ودھوا بک سیلر لاہور۔ پبلشر سچتر مہابھارت (ہندی)	۵۰۰ "
۳	پنڈت وید ویاس ایم اے لاہور۔ مصنف وشال بھارت حصہ اول	۵۰۰ "
۴	پنڈت من موہن دیوانہ مصنف ان ودھ موتی	۵۰۰ "
۵	بھائی رام سنگھ گیانی ایم اے پروفیسر خالصہ کالج امرتسر مصنف شبد چمتکار	۵۰۰ "
۶	لالہ ایشور چندر نندا۔ ایم اے لیکچرار گورنمنٹ کالج لاہور مصنف ورتھر یا للی دا ویاہ	۵۰۰ "

دیکھیے گلشنِ سخن کی بہار — اس پہ قربان ہے چمن کی بہار

حُسن ہے شاہدِ سخن پہ فدا — بزمِ انجم ہے انجمن پہ فدا

ہے فلک پر دماغِ علم و ادب

جمع ہیں خوش نوا و خوش گفتار — خوش بیانی کا گرم ہے بازار

مسند آرا ہیں حضرتِ — بلند نشاں

رونقِ بزم ہیں جنابِ — شانِ محفل کی جن سے ہے تکمیل

ہیں کمالِ سخن کے شیدائی — جانشینِ مینائی

نشۂ شعر میں جو ہیں سرشار — ہیں یہی تو سحر نگار

لوگ کہتے ہیں پیرِ میخانہ — ہم سمجھتے ہیں میرِ مے خانہ

حضرتِ پڑھ رہے ہیں غزل — وہ غزل دل کو جو کہے کہ سنبھل

معنیٔ نوبہارِ باغ ہیں یہ — جانشینِ جنابِ ہیں یہ

ان کا دیوان ہر جگہ مشہور — ان کا طوفان ہر جگہ مشہور

شاعرِ باکمال اور بھی ہیں
رونقِ بزمِ قال اور بھی ہیں

یادگارِ امیرِ مینائی
یعنی حضرت صریرِ مینائی

ان کے پہلو میں حضرتِ اختر
یادگارِ امیرِ شاعر گر

جلوہ افروز ہیں گرامی بھی
باسط و صفدر و عظامی بھی

نظم حیرت ہدف جگر محروم
جن کے فضل و کمال کی ہے دھوم

برق طالب آتش بیش فیاض
حکمتِ فن میں ہیں بڑے نباض

کوکب انصاف دل تیق تقیں
شعر کہتے ہیں خوب صاف سلیس

فوق بسمل ہوئے ہیں نکتہ نواز
گرم ہے ان میں بزمِ راز و نیاز

عرش طابش قمر ذہین و فضا
کس ادا سے ہوئے ہیں نغمہ سرا

حُسنِ معنی دکھا دیا سب نے
رنگ اپنا جما دیا سب نے

اب رہا میں گدائے خاک نشیں
پیشکش کوئی جس کے پاس نہیں

بے نوا سے ہو کیا گہرباری
کھا گئی مجھ کو شرمِ ناداری

جو کہا اُس کی مدح کی میں نے
جو سنا اُس کی داد دی میں نے

اور کیا دے سکے عقیدت کیش
برگِ سبز است تحفۂ درویش

(رجب شش سہارنپوری)

جوبلی نمبر

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا

سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا

رہنمائے تعلیم کے جوبلی نمبر کی تقریب پر جا بجا خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ جسے دیکھو خنداں و شاداں ہے۔ حلقۂ احباب میں اسی کا ذکر خیر ہے۔ طلباء و اساتذہ بھی اسی کا نام لے رہے ہیں۔ سب نگاہیں اس کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ ہر شخص پرساں ہے۔ کہ کب اُسکے درشن ہونگے۔ اُسکی وجہ صاف ہے کہ جب کسی کا بچہ گوروکل یا کالج سے تحصیلِ علم سے فارغ ہوکر گھر آتا ہے۔ تو کس قدر خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ اسکے ماں باپ کے نخلِ تمنا میں پھل لگتا ہے۔ اور وہ اُن کیلئے حقیقی مسرت کا موجب ہوتا ہے۔ پس جس بچہ کی پرورش و نگہداشت ۵۲ برس کی گئی ہو اور جسے زمانہ کی ہر سرد و گرم ہوا سے محفوظ رکھا گیا ہو۔ اسکے بالغ ہونے اور امورِ خانہ داری میں شمولیت پر کون ہے۔ جو اُچھل نہ پڑے۔

رسالہ رہنمائے تعلیم کا عہدِ طفولیت اگرچہ گوشۂ تنہائی میں گزرا مگر وہ اُس وقت بھی ایک خصوصیت لئے ہوا تھا جسے اُس نے برابر قائم رکھا۔ اس زمانہ میں ماسٹر جگت سنگھ صاحب نے اسکی مناسب پرورش و پرداخت کی۔ ہر قسم کی قربانی و ایثار نفسی سے کام لیا۔ اسکے ابتدائے شباب کو قریشی طالب علی پابند حال اڈیٹر اخبار تعلیم اور ماسٹر صاحب موصوف نے خوب نبھایا۔ پنجاب بھر میں واحد تعلیمی رسالہ بنا رہا۔ کسی کو مقابلہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی جب اس کا شباب پورے جوبن پر آیا۔ تو اُس کا دورِ جدید شروع ہوا۔ اس میں ایک انقلابِ عظیم اور کایا پلٹ کا مضمون ہوا۔ محض تعلیمی دائرہ پر قانع نہ رہ کر ادبی دُنیا کے رنگ میں رنگا گیا۔ جسے دیکھ کر کئی برساتی مینڈک ٹرانے لگے۔ حسد و عناد کی تاریک گھٹائیں اُسکے سر پر منڈلانے لگیں۔ اس نوجوان کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے مشورے ہوئے۔ شاید دُشمن کامیاب ہو جاتے۔ لیکن ماسٹر جگت سنگھ صاحب مالک رسالہ کی بُردباری استقلال قربانی۔ انتھک کوشش۔ خندہ پیشانی اور رسوخ کی مقناطیسی طاقت نے اسے منزلِ مقصود پر پہنچایا۔ اور وہ آج اپنی زندگی کی پہلی منزل کو طے کر کے دوسری منزل پر کھڑا ہے۔ اسے جس قدر شہرت۔ طاقت اور عزت حاصل ہے۔ وہ سب کچھ ماسٹر صاحب کی محنت و قربانی کا نتیجہ ہے۔ ہندوستان بھر میں اس کا دائرہ اثر موجود ہے۔ برساتی مینڈک ٹراتے رہیں۔ حشرات الارض کی طرح خود ہی رہ جائیں گے۔ کارکنان کو اس سے زیادہ کیا۔

خوشی اور فخر ہو سکتا ہے۔ کہ اُنھوں نے ماسٹر صاحب کی سپرٹ سے چند سبق سیکھ کر تعلیمی و ادبی دُنیا کی کچھ ادنیٰ خدمت کر دکھائی ہے۔

ہم ماسٹر صاحب کی خوشی میں بھی اُسی طرح سے شریک ہیں۔ اور اس ۲۵ سالہ جوبلی نمبر کی کامیابی پر اُن کو تہ دل سے مبارک باد دیتے ہیں۔

ناظرین و اصحاب رسالہ کی حوصلہ افزائی کے بھی ممنون ہیں۔ اور اُن سے استدعا کرتے ہیں۔ کہ آئندہ بھی بدستور رسالہ کی امداد فرماتے رہیں۔

(چیف اڈیٹر)

رنگِ جدید

کوئی جاپان کوئی روس کے ساتھ اور ہیں آپ کے جلوس کے ساتھ

وہ اس کا راز سمجھا وہ اس کا پیچ سمجھا دنیا میں جس نے رہ کر دنیا کو ہیچ سمجھا

ہم نہ ہونگے نہ زمانے میں نشانی ہوگی زندگی اپنی کسی روز کہانی ہوگی

منہ سے ہم کہتے ہیں بھگوان کا درشن مل جائے اور ہے پیٹ کا یہ حکم کہ بھوجن مل جائے
کوئی ارماں نہیں اس کے سوا اے بسمل اُن کے فیشن سے ہمارا کہیں فیشن مل جائے

(بسمل الہ آبادی)
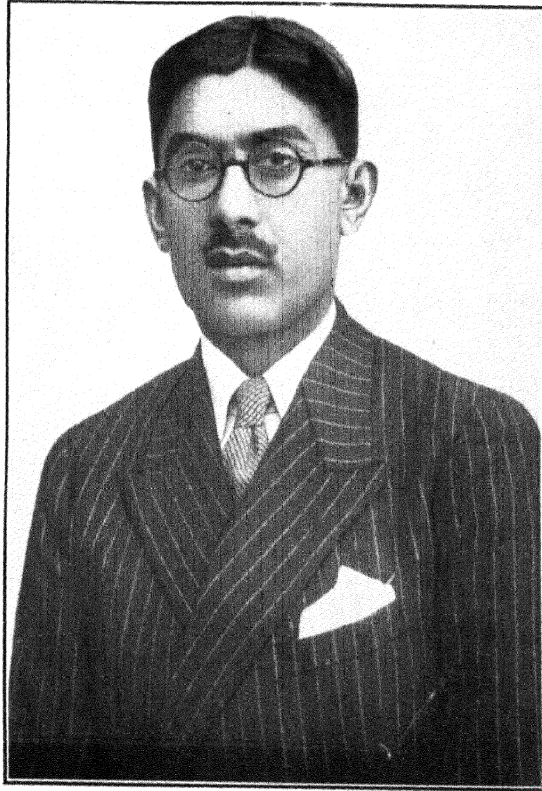
آنریبل ملک فیروز خان نون-ایم اے (اوکسن) بار ایٹ لاء
وزیر تعلیم و صحت پنجاب

سررشتہ تعلیم پنجاب کے سرتاج

آنریبل ملک فیروز خان صاحب نون ایم اے بیرسٹر ایٹ لاء وزیر تعلیم پنجاب

کا

پیغام

"آپ کی پندرہ ماہ سال کی چٹھی کا شکریہ صوبہ بھر کے تمام تعلیم و تعلّم سے تعلق رکھنے والے اصحاب رسالہ "رہنمائے تعلیم" کی قیمتی خدمات سے جو وہ عامۂ خلائق کی بالعموم اور معلمین و متعلمین کی بالخصوص بجا لا رہا ہے۔ پورے طور پر باخبر ہیں میں آپ کی کامیابی کا خواہاں و ملک کی حقیقی خدمت گزاری کیلئے آپ کے رسالہ کی درازیٔ عمر کا آرزومند ہوں!

دستخط انگریزی

Firoz Khan Noon

قطعۂ تاریخ

جُبلی نمبر رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور

جُبلی نمبر ہے یا ہے بادِ بہار
کھل گیا جس سے باغِ علم و ادب

رفعتِ پایۂ مضامیں سے
ہے فلک پر دماغِ علم و ادب

سالِ تاریخ بھی ہے نُورانی
اب ہے روشن چراغِ علم و ادب
۱۹۳۱ء

جوشؔ ملسیانی

J. E. PARKINSON, Esq., M. A., I. E. S.,
PRINCIPAL, CENTRAL TRAINING COLLEGE LAHORE.

پیغامات

آنریبل ڈاکٹر گوکل چند صاحب نارنگ ایم اے، پی ایچ ڈی۔ بیرسٹرایٹ لاء وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ پنجاب۔

آپ کا مہربانی نامہ ملا۔ آپ کے رسالہ کیلئے مضمون تحریر کرنے سے بوجہ عدیم الفرصتی قاصر ہوں۔ مگر آپ کے رسالہ کی معرفت جو تعلیم کا اسم بامسمیٰ رہنما ہے۔ ہمارے بچوں کی تعلیم سے علاقہ رکھنے والے تمام بزرگوں کی توجہ مبذول کراتا ہوں۔ کہ محض درسی تعلیم ہمارے صوبہ کے مفید نہیں ہے۔ ہمارے ہزارہا برائے نام تعلیم یافتہ نوجوان جو آئے سال سکولوں اور کالجوں سے نکلتے ہیں اپنی معاش حاصل کرنے کیلئے اسے باوجود تکمیل غیر مکتفی پائیں گے۔ پس یہ نہایت ضروری ہے کہ طریق تعلیم میں خاص تبدیلی رونما ہو اور محدودے چند مالدار اور مستغنی اشخاص کو چھوڑ کر پبلک کو دستی کام سکھایا جائے۔ تاکہ وہ محض سرکاری ملازمت پر انحصار نہ رکھیں بلکہ آزادانہ ذرائع سے معاش حاصل کرسکیں۔ کیونکہ ہمارے نوجوان جب سکول اور کالج کو خیرباد کہتے ہیں۔ دستی کام کے بالکل ناقابل ہی ثابت نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ اسے کسر شان سمجھتے ہیں۔ جو واقعات کی نہایت ناواجب صورت کا اظہار ہے۔ اور اگر آپ ان اصحاب کی توجہ کو جو ہمارے بچوں کی تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں منعطف کراسکیں۔ تو آپ صوبہ کی حقیقی خدمت سرانجام دینگے

جناب سردار سند داس صاحب بی اے (کنٹب) ایم اے (پنجاب) بیرسٹرایٹ لاء ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم کپورتھلہ

بوجہ عدیم الفرصتی مضمون تحریر کرنے سے معذور ہوں۔ مگر آپ کے نامی رسالہ کی پچیس سالہ کامیاب زندگی کی تکمیل پر مبارکباد عرض کرتا ہوں۔ اور آرزومند ہوں کہ وہ عرصہ دراز تک بدستور مفید اور نمایاں تعلیمی خدمات سرانجام دیتا رہے۔

خانصاحب میر کریم بخش صاحب انسپکٹر و رینکلر ایجوکیشن صوبہ سرحدی۔ پشاور

مہربانی نامہ کا شکریہ۔ جوبلی نمبر کی کامیابی کا دل سے خواہاں ہوں۔ آپ کے رسالہ نے شاندار تعلیمی خدمات انجام دی ہیں اور میں داعی ہوں۔ کہ وہ بدستور اپنے فرائض کو سرانجام دیتا رہے۔ اگر فرصت نے مساعدت کی۔ تو انشاء اللہ کوئی مضمون بھی

آرائے گرامی

عالیجناب خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب ایم اے، آئی ای ایس ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز لاہور ڈویژن۔

"میں بلا مبالغہ رسالہ رہنمائے تعلیم کو بہتر ماہانہ کہتا ہوں۔ اور اُس کے مفید خدمات کی بجاآوری پر تحسین و آفرین کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

عالیجناب مسٹر من موہن ایم اے ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز جالندھر ڈویژن

رسالہ رہنمائے تعلیم اعلیٰ پایہ کا رسالہ ہے۔ اور مدرسینِ مدارس کے لئے نہایت مفید بلکہ مفید ترین رسالہ ہے۔ اس کے مضامین ہمیشہ سبق آموز ہوتے ہیں۔ اس کی صورت نہایت مطبوع اور پسندیدہ ہے۔ میں اس کی ہر گونہ ترقی کا متمنی اور خواہاں ہوں۔"

عالیجناب شیخ عبد الحمید صاحب ایم اے۔ پی ای ایس ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز ملتان ڈویژن

"رسالہ رہنمائے تعلیم عرصہ دراز سے تعلیم کے پوتر کار کی اشاعت کر رہا ہے۔ وہ طلبار کا رفیق اور مدرسین کا بجا وکیل ہے اور طلباء کی ذہانتِ طبع کو بڑھانے کا حقیقی ذریعہ ہے۔ وہ تعلیمی اور اخلاقی ہر قسم کے مضامین بہم پہنچاتا ہے۔ اس کا ضمیمہ یعنی گلدستۂ اطفال پورے طور پر دلکش اور مفید ہوتا ہے۔ اس کے سالانہ چندہ کا جب اسکی خدمات۔ ضخامت اور خوبیوں سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔ تو برائے نام اور قلیل معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مالک کی ایثار نفسی قابلِ داد ہے۔ میری دلی تمنا ہے۔ کہ رسالہ کو اپنے مدعا میں نمایاں کامیابی حاصل ہو۔ اور وہ ہمیشہ شاہراہِ ترقی پر گامزن رہے۔"

عالیجناب سردار دیوا سنگھ صاحب ایم اے پی ای ایس ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز انبالہ ڈویژن

رسالہ رہنمائے تعلیم قومی طرفداری سے پورے طور پر مبرا اور دلکش اور قابل دید مضامین کا بہترین مجموعہ ہوتا ہے۔ جو نوجوانوں کو شاہراہِ مستقیم پر گامزن ہونے کا ہادی اور رہنما ہے۔ سیکنڈری مدارس اور ڈیپارٹمنٹ کے لئے وہ بے حد مفید

اور منفعت بخش ہے۔

عالیجناب سردار بہادر سردار بشن سنگھ صاحب بی اے آئی ای ایس (ریٹائرڈ) سابق ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز جالندھر ڈویژن۔ پرنسپل خالصہ کالج امرتسر

آپ کے مفید ترین رسالہ کی نسبت میری رائے بدستور سابق نہایت اعلےٰ ہے۔ وہ صوبہ کے نہایت مفید رسائل سے ہے اور قیمتی اور سبق آموز رسالہ ہونے کی وجہ سے حقیقی طور پر سراہنے کے قابل ہے۔ اور ہر خاص و عام کا منظور نظر ہے۔ میں اس کی کامیابی کا تہ دل سے خواہاں ہوں۔

عالیجناب رائے بہادر مسٹر آتمارام صاحب ایم اے آئی ای ایس (رخصتی) ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز راولپنڈی ڈویژن

رہنمائے تعلیم کا مطالعہ نہایت مسرت بخش اور دلخوش کن ہوتا ہے۔ اس کی صورت نہایت دیدہ زیب اور اس کا وجود اس امر کا بدیہی ثبوت ہے۔ کہ وہ اپنی خوبی اور عمدگی کو پورے طور پر قائم رکھے ہوئے ہے۔ جب اس کا مطالعہ کرتا ہوں۔ اسے اسم بامسمی اور علمی ضیافت کا بے بہا دسترخوان پاتا ہوں۔ اس کی خوشحالی اور کامیابی میرے لئے بے حد طمانیت بخش ہوگی۔"

جناب ملک غلام رسول صاحب شوق ایم اے پی ای ایس ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس ضلع شاہ پور

"رہنمائے تعلیم بہت پرانا اور مفید رسالہ ہے۔ محکمہ تعلیم کا مشیر اور مدرسین کا ہمدرد ہے۔ اسکی خدمات قابل قدر ہیں۔ میں ہمیشہ اسے دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ اور اسکی اشاعت کو مفید سمجھتا ہوں۔ آج کل کی مالی مشکلات میں ایسے رسالوں کے لئے کچھ رقم نکال لی جائے۔ تو غنیمت ہے۔"

جناب لالہ رام چند صاحب بی اے پی ای ایس ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس ضلع ملتان

"آپ کا رسالہ روز بروز مضامین اور چھپائی کے لحاظ سے نمایاں ترقی پر ہے۔ اور مدرسین کے لئے بہت مفید ہے۔ یہ رسالہ کافی عرصہ سے محکمہ تعلیم کی خدمت بجا لا رہا ہے۔ اور اس وجہ سے محکمہ ہذا کی امداد و سرپرستی کا حقدار ہے۔"

خانصاحب مولوی الہ دین صاحب بی اے پی ای ایس ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس ضلع ہزارہ

"آپ کا رسالہ واقعی مفید ہے۔ مضامین موزون اور قابل قدر ہیں۔"

سالِ نو

(فصیح العصر تاجدارِ سخن تاج الشعراء حضرت نوح ناروی)

پھر مژدۂ عید آیا   پھر حسبِ امید آیا
پھر وقتِ کشید آیا   پھر دورِ وحید آیا
پھر لطفِ مزید آیا   پھر حکمِ اکید آیا
پھر سالِ جدید آیا

خوش طرز و ادا منظر   خوش وضع و خوشنما منظر
اندوہ ربا منظر   تصویرِ فنا منظر
مہ جود و عطا منظر   انوارِ خدا منظر
پھر سالِ جدید آیا

گلشن نہ کبھی چھوٹے   چھائی نہ کوئی کوٹے
دن رات مزے لوٹے   کس واسطے دل ٹوٹے
شاخوں سے دمک چھوٹے   کچھ اور اُگیں بوٹے
پھر سالِ جدید آیا

عالم میں خوشی چھائی   دنیا نے بڑی پائی
تقدیر اڑا لائی   انداز پر اترائی
زحمت بڑی فرمائی   خود کھنچتی ہوئی آئی
پھر سالِ جدید آیا

آئین بدل جائیں   بیمار سنبھل جائیں
مغموم بہل جائیں   غم آپ ہی ٹل جائیں
ارمان مچل جائیں   فی الفور نکل جائیں
پھر سالِ جدید آیا

کیا خوب نئے ڈھب ہیں   مصروفِ طرب سب ہیں
ناشاد و حزیں کب ہیں   ممنونِ کرم اب ہیں
بے اذن یونہیں جب ہیں   فطرت کے یہ کرتب ہیں
پھر سالِ جدید آیا

بادل کی سیہ پوشی   بجلی کی ضیا کوشی
خورشید کی سرجوشی   مہتاب کی مدہوشی
انجم کی ہم آغوشی   رتال کی خاموشی
پھر سالِ جدید آیا

اے نوح تجھے الفت   نفرت سے رہے نفرت
ایک ایک کرے عزت   راحت ملے ہر ساعت
ملت سے بڑھے قوت   ہوں رنج و الم رخصت
پھر سالِ جدید آیا

کلامُ الملوک مُلوکُ الکلام

(ہز اگزالٹیڈ ہائی نس اعلیحضرت حضور نظام نواب سر میر عثمان علی خاں بہادر آصف سابع سلطان دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہٗ)

گل ترے عشق میں ہیں چاک گریباں کیا کیا
دیکھ کر تجھ کو ہوا آئینہ حیراں کیا کیا

پھر وہی چھیڑ ہے قاتل سے وہی خنجر سے
پھر مرے دل نے کئے قتل کے ساماں کیا کیا

چشمِ جاناں کی محبت میں خبر تھی کس کو
دل پہ ڈھائیگی ستم گردشِ دوراں کیا کیا

یہ ادائیں، یہ کرشمے، یہ غضب کے انداز
نظر آتے ہیں مری جان کے خواہاں کیا کیا

ضبط کی تاب تہِ خنجرِ قاتل نہ رہی
تپشِ دل نے کیا مجھ کو پشیماں کیا کیا

کیا کہوں رنگ ہے کیا عشوہ گری کا اے دل
دھوکے دیتی ہے مجھے صورتِ جاناں کیا کیا

ہوسِ وصل کو تھوڑا نہ سمجھنا عثمان
رنگ دکھلائے گا یہ خواب پریشاں کیا کیا

سلطان العلوم حضور نظام شاہ دکن

خاندان شاهی

رہنمائے تعلیم کا دورِ حیات

بیسویں صدی کا آغاز ہے۔ سررشتہ تعلیم پنجاب کی عنانِ حکومت ڈاکٹر جے سائم صاحب مرحوم کے ہاتھوں سے نکل کر مسٹر ڈبلیو بیل کے سپرد ہوئی۔ آپ نے اپنے پیشرو کی لکیر کا فقیر نہ رہ کر ہر ضلع میں ایک ایک گورنمنٹ ہائی سکول قائم کیا اور حتی الامکان بہتر سے بہترین سٹاف مہیا کیا۔ ڈاکٹر سائم صاحب کا مقولہ کہ "۳۰ روپیہ ماہانہ یا ایک روپیہ روزانہ ہندوستانیوں کے لئے شاہزادوں کی تنخواہ کے برابر ہے" غلط کر دیا گیا۔ اور بیل صاحب نے بہت اعلےٰ تنخواہیں دے کر اسوقت کے حالات کے موافق نہ صرف صوبہ پنجاب سے بلکہ دیگر صوبجات سے بھی قابل آدمی تلاش کئے۔ اور ان گورنمنٹ ہائی سکولوں کو نمونہ کا سکول بنانے میں اپنی جانب سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ افسرانِ معائنہ کی ذیل میں ہر ضلع میں ایک ایک اے ڈی آئی صاحب کا تقرر عمل میں آیا۔ گریڈ بندی نئی ہو کر ماتحت تعلیمی ملازمت کی سکیم شائع کی۔ اور کایا پلٹ کا نمونہ دکھایا گیا۔ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں بھی جہاں بلڈنگ میں توسیع روا رکھی گئی۔ وہاں ممبرانِ سٹاف کی ازدیادی بھی عمل میں آئی۔ گویا اسکی زندگی میں بھی ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ چنانچہ اس نئے دور کے آغاز میں سردار جگت سنگھ صاحب مالک رسالہ رہنمائے تعلیم کو سنہ ۱۹۰۴ اور سنہ ۱۹۰۵ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج کی ایس وی کلاس میں داخل ہونے کا موقعہ ملا۔ آپ نے سررشتہ کے نئے حالات اور اپنے کالج کے پروفیسر اصحاب کے اسباق اور فیضانِ صحبت سے متاثر ہو کر جہاں اپنی علمی قابلیت میں اضافہ کیا۔ وہاں یہ جذبہ بھی اپنے دل میں لیا۔ کہ نئے اصولِ تعلیم (کنڈر گارٹن۔ سلے موڈلنگ وغیرہ) اور نئے تجربات جو تعلیمی دنیا میں عمل میں آ رہے ہیں۔ اپنے بھائیوں تک پہنچانے چاہئیں۔ چنانچہ "ہر کسے را بہر کارے ساختند" کا مقولہ آپ کی ذات پر صادق آتا ہے۔ کیونکہ آپ نے برخلاف دیگر متعلمین ایس وی۔ جے اے وی و ایس اے وی اس جذبہ کو عملی صورت دینا شروع کیا۔ اور سنٹرل ٹریننگ کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے وطن مالوف پنڈی گھیپ سابق ضلع راولپنڈی حال ضلع اٹک سے جو صوبہ کے ایک دور افتادہ گوشہ میں ہے۔ رسالہ "رہنمائے تعلیم" جاری کرنے کی ٹھانی۔ آپ کی نیک طینتی اور جذبہ خدمتگزاری کا نتیجہ ہے۔ کہ رسالہ رہنمائے تعلیم جو اپنی قسم کا پہلا ہی رسالہ کہا جا سکتا ہے۔ آج اس قابل ہے۔ کہ اپنی پچیس سالہ نمایاں خدمات کی خوشی میں اپنی جوبلی منا رہا ہے۔

پنڈی گھیپ میں پریس کا نام و نشان نہ تھا۔ آپ یکہ و تنہا اسے تیار کر کے ہر ماہ راولپنڈی آ کر اسے

زیورِ انطباع سے مزین کرکے خریداران تک پہنچاتے۔ اس وقت کے پرچے جن اصحاب کے مطالعہ سے گزرے ہونگے۔ وہ جانتے ہیں کہ رسالہ مختصر صورت میں ایک دل لبھانے والی چیز کا آغاز تھا۔ چونکہ قدرت کو اسے پروان چڑھانا تھا۔ اس لئے اسکی بہتری کا سامان خود بخود ظہور میں آیا۔ یعنی ایس وی میں اوّل رہنے کی وجہ سے سردار صاحب کو گورنمنٹ سروس میں لیا گیا۔ اور آپ سنٹرل موڈل سکول لاہور میں ورنیکلر ٹیچر ہو کر آ گئے۔ لاہور میں جہاں ہر قسم کی ضروریات حسب دلخواہ مہیا ہو سکتی تھیں۔ آپ نے رہنمائے تعلیم کی حالت کو اسوقت کے حالات کے موافق سدھارا۔ اور خریداران کی دلچسپی کا موجب ہوتے رہے۔ حسنِ اتفاق سے قریشی طالب علی صاحب پابند جوان دنوں غالباً معین الطلباء نامی رسالہ نکالا کرتے تھے۔ آپ سے ملے۔ اور انہوں نے سردار صاحب رہنمائے تعلیم کی مشترکہ خدمت گزاری کی آرزو کی۔ چنانچہ ہر دو اصحاب کے اتفاق سے رسالہ ۱۹۲۲ء تک سررشتہ تعلیم پنجاب کی خدمات۔ اور مدرسین بھائیوں کی وکالت کے فرائض سرانجام دیتا رہا۔ اس موقعہ پر یہ ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا۔ کہ قدرت کی فیاضی اس ہونہار کے شاملِ حال رہی اور سررشتہ تعلیم کے حکام اعلےٰ نے اس کی سرپرستی فرماکر اسے مفتخر فرمایا۔ اور جہاں ہیل صاحب نے اس کے جاری رکھنے کی اجازت عطا کی۔ وہاں آنریبل مسٹر جے سی گاڈلے نے تمام سرکاری سکولوں میں اس کی خریداری کے لئے خاص سرکلر جاری فرمائے۔ اور ان ہدایات کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ رہنمائے تعلیم کی اشاعت میں آئے سال اضافہ ہوتا گیا۔ سردار صاحب اور قریشی صاحب کے مشترکہ عہد میں رسالہ کا دربار نمبر اور ڈسٹرکٹ انسپکٹر نمبر خاص نمبر تھے۔ جن کی ہزارہا کاپیاں سررشتہ اور پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی نے خرید فرماکر صوبہ کے سکولوں میں بہم پہنچائیں۔ اور اسطرح رسالہ کی سرپرستی فرماکر اسکی شہرت میں اضافہ کیا۔

اس عرصہ میں اگرچہ مختلف اوقات میں چند اور تعلیمی رسالے بھی معرضِ وجود میں آئے۔ مگر حالات کے موافق نہ ہونے سے اپنی زندگی قائم نہ رکھ سکے۔ اسے رہنمائے تعلیم کی خوش قسمتی کہو یا اس کے مالک اور قابل اڈیٹر کی نیک نیتی اور جذبہ خدمتگذاری، کہ اس نے جہاں ملک میں مضمون نگاری اور انشاپردازی کا مذاق پیدا کیا۔ وہاں اپنے حالات کو بہتر سے بہترین بنا کر اپنی ذات کو آفات کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار کیا۔ غرض کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۲ء تک کا عرصہ رسالہ کی واحد خدمتگذاری کا عرصہ تھا۔ اپریل ۱۹۲۲ء سے قریشی صاحب نے اپنا ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔ اور قدرتاً اپنے کام کو جاری رکھنے کے لئے انہیں اپنے پیارے رہنمائے تعلیم سے بچھڑنا پڑا۔

مگر اس کی خوش قسمتی قابلِ رشک ہے۔ کہ ایک دیرینہ رفیق کی سرپرستی سے علیحدہ ہو کر اسے بہت دنوں بھٹکنا نہ پڑا۔ بلکہ سردار صاحب کے اظہارِ حال پر لالہ لچھمی چند صاحب ودیارتھی نے اس کی اعزازی خدمتگذاری کا بیڑا اٹھایا۔ راقم الحروف کو بھی جون ۱۹۲۲ء سے ہی ودیارتھی صاحب کی رفاقت کا فخر حاصل ہوا۔ اور

رہنمائے تعلیم کی کارگذاری دو دوستوں کی بجائے تین ہاتھوں میں آگئی۔ جس کا پہلا اور بدیہی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی ضخامت میں معتدبہ ترقی ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۲۲ئہ کے پہلے پانچ چھ پرچوں کے مقابلہ میں اس کے آخری چھ پرچے بہت ضخیم نکلے۔ اور ان میں حالات حاضرہ کے تمام کوائف۔ تحاریک علمی کی اشاعت اور مفید عامہ مضامین کے ساتھ زیر تربیت اطفال کی پرورش اور ان کے مذاق تحریری میں دلچسپی بڑھانے کی خدمت اس نے اپنے ذمہ لی۔ اور اسے اور اس کے علاوہ موجودہ ایڈیٹوریل سٹاف کو بجا فخر ہے کہ "گلدستۂ اطفال" نامی حصہ رہنمائے تعلیم کی جدتِ طبع کا نتیجہ ہے۔ جس کی تقلید میں اب کوئی تعلیمی رسالہ یا اخبار اس حصہ سے خالی نہیں۔ اس کے دیگر مضامین اور مسودے بھی ہمعصروں کی رہنمائی کا موجب ہوتے رہے۔ بلکہ بعض احباب نے تو اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک نقطہ کی نقل کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔

چونکہ صوبہ میں رہنمائے تعلیم کے کئی ہمعصر عالم وجود میں آچکے تھے۔ اس لئے بعض حالات میں فیما بین مقابلہ اور رشک کے ساتھ ایک سرحرفی جذبہ کا وجود بھی منصۂ شہود پر جلوہ افروز دکھائی دیا۔ مگر رسالہ کی خدمتگذاری اور اس کے قابل مالک کی ایثار نفسی ہے کہ وہ ہر ایسے کڑے امتحان میں پورا اترا۔ اور "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" کے مقولہ کا عامل و قائل رہا۔ اس دور میں جسے رسالہ کی کایا پلٹ کا دور کہنا ہرگز بے جا نہیں۔ صوبہ میں بدقسمتی یا خوش قسمتی سے فرقہ داری اور جنبہ داری کا جذبہ ظہور میں آیا۔ اور اگرچہ رسالہ اپنے پاؤں پر کھڑا رہا۔ مگر یہ کہنا پڑتا ہے کہ اسکی خدمتگذاری اور اس کے جذبۂ کارگزاری کی قدر اور منزلت اسکے حالات کے موافق نہ ہوئی۔ بلکہ بعض حلقوں میں اسکی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بھی اسکی سرپرستی سے اعراض کیا گیا بہرحال خدائے کریم کی عنایات کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کہ وہ اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری میں کسی ہمعصر سے پیچھے نہیں رہا۔ بلکہ آئے دن نہ صرف احباب سے بلکہ افسرانِ اعلیٰ سے بھی خراجِ تحسین و آفرین حاصل کرتا رہا ہے۔

اگرچہ سردار صاحب کو سرکاری ملازمت میں داخل ہوتے ہی مسٹر ڈبلیو بیل ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب کی بارگاہ سے رسالہ جاری رکھنے کے احکام مل چکے تھے۔ مگر کسی نہ کسی وجہ سے (جس کا اظہار اس وقت مناسب نہیں) اس کا ذکر لیجسلیٹو کونسل پنجاب میں بھی جا پہنچا۔ اور ع

"ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے"

کا مقولہ اسکی ذات پر صادق آیا۔ چونکہ رسالہ کے اجرا سے مالی منفعت مقصود نہ تھی۔ بلکہ عامۂ خلایق کی رہنمائی اور سررشتۂ تعلیم پنجاب کے اغراض و مقاصد کی بجا اشاعت کے ساتھ کس مپرس فرقہ مدرسین کی وکالت اس کا منتہائے مقصود تھا۔ لہذا اسکی ذات پر یہ حملہ جو اسکے دوست نما اصحاب کی عنایات کا نتیجہ تھا

اسکی استقامت کا موجب ہوا - اور " خدا شرّے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد" کے مصداق گورنمنٹ پنجاب (وزارت تعلیم) کی بارگاہ سے اس کے اجرا پر تصدیق کی مہر ثبت کی گئی - اور سردار صاحب کو اسکی خدمتگزاری کی اجازت از سر نو عطا کی گئی۔

نئے دور کا دور جدید اسکی شکل وصورت میں اضافہ کے علاوہ فخر الشعرا حضرت جوش ملسیانی اور طالب کاشمیری کی شمولیت لئے ہوئے ہے - گذشتہ سال سے تاج الشعرا فصیح العصر نا خدائے سخن حضرت نوح ناروی جانشین داغ مرحوم نے اسے اپنی خاص سرپرستی میں لیا ہے - دو تین سال مولانا ادیب لوکانوی نے بھی شامل ادارہ رہکر اس کی خوبیوں میں اضافہ فرمایا - مگر اپنی مصروفیات کی وجہ سے اسکی ہمراہی کو قایم نہ رکھ سکے - موجودہ حالت میں تعریف و توصیف میرا منصب نہیں - بلکہ اس کے مربیوں اور قارئین کرام کا کام ہے - البتہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا - کہ وہ رسالہ رہنمائے تعلیم جس نے صوبہ کے ایک گوشہ میں جنم لیا تھا - اپنے قابل وفیاض مالک کی آغوش محبت میں تربیت پاکر اس قابل ہو چکا ہے - کہ تعلیمی رسائل کی صف سے ممتاز ہوکر اپنی خدمات کے لئے ادبی دنیا کا منظورِ نظر ہوگیا ہے - اور ہر مذاق کا اردو داں اسکے مطالعہ سے بہرہ اندوز ہونا باعث فرحت وشادمانی خیال کرتا ہے اور اسکی تعریف میں بے اختیار رطب اللسان ہوتا ہے -

اس کا جوبلی نمبر اس امر کی شہادت ہے - کہ وہ چوٹی کے ادیبوں اور ملک کے یگانہ روزگار ناشروں اور ناظموں کا منظورِ نظر ہی نہیں - بلکہ وہ اسے اپنے شاہکاروں کی اشاعت کا بہتر سے بہترین ذریعہ مانتے ہیں - اور اس کے عنایت فرماؤں کا حلقہ نہایت وسیع اور انکی عنایات اس کے حال پر اس طرح سے مبذول ہو رہی ہیں - کہ اسکا سر ان کے شکریہ میں خود بخود جھکا ہوا ہے - اور وہ مصداق " خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست" دل ہی دل میں ان کی توجہات کا شاکر اور ان کی ایزادی جاہ وجلال کا داعی ہے -

(مسیح لوا)

حضور گورنر پنجاب پر مہلک حملہ

۲۳ر دسمبر ۱۹۳۰ء پنجاب یونیورسٹی کانوکیشن کی صدارت فرماکر جب ہز ایکسلنسی سر جیوفری ڈی مانٹ مورینسی گورنر پنجاب وچانسلر یونیورسٹی حسب معمول جلوس کی صورت میں یونیورسٹی ہال سے تشریف لے جانے لگے تو کسی شوریدہ سر نوجوان نے ہال کے اندر سے ہی حضور ممدوح پر پستول سے فائر کئے جس سے نواب حضور والا کے بازو اور پشت پر زخم آگئے - خوشی کی بات ہے کہ نواب گورنر بہادر اس مہلک حملے سے بال بال بچ گئے - جس پر حضور کی خدمت میں رہنمائے تعلیم اور اس کے کارکنان خصوص دل سے مبارک باد عرض کرتے ہیں -

اس مہلک حملے پر اظہار نفرت اور حضور ممدوح کی خدمت میں مبارک باد عرض کرنے کے کئی ریزولیوشن صوبہ کے سکولوں اور افسران تعلیمی کی طرف سے موصول ہوئے ہیں - مگر جوبلی نمبر کے پریس میں جا چکنے کی وجہ سے ہم تفصیلات میں جانے سے معذور ہیں - (مسیح لوا)

رہنمائے تعلیم

(فصیح العصر ناخدائے سخن تاج الشعرا حضرت نوح ناروی جانشین جناب داغ دہلوی)

ساقی نگہِ کرم ادھر کر ساقی مرے حال پر نظر کر
مینا و سبو سنبھال ساقی ایک ایک ہوس نکال ساقی
ساقی یہ نہیں نہیں غضب ہے ساقی یہ نہیں مناسب اب ہے
دے دے مجھے کوئی جام ساقی ناکام ہو شاد کام ساقی
مطرب سرِ بزم چپ رہے کیوں مطرب نہ زباں سے کچھ کہے کیوں
رُوپوش کہاں ہے آئے مطرب خاموش عبث ہے گائے مطرب
مطرب کی ادا بھی قہر ڈھائے مطرب کی صدا بھی قہر ڈھائے
گذری حدِ احتراز مُطرب اُف غمزۂ شوخ و نازِ مُطرب
توبہ کے قدم اکھڑ چکے ہیں زہاد سے رند لڑ چکے ہیں
لے کون خبر حواس کس کو تقوے کا لحاظ و پاس کس کو
بدلی ہوئی نیتیں ہیں سب کی بگڑی ہوئی عادتیں ہیں سب کی
مے خوار کو احتیاج کیسی کل کے لئے فکر آج کیسی

ہیں محوِ نشاط جینے والے ‏ پیتے ہیں شراب پینے والے
بھٹی سے دھواں نکل رہا ہے ‏ پیمانے کا دَور چل رہا ہے
گردوں پر اٹھا وہ ابر کیسا ‏ جب ابر اٹھا تو صبر کیسا
جو شے ہے وہ حسبِ حال شے ہے ‏ شیشہ ہے جدید کہنہ مے ہے
دم عیش و خوشی کا بھرنے والی ‏ بوڑھوں کو جوان کرنے والی
دن رات ترنگ اور دل ہے ‏ ہے دل کی امنگ اور دل ہے
افکار سے دُور ہے زمانہ ‏ ممنونِ سرور ہے زمانہ
گلزارِ جہاں کے رنگ بدلے ‏ سو رنگ سے رنگ ڈھنگ بدلے
نکھری ہے بہت چمن کی صُورت ‏ گویا ہے نئی دلہن کی صُورت
ہر سمت صبا پکار آئی ‏ دوڑو چلو پھر بہار آئی
عالم ہے عجب کلی کلی پر ‏ نزہت ہے فدا شگفتگی پر
لالے کے جگر کا داغ چمکا ‏ جو گل نہ ہو وہ چراغ چمکا
انگڑائیاں سبزہ لے رہا ہے ‏ شبنم کو دعائیں دے رہا ہے
کیا خوب ہے سادگی سمن کی ‏ مرغوب ہے وضعِ نسترن کی
ظاہر میں حنا کا ڈھنگ کچھ اور ‏ باطن میں حنا کا رنگ کچھ اور
سوسن کی زبان کھل گئی ہے ‏ پھولوں کی دوکان کھل گئی ہے

بیلوں میں ہے پیچ وخم بلا کا	انداز ہے کاکلِ دوتا کا
کس کام کے آبدار موتی	ہیں موتیے پر نثار موتی
شمشاد کا مرتبہ بڑا ہے	پہرے کو یہ سنتری کھڑا ہے
حسرت نہیں خار کو خلش کی	دل چسپ روش روش روش کی
جھک جاتا ہے جس سے آسماں تک	ہے سرو میں سرکشی یہاں تک
پتّی جو ہے وہ ہری بھری ہے	اک حُور ہے دوسری پری ہے
دنیا سے جدا انار کا حسن	عالم سے الگ چنار کا حسن
جوہی ہے کھلی چنبیلیوں میں	رانی ہے سکھی سہیلیوں میں
ریحان میں ہے آن بان کیسی	سنبل میں ہے کھینچ تان کیسی
بھونروں کا اِدھر اُدھر ہے مجمع	کم تر نہیں بیش تر ہے مجمع
گو حوض میں غرق سر بسر ہے	کب نقش بر آب نیلوفر ہے
چمپا کا بناؤ ہے نرالا	شبو کا سبھاؤ ہے نرالا
موقع سے دھرے ہوئے ہیں گملے	پودوں سے بھرے ہوئے ہیں گملے
نکہت کا خزانہ کیتکی میں	مہتاب کا نُور چاندنی میں
گھنگھور گھٹا تہِ فلک ہے	بجلی کی تڑپ چمک دمک ہے
چھڑکاؤ کا لطف مل رہا ہے	فوّاروں کو جوش آگیا ہے

سب اونچے سروں میں گا رہے ہیں
بے پر کی طیور اڑا رہے ہیں

کوکو بھی ہے اور پی کہاں بھی
نغمے کی ہے شکل میں فغاں بھی

دنیا کی ہوا بدل گئی کیوں
جو پھانس تھی وہ نکل گئی کیوں

ہلچل سی مچی ہوئی ہے کیسی
شادی سی رچی ہوئی ہے کیسی

کیوں بزمِ ادب عروج پر ہے
کیوں حسنِ خیال پر نظر ہے

کیوں نظم کا قدرداں ہے عالم
کیوں نثر کا مدح خواں ہے عالم

اسرارِ نہاں وہ کھولتا ہے
جو تارِ رباب بولتا ہے

محفل میں ہیں جمع اہلِ دل کیوں
بیٹھے ہیں قریب و متصل کیوں

تعلیم کی داستاں زباں پر
تعلیم کی خوبیاں زباں پر

تعلیم کا ذوق ہر کسی کو
تعلیم کا شوق ہر کسی کو

تعلیم کے مرتبے بڑے ہیں
تعلیم سے کام بن پڑے ہیں

تعلیم وسیع سلطنت ہے
تعلیم خراجِ مملکت ہے

تعلیم ہی کارِ اولیں ہے
تعلیم نہیں تو کچھ نہیں ہے

تعلیم سے ہاتھ دھو چکے تھے
تعلیم کو لوگ رو چکے تھے

رائج تھے وہی قدیم دستور
نافذ تھے وہی قدیم دستور

تہذیبِ جدید کی نئی شان
ہر شان میں بھی کئی شان

جو کورس ہے ٹھیک ہے بجا ہے ۔۔۔ اسکول جو ہے بہت سجا ہے

اوراقِ کتاب پر نگاہیں ۔۔۔ تقسیمِ حساب پر نگاہیں

جغرافیہ رٹ رہا ہے کوئی ۔۔۔ تاریخ الٹ رہا ہے کوئی

ہشیار تھے ماسٹر **جگت سنگھ** ۔۔۔ سمجھے اسے پیشتر **جگت سنگھ**

ذی علم ہیں اللہ ذی ہنر بھی ۔۔۔ ذی جاہ ہیں اور ذی اثر بھی

سب طور طریق جانتے ہیں ۔۔۔ پایاب و عمیق جانتے ہیں

لذاتِ جہاں کے چکھنے والے ۔۔۔ کھوٹے کھرے کے پرکھنے والے

کوشاں یہ ہوئے برائے تعلیم ۔۔۔ جاری کیا **رہنمائے تعلیم**

دلچسپیِ امتیازِ تعلیم ۔۔۔ سرگرمیِ سوز و سازِ تعلیم

ہر ماہ میں وقت پر نکلنا ۔۔۔ افکار ہوں کچھ مگر نکلنا

حاضر ہے یہاں وہاں رسالہ ۔۔۔ جاتا ہے کہاں کہاں رسالہ

اربابِ خرد کا مدعا ہے ۔۔۔ یارانِ سخن کا آسرا ہے

مضمون کوئی ادق نہیں ہے ۔۔۔ دشوار کوئی سبق نہیں ہے

اِن میں ہے وہی نفیس اردو ۔۔۔ کہتے ہیں جسے سلیس اردو

پاکیزہ ہے خطِ عبارت اچھی ۔۔۔ اچھا ہے قلم کتابت اچھی

پچیس برس گذر گئے ہیں ۔۔۔ آفاق میں نام کر گئے ہیں

ہے وجہ یہی ہنسی خوشی کی | تقریب ہے آج جوبلی کی
یہ جشنِ طرب فزا مبارک | یہ بزم جہاں نما مبارک
یہ عیش ہو جاوداں مبارک | یہ وقت ہو یہ سماں مبارک
ودیارتھی ہیں مدیر اس کے | سوجی سے ہیں دستگیر اس کے
بے مثل و نظیر لچھمی چند | حامی و مدیر لچھمی چند
اقبال ہے خود نثار ان پر | ہے رحمتِ کردگار ان پر
تکمیلِ کمال کس قدر ہے | بی اے ہیں یہ وصف مختصر ہے
آمادۂ کار آگیا رام | با عزّ و با وقار آگیا رام
سمجھاتے ہیں نیک و بد ہمیشہ | فرماتے ہیں رد و کد ہمیشہ
اخلاق و وفا سے کام لینا | جو گرتے ہوں ان کو تھام لینا
طالب کی طلب کا پوچھنا کیا | اسلوب و سبب کا پوچھنا کیا
مصروفِ توجہات رہنا | دن رہنا اسی میں رات رہنا
توسیعِ ہنر کی آرزو ہے | کھوئے ہوئے فن کی جستجو ہے
کیا وصفِ جنابِ جوش لکھئے | غارت گرِ صبر و ہوش لکھئے
اندازِ کلام اثر میں ڈوبا | نشتر کی طرح جگر میں ڈوبا
ہر مطلع ہے آفتاب ان کا | ہر مقطع ہے لاجواب ان کا

جو مصرع ہے انتخاب ہے، وہ　　جو شعر ہے کامیاب ہے، وہ

جو حرف وہ حرف دل نشیں ہے　　جو لفظ وہ لفظ نازنیں ہے

ترتیبِ غزل ہو سست کیونکر　　تخئیل ہو نادرست کیونکر

خوش فکر ہیں خوش دماغ یہ ہیں　　شاگردِ رشیدِ داغ یہ ہیں

اسلاف کی یادگار ٹھہرے　　تاجِ سرِ افتخار ٹھہرے

کہنا تھا جو کچھ وہ کہہ چکا ئیں　　اللہ سے مانگ لُوں دُعا ئیں

جاری رہے حشر تک رسالہ　　چھپتا رہے بے دھڑک رسالہ

ہر باغ میں پھیلے نکہت اِس کی　　ہر ملک میں پہنچے شہرت اس کی

مشتاقِ لقا ہو سارا عالم　　قربان و فدا ہو سارا عالم

یارانِ ادب رہیں سلامت　　سب خوش رہیں سب رہیں سلامت

پھر دیکھیں بہار جوبلی کی　　پھر آئے گھڑی ہنسی خوشی کی

پھر لطف اٹھائے روح اپنی

پھر دھوم مچائیں نوح اپنی
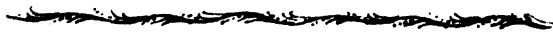
ارشاداتِ عالیہ

(عالیجناب جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر حضرت جلیل استاذ السلطان فرمانروائے دکن)

وہ اُن کا پیار سے ملنا وہ ہم آغوش ہو جانا | وہ میرا اُس کی قدرت دیکھ کر بیہوش ہو جانا

ہوا اچھا مرے حق میں جنوں کا جوش ہو جانا | وہ کہتے ہیں کہ اب بیکار ہے روپوش ہو جانا

عجب استاد ہے مستی بھری تیری جوانی بھی | سکھایا جس نے تجھ کو بے پئے مدہوش ہو جانا

کریں وہ قتل کیوں کر رشک سے دیکھا نہیں جاتا | عروسِ مرگ سے عاشق کا ہم آغوش ہو جانا

دمِ نظارہ آجائے حیا اے جاں تو آنے دو | مری پلکوں کی چلمن ڈال کر روپوش ہو جانا

بھلا دیتا ہے ساری کلفتیں شبہائے ہجراں کی | تصوّر میں کسی کا زینتِ آغوش ہو جانا

وہ زانو پر دھرے ہیں سر مرا قسمت یہ کہتی ہے | مبارک ہو جمالِ یار سے بے ہوش ہو جانا

فقط شب بھر کی رونق ہے یہ ساری بزمِ ہستی کی | پکارے کہہ رہا ہے شمع کا خاموش ہو جانا

اثر ہو یا نہ ہو اے بلبلِ ناشاد کیا کم ہے | تری فریاد پر گل کا سراپا گوش ہو جانا

رہے محفوظ رازِ بزمِ خلوت مدعا یہ ہے | نہیں حکمت سے خالی شمع کا خاموش ہو جانا

تری شکلِ خیالی بھی نہیں کم تجھ سے شوخی میں | ابھی نظروں میں پھرنا اور ابھی روپوش ہو جانا

حقیقت میں پتہ دیتا ہے در پردہ محبت کا
جلیل اُن کا تمہارے نام پر خاموش ہو جانا

RISALA "RAHNUMA-I-TALIM"
Ramgali, LAHORE.

استاذ السلطان نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل القدر حافظ جلیل حسن صاحب جلیل جانشین حضرت امیر مینائی رح

فہرستِ مضامین

S. INAYAT.

بہشت کی تلاش

(خانصاحب راجہ فاضل محمد خاں صاحب - بی - اے - پی - ای - ایس ڈپٹی انسپکٹر مدارس جالندھر ڈویژن)

کسی معلم کا قول ہے کہ "اعلیٰ درجے کی نتیجہ خیز تعلیم وہ ہے جو کسی قوم یا جماعت کی اُس جدوجہد کی مظہر ہو۔ جس سے اُس کی تہذیب - اس کا تخیل اور اس کی تمنا کا اثر آنیوالی نسلوں پر پڑے"۔ یوں تو تعلیم بنی نوع انسان کی آفرینش کے وقت سے ہی اُس کے لوازمات زندگی کا جزو لاینفک ہے۔ اور مکتبوں - پاٹھ شالوں مسجدوں اور مندروں کی تقدیس کا بنیادی پتھر بھی رہا ہے۔ مگر زمانہ کی بدلتی ہوئی ضروریات اور انسان کی نت نئی خواہشات کے ساتھ ساتھ تعلیم کا نصب العین بھی تغیر پذیر ہوتا رہا۔ اگر کسی وقت تعلیم مذہب کے صحیح اوراک اور صفات الٰہیہ کے بالتوضیح انعکاس کیلئے ضروری سمجھی گئی تاکہ انسان حسن معاد کیلئے تیار ہو تو ایک وقت یہ بھی آیا کہ اُسے حصول معاش کا ذریعہ سمجھنا پڑا۔ یہ دونو وقت آناً فاناً ڈھل گئے۔ اور تعلیم کا نقطۂ نگاہ وسعت پذیر ہونے لگا۔ اور وہ نسل انسانی کے بہترین ذرائع ارتقا کا مصدر سمجھی جانے لگی۔ الغرض اس کے مقاصد ضروریات وقت کے لحاظ سے کسی نام سے موسوم ہوئے ہوں مگر حقیقتاً اس کا عام مدعا انسان کی حالت کو بہتر بنانا اور زندگی کو خوش اسلوبی سے بسر کرنا سکھانا ہے۔ چنانچہ نتیجہ خیز تعلیم وہی ہو سکتی ہے جس کا انجام اس مدعا کا حصول ہو۔ ایسی تعلیم جس قوم یا جماعت کے افراد کا مطلوب بنے اُن کی جدوجہد سے اس امر کا پتہ ضرور چلنا چاہیئے کہ اُن کی تہذیب ان کی سوچ بچار - اُن کا تفکر و تدبر - اور اُن کا غور و خوض آنیوالی نسلوں کی بہتری اور بہبودی کیلئے ہے۔ اور اُن کے بچوں کی جسمانی - روحانی اور دماغی ترقی اُن کی دلی تمنا ہے۔

اس ملک میں موجودہ نظام تعلیم قریب قریب ایک صدی سے جاری ہے اور اب اس بات کے پرکھنے کا وقت ہے کہ اس کے نتائج مذکورہ بالا معیار کے مطابق کس حد تک امید افزا ثابت ہوئے۔ بالفاظ دیگر ہماری بدلتی ہوئی تہذیب - ہمارا جدید تخیل اور ہماری نئی تمنا آنیوالی نسلوں پر کہاں تک اثر ڈالنے میں کامیاب نظر آتی ہے۔ آیا ہمارے بچے اور نوجوان اس معیار کے مطابق شاہراہ ترقی پر گامزن ہیں اور آئندہ پیدا ہونے والے بچوں کے قابل باپ بن رہے ہیں؟ - تعلیم نے گذشتہ تیس سال میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ترقی کی ہے۔ مگر کیا اُس کا انجام وہی نظر آرہا ہے جو ہمارا مدعا ہے؟ پیشتر اس کے کہ اس قسم کے سوالات کے جوابات زیر غور ہوں۔ اور تعلیم حاضرہ کی خصوصیات کسی معیار پر پرکھی جائیں ہمیں دیانت داری سے سوچنا چاہیئے۔ کہ آیا ہمارے تخیل کی پرواز ہمارے نصب العین سے بخوبی آشنا ہے۔ اور اُس کے مفہوم کو کماحقہٗ سمجھکر اُس کے حصول کے ذرائع پر قابو پا رہا ہے یا نہ ہے۔ کیونکہ

انسان کو کسی مدعا تک پہنچنے کے لئے بھی دو مرحلے طے کرنے پڑتے ہیں یعنی تخیّل مدعا اور تعیّن مدعا۔
تحصیل مدعا کے لئے جدوجہد ازاں بعد شروع ہوتی ہے۔ جب مدعا حاصل ہو جائے تو پھر اُس پر پڑتال کی ضرورت پیش آتی ہے۔ کہ آیا نتیجہ حسب مراد ہے اور ہماری تمنّا بر آئی ہے؟

نظریہ امورِ بالا جو تعلیم اِن خصوصیات سے معرّا ہو گی۔ وہ تعلیم تعلیم کہلانے کی مستحق نہیں کیونکہ اگر ہماری موجودہ نسلوں نے اس تعلیم سے اُن باتوں پر عمل پیرا ہونا نہیں سیکھا تو ہماری آنیوالی نسلوں کی بہتری کا بیج ابھی نہیں بویا گیا۔ مدرسوں کے اجرا اور طلبا کا نام ہی تعلیم نہیں۔ گو اب تک لفظِ تعلیم کا مفہوم یہی ہے۔ اور ملک کی آبادی کا ایک بڑا حصّہ اِسی مغالطے میں مبتلا ہے۔ مدرسوں میں طلبا کا باقاعدہ جانا اور دن کا کچھ حصہ مدرسے کے انضباط اوقات کے لحاظ سے وہاں گذارنا۔ چند مضامین کا رٹ لینا اور امتحان پاس کر لینا تعلیم یافتگی کی سند نہیں کہلا سکتا۔ کیونکہ صدیوں پہلے ایک بزرگ فرما گئے ہیں کہ کتابیں گدھے پر بھی لادی جا سکتی ہیں اور کتابوں کے زیر بار ہو کر گدھا انسان نہیں بن سکتا۔

لہذا صورت سوال یوں ہوئی۔ کہ صحیح معنوں میں تعلیم آئے تو کس طرح؟ اور موجودہ یا آئندہ نسلیں ان معنوں میں اصلی تعلیم کی طرف متوجہ ہوں تو کسطرح؟ اس کا جواب راہنمایان تعلیم کے لائحہ عمل کا نتیجہ ہونا چاہیئے۔ اور انہیں اپنی اپنی ذات پر ناقدانہ نظر دوڑا کر دیکھنا چاہیئے کہ وہ صحیح معنوں میں راہنما کہلانے کے مستحق ہیں۔ جس طرح ہر مدرسہ تعلیم گاہ نہیں ہو سکتا اسی طرح ہر مدرس معلم نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر ہر شخص صرف پودے کو پانی دینے اور کھاد ڈالنے اور نا ملائم موسم کی سختی سے اس کو بچانے سے باغبان نہیں ہو سکتا۔ بلکہ صحیح باغبانی کے لئے اس علم اور عمل کی ضرورت ہے جو پودے کے صحیح بیج کی شناخت۔ اس کے بونے کے موسم۔ اس کے نشوونما۔ اور اُس کے پھل کے امتیازی علامات کے پیدا کرنے میں ممد ہو۔ اگر پودے کی آئندہ بہتری اور اس کی جنس کی ترقی باغبان کی محنت پر منحصر ہے تو انسانی بچے کی منازل ارتقاء معلم کی جانفشانی اور جگر سوزی کی طالب۔ علم کی تحصیل اگر طالب علم کا مدعا ہے تو اس مدعا کے حصول کا تخیّل اور تعیّن معلم کے معلومات کا نقطۂ نگاہ۔ جبتک کہ معلم ہمہ دانی کے بلند مینارہ سے اتر کر طالب علم کی ہیچمدانی کے تاریک و تار غار کے مختلف کونوں میں اس کی طبیعت کے جواہر ریزوں کی تلاش میں سر نہ ٹکرائے اور ان کو اپنے علم کی برقی تاثیر سے جلا دینے کی محنت شاقہ برداشت نہ کرے۔ اور طالب علم کو ارتقائے جسمانی اور روحانی کی سیڑھیوں پر نہ چڑھائے۔ وہ معلم کہلانے کا مستحق کیونکر ہو سکتا ہے۔ اگر مدرس یہ مصیبتیں ملک کے ہونہار بچوں کی خاطر سہیگا۔ تو مدرسے کی سرزمین کے کسی نہ کسی گوشے سے اُس گمشدہ بہشت کا پتہ چلیگا۔ جہانتک پہنچنے کی تمنا میں نوجوان محنت، تدبر، استقلال، تحمل اور خود ضبطی کا زاد راہ مہیا کرنے کی کوشش کرینگے۔ اور اُن کا سلجھا ہوا دماغ اُن کے لئے خضر راہ کا کام دیگا۔ وہ اپنے حواس خمسہ کو صحیح طور پر استعمال کرنا سیکھینگے۔ اور تجسس

اور تحقیق کے دشوار گذار رستوں سے ابدی اطمینان اور اصلی تسکین کی وراثت حاصل کرینگے خوش نصیب ہے۔ وہ ملک جس کو ایسے معلم حاصل ہیں۔ اور جس ملک کی قسمت میں ایسے مدرس نہیں۔ اور جہاں ایسے مدرسے نہیں۔ اُن کے نوجوان "گم شدہ بہشت" کا پتہ لگانے میں سعی مدعاصل سے کام لے رہے ہیں۔ اور وہاں آنیوالی نسلیں وراثتاً اس بہشت کو حاصل کرنے کے ناقابل۔

پس ہر مدرس کا فرض اولین جب وہ اس پیشے میں داخل ہو یہ ہونا چاہیئے کہ وہ طلبا کو ایسے رستے پر چلائے جو سیدھا مذکورہ بالا منزل مقصود کو جاتا ہو۔ اس مطلب کے حصول کے لئے مدرس کو جہاں اپنے ذاتی علم کی وسعت کی ضرورت ہے۔ وہاں اس کے لئے ہر قدم پر اپنے طلبا کی فطرت۔ رجحان طبیعت اور اُن کے میلان جذبات کا مطالعہ ضروری ہے۔ تاکہ ان قدرتی عطیوں کو وہ ایسے ڈھنگ سے استعمال کر سکے۔ کہ طالب علم کی طبعی چستی اور دلی شوق اُس کے رفیق راہ بنیں۔ اور وہ دوسروں کے ساتھ ملکر ایسی خوش اسلوبی سے وہ راستہ طے کرنا سیکھے۔ کہ اس کے ہمراہی اُس کی مثال کی پیروی کریں۔ اور اس طرح سب ملکر "بہشت" میں داخل ہوں۔ یہ ہے۔ قومی یا جماعتی ترقی کا راز۔ اور مدرس ہے اس راز کے سنہری دروازوں کا کلید بردار۔

پس

اے بہشت کے کلید بردار! اپنی ذمہ واری سمجھ۔ اور بہشت کے ڈھونڈنے والوں کی حمایت کے فرض سے سبکدوش ہو کر بہشت کا وارث بن اور رہنما۔ تاکہ تیری مقبوضہ دودھ کی نہروں سے موجوہ اور آئندہ نسلوں کی پیاس بجھے اور تیرے میوہ دار درختوں سے اُن کی بھوک کا علاج ہو۔ یہ ہے۔ تیری امانت۔ جس کا بارِ گراں تو نے برضائے خود اپنے کندھوں پر لیا ہے۔ اُس میثاق کو یاد کر۔ جو اس امانت کا رہین بننے وقت تو نے بنی نوعِ انسان کے ساتھ باندھا تھا۔

سلک مروارید

۱۔ اگر کوئی غلطی تم سے ہوگئی ہے۔ تو اس کو خوب یاد رکھو۔ کہ آئندہ پھر نہ ہونے پائے۔
۲۔ تہذیب و اخلاق ایک انسانی جوہر ہے۔ جسکو انسان خود حاصل کر سکتا ہے۔
۳۔ نیک ذریعے سے اگر تھوڑا بھی ملے۔ تو اس کو بہت سمجھو۔

(گنگا رام عیسیٰ پور)

لیڈز ٹریننگ کالج

(جناب شیخ خادم محی الدین صاحب۔ ایم۔ اے ڈی انٹرمیڈیٹ کالج لائل پور)

انگلستان میں لیڈز کا ٹریننگ کالج یورپ بھر میں اپنی نظیر آپ ہے۔ یہ کالج اُن عورتوں اور مردوں کیلئے مخصوص ہے جو پبلک ایلیمنٹری (ابتدائی) سکولوں میں بحیثیت مدرسین کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اس کالج کی مجلس منتظمہ "لیڈز کی تعلیمی کمیٹی کے ماتحت "ٹریننگ کالج سب کمیٹی" کے نام سے موسوم ہے۔ ۱۹۰۷ء میں وہاں کی تعلیمی کمیٹی نے ایک عارضی کالج قایم کیا۔ تاکہ اُس میں مدرسین تربیت پائیں۔ پہلے پہل وہاں کے ایک زنانہ ہائی سکول سے عارضی طور پر ٹریننگ کالج کا کام لیا گیا۔ بعد ازاں اسی کالج کی مستقل بنیاد قایم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ اگلے ہی سال اس عمارت کی بنیاد رکھی گئی۔ ایک مخصوص کمیٹی کو کالج کے محل وقوع کا انتخاب کرنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ اُنہوں نے شہر کے ایک پُر فضا حصّے میں جس کا نام "بیکیٹ پارک" ہے۔ ایک معزز رئیس سے چالیس ایکڑ زمین خریدنے کا فیصلہ کر لیا۔ کچھ عرصے کے بعد کھیل کے میدانوں کے واسطے مزید زمین مہیا کی گئی۔ اور اس وقت اس ٹریننگ کالج کی مجموعی جائیداد معہ عمارات وغیرہ نوے ۹۰ ایکڑ رقبہ میں پھیلی ہوئی ہے۔

محلِ وقوع

کالج کا محلِ وقوع ایک بلند اور صحت افزا مقام ہے۔ جو ایسی درسگاہ کیلئے خاص طور پر موزوں ہے۔ یہ کالج ۴۴ ایکڑ کے ایک وسیع اور پُر فضا پارک کے مرکز میں، شہر کے رُخ پر واقع ہے۔ یہاں کی فضا خاموش ہے اور اس کے مشرق، شمال اور مغرب کی جانب بیس میل کا ایک زراعتی رقبہ دُور تک چلا گیا ہے۔ کالج میں نیچر سٹڈی۔ باغبانی۔ نخل بندی۔ اور علم نباتات کیلئے ایک خوبصورت باغ ہے۔ طلبا کے کھانے کی سبزیاں اُسی میں بوئی جاتی ہیں۔ پانی کا انتظام خاطر خواہ ہے۔ یونیورسٹی، مدارس، مارکیٹ۔ غرض سبھی طرف سے یہاں تک پہنچنے کے راستے ہیں۔ سب سے پُر لطف نظارہ اس کے ارد گرد کے وسیع جنگلات ہیں۔ جن میں سے مختلف اطراف میں سیرگاہوں کے راستے نکلتے ہیں۔ جابجا درختوں کی بہتات ہے۔ جن کے نیچے موسم گرما میں طلبا بخوبی مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ایک راستہ "ملکہ کا راستہ" کہلاتا ہے کیونکہ یہاں ۷ ستمبر ۱۸۵۸ء کو ملکہ وکٹوریا آنجہانی لیڈز کے ٹاؤن ہال کا افتتاح کرنے کیلئے تشریف لائی تھیں۔ اسی طرح ملک معظم ایڈورڈ ہفتم اور ملکہ الگزینڈرا نے بھی اپنے ورودِ مسعود سے کالج کو شرف بخشا۔

کھیلوں کے میدان کا داخلی راستہ
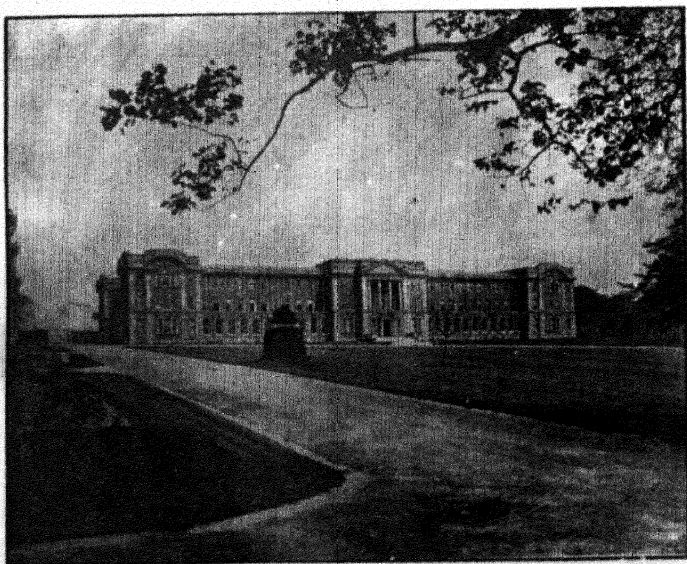
کالج کا بیرونی منظر
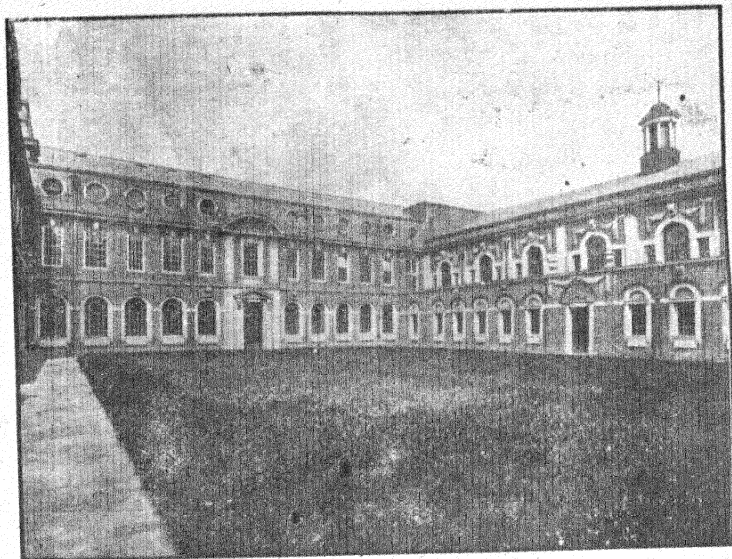
کالج کا اندرونی منظر
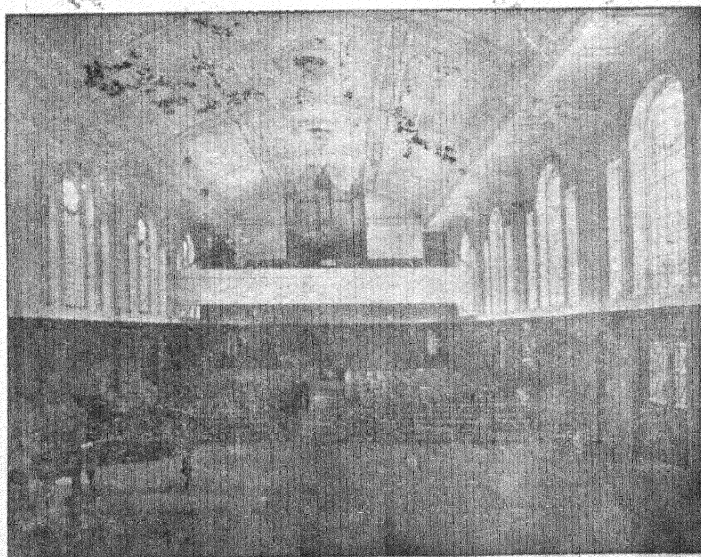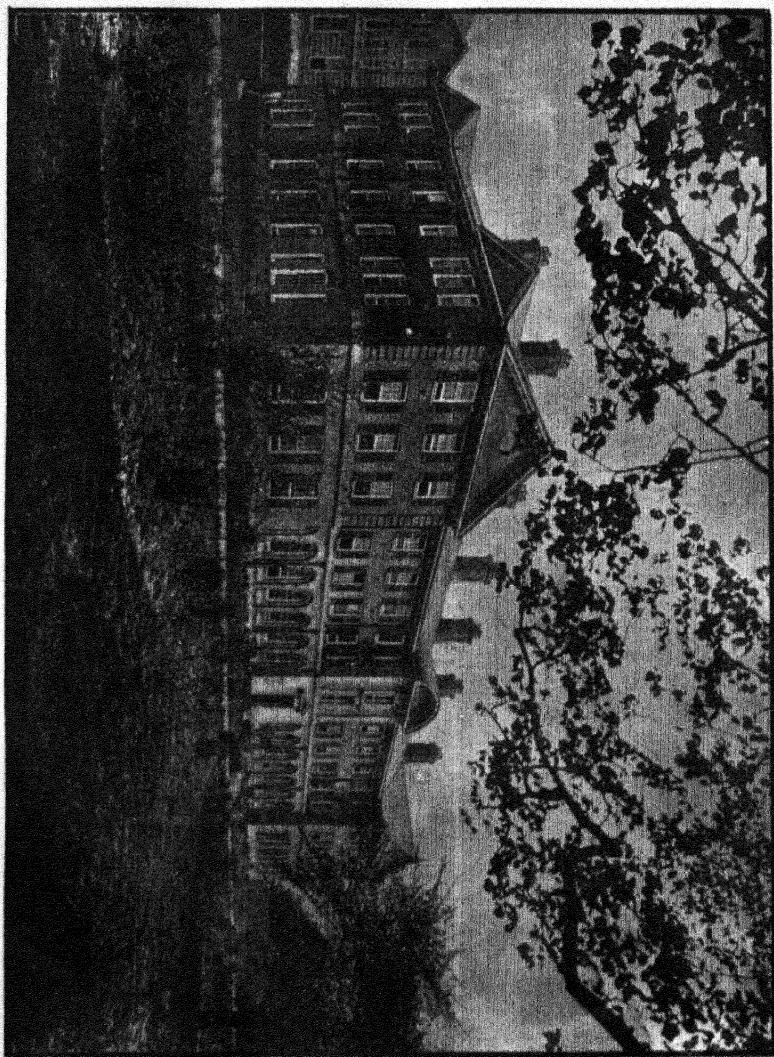
کالج کا ھال کمرہ

ایک دارالاقامت کا منظر۔
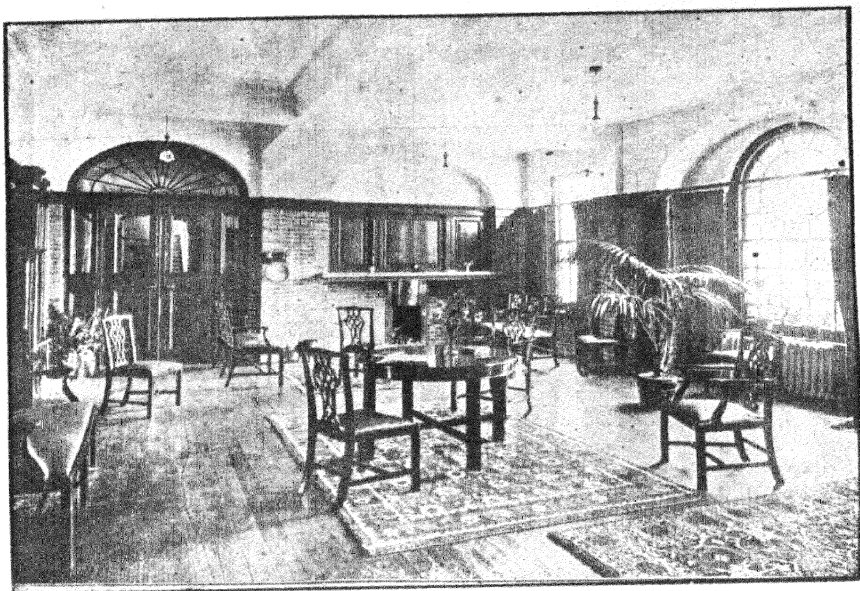
ایک دارالاقامت کا داخلی ہال کمرہ۔

طالب علم کا مطالعہ اور سونے کا کمرہ۔
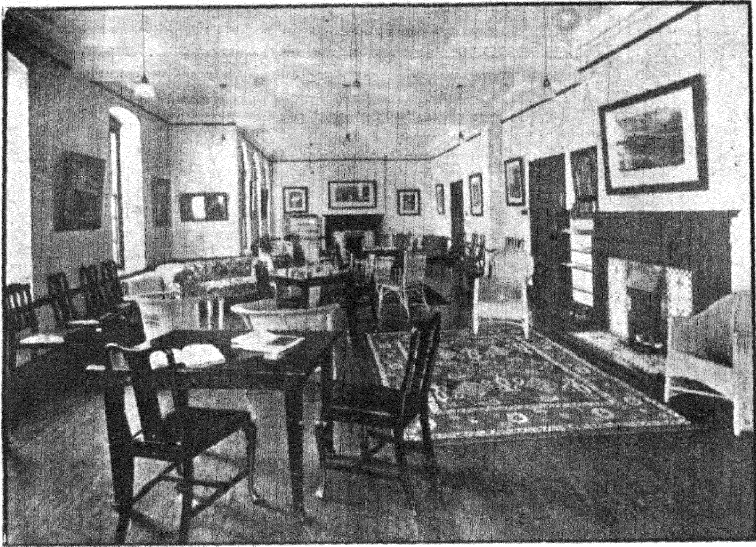
طلبہ کا مشترک کمرہ

کمرہ نقاشی

معمل طبیعات۔
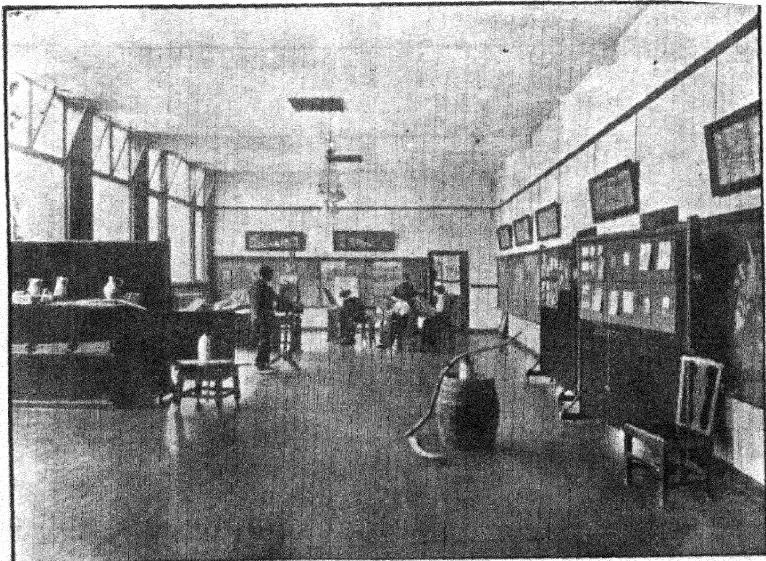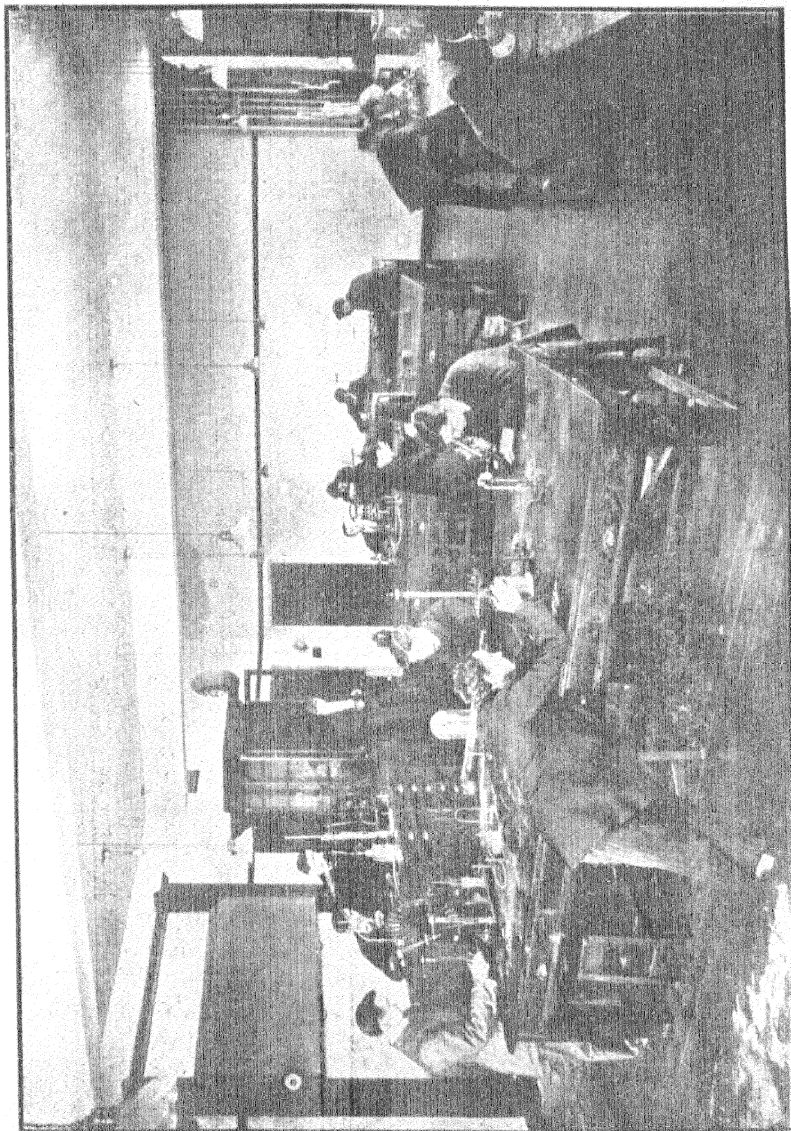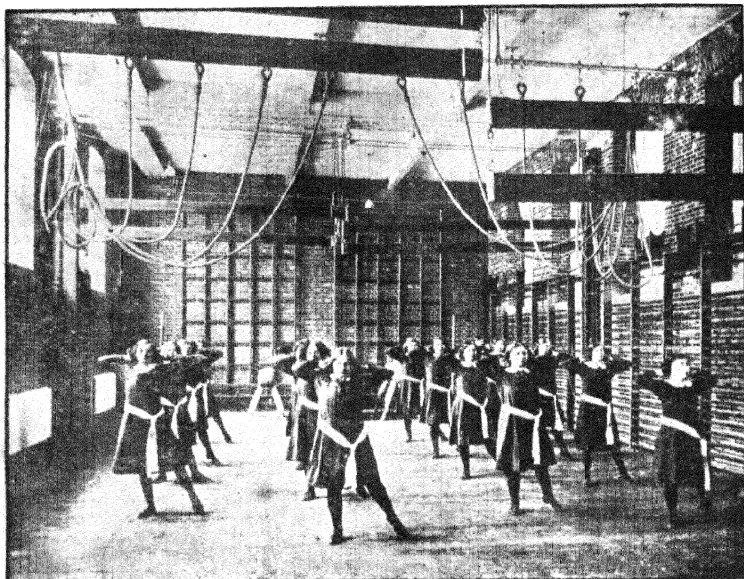
لڑکیوں کا تالار ورزش

تیرنے کا تالاب

کهیلون کی آرام گاه
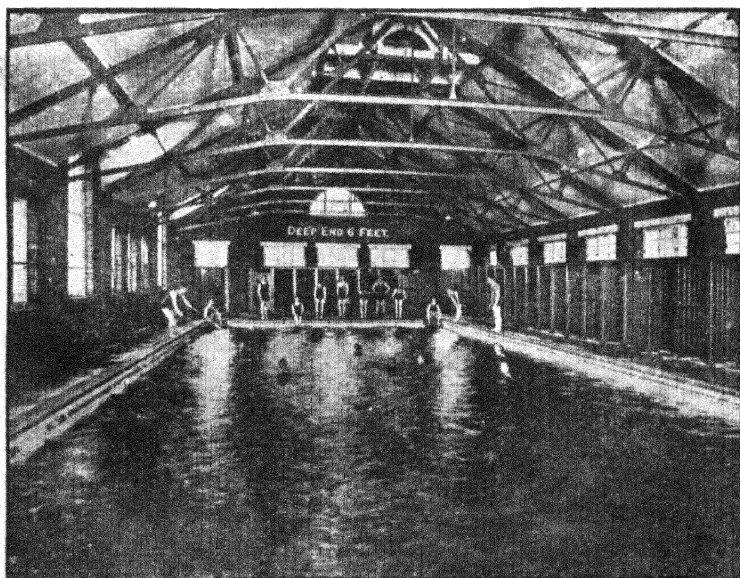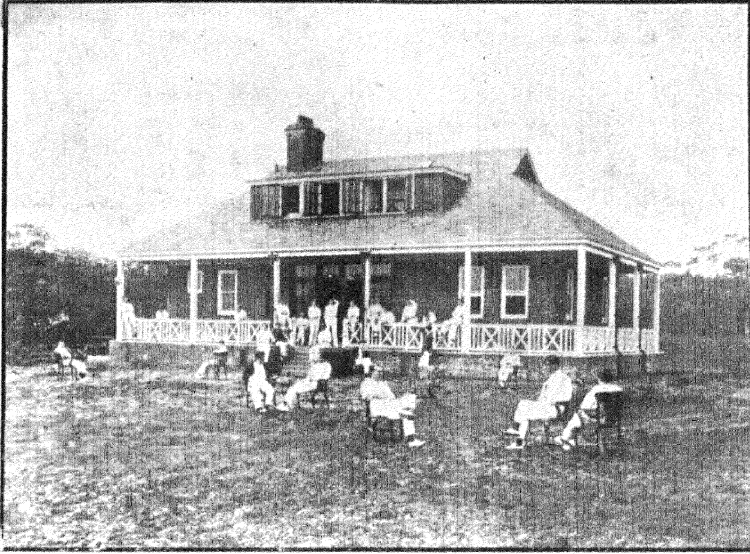
لڑکیون کے کهیل کا میدان

کھانے کا ہال کمرہ

محو سرود
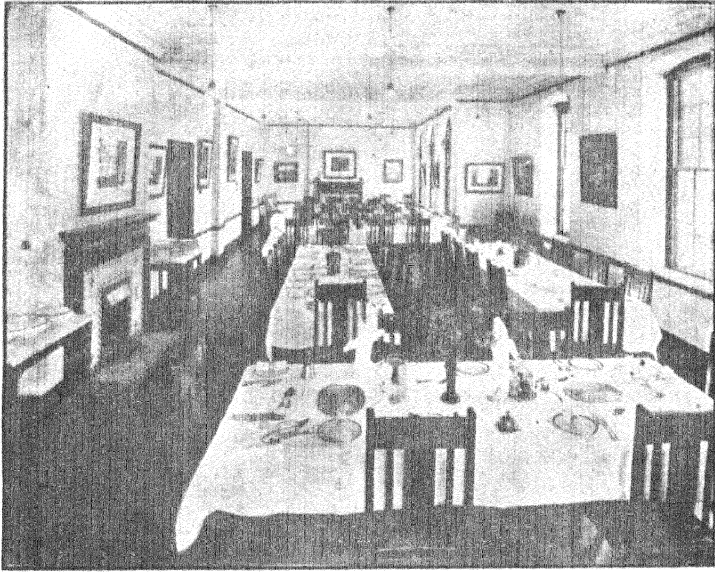
مغرب کے ایک بہت بڑے مصور کا کارنامہ

اثرات راگ

ایک اٹالین مصور کا شاہکار

حضرت عیسیٰ و مریم

کالج کی عمارات

اس کالج کی عمارات کی ترتیب اور آراستگی، مقامی تعلیمی کمیٹی اور ماہرین فن تعمیرات کی متفقہ کوشش کا نتیجہ ہے۔ کالج ایک بلند مقام پر واقع ہے۔ جہاں سے سب طرف کا منظر دکھائی دیتا ہے ان عمارات میں ایک بڑی بلڈنگ اور آٹھ رہائشی ہال یعنی بورڈنگ ہاؤس شامل ہیں۔ ان میں سے تین مردوں اور پانچ عورتوں کیلئے مخصوص ہیں۔ ان میں ۴۸۰ طلبا یعنی ۱۸۰ مرد اور ۳۰۰ عورتوں کی گنجائش ہے۔ علاوہ ازیں پرنسپل وائس پرنسپل کیلئے رہائشی مکانات بنے ہوئے ہیں۔ اور ایک تیرنے کا تالاب۔ دھوبی خانہ کھیلوں کی آرام گاہیں اور چوکیداروں کے مکانات ہیں۔

کالج

کالج میں دو بڑے احاطوں کے اردگرد زنانہ اور مردانہ کمرے بنے ہوئے ہیں۔ ایک بڑا ہال کمرہ آٹھ سو آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش رکھتا ہے۔ جماعتوں کے لیکچر روم کشادہ اور روشن ہیں۔ اور ان کے علاوہ علم کیمیا۔ علم طبعیات۔ اور نیچر سٹڈی کے معمل ہیں۔ اور لیکچر تھیئیٹر، جغرافیہ اور تاریخ کے معمل۔ نمائشی کمرہ۔ سلائی کے کمرے موسیقی کے کمرے اور مردوں وعورتوں کے جدا جدا ورزش کے تالار، ایک کتب خانہ اور طالب علموں کے مشترکہ کمرے بھی ہیں۔

رہائشی ہال

کالج کے بالکل نزدیک آٹھ رہائشی ہال ہیں۔ ہر ایک ہال میں ٹیوٹر (اتالیق) اور خانگی اسٹاف کے علاوہ ساٹھ طالب علموں کی گنجایش ہے۔ ہر طالب علم کو ایک مطالعہ اور سونے کا کمرہ معہ مخصوص فرنیچر کے دیا جاتا ہے۔ اور ہر ہال میں ایک لائبریری اور طلبا کا مشترکہ کمرہ ہوتا ہے۔ رہائشی ٹیوٹروں کے لئے خاص کمرے ہیں۔ اور ملاقاتیوں کا کمرہ مرکزی داخلی راستے کے ساتھ ملحق ہے۔ اسی راستے کے ساتھ ہی فوارے والے غسل خانے۔ کپڑے تبدیل کرنے کے کمرے۔ صحت خانے۔ کپڑوں اور بوٹوں کے برش پھیرنے کے کمرے بنے ہوئے ہیں۔ یہ سب صفائی کے کمرے اصل عمارات سے جدا کر دیئے گئے ہیں۔ تاکہ گرد اور میل اصل رہائشی ہال سے دور رہیں۔

باورچی خانے موجودہ گیس اور تازہ ترین آتشی آلات سے مزین ہیں۔ تاکہ کھانا پکانے میں نفاست اور

کفایت شعاری ملحوظ رہے ہے۔ یہ باورچی خانے اور کھانے کے کمرے اصل عمارت سے ایک راستے کے ذریعے جدا کر دیئے گئے ہیں۔

کالج کی خانگی زندگی

رہائشی ہال اس طرح آراستہ کئے گئے ہیں۔ کہ طلبا اُن میں بلا تکلف گھر کی سی بود و باش رکھیں۔ ہر ایک ہال دو رہائشی ٹیوٹر اور ایک معلمہ کی نگرانی میں ہے۔ طلبا کا پڑھنے اور سونے کا کمرہ اس طرح بنایا گیا ہے کہ دن کے وقت وہ ایک نشست گاہ دکھائی دے۔ ان پرائیویٹ کمروں کے علاوہ ہر بورڈنگ کی جداگانہ لائبریری کھانے کا کمرہ اور مشترکہ کمرہ ہے۔ پس طلبا کو نہ صرف اپنے کام میں علیحدگی نصیب ہے۔ بلکہ متفقہ زندگی کے مواقع بھی میسّر ہیں۔

سٹاف

پرنسپل کیمبرج کا ایم اے۔ اور لندن کا بی ایس سی ہے۔ انگریزی، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی اور نقاشی، سلائی کا کام، دستکاری، موسیقی، طریقۂ تعلیم، سائنس، باغبانی، بائی جین، ورزش جسمانی اور فرانسیسی ان سب مضامین کیلئے قابل پروفیسر موجود ہیں۔ طریقۂ تعلیم کے گیارہ، انگریزی کے چھ۔ سائنس کے چار تاریخ جغرافیہ کے چھ۔ نقاشی کے تین۔ اور ورزش جسمانی کے پانچ پروفیسر ہیں۔ باقی مضامین کیلئے ایک ایک دو دو پروفیسر ہیں۔ تمام سٹاف میں چوبیس ۲۴ عورتیں اور اکیس ۲۱ مرد ہیں۔

ٹریننگ کا کورس

(۱) ٹریننگ کا معمولی کورس دو سال کا ہے۔ اس کے تین حصّے ہیں

اوّل وہ کورس جو ایسے طلبا کے واسطے مخصوص ہے۔ جنہیں گیارہ سال تک کی عمر کے بچّوں کو ایلیمنٹری سکولوں میں اعلیٰ تعلیم دینا ہے

دوم وہ کورس جس میں طلبا ایسے ہی مدارس میں چودہ سال تک کی عمر کے بچوں کو پڑھانے ہوں۔ وہ کورس جو طلبا کو ابجد خوانوں اور مختلف قسم کے جونیر سکولوں کی تعلیم کے واسطے تیار کرتا ہے۔

(۲) جن طلبا نے قابل اطمینان طور پر دو سال کا کورس مکمل کر لیا ہو وہ تیسرے سال کا کورس بھی تیار کر سکتے ہیں۔ اس تیسرے سال میں خاص خاص مضامین کا سپیشل کورس پڑھا جاتا ہے۔ اور اس میں اصول

تعلیم کو اعلیٰ پیمانے پر سیکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اُس کے دوران میں طلبا کو مختلف قسم کے مدارس میں جاکر اُن میں نظم و نسق اور طریقۂ تعلیم کو دیکھنے کیلئے معائنہ کرنا پڑتا ہے ۔

(۳) جو طلبا سند مدرسی پہلے سے لے چکے ہوں ۔ یا گریجوایٹ ہوں اُن کیلئے ایک سال کا کورس بھی ہوتا ہے ۔ مشقی اسباق کیلئے کالج کے طلبا ہر قسم کے مدارس میں مشق تعلیم یا مشاہدہ وغیرہ کے لئے آسانی سے ٹریم میں بیٹھ کر جا سکتے ہیں ۔

کالج کا سال ہمیشہ ستمبر میں شروع ہوتا ہے ۔ ہر سال کے تین حصے کئے جاتے ہیں ۔ ہر مدت قریباً بارہ ۱۲ ہفتے کی ہوتی ہے ۔ آخری امتحان جولائی کے پہلے ہفتے میں ہوتا ہے ۔

صحتِ جسمانی

کالج میں داخل ہونے سے پہلے تمام طلبا کو میڈیکل افسر کی زیر نگرانی طبی امتحان پاس کرنا پڑتا ہے ۔ اگر دانتوں کی حالت خاطر خواہ نہ ہو ۔ تو داخل ہونے والے طلبا کیلئے ضروری ہے ۔ کہ کسی ماہر دندان سے سارٹیفکیٹ لے کر آئے ۔ ہر ٹرم کے آغاز میں طلبا کو اپنی صحت جسمانی کی سند پیش کرنی ہوتی ہے ۔ جس میں یہ لکھا ہو ۔ کہ وہ ایام تعطیل میں چھوت کی بیماری سے محفوظ رہے ہیں ۔ کالج میں وقتاً فوقتاً طلبا کا طبی معائنہ ہوتا رہتا ہے ۔ جسمانی پیمایش کی جاتی ہے ۔ اور اُسے درج رجسٹر کیا جاتا ہے ۔ طلبا کے دوران قیام میں اُن کی صحت کا پورا خیال رکھا جاتا ہے ۔ اور اُنہیں صحت کو برقرار رکھنے کی عادات ڈالی جاتی ہیں ۔ کیونکہ اُس کے بغیر صحت قائم نہیں رہ سکتی ۔ کالج میں ورزش کی مختلف مجالس ہیں ۔ مثلاً تیرنے کی کلب ۔ فٹ بال ۔ ہاکی ۔ ٹینس ۔ کرکٹ کی کلبیں ۔ تعلیم کے لیکچر عموماً صبح سویرے ہو جاتے ہیں ۔ سہ پہر کو ہفتے میں دو یا تین مرتبہ طلبا مدارس کا معائنہ کرتے ہیں ۔ اور باقی دن سہ پہر کو کھیلوں اور ورزش میں صرف کرتے ہیں ۔ ان تمام کھیلوں میں پرنسپل اور سٹاف کے لوگ پوری دلچسپی لیتے ہیں ۔ کھیلوں کی مجالس کے علاوہ بعض اور مجالس بھی ہیں ۔ مثلاً نقاشی کی کلب ۔ فوٹوگرافی کی کلب طبعیات کی کلب ۔ ادبی او بحث مباحثہ کی کلب ۔ موسیقی کی کلب ، جسکے سلسلے میں کالج کا ایک بینڈ بھی ہے ۔

طلبا کی مذہبی تربیت کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے ۔ اس کے لئے روزانہ صبح شام نماز ہوتی ہے ۔ لیکن یہ رسم غیر فرقہ دارانہ طور پر ادا کی جاتی ہے ۔ اور طلبا پر اس کی حاضری لازمی نہیں ہے ۔ اگر وہ چاہیں تو جس فرقے سے اُن کا تعلق ہو ۔ اسی فرقہ کے گرجے میں جا سکتے ہیں ۔ البتہ یہ ضروری ہے ۔ کہ ہر اتوار کی شام کو جس گرجے میں جائیں ۔ اس کی رپورٹ حاضری اپنے ریذیڈنٹ ٹیوٹر کو دیں اس سلسلے میں طلبا کی مسیحی مجلس کی

ایک شاخ کالج میں موجود ہے۔
طلبا کو مختلف قسم کی کافی خوراک مہیا کی جاتی ہے۔

شرائط داخلہ

دو سال کے کورس کے لئے ضروری ہے کہ طلبا اٹھارہ سال سے اوپر کی عمر کے ہوں کالج میں داخل ہونے کیلئے مندرجہ ذیل امتحانات میں سے کوئی ایک پاس کرنا ضروری ہے:-

(۱) آکسفورڈ یا کیمبرج کا امتحان انٹرنس۔
(۲) آکسفورڈ یونیورسٹی کا سینیر لوکل امتحان۔
(۳) کیمبرج یونیورسٹی " " " "
(۴) ڈرہم یونیورسٹی کا سکول سارٹیفکٹ امتحان۔
(۵) لنڈن یونیورسٹی کا جنرل سکول امتحان۔
(۶) لیڈز، لورپول، برمنگھم، مانچسٹر، اور شیفلیڈ یونیورسٹی کی متفقہ میٹرک بورڈ کا امتحان انٹرنس۔
(۷) برسٹل یونیورسٹی کا ایسا ہی امتحان انٹرنس۔
(۸) سنٹرل ویلش بورڈ کا ایسا ہی امتحان۔
(۹) مدرسی کی ابتدائی سند کا امتحان۔

ہر طالب علم کو داخل ہونے کے بعد تعلیمی بورڈ کو اقرار نامہ لکھ کر دینا پڑتا ہے کہ وہ کالج چھوڑنے کے بعد ایک خاص مدت تک کسی منظور شدہ مدرسے میں تعلیم دے گا جو طلبا ایک سال کے کورس کیلئے درخواست دیں۔ اُن کیلئے ضروری ہے۔ کہ وہ کسی ایلیمنٹری سکول میں چار سال تک مُعلمی کر چکے ہوں۔

مردوں اور عورتوں سے ہر سال ٹریننگ کی فیس بقدر چالیس پونڈ لی جاتی ہے۔ اس فیس میں رہائشی خوراک، پڑھائی، طبی امداد اور کپڑوں کی دھلائی کا ایک سال کا خرچ شامل ہے۔ تمام فیس پیشگی لیجاتی ہے۔ داخلے کی درخواست مطبوعہ فارم پر کرنی پڑتی ہے۔ جو دفتر پرنسپل سے مل سکتی ہے۔ جو امیدوار ملاقات کیلئے بلائے جائیں انہیں اپنے ہیڈ ماسٹر یا اول معلمہ سے ایک سند لاکر دکھانی پڑتی ہے جس میں یہ مذکور ہو کہ وہ مدرسے میں باقاعدہ رہے ہیں۔ یا کہ اُن کو مُعلمی سے خاص ذوق ہے۔
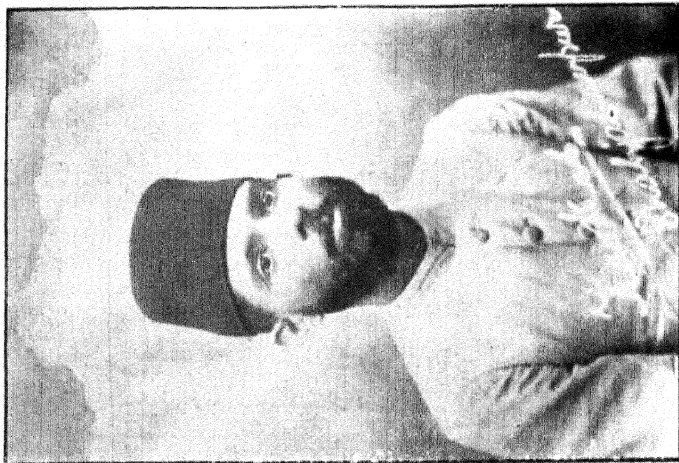
مولوی شاہ ولی یمینی صاحب بی-اے
(آنرز) اڈیٹر "دبستان"

کوکب شاہ جہان پوری

صوفی غلام مصطفیٰ صاحب تبسم ایم اے لکچرار
سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور

تدریس اُردو

(جناب صوفی غلام مصطفیٰ صاحب تبسم - ایم اے لکچرار سنٹرل ٹریننگ کالج - لاہور)

تدریس اُردو پر اظہار رائے کرنے سے پیشتر اس امر کا تصفیہ کر لینا ضروری ہے - کہ اُردو زبان کو داخل نصاب کرنے کے وجوہات اور اُسے ثانوی مدارس میں رائج کرنے کے عملی مقاصد کیا ہیں -

اُردو زبان کی اہمیت کے وجوہ حسب ذیل ہیں :-

(۱) اُردو زبان ملک کی دیسی زبان ہے -

(۲) ثانوی مدارس میں ابتدا سے لیکر اخیر تک ذریعہ تعلیم یا وسیط تدریس ہے -

(۳) اُردو زبان کا مطالعہ غیر زبان کے سیکھنے میں ممد ہے - چنانچہ انگریزی زبان سیکھنے کیلئے جس کی حیثیت ہندوستان میں ایک اجنبی غیر زبان کی ہے - اُردو زبان کی واقفیت بے حد ضروری ہے، انگریزی کیلئے صحیح اور موثر طریق تدریس وہی ہوگا جس میں متعلمین کی اُردو کی قابلیت سے معقول استفادہ کیا جائے - علاوہ بریں یہ امر مسلّم ہے کہ جو طلبہ اپنی مادری یا دیسی زبان کی خوبیوں اور نظم و نثر کی گوناگوں دلآویزیوں سے واقف نہ ہوں، وہ کسی غیر زبان کی نکتہ آفرینیوں، اس کے اندازِ فصاحت و بلاغت، تشبیہات و استعارات، غرض ادب کی ہر قسم کی چاشنیوں سے کماحقہٗ لذت اندوز نہیں ہو سکتے، اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے اُردو زبان اور اس کی تعلیم کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے -

مذکورہ بالا امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم اندازہ کر سکتے ہیں - کہ ثانوی مدارس میں اُردو کا معیار کیا ہونا چاہیئے؟ تدریس فارسی کا معیار جو ہندوستان میں کلاسیکل یا قدیم زبان کی حیثیت رکھتی ہے ، ثانوی مدارس میں یہ ہے - کہ طلبا فارسی ادب کی کتابوں کو دیکھنے کے قابل ہو جائیں - انگریزی زبان کی تدریس کا معیار اس سے مختلف ہے، مدرسہ سے فارغ ہونے پر متعلمین میں، اتنی استعداد ہونی چاہیئے کہ وہ اعلیٰ جماعتوں میں پہنچ کر نہ صرف مختلف مضامین کی کتابوں کو سمجھ سکیں بلکہ اپنے خیالات کو تحریر و تقریر کے ذریعے ظاہر بھی کر سکیں -

ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اُردو کی قابلیت کا معیار کسقدر بلند ہونا چاہیئے بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ اس زبان کی اہمیت کیا بلحاظ دیسی زبان کے اور کیا بلحاظ مدتِ تعلیم کے بہت زیادہ ہے ؟

(اُردو تدریس کی ابتدا پہلی جماعت سے ہوتی ہے اور تقریباً دس سال تک جاری رہتی ہے، دوسرے مضامین پر

اس قدر وقت صرف نہیں کیا جاتا، تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ طلبہ فارغ التحصیل ہونے پر اس قابل نہیں ہوتے کہ اُردو میں تحریر و تقریر کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔ زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ غیر زبان یعنی انگریزی ہیں تو لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ اور وقتاً فوقتاً انگریزی بول بھی سکتے ہیں لیکن اُردو میں یہ چیز بالکل مفقود ہے، زاید کتابوں کو پڑھ کر سمجھنا اور مضمون و مفہوم سے لذت اندوز ہونا تو درکنار، طلبہ اپنی درسی کتابوں کو بھی پورے طور پر نہیں سمجھ سکتے، اگر بد قسمتی سے اُنہیں کسی غیر کتاب، رسالے یا اخبار کے دیکھنے کا اتفاق ہو تو قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہیں، بیسیوں ایسے الفاظ جنہیں وہ پہلے پڑھ چکے ہیں پہچان نہیں سکتے، اور اگر انہیں کسی حکایت یا واقعہ کو اُردو میں بیان کرنے کیلئے کہا جائے تو مسلسل بیان نہیں کر سکتے، اُن کے الفاظ ناموزوں، عبارت غیر مربوط اور بندش پھسپھسی ہوتی ہے، ہوسکتا ہے کہ ہمارے بعض بھائی ایسی مثالیں پیش کر سکیں جو ہمارے پیش کردہ دعویٰ کے خلاف ہوں، لیکن اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اگر چند ہونہار بچے اپنی ذاتی مساعی یا خانگی روایات و حالات کے ماتحت اس قابل ہو بھی جائیں کہ اُن پر یہ الزام عاید نہ ہو سکے تو اس سے عام نقص رفع نہیں ہو سکتا۔

(پس معلم ہونیکی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم) اِن حالات پر غور کر کے تمام بنیادی اور فروعی نقائص کو سمجھیں اور اُن کے ارتفاع کیلئے حتی الامکان کوشش کریں۔

اُردو ایک عرصے سے ہائی کلاسوں میں اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے یونیورسٹی کا یہ فیصلہ کیسی ہی دوراندیشی اور بالغ نظری پر مبنی کیوں نہ ہو، اس کا بُرا اثر بالواسطہ یا بلاواسطہ اُردو کی تعلیم و تدریس پر پڑا ہے جس نے ہماری نظر میں اس مضمون کی وقعت کم کر دی ہے، اول تو طلبا کی ایک کثیر تعداد اُردو زبان کو صرف املائے خیر باد کہہ دیتی ہے کہ اُن کے نزدیک زندگی کے مختلف مشاغل میں اُردو کی نسبت دوسرے مضامین تاریخ جغرافیہ سائنس وغیرہ وغیرہ کی اہمیت بہت زیادہ ہے، اگر کوئی طالب علم بھولے سے اُردو پڑھتا بھی ہے تو زیادہ تر اس خیال سے کہ یہ مضمون دوسرے مضامین کی نسبت آسان ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبا اس کی طرف بہت کم توجہ دیتے ہیں، مڈل کی تحتانی اور فوقانی جماعتوں میں بھی طلبہ اسی غلط خیال کا شکار رہتے ہیں۔

تعلیم اُردو کے ناقص ہونے کی دوسری اہم وجہ معلمین اور مدرسے کے افسر اعلیٰ یعنی ہیڈ ماسٹر کی بے توجہی ہے، اکثر دیکھا جاتا ہے کہ معلمین اُردو کی علمی قابلیت بہت پست ہوتی ہے اور شوق مطالعہ کے فقدان کے باعث آیندہ کسی ترقی کی امید بھی نہیں ہوتی، ہیڈ ماسٹر اصحاب جنکی نظر میں اُردو نہایت کم مایہ چیز ہوتی ہے ان مدرسین کے کام کی نگرانی اپنی کسر شان خیال کرتے ہیں، غرض مدرسے میں ایسے اساتذہ سیاہ و سفید کے مالک ہوتے ہیں۔ اُن کی کارگزاریوں کا معیار محض افسران معائنہ کی رائے اور سالانہ امتحان کا نتیجہ ہوتا ہے۔

تیسری وجہ تدریس اُردو کا ناقص ہونا ہے، بعض اساتذہ سند یافتہ معلم ہونے کے باوجود اپنے فرائض کو

سرانجام دینے میں کوتاہی کرتے ہیں، نصاب کی کتابوں کو مقررہ میعاد کے اندر ختم کرانا ہی اُن کا مطمح نظر ہوتا ہے، تعلیم و تدریس کے تمام اصول یکلخت فراموش کر دیئے جاتے ہیں، یہاں تک کہ مضمون زیر بحث کی وقعت معلم اور متعلم دونوں کی نظروں میں کم ہو جاتی ہے، اُردو کی گھنٹی یا تو تفریح کا وقت متصور ہوتی ہے یا بلائے ناگزیر۔

علاوہ بریں کتب نصاب کا انتخاب بھی معقول نہیں ہوتا، دوسرے مضامین کے مقابلے میں اس کی مقدار بھی کم ہوتی ہے، نظم کا حصہ بالعموم طلبا کی جبلی استعدادوں اور طبعی دلچسپیوں کے منافی ہوتا ہے، ابتدائی جماعتوں کی درسی کتب میں بعض ایسی نظمیں درج کی جاتی ہیں جن میں ثقیل الفاظ، مغلق تراکیب اور غیر مانوس تشبیہات استعارات ٹھونس دیئے گئے ہوں۔ موضوع نظم کا خشک اور ٹھوس ہونا بسا اوقات بچوں کو کبیدہ خاطر کر دیتا ہے

موزوں کتابوں کے انتخاب کا سوال مہذب اور متمدن قوم کیلئے بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے، ہمارے ملک میں بھی ایک عرصہ سے اس مسئلہ پر غور ہو رہا ہے مشکلات کو مختلف النوع تدابیر سے حل کرنے کی کوشش کیجا رہی ہے، شکر کا مقام ہے کہ معاملہ بڑی حد تک سلجھ گیا ہے لیکن ابھی اس میں اصلاح کی گنجائش ہے ہماری اُردو زبان محکمہ تعلیم کے اصحاب فکر اور ارباب کار کی آئندہ توجہ اور مساعی کی خاص طور پر مستحق ہے،

تدریس اُردو کے مختلف پہلوؤں اور موجودہ نقائص پر غور کرنے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُن نقائص کے رفع کرنے کی اہم تدابیر پر بھی روشنی ڈالی جائے۔ تاکہ وہ تلخ شکایات جن کے ہم بڑی حد تک خود ذمہ دار ہیں دور ہو سکیں، اس میں شک نہیں کہ موجودہ صورت حالات کو بدلنے کیلئے مستقل اور مسلسل مساعی کی ضرورت ہے، تاہم مفید کار تجاویز کا پیش کرنا کسی حالت میں ناموزوں نہ ہوگا۔

یونیورسٹی کے معاملات میں دخل دینا ہمارا کام نہیں، اس کے ارباب بست و کشاد ملک کے نظام تعلیم اور اس کے اہم مسائل کو ہر لحاظ سے ہم سے بہتر سمجھنے کے اہل ہیں اور اپنی مفید آرا اور مساعی جمیلہ سے معاملات کو سلجھانے کی فکر میں رہتے ہیں، تاہم ہم اتنا عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کہ مدرسہ کی اعلیٰ جماعتوں میں اُردو کو اختیاری مضمون قرار دینا کسی طرح بھی قرین مصلحت نہیں ہو سکتا ممکن ہے کسی دور کی مصلحت نے اُنہیں اس بات پر مجبور کیا ہو کہ وہ تاریخ یا جغرافیہ کے مقابلے میں اس مضمون کو دوسرا درجہ دیں مگر اس کی روز افزوں ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُسے اختیاری مضامین کی فہرست میں ایسی جگہ دیجائے کہ کم از کم اس کا انتخاب لازمی ہو جائے۔

کالج کے مروجہ مضامین میں اُردو کے اضافہ کی اہمیت صرف اُسی حالت میں نمایاں ہو سکتی ہے کہ مدرسہ کی تمام جماعتوں میں اس کی تعلیم لازمی قرار دیجائے، ورنہ یہ خواہش کرنا کہ دیسی زبانیں سکولوں اور کالجوں میں ذریعۂ تدریس بن جائیں کسقدر لغو ہے۔

تدریس اُردو میں بھی اصلاح کی گنجائش ہے۔ جس طرح کسی زمانے میں جغرافیہ کی تعلیم کا مقصد محض دریاؤں،

پہاڑوں اور شہروں کے نام یاد کرانا سمجھا جاتا تھا اسی طرح ہمارے اساتذہ نے اُردو تعلیم کا مقصد صرف یہی سمجھا ہے کہ طلبہ مشکل الفاظ کے معنی یاد کرلیں عبارت کو پڑھ سکیں اور ایک آدھ مضمون لکھ لیں، گفتگو کی طرف سے بے حد تغافل کیا جاتا ہے، اگرچہ بعض نوجوان اساتذہ نے ابتدائی جماعتوں میں گفتگو کی اہمیت کو سمجھکر اس سے کماحقہ استفادہ شروع کر دیا ہے، لیکن مدرسہ کی اعلیٰ جماعتوں میں یہ چیز معیار مطلوبہ سے کم درجے پر خیال کی جاتی ہے اور معلّم اور متعلم اسے اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ بعض کے نزدیک گفتگو سبق کے ارتقائی مدارج میں سوال وجواب کا نام ہے، اس میں شک نہیں کہ سوالات وجوابات کا یہ تسلسل لڑکوں میں بڑی حد تک اظہار مافی الضمیر کی استعداد پیدا کرتا ہے لیکن ہمارا مقصد یہیں نہیں پورا ہو جاتا بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ لڑکے اُردو زبان میں مسلسل اور مربوط طریق پر گفتگو کرسکیں، اس چیز کا اثر محض اُردو کی قابلیت پر نہیں پڑتا بلکہ دوسرے مضامین مثلاً تاریخ، جغرافیہ وغیرہ وغیرہ میں بھی طلبا اپنے خیالات کا اظہار بآسانی کر سکتے ہیں۔ کسی موضوع پر اظہار رائے کیلئے خیالات کو مجتمع کرنا اور اُن کو معقول پیرائے میں بیان کرنا بہت ضروری ہوتا ہے، اگر الفاظ یاوری نہ کریں اور زبان ہر لفظ پر رُکے تو خیالات گفتگو کرنے والے کے ذہن ہی میں رہ جاتے ہیں اور سامعین کچھ نہیں سمجھ سکتے، خیالات کا ذہنی طور پر ترتیب دینا اور پھر اُن کو موزوں الفاظ میں بیان کرنا دونوں چیزیں تقریر وتحریر کی جان ہیں۔ ان دونوں میں جس قدر گہرا تعلق اور باہمی مناسبت ہوگی اسی قدر تقریر یا تحریر زیادہ مربوط، زیادہ پُر مغز اور زیادہ فصیح ہوگی۔

گفتگو کے سلسلے میں یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ معلم کو اُردو کے سبق کا تمام کام اپنے ذمے نہیں لینا چاہیئے بلکہ سبق کے تمام ارتقائی مراحل معلم ومتعلم دونوں کی مشترکہ کوششوں سے طے ہونے چاہئیں۔ موزوں سوالات کے ذریعے خواندہ عبارت کے مفہوم کو نکلوا کر اس کی توضیح اپنے الفاظ میں کرنی چاہیئے تاکہ طلبہ کتاب کے محدود الفاظ ہی پر اکتفا نہ کریں، ان توضیحات کا فائدہ ایک یہ بھی ہے کہ طلبا نئے نئے الفاظ اور انداز بیان سے واقف ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے موقع پر مُعلّم کا شُستہ کلام ہونا بے حد ضروری ہے، تاکہ طلبہ دلچسپی سے سُنتے رہیں۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ معلمین اُردو تختۂ سیاہ کا استعمال نہیں کرتے، حالانکہ خلاصہ تختۂ سیاہ بھی توضیحات مرئی میں شمار ہوتا ہے، طلبہ کے اُردو الفاظ کے ہجے غلط لکھنے کا باعث یہی ہے کہ انہوں نے بہت سے الفاظ اپنے استاد کی زبان سے سُنے ہوتے ہیں دیکھے نہیں ہوتے۔ تختۂ سیاہ پر لکھتے وقت خوشنویسی کو بالخصوص ملحوظ رکھنا چاہیئے، تقسیم تختۂ سیاہ کی موزونی اور اس کے معقول استعمال کا سلیقہ معلم کا قابل فخر کارنامہ ہے، الفاظ کی بھونڈی اور بھدی شکلیں، جگہ کی ناموزوں تقسیم اور بے ترتیب انداز تحریر طلبہ کی حسِ جمالی کے لئے سخت مضر ہے۔ لڑکوں کے بدخط ہونے اور اُن کی بے پرواطرز تحریر کی بڑی وجہ یہی ہے۔

تدریس نظم کا کام نثر سے نسبتاً زیادہ مشکل ہوتا ہے کیونکہ اس میں اشعار کو صحیح طور پر پڑھنے کی دقتیں

شامل ہو جاتی ہیں۔ معلم عام طور پر نظم و نثر کے سبق میں امتیاز نہیں کرتے، مشکل الفاظ کی تشریح ہی کافی خیال کی جاتی ہے۔ اس کام کے لئے ضروری ہے کہ مدرس کا مذاق شعری بہت سلیم ہو، تاکہ اس کا اثر براہ راست طلبا پر پڑے، اور وہ موزونی الفاظ، روانی عبارت، سلاست بیان، وزن، قافیہ اور ردیف غرض تمام شعری لوازمات کی اہمیت کو محسوس کریں۔ اکثر الفاظ کے صحیح تلفظ اور تذکیر و تانیث کا راز اشعار میں آکر خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے، لغت نویس الفاظ کے استعمال کیلئے جب فصحا کی سند پیش کرتے ہیں تو وہ زیادہ تر اشعار ہی ہوا کرتے ہیں۔ کاش ہمارے معلم اس بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

اشعار کی شرح بیان کرتے وقت اکثر طلبا محض اُن کی نثر بنا دیتے ہیں، معلم بھی اُن کے اسی ادبی کارنامے سے خوش ہو لیتا ہے حالانکہ نثر بنانا کسی خاص ذہنی کاوش کا نتیجہ نہیں ہوتا، ابتدائی جماعتوں میں اگر اسی پر اکتفا کیا جائے تو کوئی ہرج نہیں لیکن بڑی جماعتوں میں طلبا کو اشعار کا مفہوم اپنے الفاظ میں پوری وضاحت کے ساتھ کرنا چاہیئے معلم کا فرض ہے کہ وہ طلبا کی تشریحات کی تکمیل نہایت جامع الفاظ میں کرے۔ قرات اشعار پر بھی بہت زور دینا چاہیئے مشکل اشعار کی صورت میں معلم کو خود نمونہ پیش کرنا چاہیئے یا کسی ہوشیار طالب علم سے ابتدا کر کے کمزور طلبہ کی طرف توجہ مبذول کرنی چاہیئے، موزوں اشعار یا نظم کا زبانی یاد کرانا بھی بسا اوقات مفید ہوا کرتا ہے (مصنف چہار مقالہ کا یہ خیال کہ شاعر کیلئے اساتذہ کے بے شمار اشعار کا یاد کرنا لازمی امر ہے، بڑی حد تک درست ہے، اس بات کو بھی ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ اشعار یاد کرانے سے محض افسران معائنہ کو خوش کرنا مقصود نہیں بلکہ اس بات کا تعلیمی فایدہ بھی ہے۔ اسلئے فرداً فرداً ایسے اشعار بھی یاد کرائے جا سکتے ہیں جن میں شاعر نے کوئی خاص محاورہ بندی یا بندش کی چستی، یا بلند خیالی کا اظہار کیا ہو، مگر یہ اشعار ایسے ہونے چاہئیں کہ طلبہ انہیں یاد بھی رکھ سکیں، ان اشعار کا محض نصاب تک محدود ہونا ہی ضروری نہیں، معلم ضرورت کے وقت توضیحات و امثلہ کے طور پر ان کو پیش کر کے سبق کو دلچسپ بنا سکتا ہے۔

سبق کے دوران میں نثر نگار، یا شاعر کا فوٹو دکھانا اس کے حالات مختصراً بیان کرنا، اور اس کے طرز نگارش پر اظہار رائے کرنا بھی مفید ہے اسی سلسلے میں تاریخ ادبیات کا تصور دلانا بھی ضروری ہے، تاکہ طلبا مختلف شعراء اور نثر نگاروں کے عہد سے واقف[1] ہو جائیں اور آئندہ مطالعہ کو جاری رکھتے ہوئے اردو علم ادب کی عہد بعہد ترقیوں کو سمجھ سکیں۔

تحریری کام کو حتی الامکان جماعت میں ختم کرانے کی کوشش کرنی چاہیئے ورنہ طلبا گھر پر دوسروں کی مدد سے

---

[1] ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ ایس وی کے طلبہ کی طرح اقبال کے متعلق یہی کہیں گے کہ ایک ایران کا اچھا شاعر ہو گذرا ہے۔ یا بی اے کے ایک جاہل طالب علم کے طرح یہ سوال کریں گے کہ عود ہندی کون تھا؟ یا ایک گردیدۂ تہذیب نو کی طرح مسدس حالی کو "پنجاب کا ایک شاعر تھا" نہیں لکھیں گے، نعوذ باللہ من ذٰلک

۷۵۵۹

کام ختم کر لیتے ہیں اور ناجائز طریق پر اُستاد سے خراج تحسین حاصل کرتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُستاد غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور بعض اوقات ایسے طلبہ کی طرف توجہ کرنے سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف طلبہ ذاتی سعی و کوشش کے ناقابل ہو جاتے ہیں۔ جماعت میں کام کرانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ معلم محض نگرانی اور رہنمائی نہیں کرتا بلکہ اصلاح بھی کرتا جاتا ہے، معلم کو چاہیئے جہاں تک ہو سکے اصلاح کا کام بھی طلبا کی حاضری میں مکمل کرلے، کام کی قلیل مقدار کوئی بُری بات نہیں، اصلاح کا نہ ہونا یا مجبوری کے عالم میں نامکمل اور غیر اطمینان بخش ہونا مضر ہے، مضمون نگاری یا املا وغیرہ کے سلسلے میں کاپیوں کا انبار معلم کیلئے حوصلہ شکن ہوتا ہے۔ اس طرح سے یہ شکایت بھی بڑی حد تک رفع ہو جائیگی +

مضمون نگاری میں تمہیدی بحث و تمحیص بھی کارآمد ہوتی ہے، اس بحث و تمحیص کو مذاکرہ کی صورت اختیار کرلینی چاہیئے یعنی مضمون زیر بحث معلم اور متعلم کی مشترکہ ذہنی کوششوں کا نتیجہ ہو اس سے طلبا کی صحیح رہنمائی بھی ہوگی اور کام بھی بڑی حد تک اصلاح کا منت کش نہ ہوگا۔ درست ہجے، صحیح رسم الخط، موزوں وقفے عروس تحریر کا زیور ہیں۔ اس پر خوشنویسی جامہ زیبی کا حکم رکھتی ہے۔ یہ تمام چیزیں معلم کی درست رہنمائی پر منحصر ہیں۔ ایک چیز آجکل بالکل مفقود ہے، یعنی وقفے، اگر مفصلہ ذیل علامات استعمال کی جائیں تو عبارت کی شان دوبالا ہو جائیگی اور پڑھنے والے کو بھی آسانی ہوگی :-

مکمل جملے کی علامت	-
جملہ معترضہ یا جملے کے مختلف حصوں کی علامت	،
فصل (پیراگراف) کی علامت	+
تفسیری یا تفصیلی علامت	:-
اقتباس کی علامت	" ..... "
استفہام کی علامت	؟
تعجب یا ندا کی علامت	!
قوسین وغیرہ وغیرہ	( )

"اس جگہ یہ بیان کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ پنجابی طلبا بالخصوص اعداد کو پڑھتے وقت پنجابی عدد پکارتے ہیں اس کی طرف بھی خاص توجہ مبذول کرنی چاہیئے +"

مدرسہ میں بلند آواز سے پڑھانے کا مطلب صحت روانی قراءت، تلفظ اور لہجہ کی درستی کے لئے ہوتا ہے، لیکن فارغ التحصیل ہونے پر طلبہ خاموش مطالعہ کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں اسلیئے اس کا آغاز بھی مدرسہ ہی میں

ہونا ضروری ہے، خاموش مطالعہ کی ابتدا بالعموم تیسری جماعت سے ہوتی ہے اور اسے دسویں جماعت تک جاری رکھا جاتا ہے لیکن معلمین اس کی اہمیت کو فراموش کر دیتے ہیں اور خاموش مطالعہ دفع الوقتی خیال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ چیز معلم کیلئے بے حد مفید ہے اور اس کے تدریسی کام میں اس کی سب سے بڑی معاون ہے۔ اس کو کامیاب بنانے کے لئے حسب ذیل امور کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے:۔

(۱) موزوں کتابیں انتخاب کی جائیں۔ جو لغوی مشکلات کے اعتبار سے درسی کتابوں سے نسبتاً آسان، مضامین کے لحاظ سے زیادہ دلچسپ، اور مصوّر بھی ہوں۔

(۲) اس غرض کے لئے جماعتی کتبخانے کھولے جائیں اور معلم خود کتابوں کا انتخاب کرے۔ ہر کتاب کے ایک سے زیادہ نسخے رکھے جائیں تاکہ تمام طلبا ایک وقت میں ایک ہی کتاب پڑھیں اس سے نگرانی کا کام آسان ہو جائے گا اور طلبہ کی رفتار مطالعہ کا اندازہ کرنا بھی سہل ہوگا۔

(۳) تمام کام معین وقت اور معلم کی رہنمائی میں ہو۔

(۴) خاموش مطالعہ کی معلومات سے مضمون نگاری، اور دیگر تحریری مشقوں میں استفادہ کیا جائے۔

(۵) بڑی جماعتوں میں ایک امر پر خاص طور پر زور دیا جائے اور کتابیں بلحاظ مضامین کے زیادہ موزوں اور دلچسپ ہوں، اور اُن میں مفید معلومات کے علاوہ ادبی چاشنی بھی ہو۔

اخبارات اور رسائل کا مطالعہ بھی ایک لازمی امر ہے، اس کام کیلئے لڑکوں کو خاص ہدایات دینی چاہئیں۔ معلم خود اخبارات و رسائل کے مطالعہ کے بعد اپنے طلبہ کو چیدہ چیدہ مضامین دیکھنے کا حکم دے اور بعد ازاں امتحان بھی کرے کہ لڑکوں نے فی الواقعہ اُن کا مطالعہ کیا بھی ہے یا نہیں۔ اس امتحان کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ معلم اخبارات و رسائل سے مضامین کو لے کر اپنے تحریری کام کے لئے موزوں موضوع انتخاب کرے۔

طلبہ میں اُردو کے مطالعہ کا شوق پیدا کرنے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ ہر مدرسے میں مجلس مذاکرہ قائم کی جائے اور وقتاً فوقتاً مناظرے کرائے جائیں ہیڈ ماسٹر اور دیگر اساتذہ اس کام میں خود بھی دلچسپی لیں تاکہ لڑکوں کی حوصلہ افزائی ہو۔ اگر اس کام کے لئے ایک آدھ انعام بھی مقرر ہو تو مضائقہ نہیں ان مناظروں کیلئے تاریخی، جغرافیائی مباحث بہت مفید ثابت ہونگے۔ اس سے دوسرے مضامین کو بھی تقویت ہوگی طلبا کی استعداد کے مطابق محض ادبی مباحث بھی انتخاب کئے جا سکتے ہیں۔

نئے اسباق کی تیاری معلم اور متعلم دونوں کے لئے ضروری ہے، علم التدریس کا اولین اصول یہی ہے کہ معلم سبق کی تیاری کے بغیر ایک حرف تک پڑھانے کی جرأت نہ کرے، اگر کبھی اتفاق سے معلم سبق تیار نہ کر سکا ہو تو اس کیلئے بہتر ہے کہ وہ اپنا وقت اِدھر اُدھر کی باتوں میں صرف کر دے اور مختلف طریق تفریح سے لڑکوں کا دل بہلائے

لیکن سبق کا قصد نہ کرے، ورنہ اُس کے وقار میں فرق آجانے کا اندیشہ ہے۔ طلبہ کو بھی چاہیئے کہ وہ ہر نئے سبق کو ایک بار گھر سے دیکھ کر آئیں۔ بہت سی مشکلات سبق کو ایک دفعہ دیکھنے سے رفع ہو جاتی ہیں اور معلم کا کام بڑی حد تک آسان ہو جاتا ہے۔ طلبہ لغت کے صحیح استعمال کو نہیں سمجھتے خاموش مطالعہ یا تیاریٔ اسباق اس کے لئے بہترین موقع ہے۔

پیشتر اس کے کہ ہم اس مختصر سی بحث کو ختم کریں یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ تدریس و تعلیم کا کوئی اصول کارآمد نہیں ہو سکتا جب تک معلّم میں فرض شناسی کا احساس بدرجہ اتم موجود نہ ہو۔ اس کے بغیر ہر تجویز بے کار اور ہر مشورہ رائگاں ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے معلم بھائی ہماری ان ادنیٰ گذارشوں پر غور کریں گے اور اُن تمام فرائض کو پوری تندہی سے سرانجام دینگے جن سے عہدہ برآ ہونا ہم سب کا مشترکہ نصب العین ہے۔

لال قلعہ کی ایک جھلک

لال قلعہ کی تمیز اور بات چیت میں اور شاہجہان آباد کی تمیز اور بات چیت میں بڑا فرق تھا۔ ایک بیاہ کی محفل میں لال قلعہ کی بیگمیں شاہجہان آباد کے اندر شریک ہوئیں محل کی انگنائی میں ایک چوکے پر شاہجہان آباد کی لڑکیاں جن کی عمر پانچ چھ سال سے زیادہ نہ تھی دس پانچ بیٹھی آپس میں کھیل رہی تھیں۔ ان ہی میں ایک قلعہ کی رہنے والی بادشاہزادی بھی بیٹھی تھی جن کی عمر بھی شہر والی لڑکیوں سے زیادہ نہ تھی۔ شہر والی لڑکیاں "تو تو" کہہ کر ایک دوسری سے بولتی تھیں اور قلعہ والی لڑکی کو "تو" کہنا نہیں بھاتا تھا' وہ ان کی باتوں سے گھبرا گئیں تو توتلی بولی میں کہنے لگیں "بیگم "تو" نہیں کہتے "تم" کہتے ہیں"۔ مگر نقار خانہ میں طوطی کی صدا کون سنتا ہے ان کے کہنے کا کسی نے خیال نہ کیا۔ تو انہوں نے دوا سے کہا دوا تم مجھے گود میں اٹھا کر لے چلو۔ یہ پکار تو مجھ سے نہیں سُنی جاتی۔

بچوں کی زبان میں طاقت آنے کے لئے یہ کہاوت اُنہیں سکھاتیں "لپ بھر آٹا مٹھی چنے ٹکڑا روٹی گڑ کی ڈلی" اور بچوں سے کہا جاتا لپ کہو تو ایک ہاتھ سے لپ بناؤ' پھر مٹھی چنے کہو تو مٹھی بناؤ' ٹکڑا روٹی کہو تو مٹھی میں دو انگلیوں کو کھول اور انگوٹھا اس پر رکھ ٹکڑے کی صورت بناؤ گڑ کی ڈلی کہو تو کلمہ کی اور بیچ کی دو انگلیوں اور انگوٹھے کو کھول کر ڈلی کی صورت بناؤ۔ اور اس کہاوت کو جلدی جلدی کہو۔

ایک بیگم اپنی صاحبزادی کو اس طرح بلاتی تھیں "بیوی تاجو تاج ملو کو سر پہ تاج نصرت بانو بیٹیاں شاہ بیوہاں" ایک دن محل کے چبوترے پر مرغا بھاگا پھرتا تھا۔ کسی طرف سے بلی آئی اور مرغے کو زخمی کر گئی تو بیگم نے نصرت بانو کو اس طرح بلایا "بیوی تاجو تاج ملو کو سر پہ تاج نصرت بانو بیٹیاں شاہ بیوہاں چھری لاؤ مرغا مرتا ہے" اس خطاب کو پورا پورا کرتے کرتے مرغا مر کر رہ گیا۔ اور چھری نہ آئی۔

"ساقی"

ہندوستان میں فارسی زبان
اور
اس کا طریق تعلیم

(جناب مولوی امام الدین صاحب منشی فاضل اورنیٹل ٹیچر گورنمنٹ سنٹرل ماڈل سکول لاہور)

ناظرین کرام! پیشتر اس کے کہ میں زبان فارسی کی تدریس پر اپنے خیالات پریشان کا اظہار کروں۔ یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ ہمارے ملک میں زبان مذکور کی تحصیل کیوں ضروری ہے اور ہمیں اس کے حاصل کرنے سے کیا کیا فائدے حاصل ہو سکتے ہیں؟۔

کسی ملک میں غیر زبان کے سیکھنے کے مندرجہ ذیل اسباب ہو سکتے ہیں:۔

(۱) اُس زبان کے اہل زبان کا کوئی نہ کوئی تمدنی۔ معاشرتی۔ تجارتی و مذہبی تعلق اُس ملک کے ساتھ ہو یا بخلاف اس کے اہل ملک کو اُس غیر زبان کے ملک والوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی واسطہ ہو۔

(۲) اُس غیر زبان کی تصنیفات ملک کے نصاب تعلیم میں داخل ہوں۔

(۳) اہل ملک میں کسی فرقے کی مذہبی یا علمی تصنیفات اُس غیر زبان میں ہوں۔

(۴) مصنفین یا مولفین کو ترجمے یا تالیف کی غرض سے بعض غیر زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں۔

(۵) تاجروں اور سیاحوں کو غیر ملک کی زبان ضرورتاً سیکھنی پڑتی ہے۔

اسباب مندرجہ بالا کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اپنے ملک میں زبان فارسی کی اہمیت کا اندازہ لگاتے ہیں۔ اور اس مسئلے میں جہاں تک غور کرتے ہیں وجوہات خمسہ میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جو ہندوستان میں زبان فارسی کی تحصیل پر حاوی نہ ہو۔ ہم ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک زمانے میں فارسی کا ایسا تصرف اس ملک پر پاتے ہیں۔ کہ دفتری۔ درباری۔ کاروباری اور تصنیفی زبان فارسی ہی نظر آتی ہے۔ مسلمان تو ایک طرف ہندو بھی فارسی میں انشا پردازی کو فخر سمجھتے تھے۔ تصنیفات اس امر کی شاہد ہیں۔ چنانچہ سید محمد عبداللہ صاحب ایم۔ اے۔ ریسرچ سٹوڈنٹ پنجاب یونیورسٹی نے "ہندوؤں کا فارسی لٹریچر" کے عنوان سے ایک تحقیقانہ

مضمون اوری انٹل کالج میگزین بابت ماہ اگست ۱۹۳۰ء میں شایع کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے
کہ زمانۂ سلف میں قوم مذکور کو زبان فارسی سے کسقدر دلچسپی تھی انہوں نے از ۱۱۲۴ھ تا ۱۲۲۱ھ گویا تقریباً
ایک صدی کے فارسی لٹریچر کی مختصر فہرست جو ہنود نے لکھا حسب ذیل دی ہے۔

علم تاریخ	۳۷
سوانح وسیر	۱۱
ریاضی	۴
تراجم	۱۲
قصص	۹
انشا	۱۹
شعرا	۳۵
	۱۲۶

مسلمانوں اور سکھوں کے عہد حکومت کے بعد انگریزوں کی ابتدائی عملداری میں بھی دفتری زبان فارسی تھی
اس کے بعد اگرچہ بظاہر اُردو نے فارسی کی جگہ لے لی۔ لیکن فارسی زبان کے الفاظ نے اردو میں بکثرت داخل ہوکر
اپنا قبضہ جمائے رکھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ اُردو زبان ہیں جو ہندوستان ہیں ہمہ گیر کاروباری زبان ہے
فارسی الفاظ کا عنصر غالب ہے۔ اگر عربی الفاظ اُردو میں ہیں تو اسلئے کہ وہ فارسی میں پہلے سے داخل ہیں۔ گویا وُہ
بھی اب فارسی کا مال ہیں اور زبان فارسی کے ساتھ شیر وشکر ہو چکے ہیں۔ اور "تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم
تو دیگری" کا مصداق بن چکے ہیں

نظر بریں حالات ہم دیکھتے ہیں کہ فارسی زبان کا ہند اور اہل ہند سے ایک دیرینہ اور گہرا تعلق ہے۔ اور
اسی لئے یہاں کے صیغہ ہائے معارف نے اُس کو داخل نصاب کیا ہوا ہے اور اس کی تعلیم ابتدائی درجہ سے
انتہائی درجے تک دی جاتی ہے۔ منشی فاضل کا درجہ انتہائی تو پہلے تھا ہی۔ لیکن اب کئی سال سے پنجاب
یونیورسٹی نے فارسی کا ایم۔ اے امتحان بھی مقرر کر دیا۔ اس وقت طلاب فارسی مشرقی اور مغربی دو طریقوں
سے اس کی تحصیل کرتے ہیں گویا ایک فارسی خواں طبقہ ہے اور دوسرا انگریزی فارسی خواں فرقہ

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ اس ملک میں زبان فارسی کی تحصیل کا مقصد کیا ہے؟ اس کا جواب وہی پانچ اسباب
ہیں جو سابقاً بیان کئے گئے۔

پہلی صورت ظاہر ہے کہ ہندی مسلمانوں اور ایرانیوں کے درمیان رشتۂ اسلام قایم ہے نیز فاتحین

اسلام کے ساتھ یہ زبان اس ملک میں آئی ۔

دوسرا سبب بھی بمصداق "عیاں راچہ بیاں" تصنیفات زبان فارسی داخل نصاب ہیں اور یہ تصنیفات جملہ علوم فنون مشرقی کی حامل ہیں مثلاً فلسفہ ۔ منطق ۔ طب ۔ تاریخ ۔ علم کلام ۔ علم بیان وغیرہ ۔

تیسرا پہلو کسی وضاحت کا محتاج نہیں ۔ مسلمانوں کی ہر قسم کی کثیر التعداد کتب مذہبی زبان فارسی میں موجود ہیں ۔ جن میں قرآن مجید اور احادیث کی تفاسیر ۔ فقہ ۔ تاریخ اسلام وغیرہ شامل ہیں ۔ جنہیں فارسی خواں مسلمان استفادے کی غرض سے پڑھتے ہیں ۔ ان علوم کے بے انتہا خزانے اس زبان میں موجود ہیں جن کی کنجی فارسی زبان ہے ۔

چوتھی وجہ بھی محتاج بیان نہیں ۔ ہندوستان میں مسلمانوں نے اُردو کی ترویج سے پہلے اکثر کتب مذہبی کا فارسی میں ترجمہ کیا ۔ تاکہ جو لوگ عربی خواں نہیں وہ ان ترجموں سے فائدہ اٹھا سکیں ۔

پانچویں جہت بھی مخفی نہیں ہے ۔ ہندوستانی سیاح اور تاجر ایران میں جاتے رہے ہیں ۔ اور اب بھی کم و بیش یہ سلسلہ جاری ہے ۔ خصوصاً مسلمانوں کا ایک جم غفیر زیارات متامات مقدسہ کے لئے جاتا رہتا ہے ۔

فارسی زبان کی اہمیت بلحاظ محاسن وخصائص

علاوہ اُن اسباب کے جن کا اوپر ذکر ہوا ۔ زبان فارسی اپنے محاسن وخصائص کی وجہ سے بھی لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے ۔ یورپ کے علمائے فلسفہ زبان (فیلالوجی) نے بالاتفاق اس کی خوبیوں کا اعتراف کیا ہے ۔ کسی نے فرینچ زبان سے نسبت دی ہے ۔ چنانچہ ایک فرینچ اہل زبان لکھتا ہے ۔ جس کا ملخص یہ ہے کہ "اس میں شبہ ہے نہ مبالغہ کہ فارسی عمدہ زبانوں میں سے دلپذیر ہے ۔ وہ اپنے ذخیرہ الفاظ و محاورات سے ہر قسم کے مضمون کو مناسب اور زیبا قالب میں ڈھال لیتی ہے ۔ اور السنہ شرقیہ میں سے یہ زبان شاعری اور انشا پردازی کیلئے بالطبع مناسب و موزون ہے" (اقتباس از دیباچہ مکالمۂ فارسی مصنفہ موسیو نکولا قنصل دولت فرانس مقیم طہران)

دیگر دانایان فرنگ بھی قریب قریب انہی الفاظ میں اس کی خوبی کا ذکر کیا ہے تفصیل کے لئے شائقین سخندان فارس حصہ دوم کے آٹھویں لکچر کا مطالعہ کریں ۔

آزاد مرحوم سا محقق جو فلسفہ زبان فارسی کا مصنف بھی ہے ۔ اس زبان کی ممتاز خوبیوں کو اپنی سخندان فارس میں وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے ۔ خاکسار بالاختصار حوالہ قلم کرتا ہے ۔

(۱) فارسی زبان نے دوسری زبانوں خصوصاً عربی کے الفاظ مفردہ اور فارسی الفاظ کے ساتھ اُن کی تراکیب

اور خالص فارسی ترکیبوں سے وہ وہ نئے معانی اور معانی میں لطافت اور نزاکت پیدا کی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ تشنگان تفصیل سخندان فارس کے متذکرہ بالا لکچر کے چشمۂ شیریں سے اپنی پیاس بجھائیں میں یہاں بغوائے "مشتے نمونہ از خروارے" تمثیلاً ایک دو باتیں عرض کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

مثلاً ذوق عربی لفظ ہے جس کے معنی عربی میں چکھنے کے ہیں۔ فارسی زبان میں آکر "ذوق کردن" نے کیا مزیدار معنی پیدا کئے کہ اصحاب مذاق کی زبان ذوق چٹخارے بھرتی ہے مگر زبان بیان نہیں کرسکتی۔ اس ذوق وشوق کی کیفیت کے مزے دل ہی لوٹتا ہے۔ بقول شخصے ؎

حدیث سِرِّ دل دل داند و بس زبان و لب دراں محرم نباشد

مثلاً آزاد مرحوم اپنے سیاحت نامۂ ایران میں لکھتے ہیں " در شیراز روزے بر قبر خواجہ حافظ رفتم۔ فاتحہ میخواندم کہ مطلع خواجہ بخاطرم گذشت ؎ (مطلع)

در نمازم خم ابروے تو تا یاد آمد حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد

کیفیتے طاری شد کہ شرح آنرا حوصلۂ بیان بر نمے تابد۔ ایں قدرے دیدم کہ لب خندان است و دیدہ گریان و دل از ہر دو برکراں تا کہ بمنزل رسیدم میخواندم و ذوقہاے کردم"

اب اس کی اپنی مختلف ترکیبوں پر غور کرو۔ وہی اسم اور امر ہیں کہ ملکر کبھی اسم فاعل اور کبھی اسم مفعول کبھی حاصل مصدر تو کبھی اسم ظرف اور گاہے اسم آلہ کے معنی دیتے ہیں۔ ایک ہی قسم کی ترکیب پانچ مختلف معنی دیتی ہے۔ لفظ "دستگر" کو دیکھو۔ کہ بمعنی دست گیرندہ (مدد کرنے والا) اور دست گرفتہ (گرفتار) دونو معنی ایک دوسرے کے متضاد۔ مگر عبارت میں بلحاظ سیاق عبارت ہر ترکیب اپنے معنی برمحل بتاتی ہے۔ کیا مجال کہ دوسرے معنی لگ سکیں۔ مثلاً "او دراں پریشاں حالی از راہ ترحم اورا دستگیر شد (امداد نمود) اور "او در جنگ بدست دشمناں دستگیر شدہ ہلاک گشت" یعنی او بدست دشمناں اسیر یا گرفتار شد۔ اس کے سوا اور کچھ معنی نہیں ہوسکتے۔ دیکھو "در" اور "بر" افعال کے ساتھ عموماً زائد آتے ہیں۔ مگر کبھی معنی پیدا کرتے ہیں مثلاً درافتادن (لڑ مرنا) اور برافتادن (گر پڑنا) دیکھو دونو اپنا جلوہ ایک ہی جگہ دکھاتے ہیں (ع)

بادردکشاں ہرکہ درافتاد برافتاد

دوسرا امتیاز وصف یہ ہے کہ اس کے بہت سے الفاظ مفرد اور جامد معلوم ہوتے ہیں مگر مرکب اور مشتق ہیں نقل میں اصل معلوم ہوتے ہیں۔ اور معنوں کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں۔ مثلاً کمند۔ مبدل خمند کا اصل میں خم وند تھا کہ خم والی چیز ہے۔ یا مثلاً تیغ مبدل تیز ہے۔ وجہ تسمیہ ظاہر ہے۔

ذرا محاورات پر غور کرو معنوں سے فصاحت اور وضاحت ٹپکتی ہے۔ مثلاً "روغن از کدوے خشک مے برآرد"

یعنی اپنی محنت اور ہمت سے ایسی جگہ سے مطلب نکال لیتا ہے جہاں سے مطلب برآری محال ہو۔ باد پیمودن۔ آہن سرد کوفتن۔ دام بر ہوا انداختن۔ تینوں محاورے فعل عبث کے معنوں کو کس وضاحت سے بیان کرتے ہیں کہ کسی ذی فہم سے ان کا مفہوم بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

تیسرا وصف رنگینی اور شیرینی ہے۔ اس کی تشبیہات اور استعاروں کی گھلاوٹ نے فارسی کو ایسا رنگین وشیریں بنایا ہے۔ کہ صاحبان ذوق سلیم کی آنکھوں میں کھبی ہوئی ہے۔ اسی وصف کی برکت سے دلکش مناظر اور دلربا جذبات کی منہ بولتی تصویریں کھینچتی ہے۔

چوتھا وصف مبالغہ ہے کہ کلام کو اصلیت اور حقیقت سے دور پھینک دیتا ہے۔ اور صاحبان دیانت کے نزدیک کذب وافترا کی سرحد میں داخل کر دیتا ہے۔ مگر فارسی میں مبالغہ کس لطافت سے جوش تحریک پیدا کرتا ہے۔ ترغیب وتحریص دلاتا ہے۔ ادب فارسی میں اسی وصف کی بدولت جابجا قومی اور ملکی بلند ہمتی اور غیرت کے دریا موجزن ہیں۔ دیکھئے ہم کہتے ہیں "کیا کریں تن بہ تقدیر بیٹھے ہیں" ایرانی کہتا ہے "دست از جاں شستہ ام ونشستہ ام" یا "تن بہ کشتن دادہ ام" وغیرہ کہ سننے والا کانپ اٹھے کہ جو شخص اس طرح مرنے مارنے پر تلا بیٹھا ہے۔ جو کچھ کر بیٹھے سچ ہے۔ یا مثلاً ہم کہتے ہیں۔ "اس سفر میں بڑی دشواری جہاز کی سواری کی ہے" ایرانی کہتا ہے "من جہاز را پر کاہے نمے گیرم" دونوں کا مقابلہ کرو۔

"بہ بیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا"

پانچواں وصف فصاحت وبلاغت ہے۔ کہ زبان کی جان ہے۔ فصحائے ایران نے اس چمن میں وہ وہ گل افشانیاں کی ہیں کہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ذرا اس روزمرہ گفتگو پر خیال کرو۔ ایک شخص نانبائی سے روٹی لیتا ہے کہ روٹیاں ایران میں تُل کر بکتی ہیں۔ گاہک دکاندار سے کہتا ہے کم ہے۔ دکاندار جھٹ ترازو میں رکھکر دکھاتا ہے کہ دیکھو۔ کم نہیں بلکہ زیادہ ہے۔ دیکھئے ایرانی اس مطلب کو کیوں کر ادا کرتے ہیں۔

(مشتری بانانوا) کم است آغا!

(نانوا) (روٹی ترازو میں رکھکر) این یک ترازو سلام مے کند (یعنی زیادہ ہے)

اب بلبل شیراز کی نغمہ سنجی بھی سن لیجئے:۔ جاڑے کی اندھیری رات میں چوروں کی زبانی کہتے ہیں۔ "چہ حرامزادہ مردمانند کہ سنگہا را بستہ وسگہا را کشادہ" اس فصاحت پر قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔ اور ملاحظہ فرمائیے، بادشاہ ایک گدا سے کہتا ہے۔ دامن پھیلا۔ وہ کہتا ہے "دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم" صاحب مطوّل کہتے ہیں کہ کاش سعدیؒ میری ساری کتاب لے لیتے اور یہ فقرہ دیدیتے "از بستر نرمش برخاکستر گرمش نشاند" فصاحت وبلاغت کی اس بہار کی سیر کے مشتاق گلستان سعدیؒ کی سیر کریں۔

قدم قدم پر "کرشمہ دامن دل مے کشد کہ جا اینجا ست" اس گلستان رسدا بہار میں چپے چپے پر خوش بیانی کے گل بوٹے سیر کرنے والوں کے دماغوں کو معطر کرتے ہیں۔ اور انہی چیزوں نے غیر ملکوں کے لوگوں کے دلوں میں بلکہ آنکھوں میں جگہ دی۔ غرض فصاحت و بلاغت کے جواہرات سے فارسی کا مخزن ادب مالا مال ہے۔ جس سے لوگ نہال ہو گئے۔

حقیر نے اب تک جس قدر خامہ فرسائی کی محض اسلئے کہ ناظرین کرام پر روشن ہو جائے کہ زبان فارسی کی تحصیل کیوں ضروری ہے اور یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس میں میرا روئے سخن محض اُن ناظرین کی طرف ہے جو مفصلات میں رہ کر ان حالات سے کما حقہٗ آگاہ نہیں (مجھے یقین واثق ہے کہ اُن میں سے اگر ہزاروں نہیں تو بلا مبالغہ سینکڑوں میرے شاگرد ہونگے) ورنہ ایسی باتیں شہری اساتذۂ وسیع النظر کے پیش کرنا۔ "چراغ پیش آفتاب روشن کردن" یا "حکمت بہ لقمان آموختن" کا مصداق بننا ہے۔ دیہاتی معلمین جو اُن مدارس میں زبان فارسی کی بنیاد رکھتے ہیں۔ انہیں شاید یہ مضمون فارسی کی تعلیم میں رہنمائی کر سکے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ فارسی زبان اُن بیشمار خوبیوں کی حامل ہے جو ایک مہذب علمی زبان میں ہونی چاہئیں یہ امر مسلّمہ ہے کہ ہمارے ملک میں ابتدائی تعلیم کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے۔ جس کی تکمیل کے بغیر طلبا دوسرے مضامین سمجھنے میں کما حقہٗ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اور اُردو زبان پر حاوی ہونا زبان فارسی کی تحصیل پر منحصر ہے۔ کیونکہ بقول آزاد مرحوم "اُردو نے فارسی کا دودھ پی کر پرورش پائی ہے" جس کے معنی یہ ہیں۔ کہ اُردو کے ذخیرۂ الفاظ میں فارسی الفاظ اور عربی مستعملہ فارسی کا عنصر غالب ہے۔ پُرانے اُردو علم ادب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُردو میں بجز ہے۔ ہیں سے۔ اور وغیرہ افعال و روابط ٹھوس فارسی فقرات بھرے ہوئے ہیں۔ مثلاً انشا مرزا جانجاناں مظہر کو لکھتے ہیں "اشتیاق مالا یطاق تقبیل عتبۂ عالیہ نہ بحدے تھا کہ سلک تحریر و تقریر میں منتظم ہو سکے،، ذرا غور کرو کہ از قبیل اردو عبارات کو سمجھنے کیلئے فارسی زبان پر کافی عبور کس قدر ضروری ہے۔ اس جملے میں اگرچہ جمیع الفاظ عربی ہیں مگر مستعملہ فارسی ہیں اور ترکیب فارسی کے ساتھ آئے ہیں۔ جملہ مذکور اب بھی اگر بولینگے تو کہینگے "مجھے آپ کی قدمبوسی کا بیحد شوق اس قدر نہ تھا۔ کہ تحریر و تقریر میں سما سکے،، اس میں بھی دیکھ لو کس قدر فارسیت ہے۔ علاوہ ازیں قواعد صرف و نحو کی اصطلاحات گو عربی ہیں اُردو نے فارسی سے لیں۔ اور فارسی کے محاورات اور ضرب الامثال کا ترجمہ کر کے انہیں اُردو کا لباس پہنایا جو زبان کی وسعت کا باعث ہوا۔ ایک فارسی خواں اُردو میں اُن کا مفہوم فوراً سمجھ سکتا ہے۔ کیونکہ فارسی میں اُس کے معنی سے وہ آشنا ہے۔

فارسی کی تدریس ہمارے مدارس میں

اکنوں آمدم بر سرِ مطلب۔ یعنی اب میں فارسی کی تدریس پر اپنے ناقص تیئیس سالہ تجربہ کی بنا پر کچھ روشنی ڈالوں۔ کیونکہ مجھ سے فرمائش بھی کی گئی تھی۔ کہ فارسی کے طریقہ تعلیم کے متعلق کچھ خامہ فرسائی کروں۔ بقول غالب مرحوم (ع) "منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی" نمود و نمائش مقصود نہیں۔ کہیں ریو و ریا کا شبہ نہ ہو۔

ناظرین باتمکین! ابتدائے ملازمت سے اب تک خاکسار کا واسطہ اُردو و فارسی کی زبانوں کی تعلیم سے رہا۔ اِس امر کا نہ تو مجھے دعویٰ ہے نہ فخر کہ مجھ سے ان کی تعلیم کا کما حقہٗ حق ادا ہو سکا۔ مگر اس امر سے ہمیشہ مطمئن رہا کہ اپنی بساط کے مطابق شوق سے پڑھاتا رہا۔ اور شوق ہی دنیا میں وہ چیز ہے۔ کہ بقول شخصے (ع) "شوق در ہر دل کہ باشد رہبرے درکار نیست" محکمانہ تربیت (ٹریننگ) کے اصولوں کی اندھی تقلید نہیں کی۔ جن کا جہاں موزوں استعمال دیکھا استعمال کر لیا۔ میرا اپنا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی تربیت گاہ (ٹریننگ انسٹیٹیوشن) معلم نہیں بنا سکتی۔ جب تک اُس میں تعلیم و تعلّم کا طبعی ذوق شوق موجود نہ ہو۔ ہاں جس میں یہ مادہ ہوگا۔ تربیت سے ضرور چمکیگا۔ اور اُس کی جلا ہوگی۔ تربیت سے ہمیشہ ہر شخص حسبِ قابلیت کسبِ فیض کرتا ہے بقول شخصے ؎

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

زمانۂ سلف کے اساتذۂ مشاہیر کو دیکھو کس ٹریننگ کالج کے تربیت یافتہ تھے۔ مگر اپنے فیضانِ تعلیم سے ہزاروں شاگردوں کو استادِ زمانہ بنا گئے۔

تدریس زبان فارسی در ملکِ ہند

فارسی زبان جیسا کہ سطورِ بالا میں بار بار دہرا گیا ہے۔ ایک دلکش شیریں زبان ہے۔ پھر ہمارے مدارس میں طلبا کو اس سے کیوں دلچسپی نہیں۔ یہ تدریسی نقص ہے۔ ابتدائی تعلیم کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ طلبا ہمیشہ اسے روکھی پھیکی زبان سمجھتے رہتے ہیں۔ بمصداق ؎

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا مے رود دیوار کج

مَیں نے ابتدائے ملازمت میں ورنیکلر مڈل سکولوں کے بعض استادوں سے سُنا اور مکرر سنا۔ کہ اینگلو ورنیکلر

سکولوں میں طلبا اُردو فارسی میں شوق نہیں لیتے۔ اس لئے ہم تو وہاں جانا پسند نہیں کرتے۔ مجھ سے میرے کئی دوستوں نے بارہا از راہِ استعجاب پوچھا۔ کہ یار تم انگریزی سکولوں میں کس طرح گزارہ کرتے ہو۔ میں نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ مجھے تو کوئی شکایت نہیں میرے طلبہ میرے مضمونوں میں برابر کی دلچسپی لیتے ہیں۔ میرے متعلق فاضل افسران معائنہ کے یہ ریمارکس قائل ہیں کہ "مدرس زبانِ فارسی کی تعلیم کا بہت شوق رکھتا ہے" مکرر عرض کرتا ہوں کہ ناظرین ان باتوں کو خود ستائی پر محمول نہ کریں۔

تدریسی نقائص میں محض اساتذہ ہی ذمہ دار نہیں ہیں۔ بلکہ اس بارے میں بہت سی ذمہ داریاں صیغۂ معارف پر بھی عاید ہوتی ہیں مثلاً :-

ا۔ ابھی کل کی بات ہے۔ کہ فارسی ہمارے مدارس میں چوتھی جماعت سے شروع ہوا کرتی تھی۔ جسے اب ساتویں جماعت سے شروع کیا جاتا ہے۔ (ع) بہ بیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا۔ فارسی کے اس تنزل سے اُردو پر بہت بُرا اثر پڑا اور پڑنا چاہیئے تھا۔ سکولوں میں پڑھانے والے خوب واقف ہیں (ع) کجا دانند حال ماسبکساران ساحلہا۔ یہاں یہ جتا دینا ضروری ہے۔ کہ محکمے کے اربابِ حل و عقد نے طلبہ کی نازک دماغی کو مدِنظر رکھکر اُن پر رحم کیا ہے کہ ایک ہی وقت میں بہت سی زبانیں نہ سکھائی جائیں۔ بیشک طریقۂ تعلیم کے فلسفیانہ اصولوں کے ضرور یہ بات خلاف ہوگی جیسا کہ ایک فلاسفر کا قول ضرب المثل ہے "حساب جوں کا توں اور کنبا ڈوبا کیوں" مگر عملی طور پر ہم دیکھتے ہیں۔ کہ وہ طالب علم اچھی لیاقت کے طالب علم تھے، جن پر وقتِ واحد میں متعدد زبانوں کے سیکھنے کا بارِ گراں پڑ جاتا تھا۔ جسمانی طاقت کے لحاظ سے بھی وہ ان سے بدرجہا اچھے تھے۔ طب کا مسئلہ ہے۔ کہ جس قدر زود ہضم اور لطیف غذا کھائی جائے۔ کہ جس کے ہضم میں معدے کو بہت کم کام کرنا پڑے تو معدہ کمزور ہو جاتا ہے۔ یہی حال ہمارے موجودہ طالبعلموں کا ہے۔ یہ امر تفصیل طلب ہے۔ انشاء اللہ اسے الگ مضمون کی صورت میں محکمہ عالیہ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

۲۔ نصابِ تعلیم کے مقرر کرنے میں کافی اور ضروری احتیاط سے کام نہیں لیا جاتا۔ مثال کے طور پر دیکھئے۔ کہ گلستاں کے پہلے دو باب کا انتخاب جن کی طرزِ تحریر اور مضامین عالمانہ ہے۔ اور مصنف نے اُن کے لکھنے میں پورا زور خرچ کیا ہے۔ کیونکہ اُن میں بادشاہوں اور درویشوں کی طرف خطاب ہے۔ ابتدائی جماعتوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ اور دوسرے ابواب کا انتخاب بڑی جماعتوں میں۔ جو طریقۂ تعلیم کے اس زریں اصول کے صریحاً خلاف ہے کہ "آسان سے مشکل کی طرف چلو" اگر محکمہ عالیہ چند چیدہ تجربہ کار اساتذۂ زبانِ فارسی کی ایک کمیٹی انتخاب نصاب کیلئے مقرر کرے اور ماہرین زبان مذکور جو محکمے میں مناصبِ رفیعہ اور مدارجِ منیعہ پر فائز ہیں احتساب کا کام کریں تو ایک معقول نصاب مقرر ہو سکتا ہے۔

۳۔ ہمارے مدارس ثانوی میں زبان فارسی اور دیگر السنۂ شرقیہ (کلاسیکل لنگوئجز) کی ترغیب کے سامان مفقود ہیں پُرانا ذخیرۂ ادب تو کم و بیش سب سکولوں میں موجود ہے مگر مبتدیوں میں شوق پیدا کرنے کے لئے چھوٹی چھوٹی سلیس فارسی کتب لائبریری میں ہونی چاہئیں جن میں علاوہ سلاست عام فہم دلکش مضامین۔ لطائف اور حکایات ہوں۔ اس نقص کی تلافی کے لئے محکمہ عالیہ ایران سے بہت سی نظم و نثر کی قدیم و جدید کتب جو اس مطلب کیلئے موزوں ہوں منگوا سکتا ہے۔ اور یہاں بھی لکھی جا سکتی ہیں۔

۴۔ مدارس میں قابل ہیڈ ماسٹر صاحبان اور فاضل افسران معائنہ اِن زبانوں کی تعلیم کو بہت ضروری خیال نہیں کرتے اور اسی لئے ان کی دیکھ بھال میں کماحقہٗ حصّہ نہیں لیتے۔

۵۔ جے۔ وی۔ اور ایس۔ وی جماعتوں میں کم از کم فارسی زبان کی تعلیم کا معیار وہی ہونا چاہئے۔ جو آج سے پچیس تیس سال پہلے تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمیں ایس وی کلاس میں استاد نے علم عروض علم معانی بیان اور صنائع بدائع کے متعلق جو کچھ لکھوایا تھا۔ منشی فاضل کے امتحان میں اتنے ہی کی ضرورت تھی وہ کاپی میرے پاس اب تک موجود ہے۔ اور اب ایس وی کلاس کے پرچے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی حالت اور موجودہ حالت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اُس وقت کے ایس وی اب تک کامیابی سے ہائی سکولوں میں کام کر رہے ہیں۔

اب وہ باتیں عرض کرتا ہوں جو معلمین زبان فارسی سے تعلق رکھتی ہیں۔

۱۔ عموماً الفاظ کے معانی اور عبارت کے ترجمے کے رٹوانے کی طرف زور دیا جاتا ہے۔ اور اسی کو اصل مقصود سمجھ لیا جاتا ہے۔ صرف و نحو کے قواعد بھی اسی طرح یاد کرائے جاتے ہیں علے ہذ القیاس اُردو سے فارسی میں ترجمے کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا ہے۔ یعنی پیٹنٹ ترجمہ بلیک بورڈ پر لکھ دیا جاتا ہے۔ کہ طلبہ کاپیوں پر نقل کرلیں اور زیادہ سے زیادہ حفظ بھی کرلیں۔ لیکن اگر لڑکے نے ”تو نے کہا“ کا ترجمہ ”توگفتی“ یاد کرلیا ہے۔ اگر اُس سے پوچھا جائے تو فر فر سُنا دیتا ہے۔ لیکن اگر اُسے کہا جائے کہ ”میں نے کہا“ کا ترجمہ کرو تو نہیں کرسکتا۔ ”میں نے کہا“ کا ترجمہ ہائی کلاسز چھوڑ کالج کے بعض طلبہ بھی ”من گفت“ کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں زبان فارسی میں جو اخلاقی تعلیم کوٹ کوٹ بھری ہوئی ہے خصوصاً گلستان اور بوستان میں۔ اس کی طرف طلبہ کی توجہ نہیں دلائی جاتی۔ ترجمے پر ہی اکتفا جاتا ہے۔ لیکن مطالب مذکور مزید تشریحات کے محتاج ہیں اور ساتھ ہی طرز بیاں مؤثر ہو کہ وہ باتیں دلنشیں ہوجائیں۔ اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ کہ بعض اوقات ایک پیریڈ میں بوستاں کے ایک ہی شعر کی تشریح ہوسکتی ہے اور وہ بھی طلبہ کی استعداد اور ضرورت کے مطابق۔ ورنہ بلا مبالغہ بوستاں کے ایک ایک شعر پر اور گلستاں کے ایک ایک فقرے پر ایک مبسوط کتاب لکھی جاسکتی

ہے ہاں مقدار نصاب کے مقابلے میں قلت وقت کی شکایت ضرور ہے۔ اس کا ایک علاج تو یہ ہے۔ کہ معلّمین زبان فارسی یک زبان ہو کر اس کے لئے صدائے احتجاج بلند کریں۔ اور جب تک محکمہ عالیہ اس کی اصلاح نہ کر دے آواز بلند کئے جائیں۔ اس بیماری کا مقامی علاج جو ہمارے بس میں ہے اس سے بہتر کوئی نہیں ہو سکتا۔ کہ ہم تھوڑا پڑھائیں۔ مگر جس قدر پڑھائیں۔ اس طرح سمجھا کر کہ اُس سے طلبہ میں شوق پیدا ہو جائے۔ ہر مضمون میں کامیابی کا واحد گُر شوق کا پیدا کرنا ہے۔

کچھ دن ہوئے ٹریننگ کالج سے ایک سلیبس مشرقی زبانوں کے نصاب متعلق آیا تھا۔ اس میں مڈل کی جماعتوں کے لئے فی سال سَو صفحہ تجویز کیا ہوا تھا جو مناسب و موزون ہے۔ اساتذہ کو چاہیئے کہ سابقہ سہ سالہ نصاب کی کتابوں میں سے سو صفحہ ساتویں کے لئے اور سَو صفحہ آٹھویں کے لئے منتخب کر لیں۔ لاہور میں اورینٹل ایسوسی ایشن قائم ہے جس کی مساعی جمیلہ سے میٹریکولیشن کے نصاب فارسی کی کچھ اصلاح ہو گئی ہے پنجاب کے دیگر اساتذۂ السنہ شرقیہ نے ایسوسی ایشن مذکور سے الحاق نہیں کیا۔ اگر ایسا ہو جائے تو ملکر کچھ مفید کام ہوتا رہے۔ عنقریب رسالہ رہنمائے تعلیم کے ذریعے اورینٹل ایسوسی ایشن کے اغراض و مقاصد شایع کئے جائینگے۔

اب خاکسار اپنا دستور العمل جسے تعلیم میں مدِ نظر رکھتا ہے عرض کر کے مضمون ختم کرتا ہے۔

۱۔ ابتدائی جماعتوں میں الفاظ کے تلفظ کی صحت اور عبارات کی قرأت کے اصولوں کی پابندی کے علاوہ تراکیب فارسی اچھی طرح ذہن نشین کرائی جائیں۔ مثلاً مضاف مضاف الیہ۔ اشارہ مشارٌ الیہ۔ جار مجرور وغیرہ

۲۔ افعال کی شناخت اور اُن کے بنانے کے طریقے خوب سمجھا کر یاد کرائے جائیں۔ طوطے کی طرح رٹوائے نہ جائیں۔ ضمائر منفصل اور متصل کی اصطلاحیں تو شروع میں نہ بتائی جائیں۔ البتہ تصوّر ذہن نشین کر دیا جائے۔ ضمائر متصل فاعلی اور ضمائر منفصل فاعلی کی مطابقت سمجھا دی جائے۔ لڑکے طوطے کی طرح گردان رٹ لیتے ہیں۔ لیکن اگر کسی صیغے کے معنی پوچھے جائیں تو ندارد۔ وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ "گفتند" میں انہوں نے کس لفظ کے معنی ہیں۔ ند۔ ی۔ ید م۔ یم ضمائر متصل فاعلی کی شناخت خوب اچھی طرح کرائی جائے۔ اور ضمائر منفصل کے ساتھ مطابقت بھی اچھی طرح ہو جائے یعنی مشق کے لئے ما گفتم۔ تو گفتید۔ شما گفتی کو درست کرایا جائے اور وجہ درستی دریافت کی جائے۔ یہ بنیادی غلطیاں ہیں کہ اعلیٰ جماعتوں تک چلی جاتی ہیں۔

۳۔ قرأت کی درستی کے بعد مشکلات کی تشریح ایسے پیرائے میں کیجائے جو کہ طلبا کی دلچسپی کا باعث ہو۔ اسی ضمن میں صرف و نحو کے مسائل ضرور یہ بھی بتلاتے جائیں۔ کہ وہ بھی مطالب کے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ مثلاً مبادا کے معنی صرف "ایسا نہ ہو" بتا دینے کافی نہیں اس کی پوری تشریح کی جائے۔ گرامر کا علیحدہ کوئی سبق نہیں ہونا چاہیئے جیسا کہ بعض اساتذہ ایک پیریڈ گرامر کا ٹائم ٹیبل میں رکھتے ہیں۔ گرامر عملی طور پر ریڈنگ اور ترجمے کے اسباق کے

ساتھ ساتھ ہونی چاہیئے۔ ہر سبق میں ایک دو مسئلے مدنظر رہیں۔ جن میں باہم ربط بھی ہو۔ مثلاً اگر مرکب اضافی بتائیں تو اسی سبق میں دیکھیں کہ فک اضافت اور قلب اضافت کی صورت موجود ہے یا اقسام اضافت میں سے کوئی قسم بتائی جائے۔ کہیں علامات اضافت میں سے کوئی سمجھا دی جائے۔ غرض "جوئندہ یابندہ" جب مدرس کو شوق ہو تو ایسا سلسلہ آپ سے آپ مل جاتا ہے۔ اگر آج ایک سبق میں ایک بات بتائی ہے۔ تو اگلے روز کے سبق میں ضرور پوچھنا چاہیئے۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ طلبا اُس پر حاوی ہو گئے ہیں۔ قرأت کے اسباق میں کسی مشکل اور ضروری لفظ یا محاورے کے معنی اچھی طرح دلنشین کرنے کیلئے ایک ایسا اُردو فقرہ بنا کر اُس کا فارسی میں ترجمہ کرایا جائے۔ جس میں اس لفظ یا محاورے کا استعمال ہو جائے۔ مثلاً "دل در کسے مبند کہ دل بستۂ تو نیست" میں "دل بستن" محاورہ ہے۔ اب ایک تو دل بستہ سے حاصل مصدر اسمی بنوایا جائے۔ اور ترجمہ کے لئے فقرہ دیا جائے "دنیا دل لگانے کے قابل نہیں" اسکا ترجمہ طلبہ "دنیا قابل دلبستگی نیست" آسانی سے کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ دلبستگی دلنشین ہو گئی ہو۔ کچھ استاد "دنیا دل بستگی را نشاید" بھی بتا سکتا ہے۔ غرض قرأت۔ صرف و نحو اور ترجمے کی تعلیم ساتھ ساتھ ہونی چاہیئے۔

۴۔ بعض مشکل فقرات کو آسان فارسی الفاظ میں تبدیل کرانا چاہیئے۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ طلبا اُن کے مفہوم پر حاوی ہو گئے ہیں یا نہیں۔ مثلاً "او غریق بحر فنا گردید" اس کا ترجمہ "وہ بحر فنا میں غرق ہوا" یا وہ فوت ہو گیا" اب طلبہ سے اگر کہا جائے کہ آسان فارسی الفاظ میں اُس کو تحویل کرو تو وہ آسانی سے "او فوت شد" یا "او بمرد" کر سکتے ہیں۔ یا مثلاً "دگرت از دست بر آید دہنے شیریں کن" کا مفہوم سمجھانے کے بعد طلبہ اُس کو "اگر بتوانی بہ کسے راحت رساں" میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ اگر بالفرض طلبا آسانی سے آسان الفاظ میں تبدیل نہ کر سکیں تو استاد اسطرح بتا سکتا ہے سبق میں دلچسپی بھی ہوگی اور طلبہ کی رہنمائی بھی کہ وہ آئندہ اس طرح مشکل عبارات کو آسان لفظوں میں تبدیل کر سکیں گے میں نے عملی طور پر کر کے دیکھا ہے۔ کوئی دقت پیش نہیں آتی۔

۵۔ بعض فارسی فقرات میں فعل یا اسم کے صیغوں میں تبدیلی کر کے عبارت درست کرائی جائے۔ اس سے بھی طلبہ کے دماغ پر زور پڑتا ہے۔ مثلاً "تُرا باید کہ امروز بروی" میں اگر تُرا کو مرا سے بدل دیں تو فقرہ کس طرح ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ علاوہ ازیں غلط فقرات کی درستی۔ نامکمل فقرات کی تکمیل سوالات کے جوابات۔ خالی جگہوں کو پُر کرنا بھی حسب استعداد طلبہ پیش نظر رہے۔ یہ باتیں "مشتے نمونہ خروارے" ہیں۔ اگر اساتذہ اپنے دماغ سے کام لیں گے۔ تو انہیں ان سے بہتر اور بیشتر ملینگی +

———

جیومیٹری کا ایک اہم سوال

اور

اس کا نیا اور صحیح قاعدہ

(جناب لالہ موہن لال صاحب بھلہ بی اے بی ٹی پی ای ایس ہیڈ ماسٹر سنٹرل ماڈل سکول لاہور)

جماعت ہشتم کی ایک جیومیٹری کی کتاب میں مندرجہ ذیل سوال درج ہے۔ جس کے حل کرنے کے قواعد اور جوابات میں لوگوں کا بہت اختلاف ہے۔ ہم عام ناظرین کی تفریح اور اہل علم اور اس مضمون میں خاص مذاق رکھنے والے اصحاب کی دلچسپی کے لئے وہ تمام اختلافات معہ اس کے صحیح حل کے پیش کرتے ہیں۔

سوال۔ ایک مکعب صندوق کا کنارہ ایک فٹ ۱۰ انچ ہے۔ بتاؤ اُس میں کتنی پنسلیں آئینگی جبکہ ہر ایک پنسل 7 انچ لمبی ہو۔ اور اس کے سرے کا قطر $\frac{1}{2}$ انچ ہو ($\pi = \frac{22}{7}$)

سوال کی عبارت میں ایک سُقم ہے۔ اور وہ یہ کہ صندوق کے کناروں کے متعلق صاف طور پر یہ ظاہر نہیں کیا گیا۔ کہ وہ اندرونی کنارے ہیں یا بیرونی۔ لیکن اگر بیرونی ہوتے۔ تو اُس صورت میں لکڑی کی موٹائی بتائی جانی چاہیئے تھی۔ چونکہ موٹائی نہیں بتائی گئی۔ اسلئے فرض کرنا پڑتا ہے کہ لمبائی اندرونی کناروں کی ہے۔ اس کے حل کرنے میں (۱) اکثر اصحاب یہ قاعدہ استعمال کرتے ہیں۔ کہ اول صندوق کی کل جسامت معلوم کر لی۔ پھر ایک پنسل کی جسامت دریافت کر کے صندوق کی جسامت کو ایک پنسل کی جسامت پر تقسیم کر دیا۔ جیسا کہ حسب ذیل ہے:۔

صندوق کی ہر طرف کا طول = ۱ فٹ ۱۰ انچ = 22 انچ

صندوق کی اندرونی جسامت $= 2 \times 22 \times 22 = 10648$ مکعب انچ

پنسل کے سرے کی سطح کا رقبہ $= \frac{1}{4} \times \frac{1}{4} \times \frac{22}{7} = \frac{11}{56}$ مربع انچ

پنسل کا طول = 7 انچ

پنسل کی جسامت $= \frac{11}{56} \times 7 = \frac{11}{8}$ مکعب انچ

کل پنسلوں کی تعداد $= 10648 \div \frac{11}{8} = \cancel{10648}^{968} \times \frac{8}{11} = 7744$

اور یہی جواب کتاب میں بھی درج ہے۔

لیکن اس کے غلط تسلیم کرنے میں کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جب ہم صندوق کی کل جسامت کو ایک پنسل کی جسامت پر تقسیم کر کے کل پنسلوں کی تعداد معلوم کرتے ہیں۔ تو اس کے یہ معنی نہیں کہ صندوق میں ایک ذرہ بھر جگہ خالی نہیں رہ سکتی اور پنسلیں صندوق میں آٹے کی طرح بھری ہوئی ہیں۔ حالانکہ یہ امر واقع کے بالکل خلاف ہے۔ ہر ایک سمجھدار آدمی خیال کر سکتا ہے کہ پنسلوں کے درمیان خالی جگہ ضرور ہوگی۔ پس پنسلوں کی مندرجہ بالا تعداد کسی طرح بھی صندوق میں نہیں سما سکتی۔

(۲) بعض اصحاب مندرجہ بالا قاعدہ کو غلط سمجھتے ہیں۔ اور پنسلوں کے درمیان خلا رہنے کے قائل ہیں۔ مگر وہ اسے

شکل نمبر 1

22 انچ

اس طرح حل کرتے ہیں۔ کہ صندوق کی تہ میں پنسلوں کو ساتھ ساتھ بچھا دیا۔ چونکہ پنسل کی موٹائی $\frac{1}{2}$ انچ ہے۔ اسلئے صندوق کے ایک کنارہ کے ساتھ ساتھ تہ پر ۴۴ پنسلیں بچھ سکینگی۔ اور چونکہ ہر پنسل ۷ انچ لمبی ہے۔ پس اس قسم کی تین قطاریں آگے پیچھے آسکینگی۔ جن میں $44 \times 3 = 132$ پنسلیں آجائیں گی۔ اب سات سات انچ لمبی تین قطاریں لگ جانے کے بعد ایک طرف ایک انچ جگہ بچ جائیگی۔ جس میں دو دو پنسلیں ساتھ ساتھ آکر سات سات انچ لمبی 3 قطاریں لگ سکتی ہیں۔ پس اس طرح چھ پنسلیں اور آگئیں۔ گویا ایک تہ میں $132 + 6 = 138$ پنسلیں آگئیں جیسا کہ شکل نمبر 1 سے ظاہر ہے۔

اب وہ لوگ کہتے ہیں کہ چونکہ صندوق 22 انچ ہی اونچا ہے۔ اسلئے آدھی آدھی انچ موٹی اس میں 44 تہیں آئینگی۔ پس اس طرح آئی ہوئی پنسلوں کی تعداد $= 138 \times 44 = 6072$

اب صندوق کے ایک کونہ پر ایک انچ مربع پیندے کی اور 22 انچ اونچی جگہ اور بچ جائیگی۔ جس میں ساتھ ساتھ چار چار پنسلیں کھڑی آکر ایسی تین قطاریں نیچے اوپر آسکتی ہیں۔ اور اوپر ایک مکعب انچ جگہ بالکل بیکار بچ جاتی ہے۔ پس اس طریق سے 12 پنسلیں اور آگئیں۔

پس کل پنسلوں کی تعداد $= 6072 + 12 = 6084$

(۳) مگر ان اصحاب کو بھی مغالطہ لگتا ہے۔ وہ اگر اس کام کو عملی طور پر کر کے دیکھیں تو انہیں معلوم ہوگا۔ کہ اس طرح نیچے اوپر تہیں لگانے سے ایک پنسل دوسری کے عین اوپر نہیں آیا کرتی۔ جیسا کہ شکل نمبر 2 میں ہے۔ بلکہ ہر تہ کی پنسلیں اپنی پچلی تہ کی پنسلوں کے درمیان آجایا کرتی ہیں۔ جیسا کہ شکل نمبر 3 میں دکھایا گیا ہے۔

شکل نمبر 2

اس طرح ہر تہ کی موٹائی نصف انچ سے کچھ کم ہو جاتی ہے اور اسلئے کل تہوں کی تعداد ۴۴ سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ مندرجہ بالا دوسرا قاعدہ بھی اور تعداد بھی غلط ہے۔

ہم اس تعداد کا صحیح صحیح اندازہ یوں لگاتے ہیں:-

سب سے نچلی تہ کی بلندی پورا نصف انچ ہے۔ اوپر والی تہ کی بلندی ا ب خط کے اوپر سے شروع ہو کر ج د خط تک ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اوپر کی تہ کا جو حصہ خط ا ب کے نیچے ہے۔ وہ اسکی بلندی میں شمار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ پہلی تہ کی پنسلوں کے درمیان سما چکا ہے۔

شکل نمبر 4

اس کی صحیح بلندی معلوم کرنے کے لئے ہم پنسلوں کے دائروں کو ذرا بڑا بنا کر سامنے رکھتے ہیں۔ دیکھو سامنے کی شکل نمبر 4 میں پنسلیں اسی حالت میں پڑی ہیں۔ جیسی ہمیں درکار ہیں۔ تینوں پنسلوں کے مرکزوں کو ملانے سے ایک متساوی الاضلاع تکون س ج ی پیدا ہو گئی۔ جس کے تینوں اضلاع نصف نصف انچ ہیں۔ پس اس کا درمیانی عمود س ص $\frac{1}{2} \times .866$ یعنی 433. انچ ہوگا۔
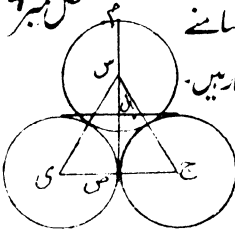
چونکہ ص ل = س م = ½ انچ

پس ل م بھی = 433. انچ ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ صرف پہلی تہ کی پنسلوں نے ½ انچ اونچی جگہ گھیری ہے۔ باقی اوپر کی ہر ایک تہ 433. انچ جگہ گھیرے گی۔ پس پہلی قطار کے بعد جو جگہ اوپر بچی = 22 - 5. = 21.5 انچ۔

```
        49
433 ) 21500
      1732
      4180
      3897
```

پس اوپر کی تہوں کی تعداد = 21.5 ÷ 433. = 21500 ÷ 433

= 49

پس نچلی تہ سمیت کل تہوں کی تعداد = 49 + 1 = 50

یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ سب سے نچلی تہ میں 44 پنسلیں آئینگی۔ اور اس سے اوپر کی تہ میں 43 — اسی طرح تیسری تہ میں پھر 44 پنسلیں آئینگی اور چوتھی میں 45 علی ہذا القیاس۔ اس طرح 50 تہوں میں 25 تہیں تو 44 پنسلوں والی ہونگی اور 25 تہیں 43 والی۔

پس ان تہوں میں پنسلوں کی تعداد $= 25 \times 44 + 25 \times 43$

$= (43+44) \times 25 = 87 \times 25$

$= 2175$

اور چونکہ صندوق کے پیندے میں اس قسم کی 3 قطاریں ہیں۔ پس تینوں قطاروں میں پنسلوں کی تعداد

$2175 \times 3 = 6525$

اب ایک انچ خالی جگہ میں جیسے کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ جو پنسلیں ساتھ ساتھ رکھکر ایسی 3 قطاریں لمبائی میں آنے سے ہر تہ میں 6 پنسلیں اور آ جائینگی۔ مگر یاد رہے کہ یہ تہیں ایک دوسری کے درمیان میں نہیں آئینگی۔ بلکہ ایک دوسری کے عین اوپر آئینگی اور اسلئے ان کی تعداد 44 سے زیادہ ہوگی۔ پس 44 تہوں میں پنسلوں کی تعداد $= 6 \times 44 = 264$

اب کونہ والی ایک انچ مربع اور 22 انچ اونچی جگہ میں 12 پنسلیں اور آ جائینگی۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔

پس کل پنسلوں کی تعداد $= 6525 + 264 + 12 = 6801$ اور یہی تعداد صحیح ہے۔

اب مقابلہ سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ پہلا جواب اصلی سے بقدر 943 کے زیادہ ہے۔ اور دوسرا جواب اصلی جواب سے بقدر 717 پنسلوں کے کم ہے۔

(۴) اس سوال کو ہم ایک اور آسان طریق سے بھی حل کر سکتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ پہلے اس اصول کو ذہن نشین کر لیں کہ جب گول چیزیں اس طریق سے قطاروں کی شکل میں نیچے اوپر لگائی جائیں۔ تو ان سے ایک مثلث متساوی الاضلاع پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ نچلی شکل نمبر 5 میں سروں والی پنسلوں کے مرکزوں کو ملانے سے ظاہر ہوتا ہے۔ جس میں پنسلوں کی تہوں کی تعداد اتنی ہی ہے۔ جتنی پیندے کی قطاروں میں پنسلوں کی تعداد۔

شکل نمبر 5
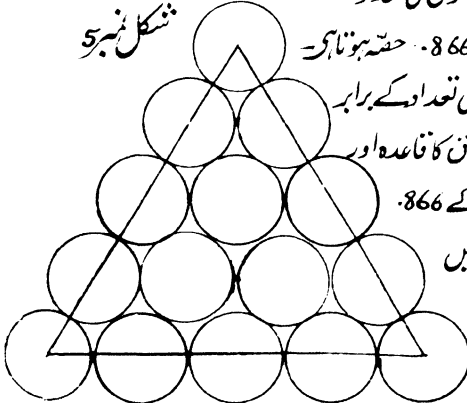
اور چونکہ مثلث متساوی الاضلاع کا عمود قاعدہ کا 866. حصہ ہوتا ہے۔ اسلئے بلندی کے 866. حصہ میں پیندے کی پنسلوں کی تعداد کے برابر قطاریں آ جائینگی۔ اور چونکہ مندرجہ بالا سوال میں صندوق کا قاعدہ اور بلندی برابر ہے۔ پس معلوم ہو سکتا ہے کہ جب بلندی کے 866. حصہ میں 44 پنسلیں آ سکتی ہیں تو کل بلندی میں کتنی پنسلیں سما سکیں گی۔

866. میں سما سکتی ہیں = 44 پنسلیں

تو 1 " $= \frac{44}{.866}$

$50 = \frac{44000}{866}$

866) 44000 (50
4330

پس 50 تھنوں میں جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے ۔ 25 تھنیں 44 والی ہونگی اور 25 تھنیں 43 والی۔ اس سے آگے اسی طـــرح عمل ہو گا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے +

یہ سوال درحقیقت جماعت ہشتم کی قابلیت سے بہت ہی بالا ہے۔ اور اس جماعت کے طلبا اس کا صحیح جواب معلوم کرنے کے بالکل ناقابل ہیں۔ پس اس جماعت کی کتاب میں اس قسم کا سوال درج کرنا طلبا کو مغالطہ اور الجھن میں ڈالنا ہے۔ نہ ہی اس قسم کے سوالات کا تخمیناً جواب نکالنا سوال کے منشا کو پورا کرتا ہے۔

علاوہ ازیں اس قسم کے سوالات طلبہ کی علمی اور عملی واقفیت میں ، بجائے مطابقت پیدا کرنے کے تفاوت پیدا کر دیتے ہیں۔ جو تعلیم کے منشا اور مفاد عامہ ہر دو کے خلاف ہے۔ کیونکہ اُن کی غلط رہنمائی کرنے والی عبارت ($\pi = \frac{22}{7}$) عملی کسوٹی پر اُنہیں پورا نہیں اترنے دیتی ۔ اور اس وجہ سے اندیشہ ہے ۔ کہ طلبہ علمی اور عملی ریاضی کو دو مختلف مضامین خیال کرنے لگیں ۔ حالانکہ یہ دونوں ایک ہی ہیں ۔

یہ سوال درحقیقت ایک بڑے پایہ کا سوال ہے ۔ اگرچہ اس جماعت کے معیار سے بالا ہے ۔ اگر یہ مناسب موقعہ پر درج کیا جاتا اور صحیح طریق سے حل کیا جاتا ۔ تو اس کے صحیح حل کرنے سے جیسی دماغ کی تربیت ہوتی ۔ ویسا ہی عملی واقفیت میں بھی معقول اضافہ ہوتا +

لطیفہ

ایک دفعہ کا ذکر ہے ۔ کہ ایک گویا کسی بوٹ شاپ کے مالک کے ہاں بطور مہمان گیا۔ مالک کارخانہ نے مہمان کی خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میزبان نے مہمان سے کہا ۔ کہ میاں آجکل تمہارے گانے کی بہت شہرت ہے ۔ ذرا ہمیں بھی تو سناؤ ۔ چنانچہ گویے نے اپنی سریلی آواز سے کچھ ایسا اچھا گایا کہ مالک کارخانہ خوشی کے مارے جھومنے لگا۔ اتفاق سے کسی دن وہی دکاندار اسی گویے کے ہاں پہنچا ۔ اُس نے بھی مہمان کی خوب آؤ بھگت کی ۔ دعوت سے فارغ ہونے کے بعد گویے نے اپنا پھٹا پُرانا بوٹ اپنے مہمان کے آگے رکھ دیا ۔ دکاندار حیران ہو کر پوچھنے لگا ۔ کہ میاں ۔ یہ کیا ماجرا ہے ۔ میزبان نے جواب دیا کہ جب مَیں تمہارے ہاں مہمان تھا ۔ تو تم نے مجھ سے گانا سنا اور اپنے تئیں خوش کیا ۔ اور تمہیں معلوم ہے کہ میں نے گانے میں ذرا بھی تامل نہ کیا کیونکہ گویے کو گانے کے سوا اور کام ہی کیا ہے ۔ تم بوٹوں کے کارخانہ کے مالک ہو اور میرا پھٹا پرانا بوٹ تمہارے سامنے ہے ۔ ذرا مہربانی فرما کر اس کی مرمت تو کر دو ۔

لطف سخن

(تاج الشعرا فصیح العصر ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی جانشین داغ مرحوم)

ملادی اے ہوس مٹی میں ساری آبرو میری / نکل جا اب مرے دل سے نہ میں تیرا نہ تو میری

بنی تھی بات ضبطِ دردِ غم سے چارسو میری / مگر اشکوں نے بہ کر ڈبو دی آبرو میری

وہ کیوں پوچھیں وہ کیوں سوچیں وہ کیا جانیں وہ کیا سمجھیں / مبارک ہو مجھی کو عشق میرا آرزو میری

کروں موتی کی صورت گشت کیا بازارِ عالم کا / سمجھتا ہوں کہ ہے میری گرہ میں آبرو میری

ہجومِ غم نے ہر جانب سے دل کو گھیر رکھا ہے / ملے رستہ نکلنے کا تو نکلے آرزو میری

ہمیشہ اشکِ غم نکلیں سجودِ شوق سے پہلے / نمازِ عشق ادا ہوتی ہے اکثر بے وضو میری

جنہیں انکار ہے ملنے سے آنے سے بلانے سے / نکالیں گے وہی گن گن کر اک اک آرزو میری

اگر کوئی اسے سمجھے گا تو شاید وہ سمجھیں گے / بٹھا کر حضرتِ موسیٰ کو سنئے گفتگو میری

یہ مطلب ہے کہ اپنے ہی سے تم اپنا کرو شکوہ / وہ اک تصویر رکھ دیتے ہیں میرے روبرو میری

اِدھر آئی اُدھر نکلی تو یہ پاسِ وفا کیسا / جو میرے دل میں رہ جائے وہی ہے آرزو میری

وہ کہتے ہیں بتا دے سوچ رکھوں میں جواب اسکا — شکایت کیا کریگا داورِ محشر سے تو میری

ہزار افسوس اس بے قدری بازار الفت — بکی ہے کوڑیوں کے مول انمول آرزو میری

جو ٹھہرا ہیں ہی سب کچھ تو کسی پر کیوں نظر ڈالو — کہ ہر صورت سے صورت ہوگی تیرے روبرو میری

ابھی میں آرزو کو دیکھ کر آنسو بہاتا ہوں — کبھی میری طرح روئے گی مجھ کو آرزو میری

بڑھایا مرتبہ دل نے وفا نے عشق نے غم نے — انہیں چاروں سے شہرت ہے جہاں میں چارسو میری

جدا ہے ایک سے جب ایک تو اک ساتھ کیا نکلے — تمنا غیر کی حسرت تمہاری آرزو میری

بہارِ عشق کو ہے کہ بہارِ حسن آئی ہے — کھلے گا رنگ ادھر تیرا ادھر پھیلے گی بو میری

وہ کہتے ہیں زمانہ مان لے میں تو نہ مانوں گا — یہ کیسی بات دل تیرا ہوا اس میں آرزو میری

ادھر یہ شوق ہے مجھ کو ملاؤں ان سے ہاتھ اپنا — ادھر یہ حکم ہے کم بخت انگلی بھی نہ چھو میری

کہیں غنچے کہیں گل کیف میں کیف عالم ہے — بٹی ہی چلو چلو کیا شراب رنگ و بو میری

حرم میں کچھ نہ ہو عزت نہ ہو اے نوح پروا
بلا سے بتکدے میں تو بہت ہے آبرو میری

فن تحریر

ہمیں چونکہ بچپن ہی میں پڑھنا لکھنا سکھلا دیا جاتا ہے اسلئے ہمیں کبھی خیال نہیں آتا کہ فن تحریر کیسی حیرت انگیز چیز ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ جو لوگ فن تحریر سے ناواقف ہیں۔ وہ ہمیں لکھتے دیکھکر کسقدر حیران ہوتے ہیں؟ انگلستان کا ایک مشنری (مبلغ) جان ولیم تبلیغ مسیحیت کی غرض سے بحر اوقیانوس جنوبی کے ایک ایسے جزیرے میں قیام پذیر تھا۔ جہاں کے باشندے بالکل وحشی تھے۔ ایک روز جب وہ سمندر کے ساحل پر کسی کام میں مشغول تھا تو اُسے ہتھوڑے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ہتھوڑا اسکی جائے قیام پر موجود تھا۔ اُس نے ایک سیاہ پتھر پر چاک سے کچھ لکھا اور وہ پتھر وہاں کے ایک وحشی کے ہاتھ اپنی بیوی کو بھجوا دیا۔ بیوی نے پیغام پڑھکر ہتھوڑا اُس شخص کے حوالے کیا اور وہ اُسے انگریز کے پاس لے آیا۔

پادری یا اُس کی بیوی کیلئے تو یہ نہایت ہی معمولی بات تھی۔ اسقدر معمولی کہ انہیں اس کے متعلق خیال تک بھی نہ آیا ہوگا۔ لیکن اس وحشی کے لئے اس سے زیادہ کیا اچنبھا ہو سکتا تھا کہ پتھر کے ایک بے جان ٹکڑے نے پادری کی بیوی کو پیغام کہہ سنایا اور اُس نے پیغام سُن کر مطلوبہ چیز دیدی! اس کے بعد وہ وحشی اس پتھر کو عرصۂ دراز تک اپنے گلے میں لٹکائے رہا۔ اس کے دل میں اس پارۂ سنگ کی جو وقعت تھی اسے وہی کچھ جانتا ہوگا!

اسی طرح افریقہ کا ایک حبشی کسی مقام سے ایک خط لا رہا تھا۔ راستہ میں اُسے تمباکو پینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تمباکو تیار کرنے سے پہلے خط کو اُس نے ایک پتھر کے نیچے دبا دیا۔ وجہ پوچھی گئی تو اس نے جواب دیا کہ اگر میں اسے چھپا نہ دیتا تو وہ میری اس حرکت کی اطلاع یقیناً مکتوب الیہ کو پہنچا دیتا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے۔ کہ ایسے کاغذ جب مکتوب الیہ کے پاس جاتے ہیں تو "باتیں کرکے" اسے تمام حالات سے مطلع کر دیتے ہیں!

لیکن ہم لوگ جو لکھ سکتے ہیں ایسی باتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ فن تحریر فی الواقع ایک نہایت ہی حیرت خیز چیز ہے۔ اور جس شخص یا جن اشخاص نے اسے اختراع کیا ہوگا انہیں پہلے پہلے بڑی بڑی مشکلات کا سامنا ہوا ہوگا۔

فن تحریر جو آج مہذب ممالک میں رائج ہے۔ معلوم نہیں کہ کس قدر دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ اس کا موجد کون تھا یا وہ کب وجود میں آیا؟ ہاں تحقیقات جدیدہ نے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچا دی ہے کہ دنیا میں جسقدر تحریریں ہیں ان کی بنیاد نقوش اور تصاویر پر رکھی گئی تھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں

کہ وہ لوگ عکسی تصاویر سے کام لیتے تھے یا وہ اعلیٰ درجہ کے نقاش و مصور تھے۔ نہیں ان کی تصویریں نہایت بھدی اور مضحکہ خیز ہوتی تھیں۔ اور بہ اعتبار فن ہم انہیں تصویریں کہہ سکتے ہی نہیں ہاں اظہارِ مطلب کے لئے ان سے زیادہ اچھی تصویروں کی انہیں ضرورت نہیں تھی۔

اس زمانہ میں بھی کئی ایسی قومیں موجود ہیں جو صرف نقوش و تصاویر کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہیں۔ تصویروں کے ذریعے سے اظہار خیالات کا طریقہ قدیم مصریوں کی جدّت طبع کا مرہونِ منت ہے۔ مصر کے قدیم معبدوں میں اس قسم کی لاتعداد تصویریں آجتک موجود ہیں۔ یہ درحقیقت مصریوں کا رسم الخط تھا۔ اس میں الفاظ کی بجائے مختلف نقوش و تصاویر سے کام لیا جاتا تھا۔ مثلاً :-

ملک　بقائے دوام　روٹی　لڑکا　مینڈھا　عقاب　عصائے شاہی　مگرمچھ

اسی طرح عرب میں ایک مقام پر اسی قسم کی تصویروں کے کتبے برآمد ہوئے ہیں۔ وہاں ایک وادی ہے۔ جسے عربی میں "وادیٔ مکاتب" کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس وادی کی دونوں دیواروں پر صدہا تصویری کتبے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے :-

یہ کتبے شکل و صورت میں مصری کتبوں کی طرح ہیں۔ لیکن حقیقتہً ان سے بالکل مختلف ہیں۔ اور تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤخر الذکر سے صدہا سال پیشتر کے ہیں۔ یہ کسی ایسی زبان میں لکھے ہیں کہ آج تک کوئی محقق انہیں پڑھ نہیں سکا۔ تصویر میں جس شخص کے گلے میں رسی بندھی ہے خدا جانے اس بدقسمت کا کیا حشر ہوا ہوگا۔

شمالی امریکہ کے اصلی باشندے جنہیں "ریڈ انڈینز" (Red Indians) کہتے ہیں آجتک تصویری تحریروں سے کام لے رہے ہیں۔ تصویریں بنانے میں اُنہیں بیحد مشق ہے۔ اپنا مطلب ایسے واضح طریق پر ظاہر کر لیتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو ہرگز کوئی دقت پیش نہیں آتی۔

ذیل کے مرقع میں ایک داستان عشق لکھی ہے۔
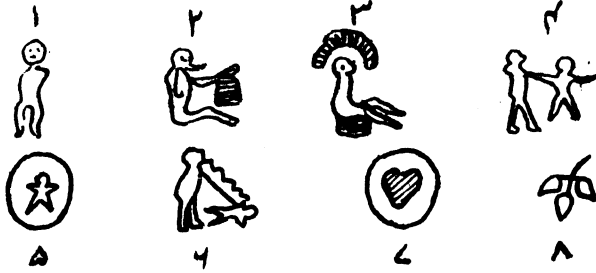
شکل نمبر (۱) ایک وارفتۂ محبت اپنے آپ کو ایک دیوتا سمجھ کر اپنی ما فوق الفطرۃ طاقتوں سے معشوقہ کو مرغوب کر رہا ہے۔

(۲) وہ گا رہا ہے اور ایک طلسمی ڈھول بجا رہا ہے۔

(۳) کھلی ہوا میں بیٹھ کر افسوں پڑھ رہا ہے۔ اس کے سر پر جو ایک محراب سا ہے۔ اس سے آسمان مراد ہے۔

(۴) وہ اپنی معشوقہ سے ایک بازو سے وابستہ ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ دونوں ایک ہیں!

(۵) وہ دعوی کرتا ہے کہ اُس کی معشوقہ خواہ کسی جزیرہ میں کیوں نہ چلی جائے۔ وہ اسے سحر کی طاقت سے ڈھونڈ نکالیگا۔ دایرہ جزیرے کو ظاہر کرتا ہے اور اس میں جو شکل ہے۔ وہ اسکی معشوقہ ہے۔

(۶) معشوقہ محوِ خواب ہے اور وہ خود عشقیہ گیت گا رہا ہے۔ اُس کی محبت اُس کے دل سے نکل کر معشوقہ کے دل میں جذب ہو رہی ہے۔ اور طلسمی موسیقی کی آواز مرتعش ہو کر اس کے کانوں میں داخل ہو رہی ہے۔

(۷) معشوقہ کا دل دکھایا گیا ہے۔

(۸) موسم بہار کے ایک درخت کے سبز پتے ہیں۔ جنکا مطلب یہ ہے کہ عاشق فائز المرام ہو گیا ہے!

اب اس مرقع کو لیجیے۔ ایک "افسانۂ خونیں" ہے جو امریکہ کے انڈین لوگوں کی جنگجویانہ سپرٹ کا اظہار کرتا ہے۔
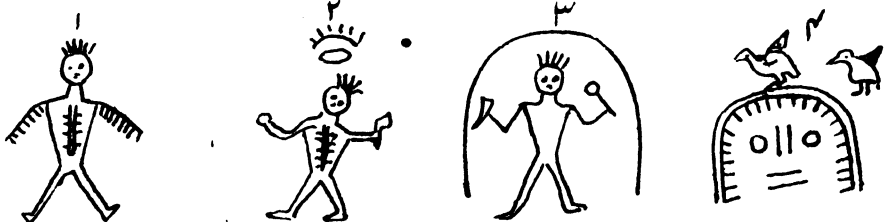
(۱) ایک جنگجو شخص ہے جس کے بازوؤں پر پر لگے ہیں اس کی تمنا ہے کہ وہ اُڑ کر میدان جنگ میں جا پہنچے۔
(۲) وہ صبح کے ستارے کے نیچے مُسلح ہو کر رقص کر رہا ہے۔
(۳) "قوس فلک کے نیچے اپنے دشمن کو للکار رہا ہے۔
(۴) کشتوں کا گوشت کھانیوالے عقاب اور گدھ آسمان پر اُڑ رہے ہیں۔
(۵) بہادر جنگجو کے سینہ میں دشمن کا تیر پیوست ہے اور وہ مقتول پڑا ہے۔
(۶) مقتول کی روح عالم ارواح میں مصروف پرواز ہے۔
تیسرے مرقع میں سراغرسانی کا ایک واقعہ ہے۔
۱۷۹۴ء میں انگلستان کا ایک خاندان کنیڈا میں جا بسا۔ ان دنوں اہل یورپ نئے نئے وہاں آباد ہو رہے تھے۔ وہاں کے اصلی باشندوں میں ایک شخص جو "افعی قاہر" کے نام سے مشہور تھا اس خاندان کا دشمن ہو گیا۔ اُس نے اپنی دشمنی کا اظہار اسطرح کیا کہ اس انگریز کے سب سے چھوٹے بچے "پرسی" کو چرا لیا۔ غریب باپ نے بہت تلاش کی۔ مگر بے سود۔

اس بات کو بہت عرصہ گذر گیا۔ ایک روز اس انگریز کو ایک بیمار انڈین عورت جنگل میں پڑی ملی۔ اس کا پاؤں زخمی ہو رہا تھا۔ انگریز نے عورت کو اُٹھوا لیا اور اُسے اپنے کیمپ میں لے آیا۔ یہ عورت "افعی قاہر" کے جتھے میں سے تھی۔

انگریز چند روز تک اس عورت کا علاج کرتا رہا۔ اس کے بعد وہ تندرست ہو کر وہاں سے چلی گئی اس کے جانیکے تیسرے روز بعد اس انگریز کا ملازم جو ایک وفادار انڈین تھا۔ کسی درخت کی چھال کا ایک ٹکڑا کہیں سے لے آیا۔ اور بڑے جوش وخروش سے کہنے لگا۔ "اب آپ کا پرسی مل جائیگا" اور یہ کہہ کر اُس نے چھال کا ٹکڑا آقا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

انگریز نے حیران ہو کر چھال کے ٹکڑے کو دیکھا تو اس پر کسی سیاہی سے یہ نقوش بنے تھے۔
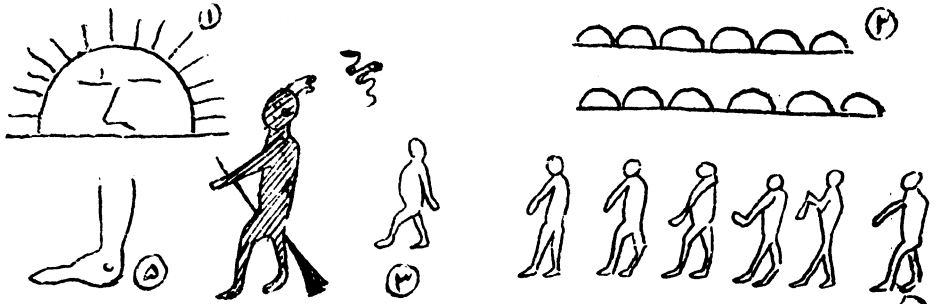
ملازم چونکہ خود انڈین تھا۔ اس لئے وہ ان نقوش کے معنی بخوبی سمجھتا تھا۔ اس نے ان کا حسب ذیل ترجمہ کیا۔

"وہ عورت جس کا پاؤں زخمی تھا اطلاع دیتی ہے۔ کہ افعی قاہر
تمہارے پرسی کو اسیر کرکے تمہارے مکان سے تقریباً
ایک سو اسی میل جانب مغرب لیگیا ہے۔ اس کے ہمراہ چھ
مسلح آدمی ہیں۔ لیکن اُن کے پاس صرف دو بندوقیں ہیں"

یہ تو تھا خط کا مفہوم۔ ہر شکل کی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) آفتاب دکھایا گیا ہے۔ چونکہ اس کا قرص نصف سے زیادہ زمین کے باہر ہے۔ اسلئے یہ مغرب کی سمت کو ظاہر کرتا ہے۔

(۲) انڈین لوگوں کی جھونپڑیاں (وگ ویمز ـــــ .Wigwams) دکھائی گئی ہیں۔ جو تعداد میں بارہ ہیں۔ ایک جونپڑی سے دوسری تک تقریباً پندرہ میل کا فاصلہ ہوتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ بارہ جھونپڑیوں کے فاصلہ کے برابر یعنے تقریباً ایک سو اسی میل کا فاصلہ ہے۔

(۳) ایک شخص بندوق لے کر جا رہا ہے۔ اس کا ڈیل ڈول اور طُرّہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے جتھے کا سردار ہے اور چونکہ اس کے سر پر سانپ کی تصویر ہے۔ اس لئے اس سے "افعی قاہر" مراد ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک اور شخص ہے۔ جس کے ہاتھ پس پشت بندھے ہیں۔ یہ پرسی ہے جو اسیر ہو کر جا رہا ہے۔

(۴) چھ اشخاص "افعی قاہر" کے ہمراہ ہیں ان میں سے صرف ایک کے پاس ایک بندوق ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے گروہ کے پاس صرف دو بندوقیں ہیں۔

(۵) ایک پاؤں کی تصویر ہے۔ جو اس عورت کو ظاہر کرتا ہے۔ جس کے پاؤں میں زخم تھا۔ جس نے انگریز کی مہربانی کا یہ صلہ دیا کہ اُسے ایک سربستہ راز سے آگاہ کر دیا۔

اسی طرح ذیل کی تصویر میں ایک مہم کا حال بنایا گیا ہے۔ پانچ کشتیاں ہیں جن میں اکاون آدمی سوار ہیں

یہ سب ایک جھیل سے پار اُتر کر دشمن پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ ان کا سپہ سالار گھوڑے پر سوار ہے۔ اور اس کا نام "کشکی مُنازی" ہے۔ جس کے معنی ہماری زبان میں کٹھ پھوڑا کے ہیں۔ زمین کچھوا خشکی کو ظاہر کرتا ہے اور قوس کے اندر تین آفتاب ہیں۔ جسکے یہ معنی ہیں کہ جھیل کو عبور کرکے اس کے دوسرے کنارے تک پہنچنے میں تین روز صرف ہوئے ہیں۔
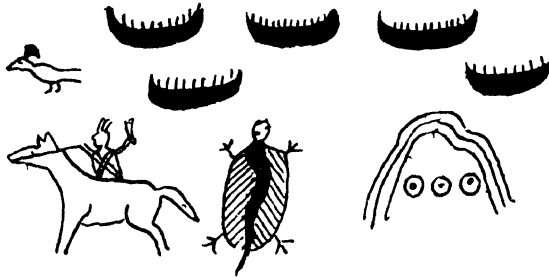
اسی طرح ہزارہا تصویری مرقعے موجود ہیں اگر ان سب کی کیفیت دی جائے۔ تو ایک ضخیم کتاب درکار ہو۔ یہ تصاویر ہمارے لئے بالکل لایعنی ہیں لیکن انہیں جو جانتے ہیں وہ اس آسانی کے ساتھ ان کا مطلب حل کر لیتے ہیں کہ گویا وہ پورے الفاظ ہیں۔ البتہ اتنی دقت ضرور ہے کہ جو کام چند حروف کے مجموعہ سے نکل سکتا ہے۔ وہ اس طرز تحریر سے نہیں نکل سکتا۔ یہاں ایک فقرہ کے لئے تصویریں بنانا پڑتی ہیں۔ لیکن با ایں ہمہ ممکن ہے کہ بعض آدمی ان تصاویر سے پورا مفہوم نہ لے سکیں۔

مثلاً مندرجہ بالا فقرہ میں جو کٹھ پھوڑا دکھایا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کسی شخص کا نام نہ ہو۔ بلکہ اس سے اصلی پرندہ مراد ہو۔ تو اب انسان اور پرندے میں تمیز کرنے کے لئے کاتب کو ایک سوار کی تصویر کھینچنا پڑی اور اس سے سمجھ لیا گیا۔ کہ اس سے کوئی انسان مراد ہے۔

"تصویری تحریر" کی ان دقتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے۔ اب لوگوں کو "صوت نویسی" کی ضرورت محسوس ہوئی جس کا اصول یہ ہے کہ حروف کی آوازوں کی شکل بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

انگریزی زبان میں "معما نویسی" کو آج کل بڑا فروغ حاصل ہے۔ یہ بچوں کا ایک کھیل ہے۔ جس سے ان کی قوت متخیلہ کی نشوونما کی جاتی ہے "معما نویسی" کو اردو کے قالب میں ڈھالا جا سکتا ہے۔

مثلاً:۔

جذباتِ عالیہ

(از ملک الشعرا حضرت غلام قادر گرامی مرحوم)

ز ذوقِ بے خودیٔ ما زمن مپرس تا چند است　　کہ سینہ چاک نظرہائے فتنہ پیوند است

رخِ تو عیدِ نظرہاست چند زیرِ نقاب　　درآ بجلوہ کہ یک شہر آرزومند است

تو مفت از کفِ من بردہ چہ مے دانی　　کہ قدرِ گوہرِ دل چیست قیمتش چند است

چہ کہنہ رند نظر بازم و ندانستم　　کہ در نگاہ و تغافل بہم چہ پیوندست

تو آرزوئے دلِ من زمن چہ مے پرسی　　ز دل بپرس کہ چون ست و آرزو چندست

قدح تو بادہ گراں مے زنی و من مردم　　ز وعدہ ہائے دروغی کہ راست مانندست

عتابِ غمزہ بلا در بلا بہم چیدست　　کتابِ صبر ورق در ورق پراگندست

چگونہ نقشِ مرادم درست بنشیند　　حجابِ حائل و دلالہ سست پیوندست

خدنگِ آں نگہِ ناز در ازل خوردم　　ہنوز بر لبِ زخمِ جگر شکر خندست

وصال گر ہمہ عمر ست عمر یک نفس ست　　فراق گر سرِ موئیست کوہِ الوندست

بسے بگشتم و جز ملکِ عشق کم دیدم　　ولایتے کہ دراں بندہ بے خداوندست

شکایتے بکنم از فلک و لے میرم　　ازیں فسانہ کہ دشمن ز دوست خورسندست

بلا کشاں ز گرامی خبر کہ مے آرد
اجل گرفتۂ زنجیرِ بے کسی بندست

کہ پانی کی تصویریں بنا کر اسے "آ" پڑھتے ہیں کیونکہ میکسیکو کی زبان میں پانی کا نام "آ" ہے۔ اُس کے بعد زیتون کی تصویر بنا دیتے ہیں۔ جسے وہ اپنی زبان میں "می" یا "ین" کہتے ہیں (عربی لفظ "آمین" یورپی زبانوں میں بھی موجود ہے)

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ "صوت نویسی" درحقیقت ایک نہایت ہی مشکل کام ہے۔ ہر حرف کی آواز تصویر سے ظاہر کرنا مطلقاً ناممکن ہے۔ اس لئے اب لوگوں نے فن تحریر کی طرف ایک اور قدم بڑھایا۔ اور جن حروف کی آوازیں تصاویر کے ذریعے سے ادا نہیں کی جاسکتی تھیں۔ ان کے لئے کچھ نقوش سے مقرر کر لئے۔ جس سے آہستہ آہستہ حروف تہجی وجود میں آگئے۔ اس نئی تحریر میں تصاویر و نقوش دونوں شامل ہو گئے۔ اور تحریر پہلے کی نسبت زیادہ آسان ہو گئی۔ اس طرز تحریر کی کوئی مثال ہم پیش نہیں کر سکتے۔ ہاں تصور دلانے کی غرض سے ذیل کے دو نام لکھے جا سکتے ہیں:-

+ خاں = شیر خاں + دان قلمدان۔

ان دو مثالوں میں "خان" اور "دان" کیلئے ہم نے نقوش نہیں لکھے۔ بلکہ الفاظ ہی لکھ دیئے ہیں۔

چینی زبان کے حروف تہجی دنیا بھر کی زبانوں سے زیادہ ہیں۔ وجہ یہ کہ اس زبان میں صرف حروف ہی نہیں بلکہ "اجزائے صوت" بھی بکثرت موجود ہیں۔ پہلے پہلے یہ زبان محض "تصویر نویسی" تھی مگر رفتہ رفتہ اس میں حروف بھی بنتے چلے گئے۔ جو آجتک موجود ہیں۔ مثلاً اس شکل میں چند تصاویر دکھائی گئی ہیں۔ جو حروف میں تبدیل ہو چکی ہیں:-

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	قدیم شکل
大	木	山	月	月	موجودہ شکل

چینی زبان میں ایک ہی لفظ متعدد معنی دیتا ہے۔ اسلئے چینی "تصویر نویسی" میں بعض اوقات نویسندہ کو بڑی مشکل پیدا ہو جاتی تھی۔ مثلاً لفظ "چاؤ" کے کئی معنی ہیں:

(۱) جہاز (۲) روٹی کی سی نرم کوئی چیز (۳) شعلے کا بھڑ بھڑانا۔ (۴) برتن۔ (۵) گفتگو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں "چاؤ" اکیلا لکھا ہوگا۔ وہاں ضرور اشتباہ واقع ہو جائیگا۔ اس اشتباہ کو رفع کرنیکی غرض

سے چینی محرر "جاؤ" کی شکل بنا کر اس کے ساتھ مختلف خطوط ایزاد کر کے حسب ذیل معنی پیدا کر لیتا ہے۔ مثلاً:۔

(۱) یہ شکل جہاں بنی ہوگی اس سے جہاز کے معنی لئے جائینگے۔

(۲) اور جب اس شکل کے ساتھ پرندوں کے پروں کا ایک جُفت ایزاد کر دیا جائے۔ تو اسی لفظ کے معنی روئی یا اسی قسم کی کسی اور نرم چیز کے ہو جائینگے۔ اس حالت میں اس کی شکل یہ ہوگی۔

(۳) پھر اسی شکل پر "آگ" یا "شعلہ" کیلئے جو علامت ہے اسکا اضافہ کر کے اسے آگ کا بھڑ بھڑانا بنالیا جاتا ہے۔

(۴) شکل کے ساتھ (ﺭ) ملا کر اسے "برتن" پڑھینگے۔ یہ ساتھ کا نشان پانی کی شکل ہے۔

(۵) اخیر پر گفتگو کے نشان ( ) کو ساتھ ملا کر کو کلمہ۔ کلام۔ گفتگو کے معنوں میں استعمال کر لیتے ہیں۔

ان امثلہ سے اگرچہ چینی زبان کی پیچیدگیوں کی تشریح نہیں ہو سکتی۔ تاہم اس کی تصویر نویسی کا اصول سمجھ میں آجاتا ہے۔ چین میں دو زبانیں رائج ہیں۔ ایک بولنے کی اور دوسری لکھنے کی۔ جو زبان بولی جاتی ہے وہ آسان ہے مگر جو لکھی جاتی ہے وہ سخت مشکل ہے۔ تحریری زبان سیکھنے میں ایک چینی بچے کو دنیا کے تمام بچوں سے زیادہ محنت درکار ہوتی ہے اور پھر بھی ممکن ہے کہ اُسے اپنی زبان کے کئی حروف و نشانات سے مدت العمر آگاہی نہ ہو سکے!

ذیل میں دنیا کی بڑی بڑی زبانوں کے حروف تہجی کا نقشہ دیا جاتا ہے جس سے معلوم ہو جائیگا۔ کہ تعداد حروف کے لحاظ سے چینی تمام زبانوں پر فائق ہے

زبان	تعداد		زبان	تعداد	
اطالوی	۲۱	حروف	مصری	۳۲	حروف
عبرانی	۲۲	"	روسی	۳۳	"
لاطینی	۲۳	"	آرمینی	۳۸	"
یونانی	۲۴	"	قفقازی	۳۹	"
فرانسیسی	۲۵	"	رومانوی	۴۰	"
انگریزی جرمن	۲۶	"	ژندی۔دری۔پہلوی	۴۵	"
ولندیزی	۲۶	"	سنسکرت	۴۹	"
ہسپانوی	۲۷	"	چینی	بیس ہزار !	"
عربی	۲۸	"			

در حقیقت چینیوں کی محنت قابل تحسین ہے۔ کسی زبان میں اتنے حروف کا داخل کر لینا اور پھر انہیں لکھ سکنا بڑی ہی کاوش ہے۔ گو ہمارے نقطۂ خیال سے چینی زبان قابل اصلاح ہے۔ مگر چینی لوگ اس میں اصلاح کرنا بمنزلہ گناہ سمجھتے ہیں۔

جاپانی زبان بھی قریب قریب چینی زبان ہی کی طرح ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جاپانی میں صوت نویسی کا عنصر غالب ہے۔ اور اسلئے اس زبان میں چینی زبان کی طرح بہت پیچیدگی نہیں۔

تصویر نویسی کی ایک اور شاخ بھی ہے۔ اس میں حروف کی شکلیں میخوں کی شکل سے ملتی جلتی ہیں۔ اسلئے اسے "میخی تحریر" یا "کیونی ای فارم رائیٹنگ" (Caneif orm Writing) کہتے ہیں۔ قدیم فارسی اور کلدانی میں یہی رسم الخط تھا۔ لندن میں اس طرز تحریر کے صدہا کتبے محفوظ ہیں۔ ذیل میں اس کا نمونہ دیا جاتا ہے:-

(ترجمہ) آہورا مزدا۔ سب سے بڑا خدا ہے۔ اس نے یہ زمین پیدا کی اور آسمان پیدا کیا۔

اس طرز تحریر کا پڑھنا نہایت دشوار ہے۔ سب سے پہلا شخص ایک جرمن ڈاکٹر "گراٹی فنڈ" (Dr. Grotefund) تھا جس نے ۱۸۰۲ء میں اس قسم کے چند کتبے پڑھکر ان کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا۔ اہل بابل اور نینوا اس طرز تحریر میں ہمارے لئے صدہا "کتابیں" چھوڑ گئے ہیں۔ مگر یہ کتابیں ہماری کتابوں کی طرح کاغذ کی نہیں ہیں۔ کاغذ اس زمانے میں ایجاد نہیں ہوا تھا۔ یہ مٹی کی بڑی بڑی تختیاں ہیں۔ جنہیں پزاووں میں پکایا گیا ہے۔ یا مٹی کے عظیم الشان بیلوں کے سر ہیں۔ جن پر چاروں طرف حروف کندہ ہیں۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ اس قسم کی "کتابیں" شہنشاہ اسیریا "سناچرب" (Sennacherib) کے کتبخانہ کی زینت ہوا کرتی تھیں۔

اس قسم کی ایک کتاب کی تصویر ذیل میں درج ہے۔ یہ پختہ مٹی کا ایک بہت بڑا ڈھول سا ہے۔ جس پر بادشاہ کے احکام کندہ ہیں۔ یہ ڈھول دو استوانوں پر قایم ہے۔ اور اپنے محور پر گھوم سکتا ہے۔ جوں جوں پڑھتے جاتے ہیں۔ ڈھول کو آہستہ آہستہ گھماتے جاتے ہیں۔ یہ دنیا کی نہایت ہی حیرت انگیز کتاب ہے!
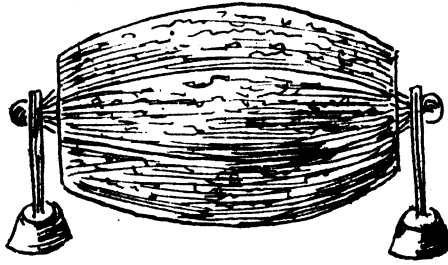
اس رسم الخط میں بظاہر تصاویر معلوم نہیں ہوتیں۔ لیکن یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یہ طرز تحریر درحقیقت تصویر نویسی ہی کی ایک ترمیم شدہ شکل ہے۔ مثال کے طور پر اس تحریر میں جہاں کہیں آفتاب کا نام آیا ہے اسے اس نشان ✕ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس زبان کے مقدس نوشتوں میں متعدد مقامات پر انسان کی تصویریں ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زبان غالباً مذکورہ "معمانویسی" کی طرز پر لکھی جاتی تھی۔

قدیم اہل مصر کی تصویر نویسی دو قسم کی تھی۔ ایک عام ضروریات کے لئے۔ دوسری صرف مقدس نوشتوں کیلئے۔ مؤخر الذکر مصری راہبوں کے علاوہ اور کسی شخص کو معلوم نہیں تھی۔ اگر کوئی شخص اسے معلوم کرنے کی کوشش کرتا تو اُسے فوراً قتل کر دیا جاتا تھا۔ اس مقدس تصویر نویسی کو "ہائی ایروگلفس" (Hieroglyphs) کہتے ہیں اس میں قدیم تصویر نویسی کی نسبت بہت کچھ ترقی ہو چکی تھی ذیل کی شکل میں ایک خاصا طویل فقرہ ہے جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ

"میں سورج دیوتا ہوں اور سورج کے دشمنوں کے خلاف جنگ کرنے کے لئے اُفق کی جانب سے آرہا ہوں"۔

۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷ ۸ ۹

اس مرقع کی پہلی تصویر میں سب سے اوپر کا نشان "نُون" ہے۔ درمیانی "ک" اور نچلا "ایک" کی علامت ہے۔ نک قدیم مصری زبان میں "میں" کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ "میں ایک" (بصیغۂ واحد) ("نک" کو بعض اوقات "انک" بھی بولتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ عربی کے لفظ انا بمعنی "میں" سے کچھ تعلق رکھتا ہو۔

دوسری شکل میں آفتاب دکھایا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک کلہاڑی۔ کلہاڑی کی علامت دیوتاؤں سے

مخصوص تھی۔ آفتاب کے ساتھ کلہاڑی کا ہونا ظاہر کرتا ہے کہ "سورج دیوتا" سے مراد ہے۔ مگر بصیغۂ واحد کیونکہ یہاں بھی ایک کی علامت موجود ہے

تیسری شکل میں فوقانی علامت **ف** ہے۔ درمیانی **ر** اور تحتانی پاؤں سمیت دو ٹانگیں ہیں پہلے دونوں نشانوں کو ملا کر **فر** پڑھا جائیگا۔ جسکے معنی ہیں "چلنا"۔ مگر شاید اس لفظ کے معنی کچھ اور بھی ہوں گے۔ اسی لئے نیچے ٹانگیں اور پاؤں بھی بنا دیئے گئے ہیں تاکہ اس سے چلنا سمجھا جائے۔

(کیا آپ کو عربی کے لفظ **فرار** اور اس **فر** میں کچھ تعلق نظر آتا ہے؟)

اب چوتھی شکل کو لیجیے۔ یہ ایک عقاب ہے۔ اور عقاب کو مصری زبان میں "اَم" کہتے ہیں۔ مگر یہ سے کے بھی معنی دیتا ہے۔

پانچویں شکل میں **افق** (بصیغۂ واحد) لکھا ہے چھٹی شکل ر کی ہے۔ اسے "ار" پڑھتے ہیں۔ اس کے معنے ہیں۔ "خلاف"

ساتویں شکل میں پہلا نشان **ز**۔ دوسرا **ف** اور تیسرا **ت** ہے۔ ان تینوں کا مجموعہ ہے " زفتو" بمعنی "دشمن" اور اس کے ساتھ کے تین خطوط صیغۂ جمع کو ظاہر کرتے ہیں۔ بمعنی "دشمناں"

آٹھویں تصویر میں ایک شخص ہاتھ میں تلوار لئے ایک خاص حالت میں بیٹھا ہے یہ جنگ کی علامت ہے۔ مطلب یہ کہ "میں جنگ کیلئے تیار ہوں"

نویں شکل تنہا **ف** ہے جس کے معنی ہیں "اس کا" یا "اس کے"

اب سارے الفاظ کو ملا کر پڑھیے تو مذکورہ بالا فقرہ بن جائیگا!

ہم دیکھتے ہیں کہ اس عبارت میں تصاویر کے علاوہ حروف بھی موجود ہیں۔ گویا اہل مصر کی جدت طبع نے تصویر نویسی کو انڈین لوگوں کی تصویر نویسی سے زیادہ آسان بنا دیا۔ جب اہل مصر یہاں تک ترقی کر چکے تو اب اُن کے لئے حروف تہجی کا وضع کر لینا نہایت آسان تھا۔ لیکن چینیوں کی طرح یہ بھی اپنے معتقدات سے مجبور تھے وضع حروف درحقیقت اہل فنیشیا کی جدت کی شرمندۂ احسان ہے۔

ذیل کے نقشہ میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ تصویر نویسی کس طرح بتدریج حروف تہجی میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔

مقدس تحریر	تصویر نویسی	کلدانی تحریر	یونانی تحریر	عربی تحریر
[hand sign]	[sign]	[sign]	Δ	د
[eye sign]	[sign]	[sign]	P	ر

مقدس تحریر	تصویر نویسی	کلدانی تحریر	عبرانی تحریر	عربی تحریر
				س
				ل
				و

وضع حروف کی تاریخ نہایت ہی دلچسپ ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ کہیں سے دستیاب نہیں ہوتی۔ محققین صرف چند حروف کا سراغ لگا سکے ہیں۔ ذیل میں عربی کے چند حروف کی مختصر سی کیفیت دی جاتی ہے۔

الف۔ عبرانی میں اسکی یہ شکل ہے۔ (٦) یہ ایک بیل کے سینگ ہیں۔ عبرانی میں بیل کو "الف" کہتے ہیں ان کے ہاں مذہبی قربانیوں کا بہت رواج تھا اسلئے انہیں بیل کی شکل بکثرت بنانی پڑتی تھی۔ مگر چونکہ وہ شکل بھی صرف سینگوں ہی کو کافی سمجھ لیا گیا۔ کثرت استعمال سے یہی شکل اس طرح ٦ ہو گئی۔ جو عربی میں و یا ا میں تبدیل ہو گئی۔

ب۔ عبرانی میں اس حرف کا نام "بت" ہے جس کے معنی ہیں "گھر"۔ "مکان"۔ مگر اس کے نیچے نقطہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ اس کا نقطہ عربی نژاد ہے۔ (عربی لفظ "بیت" بمعنی گھر عبرانی حرف "بت" سے نکلا ہے۔)

ج۔ عبرانی تصویر نویسی میں یہ نقش اونٹ کا سر اور گردن ظاہر کرنے کے لئے تھا۔ اور وہ اسے جمل کہتے تھے۔ عربوں نے اس میں کچھ تصرف کر کے اُسے ج (جیم) بنا لیا۔ (عربی میں اونٹ کو جمل کہتے ہیں)

ح۔ عبرانی میں یہ حرف کھڑکی (دریچہ) کی شکل تھی۔ جسے وہ حے کہتے تھے اور اس کی صحیح شکل یہ تھی۔ عربوں نے اسے ح بنا لیا۔ (عربی لفظ حے بمعنی پڑوس۔ ممکن ہے کہ اسی سے وجود میں آیا ہو)

د۔ اس حرف کی شکل مصری تصویر نویسی میں انسانی ہاتھ سے ظاہر کی جاتی ہے۔ عبرانی میں آکر اس کی یہ شکل ہو گئی۔ دیکھئے اس کی شکل دروازے کے محراب سے ملتی جلتی ہے۔ اسی لئے عبرانی میں اسے "دالت" بمعنی دروازہ کہتے تھے۔ یونانیوں نے اسی میں تصرف کر کے اسے اس طرح بنا لیا △ اور اس کا نام "ڈیلٹا" رکھ دیا۔ عربوں نے اس مثلث کا بائیں جانب کا ضلع اُڑا کر اسے اس طرح د بنا کر اسے دال کا نام دے دیا (ذال اسی حرف پر نقطہ دیکر بنا لیا گیا۔)

ر۔ مصری تصویر نویسی میں اس حرف کی یہ شکل تھی اور اس کا تلفظ رو (بواؤ مجہول) تھا۔ اور رو

منہ کو کہتے ہیں (ممکن ہے کہ فارسی لفظ رو بمعنی چہرہ اسی قدیم حرف سے نکلا ہوا) کچھ عرصہ کے بعد اس حرف نے یہ شکل ۹ اختیار کر لی اور جب کلدانیہ والوں نے اسے لیا۔ تو انہوں نے اس طرح 7 بنالیا۔ عربوں نے اسے یہ شکل ل دیدی (ف اسی حرف پر نقطہ دیکر بنالیا گیا)

س۔ مصری مقدس نویسی میں اس کی یہ شکل تھی بعد میں یوں ہوگئی۔ کلدانی رسم الخط میں یہ اسطرح ш ہوگئی۔ اور عبرانی میں اس کی شکل اسطرح بنی۔ حقیقت میں یہ گل نیلوفر (کنول) کی تصویر تھی۔ جسے قدیم مصری زبان میں "رسن" کہتے تھے۔ اور یہ پانی کے دیوتا کا مخصوص نشان تھا۔ عرب لوگ اسے سین کہنے لگے۔ (حسب ضرورت نقطے دیکر اسے شین بنالیا گیا)

ک۔ عبرانی میں کاف ہاتھ کی ہتھیلی کو کہتے ہیں۔ اسی سے فارسی لفظ کف نکلا ہے۔ عبرانی میں اس کی یہ شکل تھی۔ عربوں نے ک بنالیا۔

ل۔ مقدس نویسی میں اس حرف کی شکل شیر کی تصویر سے ظاہر کی جاتی تھی۔ تصویر نویسی میں کلدانی میں ل یورپی زبانوں میں L عبرانی میں۔ ل عربی میں ل۔ عبرانی میں اس کا تلفظ "لمد" ہے جس کے معنی ہیں۔ بیلوں کو ہانکنے کیلئے لوہے کی نکیلی سلاخ۔ آنکس۔

م۔ عبرانی میں اس کی شکل تھی اور یہ پانی کی علامت تھی۔ اس کا تلفظ "مم" تھا۔ جس کے معنی "پانی" کے ہیں۔ عربوں نے اسے میم کا نام دیدیا۔ (عربی لفظ "ما" یعنی پانی غالباً اسی "مم" کی ایک دوسری شکل ہے)

ن۔ عبرانی میں اس طرح لکھا جاتا تھا۔ اور "نُون" بولا جاتا تھا۔ نُون عبرانی میں مچھلی کو کہتے ہیں۔ عربوں نے اسے اس طرح ن بنالیا۔ مچھلی کو عربی میں بھی "نُون" ہی کہتے ہیں۔ مثلاً حضرت ذوالنّون کے نام سے بہت سے اصحاب واقف ہونگے۔

و۔ مصری شکل یہ ہے کلدانی یہ۔ اور عبرانی اسطرح عربوں نے و بنالیا۔ عبرانی میں اس کا تلفظ "وَوْ" ہے جسکے معنی ہیں مچھلی پکڑنے کا آنکڑہ۔

ہ۔ عبرانی میں جنگل کا نشان تھا۔ اور اسے اس طرح لکھا کرتے تھے۔ اس کا تلفظ "ہت" تھا۔ عربی میں یہی تلفظ "ہا" میں تبدیل ہوگیا۔ (انگریزی لفظ "ہیتھ" (Heath.) غالباً اسی لفظ سے نکلا ہے۔ انگریزی میں بھی اس کے معنی دشت وجنگل کے ہیں)۔

ی۔ یہ حرف عبرانی میں "انگشت" کے لئے لکھا جاتا تھا۔ اور اسے "یاد" "یا جاد" پڑھتے تھے۔ عربوں نے اسے "یا" بنالیا (عربی لفظ ید بمعنے ہاتھ اسی لفظ کی ترمیم شدہ شکل معلوم ہوتی ہے)

یہ مضمون نہایت تفصیل طلب ہے۔ مگر امید ہے کہ یہ مجمل سا بیان بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

(محمد وحید گیلانی بی اے)

مدرس اور طلباء سے دو دو باتیں

(جناب لالہ رام چند صاحب بی ۔ اے ۔ پی ای ایس ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس ضلع ملتان)

متعدد مرتبہ اصحابِ قلم نے مدرس کی حقیقت وغیرہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لاکھوں اوراق سیاہ کر ڈالے ہیں۔ جن کے حرف حرف سے یہی غرض و غایت رونما ہوتی ہے ۔ کہ مدرس کا مدرسہ ریاضِ رضواں کی مثال ہو۔ اس کا ذرہ ذرہ گلطراز بلکہ گلفشاں دکھائی دے ۔ ترقی ۔ رہنمائی ۔ فلاح و بہبودی کا راز اُن میں مستتر پایا جائے ۔ خطۂ سکول کا ہر کہ و مہ فرخندہ خصال اور صالح الاعمال بلکہ صاحبِ اقبال نظر آئے ۔ نشاطِ زندگی کے باعث چہرہ بشاش اور ارغوانی ہو ۔ اُس کی تعریف میں زمانہ کی مخلوق اُس کے ہر فن مولا ہونے کے باعث متعارف و آشنا ہو کر رطب اللسان ہو ۔ یعنی اُس سرزمین کے چشمۂ فیض سے سب نے ایک نہ ایک جُرعۂ روح افزا نوش جان کر کے اپنی حسرتِ دلسوز دتشنۂ کامی کو کافور کیا ہو ۔ ہر بچہ تہذیب و تمدن کا پُتلا ۔ نامراد خزاں کے عمل سے ناآشنا ہو ۔ بلکہ چہروں سے تنویرِ مسرت کا نشان ہویدا ہو ۔ اور زمانہ کی ہر آلودگی و آلائش سے مبرّا اور معرّا ہو ۔ صحت کے اصول زرّین سے آگاہی رکھتا ہو ۔ مثلاً صبح صادق بسترِ راحت کو چھوڑ کر غسل کرنا پھر خدا کی یاد میں مشغول ہونا کہ وہ حقیقی مُعین و مستعان استعانت فرمائے ۔ ورزش جو کہ اسرارِ تندرستی ہے ۔ اُس کے طریق سے واقفیت رکھنا یا چھوت کی بیماریوں کے بواعث و وجوہ کا علم ہونا ۔ صفائی لباس ۔ صفائی بدن عمدہ تازہ اور سادہ خوراک کے فوائد سے باخبر ہونا ۔ وغیرہ وغیرہ ..... متابعت یا فرمانبرداری جبلّی عادت دکھائی دے ۔ غفلت شعاری اور بیکاری کے زہر آمیز نتائج سے واقفیت رکھتا ہو ۔ استاد کے ہر اشارہ کا منتظر ۔ کام کا شوق باوثوق اور عارضی شوق عنقا اور ناپدید ۔ "سیوا کرے ۔ سو میوہ پائے (ع) ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد" کے مطالب و معانی ۔ قصائصِ دلفریب و دلکش لڑکوں کو سُنا سُنا کر سمجھائے گئے ہوں ۔ چنانچہ اخلاقیہ اشعار اُنہیں حفظ ہوں ۔

زمانہ حال کی طرزِ معاشرت کا اثر جو مُلک پر پڑا ہے ۔ اُس کے حُسن و قبح کے نتائج سے آگاہ کیا گیا ہو ۔ برطانوی عنایات و الطاف کی یاد ۔ مُلکی ہمدردی سادہ زندگی بسر کرنا ۔ راستبازی ۔ اور صفائی عملی کی ضرورت و فوائد ذہن نشین ہوں ۔ اصرافِ بیجا و فضول خرچی سے نفرت و اجتناب رکھتے ہوں ۔

ذخیرہ معلومات کی توسیع سیر و تفریح سے متعلق ہو ۔ انہیں عجائباتِ قدرت کا مطالعہ کرا کر اُن کے دل و

دماغ کی تربیت صحیح معنوں میں کرائی گئی ہو۔ متعدد صنائع کا علم ہو۔ کسبِ معاش و دیگر وسائل کا شوق اُن کی رگ رگ میں موجزن ہو۔ چنانچہ اس بارہ میں ان کا میلان طبع تجارت و صنائع کے فروغ میں عاشق نظر آئے۔ لہٰذا انہیں زراعت۔ دستکاری اور بیوپاری کے فوائد سے آگاہ کیا گیا ہو "اُتم کھیتی۔ مدہم بیوپار نکھد چاکری۔ بھیک دوار" وغیرہ وغیرہ مقولے سُنائے سمجھائے گئے ہوں۔ تعلیم کا حقیقی اور اصلی راز مستحسن پیش کر کے انہیں آمادہ کارِ صنعت یا تجارت یا زراعت کیا گیا ہو۔ اس بارے میں انبیاء۔ فقیروں۔ سادھوؤں وغیرہ کے حالاتِ معاش جتلائے گئے ہوں۔ مثلاً دھنا بھگت و موسیٰ علیہ السلام کا جانور چرانا۔ کبیر بھگت کی صنعت یا دستکاری۔ حضرت محمد صاحب کی بیوپاری کے قصائص سُنائے گئے ہوں۔ ایسے با خدا خیر الناس کے قصے اور حالات زندگی سُنا کر انہیں اعلیٰ معیار کا آدمی بنا دیا گیا ہو۔ اُن کے طبع زاد ترقی کے ہر مرحلہ و مسئلہ کو بالائے طاق نہ رکھا گیا ہو۔ بے ہودہ بکواس۔ عیاشی۔ بد اخلاقی۔ منشی اشیاء کے نقصانات۔ رشوت یا استحصال بالجبر وغیرہ وغیرہ زشت کاریوں سے نفرت دلائی گئی ہو۔ اس قسم کے واقعات عبرت خیز پیش کئے گئے ہوں۔ اس قسم کے عبرتناک واقعات انہیں یاد کرائے گئے ہوں۔ غرضیکہ وُہ ہر قسم کے عیوب برباد کُن بادِ خزاں کے جھونکے سے محفوظ و مامون ہوں۔ کُتب فحش و شرمناک کا مطالعہ ممنوع قرار دیا گیا ہو۔ بلکہ ایسے مُطالعہ سے دلی نفرت رکھتے ہوں۔ خطوط نویسی اور روزانہ لین دین کے متعلق حساب کتاب جانتے ہوں۔

استاد صاحب نقادانہ نظر رکھنے کے باوجود طلبا کی کوئی درخواست استحقار سے نہ ٹھکراتے ہوں۔ ان کے ساتھ اُستاد کی خلوص دلی نیک طینتی صحیح معنوں میں آشکارا پائی جائے۔ نیز اُس کی زبردست اصلاحیں ہر برگ و بار سے عیاں ہوں۔ یعنی مدرس کی اس حقیقی رہنمائی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ طلبا کی دماغی۔ اخلاقی اور جسمانی ترقی سے ظہور پذیر ہو۔ اُس کے مقاصد مبارک و عزائم قابلِ عمل ہوں۔ عوام الناس کی نظروں کے سامنے اس کے طلاب کی حرکات سکنات تبلیغ و تلقین کا کام دے کر رشک دلا رہی ہوں۔

حضرات!

ایسی صورتوں میں ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ فی الواقعہ مدرس اور اُس کے لڑکوں نے تعلیم کا حقیقی مقصدِ پاک حاصل کیا ہے۔ جبکہ وہ زمانہ میں اشکالِ مرغوب اور اعمالِ باتعریف دکھلا کر خدا سے ثوابِ عظیم کا مستحق و متوقع ہو۔

خان صاحب مولوی عبدالرحمن صاحب پرنسپل
عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن

حیدر آباد دکن
کا
تعلیمی مستقبل

از جناب محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب۔ اے، آر، سی، ایس۔ بی، ایس، سی لندن، ایف، آر، اے، ایس۔

(ایف، پی، ایس، ال، پرنسپل عثمانیہ یونیورسٹی کالج۔ حیدر آباد دکن)

خانصاحب ریاست حیدر آباد دکن کے سب سے بڑے سائنٹسٹ، ماہر تعلیم اور تعلیمات کے ذمہ وار افسر ہیں۔ آپ کئی دفعہ یورپ کا سفر کر چکے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم لندن میں پائی۔ اور بڑے اعزاز حاصل کئے۔ لندن کی یونیورسٹی کی گذشتہ صد سالہ جوبلی کے موقعہ پر آپ خاص طور سے مدعو کئے گئے تھے۔ آپ نے سائنس کی کئی انگریزی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ جو عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہے۔ آپ ایک آلہ سائنس "رحمان ورٹی کل اپٹی کل بنچ" کے موجد ہیں جو انگریزی کمپنی نے بنایا ہے آپ کی نظر ریاست اور ہندوستان کے تعلیمی مسائل پر بہت وسیع اور مستند ہے۔ عرصہ تک آپ طبیعات کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔ ہندوستان کے مشہور سائنس دانوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ گذشتہ مئی میں حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس کے آپ پریذیڈنٹ منتخب ہوئے تھے ہیں جو خطبہ پڑھا وہ ریاست اور بیرون ریاست کے اکثر تعلیمی مسائل اور اُن کے حل سے مملو ہے۔ اس کا بہترین اقتباس ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔ **ایڈیٹر**

حیدر آباد دکن میں جامعہ عثمانیہ کے قیام نے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کا دسترخوان ملک کی معمولی سے معمولی حیثیت اور اوسط قابلیت والے لڑکے کیلئے بھی بچھا دیا ہے۔ ملک کا ہر فرد بشر جس نے ملک میں نشوونما پائی ہے۔ اور اسی لئے زبان اردو سے واقف ہے۔ ادق سے ادق مضامین ایم اے اور سی۔ ایم ایس سی کی حقیقی معنوں میں تعلیم پاتا اور ڈگری حاصل کر سکتا ہے۔ یہ سہولتیں طب انجنیری اور ایجوکیشن کے پیشوں کی تعلیم میں بھی مہیا ہو چکی ہیں۔

عثمانیہ سنٹرل انسیٹی ٹیوٹ کے عالی شان مستقبل سے کون شخص ہے جو آشنا نہیں زراعت، صنعت و

حرفت وغیرہ کی اعلیٰ تعلیم کیلئے بھی کارروائی جاری ہے۔ اور امید ہے کہ چند سال کے بعد ہمیں ان مضامین میں بھی برٹش انڈیا کی محتاجی نہ رہے گی۔

اس بیان سے میرا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس حیرت انگیز ترقی پر نازاں ہو کر اپنی جگہ پر یہ سمجھ کر مطمئن ہو بیٹھیں کہ بہت کچھ ہو چکا ہے۔ سب کچھ ہو رہا ہے۔ صرف وقت کا سوال ہے، کافی مدت میں ہم تعلیم کے نقطۂ نظر سے کمال کو پہنچ جائیں گے۔ کمال تو کسی صورت میں ممکن نہیں یہ ریاضی کی وہ نامتناہی مقدار ہے جس کے صرف قریب تر ہونا ممکن ہے۔ لیکن جس کو پہنچ جانا ناممکن ہے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا ہماری رفتار ہماری متمدن زندگی کیلئے کافی تیز ہے۔ ہم جو روپیہ صرف کر رہے ہیں اس کی تقسیم تعلیم کے مختلف شعبوں پر ان کی اہمیت اور ضرورت کے لحاظ سے صحیح اصول پر ہو رہی ہے یا نہیں۔ میں نے ابتک صرف اعلیٰ تعلیم اور کچھ فنی تعلیم کا حال بیان کیا۔ دیگر شعبہ جات تعلیم کے متعلق بھی کیا ہماری ترقی کوئی حقیقت رکھتی ہے یا نہیں۔

سہولت کی خاطر تعلیم کو مندرجہ ذیل حصوں یا شعبوں میں تقسیم کر لیں تو بیجا نہ ہو گا۔

(۱) ابتدائی تعلیم جس کے دو حصے کیئے جا سکتے ہیں۔ ایک حصہ دیہی رقبوں کی ابتدائی تعلیم کا اور دوسرا شہری رقبوں کی ابتدائی تعلیم کا۔

(۲) وسطانی تعلیم۔

(۳) فوقانی تعلیم۔

(۴) جسمانی تعلیم یا فزیکل ٹریننگ۔

(۵) تعلیم اناث

(۶) اعلیٰ یا یونیورسٹی کی تعلیم۔

(۷) ٹیکنیکل تعلیم جو دستکاری پر زیادہ زور دے۔

(۸) پروفیشنل یا فنی تعلیم مثلاً طب، انجنیرنگ، زراعت، صنعت، تجارت، قانون وغیرہ

(۹) ریسرچ یا اعلےٰ تحقیقات علمیہ

(۱۰) معمر اشخاص کی تعلیم اڈلٹ ایجوکیشن۔

(۱۱) معذورین کی تعلیم۔ جیسے اندھوں، بہروں اور گونگوں کی۔

سنہ ۱۳۳۸ ف کی رپورٹ سے جو زیر ترتیب ہے۔ میرے دوست مولوی فضل محمد خاں صاحب ناظم تعلیمات نے مجھے ازراہ کرم جو اطلاع بہم پہنچائی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکار عالی نے پبلک ایجوکیشن کی اہمیت کے کماحقہٗ سمجھنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ بلکہ بعض ابواب میں سرکار عالی کا فیاضانہ تصرف

دیگر ممالک کے لئے قابلِ تقلید سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ بھی واضح ہے کہ ابتدائی تعلیم ٹیکنیکل تعلیم تعلیم نسواں ریسرچ پر زیادہ روپیہ صرف کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمارا موجودہ طریق تعلیم زیادہ تر برٹش انڈیا کے طریقہ تعلیم کی تقلید کرتا ہے۔ لیکن ہمیں توقع ہے کہ وہ دن قریب آنے والا ہے۔ جب کہ یہ قدیم طریقہ ایک بڑی حد تک بدل دیا جائیگا۔ اور محض کتابی یا زبانی تعلیم کے عوض طلباء کو ملک اور خود ان کے ضروریات کے لحاظ سے ایسی تعلیم دلائی جائیگی جس سے کسبِ معاش و روزگار میں انہیں حالیہ تکالیف و پریشانیاں برداشت کرنی نہ پڑینگی۔

ابتدائی تعلیم

اگر میں متذکرہ بالا (۱۱) ابواب پر تفصیل سے بحث کرنا چاہوں۔ تو اس کیلئے کئی لکچروں کی ضرورت ہوگی نہ تو اس کی ضرورت ہے اور نہ میرے پاس اتنا وقت یا آپ حضرات کو اتنی فرصت ہے کہ اس پر صرف ہو۔ صرف چند ابواب کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کر کے آپ بزرگوں سے استدعا کروں گا کہ ان پر غور فرمائیں۔

متمدن زندگی بسر کرنے کیلئے ملک کے تمام باشندوں کو لکھنا پڑھنا آنا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ زندگی کیلئے کھانا پینا۔ جو پبلک نوشت و خواند سے واقف نہیں وہ متمدن نہیں ہو سکتی۔ پس ابتدائی تعلیم کا لزوم ایک لازمی نتیجہ ٹھہرا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا عوام کو لکھنا پڑھنا سکھا دینے سے ان کو تہذیب سکھا دی جاتی ہے کیا سرکار کا فریضہ اس معاملہ میں صرف اسی قدر ہے اور بس میں سمجھتا ہوں کہ ایسی ابتدائی تعلیم بالکلیہ ناقص ہے اور آگے چلکر اس سے پیچیدگیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ ابتدائی تعلیم عام تو کی جائے۔ لیکن اضلاع کے لئے یہ ابتدائی تعلیم ایسی ہو کہ لوگ اپنے آبائی پیشوں کو ترک کر کے ملازمت کی تلاش میں شہروں کی طرف رخ نہ کریں اور دیہات کو ویران و برباد نہ چھوڑ دیں۔ اسی طرح شہری رقبوں میں بھی ابتدائی تعلیم اگر طلبا کو صنعت و دستکاری سے نافر بنا کر صرف پیشۂ ملازمت سرکاری یا وکالت کو ہی معزز پیشہ تصور کراتی ہے۔ تو اس سے احتراز کیا جانا چاہیئے۔

ممالک محروسہ میں سب سے زیادہ عام جو پیشہ ہے وہ پیشۂ زراعت ہے دیہاتی ابتدائی تعلیم کے نصاب میں زراعت کی تعلیم بطور جزو اعظم شریک کی جانی چاہیئے۔ تاکہ لڑکے کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ جانے کے بعد اپنے آبائی پیشہ زراعت کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں اور دھوکے میں پڑ کر علم یا ملازمت کی خاطر شہروں میں بھٹکتے نہ پھریں۔ جس سے نہ تو خود انہیں کوئی اطمینان کی زندگی میسر ہو سکتی ہے۔ اور نہ ان کے والدین یا سرپرستوں کو

لوادکی پرورش و تعلیم سے فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ ابتدائی تعلیم اگر زراعت کا شوق دلائے۔ اور اُس کے متعلق صحیح اور مفید معلومات مہیا کرائے۔ تو اس سے بہتر کوئی تعلیم ہمارے مُلک کی فلاح و بہبود ایک نوع انسان کی خوشحالی کیلئے نہیں سوچی جاسکتی۔ ایسی دیہی تعلیم کے ساتھ اضلاع میں کافی ٹکنیکل مدارس کا کھولنا بھی ضروری ہوگا۔ زراعت محض بیج بونا اور کھیتوں کو پانی پہنچانا نہیں ہے۔ اس کیلئے آلات کی بھی ضرورت ہے۔ وہ آلات ایسے ہونے چاہئیں۔ کہ آسانی سے کم قیمت پر بروقت مہیا ہوسکیں ورنہ ہتا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود کی سی کیفیت پیدا ہوجائیگی۔ جب تک مُلک میں میکینیکل انجنیرنگ عالمگیر نہ ہوجائے آلات کا اس طرح بہم پہنچانا ناممکن ہے۔ عرصہ دراز تک جانوروں، گائے، بیل وغیرہ سے کام لینا پڑے گا۔ اور اُنکی نگہداشت بغیر حفظان صحت اور ویٹرنری سرجری دشوار ہے۔ پس دیہات میں ایسے ٹکنیکل اور ویٹرنری مدارس کا زیادہ تعداد میں کھولا جانا بھی ضروری ہے۔

زراعتی تعلیم کے متعلق مجھ کو فنی تعلیم کے ساتھ بھی کچھ کہنا ہوگا۔ شہری رقبوں کی تعلیم میں زیادہ تر شہر کی ضروریات کا لحاظ کیا جانا چاہیئے۔ اس رقبہ کے لوگوں کی نظر زیادہ تر ملازمت اور تجارت وصنعت و حرفت کی طرف لگی رہتی ہے۔ عام تعلیم تو قدیم یا موجودہ طریقہ سے حاصل ہوجاتی ہے۔ لیکن وسطانی اور فوقانی مدارس میں اگر کمرشیل کلاسیں، ٹائپ رائیٹنگ اور شارٹ ہینڈ کی تعلیم بھی دلائی جائے اور مناسب صنعت و حرفت کے مدارس کھولے جائیں۔ تو شہروں میں بے روزگاری کا سوال زیادہ تشویش اور تکلیف کا باعث نہ ہوگا۔

جسمانی تربیت

میں نہایت خوف وہراس کے ساتھ چند سال سے دیکھ رہا ہوں کہ مُلک کے نوجوانوں اور خصوصاً طلبہ کی صحت جسمانی گھٹتی جارہی ہے۔ شہر کے لڑکے اور لڑکیاں خاص طور پر کمزور ہوتے جارہے ہیں۔ یہ مسئلہ حفظان صحت اور معیشت کے عام مسائل کے ساتھ وابستہ ہے تمام مُلک میں ملیریا طاعون اور دق کے امراض پھیلے ہوئے ہیں۔ ہماری سکونت و بود و باش کے مقامات غیر سائنٹیفک طریقہ پر منتخب ہوئے ہیں اور سچ پوچھو تو بمصداق :۔

"حیدرآباد نگینہ ـــــ اندر مٹی اوپر چونا"

انسانوں کی بود و باش کیلئے اتنے موزوں نہیں ہیں۔ جتنے کہ چوہوں گھونسوں اور متعدی امراض کے لئے موزوں ہیں۔ میں دولت مند بزرگوں اور صاحب ثروت امراء سے معافی چاہ کر عرض کردوں گا کہ ماحول کے اثر نے ان کے مکانات کو بھی جراثیم سے مصئون اور مُعرّا نہیں رکھ چھوڑا ہے۔ حفظان صحت کی معمولی سے

معمولی سے واقفیت بھی اس سُقم کو دُور کر دیگی۔ آرائش بلدہ کی اسکیم سرعت کیساتھ جاری ہے۔ توقع کیجاتی ہے کہ غربا کی رہائش کا مسئلہ بھی خاطر خواہ طریقہ پر حل ہوجائیگا۔ یہ امور سررشتۂ تعلیم کے دائرہ سے باہر ہیں۔ سررشتۂ تعلیم طلبہ کی اقامت خانوں اور طلبہ کی ورزش جسمانی کی طرف توجہ کرسکتا ہے۔ اقامت خانوں کی زندگی، اخلاقی اُصول کے تابع، ہمدرد اساتذہ کے زیر نگرانی ایک ایسی نعمت ہے جس کے فوائد کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر ورزش جسمانی کا بھی انتظام کیا جائے تو ملک کے آئندہ شہری اپنی تندرستی کی وجہ زیادہ صحیح الدماغ وخوش خلق اور کارفرما وکارکُن ثابت ہوں گے۔ بوائے اسکاؤٹس موومنٹ ٹریٹوریل کور کا قیام اور طلبہ مدارس کی عام جسمانی تربیت کیلئے ایک باقاعدہ تعلیم یافتہ تجربہ کار شخص کا تقرر حال ہی میں عمل میں آیا ہے۔ ہمیں اُمید دلاتے ہیں کہ طلبہ کی صحت جسمانی میں معتدبہ ترقی ہوجائیگی۔ یونیورسٹی کے طلبہ کا سالانہ طبی معائنہ بھی منظور ہوچکا ہے اگر . . . . مدارس کی عمارتیں سائنٹفک اصول کے بموجب بن جائینگی تو طلبا کی اکثر وبیشتر جسمانی کمزوریاں مثلاً بینائی کا قصور، خیشومی نقائص وغیرہ بڑی حد تک دُور ہوجائیں گے۔

طلبہ کا فطرۃً ورزش جسمانی کی طرف میلان طبع ہوتا ہے۔ اکسفورڈ اور کیمبرج وغیرہ اقامتی جامعات میں سب سے بڑی تربیت کتابی علوم سے بدرجہا بڑھکر ہے۔ کھیل و ورزش جسمانی اور معاشرتی زندگی ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ ہم اپنے بڑے مدارس میں بھی یہی بات دیکھتے ہیں۔ اس فطرتی شوق کی ایک مثال شفیع احمد صاحب سابق طالب علم کلیہ جامعہ عثمانیہ کی پیراکی میں کامیابی ہے جیساکہ اکثر حاضرین کو معلوم ہے۔ اسی فطری جذبہ نے شفیع احمد صاحب کو رودبار انگلستان کو عبور کرنے کی کوشش پہ آمادہ کیا ہے۔ خدا سے دُعا ہے کہ وُہ اس عالیشان عزم میں کامیاب ہوجائیں۔

ٹکنیکل تعلیم

ٹکنیکل تعلیم پر مَیں نے اِس سے پہلے بھی کچھ کہا ہے۔ کسب معاش کے نقطۂ نظر سے اس کی ضرورت واضح ہے۔ لیکن یہاں یہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ٹکنیکل تعلیم کی کامیابی کیلئے اول تو ملک کی صنعت وحرفت کا وسیع پیمانہ پر موجود ہونا لازمی ہے۔ کارخانوں کے مالکوں کو ایسے ہونہار کارآموزوں کے ساتھ ہمدردی ہونی چاہیئے جو وہاں جاکر نوکری کرنا چاہتے ہیں۔ کارآموزوں کو بھی یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کے مدرسہ یا جامعہ کی سند اُن کو اگر کسی چیز کا اہل بناتی ہے تو محض کارخانوں میں داخل ہوکر کام سیکھنے کا اہل بناتی ہے . . . اصل کام وہ کارخانوں ہی میں سیکھیں گے۔ اگر سپرٹ . . . .

رہی تو ملک میں صنعت و حرفت کو بہت کچھ فروغ ہوگا۔لیکن انڈسٹری یا صنعت میں کسی ملک کا حقیقی معنوں میں ترقی کرنا محض اس قسم کی تدابیر سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کیلئے بعض معیشتی اور بین الاقوامی مسائل کا حل ہونا بھی ضروری ہے۔ برطانوی ہند کے معیشتی اور ٹکنیکل ماہر اور علی الخصوص کیمسٹ اس طرف توجہ کر رہے ہیں مجھے اپنی طرز زندگی اور مصروفیتوں کیوجہ سے ان مسائل پر غور کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ سرِ دست میں یہی مشورہ دیسکتا ہوں کہ ان حضرات کو جو اس مسئلہ کحل میں اپنے آپ کو مشغول بتاتے ہیں تحقیقات کر لینے دیں اس کے بعد ہم ان کے نتائج پر تنقید کر سکیں گے۔ ہمارے ملک کی ترقی کا دار و مدار زیادہ تر زراعت پر ہے ہمیں چاہیئے کہ سرِ دست زراعت ہی کے مسائل پر غور کریں۔ اور ان کے تمام حل ڈھونڈیں۔

جو کچھ بھی ٹکنیکل تعلیم ہم دے سکتے ہیں۔ اس کو کامیاب بنانے کیلئے طلبہ کو بالطبع دست کاری کی طرف مائل اور اس سے مانوس بنانا سر رشتہ تعلیمات کا بڑا فریضہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے ابتدا ہی سے طلبہ کو دستکاری کا عادی بنانا ضروری ہے۔ پس مناسب ہوگا کہ دست کاری کو تعلیم کے نصاب میں شامل کر دیا جائے۔ سائینس چونکہ ایک عملی علم ہے اس کو بھی ابتدا ہی سے نصاب تعلیم میں شریک کرنا لازمی ہوگا۔ جتنے بھی علمی مضامین ہیں ان سب کی بنیاد طبیعات، کیمیا، حیاتیات اور ریاضی پر قائم ہے۔ پس ان مضامین کی طرف خاص توجہ کرنی چاہیئے۔ اور اعلیٰ تعلیم میں خصوصیت کے ساتھ ان کی ترقی و ترویج کا انتظام ہونا چاہیئے۔

اعلیٰ التعلیم

اعلیٰ تعلیم ایک ایسی شے ہے کہ اس سے ملک کے بہترین دماغوں کی پرورش بلکہ تکوین ہوتی ہے الحمد للہ ہمارے ملک میں اس کی طرف بتوسط جامعہ عثمانیہ و نظام کالج وغیرہ کافی توجہ کیجا رہی ہے۔ دس بارہ سال کے اندر جامعہ عثمانیہ میں ایم اے اور ایم ایس سی تک کی جماعتیں کھل گئیں۔ ایل ایل بی کی تعلیم بھی اچھے اصول پر جاری ہے۔ جامعہ کے موزوں عمارت نہ ہونے سے ہمیں اس تعلیم سے وہ حیرت انگیز فائدہ حاصل نہیں ہو رہا ہے جس کی ہمیں توقع ہے باوجود ان رکاوٹوں کے ہم نے جو کام شروع کر دیا ہے اس کی اہمیت کو ممالک غیر کے ماہرین نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ بلحاظ تعلق مجھے جامعہ عثمانیہ کے متعلق زیادہ نہیں کہنا چاہیئے صرف اس بات پر اکتفا کرتا ہوں کہ حیدرآباد میں جامعہ کا قیام ایک فطری امر تھا۔ اور اسی طرح اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا بھی ہمارے لئے ایک فطری بات تھی۔ گذشتہ جلسہ تقسیم انعامات کے موقع پر میں نے بیان کر دیا ہے کہ اردو زبان میں تعلیم حقیقی باشندگان ملک کے تمام افراد کو بلالحاظ قوم و ملت انگریزی کے ذریعہ تعلیم دلانے سے زیادہ مفید و کارآمد ثابت ہو رہی ہے۔ میں یہاں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ جامعہ عثمانیہ میں ملک کی دوسری زبانوں مثلاً تلنگی،

مرہٹی اور کنٹری کی بھی خاطر خواہ خدمت کیجارہی ہے۔ ان زبانوں میں ایم اے تک کی بھی تعلیم دی جاتی ہے لیکن ان کے پروفیسروں نے زمانہ کا رنگ اور ہندو طلبہ کا طبعی رجحان دیکھ کر یہی مشورہ دیا کہ بجائے ورنیکلر زبانوں میں ایم اے کی جماعتیں کھولنے کے ریسرچ کی تعلیم دلائی جائے چنانچہ حال میں پچھتر پچھتر روپیہ کے تین وظائف ان زبانوں کی ریسرچ کیلئے منظور ہوئے ہیں۔ اور یہ کام آئندہ شہریور سے شروع کر دیا جائیگا۔ سائینس میں ایم ایس سی کے ساتھ ریسرچ بھی شریک کر دی گئی ہے۔ تاریخ کے ایم اے میں پہلے ہی سے مقابلہ نویسی داخل تھی اب اردو میں بھی اُس کو لازمی کر دیا جانا تجویز ہوا ہے۔

اعلیٰ تعلیم کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے میں نے یہ بیان کیا تھا کہ اس سے ملک کے بہترین دماغوں کی پرورش ہوتی ہے۔ اس بارے میں میں ذرا زیادہ تفصیل سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔

کسی قوم یا ملک کا وقار اس کے اعلیٰ ترین افراد سے ہوتا ہے وہ کون ہیں؟ ملک کے مدبر و عمائد سلطنت جو اپنی قابلیت، وفاشعاری، ہمدردی اور کارگزاری سے ملک کا نام روشن کرتے ہیں امراء و سرمایہ دار جو اپنے فضل و کرم جود و سخا اور ملک کی خدمت گزاری سے رعایا اور حاجتمندوں کی اعانت و دستگیری کرتے ہیں ان کے سوا ایک تیسرا طبقہ بھی ہے جو زمانہ دراز سے دنیا پر اپنا اثر ڈالتا چلا آرہا ہے اس طبقہ میں مذہب و ملت کے پیشوا اور علماء و فضلاء شریک ہیں۔ زمانہ حال کی مادیت پرستی نے افسوس ہے کہ پیشوایان مذہب و ملت کو خارج از بحث گردانا اس لئے میں ان کا ذکر اس جگہ مناسب نہیں سمجھتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ علماء فضلا ہی اس زمرے میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اس لئے علما فضلا ہی کے متعلق بحث کرونگا۔ پہلے زمانہ میں خانگی تعلیم سے یا کسی مشہور و معروف استاد کی خدمت سے لوگ علم و فضل کے بلند ترین درجوں تک پہنچ سکتے تھے اب مادی علم اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ بغیر اعلیٰ پیمانہ پر باقاعدہ اور مسلسل کوشش کرنیکے ملک کا کوئی فرد حقیقی معنوں میں عالم و فاضل نہیں بن سکتا۔ روحانیت کا دروازہ بند ہونے کو ہے صرف مادیت میں ترقی اور حیرت انگیز ترقی ہو رہی ہے۔ خواہ فنون کے شعبہ میں ہو یا سائینس کے شعبہ میں نام آوری کرنے کے لئے اعلیٰ ریسرچ کی سخت ضرورت ہے۔ ایسی تحقیق صرف بڑے پایہ کے کتب خانوں اور تجربہ خانوں ہی سے ممکن ہے۔ قابل سے قابل شخص ان کتب خانوں اور تجربہ خانوں کے بغیر گمنام رہ جاتا ہے اور اوسط ذہانت کا انسان بھی ان میں کام کر کے کبھی کبھی بڑے اہم اور نمایاں ایجادات و انکشافات سے دنیا کو مسخر کر لیتا ہے۔ کتب خانوں اور تجربہ خانوں پر سرکار یا قوم کی طرف سے جتنا بھی روپیہ خرچ ہو فائدے سے خالی نہیں ان میں کام کرنے والوں کو اطمینان قلب نصیب ہونا چاہیئے۔ اگر ایسی تجربہ گاہیں / لیبوریٹریاں قایم کر دی جائیں اور ان پر ملک کے قابل ترین اشخاص مامور کئے جائیں تو ممالک محروسہ میں بھی اسی پایہ کی ایجادات و انکشافات دیکھنے میں آسکیں گی جیسی کہ برطانوی ہند کے بعض حصوں میں

اب نمایاں ہو رہی ہیں اور جن کا چرچا چار دانگ عالم میں ہو رہا ہے۔ سر راجندر ناتھ ٹیگور، میگ ناتھ ساہا، اور سر سی وی رامن وغیرہ کی وجہ سے علمی دنیا میں ہندوستان کو ان دنوں میں جو شہرت نصیب ہوئی ہے وہ بیس سال قبل لوگوں کے وہم و گمان سے بھی باہر تھی۔ کوئی وجہ نہیں کہ دنیا کے سر برآوردہ ماہران علوم و فنون میں حیدر آباد کے منتخب افراد کا نام داخل نہ ہو۔ ایسے کام کرنیوالے یہاں ڈھونڈنے سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ ان کو موقع دیا جانا چاہیئے۔ ایک بار جب وہ اطمینان کے ساتھ کام پر لگ جائیں گے تو ان کے زیر اثر ملک کے ہونہار طبقہ سے بھی ایک ایسی جماعت ایسے محققین کی پیدا ہونے لگیگی۔ میں نے کوڈائی کنال (Kodai Kanal) کی رصدگاہ شمسی طبیعات (Solar physical observatory) میں ریسرچ کی اجازت اپنے طالب علموں کیلئے حاصل کر لی۔ پروفیسر ساہا نے ہمارے ایک ایم ایس سی کے طالب علم کو الہ آباد کی فزکس لیبوریٹری میں (Spectroscopy) پر کام کرنے کی دعوت دی ہے نظام کالج کے ایک ہونہار گریجویٹ نے پروفیسر رامن کے تجربہ خانہ میں قابل تعریف کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہاں میں جامعہ عثمانیہ کے ان لائق طلبہ کا ذکر کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے یورپ کی جامعات میں قابل تحسین کامیابی حاصل کی ہے اور کر رہے ہیں اسلیئے کہ متعدد موقعوں پر میں نے تفصیل کے ساتھ ان کا ذکر کر دیا ہے اگر ہم اپنے تجربہ خانوں کو ترقی دیکر اطمینان کے ساتھ اعلیٰ تحقیقات کا کام کرنا شروع کر دیں تو ہمارے طلبہ کو باہر جانیکی ضرورت نہ ہوگی۔ اور تحقیقات میں جو کچھ کامیابی حاصل ہوگی اس کا کریڈٹ ہمارے ملک ہی کو ملے گا۔

تعلیم نسواں

اب میں تعلیم نسواں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اگرچہ ہم گذشتہ چند سال سے ہم نے اناث کی اعلیٰ تعلیم پر کافی روپیہ صرف کرنا شروع کر دیا ہے اور مستورات کو یورپ بھیجکر تعلیم دلائی جا رہی ہے۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی تعلیم نسواں پر اس سے بہت زیادہ روپیہ اور توجہ صرف کرنے کی شدید ضرورت ہے عورتوں کے لئے اعلیٰ تعلیم سے کہیں زیادہ روزمرہ کی معمولی اور ان کے ضروریات کے مناسب تعلیم کا انتظام ہونا چاہیئے ہر تعلیم یافتہ شخص کو روز روشن کی طرح معلوم ہے کہ عورتوں کے لئے خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو بلند طبقہ کی ہوں یا پست طبقہ کی نہ صرف لکھنے پڑھنے کی بلکہ اچھے اور اونچے معیار تک کی تعلیم دلانا کس لئے ضروری ہے اگر ہندوستان مہذب دنیا کی نظروں میں عزت کا مقام چاہتا ہے تو اُسے بہت جلد اپنے اناث کو تعلیم یافتہ بنا دینا چاہیئے لیکن اس بات کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ لڑکیوں کو ان کے مفید مطلب اور کار آمد تعلیم دلائی جائے لڑکیوں کیلئے لڑکوں کی تعلیم کا نصاب ایسا ہی غیر موزوں ہے جیسے کہ فوجی ملازمت۔ اگر مطمح نظر یہی ہے۔

کہ لڑکیاں بھی سب کی سب لڑکوں کی طرح میٹرکیولیشن انٹرمیڈیٹ پاس یا بی اے۔ ایم اے بن کر تعلیم گاہوں سے نکلیں تو میں بلا تامل اپنے آپ کو ایسے ماہران فن تعلیم کے زمرے سے علیحدہ کرلوں گا جن کا یہ مطمح نظر ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق بارہا اناث کی تعلیم کے لیے سرپرستوں اور منتہموں سے گفتگو کرنے کا مجھے موقع ملا۔ میں نے جب دریافت کیا۔ کہ انگلستان کے مدارس میں اعلیٰ تربیت اناث کے اصول پر تعلیم کیوں نہیں دی جاتی تو یہی جواب ملا کہ اگر ایسا کیا جائے تو بہت کم لڑکیاں ہمارے مدرسوں میں شریک ہونگی۔ کیونکہ سرکاری یا یونیورسٹی کی سند کی رشوت کے بغیر اکثر و بیشتر والدین اپنی بچیوں کو مدرسہ بھیجنا عبث سمجھتے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ بہت جلد یہ خیال پبلک کے دلوں سے دُور ہوجائیگا اور تعلیم کے اصل منشاء و مقصد کی طرف مائل ہوجائیں گے۔

یہ سرکاری اور یونیورسٹی کی سندیں ہیں جو غالباً اناث کو بھی انہیں نصاب کا پابند کراتی ہیں جو مردوں کیلئے تجویز ہوئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید مسٹر کاروے (Karve.) کی بنائی ہوئی مستورات کی جامعہ نے حصولِ سند کے شوق کو مفید مطلب نصاب کے ساتھ ایک حد تک تباہ دیا ہے۔ لیکن بہ نظر غائر اگر یہ دیکھا جائے تو الا اس صورت کے جب کہ عورت کو مجبوری یا محض شوق کی خاطر نوکری اختیار کرنا پڑتی ہے حصول سند کی خواہش ضروری ہے اور اگر درس گاہیں صحیح اصول پر باقاعدہ طریقہ سے اناث کی ضروریات ہی سے متعلق نصاب تجویز کرکے تعلیم دینا شروع کریں۔ تو میرا خیال ہے کہ بیشتر روشن خیال والدین اپنی بچیوں کو ایسے ہی مدرسوں میں بھیجنا پسند کریں گے اور تعلیم یافتہ اناث کی تعداد میں معتد بہ ترقی ہوگی ایسی تعلیم یافتہ لڑکیاں یقیناً اپنے ماں باپ کے گھر میں بھی خوش رہیں گی اور شادی کے بعد شوہر و زن میں بھی بخوبی اتفاق رہیگا۔ اگر کوئی غیر معمولی ذہانت والی یا اعلیٰ تعلیم کی دلدادہ لڑکی محض اکتسابِ علم کی خاطر یونیورسٹی کا کورس اختیار کرنا چاہتی ہے تو یہ ایک دوسری ہی بات ہے ایسی لڑکی کو جس قدر بھی اس کے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے مدد دی جائے اچھا ہے ہمیں توقع ہے کہ ہمارے ملک سے ایسی چند لڑکیاں نکلیں گی اور اپنے ماں باپ اور وطن کا نام روشن کریں گی۔

اگر اناث کو سینا، پرونا، کشیدہ کاڑھنا اور کھانا پکانا سیکھ لینے کے بعد حفظان صحت، ڈومسٹک اکانومی، بیالوجی یا طب خصوصاً (midwifery) دایہ گری اور نرسنگ (Nursing.) کا شوق دلایا جائے تو وہ ملک و قوم کے لئے نہ صرف مفید بلکہ مایۂ ناز بھی ہونگی۔ آخر الذکر دو شعبوں میں ہندوستانی عورتوں اور علی الخصوص مسلمان عورتوں کی اس قدر قلت ہے کہ اُن کیلئے سرکار اور پبلک کی جانب سے خاص طور پر کوشش کیجانے کی ضرورت ہے۔

بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ پردہ مانع تعلیم اناث ہے اور جب تک نہ اُٹھ جائیگا ہندوستان میں تعلیم یافتہ عورتیں عنقا ہی عنقا رہیں گی۔ پردہ کی حقیقت یا اُس کی ضرورت و غیر ضرورت کا سوال معاشرتی ہے خالصاً تعلیمی نہیں لہذا میں اُس کے حُسن و قبح پر اس محل میں بحث کرنا ضروری نہیں سمجھتا لیکن اتنا ضرور کہونگا کہ پردہ کا عذر بنا کر جو لوگ تعلیم اناث سے غفلت کرتے ہیں اور اس فکر میں بیٹھے ہیں کہ پردہ اٹھا دیں بعد کو عورتوں کی تعلیم شروع کریں۔ اندیشہ ہے کہ ایسے لوگوں کے گھروں کا پردہ تو غالباً اُٹھ جائیگا۔ لیکن اس میں تعلیم داخل نہیں ہوگی۔

ایسی پردہ نشین شادی شدہ مستورات کی تعلیم کیلئے جو اپنے گھر کے کاروبار اور دیگر مصروفیتوں کی وجہ سے مدرسے جا کر علم حاصل نہیں کرسکتیں مسز ٹاسکر نے ایک اسکیم تجویز کی ہے جو محلوں اور خاندانوں کے اتحاد عمل پر مبنی ہے جب وہ اسکیم مکمل صورت اختیار کر کے حیدر آباد دکن کی انجمن خواتین (womens society) کی منظوری حاصل کریگی تو امید ہے کہ اس سے بہت خاندان استفادہ کرسکیں گے کیا عجب کہ اپنے خطبہ میں محترمہ مسز رستم جی اس مسئلہ پر بحث کریں۔

تعلیم نسوان کے کئی اور مسائل حل طلب ہیں مثلاً یہ کہ آیا چھوٹی عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک مقررہ عمر تک مدارس میں ایک ساتھ تعلیم دلانا مناسب ہے یا یہ کہ لڑکیوں کو انگریزی کی تعلیم دلانا زیادہ مفید ہوگا یا اپنی مادری زبان کی تعلیم۔ مسائل بہت دلچسپ اور ان پر خالصاً تعلیمی نقطۂ نظر سے اچھی بحث کی جاسکتی ہے۔ لیکن چونکہ خوش نصیبی سے محترمہ مسز رستم جی موضوع تعلیم نسوان پر تقریر کرنیوالی ہیں۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ کہ اس مسئلہ کو اب ختم کردوں۔

اب میں مختصر طور پر بیان کرنے کی کوشش کروں گا کہ تعلیم کی سپرٹ کیا ہونی چاہیئے مجھے یہ کہنے میں مطلقاً تامل نہیں کہ وہ تعلیم جو اخلاق کی نگہداشت نہ کرے عبث اور بے سُود ہے۔ انسان میں اخلاق حمیدہ جب تک نہ پیدا ہوں وہ بہائم سے علیحدہ نہیں سمجھا جاسکتا۔ مختلف زمانوں اور تمدن میں اخلاق کی تعلیم مختلف طرزوں پر رہی ہے لیکن ہر صورت میں اس کا کوئی معین نصاب نہیں رہا ہے یہ زیادہ تر اساتذہ کے اخلاق اور ملک کے اخلاق پر ہی مبنی رہا ہے قدیم زمانے میں شاگرد استاد کو اپنے ہر کاروبار میں پیشوا اور ہادی سمجھتے تھے اور اساتذہ بھی اپنے شاگردوں سے ایسی محبت اور اُنسیت تھی جیسی کہ اپنی اولاد کے ساتھ یہ وہ زمانہ تھا کہ اس میں تعلیم مفت دیجاتی تھی یا اساتذہ کا معاوضہ اوقاف یا اسٹیٹ کی دیگر پوشیدہ امدادوں کے ذریعہ سے کچھ ایسے غیر محسوس طریقہ پر ادا ہوتا تھا کہ تعلیم مفت ہی متصور ہوتی تھی۔ زمانہ میں رفتار کے ساتھ اس طرز تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت پیش آئی۔ موجودہ تنخواہ یاب اساتذہ کا کم از کم ایشیائی ممالک میں وہ احترام نہ رہا۔

جو پرانے عہد کے اساتذہ کو نصیب تھا۔ لوگ یہی سمجھنے لگے کہ استاد کو اگر ہماری فیس سے روپیہ نہیں ملتا ہے تو کم از کم سرکار سے تو ضرور معاوضہ ادا ہوتا ہے۔ پس ہم پر احسان ہی کیا۔ معمولی تعلیم کی حد تک تو ایسے یا ان سے مختلف خیالات کا اثر ہی کیا ہو سکتا ہے۔ جب اعلیٰ تعلیم و تحقیقات عالیہ کا سوال پیدا ہوا تو اساتذہ نے یہ محسوس کیا کہ ان ابواب میں طلبہ کی رہنمائی ایک ایسی چیز ہے جس کا معاوضہ روپیہ پیسے سے کسی طرح ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر کوئی معاوضہ ہو سکتا تو وہ اپنے صرف شاگرد کی عقیدت، فرمانبرداری اور سعادت مندی ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ طلبہ نے بھی اس بات کو تسلیم کر لیا اور جن جامعات میں آئے دن نئی نئی تحقیقات و انکشافات کی بارش برس رہی ہے وہاں استاد اور شاگرد میں ایسے ہی تعلقات پائے جاتے ہیں جو زمانہ قدیم میں دیکھے جاتے تھے۔ کیا خوب ہوتا کہ ہر درجہ کی تعلیم میں بھی اس قسم کا تعلق برقرار رہتا۔ زمانہ گذشتہ کی اس خوبی کو مکرر حاصل کرنے کیلئے اساتذہ کو زیادہ ایثار سے کام لینا ہوگا۔ اور شاگردوں کو زیادہ سعادتمندی اور اطاعت گذاری اختیار کرنی ہوگی۔ جو کامیاب استاد ہیں وہ اب بھی پیشہ تعلیم کو حصول زر کی خاطر نہیں اختیار کرتے بلکہ محض علم کی محبت میں اختیار کرتے ہیں۔ جو جاہ طلب ہیں اس میدان میں زیادہ دن رہنے نہیں پاتے وہ یا تو اپنا پیشہ ہی بدل دیتے ہیں یا زمانہ انہیں ایثار سکھا دیتا ہے۔ یہ تو اساتذہ کے متعلق واقعات ہیں طلبہ بھی جب تک سعادتمندی نہیں اختیار کرتے انہیں علم نہیں نصیب ہوتا۔ اور اگر نصیب بھی ہوا تو اُس کے مفاد سے محروم رہتے ہیں۔ پس میں اساتذہ و طلبہ دونوں سے درخواست کرتا ہوں کہ نوع انسان کے ارتقا فلاح و بہبود کی خاطر وہ زمانہ ماسبق کے ان مبارک اخلاق و اطوار کو اپنا نصب العین بنالیں جس سے معلم و متعلم دونوں کی عزت افزائی ہوتی تھی اور دونوں کو بیرون از قیاس فائدہ پہنچتا تھا۔

مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جو لوگ حقیقی معنوں میں استاد ہیں وہ اپنے ہونہار شاگردوں کے مفاد کے لئے اگر ضرورت ہو تو تمام دنیا سے بگاڑ کر لینا پسند کرتے ہیں۔ ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ شفقت اُستاد کی بدولت کند ذہن سے کند ذہن طالب علم بھی بن کر ایسے روزگار سے لگ گئے کہ ان کی دنیا اور عاقبت دونوں ہی اچھی رہیں۔ پس استاد کا احترام اور اس کے ساتھ وفا شعاری شاگرد کے لئے ایک ایسا اخلاقی فریضہ ہے۔ جو مذہبی حکم کی وقعت رکھتا ہے۔

معمر لوگوں کی تعلیم

بالغ لٹ ایجوکیشن ایک زمانہ سے زور دیا جا رہا ہے کوئی وجہ نہیں کہ ایسے مرفہ الحال لوگ جو بدقسمتی سے اوائل عمر میں اچھی تعلیم نہ پا سکے تھے ایسے ہی ناقص التعلیم رہیں۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ دنیا کا تمدن زیادہ تر تعلیم ہی پر قائم ہے۔

اور تعلیم عمر اور دیگر قیود سے بری ہے ۔ معمر شخص کیلئے امتحانات کامیاب کرنا یا ڈگریاں لینا اگر ممکن نہیں تو محض علم کی خاطر تحصیل علم چنداں مشکل نہیں ۔ انسان کی قوتِ ارادی فضا اور وقت دونوں پر غالب آسکتی ہے علم کے ایسے طلب گار کتب خانوں ۔ نائٹ کلاسوں اور پاپولر یا ایکسٹن لکچروں سے خاطر خواہ استفادہ کر سکتے ہیں ۔ پس امید کی جاتی ہے کہ سرکار یا دولت مند پبلک کی طرف سے انسٹیٹیوشن زیادہ تعداد میں اور سرعت کے ساتھ زیادہ قایم ہوتے جائینگے ۔ پبلک کتب خانوں کا اثر ملک کی خواندگی پر انتہا درجہ کی اہمیت رکھتا ہے ۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ بلدہ و مضافات میں ہمارے ملک میں بھی ایسے کتب خانے بڑی تعداد میں قایم ہونے لگے ہیں اگر ان کتب خانوں کے سرپرست یا مہتمم محض اشاعت تعلیم ہی اپنا النصب العین رکھیں ۔ اور سیاسی یا سازشی آلائشوں سے ان کو پاک صاف بنائیں تو ملک علم کی تنویر سے منور ہو جائیگا ۔ اور فرقہ بندی کے جھگڑے آپ سے آپ رفع ہو جائینگے ۔

اشاعت تعلیم میں صاحب ثروت امرا اور دولتمند اشخاص کا اثر

اب تک ہم نے جو کچھ کہا وہ زیادہ تر سرکاری انتظامات تعلیم ہی سے متعلق تھا ۔ ہمارے ملک ہند میں پبلک کو ابھی سرکار کا ہاتھ بٹانے کا خیال نہیں پیدا ہوا ہے ۔ اگر پبلک بھی ایسے تعلیمی اور رفاہ عام سے متعلق کاموں میں محض زبانی نہیں بلکہ دام و درم کے ساتھ دلچسپی لے تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا ملک تعلیم میں کسی دوسرے متمدن ملک سے پیچھے نہیں رہیگا ۔ امرا اگر کارہائے تعلیم میں دلچسپی نہیں لیتے ہیں تو کیا ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم ان کو دلچسپی دلانے کی کوشش کریں ۔ مجھے افسوس کے ساتھ یہ ماننا پڑتا ہے کہ اگرچہ ہمارے ملک حیدرآباد میں لایق اور نامور اور اساتذہ وغیرہ بہت گزرے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے بھی طبقہ امرا یا صاحب ثروت حضرات پر اپنے علمی کاموں کا ایسا گہرا اثر نہیں جمایا جس سے ان بزرگ ہستیوں کو کم از کم وظائف یا انعام تعلیمی کے ذریعہ ان اساتذہ کی یادگاریں قایم کرنے کا کچھ بھی احساس پیدا ہوا ہو ۔ جو یادگاریں قایم ہیں وہ زیادہ تر سرکاری کی رقم سے قایم ہیں ۔ پبلک فنڈ سے اگر کوئی یادگاریں قایم ہیں تو ان کی تعداد اس قدر قلیل ہے کہ ان کا ہونا نہ ہونا دونوں مساوی ہیں ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس قلت کی وجہ زیادہ تر خود اہل علم کا باہمی حسد یا سہل انگاری ہے ۔ میں امید کرتا ہوں کہ وہ اب ان کمزوریوں کو رفع کریں گے اور طبقہ علما کی فضیلت کو ملک سے منوا کر انہیں اس بلند مرتبہ پر پہنچا دینگے جس کے کہ وہ مستحق ہیں ۔

مطابع اور اُن کا اثر اشاعتِ تعلیم پر

مطابع خواہ انگریزی ہوں یا اُردو یا دیگر ملکی زبانوں کے مدارس سے بھی زیادہ علم کی اشاعت کرتے ہیں ان

کے ذریعہ ہزارہا معلومات دور و دراز مقامات تک اور عام طور پر بہترین پیرایہ میں پہنچائی جاتی ہیں۔ مطابع کے مالک اور علمی اخبارات و رسالہ جات ایک طرح سے علم کے سرپرستوں میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ اُنہیں اپنی اس قوت کا اندازہ تو ضرور ہوتا ہے لیکن امید کیجاتی ہے کہ وہ اپنی اس قوت کو اچھے ہی کاموں میں صرف کریں گے۔ ان کے پاس ایک نہایت ہی تیز شمشیر ہے جس سے وہ اگر چاہیں تو جہل اور دروغ کو دنیا سے نیست و نابود کر دیں پس انہیں چاہیئے کہ اس ہتھیار کو صرف نیک کاموں کی تائید میں استعمال کریں۔ ذاتیات غلط بیانی اور غیر محققہ اطلاعوں کی اشاعت سے پرہیز کریں ورنہ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کا وہ مشہور شعر ان کے حسب حال سمجھا جائیگا ؎

تراتیشہ دادم کہ ہیزم شکن
نہ گفتم کہ دیوارِ مسجد بکن

خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ملک اب ایسے مدبر پیدا کرنے کی طرف مائل ہو رہا ہے جو اس شعر کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے ہیں اور واقعات کے بیان اور رائوں کے اظہار میں حق شناسی اور نیک نیتی سے کام لینے کی کوشش کرتے ہیں میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت میں سیاسیات کو نظر انداز کر کے مطابع کے ان کاروبار سے بحث کر رہا ہوں جو علمی رسالوں اور کتابوں کی طباعت سے متعلق مناسب رسالوں اور کتابوں کی اشاعت سے ہر گھر مدرسہ یا دار التعلیم بن سکتا ہے اور اُن کا ہر مطالعہ کرنیوالا ایک گھریلو یونیورسٹی کا طالب علم تصور ہو سکتا ہے افسوس ہے کہ ہماری اقتصادی کمزوری اجازت نہیں دیتی کہ ملک میں مطابع کی کافی تعداد مہیا ہو جائے۔ اس وقت خصوصیت کے ساتھ ہمیں انگریزی اور اس میں بھی ریاضی اور سائنس کی کتابوں کی طباعت میں غیر معمولی دقتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں خدا کرے کہ طباعت کتب کے لئے حیدرآباد میں جلد مدراس بمبئی کلکتہ وغیرہ کی سہولتیں میسر ہو جائیں تاکہ مصنفین کو تصنیف تالیف کی مزید سہولت ہو اور پڑھنے والوں اور علی الخصوص طلباء کو سستے داموں اور عمدہ چھپائی کی کتابیں مل سکیں۔

یہاں اردو ٹائپ اور نستعلیق وغیرہ کا سوال بھی خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ چونکہ حال ہی میں نستعلیق کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوئے تھے اور اس کا مسئلہ زیر سرپرستی سرکار عالی ایک منتخب کمیٹی کے سپرد ہوا ہے اس لئے میں صرف اتنا بیان کر کے اس موضوع کو ختم کرنا چاہتا ہوں کہ سرکار عالی نے اس سوال کے حل کرنے کی کوشش میں کئی ہزار روپیہ خرچ کر دیا ہے اور خرچ کرنے پر آمادہ ہے جس سے اس کی سرپرستی علم کا ایک مزید ثبوت ملتا ہے۔

تعلیمی نمائشیں اور ان کے فوائد

سابق میں ہماری تعلیمی کانفرنس کے جلسوں کے ساتھ علمی نمائش کا بھی انتظام ہوتا رہا ہے ہمیں چاہئے کہ

حتی الامکان ایسی نمائشوں کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں ان کے قیام و انتظام پر نہایت تفصیل کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے اس وقت میں مناسب نہیں سمجھتا کہ اس موضوع پر اس سے زیادہ بیان کروں کہ اگر ہر سال بلدہ کے علاوہ اضلاع میں بھی ایسی نمائشیں منعقد کی جائیں اور دیگر ممالک کے مدارس و اساتذہ وغیرہ کو ان میں شرکت کی دعوت دی جائے تو شوق مسابقت اور باہمی ارتباط نہ صرف تعلیم کی ایفی شنسی (Efficiency.) یعنی استعداد کو ترقی دیگا بلکہ آپس کا اتحاد بھی بڑھادیگا جس کی ہندوستان کو بہت ضرورت ہے ایسی نمائشوں میں سینما کے ذریعہ تاریخی و اخلاقی مطالب پر بھی بہت کچھ روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔ اور سائنس کی جدید ترین تحقیقات اور اس کے نتائج سے چھوٹے اور بڑے، بچے اور بوڑھے سب کے سب بوقت واحد واقف کرائے جا سکتے ہیں۔

فوٹوگرافی اور پینٹنگ

اسی ضمن میں میں نقاشی و عکاسی یعنی پینٹنگ اور فوٹوگرافی کی ضرورت تعلیم کی جانب آپ کو متوجہ کرانا چاہتا ہوں۔ ہمارے ملک کو عمدہ پینٹروں اور فوٹوگرافروں کی سخت ضرورت ہے سیر و سیاحت کے ذریعہ انسان اپنے اور پرائے ملکوں کے خوشنما مناظر سے آگاہ ہوجاتا ہے اور ان کا خوشگوار اثر اس کے جمالیاتی حواس کو تقویت بخشتا اور اس کی اخلاقی زندگی کو فروغ دیتا ہے لیکن حافظہ کہاں تک اور کب تک کام دیسکتا ہے ان چیزوں کی یاد ہمیشہ تازہ رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کے عمدہ فوٹو یا تصاویر لی جائیں بعض صورتوں میں فوٹوگراف کے ذریعہ اشیاء کی تفصیل خاطر خواہ نہیں کیجا سکتی نیز اچھے سے اچھے فوٹوگراف زیادہ دیرپا نہیں ہوتے اس لئے پینٹنگ یا ڈرائینگ اور فوٹو انگریونگ کی ضرورت داعی ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں مہذب دنیا کے ان مشہور و معروف کمالات کا شوق پیدا کرنے کیلئے مناسب ہوگا کہ ان کی تعلیم کا بھی باقاعدہ انتظام کیا جائے۔ اگر ہر سال چند ہونہار طالب علم اٹلی یا دیگر مشہور ممالک یورپ کو۔ فنون لطیفہ کی تعلیم کیلئے بھیجے جائیں تو ملک کو اس سے بڑی تقویت ہوگی ان کمالات کے کسب سے انسان کی حب الوطنی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ذی اثر اور صاحب ثروت لوگ ممالک غیر کی خوبیوں کو دیکھکر اپنی بود و باش کے شہروں کو بھی خوشنما بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

سیر و سیاحت (اکسکرشن)

شیخ سعدی نے کیا خوب فرمایا ہے:-

گر بہ دکان خانہ در گردی ـــ ہرگز اے خام آدمی نشوی
برو اندر جہاں تفرج کن ـــ پیش ازاں و زکز جہاں بروی

کون ایسا شخص ہے جو سیر و سیاحت کے فوائد سے انکار کرتا ہے یا اس کا لطف اٹھانا نہیں چاہتا کسی عمر میں بھی ہوں سیاحت مختلف طریقوں سے منفعت بخش ہوتی ہے لیکن نوعمری اور طالب علمی کے زمانہ میں جب کہ انسان کے حواس مشاہدہ قوی تر اور اس کی آئندہ زندگی کو ایک خاص شکل میں ڈھالنے کے مواقع بیشتر اور بہتر ہوتے ہیں سیر و سیاحت زیادہ فائدہ بخش ہوتی ہے انگلستان کے مدارس (صاحب ثروت اور علم دوست اصحاب کی مدد سے جو کیا عجب کہ انہی مدارس کے طلبائے قدیم میں سے ہوں) طلبہ کی سیر و سیاحت کا خاص طور پر انتظام کرتے ہیں سولہ سترہ سال کے لڑکے چھوٹی بڑی ٹکڑیوں میں دوران مدت تعلیم میں دنیا کا سفر کر کے اپنے اپنے مدرسوں کو واپس لوٹتے ہیں بوائے اسکاؤٹس کے منتظمین بھی اس قسم کے کاموں میں عہدہ داران مدارس کا ہاتھ بٹاتے ہیں ایسے اکسکرشن ہمہ قسم کے ہوتے ہیں اور سب کے سب دلچسپی سے مملو ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی پاپیادہ ملک کا سفر کرتے ہیں کوئی سائیکلوں پر اگر دور کا سفر مطلوب ہے تو ریل یا جہاز کے ذریعہ سیاحی کرتے ہیں ارباب پول کے فرزند موٹر کاروں میں گھوم کر آتے ہیں شاید چند سال کے بعد ہوائی جہازوں کے ذریعہ بھی طلبہ سیاحت کر سکیں چونکہ طلبہ کو اس امر کی تلقین کی جاتی ہے کہ اس قسم کا سفر مدرسہ کی زندگی کا ایک جزو ہے۔ اور ڈسپلن یعنی ضبط کما حقہ ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اس لئے دوران سفر میں کوئی ناخوشگوار بات وقوع میں آنے نہیں پاتی اگر آتی ہے تو خاطی کو پوری سزا دیکر واپس بھیجدیا جاتا ہے جب نوعمر طالب علم ایسے باقاعدہ طریقہ پر دنیا کی سیر کرتا ہے اس کے مختلف ممالک پہاڑ، دریا، جنگل، میدان، شہر اور قصبے دیکھنا متعدد اقوام کی بیشمار درسگاہوں پر نظر ڈالتا ان کے ہم عمر بچوں کے ساتھ گفتگو کرتا اور کھیلتا ہے۔ تو دنیا اس کے اندازہ میں چھوٹی ہو جاتی ہے اور انسان کا غرور و وقار اور اس کے ساتھ ہی خدا کی قدرت اور عظمت کا یقین اس کے دل میں بڑھ جاتا ہے اگر بنی نوع انسان میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنا مقصود ہے تو شاید اس سے بہتر کوئی طریقہ دستیاب نہیں ہو سکتا۔

کھیل

کھیلوں کے متعلق جسمانی تربیت کا ذکر کرتے وقت میں کچھ زیادہ نہ کہہ سکا ابھی ابھی سیر و سیاحت کے بیان میں میں نے کھیلوں کی طرف اشارہ کیا ہے طلبہ کیلئے کھیل بھی ایسے ہی ضروری ہیں جیسے کہ درس اس دعوے کے ثبوت میں مجھے کوئی دلائل پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہر کس و ناکس مدارس کیلئے کھیل کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے کیا خوب ہوتا کہ ہمارے تمام یا کم از کم بڑے بڑے مدارس اور کالج اپنی اپنی زمین رکھتے! اکثر صورتوں میں تو مدرسہ کو خود اپنا مکان نصیب نہیں تو زمین کہاں سے آئی "جامہ ندارم دامن از کجا آرم" لیکن جب کرایہ کے مکان میں مدرسہ کھولا جاتا ہے۔ تو کھیل کیلئے زمین بھی کرایہ یا اجازت سے لی جا سکتی ہے اور اکثر صورتوں میں ایسا ہی کیا جاتا ہے آکسفورڈ اور کیمبرج کی جامعات دارالسلطنت سے دور واقع ہونے میں انہیں یہ بڑا فائدہ ہاتھ آیا کہ ان کے پھیلنے میں موانعات کم آتے ہیں۔

اوران کوکھیل کود کے لئے سطح میدان کے وسیع رقبہ بہ آسانی مل گئے اور مل جاتے ہیں لندن اور دوسری شہری جامعات کو یہ قدرتی مواقع نصیب نہ ہوسکے اس پر بھی لندن کے کالج اور مدارس شہر کی آبادی سے باہر مناسب میدان کرایہ یا اجازت سے لیکر رکھتے ہیں اور شوقین طلبہ موسم بہار و گرما میں وہاں ریل وغیرہ کے ذریعے پہنچکر کھیل کا لطف اُٹھاتے ہیں سررشتہ تعلیمات اگراس قسم کی سہولتیں اپنے علاقہ کے تمام مدارس کیلئے مہیا کرنے کی کوشش کرے تو نہ صرف طلبہ کی صحت ہی ترقی کرے گی بلکہ تعلیم کے ساتھ عام تربیت بھی اچھی ہوجائیگی ۔

تعلیم اور بے روزگاری

اکثر اصحاب تعلیم کی عمومیت کیلئے جب کوئی تحریک کیجاتی ہے تو بے روزگاری کا سوال پیش کرکے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تعلیم عام ہونے سے پڑھے لکھے آدمی بہت ہوجائینگے اوران سب کو چونکہ نوکریاں نہیں مل سکتیں اس لئے ان میں بے چینی پھیل جائیگی۔ صحیح اعداد وشمار کے بغیر کسی بھی مسئلہ کے متعلق کوئی رائے قایم کردینا مناسب نہیں ہے۔ برطانوی ہند میں ضرور ایسا ہوتا ہو۔ لیکن ابھی حیدر آباد میں تعلیم کی ایسی عمومیت نہیں ہے کہ اسقدر خدشہ پیدا ہو۔ صرف اتنا سمجھکر خاموش بیٹھ جانا بھی تدبیر نہیں ہے پہلے توہمیں چاہیئے کہ ایسے طریقۂ تعلیم ہی اختیار نہ کریں جن سے بیروزگاری کے پھیلنے کا اندیشہ ہو تعلیم عام ہو یا نہ ہو ملازمت کی تعداد تو محدود ہی رہیگی۔ ممکن ہے کہ تعلیم زیادہ ہونے سے نوکریوں کی تعداد بھی کچھ زیادہ ہوجائے لیکن یہ تو ناممکن ہے کہ ہر تعلیم یافتہ شخص سرکاری یا خانگی نوکری حاصل کریگا۔ اور ساتھ ہی ہر زندہ انسان کو اپنا پیٹ پالنا اور اپنے متعلقین کی پرورش کرنا ناگزیر ہے۔ اس خطبہ کے ابتدائی حصہ میں میں نے جس قسم کی تعلیم کی سفارش کی ہے اگر وہ اختیار کرلیجائے تو بے روزگاری اور بے چینی کا خطرہ کم رہیگا۔ بحالت موجودہ جب کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص مثلاً گریجویٹس وغیرہ کی تعداد ہمارے ملک میں چار پانچ ہزار سے زیادہ نہیں ہے اور ہر سال ہماری اور دیگر جامعات سے ڈیڑھ دوسو سے زیادہ ملکی گریجویٹ نہیں نکلتے ہیں۔ تو باہر کے خصوصیت کے ساتھ لایق افراد کے تقرر کی گنجایش نکال کربھی ہیں شاید کافی تعداد میں ملازمت مل سکے اگرچہ ریاست کے تمام محکمہ جات کارخانہ جات وغیرہ کی سرکاری اور غیر سرکاری خدمتوں کو شمار میں لے لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ محض گریجویٹس کی تعداد کا خدمات کی تعداد سے مقابلہ کرنا درست نہیں امیدوار کیلئے خدمت کی موزونیت کا اگر لحاظ نہ کیا جائے تو یقیناً خدمت کیلئے امیدوار کی موزونیت کا تو لحاظ کرنا لازمی ہے۔ اس طرح سے اگر دیکھا جائے تو اب بھی جبکہ گریجویٹس کی تعداد کم ہے ملک میں کافی نوکریاں نہیں مل سکتیں پس ضروری ہے کہ تعلیم کا طریقہ تعلیم تبدیل کیا جائے۔ یہ مسئلہ سرکار کے زیر غور ہے اور امید کی جاتی ہے کہ بہترین مشوروں کے بموجب اس مسئلہ کا بہترین حل منظور ہوگا ۔

خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب ایم اے آئی ای ایس
ڈویژنل انسپکٹر مدارس لاہور

شمس العلماء مولوی الطاف حسین حالی کا عکس

دو رباعیاں میر انیس کی شان میں

اردو کا رواج چار سو تیرا ہے
شہروں میں رواج لکھنؤ تیرا ہے
جب تک کہ انیس کا سخن ہے باقی
تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے

دلی کی زبان کا سہارا تھا انیس
اور لکھنؤ کی آنکھ کا تارا تھا انیس
دلی جڑ تھی تو لکھنؤ اسکی بہار
دونوں کو ہے دعوی کہ ہمارا تھا انیس

حالی

شیخ عبدالحمید صاحب ایم اے بی ای ایس ڈویژنل
انسپکٹر مدارس ملتان

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY HYDERABAD

میں مکرر کہونگا کہ ہمیں زراعت کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہیئے ہماری تعلیم ہمیں زراعت کا پیشہ اختیار کرنے کیلئے زیادہ قابل بنائے۔ کہیں بعض حضرات اس سے یہ نتیجہ نہ نکالیں کہ اس تحریک سے میرا منشا یہ ہے کہ ہم لوگ صرف غریب کسان بن جائیں۔ نہیں ایں چاہتا ہوں کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص زمیندار بنیں۔ جاگیردار اپنی جاگیروں کو آپ خود سنبھالیں مقاطعہ دار بہ نفس نفیس اپنے مقطعوں کی دیکھ بھال کریں اور پٹہ دار و التعامدار اپنے وسیع رقبہ جات پر صحیح اور فنی معلومات کے ساتھ زراعت اور باغبانی کریں۔ تعلیم یافتہ شخص اگر زراعت کی طرف توجہ کرے تو وہ نوکری سے زیادہ فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔

ہمارا ذریعہ تعلیم

(از جناب مولوی عبد القادر صاحب سروری ایم۔اے۔ ایل ایل بی)

اس امر میں اب شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ تعلیم وہی مفید ہے جو بچوں کو اُن کی مانوس زبان میں دیجائے۔ یورپی ممالک میں تعلیم کی اشاعت اور ترقی کا ایک بڑا راز یہی ہے کہ وہاں بچوں سے لیکر بوڑھوں تک اور نہ صرف ملک کے ایک خطہ سے لیکر دوسرے خطے تک بلکہ نوآبادیات میں بھی ہر ایک کی توجہ ایک ہی اور اپنی زبان پر جمی ہوئی ہے۔ بچے مختلف زبانوں کے سیکھنے کی الجھنوں سے بری ہیں۔ اپنی زبان پر قدرت حاصل کرلینے کے بعد وہ فوراً زیادہ اہم علوم وفنون کی طرف توجہ کرسکتے ہیں۔ ہندوستان کی طرح کسی اجنبی زبان کے ذریعہ علم سیکھنے میں وہاں متعلمین کا وقت ضائع نہیں ہوتا۔

یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان سیاسی اور طبعی طور پر ایک ملک کی تعریف میں آتا ہے، لیکن اس کی وسعت نے نہ صرف مختلف صوبوں کی آب وہوا میں اختلاف پیدا کردیا ہے، بلکہ اس کے طول وعرض میں سینکڑوں زبانیں بھی پیدا کردی ہیں۔ ان زبانوں میں بعض ایسی بھی ہیں جو کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ بعض محدود ہیں۔ لیکن اُن کی ادبیات میں علمی ترقی ہوچکی ہے۔ جیسے بنگالی زبان۔

آیندہ ہندوستان میں ایک اہم سوال مشترک زبان کا بھی پیدا ہونے والا ہے۔ جب تک یہ ممکن نہو

کہ ہندوستان کے مختلف صوبے، جن میں سے اکثر یورپ کے ممالک کی وسعت کے برابر ہیں، ضرورت اور سہولت کے لحاظ سے ایک ایک مملکت قرار دیئے جائیں، اس وقت تک مشترک زبان کی ضرورت اور اہمیت گھٹتی نظر نہیں آتی۔ فی الحال ہر صوبے کی زبان الگ ہے بلکہ ایک ایک صوبے میں کئی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ سرحدی صوبے میں پشتو اور اُردو۔ کشمیر میں اُردو اور کشمیری، پنجاب میں اُردو گرمکھی اور پنجابی، دہلی میں اُردو اور ہندی، یو پی میں ہندی اور اُردو، سی پی میں ہندی، مرہٹی اور اُردو، بنگال میں زیادہ تر بنگالی اور اُردو، راجپوتانے میں راجستانی اور اُردو، سندھ میں سندھی اور اُردو، بمبئی میں زیادہ تر گجراتی اور اُردو اور پونے کے سواد میں مرہٹی، مدراس میں تامل وغیرہ اور اُردو، حیدر آباد میں تلنگی، مرہٹی، کنٹری اور اُردو، میسور میں کنٹری اور اُردو، جنوب بعید میں تامل، ملیالم وغیرہ۔ ان سب پر طرہ یہ ہے کہ انگریزی، حکومت کی زبان ہونے کی وجہ سے، ہر صوبے میں تعلیم یافتہ طبقے اور دفتروں کی زبان ہے۔

ان اختلافات کو نظر میں رکھتے ہوئے ایک معلم اور تعلیمی خدمت گذار کو اس گتھی کے سلجھانے میں بڑی دقت پیش آتی ہے کہ کس صوبے کے لئے کونسی زبان مخصوص کی جائے۔ اور جہاں ایک سے زیادہ زبانیں رائج ہوں۔ اُن کا انمٹ اختلاف کس طرح دور کیا جائے۔ اور پھر لطف یہ کہ مادری زبان کی تعلیم کا مطمع نظر سامنے سے ہٹنے نہ پائے، اس اصول سے ذرا بھر بھی انحراف نہونے پائے اور ہر صوبے کا کوئی طبقہ بھی ناخوش نہو۔

میرے خیال میں مذہبی تعصبات کا خاموش ہو جانا آسان ہے، لیکن لسانی اختلافات کا پہلے ہی پہل تصوری طور پر دور ہونا مشکل ہے۔ ہم بزور یہ منوا سکتے ہیں کہ فلاں زبان اکثریت کی بدولت ایک خاص صوبے کی مقامی زبان سرکاری طور پر قرار دیجاتی ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے اقلیت پر اور خصوصاً ایسی جماعت کے کمسن بچوں پر جو بار پڑیگا وہ ناقابل تلافی ہے۔ اس کے علاوہ یہ طرز عمل اس وقت تک اختیار نہیں کیا جا سکتا جبتک ہند کے ہر صوبے کی گورنمنٹ علیحدہ اور دوسری سے بے تعلق نہ بن جائے۔ بحالت موجودہ ہر صوبے کے اندرونی اور بیرونی تعلقات اور ایک صوبے کے لوگوں کی دوسرے صوبے میں روزانہ مستقل قیام اور کاروبار نے ایک مشترک زبان کے فروغ کو فطری طور پر ضروری بنا دیا ہے۔ ایسی زبان ظاہر ہے کہ وہی ہو سکتی ہے جس کو ضرورت نے پیدا کیا ہو، اور جس کا نشو و نما اسی محرک قوت کی بدولت عمل میں آ رہا ہو۔

ماحول کی دقتیں یقیناً قابل اعتنا ہیں، لیکن اُن کا محض جاننا ہی اُن کا حل نہیں ہو سکتا۔ حل بہر حال سوچنا پڑیگا۔ ممکن ہے کہ پہلے پہل کوئی حل ہمارے جذبہ کو اپیل نہ کرے۔ کیونکہ انسان ہر شئے کو سب سے پہلے اپنے جذبہ کی کسوٹی پر جانچتا ہے اور بعد کو معقولیت سے مدد لیتا ہے۔ لیکن ضرورت، رفتار زمانہ اور واقعات کے فطری اٹھان پر نظر رکھکر جو چیز سوچی جائیگی، اس کا مستقبل بعید ہی سہی، لیکن واقع ہونا ضروری ہے۔ چونکہ اجتماعی افعال اور معاملات بڑی

حد تک مصنوعی نہیں ہوتے، اسلئے اُن کی رَو کو روکنے کی ہزار کوشش کریں۔ لیکن جو نا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔
یہاں ہمارے روبرو ایک وسیع مملکت ہے، جس کے ہر صوبے میں ایک سے زیادہ زبانیں رائج ہیں، اور ہر زبان کے بولنے والے کا فرض ہے کہ وہ اپنی زبان کی وکالت کرے اور اگر ممکن ہو تو اسی کو سارے ہندوستان کی مشترک زبان منوانے کی کوشش کرے خواہ وہ ہندوستان کے کسی محدود حصے یا جنوب بعید کی ملیالم اور تامل ہی کیوں نہو۔ لیکن جب تک حالات مساعد نہ ہوں، بڑی سے بڑی تجویزیں بھی کاغذ کا نقش بن کر رہ جاتی ہیں۔

بعض لسانی ماہرین ایک نتیجہ تک پہنچتے ہیں۔ ہندوستان کے صوبوں میں زبانیں جس طرح پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کا مشاہدہ کرنے اور اپنے عملی تجربہ سے مدد لیکر ہر زبان کی رفتاری خصوصیات کا مطالعہ کرنے کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آیندہ متحد ہندوستان کی اگر کوئی مشترک زبان ہوسکتی ہے تو وہ "ہندی" یا "اُردو" ہے۔ مسلمانوں نے اُردو کی تائید کی اور ہندوؤں نے ہندی کی۔ اس اختلاف خیال نے بھی بعض جگہ باضابطہ کش مکش پیدا کر دی ہے۔ یہ کش مکش اگر دور ہونے ہی کیلئے ہو تو ظاہر ہے کہ کبھی مٹنے والی نہیں ہے۔
غرض یہ مسلّم ہے کہ ہندوستان کی مشترک زبان انہیں دو میں سے ایک ہے یا دوسری ساخت اور ترکیب کے لحاظ سے یہ ظاہر ہے کہ ہندی اور اُردو میں کوئی اصولی فرق نہیں یہ اگر علیحدہ ہیں تو اسلئے کہ ایک ہی تنے کی شاخیں ہیں۔ ہندی اور اُردو ایک ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئیں۔ لیکن دو علاتی یا اضافی نہیں۔ بلکہ دو سگے بھائی بھی جس طرح دو مختلف معلمین کے پاس پڑھ کر، یا دو مختلف ماحولوں میں نشو و نما پا کر عادات، اطوار اور بڑی حد تک مطمح نظر میں بھی ایک دوسرے سے بیگانہ ہو جاتے ہیں، اسی طرح ان دونو زبانوں میں بھی ظاہری اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ اختلاف فضا، مذاق اور لباس کے ہیں۔ اُردو زیادہ تر مسلمانوں کے ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے لفظیات عروض اور رسم الخط میں ہندی سے مختلف ہو گئی۔ یا جیسے سر گریرسن اور کیگے کا خیال ہے اُردو سے عربی اور فارسی الفاظ خارج کر کے، فارسی اصول عروض سے قطع نظر کر کے ہندی زبان بنالی گئی
یہ اختلافات یقیناً قابل نظر انداز نہیں یہی سبب ہے کہ بعض ہمدردانِ قوم نے، ملک کی بیشتر قابلیت کو ان مسایل پر ضایع ہوتے دیکھکر اس تنزاع کے دور کرنے کی کوشش شروع کی ہے۔ یہ کوشش ایک مشترک ہندوستانی زبان کے پیدا کرنے اور اُس کو فروغ دینے سے متعلق ہے
ہندوستانی زبان درحقیقت ہندی اور اُردو کی بین بینی شکل ہے۔ یہ کوئی نئی زبان نہیں، بلکہ یہ وہی قدیم زبان ہے، جو لکھنؤ کی ادبی اور گرانبار اُردو اور بنارس کی سنسکرت نما ہندی سے پہلے ہندوستان بھر میں رائج تھی۔ اور جزوی اختلافات کے ساتھ کشمیر میں کشمیری، پنجاب میں پنجابی، راجپوتانے میں رجستانی، بنگال میں بنگالی،

گجرات میں گجراتی، مہاراشٹرا میں مرہٹی، اور دکن میں دکھنی کے نام سے موسوم ہوئی۔ انہیں زبانوں کی ایک بہن جو میرٹھ اور دھلی کی نواح میں بولی جاتی تھی، اُردو اور دوآبے میں ہندی کے نام سے مشہور ہوئی۔ مسلمانوں کے ہندوستان آنے کے بعد ان کی زبان یعنی فارسی کے اثر سے ہندی زبان کی جو مختلف شکلیں بنیں انہیں بعض علماء نے "ہندو المانی" بھی کہا ہے۔ کیونکہ یہ ہندو اور مسلمانوں کے باہمی میل جول کا نتیجہ ہیں۔

قدیم زمانے کی سادہ اور ہندی سے مشابہ اُردو کیلئے "ہندوستانی" کا نام خاص طور سے استعمال کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ نہ تو مروجہ اُردو ہے، اور نہ موجودہ ہندی۔ قدیم مستشرقین جیسے ڈاکٹر جان گلکرسٹ، فلاٹ، شکسپیر، فیلن سے لیکر حال کے علما تک نے اس زبان کو ہندوستانی ہی سمجھا۔ چنانچہ ان کی تصنیفات کے نام اس کے شاہد ہیں۔ قدیم پنجابی، گجراتی، دکھنی اور ہندی مخطوطات کی فہرستوں کیلئے "ہندوستانی مخطوطات" ہی کا نام استعمال ہوا ہے۔

غرض ہندوستانی کا نام اس زبان کے لئے بے حد موزوں ہے، جو رفتہ رفتہ ہندوستان کی مشترک زبان بن رہی ہے۔ اس نام کی بدولت یقین ہے، وہ تعصبات بھی خاموش ہو جائینگے، جو ہندی اور اُردو کے نام سے وابستہ ہو گئے ہیں۔

ہندوستانی کے متعلق ہم نے ابھی اوپر لکھا ہے کہ وُہ ہندی اور اُردو کی بین بینی شکل ہے۔ اس کی یہاں کس قدر وضاحت درکار ہے۔ ساخت کے لحاظ سے اُردو اور ہندی میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے لیکن رسم الخط، عروض اور الفاظ میں فرق ہے۔ ہندی شاعری کی بحریں اُردو سے مختلف ہیں۔ اور رسم الخط بھی مختلف ہے بعد میں لکھنوی علما اور بنارسی پنڈتوں نے اُردو میں عربی اور فارسی اور ہندی میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ کر کے ان زبانوں کو ایک دوسرے سے بہت متغایر بنانا شروع کر دیا۔ تاہم ان میں سے کوئی اختلاف ایسا نہیں ہے، جو دُور نہ ہو سکے۔ چنانچہ بعض علما اور ادارے اس خلیج کو پاٹنے میں مصروف ہیں۔ عرصہ پہلے سرسید احمد خاں نے سلیس اور سادہ نثر اُردو کو رواج دیکر قدیم لکھنوی طرز کی عبارت آرائی کے طلسم کو توڑ دیا تھا۔ مولوی سید احمد دہلوی نے اپنی مستند لغت "فرہنگ آصفیہ" کے ذریعہ اُردو میں عربی اور ہندی الفاظ کے تناسب کو ظاہر کیا تھا۔ حال میں مولوی وحید الدین سلیم مرحوم، مولوی عبد الحق صاحب معتمد انجمن ترقی اُردو، مولوی عظمت اللہ خان مرحوم مرتیج بہادر سپرو اپنی تنقیدات اور مثالوں سے ان اختلافات کو مٹانے میں ہمہ تن مصروف ہوئے۔ مولوی وحید الدین سلیم ہمیشہ اس دبستانِ خیال کے مخالف رہے، جو علمی تحریروں میں بھی عربی اور فارسی کے زیادہ سے زیادہ الفاظ استعمال کرنے کو اپنی نجات سمجھتا ہے۔ سلیم صاحب نے مضامین کے ذریعہ اس خیال کی شد و مد کے ساتھ مخالفت کی۔ اور آخر میں "وضع اصطلاحات" لکھکر علمی اصطلاح سازی کیلئے ایک راستہ پیدا کرنے کی کوشش بھی کی۔

مولوی عبدالحق صاحب کی تحریریں تو سلیم صاحب کی تحریروں سے زیادہ اس اصول کی پابند ہیں۔ مولوی صاحب کی عبارت معمولی بول چال کی زبان سے سرمو تجاوز نہیں کرتی۔ علمی اُردو بھی جسقدر سادہ سلیس ہو سکتی ہے۔ اور موٹے موٹے عربی فارسی یا سنسکرت کے لغات سے پاک رہ سکتی ہے۔ اس کا ایک اچھا نمونہ خود مولوی عبدالحق صاحب کی تحریریں ہیں۔ مولوی عظمت اللہ خاں مرحوم نے نثر سے زیادہ نظم کی خدمت کی۔ اور اُردو میں ہندی بحروں کو نہایت عمدہ اسلوب میں استعمال کیا۔ ایک طویل مضمون بھی عروض پر لکھا تھا جو رسالہ اُردو (اورنگ آباد دکن) میں شائع ہُوا۔ اس میں زیادہ تر ہندی بحروں کو اُردو میں شامل کرنے اور شاعری کے میدان کو زیادہ وسیع بنانے کی پُر زور سفارش کی ہے۔ خان صاحب کی نظموں نے آئندہ شاعروں کے لئے اس راستہ کو بالکل صاف کر دیا ہے۔ چنانچہ اب بیسیوں شاعر انہیں بحروں میں کلام موزوں کر رہے ہیں۔ بلکہ نئی نئی بحریں بھی مروج ہو رہی ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب کی نثر کی طرح خان صاحب مرحوم کی نظم سلیس اُردو نظم کا بہترین نمونہ ہے۔ سر تیج بہادر سپرو جب موقع ملتا ہے، اپنی اثر انداز تقریر کو اسی بیگانگی کے دور کرنے میں استعمال کرتے رہتے ہیں۔

ان انفرادی مساعی کے علاوہ بعض ادارے بھی آئندہ ہندوستان کی مشترک زبان کھجانے اور سنوارنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ ان اداروں میں ہندوستانی اکاڈمی (الہ آباد) انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد دکن) اور جامعہ عثمانیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کچھ سال ہوئے کہ یو۔پی کے سربرآوردہ علمانے ملکر الہ آباد میں ایک علمی مجلس ہندوستانی اکاڈمی کے نام سے قایم کی تھی۔ یہ اکاڈمی اب اچھی طرح نشو و نما پا چکی ہے۔ اس کا مطمح نظر بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی دو بڑی زبانوں یعنی اُردو اور ہندی کی ترقی کے تمام وسایل پر غور کر کے کوئی لائحہ عمل بنایا جائے۔ ابتدا میں تو دونو زبانوں کے نشو و نما کی علیحدہ علیحدہ کوششیں ضروری معلوم ہوتی ہیں، لیکن ہمیں توقع ہے کہ آئندہ چلکر یہ اکاڈمی اُردو اور ہندی کے جزئی اختلافات کو دور کرنے کی بھی کوشش شروع کریگی۔ اور ان کو قریب سے قریب تر بنا کر، حقیقی "ہندوستانی اکاڈمی" ثابت ہو گی۔ انجمن ترقی اُردو، عرصہ سے دکن میں اُردو زبان اور ادب کی خدمت میں مصروف ہے۔ انجمن کے سرگرم معتمد مولوی عبدالحق صاحب کا اسلوب خود اس امر کی توضیح ہے کہ انجمن کی مساعی کا رُخ کدھر ہے۔

لیکن ہندوستانی زبان کی ترقی کا سب سے بڑا مرکز اور محرک جامعہ عثمانیہ ہے۔ اس کا ذریعہ تعلیم اُردو مشہور ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اُس کے موسسین کا مطمح نظر جس طرح ہندی زبان نہیں تھا، اسی طرح وہ اُردو بھی نہیں ہے، جس کے خلاف عام طور سے صدائے احتجاج بلند کی جارہی ہے۔ اس ادارے کا مقصد ایک مشترک

ہندوستانی زبان کو ملک میں ترویج دیتا ہے۔ اس کے کئی ثبوت ہیں۔ پہلے تو یہ کہ یہاں اُردو زبان کی تعلیم کیساتھ ہندی کی تعلیم بھی لازمی کر دی گئی ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ دونوں زبانیں ملکر نصاب پورا ہوتا ہے۔ گویا ہندی اور اُردو کو ملاکر ایک زبان قرار دیا ہے تاکہ آئندہ مشترک ہندوستانی زبان کے نشو ونما میں آسانی پیدا ہو سکے۔ دوسرے یہ کہ جب تک مولوی وحید الدین سلیم زندہ رہے' نہ صرف یونیورسٹی کالج کی اردو پروفیسری کی خدمت انجام دیتے تھے، بلکہ دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ کی علمی اصطلاحات کی تمام مجلسوں میں بھی شریک رہتے تھے۔ غایت یہ تھی کہ جامعہ کے طلبہ کے لئے جو کتابیں ترجمہ کی جائیں یا تالیف ہوں' وہ صحیح اصول سے متغایر نہ ہو جائیں۔ مولوی سلیم صاحب کے انتقال کے بعد اُردو پروفیسری کی خدمت پر مولوی عبدالحق صاحب کا تقرر عمل میں آیا۔ اس سے یقین ہے کہ زبان کی خدمت کا وہ سلسلہ جاری رہیگا۔

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو اپنے ایک خطبہ میں جامعہ عثمانیہ کے کارناموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دکن میں اُردو کے ایک شاندار ادب اور اسلوب کی پیدائش کی پیشین گوئی کی تھی۔ اس کا اشارہ درحقیقت جامعہ کی اسی ملکی اور لسانی خدمت کی طرف تھا۔

اس خاص نقطۂ نظر سے ظاہر ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے کارکنوں کو کم از کم بیس تیس سال تک ہندوستانی زبان کے نشو ونما میں محنت شاقہ اُٹھانی پڑیگی۔ اس میں شک نہیں کہ جامعہ کے متعلمین کے دلوں میں یہ حقیقت زور کے ساتھ بٹھائی جاتی ہے کہ اُن کی تحریریں اور تقریریں اُردو کی ساخت' اصلیت اور قومیت سے حتی الامکان تجاوز نہ کریں۔ اور عربی اور فارسی الفاظ کی زیادتی کے بجائے ٹھیٹ ہندی الفاظ استعمال کئے جائیں' تاہم تمام قومی معاملات کی طرح یہ پھل بھی دیر رس ہے۔ اس طرح کی فضا تیار ہونے کیلئے کم از کم ایک نسل کی مدت درکار ہے۔

بعض ہمدردان قوم اور اہل رائے بزرگوں نے دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ کی بعض علمی کتابوں کو پڑھکر ان میں عربی اور فارسی کے الفاظ کی زیادتی کی شکایت کی ہے۔ لیکن ان کے مطالعہ کے وقت یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیئے۔ کہ ہندی جو ادبی زبان ہے اس میں علمیات کے وہ خزانے مفقود ہیں' جو عربی اور فارسی میں ہیں۔ چونکہ زبان کا ایک عالمگیر اصول سہولت ہے۔ اسلئے فطرتاً مترجمین بھی ان زبانوں کی سند اور اصطلاحات کو استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں یورپ کی اکثر زبانوں میں یہی ہوتا ہے۔ یورپ کی وہ تمام قومیں جو عربوں کے خلاف صلیب بلند کر کے حملہ آور ہوئیں تھیں انہی زبانوں میں عربی کی بہت سی اصطلاحات بلا تکلف استعمال کرتی ہیں عربوں نے اپنے وقت میں یونانی جیسی اجنبی اصطلاحات کو اپنی زبان میں جگہ دینے میں تامل نہیں کیا۔ یہ سلسلہ یوں ہی جاری ہے۔

رسم الخط کے اختلاف کا سوال بظاہر بہت اہم معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ سب سے زیادہ آسانی کے ساتھ دُور ہو سکتا ہے۔ انگریزی زبان کے متعلمین کو وقت واحد میں تین طرح کے حروف سیکھنے پڑتے ہیں۔ ایک کیپیٹل،

دوسرے رومن انیسرے تحریری حروف۔ ان حروف میں بسا اوقات اتنا ہی فرق ہے جتنا فارسی اور ہندی کے حروف میں۔ پہلے ہی حرف کو دیکھئے "A ، a ، α" میں اس سے کم فرق نہیں۔ جتنا فارسی "ا" اور ہندی " " میں ہے۔ لیکن جب ہم نے کسی انگریز کو اس کی شکایت کرتے ہوئے نہیں دیکھا، تو پھر ہمارے طلبا کو ہندی اور اُردو کے حروف ساتھ ساتھ سکھانے میں کیا امر مانع ہے؟ آئندہ پرائمری کتابیں اگر اس ضرورت کو ملحوظ رکھکر لکھی جائیں، اور حکومت بھی اس تجویز کو کامیاب بنا دینے میں مدد دے، تو یقین ہے ایک بڑی نزاع کا آسانی سے فیصلہ ہو جائیگا۔ اور اس کا نتیجہ اس سے زیادہ مفید اور صحت بخش ہوگا جتنا بظاہر نظر آتا ہے۔ اگر عربی (نسخی) حروف بھی اس میں شامل کر لیے جائیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستانی زبانوں کے لئے لاطینی رسم الخط کے استعمال کا سوال عرصہ تک پیدا نہ ہو سکیگا۔

اس بحث کا آخری، مگر اہم ترین جز یہ ہے کہ، وہ کیا اسباب ہیں جنکی بنا پر یہ ہندوستانی زبان ہندوستان کی مشترک زبان بن سکتی ہے؟

اس کے اسباب اسقدر واضح ہیں کہ ہر شخص ان سے بخوبی واقف ہے۔ بلکہ ایک سے زیادہ مرتبہ اس سوال کے مختلف پہلوؤں پر روشنی بھی ڈالی جا چکی ہے۔ تاہم اپنے سلسلہ کو قائم رکھنے کیلئے ہم انہیں یہاں تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس میں کوئی بات نئی بھی نکل جائے۔

۱۔ ہندوستانی زبان کی پیدائش پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی ساختہ اور مصنوعی زبان نہیں ہے۔ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے وقت، یہاں کی مروجہ زبانوں میں سب سے زیادہ آسان، بلکہ سب کا خلاصہ، اور سب سے زیادہ وسعت پذیر زبان تھی۔ یہ غیر سرکاری اور عام زبان تھی۔ چونکہ یہ گنگا کے میدان جیسے ملک کے مرکزی علاقوں میں رائج تھی، اسلئے مغل فوجوں کی جو پہلے پہل اس زبان سے واقف ہو چکی تھیں۔ نقل و حرکت کی بدولت یہ ملک کے ہر گوشہ میں پہنچ گئی اور ہر جگہ کی مقامی خصوصیات سے متاثر ہو کر ایک خاص صورت پر نشو نما پانے لگی۔ اب فوجی نقل و حرکت کا سلسلہ بند ہو گیا ہے، لیکن چونکہ یہ معاملات کی زبان بن گئی ہے، اس لئے کاروبار کے نہ ختم ہونے والے سلسلہ کے ساتھ، اس زبان کا نشو و نما بھی برابر ہو رہا ہے۔

۲۔ ہم نے ابھی لکھا ہے کہ یہ کاروباری زبان ہے۔ اس ضمن میں یہ حقیقت تعجب سے دیکھی جائیگی کہ جب دو آدمی جنکی زبان مختلف ہو، آپس میں کاروباری اغراض سے ملتے ہیں، اور ان میں کوئی دوسرے کی زبان سے واقف نہیں ہوتا، تو ان کا ذریعہ اظہار خیال عموماً یہی زبان ہوتی ہے۔ ہم نے بہت سے تامل اور کنٹری بولنے والوں کو بھی، غیر زبان والوں سے معاملے کے دوران میں اسی زبان کو استعمال کرتے سنا ہے۔ چنانچہ مدراس میں چینیوں سے معاملات کرتے وقت بعض دیہاتی برہمنوں کو بھی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں بات چیت کرتے سنا ہے۔

بلامبالغہ ہندوستان کے ہر صوبے کی کاروباری زبان یہی ہے۔ شمالی ہند میں تو یہ زبان بولی جاتی ہے، لیکن جنوب میں بھی جہاں بظاہر اس کے رواج کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، یہ بازاروں میں عام طور سے استعمال ہوتی ہے آپ اگر ہندوستان کے طول و عرض میں سفر کرنا چاہیں، تو صرف اس زبان کی واقفیت کی وجہ سے آپ کے کام کہیں بند نہیں رہتے۔ صوبہ بمبئی کے ہر شہر میں یہ زبان رائج ہے۔ لیکن مدراس کے بعض چھوٹے چھوٹے قصبوں میں بھی آپ اس کی ضرورت محسوس کرینگے۔ ان قصبوں میں اگر آپ ریل سے پہنچیں اور وہاں کی زبان سے آشنا نہ ہوں، تو آپ قلی کو پکاریئے وہ آجائیگا، آپ جو کچھ اس زبان میں سمجھائیں وہ سمجھ جائیگا۔ بلکہ ان میں سے اکثر اس زبان میں اچھی طرح بات چیت بھی کرلینگے۔ گاڑی بانوں میں تو یہ خوب رائج ہے۔ یہ واقعات ہیں ان کا تجربہ ہر وقت ہوسکتا ہے۔

۳- یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ یہ زبان پہلے پہل کسی علمی، ادبی یا پروپاغندی سطح نظر سے نہیں پیدا کی گئی بلکہ یہ مختلف اقوام کے معاشرتی اور کاروباری اتحاد کا فطری اور لازمی نتیجہ بنکر پیدا ہوئی، معاشرتی اور کاروباری تعلقات اور اغراض ہمیشہ علمی، ادبی یا پروپاغندی اغراض سے زیادہ اہم اور ناگزیر ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ ممکن ہے کہ کسی خاص زبان کو ہم اپنی کوششوں سے مہذب اور علمی زبان بنانے میں کامیاب ہوجائیں (جیسا کہ بنگالی زبان کا حال ہے) لیکن انسان جو معاشرتی مخلوق ہے معاشرتی اغراض سے کبھی مستغنی نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں جہاں کہیں معاشرتی اور کاروباری تعلقات کی ابتدا ہوتی ہے یہ زبان ان کا واسطہ بن کر ظہور پذیر ہوجاتی ہے۔ چونکہ دنیا کا کوئی مقام اس قسم کے تعلقات سے خالی نہیں رہ سکتا، ہندوستان میں بھی یہ زبان طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کی تصدیق ہندوستان کے ہر صوبے میں پھرنے اور خرید و فروخت کرنے سے ہوسکتی ہے۔ پھر چونکہ یہ کاروباری زبان ہے، اسلئے ہندوستان کے جن مقامات میں کاروبار کی زیادتی ہے، وہاں یہ عام طور سے رائج ہے۔ اس کا ثبوت بمبئی میں مل سکتا ہے۔

جامعہ بمبئی کے موجودہ وائس چانسلر نے گذشتہ خطبۂ تقسیم اسناد کے موقع پر، اسی حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ تحریک کی کہ صوبہ بمبئی میں تین یونیورسٹیاں قایم ہونی چاہئیں۔ جن سے ایک جو بمبئی میں قایم ہوگی اس کا ذریعہ تعلیم اُردو ہوگا۔ بمبئی کو چھوڑیئے، مدراس بھی تجارتی مرکز ہے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ اُسے اُردو یا ہندوستانی زبان سے بہت کم واسطہ ہے۔ لیکن حالات یہ ہیں کہ یہ زبان یہاں بھی عوام میں خصوصاً اور کاروباری اغراض کیلئے بازار میں عام طور سے مروج ہے۔ میسور اور بنگلور تو تجارتی شہر نہیں ہیں، لیکن یہاں کے بازاروں پر بھی اسی زبان کا تسلط ہے۔ تقریباً یہی حال جنوب کے ہر ترقی پذیر شہر کا ہے۔

۴- اس زبان کی یہی عمومیت ہے، جو ہر انگریز عہدہ دار کو ہندوستان آتے ہوئے اس کے سیکھنے پر مجبور

کرتی ہے۔ آپ کسی عہدہ دار انگریز کو ہندوستان آتے ہوئے، سوائے اس زبان کے کسی دوسری زبان کو پڑھتے یا سیکھتے ہوئے نہیں دیکھیں گے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ جہاں دوسری زبانیں محدود بہ مکان ہیں، یہ لامحدود ہے۔

اسی ضمن میں ایک اور اہم امر قابل ذکر ہے۔ ـــــــ کے قریب، ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں، جب اس کمپنی کے عہدہ دار ڈاکٹر جان گلکرسٹ کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ انگلستان سے آنے والے انگریز عہدہ دار ہندوستان کی زبان اور اُس کے ذریعہ یہاں کے حالات سے زیادہ سے زیادہ واقف ہو جائیں تو اُنہیں عرصہ تک اس پر غور کرنے کے بعد سوائے اس کے کہ کوئی اور چارہ نظر نہ آیا کہ ہندوستانی زبان کا ایک مدرسہ کلکتہ میں قایم کریں۔ آج کی طرح اُس وقت بھی یہی ہندوستان میں عوام کی زبان تھی۔ کلکتہ کے مدرسہ کے ذریعہ انہوں نے اس زبان کی بڑی خدمت کی۔ اور ایک بڑی حد تک آئندہ نثر کا سنگِ بنیاد اُنہوں ہی نے رکھا۔ اس وقت تک ہندوستانی اور اُردو کوئی جُدا جُدا زبانیں نہیں تھیں۔ اس سے اسی زبان کا فطرتی استحقاق ہندوستانی زبان بننے میں ثابت ہے۔

۵۔ ایک آخری خصوصیت اس زبان کی ساخت اور فطرت کے متعلق بھی بیان کرنی ضروری ہے۔ جس سے اُس کی آیندہ روشِ ترقی پر روشنی پڑ سکتی ہے۔

اس زبان کی پیدائش ہی ایسے حالات اور ایسے فطرتی اصول کے تحت عمل میں آئی ہے۔ کہ اس میں غیر معمولی لچک اور وسعت پذیری پیدا ہو گئی ہے۔ دنیا کی تقریباً ہر اس زبان سے یہ مستفید ہے، جس کے ساتھ برائے نام بھی اس کا تعلق رہا ہو۔ اس کے افعال جو خالص ہندی ہیں، ان کے ساتھ آپ جس زبان کے اسما چاہیں ملا کر، ایک مقرر جملہ بنا سکتے ہیں۔ کچھ اجنبیت نہیں معلوم ہوتی۔ زبان کے عام اصول آریائی زبانوں کی طرح اسقدر سادہ ہیں کہ ان کے سیکھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔

غرض اس زبان کی لچک، اس کی وسعت پذیری، اس کی عمومیت، ایسے امور ہیں، جو خاموشی کے ساتھ ہندوستان کے ہر گوشہ میں اس کے لئے جگہ پیدا کر رہے ہیں۔ ہندی سبھا کی مساعی مدراس میں ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ سے یہ زبان خاموشی کے ساتھ وہاں بھی پھیل رہی ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ رفتہ رفتہ ہندوستان کے تمام صوبے جلد یا دیر میں کم سے کم اس اصول پر ضرور متحد ہو جائیں گے۔

آخر میں انیسویں صدی عیسوی کے مشہور فرانسیسی سیاح ہندوستان ڈاکٹر گستاولی بان کی رائے اسی مسئلہ کے متعلق پیش کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ وُہ لکھتا ہے:۔

"مختلف محاوروں کو چھوڑ کر ہندوستانیں آریا طبقے کی سولہ زبانیں ہیں۔ ان میں سے ہندوستانی وُہ زبان ہے جس کا

سیکھنا ضروری ہے۔ یہ گویا ملک کی دولتی زبان ہے۔ اسی میں بہت کچھ خط و کتابت ہوتی ہے اور اخبارات
چھپتے ہیں۔ غرض جن اشخاص کو ہند کے لوگوں سے کام پڑتا ہے اُن کیلئے اُردو (ہندوستانی) کا جاننا
لازمی ہے۔ یہ زبان باوجود ملک میں اسقدر عام ہونے کے بالکل جدید زبان ہے۔ اور پندرہویں صدی کی
ابتدا میں قدیم آریا زبان، ہندی اور فارسی و عربی سے مرکب ہو کر بنی ہے۔ اس کی صرف و نحو سنسکرت سے
مشتق ہے۔ اور یہ عموماً فارسی حرفوں میں لکھی جاتی ہے۔ یہ زبان زیادہ تر اُردو کے نام سے مشہور ہے۔ .....
اُردو بالکل فطرتی طور پر اور محض ضرورت کے لحاظ سے بنی ہے۔ محققین السنہ کو اس کی صرف و نحو کا مطالعہ
کرنا ضرور ہے۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نئی زبان کیونکر وجود میں آتی ہے۔ اُردو کے بعد ہندی کا درجہ
ہے، جو ہندوستان میں بولی جاتی ہے۔

یہ موضوع اس قدر فرسودہ اور پامال ہو چکا ہے کہ اب اسے کسی مضمون کا عنوان بنانا یا اس عنوان پر
خامہ فرسائی کرنا۔ مضمون نگار کی بدذوقی خیال کیا جانے لگا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ماضی اور حال کے
نتائج کا مقابلہ و موازنہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس باب میں ہنوز روز اوّل کا معاملہ ہے۔ "حال" تا حال
بدستور ماضی بنا ہوا ہے بلکہ اگر "تعلیم" کے صحیح مفہوم کو "تدریس" ہی تک محدود کر لیا جائے (ہندوستان
میں تعلیم کا مفہوم علمی حیثیت سے خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو عملی طور پر ابھی اس کا مفہوم تدریس ہی قرار دیا جا رہا ہے،
جماعت بندی، اور امتحانات کا موجودہ نظام عمل، طریق تدریس، اور افسران معائنہ کے معائنوں کی پابندیاں،
اس امر کی شاہد ہیں) تو کسی حقیقت شناس اور سلیم الفطرت کو اس حقیقت کے اعتراف سے اعراض نہیں ہو
سکتا کہ حال ماضی کے مقابلہ میں ترقی کرنے کی بجائے روز بروز رُو بہ تنزل ہو رہا ہے۔ طلبا کی لیاقتیں پست
ہو رہی ہیں۔ زمانۂ سابق میں طلبا تین چار سال تک زیر تعلیم رہ کر "اُردو" بلکہ فارسی تک میں اظہار خیالات پر

قادر ہو جایا کرتے تھے۔ مگر آج کل مڈل اور انٹرنس پاس کر چکنے کے باوجود فارسی تو درکنار اُردو بھی صحیح نہیں لکھ سکتے۔

تعلیم کی ترقی اور اشاعت کے سلسلے میں اگرچہ ماہرین فن تعلیم کی طرف سے قابل قدر تجاویز پیش کی جا چکی ہیں اور محکمہ کی طرف سے بھی بڑے بڑے دعاوی کا نہایت بلند آہنگی سے اعلان کیا جا رہا ہے۔ لیکن معلوم نہیں کیوں وہ تجاویز اور کوششیں کسی تسلی بخش نتیجہ پر اختتام پذیر نہیں ہوتیں + شاید ———

ا۔ "اصلاحی نقطہ نظر سے ان میں عمل کی صلاحیت نہیں" + ——— یا ———

ب۔ "مادی اور عملی نقطۂ نظر سے ان میں اتنی دقتیں اور مشکلات ہیں کہ ان پر عمل نہیں کیا جا سکتا" + ——— یا ———

ج۔ "اُن پر عمل کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی گئی" +

اب بھی باوجود انتہائی کوششوں کے اہل ملک کی طرف سے عام طور پر مندرجہ ذیل شکایات سُنی جاتی ہیں:۔

"مدارس میں طلبا کی لیاقتیں پست ہو رہی ہیں"

"حکومت کی طرف سے تعلیم پر بہت کم روپیہ صرف ہو رہا ہے"

"موجودہ تعلیم بیکاری کا پیش خیمہ ہے"

محکمہ بھی اس بات کا شاکی ہے . . . . کہ :۔

ابتدائی تعلیم پر جو روپیہ صرف کیا جا رہا ہے اس کا ۶۶ فیصدی ضایع ہو رہا ہے کیونکہ اُس تعداد کا ۳/۲ چوتھی جماعت تک پہنچنے سے پہلے پہلے تعلیم چھوڑ دیتا ہے۔

تحقیقات حالات سے پتہ چلتا ہے۔ کہ :۔

"موجودہ طریقۂ تعلیم نہایت خشک اور غیر دلچسپ ہے جبھی لڑکے دو دو تین تین سال زیر تعلیم رہنے کے باوجود بھی جماعت اول سے فارغ نہیں ہو سکتے"

گویا اس باب میں مندرجہ ذیل امور اصلاح و تکمیل طلب ہیں:۔

۱۔ "حکومت کی مزید مالی امداد"

۲۔ بیکاری کا انسداد

۳۔ لائق اور طریقۂ تعلیم سے کماحقہٗ ماہر مدرسین کی بہم رسانی

۴۔ طریقۂ تعلیم میں تبدیلی۔

امور مندکرہ بالا میں سے ہر ایک بجائے خود ایک مستقل مضمون کی حیثیت رکھتا ہے اور وقت اس

بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ان تمام امور کو بالتفصیل معرض بحث میں لایا جائے۔

سطور آئندہ میں صرف نمبر ۴ پر روشنی ڈالتے ہوئے جماعت اول کے طریق تعلیم میں مناسب حال اصلاح و ترمیم کرنے کی ضرورت اور اپنی بساط بھر ایک مفید اور بہترین طریق پیش کرنے کی کوشش کیجائیگی۔

محکمانہ قواعد کی رُو سے جماعت اول کا تعلیمی نصاب مندرجہ ذیل مضامین پر مشتمل قرار دیا ہے۔

ا۔ پڑھنا

جو عبارت ہے کسی زبان کی مختلف تحریری علامات کو دیکھ کر ان کی خاص آوازوں کو ادا کرنے اور اُن کا مطلب سمجھ سکنے سے۔ ہندوستانی مدارس میں جماعت اول میں پڑھنے سے اُردو کی آسان عبارتوں کا پڑھنا اور ان کا مطلب سمجھ سکنا مراد لی جاسکتی ہے۔

پڑھنا سکھانے کیلئے ہمارے مدارس میں آجتک کئی مختلف طریق اختیار کئے گئے ہیں اور اگرچہ تعلیمی تدریسی اور اصولی نقطۂ نظر سے ان میں سے ہر دوسرے کو پہلے سے بہتر اور مفید بنانے کی کوشش کی گئی ہے تاہم یہ اعتراض بدستور سہم پر عاید ہو رہا ہے کہ "موجودہ تعلیم نہایت خشک اور غیر دلچسپ ہے"۔ اندریں حالات کہ ابھی اصلاح کا میدان وسیع اور تنجاویز کا دامن فراخ ہے ہمیں ایسے طریق یا طریقہائے تعلیم کے وضع کرنے اور رواج دینے کی ضرورت ہے ...... جو

ا۔ اصولاً۔ صحیح، قدرتی اور فطرتِ اطفال کے مطابق ہو۔

ب۔ عملاً۔ آسان، دلچسپ، مفید اور بہترین ہو، تاکہ جلد از جلد طلبا کو پہلی جماعت سے فارغ التحصیل کر سکے۔

سطور آئندہ میں۔ اُردو کی تعلیم کیلئے جو جدید طریقہ پیش کیا جانے والا ہے، کوشش کی گئی ہے، کہ اُسے متذکرہ بالا معیار کے مطابق ترتیب دیا جائے۔

اس طریق تعلیم میں:۔

(ا) تعلیم کیلئے صحیح اور قدرتی طریقہ اختیار کرنیکی غرض سے

ا۔ اسباق الفاظ سے شروع کئے گئے ہیں، بعد میں ان الفاظ سے حروف اور اُن کی آوازیں نکلوانے کا التزام کیا گیا ہے۔

۲۔ شروع میں ایسے الفاظ لئے گئے ہیں، جن کا تلفظ اُردو اور پنجابی میں ایک ہی ہے، مثلاً لوٹا، کوٹ،

لال، جال وغیرہ
۳۔ الفاظ ایسے منتخب کئے گئے ہیں، جن کی توضیح کیلئے، اصل اشیا یا تصاویر پیش کی جا سکیں۔

ب:۔ لڑکوں میں دلچسپی پیدا کرنے کی غرض سے

اسباق مکمل، مسلسل، مربوط، اور دلچسپ فقرات سے شروع کئے گئے ہیں، اور کوشش کیگئی ہے کہ فقرات گفتگو یا ڈرامے کی شکل میں ہوں، جنہیں بچے عملی طور پر کر سکیں، تاکہ ان میں مطلب فہمی کا مادہ پیدا ہو، گویا یہ اسباق انشا پردازی کے ابتدائی اسباق ہیں، جنہیں کسی دوسرے طریق سے جماعت اول میں شروع نہیں کرایا جا سکتا۔

ج۔ آسانی پیدا کرنے کی غرض سے

۱۔ کوشش کیگئی ہے کہ ایک سبق میں زیادہ سے زیادہ تین یا چار نئے الفاظ آئیں تاکہ بآسانی یاد رہ سکیں۔

۲۔ ہر نئے سبق میں کثرت سے نئے الفاظ ایسے آئیں جو پڑھے ہوئے الفاظ کے اجزا سے بنیں اور لڑکے اُنہیں استاد کی معمولی رہنمائی سے پہچان سکیں۔ اس طرح بچوں میں نئے الفاظ پہچاننے اور لکھنے کی قابلیت پیدا ہو گی۔

د۔ مکمل اصول سکھانے کی غرض سے

کوشش کی گئی ہے کہ :۔
۱۔ الفاظ میں تمام مفرد اور مرکب حروف آ جائیں اور اس انداز سے آئیں کہ :۔
ا۔ ان کی سالم شکل اور آواز لفظ سے علیحدہ کی جا سکے۔
ب۔ مفرد اور مرکب تمام حروف اپنی تمام اشکال کے ساتھ آ جائیں۔
۲۔ فتحہ۔ کسرہ۔ ضمہ اور آ۔ ای۔ او۔ اُو۔ اے۔ اَے۔ تشدید وغیرہ کی آوازیں اور اُن کے اصول و قواعد سکھا دئے جائیں۔

نمونتہً تین اسباق نذرِ ناظرین ہیں۔ امید ہے کہ ان سے مذکورہ بالا امور کما حقہٗ منکشف ہو ہو جائیں گے۔

سبق نمبر ۱

لوٹا

کوٹ

دو کوٹ

دو لال کوٹ

لال - کوٹ دو

لو - کوٹ لو

لال - لوٹا دو

لو - لوٹا لو

لال کو کوٹ لادو

لو - لال - کوٹ لو

لال کو لوٹا لادو

لو لال لوٹا لو

تجزی :- لوٹا - لو - ٹا

کوٹ - کو - ٹ

لال - لا - ل

نئے اجزا - لو - کو - لا - ٹا - دو - ٹ - ل

مشق - لالا - لاٹ - ٹال - ٹالو - ٹالا

سبق نمبر ۵
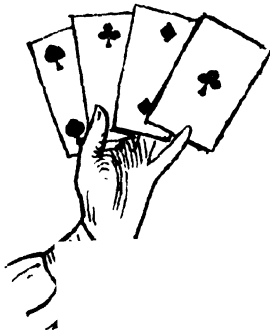
ایک تاش ہے
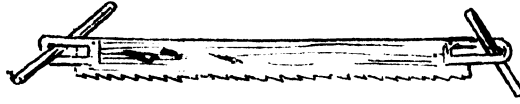
ایک آرا ہے

لال جا ایک آرا لے آ

(لال جاتا ہے ایک آرا لے آتا ہے)

لو آرا لے لو

راج جا ایک تاشش لے آ

(راج جاتا ہے ایک تاشش لے آتا ہے)

لو تاشش لے لو

تجزیہ۔ تاشش ۔تا ۔ ش

نئے اجزا۔ ہے ۔را ۔ ش

مشق۔ لا ۔کا ۔جا ۔ٹا ۔ آ ۔تا ۔ چا ۔ را ۔ لو ۔کو ۔ ے ۔ل ۔ٹ ۔ م

د۔ ج ۔ ر ۔ش

کالا۔ آٹا۔ چارا۔ آتا ۔ لال ۔ لاٹ ۔لاد۔ کاٹ ۔کام۔ کاج ۔ چال

سبق نمبر ۶
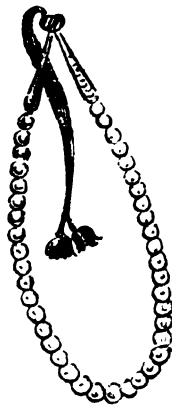
بابا

دادا

مالا

رام لال بابا کو مالا لا دو

(رام لال جاتا ہے مالا لے آتا ہے)

لے بابا مالا لے لے

راما چاچا کو آٹا دال لا دو

چاچا دام دو

لے راما دام لے جا

(راما دام لے جاتا ہے آٹا دال لے آتا ہے)

لے چاچا آٹا دال سے لے

تجزیٔ - بابا - با - با

داوا - دا - دا

مالا - ما - لا

نئے اجزا - با - دا - ما

(حروف کا اتصال ا کے ساتھ) چار - ر - آرا - را - ر - را

زرد - د - وادا - دا - د - دا

را - ر - دا - د

جا - ج - ج - ما - م - م - ٹا - ٹ - ٹ - لا - ا - ل - با - ب

تا - ت - چا - چ - کا - ک

آ - ا - ا

حروف کی مختلف اشکال - جر - ب - مر - ٹ - چ - ک - تا - ل -

مشق - ماما - چاچا - تالا - تارا -

آرام - بادام - تالاب وغیرہ -

نوٹ:- ا- تجزیٔ کراتے وقت اجزائے الفاظ میں سے مفرد حروف کے نام یعنی ٹے اور لام وغیرہ نہ بتائے جائیں، بلکہ ان کی اصلی آوازیں "ٹ" اور "لم" وغیرہ لڑکوں سے نکلوائی جائیں :-

۲- تجزیٔ کراتے وقت تختہ سیاہ کے ساتھ اگر ایسے تاش کا استعمال کیا جائے، جس کے پتوں میں سے ہر ایک پر الفاظ کے اجزا تحریر ہوں تو بہتر رہیگا، شروع میں ان پتوں کو اجزا کی درست ترتیب کے لحاظ سے ترتیب دیکر مکمل لفظ کی شناخت کروائی جائے، بعد ازاں آہستہ آہستہ پتوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرتے ہوئے مفرد اجزا اور حروف کی آوازیں نکلوائی جائیں -

۳- لڑکے کے سکول میں داخل ہوتے ہی یہ اسباق شروع نہ کر دیئے جائیں، بلکہ ابتدائی ڈیڑھ دو ہفتوں میں اُنہیں گھر اور مدرسہ کے اندر اور باہر کی اشیائے کے متعلق پہلے پنجابی میں پھر پنجابی اور اُردو کے مقابلے سے اُردو میں گفتگو شروع کر دی جائے حتیٰ کہ لڑکے ابتدائی اسباق کے فقرات کا مطلب سمجھنے کے قابل ہو جائیں، سبق پڑھانے سے پیشتر سبق کو گفتگو یا ڈرامے کی صورت میں لڑکوں سے عملی طور پر کروالیا جائے،

———

لکھنا

بیسویں صدی کے اوائل سے مدارس میں اُردو کی کتابت اور خوشنویسی (خوشخطی) خاص طور پر منحطط ہونی شروع ہوگئی ہے، اس کا سب سے بڑا سبب ذرائع طباعت کی فراوانی کے علاوہ خود مدرسین کے دماغ سے مذاقِ خوشخطی کا فقدان اور ان کی اپنی بدخطی ہے، اس وقت ہمارا موضوعِ بحث خوشنویسی کی ابتدائی تاریخ، اُس کی اہمیت، فنونِ لطیفہ میں اس کا درجہ، اور اُس کے عروج و انحطاط کے اسباب بیان کرنا نہیں، بلکہ مختصراً ایسی تجاویز پیش کرنا ہے، جن سے حسب اقتضائے ضرورت و وقت ابتدائی جماعتوں میں لکھنے اور خوشخطی کو موجودہ صورت سے بہتر بنایا جاسکے۔

اکثر اصحاب خوشخطی کو لکھنے پر مقدم خیال کرتے ہوئے، پہلی جماعت سے ہی اس کی باقاعدہ تعلیم دینے کے حامی ہیں، ان کے نزدیک طریق تہجّی کو ذریعۂ تدریس قرار دیتے ہوئے حروف کی قرأت کے ساتھ ساتھ اصولِ خوشنویسی کے مطابق ان کی کتابت شروع کرا دینا ضروری اور لابدی ہے، لیکن :-

۱- اس عمر میں بچوں کو اپنی انگلیوں کے عضلات پر اتنا قابو نہیں ہوتا، کہ وہ معیارِ فن کے مطابق حروف کی درست اشکال بنا سکیں،

۲- اور نہ ہی اُن کا دماغ خوشنویسی کے باریک اصول سمجھ سکتا ہے، چہ جائیکہ ان پر عمل بھی کیا جاسکے،

۳- بے معنی حروف کا لکھنا جس میں کوئی بھی دلچسپی کا سامان نہیں، بچے کے لئے ایک بوجھ ہے، وہ غیر دلچسپ ہونے کی وجہ سے وہ بار بار ایک ہی حرف کو لکھنے سے گریز کرتا ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ خوشخطی مشق کے بغیر نہیں آسکتی،

میرے خیال میں اگر اُردو پڑھانے کے جدید طریق کو ذریعۂ تدریس قرار دیتے ہوئے ابتدا میں مکمل الفاظ کا لکھنا اور الفاظ کی مجموعی شکل کا درست بنانا سکھایا جائے، اور آہستہ آہستہ قلم کی بناوٹ اُس کی گرفت، درست نشست، ہاتھ اور قلم کی حرکت، اور حروف کی درست بناوٹ کا ان کے ساتھ تعلق ظاہر اور ذہن نشین کرتے ہوئے الفاظ میں کے مفرد حروف کی درست بناوٹ پر توجہ دینی شروع کی جائے، تو زیادہ بہتر ہوگا، حروف، ان کی مختلف اشکال، اور اُن کے وصل کے قواعد کو چار درجوں میں تقسیم کر لیا ہے۔

پہلی اور دوسری جماعت میں، ان کے متعلق عام موٹی موٹی باتیں بتلائی جائیں اور الفاظ کی درست بناوٹ پر زور دیتے ہوئے، ایک لکیر پر لکھنے کے متعلق ہدایات دی جائیں یعنی "ا" اوپر سے سیدھا نیچے اور "ب ت ک ف" وغیرہ لکیر کے ساتھ ساتھ دائیں سے بائیں "ے" بائیں سے دائیں وغیرہ۔

تیسری اور چوتھی جماعت میں، اصولی باتیں بتاکر ان کے مطابق مشق کرائی جائے، مثلاً "ا" اوپر سے سیدھا نیچے کو تین قط ہوتا ہے، "م" کا عمودی حصہ پانچ قط، "ب" پانچ، لو یا گیارہ قط تک، دائرے چار قط گہرے اور ساڑھے تین قط چوڑے وغیرہ وغیرہ علاوہ ازیں وصلِ حروف کے متعلق عام باتیں بتائی جائیں۔ اس سے اگلی جماعتوں میں وصلِ حروف کے تمام طریق اور حروف نشست (کرسی) وغیرہ کی بابت ہدایات دیکر مشق کرائی جائے ۔

انشا پردازی

آپ یقیناً جماعت اول کی تعلیم کے سلسلے میں انشا پردازی کی سُرخی دیکھکر حیران ہونگے، لیکن اگر زبان کی صحیح تعلیم کے مفہوم پر غور کیا جائے، تو ماننا پڑیگا کہ کسی زبان کی مکمل تعلیم سے مراد ہے اُس کا پڑھنا، سمجھنا اور اس میں اظہارِ خیالات کرسکنا، اور زبان کی تعلیم کے سلسلے میں یہ امورِ ثلاثہ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ ہیں کہ اُنہیں ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا، اگرچہ ان میں سے پڑھنا اور سمجھنا مرکزی حیثیت رکھتا ہے، لیکن فی الحقیقت یہ بنیاد ہے اس زبان میں تحریری طور پر اظہارِ خیالات کر سکنے کی، بدقسمتی سے ہمارے سکولوں میں تعلیم زبان کی غرض سے اُنہیں ایک دوسرے سے اس طرح علیحدہ کر دیا جاتا ہے، گویا ان کا آپس میں دُور کا تعلق بھی نہیں، اُردو کے وُہ طریقے جن کے مطابق اور وُہ مطبوعہ قاعدے جن کے ذریعے تعلیم دیجاتی ہے، اس حقیقت کو بے نقاب کر رہے ہیں، کہ پڑھنا سکھانے کے موجودہ طریقوں کا مقصد محض حروف اور اُن سے بننے والے الفاظ کی آوازوں کا ذہن نشین کرنا ہی قرار دیا گیا ہے، مطلب فہمی کو اس میں شامل نہیں کیا گیا، موجودہ طریقِ تعلیم کے مطابق ہمارے سکولوں میں عام طور پر پڑھنا پہلی جماعت سے، سمجھنا دوسری اور تیسری جماعت سے اور اظہار خیالات کرنا چوتھی جماعت سے شروع کرایا جاتا ہے، یہی وجہ ہے۔ کہ لڑکے عام طور پر پرائمری کی آخری جماعت تک مطلب فہمی میں کمزور رہتے ہیں۔ اور اظہارِ خیالات تو مڈل بلکہ انٹرنس پاس کر چکنے کے باوجود بھی اچھی طرح نہیں کر سکتے، اگر اُردو انشا پردازی سکھانے کیلئے ابتدا ہی سے زبان کی مکمل تعلیم شروع کر دیجائے اور اُردو پڑھنے کے مجوّزہ اسباق کی طرح ایسے اسباق کو ذریعۂ تدریس بنایا جائے، جن میں پڑھنا، مطلب فہمی اور اظہارِ مطلب ایک ہی وقت میں شروع ہو سکیں تو کوئی وجہ نہیں کہ لڑکے پڑھنے تک ساتھ ساتھ مطلب فہمی اور اظہارِ مطالب میں کمزور رہ جائیں، اس کے علاوہ سب سے بڑی بات زبان اُردو کی ترقی و اشاعت کے سلسلے میں طلباء میں اُردو انشا پردازی کا صحیح مذاق پیدا کرنا ہے، اس کے لئے ذیل کا لائحۂ عمل تجویز کیا اور معمول بنایا جاسکتا ہے:

ا۔ گفتگو

۱۔ مادری زبان کے مقابلے سے اُردو میں چیزوں کے نام بتلائے جائیں اور بعد میں مشق کے لئے چیزیں دکھاکر ان کے نام اُردو میں دریافت کئے جائیں۔

۲۔ مادری زبان کے افعال کے مقابلے میں اُردو کے عام مستعمل افعال سکھاتے ہوئے اُردو کے چھوٹے چھوٹے فقرات میں گفتگو کرائی جائے۔ یہ کیا ہے؟ یہ کوٹ ہے۔ کس کا کوٹ ہے؟ وغیرہ بعد ازاں پڑھنا سکھاتے ہوئے، اسمائ افعال اور ان سے بنے ہوئے فقرات پڑھائے جائیں (لڑکے وہ کچھ پڑھیں جو وہ پڑھنے سے پہلے گفتگو و مکالمات کے ذریعے عملی طور پر کرلیں)

ب۔ تحریری

اس طریق تعلیم کے مطابق لڑکے اُردو کے چھ سات سبق پڑھکر اس قابل ہو جاتے ہیں کہ پڑھتے ہوئے اسما و افعال کو لکھ سکیں، جب لڑکے اُردو کے چھوٹے چھوٹے فقرات بولنے کے قابل ہو جائیں تو مندرجہ ذیل مراحل میں سے گذر کر اُردو کے چھوٹے چھوٹے فقرات لکھنا سکھایا جائے۔

۱۔ مختلف چیزیں (جن کے نام وہ پڑھ چکے ہیں) دکھاکر طلبا سے ان کے نام تختیوں پر لکھنے کو کہا جائے۔

۲۔ بعد میں ان اشیا کے متعلق آہستہ آہستہ سوالاً جواباً مکمل فقرات لکھوانے شروع کردیئے جائیں۔

۳۔ ایک یا چند چیزیں کسی جگہ پر رکھکر ان کے متعلق فقرات بنوانے اور انہیں درست طور پر ترتیب دینے کی مشق کرائی جائے، لڑکے صرف اشیا کی تعداد رنگ اور محل وقوع ظاہر کریں، ابتدا میں ایسی مشقوں کے متعلق زبانی گفتگو کی جائے۔ پھر لکھوانا شروع کیا جائے، بعد میں آہستہ آہستہ لڑکوں کو خود دیکھنے اور فقرات مرتب کرنے کی مشق کرائی جائے،

ج۔ تصویر فہمی

آ۔ تختہ سیاہ یا کاغذ پر تصاویر بناکر اُن کے نیچے ایسے سوالات لکھ دیئے جائیں، جن کے جوابات لڑکے تصویر پر سے دیکھ کر لکھ سکیں،

ب۔ تصویر کے نیچے اس کے متعلق فقرات لکھکر ان میں اسما کی جگہ تصاویر بنادی جائیں، لڑکے تصویر کی جگہ تصویر کا نام لکھتے ہوئے مکمل فقرات تختیوں پر نقل کریں۔

ج۔ تصویر کے نیچے اُس کے متعلق فقرات لکھکر ان میں سے ایسے اسما کی جگہیں خالی چھوڑ دی جائیں جنہیں تصویر پر سے دیکھکر پُر کیا جاسکتا ہے۔ لڑکے خالی جگہوں کو پُر کرتے ہوئے مکمل فقرات لکھیں۔

ان مشقوں کو جاری رکھنے اور حسبِ استعداد اوان میں رفتہ رفتہ ترقی کرنے سے لڑکے جماعت چہارم تک پہنچتے پہنچتے، بہت اچھے مضامین لکھنے اور نہایت خوبی سے اظہارِ خیالات کرنے کے قابل ہوجائینگے،

ہندسے

طریقۂ تعلیم کی ان بیقاعدگیوں سے قطع نظر جن کی وجہ سے بچوں کو اعداد کی قیمت کا صحیح تصور نہیں ہوتا ہندسے لکھنے میں عام طور پر مندرجہ ذیل نقائص اور مشکلات دیکھنے میں آتی ہیں،

۱۔ ہندسوں کی معکوس اشکال بنانا، ۲ کو ۲، ۳ کو ۳، ۹ کو ۹ وغیرہ

۲۔ اعداد میں اکائی اور دہائی کے ہندسوں کو تبدیل کر دینا، ۱۳ کو ۳۱، ۱۴ کو ۴۱، ۴۷ کو ۷۴، ۲۷ کو ۷۲ وغیرہ۔

۳۔ ۱۹ کو ۲۹، ۲۹ کو ۳۹، ۳۹ کو ۴۹ وغیرہ لکھدینا۔

اگر ہندسوں کی قرأت مقرون اشیا کے ذریعے سکھائی جائے اور کتابت کا بھی اشیا کے ساتھ گہرا تعلق پیدا کر دیا جائے، تو کوئی وجہ نہیں لڑکوں کو اعداد کی قیمت کا صحیح تصور نہ ہو، اس کیلئے مندرجہ ذیل ذرایع اختیار کئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ قرأت سکھانے کے لئے مقرون اشیا فرداً فرداً گن کر لڑکوں کو دیجئے، اور ساتھ ہی ساتھ ان کی تعداد بآواز بلند پکارتے جائیے، لڑکے بھی آپ کے ساتھ ساتھ بولتے جائیں، پھر ان سے اسی طرح گنوا گنوا کر وہ اشیا واپس طلب کیجئے۔

۲۔ ایک سے شروع کر کے بتدریج چیزوں کی تعداد کا ان کی اشکال تحریری کے ساتھ تعلق پیدا کر دیجئے اور مشق کیلئے:۔

ا۔ چیزوں کی کوئی تعداد لڑکوں کے سامنے پیش کر دیجئے وہ ان کی تعداد:۔

I گن کر بتائیں،

II۔ خاموشی سے زمین یا تختی پر لکھدیں،

ب۔ ایسے تاش تیار کرا لیجئے، جس کے کچھ پتوں پر فرداً فرداً ایک سے دس تک نقطوں یا لکیروں کے نشانات ہوں اور اتنے ہی پتوں پر فرداً فرداً ایک سے دس تک ہندسے لکھے جائیں دو دو لڑکے اس تاش سے اس

طرح کھیلیں کہ ایک لڑکا نقطوں والا پتہ پھینکے اور دوسرا اُس تعداد کے ہندسے والا پتہ پھینک کر وُہ پتہ اُٹھالے اس طرح کھیل جاری رہے،

۳۔ اگر کوئی لڑکا ہندسوں کو الٹا لکھے، تو اُسے تختی پر پنسل سے خود ہندسے لکھ دیئے جائیں، وہ سیاہی سے ان پر لکھے، اور ساتھ ساتھ ان کی تعداد کو بلند آواز سے پکارتا جائے،

۴۔ سَو تک ہندسے سکھانے کیلئے مندرجہ ذیل مدارج اختیار کرنا اکائی اور دہائی کے ہندسوں کو تبدیل کرنے کا بہترین سدِّ باب ثابت ہوا ہے،

I ۱ سے ۱۰ تک کتابت،

II ۱۰ سے ۱۰۰ تک صرف دہائیوں کی کتابت،

III ۱۰ سے ۱۰۰ تک تمام ہندسوں کی کتابت، دہائیوں کے تعلق اور اجزائے ترکیبی سے مثلاً ۳۷ ہوتے ہیں ۳۰ (تیس) اور ۷ (سات) پہلے تیس ۳۰ لکھو اب ۰ (صفر) کو ۷ (سات) بنادو علیٰ ہذا القیاس،

IV۔ اگر اس پر بھی لڑکے ۱۹، ۲۹، ۳۹ وغیرہ کی کتابت میں غلطیاں کریں تو ان کی مشق ایک علیحدہ سبق کی صورت میں کرائی جائے۔

پہاڑے

پہاڑوں کے متعلق بھی صحیح تصور نہ ہونے اور اُن کے عملی استعمال پر زور نہ دیئے جانے کا اعتراض کیا جاتا ہے، اگر پہاڑے مقرون اشیاء اور بالفریم وغیرہ کے ذریعے سکھائے جائیں اور ساتھ ہی ساتھ انہیں بافہم بنانے کے لئے عملی سوالات پر زور دیا جائے، دلچسپی پیدا کرنے اور مشق کیلئے مختلف اصلی اشیاء یا اُن کے نمونے ترازو اور باٹ اور کاغذ یا گتے کے بنے ہوئے سکے (جو بالکل اصلی سکوں کے مشابہ ہوتے ہیں) مہیا کر کے لڑکوں سے عملی طور پر خرید و فروخت کا کام کرایا جائے، تو موجودہ حالات سے بہترین نتائج کی امید کیجا سکتی ہے،

عبدالغنی ایس وی مدرس مڈل سکول

گھونڈ۔ ضلع لاہور

ایک ضروری گذارش

(جناب سردار بکرم سنگھ صاحب بی اے۔ بی۔ ٹی۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس ضلع راولپنڈی)

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ مُلک کی خدمت کا بہترین ذریعہ علم ہے۔ بغیر تعلیم کے کوئی ملک اور قوم بام ترقی اور اوج تہذیب تک نہیں پہنچ سکتی اور یہی وجہ ہے کہ ممالک غربی میں اور سب باتوں کی نسبت تعلیم پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ فی زمانہ جو مُلک تعلیم میں پیچھے ہے وہ ترقی کے میدان میں بھی اور ملکوں کے مقابلے میں پیچھے رہ جائیگا۔ پس اگر ہندوستان بھی ترقی کے میدان میں آگے قدم بڑھانا چاہتا ہے تو اُسے تعلیم کی طرف خاص توجہ منعطف کرنی چاہیئے۔ تعلیمی ترقی میں سب سے بڑا ایجنٹ معلم ہے۔ جس کے سپرد ان بچوں اور نونہالوں کی تعلیم و تربیت ہے۔ جنہوں نے اس مُلک کی آئیندہ نسل بننا ہے اور مُلک اور قوم کی حالت کو سُدھارنا ہے۔ پس معلم کی شخصیت اور ذمہ داری بہت بڑی ہے۔ مُلک کی امید کا رشتہ اُسی کے ہاتھ میں ہے اُس کا پیشہ معزز اور قابل عزت ہے۔ کیونکہ یہ بنی نوع انسان کی خدمت کرتا ہے۔ اور یہی خدمت خدائے بزرگ و بالا کی نظروں میں وقعت رکھتی ہے۔

یہ وہی پاکیزہ پیشہ ہے۔ جو ہر ایک ہستی کیلئے باعث افتخار دو عالم تھا مگر آج اس کی حالت دگرگوں ہے پبلک کے دِلوں میں مدرسین کے متعلق وہ نفرت پھیل رہی ہے۔ کہ رونا آتا ہے۔ اور دل سے بے اختیار نکلتا ہے۔

ہائے وہ اوج ہمارا یہ ہماری پستی — نام کو رہ گئی دنیا میں ہماری ہستی

آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ باقی تو سارا زمانہ ترقی کرے اور مدرس جو دوسروں کی ترقی کا ذریعہ ہے خود قعر پستی میں گرتا جائے۔ اس میں ہمارا ہی قصور ہے اور ہم ہی پستی کے ذمہ وار ہیں ؎

ہم میں افسوس وہ اگلے سے محاسن نہ رہے — اہل ظاہر ہیں مگر صاحب باطن نہ رہے

مَیں نے اس کمزوری اور انحطاط و تنزل کے اکثر اسباب معائنہ کے موقع پر وقتاً فوقتاً دیکھے ہیں۔ اور اب مَیں ان چند نقائص کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

(۱) سب سے پہلا نقص یہ ہے کہ تازہ نوخیز استاد جب نارمل سکولوں سے فارغ ہو کر وہاں سے رُخصت ہوتے ہیں۔ تو ساتھ ہی اُن اصولوں کو جو انہوں نے سال بھر میں نہایت عرق ریزی و جان فشانی سے حاصل کئے تھے۔ وہیں بالائے طاق رکھ آتے ہیں سکول میں حاضر ہونے پر وہ اپنے کام کی نہ کوئی سکیم یا سلیبس اور نہ ہی کوئی ٹائم ٹیبل تیار کرتے ہیں روزانہ ڈائری کا تو ذکر ہی رہنے دیجئے۔ اور یہ وہ چیزیں ہیں جن سے مدرس کی کامیابی کا بہت سا حصہ یقینی ہو جاتا ہے۔ مگر آپ باوجود اس بات کا علم ہونے کے پھر وہی دقیانوسی طریقہ تعلیم اختیار

کر لیتے ہیں۔ جو نہایت نا واجب اور غیر دلچسپ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ بچوں کو تعلیم سے نہ کوئی دلچسپی پیدا ہوتی ہے نہ شوق بڑھتا ہے۔ وہ جبراً قہراً مدرسے آتے ہیں اور خدا خدا کر کے اس وقت کو گذارتے ہیں۔

(۲) دوسرا سب سے بڑا نقص جو استادوں میں دیکھا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انہیں کتب بینی اور مطالعہ سے نفرت ہے اور اوقات مدرسہ کے بعد کتاب کو ہاتھ لگانا بھی خلاف شان سمجھتے ہیں۔ اور ان کا مطالعہ درسی کتب تک ہی محدود رہتا ہے۔ گھر جا کر انہیں پڑھنے لکھنے سے گھن آتی ہے اور کتاب انہیں کاٹے کھاتی ہے۔ اس کا بُرا اثر طلبہ پر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ پس طلبا میں تعلیمی شوق پیدا کرنے کیلئے استاد کو خود نمونہ بننا چاہیئے۔ اور مطالعہ کا عادی ہونا چاہیئے۔ علاوہ ازیں اپنے مدرسے کو دن بدن زیادہ خوبیوں اور کام کی باتوں سے متصف بنانے کیلئے استادوں کو جدید تعلیمی تجربات سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے اور یہ صرف مطالعہ کے جاری رکھنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ "پیر شو بیاموز" کے مقولہ کو کبھی نظر انداز نہ کیا جائے۔

(۳) تیسرا نقص جو عام پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ مدرسہ کے قواعد کا احترام نہیں کیا جاتا اور پرانے تجربہ کار مدرس کی ہدایت سے فائدہ نہیں اُٹھایا جاتا مثال کے طور پر طلبا کی حاضری کا دو وقت ہونا نہایت ضروری ہے۔ مگر اول تو معلم حاضری باقاعدہ لکھتا ہی نہیں اور اگر وہ لکھے بھی تو طلبا کو اس کا کوئی علم نہیں ہوتا ۹۵ فیصدی سے زیادہ لڑکے ایسے ہونگے جنہیں یہ بھی خبر نہیں ہوگی۔ کہ دوسرے وقت بھی حاضری ہوتی ہے نتیجہ صاف عیاں ہے۔ تفریح کے بعد اکثر طلباء غیر حاضر ہو جاتے ہیں۔ یا دیر سے حاضر سکول ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ مرض مدرسین میں بھی جڑ پکڑ رہا ہے۔ اندریں حالات اگر وہ لڑکوں کی بے قاعدگی اور دیر سے آنے کا رونا روئیں تو بے جا ہے۔ لاپروا استاد بچوں کے لئے قابل تقلید نمونہ نہیں بن سکتا۔

(۴) ا۔ بعض مدرسین اول مدرس کے حکم کی تضحیک اور تحقیر کو طلبہ کی ہر دلعزیزی کا ذریعہ خیال کرتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ اُن کی کوتاہ اندیشی اور جہالت پر ان کو یہ خیال تک نہیں گذرتا کہ جب خود اُن کے دل میں اپنے افسر کی عزت و توقیر اور اس کے احکام کا احترام نہیں ہے تو طلبہ سے تعظیم کی توقع رکھنا جَو بو کر گندم کاٹنے کا مصداق ہے۔ ایسے مدرسین اپنے آپ کو ہمچو ما دیگرے نیست اور ہمہ دان تصور کرتے ہیں۔ پرانے تجربہ کار اور لائق ہیڈ ماسٹر کی ہدایات پر عمل کرنا کسر شان سمجھتے ہیں اپنے آپ کو اُس جیسا ہی ٹرینڈ اور یکساں لیاقت کا تصور کرتے ہوئے جہل مرکب کی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ تجربہ ہی ایک بڑا معلم ہے۔ اور فن استادی کی باریکیاں اور نفیس اور پیچیدہ اصول بہت محنت اور برسوں کی مشقت کے بعد حاصل ہوتے ہیں۔ وہ ابھی اس میدان میں طفل مکتب اور نوخیز ہیں انہیں اول مدرس کے تجربہ سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے انسان کو علم اور تجربہ حاصل کرنے کیلئے اپنے سے کم عمر اور زیادہ تعلیم تجربہ کے لوگوں کے پاس جانے میں شرم محسوس نہیں کرنی چاہیئے۔

(ب) - ایک ہی سکول میں کام کرنے والے اساتذہ کی باہمی رنجشیں ہیں جو تعلیمی کام میں حارج ہوتی ہیں۔ تمام استادوں کے درمیان سلسلہ اخوت کا ہونا نہایت ضروری اور لابدی ہے۔ اتفاق ہی طاقت ہے اور اتفاق ہی میں برکت ہے۔ اگر بفرض محال اساتذہ میں کسی طرح کا اختلاف واقع ہو بھی جائے تو اس کا طلبہ کے سامنے اظہار پرلے درجے کی حماقت اور نادانی ہے۔ اس سے اُن کی وقعت خاک میں مل جاتی ہے۔

(۵) اکثر نوجوان مدرسین علاقہ کے بارسوخ اور سرکردہ لوگوں سے میل جول رکھنے سے کتراتے ہیں اور اُن کی مدد سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اس کے برعکس وہ چند ایک نا اہل اور بداخلاق اشخاص سے راہ و رسم پیدا کر لیتے ہیں مگر چونکہ انسان اس کی سوسائٹی سے پہچانا جاتا ہے اس لئے پبلک اور افسران اُن کے اس رویہ سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ اور یہی ناراضگی اُن کی ترقی اور کامیابی میں سدّ راہ بنجاتی ہے علاوہ ازیں ؎

پسر نوح بابداں بنشست ‏ ‏ ‏ ‏ خاندان نبوتش گم شد

کے مصداق ہیں اُن میں جو کچھ فطرتی سعادت ہوتی ہے وہ بھی ضایع ہو جاتی ہے اور بداخلاقی تک نوبت پہنچ جاتی ہے اور اس کا معصوم بچوں پر جو اثر پڑتا ہے خدا اُس سے محفوظ رکھے۔ جہاں مدرسین کے لئے پبلک کیساتھ میل جول ضروری ہے وہاں کیلئے مقامی دھڑابندی سے کنارہ کشی نہایت مفید ہے لوگوں کے ساتھ رسوخ پیدا کرنے کا احسن طریق اُن کے بچوں کی خیروعافیت اور فلاح و بہبودی میں ذاتی حصہ لینا ہے۔

(۶) مدرسین کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ جس علاقہ میں تعینات ہوں اپنی طرز رہائش مقامی رسم و رواج کے مطابق اختیار کریں۔ نیز اس علاقہ کو اپنا گھر سمجھ کر پوری دلچسپی سے کام کریں۔ تاکہ وہ اُن کے درمیان رہکر اُن کی بہتری کا ذریعہ بن سکیں۔ طلبہ کو بدنی سزا دینے سے اُن کو سخت گریز کرنا چاہیئے۔ اور اُن کی اخلاقی - جسمانی اور دماغی تعلیم کا یکساں خیال رکھنا چاہیئے۔

پس اگر آپ چاہتے ہیں کہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت اور بزرگی کو دوبارہ حاصل کریں اور کامیابی کا سہرا آپ کے سر پر بندھے تو ان نقائص کو دور کرنا چاہیئے آپ کو نمونہ کا استاد بننے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ آپ کی چال ڈھال وضع قطع - گفتگو اور چال چلن پاکیزہ اور دلکش ہو۔ زندگی بے لوث ہو۔ طبیعت میں چڑچڑاپن - زود رنجی - بے صبری اور لالچ نہ ہو خندہ پیشانی آپ کی خاص صفت ہو۔ غرضیکہ مدرس محسن ہو۔ ہمدرد ہو۔ منصف ہو۔ واعظ ہو یعنی کہ مجمع اوصاف ہو اور تمام اخلاق حسنہ کا آپ نادر نمونہ ہو۔ اپنا اورنہ سمجھے مطالعہ کو جاری رکھے۔ مدرسہ کے قواعد کی پابندی کو اپنا فرض اور اول مدرس کی امداد کو اپنا نصب العین قرار دے پھر دیکھئے کہ سکول میں جو ایک باغیچہ ہے کیسی بہار ہوتی ہے۔ اور کامیابی کس طرح آپ کے پاؤں چومتی ہے۔ بشرط فرصت آئندہ بھی اس قسم کی ہدایات شایع کرتا رہوں گا۔ امید ہے کہ مدرسین ان پر کاربند ہو کر ملک و قوم کے لئے باعث فخر ثابت ہونگے۔ فقط

مسٹر من موہن ایم۔ اے آئی ای ایس
ڈویژنل انسپکٹر مدارس جالندھر

جذباتِ عالیہ

(از ملک الشعراء حضرت غلام قادر گرامی مرحوم)

ز ذوقِ بے خودی از من مپرس تا چند است ۔۔۔ کہ سینہ چاکِ نظرہائے فتنہ پیوند است

رخِ تو عیدِ نظرہاست چند زیرِ نقاب ۔۔۔ درآ بجلوہ کہ یک شہر آرزومند است

تو مفت از کفِ من بردہ چہ می دانی ۔۔۔ کہ قدرِ گوہرِ دل چیست قیمتش چند است

چہ کہنہ رندِ نظر بازم و ندانستم ۔۔۔ کہ در نگاہ و تغافل بہم چہ پیوند است

تو آرزوئے دلِ من ز من چہ می پرسی ۔۔۔ ز دل بپرس کہ چون ست و آرزو چند است

قدح تو با دگراں می زنی و من مردم ۔۔۔ ز وعدہ ہائے دروغی کہ راست مانند است

عتابِ غمزہ بلا در بلا بہم چند است ۔۔۔ کتابِ صبر ورق در ورق پراگند است

چگونہ نقشِ مرادم درست ننشیند ۔۔۔ حباب مائل و در لالہ سست پیوند است

خدنگِ آں نگہِ ناز در ازل خوردم ۔۔۔ ہنوز بر لبِ زخمِ جگر شکر خند است

وصال گر ہمہ عمر است عمر یک نفس است ۔۔۔ فراق گر ہمہ دم نیست کوہِ الوند است

بگشتم و جز ملکِ عشق کم دیدم ۔۔۔ ولایتے کہ در آں بندہ بے خداوند است

شکایتے نکنم از فلک ولے میرم ۔۔۔ ازیں فسانہ کہ دشمن ز دوست خورسند است

بلاکشاں ز گرامی خبر ہمے آرد

اجل گرفتہ بزنجیرِ بے کسی بند است

ہنسو اور موٹے ہو جاؤ

تم کیوں نہیں لکھتے ہو

جھگڑے سے محبت

استاد کا مطالبہ

پنجاب میں لڑکیوں کی تعلیم

اُس کی ابتدا اور موجودہ حالت

(لالہ تلوک چند صاحب بی اے بی ٹی۔ اے۔ ڈی۔ آئی سکولز حصار)

ابتدائی:۔ قدیم ہندوؤں اور مسلمانوں کے زمانے میں تعلیم کس طرح پر دی جاتی تھی؟ ہم اس سوال کو اس جگہ چھیڑنا درست نہیں سمجھتے۔ لیکن یہ درست ہے کہ موجودہ طریقہ تعلیم جو انگریزوں کے زمانے میں شروع ہوا۔ اُس وقت رائج نہ تھا۔ نہ اس طرح کے سرکاری مدارس تھے۔ اور نہ سرکاری انسپکٹر۔ خاص حالات میں بعض بعض درسگاہوں کو گورنمنٹ کی امداد اور وہ بھی کسی باقاعدہ طریقہ سے نہیں۔ شاید مل جاتی ہو۔ لیکن جیسا کہ سر ولیم ہنٹر اپنی کتاب موسومہ "ہندوستان میں انگلینڈ کا کام" میں لکھتے ہیں۔ کہ "کسی مغل بادشاہ نے لوگوں کی تعلیم کو حکومت کا فرض نہ خیال کیا" عام طور پر درست ہے۔

انگریزی حکومت نے بھی جب تک یہ محسوس نہ کیا۔ کہ سرکاری ملازمتوں میں دیسی آدمیوں کی ضرورت ہوگی۔ تعلیم کے کام کو اپنے ہاتھ میں نہ لیا۔ ابتدا میں دو تین خاص درسگاہوں کو چھوڑ کر تمام تعلیمی کام پادریوں نے شروع کیا۔ ۱۸۱۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کی تجدید کے وقت ایک لاکھ روپیہ اشاعت تعلیم کے لئے مہیا کیا گیا۔ ۱۸۲۳ء میں سررشتہ تعلیم کی کمیٹی بنگال میں اور ۱۸۲۶ء میں مدراس میں قایم ہوئی۔ ۱۸۳۰ء میں ڈاکٹر ڈف نے ایک درسگاہ جاری کی جس میں انگریزی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس سے پیشتر گورنمنٹ کی درسگاہوں میں عربی اور سنسکرت کی تعلیم ہی دی جاتی تھی۔ لارڈ میکالے اور لارڈ ولیم بینٹنک۔ ڈاکٹر ڈف کی رائے سے متفق ہوئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی تعلیم کی اشاعت شروع ہوئی۔

لیکن یہ سب لڑکوں کی تعلیم کیلئے تھا۔ اس وقت تک لڑکیوں کی تعلیم کی بابت کوئی ذکر اذکار نہ تھے۔ لارڈ ڈلہوزی کے زمانے میں رات کی سیاہی میں ایک مدہم سی روشنی دکھائی دی۔

۱۸۴۹ء میں مسٹر بیتھون (Bethune) پریزیڈنٹ تعلیمی کونسل بنگال نے خاص اپنے زیر اہتمام امیروں کی لڑکیوں کی تعلیم کیلئے ایک سکول جاری کیا۔ یہ غالباً ہندوستان میں گورنمنٹ کی طرف سے لڑکیوں کی تعلیم کی پہلی مثال ہے۔

پنجاب میں (۱۸۶۱ء) کے بعد ہی لڑکیوں کے مدارس جاری ہونے شروع ہو گئے تھے۔ ۲۷ مڈل سکول ایسے تھے جو ۱۸۴۹ء سے پہلے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پنجاب میں قایم ہو چکے تھے۔ ان میں سے اکثر ۱۸۵۲ء و ۱۸۵۶ء

اور سنہ ۱۸۶۹ء میں قائم ہوئے۔ جب یہ مدارس جاری ہوئے تو لوگوں نے انہیں بڑی مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ لوگ اپنے لڑکوں کو سرکاری مدرسوں میں بھیجنے سے ڈرتے تھے۔ دیسی سرکاری افسر بھی بعض اوقات اپنا رسوخ سکولوں کے برخلاف ہی استعمال کرتے تھے۔ جب لڑکوں کی تعلیم کا یہ حال ہو تو لڑکیوں کو کون سرکاری مدارس میں بھیجنے کو تیار ہو سکتا تھا؟ محکمہ تعلیم اس کام میں بالکل بے بس تھا۔ اب تعلیم شروع ہو تو کیسے؟

ابتدا

سر رابرٹ منٹگمری جب لفٹیننٹ گورنر پنجاب مقرر ہوئے۔ تو انہوں نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ وہ کافی عرصہ سے پنجاب میں رہتے تھے۔ بڑے بڑے سکھ سرداروں سے ان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ انہوں نے سوسائٹی کے بڑے بڑے آدمیوں پر اپنا اثر ڈالا۔ اور انہیں تعلیم نسواں کی طرف رغبت دلائی۔ بہت سے اضلاع کے ڈپٹی کمشنر اور دیگر افسران نے سر رابرٹ کے اشارے کو سمجھا۔ اور اپنا اثر ڈالنا شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکیوں کے مدارس قائم ہونے شروع ہوئے۔ لاہور۔ امرتسر۔ جالندھر۔ سیالکوٹ۔ گجرات اور راولپنڈی کے اضلاع میں نہایت زور سے لڑکیوں کے مدارس جاری ہوئے یہ سب سکول پرائیویٹ آدمیوں کے زیر اہتمام تھے۔ محکمہ تعلیم یا گورنمنٹ کا ان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نہ کوئی باقاعدہ طریقہ تھا۔ اور نہ تعلیمی پیمائش یا جانچ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اور نہ اس بات کی کوئی گارنٹی تھی۔ کہ کچھ پڑھایا بھی جاتا ہے یا نہیں۔ تاہم یہ ترقی کی طرف پہلا قدم تھا۔ لوگوں کا شبہ دور کرنے کا یہی واحد طریقہ تھا کہ ہمارے اپنے آدمی ایسے مدارس جاری کریں۔

انتظام اور سلسلہ بندی

ان سکولوں کو ایک سلسلہ میں باندھنے کی کوشش پہلے مسٹر ایچسن کے زمانے میں جبکہ وہ لاہور ڈویژن کے کمشنر تھے شروع ہوئی۔ اور تعلیم نسواں کے نازک پودے کی چھانٹ اس روز سے شروع ہوئی۔ کہ پودے کی زندگی ہی خطرے میں پڑ گئی۔ لاہور کے سکولوں کیلئے ایک یورپین لیڈی سپرنٹنڈنٹ مقرر کی گئی اور سکولوں کی تعداد ۹ سے ۶ کر دی گئی۔ اسی طرح امرتسر میں کیا گیا۔ مگر تخفیف اس زور سے نہ کی گئی۔ اور ۱۱۵ میں سے ۴۰ سکول قائم رکھے گئے۔ اضلاع جالندھر اور سیالکوٹ وغیرہ میں ۸۰ مدارس حکام ضلع کے ماتحت تھے۔ پرانے سکول جو مندروں اور مسجدوں میں جاری تھے اُن کو بند کرنے کی کوشش کی گئی۔

مشن سکولز ۳۵ کے قریب تھے اور اُن میں بارہ سو کے قریب لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ بابا کھیم سنگھ بیدی نے اضلاع راولپنڈی اور جہلم میں ۵۱ مدرسے جاری کر رکھے تھے۔ اور اُن میں [illegible] کے قریب لڑکیاں زیر تعلیم تھیں۔ کشیدہ اور پھلکاری کاڑھنا سینا پرونا ان لڑکیوں کو خوب سکھایا جاتا تھا۔ اور تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ لاہور۔ امرتسر۔ سیالکوٹ۔ جالندھر اور دہلی میں عورتوں کے نارمل سکول قائم تھے۔ بڑی عمر کی عورتوں کیلئے زنانہ کلاسز تھیں۔

ایک بد صورت صنم

یہ تصویر اُس عورت کی ہے۔جو سارے یورپ و امریکہ میں پہلے درجہ کی بد مزاج۔غصہ ور۔کینہ ور۔بے مروت اور بد صورت ہے۔جس کی زبان سے ہمیشہ زہر آلود باتیں نکلتی ہیں۔انہی برائیوں کی وجہ سے آج تک اسے پیار کی نظروں سے نہیں دیکھا گیا نہ اسکی شادی ہی ہوئی ہے۔عالم نسوانی کو اس عورت سے عبرت حاصل کرنی چاہئے۔اور اُسکی ان بد عادات سے پرہیز۔

ٹریننگ سکولز	۸۷۰	۹۶۰
خاص سکولز	۴۲	۱۰۶۸
پرائیویٹ سکولز اونچے درجے کے	۷۲	۱۴۰۱
ابتدائی مدارس۔	۱۰۶۸۷	۴۳۳۰۹
میزان۔	۱۹۲۷۸۳	۴۰۰۸۳۸

سنہ ۱۸۸۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ ظاہر کرتی ہے کہ ملک میں ۲،۷۷،۲۰۷ عورتیں ایسی تھیں جو سکولوں میں داخل نہ تھیں۔لیکن لکھ پڑھ سکتی تھیں۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں یہ تعداد ۴۳،۳۴۹۵ ہوگئی۔

سنہ ۱۸۹۶ء میں پنجاب سے پہلی لڑکی نے انٹرنس پاس کیا۔ العرض انیسویں صدی کے خاتمہ پر ہماری حالت یہ تھی۔کہ تمام صوبے میں ۲ ہائی سکول ۸ مڈل سکول اور دیگر سب قسم کے سکول تھے۔ اوران میں ۱۲۶۰۰ لڑکیاں زیرتعلیم تھیں۔چند سالوں کے اعداد مقابلہ کیلئے نیچے دیئے جاتے ہیں۔

		تعداد سکول	زیر تعلیم لڑکیاں	
سنہ ۱۹۰۰ء		۳۱۵	۱۲۶۰۰	
سنہ ۱۹۰۵ء		۵۶۱	۲۱۷۶۹	۶ لڑکیاں امتحان انٹرنس میں شامل ہوئیں۔ لاہور نارمل سکول جاری ہوا۔
سنہ ۱۹۱۱-۱۲ء	سرکاری	۷۱۶	۳۶۶۴۰	
	پرائیویٹ	۸۷۵	۱۶۷۳۹	
سنہ ۱۹۱۶-۱۷ء	سرکاری	۱۰۳۰	۵۴۱۱۵	
	پرائیویٹ	۹۷۲	۱۳۵۰۱	
سنہ ۱۹۲۲ء	منظور شدہ	۱۱۴۳	۶۰۹۷۲	
	غیر منظور شدہ	۱۳۳۶	۲۴۱۶۱	
سنہ ۱۹۲۷ء	منظور شدہ	۱۳۶۷	۸۲۱۰۵	
	غیر منظور شدہ	۲۲۰۶	۳۸۵۳۲	
سنہ ۱۹۲۹ء	منظور شدہ	۱۵۸۶	۱۰۰۳۸۷	
	غیر منظور شدہ	۲۵۱۲	۴۹۳۰۶	

اس کے علاوہ کچھ لڑکیاں لڑکوں کے مدرسوں میں بھی زیرتعلیم تھیں۔اس طرح سے کل تعداد زیرتعلیم اس

طرح تھی۔

پہلی دوسری تیسری جماعتیں۔	۸۷۶۱۲
چہارم و پنجم	۱۳۰۵۹
ششم سے دہم تک	۴۴۲۹
کالج	۱۴۳
میزان	۱۰۵۲۴۳

سنہ ۱۹۱۴ء میں وکٹوریہ سکول گورنمنٹ نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس وقت ۶ ہائی سکول اور ۳۳ مڈل سکول تھے۔
یہ ہے ہماری لڑکیوں کی تعلیمی ترقی کا حال۔ اگر سنہ ۲۷-۱۹۲۶ء کا موجودہ اعداد سے مقابلہ کیا جائے۔ تو مندرجہ ذیل ہے

	تعداد لڑکیاں	آبادی کل	اوسط فی دس لاکھ
سنہ ۲۷-۱۹۲۶ء	۹۲۹۱	۱۷۵۹۶۷۵۲	۵۲۸
سنہ ۲۹-۱۹۲۸ء	۱۰۵۲۴۳	۲۰۶۸۵۰۲۴	۵۱۰۰

آئندہ کیا ہونا چاہیئے:۔

بات صاف ہے۔ کہ سخت کوشش کے باوجود تعلیمی حالت لڑکوں کی بھی درست نہیں ہوئی۔ لڑکیوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ زیر تعلیم لڑکے اور لڑکیوں کی ایک بہت بڑی تعداد ابتدائی چار جماعتوں کو عبور نہیں کر سکتی۔ اور چار جماعتوں کی تعلیم کا معیار جو ہے۔ وہ سب جانتے ہی ہیں۔ زیادہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

گذشتہ تین سال سے لڑکوں کی تعلیم کی طرف خاص طور سے توجہ دی گئی ہے۔ اس لئے کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ تعلیم کیوں نہ زیادہ ترقی کرے۔ اور لڑکیاں بھی لڑکوں کی طرح کافی تعداد میں سکولوں میں داخل ہوں۔

سلکِ مروارید

(۱) کنواں کبھی پیاسے آدمی کے پاس نہیں آتا۔ پیاسا ہی کنوئیں کے پاس جاتا ہے۔
(۲) بزرگوں کی مجلس میں بیہودہ طعنہ آمیز ہنسی مخول کی گفتگو کبھی نہ کرو۔
(۳) کسی کے نام کا خط بلا اس کی اجازت کے مت پڑھو۔

(گنگا رام عیسیٰ پور)

ہماری تعلیم

عام طور پر ہر ایسے آدمی کو جو کسی زبان بالخصوص اُردو میں کسی قدر نوشت وخواند کی مہارت رکھتا ہو تعلیم یافتہ کہہ دیا جاتا ہے۔ اور یہ راستی سے اتنا ہی دور ہے۔ جتنا نور سے سایہ۔ اگر سچ پوچھو تو تعلیم کے نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ مقصد کو محض نوشت وخواند کی مہارت کے گھٹیا سے درجے تک گرا دینا۔ اُس کے گلے پر کند چھری پھیرنا ہے۔ کیونکہ تعلیم کا اصلی مُدعا تو یہ ہے کہ :-

"اپنے طالب علموں کی تربیت اس نوع سے کی جائے۔ جس سے بڑے ہو کر وہ :-

(ا) نیک و معزز شہری بنیں۔

(ب) عرصہ تک تندرست زندگی بسر کریں

(ج) جائز ذرائع سے کما کر عمر فارغ البالی سے گزار سکیں

(د) اپنے وطن، اہل وطن اور ابنائے جنس کے ہمدرد اور ممد و مددگار ثابت ہوں۔"

تعلیم کے مدعا کی کسوٹی پر اگر ہم اپنی تعلیم کو پرکھیں۔ تو افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ وہ ایک قسم کا ملمع ثابت ہوتی ہے۔ جس کی ظاہریت تو موہنی ہے۔ لیکن حقیقت بمنزلہ صفر۔ اگر تعلیم کا وہی مدعا لیا جائے۔ جو عامۃ الناس لیتے ہیں۔ اور جسے میں نے شروع میں واضح کر دیا ہے۔ تو ہم تعلیم یافتہ ضرور ہیں۔ اور ہمارے ہاں تعلیم بڑے شد و مد سے ہو رہی ہے۔ لیکن اگر تعلیم کا مقصد وہ ہے۔ جو بعد میں بیان ہوا ہے۔ تو ہم تعلیم سے کوسوں دور ہیں۔ اور محکمۂ تعلیم کے منصرم اصحاب سے کہہ سکتے ہیں کہ ؎

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو میروی بترکستان است

آؤ دیکھیں! کیونکر؟

تعلیم کا سب سے پہلا مقصد نیک اور معزز شہری پیدا کرنا ہے۔ اب ذرا غور سے دیکھو کہ دروغ بافی، سخن سازی، رشوت ستانی، جعل سازی، مقدمہ بازی، ہر شرارت جرائم کرنا۔ اور پھر اُن کا اخفا کس طبقہ سے متعلق ہیں۔ کیا ہمارے ملک میں وہی معصومیت اور راستی اب بھی ہے جو آج سے پچاس سال پہلے تھی۔ عام میل جول اور معمولی سے معمولی بات چیت میں بھی جو تصنع اور ریا جو ظاہریت اور اجنبیت پائی جاتی ہے کیا وہ پہلے بھی تھی؟ یہ حسد و بغض، عناد اور مغائرت یہ نفسا نفسی اور خود پرستی یہ کبر اور غرور یہ افتراق و اختلاف یہ تعصب اور جنبہ داری یہ دھڑے بندی اور فرقہ داری جس نے ہر خورد و کلاں کو اپنے زیر اثر کر رکھا ہے کیا پہلے بھی اسی طرح تھی؟ موجودہ نسل جو اس وقت مدارس میں ہے یا ابھی ابھی فارغ التحصیل ہوئی ہے

شاید محسوس کرتی ہو یا نہ کرتی ہو لیکن وہ بڈھے اور سال خوردہ لوگ جنکی ابتدا اور حالات میں ہوئی تھی۔ اپنی اس انتہا کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں۔ اگر اس فرق کو نمایاں طور پر دیکھنا ہے۔ تو ان دور افتادہ مقامات کا جہاں ابھی اس شمع کی روشنی جلوہ گر نہیں ہوئی۔ ان تعلیمی مراکز سے جہاں ہماری موجودہ تعلیم عام تام ہوگئی ہے۔ مقابلہ کرکے دیکھ لو۔ آپ دونوں حالتوں میں بعد المشرقین پائیں گے۔ قانون میں جتنی دفعات بڑھ رہی ہیں۔ یا سوسایٹی کی اصلاح کا خیال جتنا روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ اس بات پر دال ہے۔ کہ جرائم کی نوعیت بڑھ رہی ہے۔ اور سوسایٹی میں خرابیاں گھر کر رہی ہیں۔ کیونکہ جب تک کوئی بیماری نہ ہو۔ اس کے علاج کے متعلق سوچنے کی ضرورت ہی نہیں ہوا کرتی۔ ہر بات میں سادگی اور میانہ روی کو ہاتھ سے نہ دینا جن اہل ہند کا شعار تھا۔ وہ اب ہر بات میں بناوٹ اور مبالغہ پر اتر آئے ہیں۔ اور ان سب کے متعلق میں تو یہی کہوں گا۔ کہ ؎

اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

حضرت آدمؑ کی طرح بہشت کی لہریں لے رہے تھے۔ اس تعلیم کا دانہ کیا کھایا۔ کہ اپنی عریانی اور کم مائگی کا احساس ہونے لگا۔ بجائے نیک اور اچھے شہری بننے کے وہ کچھ ہوگئے۔ کہ اب ہمارے نام سے وہ بھی لاحول پڑھتا ہے جس کے نام سے کبھی ہم لاحول پڑھا کرتے تھے۔

اب تعلیم کا دوسرا مدعا لو یعنی تندرست رہ کر عرصہ تک زندگی بسر کرنے کے قابل ہونا۔ اس کے دستاویزی ثبوت آپ کو ملینگے۔ آج سے پچاس سال پہلے کی اوسط عمر کا آج کل کی اوسط عمر سے مقابلہ کرکے دیکھ لو۔ پڑھے لکھے۔ اور ان پڑھ لوگوں کی عام صحت، شرح اموات، قد و قامت، شکل شباہت، ڈیل ڈول اور زور و طاقت کا موازنہ کر لو۔ ہندوؤں کو فخر ہے۔ کہ تعلیمی حالت میں وہ اپنی ہمسایہ اقوام سے گوے سبقت لے گئے ہیں۔ لیکن یہ فخر بھی ہندوؤں کو ہی حاصل ہے۔ کہ دن بدن ان کی شرح اموات تو ہمسایہ اقوام کی شرح اموات سے بڑھ رہی ہے۔ اور شرح پیدائش کم ہو رہی ہے۔ جس سے ہندو قوم کے رہنماؤں کو اس بات کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ کہ پمفلٹ لکھ کر اس قوم پر واضح کر دیں۔ کہ اگر اس کے یہی للے تللے رہے۔ تو اس کا نام صفحۂ ہستی سے مٹ جائیگا۔ دھرم پور، سولن، ڈیرہ دون دھرم سالہ بٹوت ایبٹ آباد، مری اور کشمیر کو یہ رونق کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ جو آج حاصل ہے۔ پھر ان مقامات پر نو وارد بیماریوں کی مردم شماری کرکے دیکھ لو۔ آپ کو اپنی تعلیم کے کارنامے نمایاں و بیّن صورت میں نظر آ جائیں گے۔ میرا خیال ہے۔ کہ اس پہلو پر مجھے زیادہ ثبوت یا شہادت گذارنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ؎

طفل نکتہ فہم را ایمائے استادے بس است

رہا تیسرا مدعا کہ جائز ذرائع سے روزی کما کر زندگی فارغ البالی سے بسر کرنے کے قابل ہونا۔ اس کے لئے اہل ہند کا مسئلۂ بیکاری ثبوت میں ہے۔ پڑھے لکھے لوگ لاکھوں کی تعداد میں بیکار بیٹھے ملک و قوم پر گرانبار بوجھ ثابت

ہو رہے ہیں۔ اور سچ پوچھو۔ تو ملک میں جتنی بے چینی اور بدامنی کی وبا پھیلی ہوئی ہے یا آئندہ پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ اس کی تہ میں ان پڑھے لکھے حضرات کا بیکار رہنا کام کرتا ہے۔ اِنہیں کام پر لگا دو۔ آج سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائیگا۔ اس وقت ایک روٹی کا مسئلہ ہے۔ جو نازک صورت اختیار کئے ہوئے ہے۔ اور اُس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ تعلیم روٹی کے سوال کو بالکل حل نہیں کرتی۔ ہر پڑھا لکھا اپنے آپ کو ایک اعلیٰ طبقہ میں پاتا ہے۔ عام معمولی کام جو اَن پڑھ لوگ کرتے ہیں۔ کرتے ہوئے شرم محسوس کرتا ہے۔ سرمایہ پاس نہیں ہوتا۔ اسلئے تجارت کر نہیں سکتے۔ ملازمت کے خواہاں ہیں۔ لیکن بڑی سے بڑی گورنمنٹ میں بھی یہ طاقت نہیں۔ کہ حشرات الارض کی مانند پڑھے لکھوں کی جتنی تعداد سکولوں اور کالجوں کو سلام کر کے نکلے اُن کیلئے نئی سے نئی اسامیاں پیدا کرتی جائے جن پر فائز ہو کر وہ اپنے دلی مُدعا کو حاصل کریں۔ کام وہ کرنا نہیں چاہتے یا اُن سے ہو نہیں سکتا۔ ملازمت مل نہیں سکتی۔ نتیجہ یہ ہو رہا ہے۔ کہ جہاں ایک طرف مُلک میں بھیک منگوں اور سادھوؤں کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے۔ وہاں دوسری طرف پڑھے لکھے بیکار بابوؤں کی تعداد میں ترقی ہو رہی ہے جنہوں نے سب کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اور یہ بھی اسی شجرِ تعلیم کا ثمر ہے۔

اب ذرا تعلیم کا چوتھا مُدعا لو۔ یعنی اپنے وطن، اہل وطن اور ابنائے جنس کے ممد و مدد گار ثابت ہوں۔ یہ مُدعا ہماری تعلیم کہاں تک پورا کر رہی ہے۔ اس کے ثبوت میں ہندو مسلم، ہندو سکھ، دیہاتی و شہری، زراعت پیشہ و غیر زراعت پیشہ، برہمن و غیر برہمن، اچھوت و غیر اچھوت، ساہوکار و غیر ساہوکار جھگڑے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ کسی جگہ چلے جاؤ۔ اَن پڑھ طبقہ جو پڑھے لکھے لوگوں کے اثر سے باہر ہے۔ ان تنازعات سے بالکل بے خبر ہے۔ ہر جگہ آپس میں بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔ اور پڑھے لکھے جن کا کام بچھڑوں کو ملانا، روٹھوں کو منانا، ٹوٹوں کو جوڑنا، اور پھٹوں کو سینا تھا۔ جن کے ذمے اُن کی تعلیم نے یہ فرض عائد کیا تھا۔ کہ وہ دانوں کو خرمن کی صورت میں لائیں۔ جہاں جہاں ہو سکتا ہے جڑے سروں کو الگ الگ کر رہے ہیں۔ دوستوں میں دشمنی اور عناد بڑھا رہے ہیں۔ اور ایک کو ایک بنا کر (ع)

اکائی ذات میں میری ہزاروں رنگ ہیں پیدا

کے مقولے کو بُرے معنوں میں پیش کر رہے ہیں۔ جہاں کہیں ذرا سا سوراخ پاتے ہیں۔ ایڑی چوٹی تک کا زور لگا کر سوئی کا زور قلم سے پہاڑ بنا کر دکھاتے ہیں۔ اور پہاڑ بھی ایسا جس سے گذرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ یہ سناتنی اور آریہ، کالج و گورکل، شیعہ و سنی، احمدی و غیر احمدی پارٹیاں بنانا اور پھر ان پارٹیوں میں سر پھٹول کرانا اہل قلم کا کام ہے۔ نہ کہ بیچارے غریب اَن پڑھ لوگوں کا۔ کاش یہ تعلیم نہ ہوتی اور یہ افتراق دیکھنے میں نہ آتا۔ علم تو کہتا ہے۔ کہ ؎

تو برائے وصل کردن آمدی

نے برائے فصل کردن آمدی

لیکن ہمارے لکھے پڑھوں نے اس کو یوں بدل دیا ہے۔ کہ ؎

تو برائے فصل کردن آمدی
نے برائے وصل کردن آمدی

مجھے کہا جائیگا۔ کہ جدوجہد اور اختلاف آرائے زندگی کی علامات ہیں۔ بے شک! میں اس راستی کو تسلیم کرتا ہوں بشرطیکہ اختلاف محض اختلاف آرا تک محدود ہو۔ اور اس کی انتہا دوسروں کو صفحہ ہستی سے معدوم کر دینا نہ ہو ہو سکتا ہے کہ اس کا یہ جواب بھی دیا جائے۔ کہ ملک کی اقتصادی حالت نے یہاں تک نوبت پہنچادی ہے۔ اگر اقتصادی حالت آج بدل جائے۔ تو کل سے ان تمام تنازعات کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ بے شک کسی حد تک یہ جواب درست ہے۔ لیکن جیسا کہ میں پیچھے بیان کر آیا ہوں۔ ملک کی اقتصادی حالت کو اس بُرے درجہ تک پہنچانے کی ذمہ واری بھی تو تعلیم پر ہی عاید ہوتی ہے۔ پس بالواسطہ نہ سہی بلاواسطہ ہی سہی ذمہ وار تو ہماری موجودہ تعلیم ہے۔

ممکن ہے کچھ اصحاب وہ چند گنتی کی برگزیدہ ہستیاں بطور مثال پیش کریں۔ جو ثمر تو اسی تعلیم کا ہیں۔ لیکن ان برے وقتوں میں بھی ملک کے نام کو چار چاند لگا رہی ہیں۔ اور جن کی مثال جنگل میں اُگے ہوئے اُس گلاب کے پھول کی سی ہے۔ جو اپنی مہک سے جنگل میں منگل کا سماں پیش کر رہا ہے۔ لیکن میں کہوں گا۔ کہ وہ برگزیدہ ہستیاں فطرت سے طبیعت ہی ایسی لائی ہیں۔ تعلیم کے ملمع کی شاہکاری کا نتیجہ نہیں۔ اور اگر ان کی دیکھ بھال پھلواڑی کے تربیت یافتہ مالی کے ہاتھوں ہوئی۔ تو خدا جانے وہ کیا سے کیا کر دکھائیں۔ اور خود کیا بن جائیں۔

"پھر"

اگر موجودہ تعلیم تعلیم کے اصلی مدعا سے اُلٹ ہو رہی ہے۔ تو کیا تعلیم بند کر دی جائے؟ ہاں! مگر موجودہ تعلیم نہ کہ تعلیم جس کے متعلق شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرما گئے ہیں۔ کہ ؎

بے علم نتواں خدا را شناخت

جس دوائی نے باقی ممالک کی بیماری کا علاج کیا۔ کیا ہندوستان کی سرزمین کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ کہ یہاں آکر اُس کی تاثیر ہی بدل گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ دوائی میں کچھ فرق ہے۔ ورنہ یہاں بھی وہی نتائج پیدا ہوتے جو باقی ممالک میں پیدا ہوئے۔ آبِ حیات جہاں کہیں ہے آبِ حیات ہی ہے۔ نہ کہ ایک جگہ آبِ حیات اور دوسری جگہ زہر ہلاہل ؎

تفاوت کند ہرگز آبِ زلال
گرش کوزہ زریں بود یا سفال

تعلیم کے متعلق میری ذاتی رائے تو یہ ہے۔ کہ ہندوستان باقی مہذب ممالک کی صف میں اُس وقت تک کھڑا ہونے کا اہل ہرگز نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اس کا ایک فرد بھی پڑھنے لکھنے کے فن سے عاری ہے۔ اس لئے

میرے خیالات سے کہیں یہ خیال نہ کر لیا جائے۔ کہ میں اہل ملک کو زمانۂ قبل از تاریخ کی طرف لیجانا چاہتا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ میں تو چاہتا ہوں۔ کہ میرے اہل ملک وہ تعلیم حاصل کریں۔ جو اس زمانے میں دیگر زندہ ممالک کے لوگ حاصل کر رہے ہیں۔ اس قسم کا پیچیدہ نصاب تعلیم امتحانات کی ایسی کڑی پابندیاں ایسا پھیکا اور خشک طرز تعلیم اور ایسے خوامخواہ کے مدرس جو بقول شخصے

"مان نمان میں تیرا مہمان"

فن تعلیم سے کوئی اُنس رکھے بغیر کسی طرف بھی شکم پروری کی راہ نہ پا کر محض پیٹ پالنے کی خاطر محکمہ تعلیم میں آگھسے ہیں۔ کسی اور ملک میں نہ پاؤ گے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ یہ ردّی اور ناکارہ سسٹم جو ہمارے بچوں کو ناکارہ اور نااہل بنا رہا ہے۔ فی الفور بدل دیا جائے۔

سب سے پہلے پرائمری تعلیم کو لو۔ یہ لازمی ہونی چاہیئے۔ اس کا موجودہ سٹینڈرڈ (معیار) بہت گھٹیا ہے۔ بڑھا دینا چاہیئے ہمیں پرائمری تعلیم سے بچوں کو لکھنے پڑھنے کے قابل بنانا ہے۔ تاکہ زندگی بھر وہ جو بھی کام کریں۔ اُس کی ضروریات کیلئے دوسروں کے دست نگر نہ ہوں۔ ہمارے موجودہ پرائمری پاس سکول سے نکل کر ان پڑھ بڑھے ہوئے کہلا سکتے ہیں۔ جن کا شمار نہ خواندہ آدمیوں میں ہو سکتا ہے۔ نہ ناخواندہ آدمیوں میں۔ ایسے نیوٹر جنڈر (Neuter gender ۔۔۔۔۔۔) بھلا کس کام کے؟ اتنا پڑھنے پر اُن کا جو وقت اور روپیہ خرچ آیا۔ اور لوکل باڈیوں کی جو محنت اور لاگت خرچ ہوئی۔ کیا وہ ضایع نہیں گیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ پرائمری تعلیم نہایت گھٹیل ہاتھوں میں ہے۔ ہم کہنے کو تو کہتے ہیں ؎

خشت اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا مے رود دیوار کج

لیکن یہ خشت اول رکھنے کو معمار وہ لاتے ہیں۔ جنہیں نہ تعلیم نہ تربیت اور نہ تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ اس ابتدا پر کس اعلیٰ انتہا کی امید رکھی جا سکتی ہے۔ اس لئے ہمارے کارفرمایان محکمہ تعلیم اگر دل سے ملک کو لکھنے پڑھنے کے قابل بنانا چاہتے ہیں۔ تو انہیں پرائمری تعلیم پر پوری توجہ دینی چاہیئے۔ اس کے لئے۔۔

(۱) پرائمری تعلیم کا انتظام براہِ راست گورنمنٹ کی نگرانی میں ہونا چاہیئے۔

(۲) پرائمری کلاسوں کی تعلیم کیلئے اچھے سے اچھے استاد انتخاب کرنے چاہئیں۔

(۳) پرائمری جماعتیں چار کی بجائے پانچ ہوں۔

(۴) اُن کی تعلیم لکھنا۔ پڑھنا۔ ضروری حساب۔ معمولی ملکی جغرافیہ اور علم الاخلاق تک محدود ہو۔ علم الاخلاق سے مراد اخلاقی کہانیاں اور داب و آداب مجلس وغیرہ ہے۔ جیسا کہ فارسی کی کتابوں اخلاق جلالی یا اخلاق محسنی وغیرہ

کتب میں درج ہے۔

سوال ہو سکتا ہے۔ کہ اس کے لئے روپیہ کہاں سے آئے؟ اس کا جواب بہت آسان ہے جو محکمہ بچوں کی ابتدائی تعلیم اچھی نگرانی میں نہیں کرا سکتا۔ اُسے کیا حق حاصل ہے۔ کہ وسطیٰ، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم پر روپیہ ضایع کر کے ملک میں بیکاروں کی تعداد میں اضافہ کرتا جائے۔ پس جب تک پرائمری تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہو جاتا۔ تمام گورنمنٹ کالج۔ گورنمنٹ ہائی سکول اور گورنمنٹ مڈل سکول بند کر دیئے جائیں۔ مجھے معلوم ہے۔ کہ ایک انٹر میڈیٹ کالج میں جہاں ایک سو پچاس طلبا زیر تعلیم ہیں۔ اس کی عمارت پر چار، پانچ لاکھ روپیہ سے کم خرچ نہ آیا ہوگا۔ اس میں سٹاف کے پندرہ ممبر ہیں۔ جنکی صرف سالانہ تنخواہ پر ۳۰۰۰۰ روپیہ سے زائد خرچ آتا ہے۔ اور اگر باقی اخراجات بھی شامل کر لئے جائیں۔ تو پچاس ہزار سالانہ سے کم خرچ کیا اُٹھتا ہوگا۔ اس میں ۲۵۰۰۰ روپیہ عمارت کی رقم کا شامل کر و۔ تو صرف ۱۵۰ طلبہ کو نا مکمل تعلیم دینے پر ۷۵۰۰۰ روپیہ سالانہ خرچ ہوا۔ گویا فی طالب علم ۵۰۰ روپیہ گورنمنٹ نے دیا۔ کیا پرائمری تعلیم پر اس کا سواں حصہ بھی خرچ ہوتا ہے۔ بہت سے پرائیویٹ کالج اور ہائی سکول و مڈل سکول کھل چکے ہیں۔ اُن پر گورنمنٹ کی پوری نگرانی ہے۔ اس لئے وسطیٰ، ثانوی اور اعلےٰ تعلیم کا کام ایسے سکولوں اور کالجوں پر چھوڑ دیا جائے۔ اور پرائمری تعلیم کا کام گورنمنٹ اپنے ذمہ لے۔ خرچ کا سوال فوراً حل ہو جائے گا۔

پرائمری تعلیم کے بعد وسطیٰ مدارس کا نصاب تعلیم دو حصوں میں بٹ جانا چاہیئے۔ ورنیکلر و اینگلو ورنیکلر گو ایسا اب بھی ہے۔ لیکن وہ نا مکمل ہے۔ چونکہ ہندوستان ایک زرعی ملک ہے۔ اور اس کی آبادی کا ایک بڑا جزو زراعت کے کام میں کھپ سکتا ہے۔ اس لئے ہر تحصیل میں صرف دو ورنیکلر مڈل ہوں۔ جن کے ساتھ زراعتی فارم ہوں اور ایسے سکول صرف فن زراعت و باغبانی کی تعلیم کو ہی اپنا منتہائے مقصود جانیں۔ اور تعلیم کتابی نہیں۔ بلکہ عملی ہونی چاہیئے زراعت اور باغبانی کے تمام تجربات لڑکوں سے کرائے جائیں۔ اور ملکی پیداوار کو بہتر اور زیادہ کرنے کے طریقے سکھا کر عمدہ کسان اور کاشتکار پیدا کئے جائیں۔ بدقسمتی سے مُلک میں یہ خیال دن بدن عام ہوتا جارہا ہے۔ کہ زراعت کوئی منافع کا پیشہ نہیں۔ اس لئے وہ لوگ بھی جو زراعت کا کام کر سکتے ہیں۔ اس کام کو چھوڑ کر ملازمت کی جانب جھکتے جا رہے ہیں۔ اور یہ اس مُلک کے حق میں نیک فال نہیں ضرورت ہے کہ اس رحجان کو بدلنے کیلئے عملی قدم اٹھایا جائے۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ ورنیکلر مڈل سکول زراعتی سکول بنا دیئے جائیں۔ تو اس سے میرا یہ مطلب نہیں۔ کہ وہاں سوائے زراعت کے اور مضامین کی تعلیم دی ہی نہ جائے بلکہ یہ مطلب ہے کہ زراعت پر سب سے زیادہ توجہ دی جائے۔ اور باقی مضامین زباندانی، ریاضی، تاریخ و جغرافیہ اور ابتدائی سائنس رکھے جائیں۔ لیکن اسی حد تک

کہ زراعت کی تعلیم میں ہارج ہونے کی جگہ اُس کے ممد ثابت ہوں۔ ان سکولوں سے جو لڑکے خاص قابلیت کے نکلیں۔ اُنہیں فن زراعت کی مزید تعلیم دیجائے اور مزید تجربات کیلئے اعلیٰ قسم کے کالج میں بھیجا جائے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آخر تک اُن کی تعلیم ورنیکلر زبان میں ہو۔ انگریزی یا فرانسیسی یا کوئی اور زبان بھی ساتھ کے ساتھ پڑھائی جائے۔ تاکہ طلبا فارغ التحصیل ہو کر اس فن کی لکھی گئی کتابوں سے بھی مستفیض ہو سکیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مختلف علاقوں میں انہیں صرف زرعی تجربات کے فارموں میں لگایا جائے۔ اور اُن کے ذمہ یہ فرض بھی عاید کیا جائے کہ نواحی علاقہ کے کاشتکاروں کی تربیت بھی کریں۔

اینگلو ورنیکلر سکولوں میں انگریزی بطور دوسری زبان کے پڑھائی جائے۔ نہ کہ بطور ذریعۂ تعلیم کے۔ ہر سکول۔ زباندانی۔ ریاضی۔ تاریخ وجغرافیہ اور سائینس کی ابتدائی تعلیم کے ساتھ ایک صنعت لازمی طور پر سکھائے۔ مثلاً تحصیل میں ایک سکول اگر رنگ سازی کی تعلیم اپنے نصاب میں داخل کرتا ہے۔ تو دوسرا فن دباغت۔ تیسرا صابون سازی۔ چوتھا نجّاری۔ پانچواں پنسل سازی۔ کاغذ سازی۔ دیا سلائی بنانا۔ غرضیکہ سینکڑوں صنعتوں میں سے کوئی ایک صنعت لے لے۔ لیکن یہ ضرور ہو۔ کہ تحصیل میں جو صنعت ایک سکول لیتا ہے۔ وہ دوسرا نہ لے۔

یہی تقسیم ہائی سکولوں پر عاید کی جائے۔ ضلع بھر میں صرف ایک سکول ہو۔ جو صرف کلرک پیدا کرنے کو مقرر کیا جائے اور اس میں بھی داخلہ محدود ہو۔ جہاں لڑکوں کو خط وکتابت، شارٹ ہینڈ، ٹائپ رائیٹنگ۔ بک کیپنگ وغیرہ وغیرہ کمرشل مضامین کی تعلیم دیجائے۔

اعلیٰ تعلیم کیلئے جیسا کہ دوسرے ممالک میں پایا جاتا ہے۔ ایک یونیورسٹی کے ماتحت ایک قسم کی تعلیم دینے کو ایک ہی کالج ہو۔ ہاں موقعہ اور محل کے مطابق یونیورسٹی اپنے ساتھ ان کالجوں کا الحاق کرتی جائے۔ جو کوئی خاص مدعا کو لے کر جاری ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک کالج اگر سائینس کی اعلیٰ تعلیم دینے کو کھُلتا ہے۔ تو اُس میں وہی لڑکے داخل ہوں۔ جو سائینس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ دوسرا کالج سنسکرت کی اعلیٰ تعلیم کیلئے ہو۔ تیسرا عربی کیلئے۔ چوتھا طِب کیلئے۔ پانچواں انجنیری کیلئے۔ چھٹا قانون کیلئے۔ ساتواں علم طبقات الارض کیلئے۔ آٹھواں ہیلتھ کیلئے۔ غرضیکہ کالج تو جتنے ہیں اسی قدر بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوں۔ لیکن ہر کالج کا منتہائے مقصود ایک خاص قسم کی تعلیم میں ماہر پیدا کرنا ہو۔ اور پنجاب بھر میں جتنے کاروباری محکمے ہیں۔ سب اپنی بھرتی یونیورسٹی کی معرفت لیں۔ اس سے فرقہ داری کے جھگڑے اُٹھ جائیں گے۔ نوجوانوں کو کام مل جائیگا۔ اور مُلک میں بے چینی اور بدامنی کی جو تباہ کن لہر پھیل رہی ہے۔ بند ہو جائیگی۔ لیکن کیا کوئی اس طرف توجہ دیگا؟ افسوس کہ ہمارے ملک کی قسمت میں ابھی یہ وقت نہیں آیا۔ اسلئے بقول

مانو نہ مانو جان جہاں اختیار ہے　　ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

مَیں اپنا فرض ادا کر دیتا ہوں۔ اس کا کسی پر اثر ہو یا نہ ہو اس سے مجھے سروکار نہیں۔ کیونکہ ما بر رسولاں بلاغ باشد و بس

——(·)——×——(·)——

ہمارے امتحانات

(سید اشفاق حسین صاحب۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ہیڈ ماسٹر)

اہمیّت

یوں تو دنیا ہی من اوّلہ الیٰ آخرہٖ ایک نامتناہی سلسلۂ امتحانات ہے۔ مگر تعلیمی دنیا کی چہل پہل تو تمام وکمال اسی پر منحصر ہے۔ معلّم ہو یا متعلم۔ مدارس کے مینجر ہوں یا طلبا کے والدین۔ ملازم ہوں یا ملازم رکھنے والے۔ سب کی نظریں اسی سراب پر جمی ہوئی ہیں۔

ہمارے امتحانات سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے

آپ کہیں گے کہ امتحان سی حقیقی شے کو سراب کی سی بے حقیقت اور نظر فریب شے سے تعبیر کرنا کسقدر لغو اور لایعنی ہے۔ لیکن ذرا آپ اپنی حقیقت اس نگاہ پر غور وفکر کی دوربین لگایئے اور سطحی اُمور سے آگے چلئے تو آپ کو واضح ہو جائیگا۔ کہ میں قابل معافی ہوں۔ ذیل کے چند واقعات کو مشتے نمونہ از خروارے تصور فرما کر اُن کی روشنی میں ہمارے امتحانات کی بے حقیقتی اور یکطرفہ پن کو ملاحظہ فرمائیں ساتھ ہی اس کو مدنظر رکھیں۔ کہ یہ مضحکہ خیز واقعات اُن اقوام وممالک کی تعلیمی دنیا کے ہیں۔ جو نہ صرف ہم سے تعلیم میں صدیوں آگے ہیں۔ بلکہ دور حاضرہ میں صحیح صحیح معنوں میں ہمارے معلّم ہیں۔ اور جب اُن ایمۂ تعلیم کی یہ حالت ہے۔ تو ہم جو اُن کے نام نہاد مقتدی ہیں کہاں ہوں گے۔ اس کا اندازہ آپ خود لگائیں۔

موجودہ امتحانات ذاتی قابلیّت کے صحیح معیار نہیں

امتحانات کو عموماً طلبا کی علمی استعداد ماپنے کا فیتہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے۔ کہ نہایت ہی غیر صحیح آلے ثابت ہو رہے ہیں۔ اہم اس سے کہ یہ یونیورسٹیوں کے بیرونی امتحانات ہوں یا مدرسوں

اور کالجوں کے اندرونی ۔

اگر ایک لڑکے کے قد کو ماپا جائے ۔ اور دو مختلف اشخاص اس کام کو سرانجام دیں ۔ اور اُن میں ایک اُسے اڑتیس انچ اور دوسرا اُسے اٹھاون انچ بتائے تو ہم اُسے نہایت ہی مضحکہ انگیز خیال کریں گے اور یقینی طور پر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرینگے کہ ان دونوں میں سے کس نے اس زبردست حماقت کا ارتکاب کیا ہے ۔ لیکن کس قدر حسرتناک اور عبرت خیز بات ہے کہ ہم اپنے نونہالان وطن کی علمی استعداد کے ماپنے میں اس سے کہیں زیادہ مجرمانہ حماقتوں اور فحش خطرناک اور دور رس غلطیوں کا شب و روز ارتکاب کرتے ہیں ۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ کا ایک تجربہ

امریکہ کی ریاستہائے متحدہ میں ایک ماہر تعلیم نے ایک امتحانی پرچے (جیومیٹری کا پرچہ تھا) کی چند نقول چربہ اُتار کر کئی بڑے بڑے ہائی سکولوں کے نامی اساتذہ کے پاس ایک ایک کاپی نمبر لگانے کیلئے بھیجدی ۔ کم سے کم جو نمبر دیئے گئے ۲۸ تھے اور زیادہ سے زیادہ ۹۲ - دو اساتذہ نے ۹۰ سے اوپر اُنیس نے ۸۱ اور ۹۰ کے درمیان ۔ چالیس نے ۷۱ اور ۸۰ کے درمیان پینتیس نے ۶۱ اور ۷۰ کے درمیان ۔ چودہ نے ۵۱ اور ۶۰ کے درمیان اور چھ نے ۵۱ سے کم ۔

ایک اور مضحکہ انگیز واقعہ

ایک ہیڈ اگزامینر صاحب نے جو حد درجہ اپنی ضمیر کے پابند اور عدل و انصاف قایم رکھنے کی کوشش کرتے تھے ۔ ایک مرتبہ اپنی ضمیر کی طمانیت کیلئے ایک موڈل پیپر بطور جواب خود لکھا اور اس کی متعدد کاپیاں ایک ہی قلم سے نقل کرا کر نائب ممتحنین کو اس غرض سے بھجوائیں کہ اس کو معیار سمجھکر نمبر لگائے جائیں ۔ غلطی سے ملازم نے اُس کی ہدایات پر عمل نہ کیا اور وہ موڈل یعنی نمونہ کے پرچے امیدواروں کے پرچوں کے ساتھ مل گئے ۔ اکثر اصحاب نے اُس پرچے کے لکھنے والے کو فیل کر دیا ۔ اور باقیوں نے ۴۰ سے ۸۰ تک مختلف نمبر دیئے ۔

برطانیہ کے ایک مدرسہ کا تجربہ

ایک برطانوی درسگاہ میں ایک عنوان مضمون نویسی کے لئے مقرر کیا گیا ۔ اور سات طلبا نے اس پر طبع آزمائی کی ایک ممتحن نے اُن پر نمبر لگائے ۔ تو چالیس ۴۰ سے نوے ۹۰ تک مختلف نمبر دیئے ۔ ازاں بعد یہ ساتوں پرچے تیرہ تجربہ کار اور کہنہ مشق ہیڈ ماسٹروں کے پاس اس غرض سے بھیجے گئے کہ وہ اُن کی جانچ کرنیکے بعد قابلیت کے لحاظ

سے ترتیب وار لگائیں۔ آپ پڑھکر ہنسینگے کہ ہر مضمون نویس اول دوم سوم چہارم پنجم ششم اور ہفتم نمبر پر رہا۔

ایک انگریزی کالج کے پرنسپل صاحب کا واقعہ

ایک پرنسپل صاحب کی زیر ہدایت دو طالب علم مضمون نویسی کیا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک انگریز تھا اور دوسرا ویلز کا رہنے والا۔ پرنسپل صاحب انگلستانی طالب علم کے پرچہ پر تو "بہت اچھا" اور ویلز والے کے پرچے پر "خاصہ" کا حاشیہ چڑھایا کرتے تھے۔ گو ان دونوں کے مضامین میں انیس بیس کا فرق بھی نہ ہوتا تھا۔ ایک دن دونوں طالب علموں کو شرارت سوجھی اور پرنسپل صاحب کی جانچ کی ٹھان لی۔ دونوں نے مضامین لکھکر آپس میں بدل لئے اور تبدیل شدہ مضامین پر اپنے اپنے نام لکھکر پرنسپل صاحب کی میز پر رکھ دیئے۔ لیکن جب کاپیاں واپس آئیں تو انگریز کا نام لکھے ہوئے پرچے پر "نہایت ہی عمدہ" اور دوسرے پر "خاصہ" کا نوٹ چڑھا ہوا تھا۔

اس قسم کے واقعات النّادر کالمعدوم نہیں بلکہ روزانہ رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں آپ خود ہی اندازہ فرمائیں۔ کہ ہمارے امتحانات کا یہ سلسلہ واقعی ایک حقیقت ہے یا ایک سراب۔

امتحانات کو یکقلم خیرباد نہیں کہا جا سکتا

امتحانات سراب سہی۔ یکطرفہ سہی۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا اس سلسلہ کو یکقلم بند کر دیا جا سکتا ہے؟ اُن کے خلاف کتنا ہی کہا جائے۔ لیکن اس حقیقت سے ابھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ہیں نہایت ضروری انکی ضرورت اور اہمیت ایسی ہرگز نہیں کہ اس کو نظر انداز کیا جا سکے۔ ماہرین تعلیم کا متفقہ فتویٰ ہے۔ کہ ایک معقول اور منظم سلسلۂ امتحانات ایک ایسا معیار ہے جس پر پورا اترنا طلبا کی جد و جہد کا ایک مقصد عظمیٰ ہے۔ اور فی الحقیقت ایک میعاد مقررہ تک سکول اور کالج کی چار دیواری میں رہ کر کام کرنے کی ایک زبردست تحریک

امتحانات کی کیوں ضرورت ہے؟

اس سلسلہ کی ضرورت کا نفساتی پہلو یہ ہے کہ ملازم رکھنے والا یہ معلوم کرنا چاہتا ہے۔ کہ جس کو وہ ملازم رکھنے والا ہے۔ اور جس مقصد کے واسطے وہ اس کو لے رہا ہے اُس میں کس حد تک اپنے فرائض کی بجا آوری کی اہلیت موجود ہے۔ اور وہ اس کے مقصد کو کہاں تک پورا کر سکتا ہے۔

متعلمین کے زاویۂ نگاہ سے

خود متعلمین محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے ایک خاص مدت تک مدرسہ کی چار دیواری میں محبوس رہ کر محنت کی ہے اور اپنی عمر گرانمایہ کا ایک معتدبہ حصہ صرف کیا ہے۔ والدین کا گاڑھی کمائی کا روپیہ خرچ کیا ہے۔ طبیعت کے خلاف اساتذہ کی جھڑکیاں اور چھڑیاں کھائی ہیں۔ اب ہم جب مدرسہ سے باہر نکل رہے ہیں۔ تو دنیا والے پوچھیں گے۔ کہ اتنا عرصہ کیا کیا۔ کیا قابلیت پیدا کی؟ اسلئے ضروری ہے کہ ہمارے پاس دنیا والوں کے سامنے پیش کرنے کے واسطے کوئی نہ کوئی شہادت ہو اور یہ شہادت وہ سرٹیفکیٹ ہے۔ جو درسگاہ چھوڑنے وقت اس مدرسہ کا صدر عنایت کرتا ہے۔

سب مدارس کے سرٹیفکیٹ یکساں طور پر وقیع نہیں ہو سکتے

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ سارے پبلک مدارس گو وہ ایک ہی معیار اور ایک ہی نوعیت کے ہوں یکساں طور پر وقیع نہیں ہو سکتے۔ کسی درسگاہ کی شہرت اچھی ہوتی ہے کسی کی بری۔ ایک مدرسہ نیکنام ہوتا ہے دوسرا بدنام اس بنا پر ممکن ہے۔ نہیں بلکہ اغلب اور یقینی ہے۔ کہ ایک مدرسہ کے صدر اور اساتذہ کا دیا ہوا سرٹیفکیٹ تو پبلک میں قابل قبول سمجھا جائے۔ اور اسی قسم کے دوسرے مدرسہ کے ہیڈ (جو خواہ انہی اسناد کا حامل ہو یا اُس سے بھی اعلیٰ اعلیٰ ڈگریاں حاصل کئے ہوئے ہو) کے سرٹیفکیٹ کو ردی کی ٹوکری کے لائق تصور کیا جائے۔

اندریں حالات ضرورت پیش آتی ہے۔ کسی بیرونی جماعت کی۔ جو ایک عام امتحان منعقد کر کے اسناد عطا کرے۔

اعلیٰ درسگاہوں کے ذمہ وار اساتذہ کے نقطۂ نظر سے

اعلیٰ ادبی علمی اور صنعتی درسگاہوں میں ضروری ہے کہ صرف وہ طلبا داخل کئے جائیں جو ایک خاص معیار پر پورے اترتے ہوں۔ تاکہ وہاں کی تعلیم و تربیت سے وہ کما حقہٗ متمتع ہو سکیں اگر داخل ہونے والے ایک معیار کے نہ ہونگے تو اُسی درسگاہ کے معلموں کا وقت اور ان کی محنت بیکار ثابت ہوگی۔ اور داخل شدہ امیدواروں میں سے اُن کا جو وہاں کی تعلیم و تربیت سے فائدہ اٹھانیکے اہل نہیں ہیں۔ وقت اور روپے کا خون ہوگا۔ اور وہ درس گاہ اُس مقصد کو پورا کرنے میں قاصر رہیگی۔ جو اس کے اجرا سے ہے محض اسلئے کہ نا اہل طلبا سب کے ساتھ نہ چل سکینگے اور لائق اور قابل طلبا کیلئے بھی سنگِ راہ ثابت ہوں گے۔ اس لئے بھی ضروری ہے۔ کہ امتحانات منعقد کئے جائیں۔

طلبا اپنی قابلیت کا اندازہ لگا سکیں

ایک امر اور بھی ہے کہ جو امتحانات کی ضرورت پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ طلبا اندازہ لگا سکیں۔ کہ اُن کی علمیت اور ذاتی قابلیت میں کیا اضافہ ہوا ہے نیز یہ کہ وہ اپنے آپ کو انہی نظروں سے دیکھ سکیں۔ جن سے کہ لوگ انہیں دیکھتے ہیں۔ طلبا مختلف المزاج ہوتے ہیں۔ بعض کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ لایق سمجھتے ہیں اور ایک ایسی تباہ کن غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جو یقیناً آخر میں لاعلاج ہو جاتی ہے اسلئے کہ ؎

آنکس کہ نداند و بداند کہ بداند
در جہل مرکب ابدالدھر بماند

اسلئے بھی امتحانات ضروری ہیں کہ طالب علم اپنی قابلیت کے متعلق صحیح صحیح اندازہ لگائیں۔ اور اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی تباہی خیز غلطی کا ارتکاب نہ کرے۔

بعض طلبا اپنی قابلیت کا اندازہ لگانے میں کمی کی طرف غلطی کرتے ہیں۔ اس صورت میں امتحانات یہ فائدہ دیتے ہیں۔ کہ جو طلبا اپنے آپ کو ناکارہ سمجھتے ہیں۔ اُن کے اس غلط خیال کو اُن کے دل سے محو کر کے انہیں آمادۂ کار کرتے ہیں۔

اساتذہ اپنی کارکردگی کی جانچ پڑتال کر سکتے ہیں

اساتذہ کیلئے بھی اس باب میں امتحانات نہایت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ امتحان کے نتائج کی بنا پر وہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ علمی مسائل طلبا کے ذہن نشین کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔ کوئی غلط فہمی تو طلبا کو اس مسئلہ میں نہیں ہوئی۔ انکی روشنی میں طریقۂ تعلیم کو بہتر سے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

باہمی مقابلہ اور رشک

ایک اور غرض جو حامیان سلسلہ اس سے پوری ہونے کے مدعی ہیں وہ یہ ہے کہ طلبا میں باہمی مقابلہ کے خیال سے رشک پیدا ہوتا ہے۔ جو علمی ترقی اور آمادۂ کار کرنے کا ایک بڑا کفیل ہے۔ رشک کا مادہ ہماری فطرت کی گہرائیوں میں مرکوز ہے اور ذرا سی تحریک سے یہ کام کرنے لگتا ہے۔ اسلئے جب امتحان کا نام سنتے ہیں۔ تو رات کو لیمپ کی روشنی میں داؤ پیچ سے تیار ہو کر امتحان کے اکھاڑہ میں خم ٹھوک کر آتے ہیں۔ عموماً علم

اشتعال نائرۂ رشک میں کافی سے زیادہ منہمک ہیں۔ لیکن یہ ہے نہایت حزم و احتیاط کا مقتضی اور اسی وجہ سے جب طلبا کے دلوں میں ایک دوسرے سے گوئے سبقت لیجانے کا مادہ نہایت زوروں سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ محض اس بنا پر میدان کارزار میں آکر مصروف کار ہوتے ہیں۔ تو اخلاق کا معلم دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھے ہوئے کنکھیوں سے اُن کو دیکھتا رہتا ہے۔

آیا امتحانات خود اعتباری کا مادہ طلبا میں پیدا کرتے ہیں؟

قدیم اساتذۂ فن تعلیم کا خیال تھا۔ کہ امتحانات طلبا میں خود اعتباری کا ملکہ پیدا کرتے ہیں وہ اس بات میں اُن کی تربیت کرتے ہیں۔ کہ وہ نازک مواقع اور مخاطر و مہالک میں حواس باختہ نہ ہو کر سکون اور دلجمی سے کام کریں اُن کا مطلب یہ ہے کہ جو طالب علم امتحان کے کمرہ میں گھبراتا نہیں۔ اور اطمینان سے اپنے خیالات کو صفحۂ قرطاس پر الفاظ میں منتقل کرتا چلا جاتا ہے۔ بالفرض آتش زدگی کے موقعہ پر بھی نہایت سکون سے کام کر سکیگا۔ اور بالکل اسی طرح جیسے کہ وہ ممتحن کے سامنے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بے محابا اپنے خیالات کا اظہار کر جاتا ہے اور بالکل اُس کا دل نہیں دھڑکتا۔ زبان لکنت نہیں کرتی۔ ایسے خطرہ کے موقعہ پر بھی اس کے قدم نہ ڈگمگائینگے۔ جس طرح وُہ اپنے خیالات کی رَو میں ٹھیک مقام مقصود تک جا پہنچتا ہے۔ ویسے ہی وہ دریا کی دھار کے خلاف تیرتا ہوا اور آنحالیکہ اس کا دم بھی ٹوٹ جانے کے قریب ہو۔ وہ صبر و سکون سے کنارے جا لگیگا۔ یا کشتی کے اُلٹ جانے کے وقت حوصلہ نہ ہاریگا۔

علاوہ اس کے کہ روزانہ صدہا نہیں ہزارہا واقعات اس خیال کی تغلیط کرتے ہیں۔ نفسیات کا وُہ مسئلہ جو اس کی بنیاد ہے۔ مردود و متروک قرار دیا جا چکا ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ جس شخص میں خود اعتباری کا مادہ پہلے سے موجود ہو۔ اُور اس کی مناسب تربیت بھی کی جائے۔ وہ جس طرح کہ امتحان گاہ میں حواس باختہ نہ ہو کر دنیا کے حوادث میں بھی دلجمی قائم رکھ سکے۔ لیکن یہ کہنا کہ چونکہ ایک طالب علم امتحان کے ہال میں اطمینان اور سکون سے کام کرتا ہے محض اسی وجہ سے وہ امتحان گاہ دنیا میں بھی حادثات اور نازک مواقع پر بھی ہمت نہ ہاریگا۔ اور حوصلہ کو ہاتھ سے نہ دیگا۔ مبالغہ سے خالی نہیں۔

مندرجۂ بالا اغراض و مقاصد ہرگز ایسے نہیں جو امتحانات کو لابدی اور ضروری قرار نہ دیتے ہوں اسلئے یہ لازم ہوا کہ جو نقائص اور خرابیاں ہمارے نظام امتحانات میں ہیں۔ اُن کو رفع کرنے کی کوشش کی جائے۔

امتحانات کو ضرورت سے زیادہ اہمیّت دیجاتی ہے

جملہ خرابیوں کی جڑ یہ خیال ہے کہ امتحان کی کامیابی اصل مقصد تعلیم و تعلم ہے۔ اصل الاصول یہ ہے کہ امتحان اس مقصد کے حصول کا ایک وسیلہ ہے۔ (منجملہ ایک سو ایک دیگر وسائل کے) جو تعلیم کا ہونا چاہیئے۔ اور فی نفسہٖ وہ مقصد تعلیم نہیں ہے۔

ہمارے اساتذہ و تلامذہ اسی غلط فہمی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ کہ کام ہی اس وجہ سے کیا جائے کہ امتحان میں کامیابی حاصل ہو۔ نہ کہ امتحان اسلئے ہے کہ کام بوجہ احسن انجام پائے۔

اس خطرناک غلط فہمی کے شکار نہ صرف اساتذہ و طلبا ہی ہو رہے ہیں بلکہ اگر نظر غائر سے دیکھا جائے۔ تو تمام دنیا ہی اس میں مبتلا ہے۔ دفاتر کے نگران۔ محکموں کے اعلیٰ افسر اور فرموں کے منیجر وغیرہ وغیرہ امتحان کی کامیابی کو ہی واحد معیار قابلیت سمجھے بیٹھے ہیں۔

امتحانات طلبا کے چال چلن کے متعلق کچھ نہیں بتاتے

اس میں کوئی شک نہیں کہ سرٹیفکیٹ کوئی شے ہے اور اس کا حامل اسکی ایک خاص حد تک وقیع ہے۔ لیکن یہ امر کہ چونکہ حامل سند ہذا نے انگریزی۔ ریاضی۔ اُردو۔ فارسی۔ سائنس۔ اور علوم عامہ میں چالیس فیصدی سے لے کر نوے فیصدی تک نمبر حاصل کیے ہیں۔ اسلئے ضروری ہے کہ یہ عملی زندگی میں بھی خاطر خواہ اپنے مفوضہ فرائض کی بجا آوری کر سکیگا۔ قابل قبول نہیں۔ ہمیں صرف اس کی ضرورت نہیں کہ سند یافتہ امیدوار کیا کیا جانتا ہے؟ بلکہ بڑی ضرورت اس کی ہے کہ ممتحن یہ بتائیں کہ وہ کیا کیا کر سکتا ہے؟

ممتحن یہ نہیں بتا سکتے کہ آیا اُن کا امیدوار صادق القول اور متدین ہے۔ یا نہیں؟ اس میں مستقل مزاجی عالی حوصلگی۔ اور وفاداری وغیرہ صفات موجود ہیں کہ نہیں آیا اُس میں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ملکر کام کرنے کی قابلیت پائی جاتی ہے کہ نہیں۔ تاریخ میں اعلیٰ نمبر حاصل کرنا اس امر کا ثبوت نہیں۔ کہ دیگر اشخاص کے رویہ اور چال چلن اور عادات و خصائل کے متعلق اُس کا اندازہ صحیح بھی ہے۔ علم ہندسہ میں امتحانی کامیابی حاصل کرنے والیکے متعلق یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ کہ عملی زندگی میں بھی اُس کا اندازہ اتنا ہی نپا تلا ہوگا۔

رسکن کا کیا اچھا مقولہ ہے کہ تعلیم کا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ طلبا کو جن اشیا کا علم نہ ہو اُن کا علم اُسے حاصل ہو جائے۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ جو رویہ۔ جو سلوک۔ ان کا خدا کی دیگر مخلوق کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ وہی ہو بھی اور اُنہیں معلوم بھی ہو کہ اُن کا اس باب میں کیا فرض ہے؟

امتحانات اصل ذاتی قابلیت کی جانچ نہیں ہیں

اخلاق کی جانچ تو ہمارا موجودہ نظام امتحانات اصلا نہیں کرتا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ ذہنی اور دماغی قابلیت کا کس حد تک اُن سے پتہ چلتا ہے۔ یہ مسلم بات ہے۔ کہ طالب علم کی اصل قابلیت ہے۔ کہ جو کچھ اُس نے مدرسہ کی چار دیواری میں تحصیل کیا ہے اس کو وہ کہاں تک استعمال میں لاسکتا ہے۔ بڑے بوڑھوں میں ایک مقولہ رائج ہے۔ کہ فلاں شخص پڑھ تو گیا۔ لیکن وہ گُنا نہیں۔ ان کا مطلب "گننے" سے یہ ہوتا ہے کہ اس کو محض کتابی علم ہے لیکن اس کو وہ اپنے کسی مصرف میں نہیں لاسکتا اور اسی کو شیخ شیراز "چار پائے بر و کتابے چند" سے تعبیر کرتے ہیں۔

امتحان میں صرف حافظہ کی پوچھ ہے

موجودہ نظام امتحانات سے تعلق رکھنے والے جانتے ہیں۔ کہ واقعی ہمارے امتحانات اسی قسم کے ہیں۔ کہ اُنکی تیاری کرنے والے طلبا صرف 'پڑھیں' اور 'گُنیں' نہیں۔ ہمارے امتحانات اور ممتحنین پر یہ مثل بالکل صادق آتی ہے۔ "گویا اُن کا یہ مقصد ہے کہ بھیڑوں کو گھاس وغیرہ کھلانے کے بعد اُن سے گڈریا یہ توقع رکھے کہ وہ بجنسہ وہی گھاس جو انہوں نے چری چگی تھی اُسے دیں۔ بجائے اس کے کہ وہ اسکے بدلہ میں اُون اور دودھ کی ایسی بیش بہا نعمتوں سے اس کو مالا مال کریں"۔

بالکل یہی حال ہمارے ممتحنین کا ہے۔ وہ صرف یہ چاہتے ہیں۔ کہ جو کچھ مدرسہ میں طلبا نے پڑھا ہے۔ کمرہ امتحانات میں وہ اُس کو کاغذ پر اُگل دیں۔ قوائے ذہنیہ کی تربیت یا قوائے آخذہ ستدلالیہ کی تکمیل ہرگز ہرگز ان کا مقصد نہیں ہوتا۔ اُن کا مقصد محض قوت حافظہ کی جانچ ہوتا ہے اور بس۔

ایک مثال

مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائیں۔ کہ ایک ہی جماعت کے دو طلبا شریک امتحان ہوتے ہیں۔ اُن میں ایک نہایت ہی طباع ذکی اور محنتی ہے۔ لیکن دوسرا قابلیت اور لیاقت میں اس کا پاسنگ بھی نہیں۔ ہاں صرف اتنا ضرور ہے۔ کہ وہ گر پڑ کر جماعت کے ساتھ چل رہا ہے۔ اتفاقاً ایک دن اول الذکر بوجہ بیماری مدرسے سے غیر حاضر رہنے پر مجبور ہوا۔ اور اس روز اُستاد نے جماعت میں اکبر کی پالیسی پر سبق پڑھایا اور موخر الذکر نے اس محض سُنکر اور نوٹ لیکر خوب یاد کر لیا۔ اور کوشش یہ کی کہ جہاں تک ممکن ہو اُستاد ہی کے الفاظ اور خیالات کو قلمبند کر کے دماغ میں مستحضر رکھے۔ لیکن غیر حاضر طالب علم نے سبق کا عنوان معلوم کر کے دو چار تواریخ کی کتابوں سے

اخذ کر کے اپنے ذاتی خیالات اور رائے اکبر کی پالیسی کے متعلق اپنے الفاظ میں قلمبند کی ۔

دوسرا اتفاق یہ ہوا کہ یہی سوال امتحان میں پوچھا گیا ۔ اور دونو نے اس کا جواب دیا ....

لیکن نتیجہ کیا ہوتا ہے کہ اس طالب علم کو نمبر کم ملینگے ۔ جس نے وسعت مطالعہ ۔ دماغی کاوش ۔ اور قوت استدلال سے کام لیکر تاریخی واقعات سے نتائج اخذ کئے تھے ۔ اور وہ طالب علم کہ جس نے محض اُستاد کے الفاظ اور خیالات کو رٹ لیا تھا ۔ اُس سے بڑھ جائیگا ۔

تھرنگ کی رائے

مشہور ماہر تعلیم Thring اس مضمون پر رقمطراز ہے کہ " طلبا امتحان میں محض آتشبازیاں چھوڑاتے ہیں ۔ جو دوسروں نے اُن کو تیار کر کے دیدی ہیں ۔ اور محض حافظہ سے کام لیتے ہیں ۔ امتحان میں کسی مضمون کی اہمیت اس امر سے سمجھنی چاہیئے ۔ کہ وہ طلبا کے قوائے دماغی کی کہاں تک جانچ کرتا ہے ۔ مدرسہ کا مطلب طلباء کی تربیت ہوتا ہے ۔ اسلئے امتحانات کا مقصد بھی یہی ہونا چاہیئے ۔ کہ وہ اُس تربیت کی جانچ کریں جو مدرسہ کی چار دیواری میں طالب علم کو ملی ہے ۔ ضمناً یہ مقصد بھی ہوتا ہے ۔ کہ طلبا کو کام کرنے کی تحریک ہو اور اساتذہ اندازہ لگا سکیں کہ ان کی سعی صواب کی جانب ہے یا نہ ؟ "

اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے امتحانات زیادہ تر حافظہ کی جانچ کرتے ہیں ۔ اور طلبا کو مجبور کرتے ہیں ۔ کہ وہ سوچنے اور سمجھنے کی جگہ طوطے کی طرح مضامین کی رٹ لگائیں ۔ طلبا بھی اُس کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ جن امتحانات میں وہ شریک ہوتے ہیں ۔ ان کی اصلیت کیا ہے ۔ اس لئے وہ بھی ممتحنین کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں ۔ وہ صرف وہ مقامات رٹ لیتے ہیں ۔ جنکے امتحان میں پوچھے جانیکی امید زیادہ ہوتی ہے ۔ سالہائے گذشتہ کے پرچوں کو سامنے رکھکر وہ اندازہ لگاتے ہیں کہ کس قسم کے سوالات امتحانات میں اغلب ہیں ۔

زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ ہم اساتذہ بھی طلبا کو اس "جوئے" میں امداد دیتے ہیں ۔ ہم طلبا کو "مشہور مقامات" پر نشان لگواتے ہیں ۔ اُنکو رٹواتے ہیں اور بس ۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر طلبا ہر سال امتحان کے کمرہ میں سے سر پیٹتے نکلتے ہیں کہ "ٹائپ ہی پرچہ کا نیا تھا" "سوال ہی بالکل نئی طرح کے تھے "

ہوتا کیا ہے کہ جب دو چار سال ایک ڈگر پر چلتے چلتے ممتحنین کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے ۔ کہ اب طلبا کے جواب سے یہ معلوم ہو رہا ہے ۔ کہ وہ صرف اُن مقامات یا اُس طرز کے سوالات کو رٹتے ہیں ۔ جو سالہائے گذشتہ میں پوچھے جاتے رہے ہیں ۔ تو وُہ اپنے طرز کو بدل دیتے ہیں

تعلیم کے نئے نظریے اور جدید طرقِ تعلیم

نتائج امتحان کی ذمہ داری اساتذہ پر ایک اور بُرا اثر ڈال رہی ہے جس کی وجہ سے ہماری ترقی تعلیم کی رفتار مسدود ہے۔ محکمہ مدارس کو امداد دیتے وقت یہ ضرور پوچھتا ہے۔ کہ نتیجہ فیصدی کیا رہا؟ مزید براں افسران معائنہ کے امتحان اور معائنہ کا خوف اس پر تازیانہ ہے۔ جو نئے جذبات نئے ٹرینڈ اساتذہ لیکر آتے ہیں۔ وُہ ان دونوں کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔

کسی استاد سے آپ کہیں کہ بھئی آپ Playway طریقہ تعلیم کیوں نہیں برتتے؟ جو طریقے تعلیم کے نئے نئے رائج ہو رہے ہیں۔ آپ اُن کے مطابق کیوں تعلیم نہیں دیتے؟ جواب ملتا ہے کہ صاحب وہ "امتحان" میں کام نہیں آتے۔

اور تو اور پرائمری بچوں کو لیجیئے وہ غریب بھی امتحان کے بوجھ میں دبے جاتے ہیں۔ درجہ پرائمری میں ضرورت تو اس امر کی ہے کہ طالب علم کی شخصیت کی تربیت کی جائے۔ اس کے نہ صرف دماغ بلکہ جسم کی بھی تربیت کی اس درجہ میں بدرجہ اولیٰ ضرورت ہے۔ لیکن برائے العین ملاحظہ کیجیئے ان غریبوں کو کبھی تھپڑ مکّے اور ڈنڈے سے اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر اصحاب کی رضاجوئی کے واسطے سُدھانا پڑتا ہے۔

ہمارے امتحانات انفرادیت کی جڑیں کاٹتے ہیں۔

سب سے بڑی خرابی ہمارے موجودہ نظام امتحانات میں یہ ہے کہ وہ طلبا کے فطرتی رحجانات کو فنا کرتے ہیں۔ تعلیمی دنیا کا جدید اہم ترین اصول یہ ہے کہ طالب علم صرف سماعت مجہول کیلئے نہیں ہے بلکہ اس کی قوت کار پر زیادہ تر اس کی تعلیم کا بار ڈالنا چاہیئے۔ معلم کے واسطے ضروری ہے کہ طلبا کے طبعی رحجان کا پتہ چلا کر اس کی تربیت کرے۔ کیونکہ "ہر یکے را بہر کارے ساختند" کے مطابق دنیا کی ترقی میں ہر فرد بشر کا حصّہ ہے۔ اور اصل میں یہی اس کی تخلیق کا موجب ہے۔ کہ وہ اپنی ذات سے کچھ نہ کچھ فائدہ دنیا اور دنیا والوں کو پہنچائے اور اسی بنا پر تعلیم کا مقصد یہ قرار دیا جاتا ہے کہ انفرادیت کی اس طرح تربیت کی جائے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ خود طالب علم کی ذات کو اور اس کی ذات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ بنی آدم کو پہنچ سکے۔

لیکن غور سے دیکھیئے کہ ہم قدرت کے خلاف آمادۂ پیکار ہیں۔ فرض کیجیئے کہ ایک طالب علم کا طبعی رحجان ادب کی طرف ہے۔ استاد کا فرض ہے کہ اس کے اس ذوق کی تربیت کرے۔ اگر اور طلبا اس میں دو گھنٹے صرف کرتے ہیں۔ تو اسے مشورہ دے کہ اس میں چار گھنٹے صرف کرے۔ اس میں اعلیٰ لٹریچر کا مذاق سلیم پیدا کرنے کی کوشش

کرے۔ ادیبوں کے شاہکار اس کے سامنے رکھے۔ لائبریری کی ادبی کتابوں میں اُسے چھوڑ دے۔ تاکہ وہ خود مختارانہ پڑھے اور لٹریچر میں فرد فرید بنے لیکن اس کے برخلاف ہم کرتے کیا ہیں۔ کہ اُسے منع کرتے ہیں۔ کہ بھئی تم زباندانی میں تو پاس ہی ہوگے۔ تم بفضل خدا اس میں اچھے ہو تمہیں فکر کرنی چاہیئے حساب کی۔ زبانوں پر تم بالکل محنت نکرو۔ ان میں وقت ضایع نہ کرو۔ حساب کرو۔ ورنہ تم فیل ہو جاؤ گے۔ حساب سے چونکہ اس غریب کو مس نہیں ہے۔ اسلئے اس پر اس کی محنت بالکل اکارت جانی ضروری ہے۔ اور جس مضمون میں وہ فطرتی میلان کی بدولت وحید العصر بن سکتا ہے۔ اس کو استاد صاحب نے امتحان کی بھینٹ چڑھا دیا۔ نہیں بلکہ چڑھانے پر مجبور ہوئے۔

ہمارے کالج

ہمارے کالج اور یونیورسٹیاں جو محض نظریوں کی بنا پر اپنا مقصد غلطی سے "تجسس" (Research) بتاتے ہیں اسی مرض میں مبتلا ہیں۔ اور بالکل صحیح معنی میں بیکار گریجویٹ بنانے کی مشینیں بنے ہوئے ہیں شاید الا ماشاء اللہ صورتوں ہی میں وہ کوئی صحیح مذاق طلبا میں پیدا کرتے ہوں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بڑے بڑے مصنفین کے شاہکار محض امتحان کے نصاب میں داخل ہونے کی بنا پر اپنی دلچسپی کھو دیتے ہیں۔ اور دلچسپی کھونا کیا معنی ایک کی منافرت طلبا میں پیدا کر دیتے ہیں۔

مندرجہ بالا واقعات وحقایق اس امر کے مقتضی ہیں۔ کہ امتحانات کو حد سے زیادہ اہمیت نہ دیجائے۔ تعلیمی دنیا سے باہر کے سُکان محض امتحان میں کامیاب ہو جانے کو معیار نہ رکھیں۔ طلبا امتحان کی کامیابی کو ہی مطمع نظر نہ بنائیں۔ اساتذہ امتحان کی فکر ہی میں نہ رہیں۔ بلکہ اصل مقصد طلبا کی انفرادیت کی تعمیر قرار دیں۔ محکمہ تعلیم محض فیصدی نتیجہ کے گز سے ہی درسگاہوں کو نہ ناپے

امتحانی سوالات

دوسری خرابی جو ہمارے امتحانات کے نظام کو بیکار بنا رہی ہے اور ایک انقلاب کی مقتضی ہے۔ وہ ہمارے امتحان کے سوالات ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ آجکل اس قسم کے سوالات نہیں پوچھے جاتے۔ جن کے متعلق مسٹر ایمونٹ Raymont پروفیسر تعلیمات نے اپنی تصنیف "اصول تعلیم" میں تعریض کے طور پر water babies کے چند فقروں کو نقل کیا ہے۔ جو ناظرین کی ضیافت طبع کے واسطے درج کرتا ہوں :-

ایک چلّایا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ جزو کس طرح نکالوگے ؟

دوسرا چلّایا۔ کیا تم بتا سکتے ہو —— اور —— کے درمیان کتنا فاصلہ ہے ؟ (. . . . .
دو ایسے مقامات کو ظاہر کرتے ہیں۔ جو نہایت ہی غیر معروف ہیں)

تیسرا چلّایا۔ اور ہاں یہ تو بتاؤ کہ . . . . کے جو پندرہ چچازاد بھائی تھے۔ ان میں سے تیرھویں کی دادی کی خادمہ کی بلّی کا کیا نام تھا ؟

چوتھا۔ اچھا بتاؤ۔ کہ ایک معمولی رفتار کا سکول انسپکٹر لندن سے پارک تک اگر آفت کا مارا پیدل چلے تو کیا وقت صرف ہوگا ؟

ایک تماشائی اچھا اگر ان سوالات کے جواب دے بھی دیئے جائیں۔ تو فائدہ کیا ہوگا ؟

فائدہ کیا معنی امتحان جو سر پر آرہا ہے

تاہم اب بھی بعض خرابیاں ہمارے سوالات میں ایسی ہیں۔ جنکی بنا پر امتحانات بے بنیاد ثابت ہو رہے ہیں۔ جن کی مثالیں ہم نے مضمون کی ابتدا میں درج کر دی ہیں۔ اس خرابی کو رفع کرنے کے سلسلہ میں ماہرین تعلیم نئی قسم کے سوالات کو رائج کر رہے ہیں۔ جن کو آجکل Mental Test کے نام سے نامزد کیا تھا۔ اور جن کو اول اول ۱۹۰۵ء میں ایلفرڈ بینٹ (Alfred Benet) نے استعمال کیا۔

ان کی تہ میں یہ نیا اصول کام کر رہا ہے۔ کہ بجائے اس کے کہ چند سوالات ایسے دیئے جائیں۔ جنکے لمبے لمبے جوابات مضمون کی شکل میں طلبا کو لکھنے پڑیں۔ ایسے سوالات پوچھے جائیں۔ کہ جنکا جواب دو حرفی ہو۔ لیکن وہ طلبا کی ذہنیت اور فہم و فراست کی صحیح صحیح جانچ کر سکیں۔

ان سوالات کی چند اقسام ہیں۔ ہم ہر ایک کے تحت میں چند سوالات درج کرتے ہیں۔ تاکہ اندازہ لگایا جا سکے۔ کہ اُن کی نوعیت کیا ہے۔

اوّل۔ غلط صحیح کا اندازہ۔

مندرجہ ذیل بیانات میں سے بعض صحیح ہیں۔ بعض غلط۔ اگر کوئی بیان بتمامہ صحیح ہے تو اس کے مقابل میں ص لکھدو۔ اور اگر کوئی بیان تمام کا تمام یا اس کا کوئی حصہ غلط ہے تو غ لکھدو

(۱) ہندوستان سارے کا سارا خط سرطان اور خط جدی کے درمیان واقع ہے۔

(۲) کراچی کی آبادی آئندہ پچاس سال میں بمبئی کی نسبت زیادہ فیصدی بڑھ جائیگی۔

(۳) پنجاب کی آب و ہوا میں موسموں کے تغیر و تبدل کا زیادہ اثر پڑتا ہے۔ بہ نسبت مدراس کے۔

(۴) سیواجی کی کامیابی کا راز عیاری اور فریب کاری میں مضمر تھا۔

(۵) عہد اکبری میں مذہبی پیشواؤں کا اقتدار زیادہ ہو گیا تھا۔

(۶) سلطنت مغلیہ کو تیمور کے حملہ سے بہت بڑی زک پہنچی۔

آئندہ فقروں کی تکمیل کیلئے خطوط وحدانی والے الفاظ میں سے کوئی ایک ایسا چھانٹو جو اس فقرہ کو صحیح بنا دے۔

(۱) اشوک اعظم نے (برہمن مت - جین مت - بدھ مت) .... کی سرپرستی کی۔

(۲) ساہو کو .... (اورنگ زیب - بہادر شاہ - زیب النسا) نے رہا کر دیا۔

(۳) غدر ۵۷ء .... (دہلی - میرٹھ - کانپور) سے شروع ہوا۔

مندرجہ ذیل میں سے غلط کے مقابل میں X کا نشان بنا دو۔

محمود غزنوی ۱۰۰۰ء

غوری خاندان عروج پر تھا ۱۱۰۰ء

علاؤالدین خلجی ۱۲۰۰ء

خاندان غلامان کا پہلا بادشاہ ۱۳۰۰ء

دوم صحیح جواب کا انتخاب:- فقروں کو صحیح بنانے کے واسطے مناسب ترین الفاظ کا انتخاب کرو۔

(۱) مدراس میں زیادہ تر بارش .... (بہار - خزاں - گرمی - سردی) کے موسم میں ہوتی ہے۔

(۲) اوسطاً سالانہ بارش سندھ میں تقریباً (۸ - ۲۵ - ۴۰ - ۶۰) انچ ہوتی ہے۔

(۳) آبپاشی کے واسطے بہترین دریا .... (برہم پتر - سندھ - ایراودی - کاویری - گنگا) ہے۔

(۴) دکن کے اکثر دریا .... (شمال - جنوب - مغرب - مشرق) کی طرف بہتے ہیں۔

(۵) کوہ ہمالیہ کی چوٹیاں برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے ....
(وہ قطب شمالی سے زیادہ نزدیک ہیں۔ بہت بلند ہیں۔ ان پر بہت زیادہ بارش ہوتی ہے۔ یخ کے تودے اُنہیں ٹھنڈا رکھتے ہیں)

سوم فقروں کی تکمیل:- نیچے دیئے ہوئے فقرات کی تکمیل کرو۔

اول اول انگریز ہندوستان میں بطور ..... آئے۔ اور انہوں نے ۱۶۰۰ء .... بنائی۔ برطانوی راج کی بنیاد ہندوستان میں .... نے ڈالی جس نے کہ .... سے انتقام لینے کے واسطے۔

(۲) .... ہندوستان کا وہ صوبہ ہے جس میں زیادہ سے زیادہ بارش ہوتی ہے۔

(۳) .... زیادہ تر کلکتہ سے باہر جاتی ہے۔

(۴) گو ...... ہندوستان کا ایک صوبہ ہے لیکن دراصل یہ جزیرہ نما ہند چینی کا ایک حصہ ہے۔
(۵) ہندوستان کی بڑی بڑی بندرگاہیں .... اور .... ہیں۔

مندرجہ ذیل واقعات کب وقوع پذیر ہوئے۔
آرمیڈا کی شکست۔ امریکہ کی دریافت۔ جنگ پلاسی۔ الحاق پنجاب۔ پانی پت کی پہلی لڑائی۔
(۱۴۹۲ - ۱۵۲۶ - ۱۵۸۸ - ۱۷۵۷ - ۱۸۴۹ء)

مندرجہ ذیل تاریخی واقعات کے متعلق ایک فرضی مکالمہ یا خط لکھو۔
(۱) محمد غوری کو جے چند کا بلانا۔
(۲) محمد غوری کا اپنے سپاہیوں کو غیرت دلانا۔
(یہ سوالات ٹیچنگ کے گذشتہ دو سال کے مختلف پرچوں میں سے اخذ کئے گئے ہیں)

اوپر درج کئے ہوئے سوالوں کو بغور پڑھ کر یہ واضح ہو جاتا ہے۔ کہ اُن کو قدیم سوالات پر بدیں وجوہ تفوق حاصل ہے۔
(۱) طلبا کو نہایت مختصر مگر خوب سوچ سمجھ کر جواب دینے پڑتے ہیں۔
(۲) اُن کی جانچ کرنے کے واسطے زیادہ وقت درکار نہیں۔
(۳) ممتحنین تھک کر طلبا پر ظلم نہیں کر سکتے۔
(۴) ممتحنین اپنی ذاتی رائے یا رجحان کی مخالفت کی بنا پر طلبا کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔
طلبا صرف ایک ہی معیار پر پرکھے جاسکیں گے۔ اس لئے وہ خطرناک اور مضحکہ خیز غلطیاں نہ ہو سکیں گی جن کا تذکرہ آغاز مضمون میں کیا گیا ہے۔

ممتحن اساتذہ ہونے ضروری ہیں

اوپر ضمناً بتایا جاچکا ہے کہ ایک بڑی حد تک ہمارے امتحانات مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ سوالات قابلیت اور محنت سے بنائے گئے ہوں۔ ممتحن کو یہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ وہ نہ صرف طلبا کی قابلیت اور علمیت کی جانچ کر رہا ہے۔ بلکہ ایک حد تک اپنے اوپر ذمہ داری لے رہا ہے۔ کہ آئیندہ طلبا کو کس طرح تعلیم دیجائے۔ نیز یہ کہ اُس کے ذمہ اساتذہ کی رہنمائی کی اہم ذمہ داری رکھ دی گئی ہے۔ اسلئے ضروری ہے کہ سوالات کا پرچہ بناتے وقت ہر سوال پر ممتحن اپنے دل میں یہ سوچے کہ
آیا اِس سوال سے طریقۂ تعلیم پر اچھا اثر پڑیگا؟
آیا اس سوال سے اساتذہ کو تحریک ہوگی کہ وہ مناسب مواد مناسب طور پر طلبا کے دماغوں میں محفوظ کریں۔

آیا اس سوال کو پورے طور پر طلبا سمجھ سکیں گے اور یہ اُن کے دماغی ارتقا کی۔ اُس منزل کے مطابق ہے۔جس میں سے وہ گذر رہے ہیں۔

لیکن اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا وہ اعلیٰ علمی اور ادبی قابلیتوں کے مالک اور اعلیٰ اعلیٰ سندوں کے حامل جنکو پروفیسر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ طلبائے سکول کی نفسیات کا ذاتی تجربہ رکھتے ہیں۔آیا وُہ براہِ راست اُن طلبا کی ذاتی اہلیت سے واقف ہیں۔جن کی کاپیوں پر وہ بے دردی سے سرخ نیلی پنسل سے X کے نشان بناتے چلے جاتے ہیں ؟ آیا اُس کو اوسط درجہ کے طلبا یا کمزور طلبا سے کوئی ہمدردی ہوسکتی ہے جو ہمیشہ اپنی جماعت میں اول نمبر پر رہا ہو ؟ آیا وہ شخص ایک مفید ممتحن بن سکتا ہے۔جس کو جدید طریق تعلیم سے مطلق کوئی واسطہ نہ ہو۔ اور جس کو صرف وہ فرسودہ اور پرانا طریقۂ تعلیم ہی یاد ہو .... جو کہ اُس کے اساتذہ نے کم ازکم ایک چوتھائی صدی پہلے پڑھایا تھا۔ آیا اُس سے یہ امید کیجا سکتی ہے کہ وہ ایسے سوالات بنا سکتا ہے۔جو اساتذہ کے طریقۂ تعلیم پر اچھا اثر ڈالیں۔اور اُن کی رہنمائی کرے۔ اُن کا جواب بلا خوف تردید "نہیں۔ ہرگز نہیں" کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔

جب یہ حالات ہیں تو کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ ہائی سکول کے آخری امتحان میں ممتحنین کی زیادہ تعداد اساتذہ ہائی سکول ہی کی ہونی چاہیئے ؟

اتفاقی تباہ کن غلطیوں کی روک تھام

بعض مرتبہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک ہوشیار سے ہوشیار طالب علم محض کسی سوء اتفاق سے ناکام ہوجاتا ہے ایک نکما لڑکا حسن اتفاق سے کامیاب طلبا کی صف اول میں لاکھڑا کردیا جاتا ہے۔خود راقم کے ہائی سکول کی طالبعلمی کے زمانہ کا ایک واقعہ ہے۔کہ چوٹی کا لڑکا ناکام رہا۔حیرت ہوئی پرچے دوبارہ دکھلوائے لڑکا کامیاب نکلا۔ اور شکر ہے کہ یونیورسٹی نے ازاں بعد اُس کے متعلق کامیابی کا اعلان بھی کردیا۔ لیکن اُسے خوش قسمتی ہی سمجھئے ورنہ اکثر ایسا نہیں ہوتا۔

اس قسم کی اتفاقی تباہ کن غلطیوں کی روک تھام کیلئے بعض یونیورسٹیوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ وُہ امتحان کے بعد فوراً تمام مدارس کے ہیڈ ماسٹروں سے ایک ایسا نقشہ منگواتے ہیں۔جس میں ہر طالب علم کے سکول کے سہ ماہی ششماہی امتحانات کے نمبر درج ہوتے ہیں۔اور ہر مضمون کے مقابل میں نوٹ دلواتے ہیں کہ آیا اس میں پاس ہونے کے قابل ہے یا نہیں۔ یہ طریقہ اگر بعض قباحتوں کا خاطر خواہ انتظام ہوسکے۔تو اس میں کوئی شک نہیں کہ نہایت مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

خیالاتِ عالیہ

(حضرت عظامی صاحب مدظلہ)

آنکہ آہو را بگیرد چشمِ صیادِ من است — وانکہ بخشد جوہرِ جاں تیغِ جلادِ من است

اے دلِ درد آشنا از آہ و نالہ ہا چہ سود — آنچہ او را بر سرِ قہر آورد دادِ من است

آفتابِ روزِ محشر با تمازتہائے خویش — سایہ پرورد عذارِ آں پری زادِ من است

پائے دیوارِ ہجوم گریۂ پیہم بریخت — ایں قصر فہائے چشمِ قلزم آبادِ من است

شکوۂ افلاک گفتن شیوۂ فرسودہ است — آسماں را شکوہ پیما کردن ایجادِ من است

خوں کند صد نالہ چشمِ سرمگینش وقتِ قتل — آں چہ ممنونِ فغانہا نیست فریادِ من است

مے خورم دشنہ بدشنہ رخصتِ فریاد نیست — داد دادِ آں صنم فریاد فریادِ من است

پا بجولاں سر بکف عشاق ہر سو میدوند
آنکہ مے آید عظامی سروِ آزادِ من است

معلّم اور متعلّم

(جناب سودھی جگت سنگھ صاحب بی اے - بی ٹی ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس امرتسر)

تعلیم کا آغاز بچپن ہی سے ہونا ضروری ہے - کیونکہ بچوں کو جس وضع قطع اور عادت کا بنانا چاہیں - بنا سکتے ہیں - وُہ اس عمر میں نہایت نرم ہوتے ہیں - جس سانچے میں چاہو ڈھال لو - مٹی نرم اور بھیگی ہی چاک پر چڑھا کر برتن بنائے جاتے ہیں - ایک مشہور پروفیسر کا قول ہے - کہ بچہ چھ سال کی عمر تک جس قدر علم حاصل کرتا ہے - وُہ مقدور میں اس تعلیم سے کہیں بڑھکر ہے - جو ایک گریجویٹ اپنی تمام تعلیم یونیورسٹی کے دوران میں سیکھ سکتا ہے - بچہ پانچ چھ سال تک وہ تمام تاثرات حاصل کر لیتا ہے - جن کو بعد کی زندگی میں وہ اچھے معلّموں کی زیر نگرانی تکمیل تک پہنچاتا ہے -

ولایت میں بچہ چھ سال کی عمر سے پہلے پہلے انفنٹ سکول یا کنڈرگارٹن سکول میں تعلیم حاصل کرتا ہے - ایسی تعلیم کے واسطے اُستانیاں مقرر ہوتی ہیں - جو نرسز کا کام سیکھی ہوئی ہوتی ہیں - اور اس عرصہ میں تعلیم کھیل کے ذریعہ دی جاتی ہے - مگر ہمارے مُلک میں چھ سال تک بچے آوارہ گردی میں مصروف رہتے ہیں - اور گلی کوچوں میں مارے مارے بیہودہ حرکات سیکھ جاتے ہیں - جو تمام عمر ان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں - ضروری ہے کہ اس ملک میں بھی چھ سال سے کم عمر کے بچوں کے واسطے استانیوں کے زیرِ اہتمام مدارس جاری کئے جائیں - جہاں کھیل کے ذریعہ کنڈرگارٹن کے طور پر تعلیم دی جائے -

بچوں کی فرصت کا زمانہ خاص طویل نہیں ہوتا - عام طور پر پندرہ سولہ سال تک زیادہ سے زیادہ اُن کی تعلیم کا زمانہ ہوتا ہے - سب سے ضروری غور طلب امر یہ ہے کہ بچوں کی جسمانی اور ذہنی تربیت کس طریقہ ہونی چاہیئے - ہمیں اگر اچھا سوٹ سِلانا ہوتا ہے - تو اعلیٰ سے اعلیٰ درزی کی تلاش کرتے ہیں - مگر بچوں کی تعلیم کیلئے جنہیں کل قوم کا لیڈر بننا ہے - ہمارے پاس وقت نہیں - روپیہ نہیں - ہم توجہ نہیں دیسکتے - لڑکوں کی تعلیم کا سارا دارومدار معلم پر ہے - اور معلم میں ان باتوں کا ہونا ضروری ہے - کہ اس کا میلان طبیعت اس پیشہ کی طرف ایسا ہو کہ اس کے سرانجام دینے میں اُسے دلی خوشی ہو اس میں یہ قابلیت ہو - کہ وہ جلد اپنے طلبا کی طبیعتوں سے بہت اچھی طرح اور بہت احتیاط سے واقفیت حاصل کر سکے - جس طرح ایک طالب علم کو کتابوں سے واقف ہونا چاہیئے - اسی طرح معلم اپنے طلبا کی طبیعتوں سے - اگرچہ بڑی درسگاہوں میں کل طلبہ کی طبایع سے فرداً فرداً آشنا ہونا

دشوار ہے مگر تجربہ کار معلم بشرے سے ہی طلبہ کی طبائع کو بھانپ جاتے ہیں ۔

معلم کا صرف صاحب علم ہی ہونا کافی نہیں۔ بلکہ لازم ہے کہ وہ جدید طریقۂ تعلیم سے پورا ماہر ہو۔ اور نیک کردار درست گفتار۔ خوش اطوار۔ نیک وضع اور جسمانی نقائص سے مبرا ہو۔

آج کل کے معلموں کو ہم دیکھتے ہیں۔ کہ اپنے شاگردوں کے کان میں آواز اس طرح ڈال رہے ہیں جیسے کوئی بوتل میں کیف سے سرکہ ڈال رہا ہے۔ ان کا حکم طلبا کو یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ اُن کی سُنیں۔ اور اپنی نہ کہیں۔ جو سبق لیں۔ اُسے طوطے کی طرح بار بار رٹیں۔ مگر یہ اُن کی بھول ہے۔ اور طلبا کی ترقی میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔ معلم کو لازم ہے۔ کہ وہ فقط اپنے ذہن کی اختراع کردہ باتوں کا بیان نہ کرے۔ بلکہ طلبا کو اجازت دے کہ جو باتیں انہوں نے اپنے ذہن اور مطالعہ سے نکالی ہو۔ وہ بیان کریں۔ اگر ان کے بیان میں غلطیاں ہوں۔ تو حتی المقدور سب کو ان سے ہی درست کرائے۔ استاد ارسطو لیسا اور شاگرد سکندر را ایسا ہونا چاہیئے۔ ارسطو نے سکندر کو کس خوبی سے تعلیم دی۔ اس کو شجاعت۔ دلیری کے طریقے۔ شباب اور استقلال کی روش میں۔ اعتدال اور عدالت کے برتاؤ۔ بزرگی۔ شان وشوکت کی نگہداشت۔ خوف کی حقارت وغیرہ اس طرح سے سکھائے کہ تمام دنیا میں اپنا اور اپنے شاگرد کا نام روشن کر گیا۔ استادوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ شاگردوں کی خوش لیاقتی سے ان کا نام بھی روشن ہوتا ہے۔ ان کی ناموری سے وہ بھی نامور ہوتے ہیں۔ بہت سے معلم ایسے ہیں کہ انکا کوئی نام ہی نہ لیتا اگر اُن کے شاگرد نامور نہ ہوتے۔ اچھے معلم کا طریقہ ہے۔ کہ جب طلبا سبق پڑھنے آتے ہیں تو وہ خود کچھ نہیں بتاتے۔ بلکہ طلبا خود بیان کرتے ہیں۔ کہ آج اپنے مطالعہ سے ان باتوں کو نکال کر لائے ہیں۔ جب وُہ سُن لیتے ہیں تو اپنی تشریح کرتے ہیں۔

بغیر مطالعہ علم میں ترقی نہیں ہو سکتی۔ معلم کو چاہیئے کہ خود روزانہ مطالعہ کر کے کمرہ میں داخل ہو۔ اور طلبا میں بھی مطالعہ کی عادت ڈالے۔ ہمارے معلمین نارمل سکولوں سے نکلنے کے بعد روزانہ مطالعہ کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اور کتب کو بالائے طاق رکھکر اپنے آپ کو کامل مدرس خیال کرتے ہیں۔ مطالعہ سے نئے منظر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اور ہم زندگی کو بسر کرنے کے نئے نئے طریقے سیکھتے ہیں۔ ہر ایک معلم کا اپنا کتب خانہ ہونا چاہیئے کتب خانہ دراصل معالج روحانی کہلاتا ہے۔ ہم جس قدیمی لایق عالم اور موجودہ قابل فاضل کو بلاتے ہیں۔ وہ ہمارے سامنے آموجود ہوتا ہے۔ دنیا کے جس کونے سے چاہیں۔ اعلیٰ عالم کو بُلا لیتے ہیں۔ نفس انسانی کے واسطے مطالعہ ایسا ہے جیسا جسم کے واسطے ورزش۔ ورزش جسمانی سے تنومندی اور تندرستی پیدا ہوتی ہے ۔ مطالعہ سے نیکی جو روحانی صحت ہے ہاتھ آتی ہے۔ متعلمین کو بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جو کچھ اُستاد سکھاتا ہے۔ وہ بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ مطالعہ ہی اس تھوڑے کو بہت بناتا ہے۔ جو آدمی کسی علم و ہنر میں بلند پایہ حاصل کرتا ہے۔

اسے دو طرح کی تعلیم کا فیض ہوتا ہے۔ ایک استاد کی تعلیم کا جو زیادہ نہیں ہوتا۔ دوسرا اپنی تعلیم میں کوشش کا۔ جو کوئی کامل عالم ہوا ہے۔ وہ اپنے اس مطالعہ کی بدولت ہؤا ہے۔

بعض معلموں کی یہ حرکت نہایت نازیبا و نامناسب ہے۔ کہ وہ طلبا کو مشفقانہ نصیحت و مربیانہ موعظت اور شریفانہ طور سے علم کی طرف رغبت نہیں دلاتے۔ بلکہ ہمیشہ ڈنڈا اور بید ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی آنکھوں میں خون اُتر رہا ہے۔ ایسی ڈراؤنی صورت اور بھبکیوں سے ننھے ننھے شاگردوں کا دل دہل جاتا ہے۔ چھوٹے بچوں کے دل میں رعب اور خوف کا سمانا ایسا بُرا ہے۔ جیسا کہ ایک نرم اور نازک پودے پر بادِ صرصر کا تند جھونکا یا پھول پر لُو کا چلنا غرض جیسے سخت بیماری سے بیمار کی صورت بگڑ جاتی ہے۔ ایسے ہی لڑکوں کی شکل اس مار دھاڑ اور دہشت و خوف سے کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ زد و کوب بچوں کیلئے ایک سخت مرض ہے۔ اُستاد اور شاگرد میں وہی علاقہ ہے۔ جو مریض اور ڈاکٹر میں جیسے ڈاکٹر کا مریض پر غصہ ہونا بے جا ہے ہمیشہ استاد کا شاگرد پر ناراض ہونا ناروا ہے۔ ایسے معلم بڑی غلطی کرتے ہیں۔ اس کا اثر لڑکوں پر یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ مدرسہ میں داخل ہوتے وقت ایسے بُرے نہیں ہوتے جتنا کہ خارج ہوتے وقت ہوتے ہیں۔ جودت و ذکاوت مر جاتی ہے۔ انسان سے حیوان بن جاتے ہیں البتہ جو فہمایش بچوں کو عقل و شعور کے ساتھ کی جاتی ہے۔ وہ مؤثر اور فائدہ مند ہوتی ہے۔ مگر ہمارے نئے تربیت یافتہ مدرسین تو لڑکوں پر لعنت و ملامت کی بوچھاڑ بار بار اس طرح لگاتے ہیں۔ کہ ان کے لئے جھڑکی گھُرکی سب مساوی ہو جاتی ہے۔ حیا اور شرم جاتی رہتی ہے۔ چکنے گھڑے بن جاتے ہیں۔ اس طرح تعلیم جو آزادی اور عزت کیلئے ہوتی ہے۔ ہرگز نہیں ہوسکتی۔ جن قوموں کے بچے مکتب میں جوتیاں کھائیں گے وہ کیا خاک فرماں روائی کر سکیں گے۔ مدرسہ کو تو ایک انبساط اور نشاط کی تصویر بنانا چاہیئے۔ کہ جس طرف بچوں کی آنکھیں شوق سے لگی رہیں۔

جہاں تک جاپانی بچوں کا تعلق ہے۔ انہیں کسی قسم کی بدنی سزا یعنی مار پیٹ۔ بید لگانا۔ تھپڑ ٹھونکنا اور گوشمالی وغیرہ نہیں دیجاتی۔ اس قسم کی نظیر دنیا بھر کے کسی مہذب ملک میں ملنی مشکل ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں۔ کہ جاپانی بچے فرشتہ سیرت یا دیوتا خصلت ہوتے ہیں۔ بلکہ اس امر کا ثبوت ہے۔ کہ جاپانی معلم دم دلاسے اور پیار سے بچوں کی درستی کرنے کو بہترین طریق خیال کرتے ہیں۔ جاپانی مدارس میں مار پیٹ یا بدنی سزا نام کو بھی نہیں دیجاتی۔ وہاں سب سے سخت سزا یہ ہے۔ کہ طالب علم کو کمرہ سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ جاپانی طلبا کیلئے استاد کی جھڑکی یا گھرکی ایک اہم سزا ہے۔ پچھلے سال کا ذکر ہے کہ کوبے ہائی سکول کے ایک معلم نے ایک لڑکے کو معمولی سی سرزنش کی اس غریب لڑکے نے اس ملامت کو اپنی بے عزتی خیال کیا اور اس کے دل پر اتنا صدمہ ہوا کہ اس نے فوراً گھر جا کر اپنے باپ کے دوائی خانہ سے زہر نکال اور خودکشی کرلی۔ تجربہ کار معلمین نے طلبا کی تقسیم اس طرح پر کی ہے:۔

اوّل طلبا جو ذہین اور محنتی ہوں۔ یہ دونوں باتیں بچوں میں جمع ہونی قران السعدین کی طرح مسعود ہیں۔ ایسے لڑکوں

کے واسطے اُستاد کا تیوری چڑھاناہی بید مارنے کے برابر ہے۔ اور بید مارنا موت کے برابر۔ اگر استاد ایک بید لگائے تو اس کی شرم اُن پر ہفتوں بید لگاتی رہتی ہے۔ ایسے طبائع کے طلبا کے ساتھ معلمین کو ہمیشہ نرمی اور ملائمت برتنی چاہیئے۔

دوم ذہین مگر کاہل اُن کا حال ایسا ہوتا ہے۔ جیسا کہ خرگوش اور کچھوے کی کہانی میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ اپنے ہم جماعتوں کو کچھوا ہی جانتے ہیں۔ ایسے طلبا بھی اپنے درجہ پر پہنچ جاتے ہیں گو ہوشیار ہوتے ہوتے۔۔۔ وہ خواب خرگوش میں رہتے ہیں۔ مگر استاد کی جھڑک اُن کی نیند کو بھگاتی رہتی ہے۔

سوم۔ کند ذہن مگر محنتی اور جفاکش اور ابتدا میں کو امغز ہوتے ہیں مگر محنت ان کے دماغ سے اس کوڑے کرکٹ کو نکال کر خوب صاف کر دیتی ہے۔ ایسے طلبا کی گوشمالی اچھے معلم نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ دنیا میں نیچر کی کوئی چیز سزا سے نہیں بدل سکتی۔

چہارم ایسے طلبا جو کند ذہن اور کاہل ہوں۔ کاہلی کی اصلاح تو ممکن ہے۔ مگر کند ذہن کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ جس قینچی کی دھار میں لوہا نہ ہو۔ اس کو دنیا کی کوئی سان تیز نہیں کر سکتی۔ ایسے طلبا کو اور اور پیشوں کی طرف رغبت دلانی چاہیئے۔ ان کو طالب علمی کا پیشہ چھوڑ کر کوئی اور پیشہ مثلاً تجارت زراعت اختیار کرنا چاہیئے۔

روحانی تعلیم کے واسطے جسمانی تعلیم بھی لازمی ہے۔ یہ دونوں ایک جوڑی میں ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ روح میں قوت اس وقت تک نہیں آتی۔ جب تک کہ جسمانی طاقت اس کی معاونت نہیں کرتی۔ دوران وقت مدرسہ میں طلبا کو ہر قسم کی ورزش کی یعنی کھیلنے کودنے۔ دوڑنے اُچھلنے پھلانگنے اور زقندیں لگانے کی اجازت دینی چاہیئے۔ جو معلم طلبا کو اس سے منع کرتے ہیں۔ وہ اُن کی آزادی اور قدرتی نشوونما کے راستے میں حائل ہوتے ہیں۔ ان کو سردی گرمی۔ ہوا اور سورج کی تکالیف کے متحمل ہونے کی عادت ہونی چاہیئے۔ غرض فرزانگی کے ساتھ مردانگی بھی پیدا کرنی چاہیئے۔ جس سے وہ کسی خوف سے نہ ڈریں۔ وہ باتیں جس سے نامردی۔ بزدلی اور زنانہ پن آئے۔ ان سے دُور رہنی چاہئیں۔ غرض وہ عادتیں ان میں پیدا ہوں۔ جس سے کہ ان میں زورآوری اور تنومندی بڑھے سختی اٹھانے کی عادت ہو۔ کوئی تلخ دوا پینی پڑے تو اُسے کشادہ پیشانی سے پئیں۔ طلبا میں کسی طرح کی نزاکت جسمانی پیدا نہ ہونے دینی چاہیئے۔

بعض طلبا کتابوں کے کیڑے بن جاتے ہیں۔ اور مطالعہ میں سرتاپا ڈوب جاتے ہیں۔ اور بن مانس کی صورت بن جاتے ہیں۔ غرض نہ تن کا ہوش ہے نہ بدن کی خبر۔ مجذوب مخبوط الحواس بن جاتے ہیں۔ متعلمین کو کتابوں کا غلام نہیں بنانا چاہیئے۔ ان میں چودہ گھنٹے پڑھنے کی عادت بُری ہے۔ تعطیلات میں ان کو بہت زیادہ مطالعہ کرنے سے باز رکھنے کی ہدایت کرنی چاہیئے۔ اور سمجھانا چاہیئے۔ کہ تعطیلات اُن کی تفریح طبع کیلئے ہوتی ہیں۔ کتابوں کو بالائے طاق رکھکر خوب سیر تماشے اور مطالعہ قدرت سے دل بہلائیں۔ فرانسیسوں میں ایک ضرب المثل ہے کہ تعلیم بہت جلد شروع

ہونی چاہیئے۔ مگر دیر تک جاری نہیں رہنی چاہیئے۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں اُس پر عمل نہیں ہوتا۔ کالج کی تعلیم میں بہت زمانہ گذر جاتا ہے۔ بعض طلبا کا دماغ تو کالج کی تعلیم میں ہی ایسا ضعیف ہو جاتا ہے۔ کہ وہ بعد تعلیم کسی بڑے کام کے لائق نہیں رہتا۔

بعض صاحبِ استعداد معلموں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ طلبا کے سامنے بہت سی ایسی باتیں کرتے ہیں۔ کہ جن کا سمجھنا ان کی استعداد سے باہر ہوتا ہے۔ دوران سبق میں اکثر طالب علموں کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ان الفاظ کی ماہیت کو کما حقہٗ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ افلاطون کا قول ہے کہ لڑکوں کی تعلیم ان کی طبائع کی استعداد اور قابلیت کے موافق ہونی چاہیئے۔ والدین کے تمول۔ حالت اور لیاقت کو اس میں دخل نہیں ہونا چاہیئے۔

ہمارے مدرسوں میں طلبا کے سبق سُننے کا یا ان کے تحریری امتحان کا طریقہ ایسا ہے کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ اور اُن کی ترکیب طلبا کے ذہن میں محفوظ ہے۔ مگر اس پر مطلق خیال نہیں ہوتا کہ اصل معانی اور مغز سخن طلبا کے ذہن نشین ہو۔ اور اس کے موافق اپنی زندگی بسر کرنے میں عمل کرتے ہوں۔ اور سینکڑوں طرح سے اُن کو ادل بدل کر مختلف مقاصد و مطالب میں برتتے ہوں۔ مثلاً اُستاد لڑکوں کو "سچ" کی بابت سبق پڑھاتا ہے۔ تو فقط اس سبق کے الفاظ ترجمہ اور ترکیب کو پوچھیگا۔ اس پر خیال نہیں کریگا۔ کہ اس پر عمل درآمد کر کے طلبا درست کردار اور راست گفتار بھی ہوئے ہیں یا نہیں۔ پس اس طرح سے اگر کوئی متعلم نئی چیز سیکھتا ہے اور اس کی اپنے ذہن سے نئی نئی صورتیں بنا کر اپنے کام میں نہیں لاتا۔ تو جان لو کہ غذائے ناملائم کی طرح اس کے ذہن اور طبیعت نے سبق کو قبول نہیں کیا۔ ایسی تعلیم سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ طلبا کو چاہیئے کہ جو چیز پڑھیں۔ اس کو سمجھیں۔ چھان بین کریں۔ ذہن کو اوروں کے بھروسے پر نہ چلائیں۔ غیروں کے خیالات کے آرزومند ہو کر متقلد نہ بنیں۔ ورنہ ان کا فطرتی جوہرِ جودت زائل ہو جائیگا۔

معلم اپنے شاگردوں کو اخلاقی تعلیم بھی باقاعدہ دے۔ اخلاقی تعلیم کا عام تعلیم سے جُدا کر دینا ایسا ہے۔ جیسا آفتاب کا روشنی سے۔ اور آگ کا حرارت سے۔ گل کا بُو سے۔ تمام علموں میں یہ شرف اسی علم کو حاصل ہے کہ اس کے تحصیل کی قابلیت بچوں میں نوشت و خواند کی قابلیت سے پہلے پیدا ہو سکتی ہے۔ ہر حالت اور ہر مقام میں اُس کی تعلیم ہو سکتی ہے۔ گھر میں۔ باغ میں۔ میز پر خلوت میں۔ جلوت میں۔ صبح و شام یہ سب اس تعلیم کیلئے یکساں ہیں۔ یہ اوضاع و اطوار کی خوبیوں کو سکھاتا ہے۔ دستر خوان پر آدابِ طعام سکھاتا ہے۔ مجلس میں آدابِ سخن۔ کھیل کود میں حُسن اخلاق۔ یہ ایسا علم ہے کہ اس میں انسان کے کل افعال اور اعمال کے قاعدے بیان ہوتے ہیں۔ یہ سکھاتا ہے۔ کہ خدا کے حقوق انسان پر کیا ہیں۔ اور انسان کے کیا؟ دولت کو کیوں کر خرچ کرنا چاہیئے۔ کونسا حصہ اس کا خیرات میں خرچ کرنا چاہیئے۔ کتنا حصہ عزیز و اقربا میں تقسیم کرنا۔ خدا کے کیا کیا احکام ہیں۔ ان کی بجا آوری کے کون سے طریقے متعین ہیں؟

بعض لڑکوں کی طبیعت ایسی ہوتی ہے۔ کہ وہ حکمت عملی کی باتوں سے دور بھاگتی ہے۔ ایک حکمت کے مسئلہ کے سُننے سے ان کا دل ایک بیہودہ بازاری گپ میں زیادہ لگتا ہے۔ اگر گلی میں ڈھول تماشے کی آواز آئے تو وہ کتاب بند

تعلیم میں حسِ مذہبی کی پرداخت

(سید اصغر علی صاحب بی اے بی ٹی۔ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول جھجر ضلع رہتک)

انجیل شریف میں آیا ہے کہ خدا کا خوف اصل دانائی ہے۔ حدیث شریف میں مسلم کا ایمان بیم و رجا کے درمیان بتایا گیا ہے۔ اہل ہنود میں پرستش مجاز معرفت حقیقت کا آغاز سمجھی گئی ہے۔ یہ تو تھا ہمارے اسلاف کا نصب العین لیکن وائے انقلاب ہمارا منتہائے خیال محض ترقی ہے کیسی ترقی؟ مجلسی ترقی، معاشرتی ترقی۔ اقتصادی ترقی۔ علمی ترقی اور مذہبی ترقی۔ اُف ہائیں یہ آخر میں۔ مَیں نے کس قسم کی ترقی کا نام لے دیا۔ یہ تو فیشنیبل تعلیم یافتہ اصحاب کی دنیائے تخیل میں ایک بم گرا دیا۔ یہ حضرات ضرور سمجھ گئے ہونگے۔ کہ راقم الحروف ضرور کوئی دقیانوسی خیالات کے بزرگ ہیں جنہیں موجودہ زمانہ کی مجلس معاشرتی اقتصادی اور علمی ترقی کے زمانہ میں بھی مذہبی ترقی کا خیال خام پریشان کر رہا ہے ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے یہ جا کے تھانے میں   کہ اکبرؔ نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

لیکن نہیں صاحب مَیں آپکو ہرگز اس صفت سے مُعرا خیال نہیں کرونگا جو ابھی تک آپ میں موجود ہے۔ ماشاء اللہ تنظیم اور سنگٹھن کے ذریعہ جس قسم کی ترقی کرنیکا خیال آپ کو ہر لحظہ دامنگیر ہے۔ وہ مذہبی ترقی ہی تو ہے۔ خواہ اس کو دیگر اقسام کی ترقیوں کا آلۂ کار بنانے کے واسطے حاصل کیا جائے۔ یہ ٹھیری دل کی بات۔ جسے عالم الغیب کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے۔ سو یہ ایک ایسا تخیل ہے۔ جس کی آپ کے فلسفہ میں گنجائش نہیں۔

صنعت و حرفت کی تعلیم جس پر ملک کی ترقی کا انحصار ہے۔ بلا شک ایک نہایت ضروری چیز ہے۔ لیکن اسکے لئے ہمارے تمام نظام تعلیمی کو عملی جامہ پہنانے کی ضرورت ہے۔ اور گورنمنٹ عالیہ کی موجودہ مالی حالت اس صرف کثیر کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اسلئے جبتک وہ وقت آئے ہم اُس نصب العین پر ایک نظر ڈال لیں جو ہمنے مُلکی ترقی کے لئے اختیار کیا ہے۔

اقتصادی ترقی کی موجودہ جدوجہد میں ہم مغربی ممالک کی تقلید کرتے ہیں۔ اور اسلئے اہل مغرب نے ان مسائل کا جس طرح کیا ہے۔ وہی ہماری رائے میں بھی صحیح ہے۔ مثلاً مغربی معیار سے بمبئی۔ احمد آباد اور کانپور بڑے خوشحال شہر کہلاتے ہیں۔ کیونکہ ان میں مانچسٹر کی طرح پر بہت سے کارخانہ جات ہیں۔ ان شہروں سے سرکار کو ٹیکس کے ذریعہ بڑی آمدنی ہوتی ہے۔ ان میں بیشمار موٹر کاریں دوڑتی پھرتی ہیں۔ لیکن غریب مزدوروں کی جھونپڑیوں اور تہ خانوں پر ایک نظر ڈالتے ہی اس خوشحالی کی قلعی اچھی طرح سے کھل جاتی ہے۔ تو کیا اقتصادی ترقی کے سلسلہ میں آپ ان برائیوں پر غور نہیں کریں گے؟ کیا ان کا علاج

یا انسداد ناممکن ہے، صنعت و حرفت کی تعلیم کی کمی کو تو یہ الزام نہیں تھوپا جاسکتا ہے کارخانوں میں آئے دن ہڑتالیں اسلئے
تو نہیں ہوتیں اور دیوالے اس لئے تو نہیں نکلتے کہ اچھے دستکار یا مزدور دستیاب نہیں ہوتے ۔ دراصل بات یہ ہے کہ
کارخانہ دار اور مزدور دونوں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ اور اسلئے جلدی سے جلدی مالدار ہونے کی کوشش
کرتے ہیں۔ اور ہر ایک اپنی طرف کھینچتا ہے۔ خواہ ہم انہیں یا نہ مانیں۔ یہ فلسفہ موجودہ سوسائٹی کے نظام پر ساری ہے اور مغربی
سائنس کی بدولت ہی یہ مادی مطمع نظر ہمیں حاصل ہوا ہے۔ اور اسلئے یہ ظاہرا خوشحالی دراصل ایک لعنت ثابت ہو رہی ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا ملک اس لعنت کے وبال میں گرفتار نہ ہو جائے تو ہمیں فوراً اپنا مطمع نظر بدلنا پڑیگا۔ اور مادی
ترقی کے نصب العین کو قائم رکھتے ہوئے اپنے دل میں خوف خدا کے لئے جگہ نکالنا پڑیگی۔ دراصل اس خوف خدا کو کسی مستند
مروجہ مذہب اور اس کے رسومات سے کوئی خاص تعلق نہ ہوگا۔ اگرچہ عقیدہ کا اظہار کسی نہ کسی شکل میں افعال سے ہی کیا جائیگا
خدائی اعتقاد کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کسی خاص مذہب یا فرقہ کا خدا ہو۔ بلاشبہ اُس کی ہستی کی معرفت کے میدان میں
اشہب عقل و فکر کے پاؤں پہلے ہی سے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ اور خواہ ہم اُسے ہستی واجب الوجود یا غیر واجب الوجود یا نفس قوت
یا قانون فطرت کے نام سے تعبیر کریں۔ کیونکہ اس کی ہستی کے تخیل میں تصور کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ صرف اتنا ضروری ہے
کہ ایسے مخلوق کا حکمران ۔ حاضر۔ ناظر۔ علیم۔ قہار اور قوی تصور کیا جائے۔ اگر آپ اس قعر مذلت میں گرنے سے بچنا چاہتے
ہیں جس کی طرف مغربی مادیت اور دہریت نہایت سبک رفتار سے آپ کو لئے جارہی ہے تو کم از کم اپنے تعلیمی نصب العین
میں یہ تبدیلی بلا پس و پیش کر ڈالئے۔ خود مغرب نے اس تبدیلی کی ضرورت کو محسوس کر لیا ہے۔ اور ممکن ہے کہ اُس کی رفتار
میدان ترقی میں آپ سے تیز ہو۔

تعلیمی دنیا میں مذہب اور خدا کے اس نئے تخیل کو رواج دیتے ہوئے میں نے یہ بات نظرانداز نہیں کی ہے کہ
زمانہ سابق میں مذہب اور خُدا کے نام سے اہل عالم پر کیا کیا مصیبت کے پہاڑ توڑے گئے ہیں۔ لیکن اتنا ضرور عرض
کرونگا۔ کہ معتقدانِ سائنس بھی ان اعمال حسنہ میں اُن سے کسی طرح پیچھے نہیں رہے۔ صرف ایک جنگ عظیم میں جو خونریزی
اور بربادی سائنس کی امداد سے کیگئی وہ تمام صلیبی جنگوں کے مظالم سے کہیں زیادہ ہے۔ لیکن اس وجہ سے سکولوں اور
کالجوں میں سائنس کی تعلیم پر کوئی شخص معترض نہیں ہوا۔ اگر سائنس کا تعلق مادہ سے ہے تو مذہبی تخیل کا روح سے۔ جب
زندگی میں مسلمہ طور پر یہ دونوں شامل ہیں۔ تو کالجوں اور سکولوں کے طلبا کو زندگی کے ہر دو اجزا کے مسائل پر غور کرنے کا موقع
دیا جائے۔ کیا یہ صریحاً غلط نہیں ہے کہ کوئی شخص مخلوق کی کیفیت ترکیبی اور استعمالی پر غور و فکر کرنے میں اسقدر منہمک ہو جائے
کہ اس کے دماغ سے خالق کا تصور ہی جاتا رہے۔

لیکن آپ کہیں گے۔ کہ ذات باری تعالیٰ کے تصور میں خواہ آپ کتنے ہی آزاد خیال ہوں۔ مگر مدارس میں اور خصوصاً
ہندوستان کے مدارس میں مذہب کا ذکر چھیڑنا ہی مناسب نہیں کیونکہ یہاں نہ مذہب کی تعداد کا ٹھکانا اور نہ معتقدات کے

تضاد و تباین کی حد۔ مثلاً ۲۲ سال ہوئے ایک گورنمنٹ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کو عالی جناب انسپکٹر صاحب بہادر کے ایما سے اپنے مدرسہ کا کام دعا سے شروع کرنے کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ ایک دعا تجویز کی گئی اور اسکول کی انجمن معلمین میں پسند کرنے کے لئے پیش کی گئی۔ ساری دعا پر تنقید لکھنے کی تو اس مضمون میں گنجائش نہیں۔ صرف ایک فقرے کی نسبت عرض کئے دیتا ہوں۔ پہلا فقرہ تھا "اے ہمارے مالک تمام دنیا کے پیدا کرنے والے ہم سب تیرے گنہگار بندے ہیں" سب سے پہلے ایک مسلمان مدرس کھڑے ہوئے اور ہیڈ ماسٹر صاحب سے عرض کیا کہ تعمیل ارشاد سے تو گریز ناممکن ہے۔ لیکن یہ دعا مسلمان بچوں کے لئے موزوں نہیں ہے۔ اول تو ہم لوگوں کے لئے دعا کے پانچ وقت مقرر ہیں۔ ان کے علاوہ اور کسی وقت خاص میں اہتمام کے ساتھ دعا مانگنا بدعت ہوگا۔ دوسرے دعا میں صرف مومن ہمخیال شریک ہو سکتے ہیں تیسرے بلا وضو اور کعبہ شریف کی طرف رخ کئے بغیر دعا مانگنا جائز نہیں۔ چوتھے مجھے دعا کے الفاظ پر بھی اعتراض ہے۔ تخلیق انسانی کو حضرت آدم علیہ السلام کے گناہ کا نتیجہ سمجھنا عیسائیوں کا عقیدہ ہے۔ مسلمان بچوں کو بالکل معصوم خیال کرتے ہیں۔ اسلئے اُن سے صبح ہی صبح اپنے گناہوں کی معافی منگوانا۔ ایک معصوم شخص کے منہ سے خوامخواہ جرم کا اقبال کرانا ہے۔ یہ تو میں نے موٹی موٹی باتیں کہی ہیں۔ اگر فردعات کو لیا جائے۔ اور شیعہ سنی۔ معتزلہ۔ نیچری۔ وہابی۔ قادیانی۔ چکڑالوی علماء کے نقطۂ خیال سے اس دعا کے الفاظ پر تنقید کی جائے تو یہ ہرگز کسی قابل ثابت نہ ہوگی۔ ابھی مولوی صاحب اپنا وعظ ختم بھی نہ کرنے پائے تھے کہ آریہ پنڈت صاحب جامہ سے باہر ہو کر اس طرح وِیا کھیان دینے لگے۔ بلاشک یہ دعا اس قابل نہیں ہے۔ کہ صبح ہی صبح ہمارے بچوں کے منہ سے جبراً کہلائی جائے۔ ہم روح اور مادہ کو خدا کی ذات کے ساتھ ازلی اور ابدی سمجھتے ہیں۔ اس واسطے آپ ہمارے بچوں سے جبراً اقرار نہ کرائیں کہ خدا ان کا مالک ہے۔ اتنے میں جینی مہاشہ کو بھی جوش آگیا اور فرمانے لگے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب میں آپ کی توجہ ملکہ معظمہ کے اعلان شاہی کی طرف مبذول کرتا ہوں۔ جو انہوں نے مذہبی عدم مداخلت کے متعلق کیا ہے۔ یہاں اے بی سی ڈی پڑھائی جائے جس غرض کے لئے یہ مدرسہ قائم ہوا ہے۔ یہ خدا خدا کیا لگا رکھا ہے۔ ہم اپنے شاستروں کی رو سے اس قسم کی ہستی کے قائل نہیں ہیں۔

خیر یہ بات تو بطور جملہ معترضہ کہی گئی اور ۲۲ سال کے عرصہ میں مقدس گنگا کے پانی کی روانی کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کے خیالات میں ایک عظیم انقلاب واقع ہو چکا ہے۔ لیکن عدم مداخلت مذہبی کے متعلق ملکہ معظمہ کے اعلان شاہی کا مطلب اساتذہ سکول نے نکال رکھا ہے۔ اس سے تو ان پر "مغز سرش خوردند" کی مثال بالکل عاید ہوتی ہے۔ حکام سلطنت

فٹ نوٹ:۔ کیونکہ یہ تو آپ پر واضح ہے۔ کہ ہمارے مدارس میں سکاؤٹنگ۔ ریڈ کراس۔ موسیقی۔ دیہات سدھار وغیرہ وغیرہ جو کچھ کیا جاتا ہے محض احکام کی تعمیل اور خوشنودی مزاج معلی کے لئے کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ مدارس میں موسیقی کا بہت چرچا ہوا اسکے خلاف بہت جلد اور مولویوں نے جواز سماع کے فتوے پر از سر نو صاد کر دیا اور وہ مدرس جنہیں فن سماع نہ ہو شقی القلب۔ متنفی اور قزاق اسد ہر فن کی مثال خیال کئے گئے۔ اور کیوں نہ کئے جاتے؟ کیا ملک الشعرا شیکسپیئر نے جو فطرت انسانی کے سب سے دقیق نباض مانے گئے ہیں اپنے ڈراما میں ایسا نہیں لکھا ہے۔ ۱۲

انگلشیہ نے ہندوستان کے آیئنی انتظام کے ارتقا کی تاریخ میں کسی جگہ بھی سکول کے بچوں کے لیے خدا کے لفظ کو "ہوا" نہیں بتایا۔ رہا ہندو مسلمانوں پر یہ الزام کہ وہ اس روشنی کے زمانہ میں بھی تصور باری تعالیٰ کے متعلق ہم خیال نہیں ہو سکتے تو مجھے تو یہ بھی محض بہتان ہی معلوم ہوتا ہے۔

درحقیقت اس بارے میں ہندو مذہب نے شروع ہی سے پوری آزادیٔ خیال دی ہوئی ہے۔ ہندو کے نزدیک خدا کائنات میں شامل۔ اور کائنات سے علیحدہ بھی متصور ہو سکتا ہے۔ یہاں تک اہل کائنات اس کے عدم اور وجود کو یکساں سمجھے ہوئے بھی ہندو کہلا سکتے ہیں۔ قدیم ہندو مہاراجاؤں نے کئی مرتبہ ایسی مذہبی مجالس قایم کیں جن میں صرف ذات باری تعالیٰ کے متعلق ہی نہیں بلکہ ہر مذہبی اعتقاد کے متعلق نہایت آزادی سے بحث مباحثہ کیا جاتا تھا۔ اور ایک دوسرے کی رائے کا بے حد احترام کرتے ہوئے حکومت کی طرف سے اس پر عمل پیرا ہونے کی پوری آزادی دی جاتی تھی۔

قرآن شریف میں جگہ جگہ دوسری اقوام کے مذہبی معتقدات کا احترام کرنے کی تاکید آئی ہے "ہم نے تم میں سے ہر ایک قوم کیلیے علیحدہ علیحدہ شریعت عطا کی ہے جو اُن کے لئے کھلا راستہ ہے۔ اگر ہماری مرضی ہوتی تو ہم تم کو ایک ہی قوم میں پیدا کر سکتے تھے۔ لیکن ہمیں تمہاری آزمائش علیحدہ علیحدہ شریعت کے مطابق ہی منظور رہے۔ اس واسطے ایک دوسرے سے نیکی میں سبقت لیجانے کی کوشش کرو"۔ (دیکھو قرآن شریف ترجمہ سیل صاحب صفحہ ۷۹) اسلام نے اپنے عین عروج کے زمانہ میں بھی عیسائی راہبوں اور ان کے اوقاف کے متعلق وہ رعایتیں جائز رکھیں جو انہیں خود عیسائی بادشاہوں سے میسر نہ آ سکیں۔ مذہبی معاملات میں شہنشاہ اکبر کی فراخدلی زبان زد عام ہے۔ تھوڑا عرصہ بھی نہیں ہوا کہ مسلمان بزرگان دین کے مزارات ہندو عوام کی زیارتگاہ بنے ہوئے تھے

اس میں شک نہیں کہ جیسا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کبھی کبھی مذہبی دیوانوں نے اپنی خوش اعتقادی کے جوش میں فتنے و فساد بپا کرنے میں کسر اُٹھا نہ رکھی۔ لیکن مہذب انگلینڈ اور یورپ کی تاریخ میں بھی تو صدیوں کی صدیاں ایسی گذری ہیں۔ کہ جب آزادیٔ خیال کا تصور بھی محال تھا۔ مگر گذشتہ دس سال کے اندر اندر مذہبی مناقشات کی وجہ سے کچھ ہندوستان کی فضا ایسی مکدر ہو گئی ہے کہ بعض لوگ تو یہ سمجھنے لگے ہیں کہ مذہبی غیر جانبداری یا عدم مداخلت کا خیال بھی دیگر برکات سلطنت برطانیہ کی طرح سے مشرق کے لئے مغرب کا ایک عطیہ ہے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ برطانیہ کی مذہبی غیر جانبداری محض منفی رہی ہے بر خلاف اس کے مشرقی بادشاہوں کی غیر جانبداری بھی مفید اور مثبت۔ مہاراجہ اشوک کے فرمانوں سے ثابت ہے کہ ہر ایک آدمی کو اس کے عقیدے کے بموجب تعلیم دینے کا بندوبست کیا جاتا تھا لیکن موجودہ حکومت کے عدم مداخلت کے حکم نے سر رشتہ تعلیم کے سرکاری مدارس سے اس شے کا تذکرہ ہی مٹا دیا جو دلوں کو راحت اور روحوں کو تسکین بخشنے والی ہے۔ اگرچہ سائنس کی تمام روشنی اور اسکے عقیدتمندوں کا جوش و خروش موجد ان سائینس کے رمز و بوم سے مذہب کا خاتمہ کرنے میں ناکامیاب رہا۔ اور رہیگا جب تک کہ مذہب کا اثر انسانی طبائع پر مسلط ہے۔

ذرا غور تو کرو خود انگلستان میں اس غیر جانبداری کے کیا معنی لئے جاتے ہیں لیکن کوئی اعتراض کرے کہ وہاں کے اور یہاں کے مدارس میں دن رات کا فرق ہے۔ وہاں سب عیسائی ہی عیسائی رہتے ہیں لیکن اگر معترض صاحب کو عیسائیوں کے ۱۰۴ بڑے بڑے فرقوں کے نام معلوم ہوں اور ان کے مذہبی معتقدات کے تفاوت کا علم ہو۔ بلکہ درحقیقت اکثر صورتوں میں اتنے ہی مختلف ہیں جتنے دو بڑے مذاہب کے معتقدات۔ تو وہ سمجھ جائینگے کہ اختلاف اور تنوع تو کائنات کی جان ہیں۔ اور مختلف چیزوں کو یکساں بنانے کی کوشش کرنا گویا انکی خصوصیات کو معدوم کرنا اور ایک کو دوسرے پر بیجا ترجیح دینا ہے۔ جو سراسر آزادی خیال کے منافی ہے۔ اسلئے انگلینڈ کے حکام محکمہ تعلیم نے ہر قسم کی مذہبی تعلیم کو نصاب تعلیم سے خارج کرنے کی بجائے یہ مناسب سمجھا ہے کہ ہر ایک سرکاری مدرسہ میں ایسے عقائد اور اخلاق کی تعلیم دی جائے جو کسی خاص فریق کی تعلیم کے خلاف نہ ہوں۔ اگرچہ والدین کو اجازت ہے کہ اگر وہ کسی مدرسہ کی مذہبی تلقین کو اپنے عقیدے کے خلاف سمجھیں تو وہ اپنے لڑکے کو اس میں شریک نہ ہونے دیں۔ لیکن یہ کام اس خوش اسلوبی سے انجام دیا جاتا ہے کہ کسی سرپرست کو اجازت مذکور سے فائدہ اُٹھانیکی ضرورت نہیں پڑتی۔

پس جب دیگر ممالک میں مختلف المذاہب اور مختلف العقائد لوگوں نے اپنی تمام فروعات کو بالائے طاق رکھکر مذہبی تعلیم کو مدارس کے طلبہ کے لئے صرف خالق کون و مکان کی ہستی کے اقرار اور تفہیم۔ اسکی قدرت کے اٹل قوانین پر غور کرنے اور اس کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کے سوانح اور تلقین کو سمجھنے تک محدود کر رکھا ہے۔ تو کیا ہندوستان میں ان سب باتوں کو قائم رکھتے ہوئے اور اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی عظیم الشان ہستیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس قسم کی تعلیم کا انتظام نہیں کیا جاسکتا؟ ہندوستان کے تمام مذاہب میں ایک ایسے خدا کی ہستی پر یقین کیا جاتا ہے جو کائنات کے کارخانہ کو اپنے اٹل اور کبھی غلطی نہ کرنے والے قوانین سے چلا رہا ہے۔ اس قسم کے اعتقاد کا نتیجہ انسان کو اخلاق کے اعلےٰ سے اعلےٰ معیار تک پہنچا سکتا ہے جس سے وہ خرابی دور ہوسکتی ہے۔ جو مذہب کو نصاب تعلیم سے مطلق خارج کر دینے سے پیدا ہوئی ہے۔ اور جس کا ذکر اس مضمون کے شروع میں کیا گیا ہے۔ ہرگز آپ کسی کے مذہبی اعتقاد میں مداخلت نہ کریں لیکن یہ آپ کی عدم مداخلت بھی مثبت ہونی چاہیئے۔ اب رہی اس اثبات کی تفصیل یہ حسب موقع طے ہوسکتی ہے۔ پرائمری سکول کے طلبا کو یہ سمجھانا کہ ہر ایک انسانی جسم خدا تعالٰی کا مسکن ہے۔ انہیں جسم کی حفاظت اور پاکیزگی کی طرف ایک ایسے زمانہ میں مائل کریگا جب جسم کی نشو و نما نہایت سرعت کے . . . ساتھ ہو رہی ہو۔ سیکنڈری سکول میں جذبات لطیف کو اُبھارا جائیگا جن کی پاکیزہ زندگیوں کا مطالعہ اُن کی اخلاقی ترقی کے لئے مشعل راہ بن جائے گا۔ کالج کے طلبا کی صورت میں جہاں عقل کی پختگی کے ساتھ تحقیق اور تنقید کا جوہر دماغ میں چمک اُٹھتا ہے۔ نظام کائنات میں قوانین کی فطرت کے فلسفہ کو حتی الامکان سمجھانے کی کوشش کی جائیگی الغرض نصاب تعلیم میں اگر ان ضروریات دینیہ کے سکھانے کا اہتمام کر لیا جائے تو مادی خوشحالی جو اخلاق اور مذہبی احساس کی عدم موجودگی میں دنیا کے لئے لعنت ثابت ہو رہی ہے۔ موجب

فلاح و برکت ہو جائیگی۔

میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنے اس خشک مضمون کو اُردو علم ادب میں سے ذات باری تعالیٰ کے متعلق کچھ اشعار کے انتخاب پر ختم کروں۔ تاکہ جب تک ارباب بست و کشاد مذہبی تعلیم کی ترویج کی ضرورت کو محسوس کرکے سرکاری مدارس میں مندرجہ بالا سکیم کو عملی جامہ پہنانے کا انتظام کریں۔ مدرسین جن پر آئندہ نسلوں کی اخلاقی تربیت کی ذمہ واری عاید ہوتی ہے۔ سمجھ لیں کہ اب بھی انہیں ایسے مواقع حاصل ہیں کہ وہ دینوی تعلیم کے دوران میں درستی عقاید کی بھی بہت کچھ غور و پرداخت کر سکتے ہیں۔

جلوہ ہے ہر کلی میں کسی کے جمال کا — جنت سمجھ رہا ہوں ظفر گلستاں کو میں

گو واں نہیں۔ پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں — کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

دَیر کی تحقیر کر اتنی نہ اے شیخ حرم — آج کعبہ بن گیا کل تک یہی بت خانہ تھا

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

وہ کریم کیا نہیں ہے وہ رحیم کیا نہیں ہے — کبھی داغ بھول کر بھی غمِ نجات کھانا

خوش ہے کافر بھی اس کی رحمت پہ — ہائے اس اشتباہ نے مارا

وہی تو ہے شعلۂ تجلی کہ برق ایمن ستمگر ہو کر — جب اس نے اپنی نمود چاہی کھلا حسینوں پہ رنگ ہو کر

کچھ شان معرفت سے نہیں دور زاہدو — ڈوبیں گناہ بادہ کشوں کے شراب میں

محروم اس کے خوان تجلی سے کون ہے — حصہ ہر ایک آنکھ نے پایا ہے نور کا

کہتے ہی یا کریم اِدھر سے اُدھر گئے — لطف و غضب میں فاصلہ تھا کتنی دور کا

جب آئی جوش پہ میرے کریم کی رحمت — گرا جو آنکھ سے آنسو دُرِ یگانہ ہوا (امیر)

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے — قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے (اقبال)

کھل گیا جب یہ۔ کہ دل بھی جلوہ گہ ہے یار کا — کون چکر کھائے پھر دیر و حرم کی راہ کا

دَیر میں آ حسن کا طالب ہے تو زاہد اگر — بت ہی ہیں جو کچھ ہیں آگے نام ہے اللہ کا

کچھ نہ سمجھے ہو نہ بوجھے ہو کہ وہ کیا چیز ہے — نام تم نے سن لیا ہے زاہد و اللہ کا

جب تلک ہست تھے دشوار تھا پانا تیرا — نیست ہونے پہ ملا ہم کو ٹھکانا تیرا

دکھاؤ جلوہ جو دعوے ہے خود نمائی کا — مجھے یقین نہیں آتا سنی سنائی کا

آج تک خورشید کا منہ اس طرف ہوتا نہیں — دیکھنا آساں نہیں اس روئے روشن کی طرف

جب نظر بندہ نوازی پہ تیری جاتی ہے — مور کو بڑھ کے سلیماں سے ہم دیکھتے ہیں

ہو کہیں لالہ و گل اور کہیں شمس و قمر — ہر جگہ تم کو نئی شان سے ہم دیکھتے ہیں

گنبدِ باری کو پہنچ جائے دِلا فکر سے تو ۔۔۔ یہ تو باہر ترے امکان سے ہم دیکھتے ہیں

ملنے نہ ملنے سے ہمیں کیا کام سے ہے کام ۔۔۔ جبتک کہ دم میں دم ہے تیری جستجو کریں

کب زاہدوں کو مسئلۂ عشق کا ہے فہم ۔۔۔ نامحرموں سے راز کی کیا گفتگو کریں

صاف کہدو نہیں دیدار دکھانا ہے اگر ۔۔۔ کعبہ و دیر میں دوڑاتے ہو کیوں تم مجکو

جستجو تیری دو عالم سے مجھے کھو دیگی ۔۔۔ مَیں بھی تجھ کو نہ ملونگا جو مجھے تو نہ ملا

پوچھتی ہے شمع پروانوں سے تیری داستان ۔۔۔ گل سُنا کرتے ہیں بلبل سے تیری تقریر کو

ہستی جہاں کی ہستیٔ حق پر دلیل ہے ۔۔۔ کیونکر جہاں ہو جو جہاں آفریں نہ ہو

لامکاں میں نہ پتہ ہے نہ مکاں میں اس کا ۔۔۔ بے ٹھکانے کے بتائے ہیں ٹھکانے ہمکو

امیر جلوۂ وحدت سے آشنا ہو جو دل ۔۔۔ وہی ظہور ہے وہی شان ہے جدھر دیکھو

بُو نہیں رنگ نہیں نُور نہیں نار نہیں ۔۔۔ معرفت کیوں نہ ہو دشوار الٰہی تیری

پردہ اُنہیں سے ہے جنہیں تاب نظر نہیں ۔۔۔ آتے ہیں خود وہ دیکھنے والوں کے سامنے

جبتک کہ دل ہے چاہیئے ہم کو تیری تلاش ۔۔۔ جبتک چلے زبان تری گفتگو کریں

محرم نہیں ہے تو ہی نوائے راز کا ۔۔۔ یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

کی جس پہ نگاہ تجکو دیکھا ۔۔۔ اب تک تو نظر کہیں نہ چوکی

جز دیر و حرم کہاں مَیں جاؤں ۔۔۔ راہیں تو یہی ہیں جستجو کی

فنا کیسی بقا کیسی جب اس کے آشنا ٹھہرے ۔۔۔ کبھی اس گھر میں آنکلے کبھی اس گھر میں جا ٹھہرے

جو چشم غور سے آئینۂ توحید کو دیکھا ۔۔۔ تو سب کچھ تو ہی ٹھہرا ہم نہ کچھ اے خودنما ٹھہرے

مانند کلیم بڑھ نہ اے دل
یہ دُور کی گفتگو بہت ہے

قیمتی باتیں

جب ارسطو سے لوگوں نے دریافت کیا۔ کہ ایک شخص جھوٹ بول کر کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ تو اس نے کہا "جب وہ سچ بھی کہے گا۔ تو اس کا یقین نہیں کیا جائیگا"۔

لوگ شکایت کرتے ہیں کہ دنیا میں کوئی سچا دوست نہیں ملتا۔ ان کو چاہیئے کہ اس بات پر غور کریں۔ آیا وہ بھی کسی کے سچے دوست ہیں۔ اور کسی کے واسطے وہ بھی اپنی پیاری زندگی قربان کرنے کے لئے تیار ہیں؟

تاج الشعرا، نسیم العصر، ناخدائے سخن، حضرت نوح ناروی

حسنِ تخیل

(از لسان الہند حضرت صفدر مرزا پوری مرحوم)

آئینہ ہے کہ ہے قاتل کے مقابل قاتل
مجھ کو ڈر ہے کہیں لڑ جائیں نہ قاتل قاتل

کھینچ کے تلوار کی صورت نہ گلے مل قاتل
اس طرح مل کہ ملے دل سے مرا دل قاتل

تیرے ہوتے ہوئے کیوں جان کروں نذرِ اجل
نیم جاں چھوڑنے سے کیا تجھے حاصل قاتل

موج میں آئیں تو دمِ ذبح کچھ اے جوششِ خوں
خود ہی ہو جائیگا پابندِ سلاسل قاتل

دستِ نازک کی طرح تیغ بھی نازک ہے بہت
تجھ سے آسان نہ ہوگی مری مشکل قاتل

اتنی مہلت بھی نہ دی تیغِ ادا نے مجھ کو
کہ دکھاتا تجھے اپنا جگر و دل قاتل

قتل گہ جاں کے ہنستا نہ ذرا محشر میں
نظر آئیں گے وہاں سینکڑوں بسمل قاتل

ہم سوئے منزلِ مقصود چلے بھی جو کبھی
جادۂ شمشیر بنا دوریٔ منزل قاتل

کشتۂ ناز ہے وہ حشر ہے عید کا دن
اپنے صفدر سے ذرا آج گلے مل قاتل

سکاؤٹ کیا ہوتا ہے؟

جناب پنڈت مرلی دھر صاحب مودگل بی۔ اے ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس (جالندھر)

انگلستان میں ماہ اگست ۱۹۲۹ء میں دنیا بھر کے سکاؤٹوں کے اجتماع اور باہمی میل جول کے دوران میں ہندوستان کے سکاؤٹوں نے مشاہدات کی بنا پر جو تجربات حاصل کئے ہیں اس سے ہندوستان میں سکاؤٹ تحریک کی اہمیت ایک مسلمہ امر ہو گئی ہے۔ دیگر ممالک کی خوبیاں اور اپنی خامیاں محسوس کرتے ہوئے ہر ایک سچے ہندوستانی شخص کا جو سکاؤٹ تحریک سے دلچسپی رکھتا ہے فرض ہے کہ وہ اپنی خامیوں کو دور کرنے اور دوسروں کی خوبیاں اختیار کرنے میں صدق دل سے ساعی ہو۔ اور میدان عمل میں اترے۔

فی زمانا پنجاب کے منتظمانِ سکاؤٹ تحریک کی توجہ اس جانب بڑے زور شور سے مبذول ہو رہی ہے۔ گذشتہ چند سالوں کے اندر اس تحریک کو تعداد کے لحاظ سے جو فروغ حاصل ہوا ہے۔ وہ ناظرین سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن ہر شخص اس بات کو محسوس کریگا کہ اس تحریک کا استحکام حقیقی سکاؤٹ تربیت پر منحصر ہے۔ اس لئے ناظرین کی خدمت میں چند ایک خیالات برائے غور و تحقیق پیش کئے جاتے ہیں۔ اگر مقبولِ خاطر ہوں۔ اور ضمیر منظور کرے تو ان خیالات کو عملی جامہ پہنا کر دیگر ممالک کے پہلو بہ پہلو دنیا کے مصائب و آلام کی تخفیف و تنسیخ میں حصہ لیں۔ اور اس تحریک کو حقیقی معنوں میں قوم و ملک کی فلاح و نجات کا ذریعہ بنائیں۔

اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ سکاؤٹ کیا ہوتا ہے؟ کیا خاکی وردی میں ملبوس، ہاتھ میں ساڑھے پانچ فٹ کی لمبی لاٹھی پکڑے ہوئے بچے کا نام سکاؤٹ ہے۔ یا جس کسی لڑکے کو کھانا پکانے۔ گانٹھیں لگانے یا ابتدائی امداد بہم پہنچانے میں معمولی یا بخوبی واقفیت ہو جائے۔ اسے سکاؤٹ کہتے ہیں۔ یا وہ بچہ سکاوٹ کہلاتا ہے۔ جو بگل یا نفیری کے بینڈ باجے میں ماہر ہے۔ اور جھنڈی یا سیٹی کے اشارات سے پیغام رسانی کر سکتا ہے۔ جانوروں کی بولیاں بول سکتا ہے کھوج لگا سکتا ہے۔ اور پوشیدہ اشارات کو سمجھ سکتا ہے۔ ان تمام سوالات کا جواب ایک جملے میں دیا جا سکتا ہے۔ کہ سکاوٹ بننے کا انحصار مندرجہ بالا خوبیوں کے ماہر ہونے پر نہیں اور نہ اس بات پر ہے۔ کہ وہ کیا کچھ جانتا ہے؟ اور کرتا ہے؟ بلکہ اس بات پر ہے کہ وہ کیا ہے؟ اور کیا بننے کی کوشش کر رہا ہے؟ دنیا بھر کے سکاؤٹ موخر الذکر رویہ کے زیر اثر اپنے اندر کی جمیع پوشیدہ طاقتوں کے نشو و نما میں کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اس زبردست عہد کو نباہتے ہیں جو انہوں نے سکاؤٹ تحریک میں شمولیت کے وقت کیا تھا۔

جب ایک سکاوٹ اپنے سکاؤٹ بھائی سے ملتا ہے۔ تو اس کے تین انگلیوں سے سلام کرنے کا عمل اسے

فوراً یاد دلاتا ہے۔ کہ اس نے کون سے تین عہد کئے ہوئے ہیں :-

(۱) جو فرائض خدا۔ بادشاہ اور اپنے ملک کی جانب سے اس پر عاید ہوتے ہیں۔ وہ انہیں پورا کرے گا۔

(۲) ہمیشہ بنی نوع انسان کی مدد کرے گا۔

(۳) وہ دس قوانین سکاؤٹ کی پابندی کریگا۔

پیشتر اس کے کہ دس قوانین سکاؤٹ کی اہمیت پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عہد سکاؤٹ کے مدعا و مقصد پر نشر کچھ عرض کیا جائے ؞

عہدِ سکاؤٹ

ہر ایک ملک و قوم کم و بیش اپنے اپنے عقیدے کے مطابق دنیاوی عیش اور خوشی اور بعد از مرگ نجات یا دکھ سے رستگاری حاصل کرنے کے لئے تگ و دو کر رہی ہے۔ اس لئے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ انسانی زندگی رنج اور راحت کے تجربات کا مجموعہ ہے۔ اس رنج اور راحت کا انحصار مادے پر ہے۔ اور مادہ ہمیشہ تغیر پذیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی گھڑیاں ہمیشہ ایک سی نہیں کٹتیں۔ کبھی تو مارے خوشی کے وہ جامے میں پھولا نہیں سماتا۔ اور کبھی رنج و غم کے بوجھ کے نیچے دب کر زندگی کو وبالِ جان خیال کرتا ہے۔

اگر بہ نظر تعمق دیکھا جائے تو مادی اشیا میں دوامی راحت کو تلاش کرنا سخت غلطی ہے اور طبع سلیم اس بات کو تسلیم نہیں کرتی۔ کہ دنیا بھر کے عیش و عشرت کے سامان مہیا کر لینے سے انسان کو دائمی راحت مل سکتی ہے۔

پس لازم و لابد ہے کہ دوامی راحت کی بنیاد ایسے نظام پر رکھی جائے۔ جو زمانہ کی دست برد سے مامون ہو۔ ہر مذہب ملت میں روح یا آتما کو ہی مسرت یا سرت کو ہمیشہ قائم رہنے والی طاقت یا شکتی تسلیم کیا گیا ہے۔ پس لازم ہے کہ سچی خوشی یا ہمیشہ قائم رہنے والی راحت حاصل کرنے کے لئے اسکی بنیاد روح یا آتما پر رکھی جائے۔

یہ بات اور غور طلب ہے۔ عارضی خوشی جو مادے کے موافق حال ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ مادے میں نہیں ہوتی۔ بلکہ دل کی توجہ کی دھار کے اس مادے میں جذب ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ ذرا توجہ اس جانب سے ہٹی اور وہی مادی شے جو خزینہ راحت معلوم ہوتی تھی۔ دکھ اور رنج و کلفت کا باعث بن جاتی ہے۔ جیسے اگر توجہ کی دھار کو مادے سے ہٹا کر روح یا آتما میں جو کہ تغیر سے مبرا ہے۔ لگایا جائے تو جو سرور یا آنند اس سے حاصل ہوگا وہ دیرپا ہوگا۔ ع

یہ نشہ وہ نہیں جسے ترشی اتار دے

یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے مذاہب اس دائمی آنند و خوشی کو حاصل کرنے کے لئے روح یا آتما کے عنصر لطیفی

کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ اور اس ذات پاک کو مختلف ناموں سے منسوب کرتے ہوئے اپنے اپنے عقیدے کے مطابق اپنے بھگونت کی بھگتی معبود کی عبادت اور اپنے خدا کی پرستش کے حصول مدعا میں مشغول رہتے ہیں۔

اس لئے سکاؤٹ عہد کا پہلا جزو ہر بنی نوع انسان کو دائمی راحت ورشتے سنبھالنے کی جانب رجوع کرتا ہے۔

ب۔ یہ امر پوشیدہ نہ رہے کہ روحانی ریاضت کے لئے مادی حالات کی موافقت بے حد ضروری ہے۔ اور جب تک کہ انسان کو بیرونی فارغ البالی نہ ہوگی۔ وہ اپنی توجہ کو باطن میں یکسو کرنے میں قاصر رہے گا۔

اس مدعا کے حاصل کرنے کیلئے افراد میں ضبط اور اقوام کی تنظیم لازمی ہے۔ تاکہ ہر قوم کے افراد اپنے عقیدے کے مطابق بلا روک ٹوک اپنے معبود کی عبادت میں لگ سکے۔ مضمون طول وطویل ہے لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ کہ خارجی فارغ البالی کے حاصل کرنے کے لئے ملک میں نظم ونسق کا ہونا ضرور ہے۔ خواہ وہ کسی جماعت کے ہاتھ میں ہو۔ جس نے کسی ایک فرد کو اجرائے احکام کے لئے منتخب کیا ہو۔ یا وہ کسی ایسی ممتاز ہستی کے زیر نگیں ہو۔ کہ جسے ملکی رسم ورواج کے ماتحت قدرت کی جانب سے کسی ایسے خاندان میں پیدا ہونے پر جو کہ ایک حکمران کی تمیع صفات سے متصف ہونے کے لحاظ سے مسلم ہو۔ نائندہ تسلیم کر لیا گیا ہو۔

پس ایسی ہستیوں کی قدر وتعظیم نہایت لازم ہے۔ جو کہ ملک میں نظم ونسق اور قوم میں تنظیم بوجوہ احسن برقرار رکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مذاہب میں بادشاہ کو ظل الٰہی کے نام سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ اور یہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ کہ اس ہستی میں کوئی خاص قدرت کلایا شکتی کارکن ہے۔ جو دیگر افراد میں نہیں پائی جاتی۔ ایسی ہستیوں کے احکام کے روبرو سر تسلیم خم کرنا عین سعادت ہے۔ اور موجب رضائے خدا ہے۔

ج۔ ملک میں امن وچین اسی وقت قایم رہ سکتا ہے۔ جب کہ ہر ایک فرد بشر دوسرے کے احساسات وجذبات کی اتنی ہی قدر کرے۔ جس قدر کہ خود اپنی۔ نیز راہ راست پر چلتے ہوئے ملکی مشین کا ہر ایک پرزہ اپنے فرائض بخوبی سر انجام دے۔ یہی وجوہات ہیں۔ جن کی بنا پر سکاؤٹ کا پہلا عہد مقرر کیا گیا ہے۔ اور سکاؤٹ کیلئے دائمی راحت فارغ البالی اور امن چین حاصل کرنے کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنے معبود کی رضا پر راضی ہو۔ اپنے حاکم اور بادشاہ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔ اور اپنے ملک کے لئے ایثار نفسی اور قربانی کا نمونہ بنے۔ اور عزم راسخ سے اس عہد کو نبھائے۔ اگر ہر ملک کا ہر ایک شہری اس تعلیم کے زیر اثر تربیت حاصل کرے۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ملک میں راحت فارغ البالی اور امن چین کا دور دورہ نہ ہو۔

عہدِ دُوم

شاعر نے کہا ہے ؎ دردِ دل کیواسطے پیدا کیا انسان کو ٭ ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

خالق نے اپنی مخلوق میں برے اور بھلے سب پیدا کئے ہیں۔ اور انسان دنیا میں رہتے ہوئے ہر لحظہ افعال و اعمال کی قید میں جکڑا رہتا ہے۔ اگر یہ جملہ اعمال نیک ہوں تو انسان فرشتہ بن جائے۔

خدا سے میل معدودے چند ہستیوں کا ہوا ہو تو ہوا ہو۔ ورنہ خدا کا تصور اس کی صفات سے ہی قایم کیا جاتا ہے اور خدا کی خدمت اس کے بندوں کی خدمت پر مشتمل ہے۔ ورنہ خدا خدمت کا بھوکا یا محتاج نہیں۔ ع

نہ چاہوں میں اسے کیونکر میرے پیارے کا پیارا ہے

کے مصداق خدا کی محبت اس کے بندوں سے محبت کرنا ہے۔

اسلئے لازمی ہے کہ انسان کی خدمت کی جائے اور اس سے محبت کی جائے

چنانچہ سکاوٹ سے عہد دوم کا مطالبہ کوئی غیر مرغوب شرط نہیں۔ بلکہ خود اِسے خدا سے میل کرانے کی شاہراہ پر گامزن کرنا ہے۔

جب مندرجہ بالا دو وعدوں کی اہمیت واضح ہوگئی۔ تو ان کی پابندی کے لئے سکاوٹ میں قابلیت کا ہونا ضروری ہے۔ اور اس قابلیت کے پیدا کرنے کی غرض سے دس قوانین بطور ذرائع مقرر کئے گئے ہیں۔ جن کی قید میں سکاوٹ راہِ راست پر چلتے ہوئے لغزش نہ کھائیگا۔

مکمل ذات خدا ہے اور تکمیل حاصل کرنا فرضِ انسان ہے۔

اگر کوئی انسان چند اوصافِ حمیدہ سے متصف ہے۔ اور آئندہ کے لئے بہتر سے بہترین بننے کی کوشش نہیں کرتا۔ تو وہ اس انسان کے مقابلہ میں جو کہ ابتدا میں کوئی اعلیٰ ہستی نہیں۔ لیکن حصولِ تکمیل کے لئے ہمہ تن کوشاں ہے اور ناپسندیدہ صفات کو ترک کرکے صفات حسنہ کے اکتساب میں ساعی ہے۔ کسی صورت میں افضل تر نہیں۔

پس سکاوٹ کے نام کے ساتھ متواتر ترقی لازم و ملزوم ہے۔ اور جب کسی سکاوٹ نے اپنی آئندہ ترقی میں کوشش کو ترک کر دیا۔ وہ سکاوٹ کہلانے کا مستحق نہیں رہا۔ اس لئے ہر سکاوٹ کے لئے لازم ہے کہ وہ بہتر سے بہترین بننے کے سلسلہ ترقی کو لگاتار جاری رکھے۔ اور اپنے خیالات اقوال و افعال سے عوام کے دلوں پر سکاوٹ تحریک کی اہمیت کا سکہ ثبت کر دے۔

اب دس قوانینِ سکاوٹ کی نسبت مختصراً عرض ہے:-

قانونِ اوّل

اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ کہ دنیا بھر کا کاروبار خواہ وہ کسی شعبہ کے متعلق ہو۔ صرف اعتبار پر چل رہا ہے۔ خواہ بیوپار ہو یا صنعت و حرفت۔ خواہ ملازمت ہو یا حکومت۔ اگر آج دنیا سے اعتبار اٹھ جائے۔ تو تمام کاروبار بند ہو جائیں

- - - - - - - مثل مشہور ہے - جان جائے پر آن نہ جائے -

دنیا میں ہر شخص عزّت حاصل کرنے کے لئے اپنا سرمایہ - دھن - دولت سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہے - کوئی اس عزت کو پبلک کے نمائندہ کی شکل میں تلاش کرتا ہے - کوئی خطابات کے پیچھے لگ رہا ہے - کوئی ممتاز عہدے حاصل کرنے کے درپئے ہے - کسی کے دِل میں رفاہِ عام کی دُھن سمائی ہے - غرضکہ "فکر ہر کس بقدر ہمّت اوست" کے مصداق ہر کہ ومہ عزّت کی دیوی کی بھینٹ اپنے عزیز تریں سرمایہ کو قربان کرنے میں گریز نہیں کرتا - لیکن مقام افسوس ہے کہ ہر قدم پر وہ منزلِ مقصود سے دور تر ہوتے جاتے ہیں - کسی نے سچ کہا ہے ؎

خدا اُس پاس وُہ ڈھونڈھے ہے جنگل میں
ڈھنڈورا شہر میں لڑکا بغل میں

ریت کی بنیاد پر عالیشان عمارت کو کھڑا کرنے میں سرمایۂ زندگی صرف کردیا جاتا ہے - اور آخرش جب اس دنیا سے کوچ کا وقت آتا ہے - تو ؏ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا" کا ورد کرتے ہوئے سینہ پر بارِ گراں لئے عالم فانی سے روانہ ہو جاتے ہیں -

مثالیں موجود ہیں - جو ببانگِ دہل پکار پکار کہتی ہیں کہ حقیقی عزت کے حاصل کرنے کے لئے **راستبازی** اختیار کرو - قول کے دھنی بنو -

کیا مہاراجہ رامچندر جی کی صحرا نوردی خارج از علت تھی ؟

باپ کا قول نبھانے کی غرض سے چودہ سال جنگلوں میں دُکھ سہے - عزیزوں سے جدائی اختیار کی - لیکن جھوٹی عزت کو اختیار نہ کیا - ایک طرف راج پاٹ - والدین کا اصرار - رعایا کی التجا اور کوئی رکاوٹ راستے میں حائل نہ تھی - اور دوسری طرف سراسر مصائب و تکالیف - لیکن واہ رے (مریادا پرشوتم) فرضِ مجسم - ذرا ارادے کو متزلزل نہ ہونے دیا - اور خندہ پیشانی بنوں کو سدھارے - اور دنیا بھر کے لئے ایک مثال قایم کر گئے -

جملہ تواریخ ایسے کارناموں سے پُر ہیں -

پس مکمل انسان وہی ہے - جو حقیقی عزت کے مقابلے میں حرص و ہوا کو لات مارے - اور اپنی آن پر کٹ مرے کیا ہی اچھا ہو - اگر سکاؤٹ اپنے رویّہ سے یہ ثابت کردکھائیں - کہ عدالت میں بجائے ایمان یا دھرم کے ان سے یہ قسم لی جائے - کہ میں اپنی آن پر جو کچھ کہونگا - سچ کہوں گا - پس سکاؤٹ کا پہلا قانون اسی غرض سے مقرر کیا گیا ہے کہ سکاؤٹ کی عزت قابلِ اعتبار ہے -

قانونِ دوم

دُنیا بھر کے مصائب دور ہو جائیں - اگر ہر ایک انسان اپنے فرض کو سمجھے - اور اسے انجام دے - بیوی - بچے

بھائی بند۔ خویش و اقارب۔ دوست آشنا۔ والدین۔ افسر۔ ماتحت بادشاہ اور رعایا ہر ایک کے ذمے کوئی نہ کوئی فرض ہے جب تک ان میں سے ہر ایک اپنے فرض کو نبھاتا رہتا ہے۔ دنیا میں امن چین کا راج رہتا ہے۔ شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ لیکن جونہی ان میں سے کسی نے اپنے فرائض میں کوتاہی کی۔ نظام دُنیا درہم برہم ہؤا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم کو برقرار رکھنے کے لئے قانون و قواعد مرتب کرنے پڑے۔ تاکہ خطاوار کو سزا ملے۔ اور دوسروں کے لئے باعثِ عبرت ہو۔

سکاؤٹ کا دوسرا قانون اُسے فرائض کی ادائیگی کی تلقین کرتا ہے۔ تاکہ وہ اپنی زیست کے طریق کو ایسے سانچے میں ڈھال لے۔ کہ زندگی میں اسے نیچا نہ دیکھنا پڑے۔ چنانچہ یہ قانون ہدایت کرتا ہے کہ

"سکاؤٹ اپنے بادشاہ اپنے حاکم اپنے والدین اپنے ہمسروں اور اپنے ماتحتوں کا وفادار ہوتا ہے اور کسی سے دغا نہیں کرتا"

قانونِ سوم

ع
بنی آدم اعضائے یک دیگر اند + کہ در آفرینش ز یک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار + دگر عضوہا را نماند قرار

دنیا میں جتنے بھی پیر پیغمبر۔ اولیا۔ اوتار اور خدا رسیدہ بزرگ گزرے ہیں۔ سب کے سب خدمتِ خلق کو خدمتِ خالق کا درجہ دے گئے ہیں۔ اور سیوا کو خدائی وصال کا زینہ قرار دے گئے ہیں۔ کمزور انسان کی کیا مجال کہ جل جلالہ کی تجلّی کو نظر بھر کر دیکھنے کی تاب لا سکے۔ دنیا کے جیو۔ جنتو۔ چرند۔ پرند اور انسان کی سیوا ہی پرماتما کی بھگتی ہے اور وصالِ باری کا اعلیٰ ذریعہ! ع

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

چنانچہ سکاؤٹ کا تیسرا قانون اُسے ہدایت کرتا ہے کہ

"وُہ اپنے اندر سیوا کی قابلیت پیدا کرے اور بنی نوع انسان کی امداد کرے"

اسی بنا پر سکاؤٹ کے مختلف مشاغل اور اعزازی نشانات مقرر کئے گئے ہیں۔ تاکہ وقت پڑے پر سکاؤٹ اپنی علمیّت اور قابلیّت کا پورا استعمال کر سکے۔ اور ہر حالت میں چاق و چوبند چُست اور تیار پایا جائے۔

قانونِ چہارم

جس وقت سکاؤٹ کے اندر سیوا اور خدمت کی قابلیّت پیدا ہو گئی۔ تو وہ اس قابلیت کا جائز اور حقیقی استعمال

اسی وقت کرسکتا ہے۔ جب کہ اس کے اندر خدمت اور سیوا کے لیئے سچی خواہش اور دلی احساس ہو۔ پیشتر اس کے کہ کوئی شخص کسی کی خدمت کرتا ہے۔ اس کے اندر خدمت کے لئے خواہش پیدا ہونا ضروری ہے۔ اور یہ خواہش ذاتی اغراض کی بنا پر ہوسکتی ہے۔ یا محض اس شخص میں فطرتاً یہ جذبہ ہوتا ہے۔ کہ دوسروں کی تکالیف میں ان کا ہاتھ بٹائے۔ اور انہیں دُکھ سے نجات دے۔ سکاؤٹ کی خدمت کا معیار نہایت اعلیٰ ہونا چاہئے۔ اس کا لالچ یا صلے اور انعام کی غرض سے خدمت پر مستعد ہونا سکاؤٹ تحریک کو ذلیل کرنا ہے۔

پس یہ ضروری ہے کہ سکاؤٹ کی خدمت بلاغرض اور بمنزلہ فرض ہو۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس کے تعلقات کا دائرہ نہایت وسیع ہو۔ وہ دنیا کے ہر ایک انسان کو اپنا دوست شمار کرے۔ اور ہر دوسرے سکاؤٹ کو اپنا بھائی سمجھے۔

بعض اصحاب کو اس امر کا بہت گھمنڈ اور اطمینان ہوتا ہے کہ ایک قوم ان کی پُشت پناہ ہے۔ چہ جائیکہ سکاؤٹ جس کی برادری روئے زمین کے ہر حصے میں اس کی حمایت پر کمربستہ ہے۔ سکاؤٹ خدا سے اتر کر دوسرے درجہ پر دُنیا کے ہر ملک و قوم کے سکاؤٹوں کی اوٹ اور پناہ لئے ہوئے ہے۔

انگلستان کی عالمگیر جمبوری (World Scout Jamboree) کا عالیشان نظارہ اس امر کا شاہد ہے۔ کہ دنیا کے کونے کونے میں سکاؤٹ جمعیت صلح و آشتی کا پیغام لے کر گئی ہے۔ اور جنگ و جدل کے کلہاڑے کو سکاؤٹ تحریک کے بانی مبانی لارڈ رابرٹ بیڈن پاول نے ہمیشہ کے لئے زندہ درگور کر دیا ہے۔ صلح کے سنہری تیر ہر ملک و قوم کے سکاؤٹ نمائندوں کے ہاتھ میں اپنا اثر دکھائیں گے۔ اور خدا کرے وہ دن نزدیک ہو جبکہ سکاؤٹ تحریک کے ہاتھوں دنیا کے تنازعات اور منافرت کا قلع قمع ہو۔ لارڈ بیڈن پاول کی رقت آمیز اور دل گداز اپیل اپنا رنگ لائے۔ اور دنیا میں امن کا راج قائم ہو جائے۔

پس چوتھے قانون کی رُو سے سکاؤٹ کا فرض قرار دیا گیا ہے کہ

"وہ ہر انسان کو اپنا دوست خیال کرے اور ہر دوسرے سکاؤٹ کو بلا تمیز عہدہ یا کسی دنیاوی عزت کے اپنا بھائی شمار کرے۔"

قانون پنجم

کسی نے سچ کہا ہے کہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے درمیان ناخوشگوار تعلقات وقوع پذیر نہ ہوں۔ تو ہمارا فرض ہے۔ کہ ہم ان لوگوں سے ساتھ جن سے ہمارا دن رات واسطہ پڑتا ہے۔ خوش اخلاقی سے پیش آئیں۔ اگر ہم کسی کو شہد نہ کھلا سکتے ہوں۔ تو کم از کم ہمارا کلام تو شیریں ہو۔

پس سکاؤٹ سے امید کی جاتی ہے کہ وُہ خوش اخلاق بنے۔

قانونِ ششم

جب ہم خود راحت کے متلاشی ہیں۔ تو ہمیں زیب نہیں دیتا کہ ہم اوروں پر ظلم وستم روا رکھیں - اور خاصکر بے زبان چرند وپرند کو جو وفاشعاری اور خدمت میں انسان سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ محض تفریح و تماشے کی غرض سے ایذا پہنچانا گناہِ کبیرہ ہے اور سکاؤٹ کا چھٹا قانون اسے ہدایت کرتا ہے۔ کہ وہ جانداروں کے ساتھ مہربانی سے پیش آئے۔

قانونِ ہفتم

؎ بے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید + کہ سالک بے خبر نبود زراہ ورسم منزلہا

ضبط کا پہلا اصول فرماں برداری ہے۔ خدا جس کسی کو حاکم بناتا ہے وہ اسے حکمرانی کی صفات پہلے عطا کر دیتا ہے اور ماتحت کا فرض ہے کہ اپنے حاکم کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کرے۔ ورنہ دُنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ جو شخص فرماں برداری کرنا نہیں جانتا۔ وہ کبھی کامیاب فرمانروا نہیں بن سکتا۔ سنت کبیر نے فرمایا ہے ؎

پہلے داتا شِش بھیا، جن تن من اُرپا پاسیں
پیچھے داتا گورو بھیا جن نام کیا بخشیش

پس سکاؤٹ کے ساتویں قانون میں اُسے فرماں برداری کا سبق ملتا ہے۔ یعنی
سکاؤٹ اپنے افسروں کے احکام بلاحیل وحجت بجالاتا رہے

قانونِ ہشتم

؎ دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے + جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گزار دے

دکھ اور تکلیف اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ انسان کا فرض ہے کہ ان دکھوں کو برداشت کرنا سیکھے۔ اور ان کے رفع کرنے کی سبیل نکالے۔ نہ کہ دکھ کے بوجھ سے دب کر اپنی اور دوسروں کی زندگی دوبھر کر دے۔ سچ پوچھو تو

؎ مصیبت کا احوال ہر اک سے کہنا + مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ

اگر کوئی مشکل آپڑے۔ تو انسان کا فرض ہے کہ اسے حل کرنے کی تدبیر کرے۔ ایک فلاسفر کی نسبت بیان کیا گیا ہے۔ کہ وہ غلامی کی حالت میں اپنے ظالم آقا کی بہمہ نوع خندہ پیشانی سے خدمت کرتا۔ ایک مرتبہ ظالم آقا نے کسی کوتاہی پر اس کی ٹانگ کو شکنجہ میں ڈال کر اسے مروڑا۔ فلاسفر نے کہا:"اس سے زیادہ نہ مروڑیے، ورنہ ٹانگ

ٹوٹ جائے گی"۔ ظالم نہ مانا - ذرا اور مروڑا اور ٹانگ ٹوٹ گئی - لیکن واہ رے برداشت! فلاسفر صاحب کہنے لگے کہ "میں نہ کہتا تھا کہ ٹانگ ٹوٹ جائے گی - دیکھا ٹوٹ گئی کہ نا" پس قانونِ ہشتم سکاؤٹ کو ہدایت کرتا ہے - کہ وہ مشکلات کا مقابلہ مسکراہٹ سے کرے - اور سیٹی بجا کر غم غلط کرنے کی کوشش کرے -

قانون نہم

دور اندیشی اسی میں ہے کہ انسان اپنی ضروریات میں حد سے تجاوز نہ کرے - جتنی چادر دیکھے - اتنے پاؤں پھیلائے اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی کو مفت میں برباد نہ کرے - چنانچہ کفایت شعاری سکاؤٹ کا لازمی فرض ہے اور قانونِ نہم اس کی تلقین کرتا ہے -

قانون دہم

انسانی زندگی اعمال کا مجموعہ ہے - اور اعمال کا مسئلہ نہایت دقیق ہے - اعمال نیک ہو سکتے ہیں یا بد - ان کے نیک یا بد ہونے کا معیار نتیجہ پر منحصر ہے - اگر کسی عمل کے کرنے سے عامل و معمول کو سکھ اور آنند یا راحت اور خوشی حاصل ہوتی ہے - تو عمل نیک ہے - ورنہ برعکس نتیجہ برآمد ہونے پر اس عمل کے بد ہونے کا ثبوت مل جاتا ہے - دنیا میں سکھ - آنند - راحت اور خوشی حاصل کرنے کے لئے ہر کہ و مہ کوشاں ہے -

پس یہ لازم ٹھیرا - کہ اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے جو عمل اختیار کیا جائے وہ نیک ہو -

چنانچہ ہر ایک مذہب اپنے پیروؤں کو اعمال صالح کی تلقین کرتا ہے جن سے کہ دائمی راحت سکھ اور آنند پراپت ہو -

اب اعمال کی تین صورتیں ہیں - یعنی منسا - باچا - کرمنا - یا خیالات - اقوال اور افعال - مثال کے طور پر یوں سمجھئے - کہ ہمارے دل میں کسی عمل کے کرنے کی خواہش یا خیال پیدا ہوتا ہے - ہمارے اندر ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے - خواہ ہم نے اس کے بیرونی اظہار سے بیشتر ضبط سے کام لیا - لیکن ہمارا دیہ - ہمارا بشرہ - چشم بینا پر ہمارے اندرونی جذبات کا انکشاف کر دیتا ہے -

اس عمل کا اظہار ہم بول کر زبان سے کر سکتے ہیں - اور تیسرے درجہ پر اسی خیال کو ہم کسی فعل کی شکل میں عملی جامہ پہنا سکتے ہیں - پس ہر مذہب میں اس امر کی بار بار تاکید کی گئی ہے کہ ہمیں خیالات - اقوال اور افعال سے کسی کو دکھ نہیں پہنچانا چاہیئے - بلکہ سچ پوچھو تو اکیلے اس اصول پر کاربند ہونے سے انسان دنیا و عاقبت میں دونو جگہ عہدہ برآ ہو سکتا ہے -

اور سکاؤٹ کا آخری قانون ہر مذہب کے نقطۂ نگاہ سے ایک ایسی اعلیٰ تعلیم ہے - کہ جس کے زیر اثر سکاؤٹ خود بخود اپنے مذہب کا حقیقی پیرو بن سکتا ہے - عالم بننا آسان ہے - لیکن عامل بننا مشکل ہے - پس جب تک کہ بچے کو شروع سے بغیر

مذہبی زنجیروں کی قید کے اعمال پاکیزہ کی جانب راجع نہ کیا جائیگا۔ اور اسکی عادات راسخ نہ کی جائینگی۔ خدشہ ہے۔ کہ بڑا ہو کر اپنے مذہب کے اصولوں پر کاربند ہونے سے قاصر رہے۔ چنانچہ سکاؤٹ کا دسواں قانون اسے خیالات، اقوال، افعال میں پاکیزہ رہنے کا سبق دیتا ہے۔

سکاؤٹ قوانین کا مقصد اور مدعا مختصراً بیان کردینے سے یہ امر واضح ہوچکا ہے۔ کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے قول کے دھنی ہوں۔ وہ وفاکیش اور فرض شناس بنیں۔ وہ سعادت مند اور فرمانبردار رہیں۔ ان میں استقلال و تحمل کی عادات پیدا ہوں۔ وہ کفایت شعار بنیں۔ اور پاکیزہ خیال۔ خوش اقوال اور نیکو افعال رہیں۔ ان میں قربانی اور ایثار نفسی کا جذبہ پیدا ہو۔ وہ حقیقی محبت کے رنگ میں رنگے جائیں۔ تو سکاؤٹ تربیت سے بہتر اور کوئی تربیت جو ہر ایک ملک و قوم اور ہر مذہب و ملت پر یکساں عائد ہوسکے۔ آج روئے زمین پر نظر نہیں آتی۔

یہ امر واضح رہے کہ یہ تعلیم و تربیت اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہے۔ جب کہ سکاؤٹ ماسٹر خود اس تربیت سے بہرہ ور ہوں۔ اس کے اصولوں سے ماہر اور ان پر عملی طور پر سچے دل سے کاربند ہوں۔ اور وہ اپنے زیر تربیت سکاؤٹوں کو اپنے رنگ میں رنگنے کی قابلیت رکھتے ہوں۔

انگلستان کے ۱۹۲۹ء کی عالمگیر جمبوری (World Scout Jamboree.) میں بین الاقوامی محبت اور پریم کے جو نظارے دیکھنے میں آئے۔ وہ نہایت حوصلہ افزا تھے۔ جاپانی، ترکی یا جرمن، ہندوستانی انگریز یا امریکن، حبشی، فرانسیسی، برازیلین غرضکہ ہر ایک ملک و قوم کے بچے حقیقی بھائیوں کی طرح ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ آپس میں ہنستے، کھیلتے تھے اور خندہ پیشانی سے ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ عجب گلزار تھا جس میں تمام روئے زمین کے گلہائے گوناگوں اپنی رنگ و بو سے تماشائیوں کے دلوں میں صلح و آشتی کے سرور کی جھلک پیدا کرتے تھے۔ اور سکاؤٹ تحریک کے جد امجد لارڈ بیڈن پاول کے تشریف فرما ہونے پر کس ناز و انداز سے اس کے قدموں پر نثار ہونے کے لئے آمادہ نظر آتے تھے۔ یہ نظارہ دیکھنے سے ہی تعلق رکھتا تھا۔

سب نے ہم آہنگ ہوکر لارڈ بیڈن پاول کی آمد پر (He is a jolly good fellow.) کا نغمہ جو کیفیت سامعین کے دلوں پر پیدا کرتا تھا۔ وہ مدت العمر کانوں میں گونجتا رہے گا۔

خاتمہ پر درگاہ ایزدی میں دعا ہے کہ ہم ہندوستانیوں کو توفیق دے۔ کہ ہم اپنی خامیوں کو دور کرکے دیگر اقوام کے دوش بدوش خدمت خلق بجا لائیں۔ اور دنیا سے رنج و الم کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکیں۔ آمین۔

سکاؤٹ تحریک کا مقصد منجملہ مندرجہ بالا مقاصد کے ایک ہی جملے میں بیان کیا جاسکتا ہے کہ آنے والی نسل کے میلان طبع اور چلن کو ایسے معیار پر لانا ہے۔ کہ وہ اپنی زندگی کو ادائیگی فرض کا ایک مسلسل اور طویل زمانہ خیال کریں۔ اور مفید شہری بنیں وہ اپنا بوجھ خود اٹھانے کے قابل ہوں۔ وہ دوسروں کے راستے میں حائل نہ ہوں۔ بلکہ دوسروں کے مدد و معاون بنیں۔

وہ زندگی کو وبالِ جان خیال نہ کریں۔ بلکہ اس میں دلچسپی لیں۔ اور دوسروں کی زندگی دلچسپ بنائیں۔ دنیا کی دکھوں کی تخفیف کریں۔ اور بنی نوع انسان کے لئے حقیقی راحت کا دروازہ کھولیں۔

نواب غلام احمدیار خاں احمدی کے مندرجہ تحت اشعار نہایت وضاحت سے سکاؤٹ کے فرائض کو بیان کرتے ہیں:—

معیّن وقت تک تجھ کو ملا ہے سیر کا فرماں ۔۔۔ غرض یہ تھی کہ جب ہو جلوہ بخشِ گلشنِ امکاں!

ترے آنے سے ہوں سب ہمصفیرانِ چمن شاداں ۔۔۔ چلن سے تو عزیزِ دل ہو ان کا اور سرورِ جاں

تو ہر اک حال میں ان کا شریکِ ہمنوائی ہو

دلوں میں ان کے جا ہو تیری سینوں میں سمائی ہو

مصیبت جس کو پیش آئے تو اس کا آشنا تُو ہو ۔۔۔ کوئی ماتم زدہ پائے تو اس کا غم ربا تُو ہو

کوئی ہو راہ گم کردہ تو اس کا رہنما تُو ہو ۔۔۔ غرض ہر زخم کا مرہم ہو ہر دکھ کی دوا تو ہو

جہاں مشکل کی پڑ جائے گرہ ناخن ترا کھولے

تو ہر اک درد میں شامل ہو ہر آواز میں بولے

جہاں کانٹے نظر آئیں کرے تو صاف وہ رستہ ۔۔۔ تجھے ہر دم برہنہ پائے بیکس کا رہے کھٹکا

نہ ہو پامالِ گلچیں سبزۂ خوابیدہ گلشن کا ۔۔۔ جلانے پائے گلبن کو نہ بادِ گرم کا جھونکا

لڑیں دو بلبلیں تو ثالثِ باخیر تو ہووے

معاون ہو کے ہادی بنکے گرمِ سیر تو ہووے

قدیم ہندوستان میں

ہندوؤں کا طریقۂ تعلیم

(جناب سید خادم حسین صاحب رضوی ایم۔ اے)

قدیم یونانیوں کی طرح ہندوستانی بھی فلسفہ کا شوق لے کر پیدا ہوئے تھے۔ اور مذہب کے شیدائی تھے۔ یعنی فلسفہ انکی جبلت اور مذہب طبیعت ثانیہ تھا۔ قدرتاً اُن کی تعلیمی درسگاہیں اس رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔ یہ فلسفہ کے پُتلے۔ مذہب کے مجسمے۔ شہری زندگی سے سخت متنفر۔ جنگل کو اپنی بہترین جائے اقامت سمجھتے تھے۔ لیکن علم کے پروانے جہاں یہ شمع روشن ہوتی تھی۔ اڑکر پہنچتے تھے۔ جب شہری زندگی نے ترقی پائی۔ اور عامۃ الناس کے لئے اپنے بچوں کو آبادی سے دُور بھیجنا دشوار محسوس ہونے لگا۔ تو شہروں میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لیکن ان کا اعتقاد پھر بھی یہی رہا۔ کہ حصولِ علم ومعرفت کے لئے جنگل کا گوشۂ تنہائی ہی نہایت موزوں مقام ہے۔ یہیں انسان فتنہ ہائے عالم سے بچ کر آرام وسکون کی زندگی بسر کرسکتا ہے۔ دنیا کے جھگڑوں سے آزاد۔ پیٹ کے دھندوں سے بے نیاز۔ فرشتہ صورت شیطان سیرت مکّار، دغابازوں کی صحبت سے دُور۔ حرص وہوا کے جنجال سے علیحدہ سادگی۔ سچائی اور زُہد کی زندگی بسر کرسکتا ہے۔ اِرد گرد جویانِ حق کے جمگھٹے ہیں۔ علم ومعرفت کے چرچے ہیں۔ کیوں نہ ہو ایسی ہی اور فقط ایسی ہی زندگی ان بزرگوں کی پسندِ خاطر ہوسکتی تھی۔

وہاں ان سب کا رتبہ یکساں ہوتا تھا۔ غلام اور آقا میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ امیر وغریب۔ شاہ وگدا۔ راجہ ورعیت سب مساوی سمجھے جاتے تھے۔ شہروں اور دیہاتوں میں جابجا لاتعداد سکول کھلے ہوئے تھے۔ اور ٹکیسلا۔ بنارس۔ ندیا وغیرہ بڑے بڑے شہروں میں یونیورسٹیاں تھیں۔ جہاں دور دراز علاقوں سے طالب علم اعلےٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے جوق درجوق آتے تھے۔ یہ تمام یونیورسٹیاں رہائشی ہوتی تھیں۔ اور ہر ایک اتنا رقبہ سنبھالے ہوئے تھی۔ کہ اس میں عمارات ضروری کے علاوہ سبزہ زار اور ان میں چھوٹی چھوٹی ندیاں۔ عجائب خانہ اور چڑیا گھر بھی شامل تھے۔

یہ تمام عمارات پختہ ہی نہیں ہوتی تھیں۔ ان میں سے بعض بلکہ بیشتر کی یہ حالت تھی۔ کہ صرف گارے کی چار دیواری بنائی۔ تاڑ کھجور اور ساکھو وغیرہ کی بلّی رکھی۔ اور گھاس پھوس کا چھپر ڈال لیا۔ علاوہ ازیں ان جھونپڑوں میں کوئی قابل ذکر سامان بھی نہیں ہوتا تھا۔ لڑکے چٹائیوں پر یا قدرت کے مخملی فرش پر سبزہ زاروں میں بیٹھ کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اور ان کے

معلم بغیر خاص امتیاز کے ان کے درمیان تشریف فرما ہوتے۔
اس سادگی کا یہ فائدہ تھا۔ کہ جہاں ضرورت ہوئی فوراً درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا جا سکتا تھا۔ بزرگوں کو کبھی مالی دقتوں کی تکلیفیں پیش نہ آئیں۔ کسی قریب کے درخت کا سایہ جماعت بٹھانے کے لئے نہایت موزوں ہوتا۔ اور اگر موسم کی خرابیوں نے تنگ کیا۔ تو نزدیک کا برآمدہ سب سے عمدہ جائے پناہ تصور کی جاتی تھی۔ اس طور پر سرمایہ کی قلت ان پرانے لوگوں کی تعلیمی ترقی کے راستے میں ہرگز حائل نہ ہو سکتی تھی۔

فیس

ہر ایک برہمن کے لئے تعلیم دینا فرض ہوتا تھا۔ اور ان کو فیس یا کسی قسم کا معاوضہ لینے کی سخت ممانعت ہوتی تھی۔ البتہ جب کوئی شاگرد فارغ التحصیل ہو جاتا۔ تو اس سے وہ تحفے کے طور پر کچھ عطیہ منظور کر لینے کا مجاز تھا۔

اخراجات

چونکہ عمارتیں اور سامان سکول بہت معمولی ہوتا تھا۔ اس لئے اخراجات سکول بھی نہایت معمولی ہوتے تھے۔ اور جو کچھ تھوڑا بہت ہوتا اُسے عام لوگ مل کر پورا کر دیتے۔ لیکن بڑی بڑی درسگاہیں اور یونیورسٹیاں راجاؤں اور رئیسوں کے عطیات کے بل پر قائم تھیں۔ وسیع رقبۂ زمین لگان سے بری ان کے سپرد کر دیا جاتا۔ اور علاوہ ازیں کافی مستقل سرمایہ اُن کے پاس جمع رہتا تھا۔ جو طلباء امیر گھرانوں سے آتے۔ انہیں اپنے تمام زمانہ تعلیم کا خرچ آغاز میں جمع کرانا پڑتا۔ مگر اس کے بعد ان کو دیگر طلباء کے ساتھ مساوی درجے پر زندگی بسر کرنا ہوتی تھی۔ امیر غریب میں کوئی امتیاز نہ ہوتا تھا۔ اور سب کو یکساں خوراک و لباس ملتا۔ مگر چھوٹی چھوٹی درسگاہوں میں طلباء اپنے لئے اور اپنے اساتذہ کے لئے خورونوش کا سامان در بدر بھیک مانگ کر مہیا کرتے تھے اور یہی رواج قرونِ وسطیٰ میں یورپ کی قدیم درسگاہوں میں پایا جاتا تھا

طالب علم کے فرائض

شاگردوں کو ادائیگی فرائض کے علاوہ استاد کے تمام خانگی امورات کو سرانجام دینا ہوتا تھا۔ وہ ہر وقت اپنے اُستاد کے احکام کے لئے دست بستہ منتظر رہتے۔ گویا وہ ان کے بلا تنخواہ خدام تھے۔ ان کا زمانۂ تعلیم خاص نظام کے ماتحت ہوتا۔ اور ان کو اخلاقی طور پر ایک خاص سانچے میں ڈھالا جاتا تھا۔ چنانچہ منو نے اپنے آئین میں چند ان اخلاقی جسمانی۔ معاشرتی اور مذہبی پابندیوں کا ذکر کیا ہے۔ جن پر کاربند ہونے کے لئے اس زمانے میں طلباء کو خاص تاکید ہوتی تھی۔ ملاحظہ ہوں:-

طلباء کو ہر روز نہانا ضروری ہوتا تھا۔ شہد اور گوشت کا کھانا۔ خوشبو اور پھولوں کے ہار کا استعمال۔ دن کو سونا۔ سُرمہ لگانا۔ گاڑی پر چڑھنا۔ جوتا پہننا۔ محبت۔ غصہ۔ لالچ۔ ناچنا۔ گانا بجانا اور تفریح کے لئے نہانا۔ یہ سب چیزیں منع تھیں۔ اور کم و بیش ان کی پابندی کی جاتی تھی۔ طالب علموں کے لئے اپنی زبان۔ ہاتھ پاؤں اور بھوک پر قابو رکھنا۔ شراب اور دیگر نشئی چیزوں سے پرہیز کرنا ضروری تھا۔ سچ بولنا اور بڑوں کا ادب کرنا اُس کے حُسنِ اخلاق میں داخل تھا۔

مگر بندشیں صرف طلباء پر ہی عاید نہ ہوتی تھیں۔ بلکہ استادوں کے لئے بھی مقرر تھیں۔ مالی یا ذاتی اغراض کو مدِ نظر رکھ کر پڑھانا ان کے نزدیک مکروہ تھا۔ اور وہ درس و تدریس کو اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ شاگردوں کو بیٹوں بجا سمجھنا ہندوستان کے قدیم اساتذہ کا عام رویہ تھا۔ اور ان کا قول تھا کہ "قہرِ استاد بہ ز مہرِ پدر" اور ان کا خیال تھا کہ طلباء میں اعلیٰ معیار تعلیم قایم کرنا اور حُسنِ اخلاق پیدا کرنا اسی صورت میں ممکن تھا۔ جب کہ ایک شاگرد کے لئے ایک استاد مقرر ہو۔ گو اس نعمت سے عامۃ الناس محروم تھے۔ اور صرف رؤسا ہی کو میسّر آ سکتی تھی۔ تاہم ایک استاد کو نہایت ہی مختصر جماعت کا اتالیق بنایا جاتا تھا۔ وہ اکیلا ہی از ابتدا تا انتہا اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتا تھا۔ یعنی یہ موجودہ رواج کہ ہر ایک جماعت کے لئے علیحدہ استاد ہونا چاہیئے۔ ان دنوں معدوم تھا۔ اور اس کا یہ فائدہ تھا۔ کہ وہ لڑکوں کے اخلاق کی اچھی طرح جانچ پڑتال کر سکتا۔ اور اس طرح ان کا صحیح مربّی بن سکتا تھا۔ قدرتاً لڑکوں کو بھی اپنے استادوں سے کمال اُلفت پیدا ہو جاتی تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ بخلاف رواج ولایت ملک ہندوستان میں درسگاہ کو نہیں بلکہ اُستاد کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ انگلستان والے اپنی درسگاہوں پر ناز کرتے ہیں۔ مگر اہلِ ہند اپنے خاص اساتذہ پر۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ یہ خیال اب بھی لوگوں کے دماغوں سے نہیں گیا۔ کہ بہترین استاد وہ ہے۔ جو ہر وقت طلباء کے درمیان رہے۔ اور ہر ایک مسئلے پر روشنی ڈالے۔ مشکلاتِ علمی کو حل کرے۔ اور دیگر حل طلب امور پر نصیحت کرے۔ مگر جو استاد صرف مقررہ وقت پہ آئے۔ اور پڑھا کے رفو چکر ہو جائے۔ اور پھر سارا دن نظر نہ آئے۔ اُسے ہمارے بچّے مغرور سمجھتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں۔

مضامینِ نصاب

ہر وقت سوچنا اور غور کرتے رہنا آرین کی فطرت تھی۔ اور مذہب طبیعت ثانیہ۔ اس وجہ سے عاقبت کا خیال اُن کے دماغ میں ہر وقت جاگزیں رہتا تھا۔ جس سے اِس دنیا کی ان کی نظر میں کوئی وقعت نہ تھی۔ ان حالات میں ظاہر ہے۔ کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم ہی ایسی دیتے تھے۔ جس سے ان کی عاقبت سنور جائے۔ اور لازماً اس قسم کی تعلیم سے زیادہ ذہنی ترقی ناممکن تھی۔ اس کے علاوہ ان کے اس خیال نے "کہ ہر ایک انسان اپنی ذات کے مطابق ایک خاص کام کے لئے پیدا ہوا ہے" ان کے تعلیمی دائرے کو اور بھی محدود کر دیا تھا۔

گویا ایک طرف تو "دوسری دنیا کی تیاری" کے خیال نے ذہنی ترقی کے دائرے کو محدود کر دیا تھا۔ دوسری طرف ذات پات کے سلسلے نے غیر برہمنوں کے لئے تعلیم تقریباً ناممکن کر دی تھی۔ وہ صرف اس قدر تعلیم حاصل کرتے تھے جو ان کے کاروبار کے واسطے ضروری تھی۔

اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ان کا زاویہ نگاہ ہمیشہ تنگ رہا۔ اور اس لئے صدیوں تک صرف ویدوں کی تعلیم پر لوگوں نے اکتفا کی۔ مگر یہ بھی فقط برہمنوں کے لئے مخصوص تھی۔ اور عامۃ الناس اس نعمت سے محروم تھے۔

لیکن تحصیل وید کے لئے گرائمر۔ تلفظ اور علم الالسنہ کی ضرورت تھی۔ لہٰذا یہ مضامین بھی نصاب میں داخل کر لئے گئے۔ علاوہ ازیں ہندوؤں کی مخصوص طرز عبادت کا تقاضا تھا۔ کہ علم النجوم اور ہندسہ وغیرہ کی تحصیل کی جائے۔ اور اسطرح خود بخود ضرورت کے مطابق جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ نصاب تعلیم میں توسیع ہوتی گئی۔ شہری زندگی نے ترقی پائی۔ اور آریہ ورت کی ترقی پذیر تہذیب نے مختلف علوم و فنون کے ایجاد پر اصرار کیا۔ چنانچہ چندر گپت کے زمانے ہی میں منطق۔ حکمت و فلسفہ۔ سیاسیات۔ فن عمارت۔ علم نباتات و حیوانات۔ طبیعیات و کیمیا اور حساب و جیومیٹری وغیرہ ایسے علوم نے خوب رواج پا لیا تھا۔ اور مختلف درسگاہوں کو مختلف شعبوں میں عروج حاصل تھا۔

غرضکہ جوں جوں انسانی ضروریات بڑھتی گئیں۔ علم کی شاخیں بھی پھیلتی گئیں۔ لیکن اس کا مطالعہ ہمارے لئے اس قدر اہم نہیں۔ جتنا پرانے رشیوں کا طریقہ تعلیم۔

طریقہ تعلیم

جب میسوپوٹیمیا سے لکھائی ہندوستان میں آئی۔ اس کے پہلے اور بعد بھی تقریری اسلوب پرانے معلموں کے ہمیشہ پسند خاطر رہا ہے۔ استاد شاگرد دونوں کتاب سے بے نیاز تھے۔ اور شاگرد کا فقط یہی فرض تھا۔ کہ جب استاد لب کشا ہو۔ اس کو گوش ہوش سے سُنے۔ اور بار بار دُہرائے حتیٰ کہ سبق ذہن نشین ہو جائے۔ حل طلب نکات کی توضیح اور مشکل مسائل کی تشریح کی جاتی تھی۔ اس مقصد کے لئے شاگرد استاد کے گرد حلقہ باندھ لیتے۔ اور جو شلوک وہ سناتا۔ اُس کے پیچھے پیچھے دُہراتے جاتے۔ مگر اس طریقہ سے اکثر طلبار کا دل اُچاٹ ہو جاتا تھا۔ اور معلم کہانیوں اور لطیفوں سے اس کو دلچسپ بناتے تھے۔ اس فن میں ان لوگوں کو کمال مہارت حاصل تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ داستان و حکایت افسانہ و قصہ گوئی اور تمثیلات کے لئے ہندوستان مشہور ہے۔

اپنشدوں میں فلسفہ کی تعلیم حکایتوں اور نظیروں کے ذریعے سے دی گئی ہے۔ اور پنچ تنتر اور ہتوپدیش کے مصنفین نے اس طریقے کو تعلیم اخلاق کے لئے مخصوص ہی کر دیا ہے۔

بہرحال پرانا طریقہ تعلیم انفرادی تھا۔ اور ایک استاد کے لئے ایک شاگرد کافی سمجھا جاتا تھا۔ گو عملی طور پر یہ سمائے

راجاؤں کے سپوتوں کے اور کسی کے لئے ممکن نہ تھا۔ تاہم اس امر کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ کہ جماعت نہایت مختصر ہو۔ اور استاد ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ سبق دے۔ جو لڑکے زیادہ ہشیار۔ ذہین اور چالاک ہوتے تھے۔ وہ استاد کو مدد دیتے۔ اور یہ مانیٹر مقرر کرنے کا طریقہ نہایت مستحسن تھا۔ اس سے نہ صرف استاد کی ہی کمال اعانت ہوتی۔ بلکہ بڑے لڑکوں کو اپنا سبق دہرانے اور احساس ذمہ داری کے لئے نہایت معقول موقع مل جاتا۔ انیسویں صدی میں جب ڈاکٹر آرنلڈ بیل ہندوستان میں تشریف لائے۔ تو وہ اس طریقے سے بہت متاثر ہوئے۔ اور اپنی واپسی پر انہوں نے ولایت کے سکولوں میں اس مانیٹوریل طریقے کو رواج دینے کا تہیہ کیا۔

زمانہ تعلیم و تربیت

مدبران سلف نے زندگی کو چار حصوں میں تقسیم کر کے پہلے حصے کو تحصیل علم کے لئے وقف کیا۔ عام طور پر یہ مدت بارہ سال مقرر تھی۔ اور اس میں ایک وید نہایت آسانی سے ختم ہو سکتا تھا۔ مگر اکثر شوق والے اپنی تمام زندگی کو اس کار نیک کے لئے وقف کر دیتے تھے۔ سکول جانے کا وقت برہمن لڑکے کے لئے ۸ سال۔ کشتری کے لئے ۱۰ سال اور ویش کے لئے گیارہ سال کی عمر سے شروع ہوتا تھا۔ مگر یہ میعاد مقررہ تصوری (Ideal) تھی کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اپنی تعلیم کو بہت جوان ہو کر شروع کرتے تھے۔

سزا

استاد اپنے طلبا کو سزا دینا نہایت معیوب سمجھتے تھے۔ گوتم اپنے درشن میں لکھتا ہے کہ عام طور پر طالب علموں کو جسمانی سزا ہرگز نہیں دینا چاہئے۔ مگر اصلاح کے لئے اگر کوئی راہ نہ ملے تو فقط پتلی رسی یا بید سے مارنا چاہئے۔ اگر کوئی استاد بچے کو کسی اور چیز سے مارے تو وہ دربار شاہی میں مستوجب سزا ہے۔ منو نے بھی اس خیال کی تائید کی ہے۔ اور صرف رسی یا بانس کی لکڑی سے پیٹھ پر مارنے کی اجازت دی ہے۔ اور کسی عضو نازک پر لگنے کو جرم قرار دیا ہے۔

طالب علموں کو نہایت اعلیٰ تربیت دی جاتی تھی۔ نظم و نسق نہایت عمدہ ہوتا تھا۔ مگر کیا مجال کہ اس میں سختی و درشتی کی جھلک تک بھی ہو۔ استاد شاگرد دونوں ایک نہایت عمدہ اخلاق اور چال چلن کا نمونہ ہوتے تھے استاد شاگرد کو بیٹے سے بڑھ کر عزیز رکھتا۔ اور شاگرد کی کیا مجال کہ استاد کے سامنے اونچا سانس بھی لے معلم کو کوئی انعام و تحفہ یا فیس کا لالچ نہ تھا۔ اور وہ درس و تدریس کو فقط ایک فرض انسانی سمجھ کر انجام دیتا تھا بالمقابل اس کے شاگرد اطاعت و فرمانبرداری کو اپنا شیوۂ زندگی خیال کرتا تھا۔ ریاکاری تصنع اور گستاخی سے کوسوں بھاگتا

سادگی اخلاص اور حُسن خلق کی اسے ہر وقت نصیحت ہوتی تھی - اور ہمیشہ پابندئ وقت مستعدی - غیروں کی عزت اور ذاتی وقار برقرار رکھنے کی تعلیم ہوتی تھی۔ غریب ہو یا امیر استاد کے لئے دونوں ایک تھے - اور ان کے باہمی تعلقات ایسے خوشگوار ہوتے تھے - جیسے پدرِ مہرباں اور فرزند فرماں بردار کے -

قصّہ مختصر یہ ہیں وہ اصول جو اسلاف سے ہمیں وراثت میں ملے ہیں۔ ہمارے موجودہ طریقہ تعلیم کے جاری کرنے والوں نے ان کی طرف بے اعتنائی اختیار کی اور اس کا نتیجہ ہم آج بھگت رہے ہیں - نہ بچوں میں اخلاص ہے نہ سادگی - راستی نام تک کو پاس پھٹکنے نہیں پائی - اور بزرگوں کی عزت کیسی - انہوں نے چھوٹے بڑے سب کو اپنی گستاخیوں سے نالاں کر رکھا ہے - کون ہے اس زمانے میں جس کو ہمارے نوجوان تعلیم یافتوں سے شکوہ نہیں - ماں باپ کہتے ہیں کہ ہمارا کوئی کہا نہیں مانتا - استاد کو شکایت ہے کہ اس کی مطلق عزت نہیں - صنف نازک شکوہ سنج ہے کہ سوسائٹی میں قطعاً ان کا احترام نہیں - اور بزرگان قوم و ملت کو گلہ ہے - کہ نئی پود کی گھٹی میں سرکشی پڑی ہے غرض جسے دیکھو شاکی ہے - سر رابندر ناتھ ٹیگور نے اس مرض کی خوب تشخیص کی ہے - ان کا خیال ہے کہ ہندوستان میں علم کا صحیح چرچا ہو نہیں سکتا - تاآنکہ ہم اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر نہ چلیں - اور اس مرض کا انہوں نے یہ علاج سوچا ہے - کہ پرانے طریقۂ تعلیم کو پھر از سرِ نو رواج دیا جائے - چنانچہ اسی مقصد سے "شانتی نیکیتن" انہوں نے ایک درسگاہ کھولی ہے - جو اپنے مقاصد میں بالکل موجودہ ہے - مگر طریقے میں ٹکسیلا کا نمونہ ہے -

خدا کرے ان کی محنت بارآور ہو - آمین

حساب کی درست تعلیم

(جناب لالہ برکت رام صاحب کھوسلہ بی اے، بی ٹی، بی ای ایس)

یونیورسٹی کے میٹریکولیشن امتحان کے نتیجہ نکلنے پر عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ طلبا کی زیادہ تعداد حساب میں فیل ہوتی ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اس دفعہ حساب کے پرچہ جات بہت مشکل تھے۔ اور کبھی کہا جاتا ہے کہ ممتحن صاحبان نے عجیب سوالات دیئے اور کبھی کہا جاتا ہے کہ طلبا اس مضمون کو محنت سے تیار نہیں کرتے۔ اصل مرض کی تشخیص نہیں کی جاتی۔ میرے خیال میں حساب کی تعلیم کی بنیاد پختہ نہیں ہوتی۔ اور مختلف جماعتوں میں پچھلے قاعدے اچھی طرح سے دہرائے نہیں جاتے۔ آؤ دیکھیں کہ حساب کی تعلیم کی بنیاد کس طرح سے رکھی جاتی ہے۔

مدرسین کی عموماً تعلیم مڈل تک ہوتی ہے۔ وہ حساب کی درست تعلیم کے طریقوں سے بے خبر ہیں۔ - - اس میں شک نہیں کہ بعض سکولوں میں مڈل پاس استاد بہت اچھا کام کرتے ہیں۔ مگر میرا اشارہ عام استادوں کی طرف ہے دیکھا گیا ہے۔ کہ طلبا کو گنتی ڈنڈے کے زور سے بار بار دہرا کر یاد کرائی جاتی ہے۔ مرئی توضیحات کو استعمال نہیں کیا جاتا۔ اگر بچے ایک سے سو تک گن دیویں تو ممتحن صاحبان۔ والدین اور استادوں کی تسلی ہو جاتی ہے۔ حالانکہ دیکھنا تو یہ تھا کہ اعداد کے درست تصورات بچوں کے اذہان میں قایم ہوئے ہیں یا نہیں۔ مرئی توضیحات سے بار بار عمل کرا کر تصورات کو پختہ کرنا چاہیئے۔ کوڑیاں۔ ریٹھے۔ گولیاں۔ منکے۔ تیلیاں۔ املی کے بیج۔ کنکر وغیرہ بکثرت مل سکتے ہیں۔ ان کے ذریعہ اعداد کے درست تصورات ذہن نشیں کرائے جائیں۔ طلبا چیزوں کے چھوٹے گروہوں کو فوراً پہچان سکیں۔ تعداد کی نسبت اندازہ لگا سکیں۔ تعداد کو زبانی دہرا کر ان کے درست تصورات میں تمیز کرانی چاہیئے اعداد کی دہرائی سے ضرور مدد لینی چاہیئے۔ شروع شروع میں جمع اور تفریق کے نہایت سادہ سوالات بذریعہ اشیار کرانے چاہیئیں۔ اور عملوں سے اس قدر مشق کرانی چاہیئے۔ کہ ان کے نتائج خود بخود یاد ہو جائیں۔ مثلاً ۱+۱، ۲+۱، ۳+۱، ۴+۱، ۵+۱ وغیرہ وغیرہ یا ۱+۲، ۲+۲، ۳+۲، ۴+۲، ۵+۲ وغیرہ وغیرہ یا ۱+۳، ۲+۳، ۳+۳، ۴+۳، ۵+۳ وغیرہ وغیرہ یا ۱۰-۱، ۹-۱، ۸-۱، ۷-۱، ۶-۱ وغیرہ وغیرہ یا ۱۰-۲، ۹-۲، ۸-۲، ۷-۲، ۶-۲ وغیرہ وغیرہ یا ۱۰-۳، ۹-۳، ۸-۳، ۷-۳، ۶-۳ وغیرہ کے نتائج بذریعہ اشیاء اس قدر پختہ کرائے جائیں۔ کہ طلبا ان میں سوں

کو زبانی بتا سکیں۔ بعد ازاں اس قسم کی مہارنی میں مشق کرائی جا سکتی ہے۔ پہلی جماعت سے ہی آسان آسان عبارتی سوال کرائے جائیں۔ **مثلاً** میرے پاس آٹھ پیسے ہیں۔ میں نے تین پیسے خرچ لیئے۔ باقی کتنے پیسے میرے پاس رہے۔ یا میرے پاس دو پیسے اور میرے بھائی کے پاس چار پیسے ہیں۔ ہم نے پیسے اکٹھے کر لئے۔ کل کتنے پیسے ہوئے۔

حساب میں تعلیم کا آغاز مرئی توضیحات سے یعنی بذریعہ اشیا ہونا چاہیئے۔ مگر طلبا کو ہر وقت انہیں توضیحات میں نہ رکھنا چاہیئے۔ اشیاء کے استعمال سے یہ مراد ہے کہ اعداد کے تصورات پختہ ہوں۔ نہ یہ کہ طلبا بغیر استعمال اشیا کام ہی نہ کر سکیں۔ اور توضیحات مرئی کے غلام بن جائیں۔ آگے چلکر پہاڑے طلبہ کی مدد سے بنوائے جائیں۔ یہ نہیں کہ استاد نے دو یا تین کا پہاڑہ زبانی بتا دیا۔ اور بذریعہ مہارنی طلبہ کو یاد کرا دیا۔ بذریعہ گولیاں یا تیلیاں یا بال فریم طلبا ۲×۲، ۲×۳، ۲×۴ وغیرہ وغیرہ کو اچھی سے سمجھیں۔ بعد ازاں ان کو ازبر کر لیں۔ کیونکہ پہاڑے اچھی طرح یاد نہ کرنے سے سوالات نکالنے میں دقت ہو گی۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض اوقات دسویں جماعت کے طلبار کو پہاڑے اچھی طرح سے یاد نہیں ہوتے۔ وہ قاعدہ جانتے ہوئے سوالوں کے جوابات غلط نکال لیتے ہیں۔ یا ان عملوں پر بہت سا وقت صرف کرتے ہیں۔ میں نے میٹرکیولیشن کے امتحان میں طلبا کو دو پر تقسیم کرتے ہوئے لمبی تقسیم سے عمل کرتے دیکھا ہے۔

دوسرے پہاڑے یاد کرتے وقت اگر طلبہ یہ بات سمجھ لیویں کہ ۲×۳ یا ۳×۲ ایک ہی بات ہے تو ان کی محنت پہاڑے یاد کرنے میں نصف رہ جائیگی۔ اس وقت بھی عبارتی سوالوں سے کام لینا چاہیئے۔ مثلاً ایک جماعت میں ۶ لڑکے ہیں۔ اگر ہر ایک لڑکے کو چھ چھ لڈو دیئے جائیں۔ تو کل کتنے لڈو خرچ ہوں گے؟ یا ایک جماعت میں ۱۲ لڑکے ہیں۔ اگر کل فیس ۹۶ آنے ہو۔ تو بتاؤ ہر ایک لڑکا کتنی فیس دیتا ہے؟

میرے تجربہ میں آیا ہے کہ طلبا، ضرب و تقسیم کے لمبے لمبے سوالات تو حل کر لیتے ہیں۔ مگر جب عبارتی سوال دیا جائے تو رہ جاتے ہیں۔ اور مدرسین بھی کہتے ہیں۔ کہ عبارتی سوالات ان کی طاقت سے باہر ہیں۔ مجھے ایک دفعہ تیسری جماعت کو سوالات میں امتحان لینے کا موقع ملا۔ اور یہ سوال لکھایا گیا کہ میرے پاس ۲۴ صندوق ہیں۔ اور ہر ایک صندوق میں سولہ سولہ کپڑے رکھے ہوئے ہیں۔ کپڑوں کی کل تعداد بتاؤ۔ ۴۰ طلباء میں سے تین چار نے جواب درست نکالا۔ استاد صاحب نے فرمایا کہ اس جماعت میں عبارتی سوال نہیں کرائے جاتے۔ لڑکوں کا ڈر عبارتی سوالات کا دُور کرنا چاہیئے۔

اس میں شک نہیں کہ پرائمری جماعتوں میں حساب کے سادے قاعدوں میں طلبا کو خوب مشق کرانی چاہیئے۔ تاکہ اگلی جماعتوں میں ان کو دقت نہ ہو۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کہ میں نے دسویں جماعت کے طلبا کو مفصلہ ذیل

سوال دیا۔ ۷، ۹، ۸، ۷، ۲۶، ۲۶، ۷، ۵، ۶، ۴، ۳، ۲، ۲، ۱، ۹، ۷ کو ۱۲ پر تقسیم کرو۔ اور جو خارج قسمت آئے۔ اسے پھر ۱۲ پر تقسیم کرو۔ اور اس عمل کو دہراتے جاؤ۔ حتیٰ کہ خارج قسمت ۱۲ سے کم آئے۔ ۴۲ طلبا میں سے چار نے سوال درست حل کیا صاف ظاہر ہے کہ اس جماعت نے پچھلی جماعتوں میں سادے قاعدوں میں پوری مشق نہیں کی۔

نقدی کے اصلی سکّے طلبا کو دکھا کر اُن سے جمع تفریق۔ ضرب تقسیم کے عمل شروع میں کرانے چاہئیں۔ تاکہ طلبا ان کی قیمتوں اور عملوں کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ وزن اور لمبائی کے پیمانے بذریعہ استعمال سیکھیں۔ کمروں کی لمبائی۔ چوڑائی کا اندازہ لگائیں۔ اور ناپ کر اندازے کی صحت کی پڑتال کریں۔

پیمانوں کی واقفیت بغیر استعمال اچھی طرح سے نہیں ہو سکتی۔ چاہیئے کہ طلبا اُن کو اپنے ہاتھ سے استعمال کریں مکسورِ عام اور مکسورِ اعشاریہ کے تصوّرات کو اچھی طرح سے واضح کرنا چاہیئے۔ طلبا، ان کی اصلیت کو سمجھیں۔ قاعدوں کو دلائل پر مبنی کرنا چاہیئے۔

ان قاعدوں میں بھی عبارتی سوالات دیئے جائیں۔ مثلاً ایک گھڑی اور چین کی قیمت ۱۲۰ روپے ہے گھڑی کی قیمت چین کی قیمت سے $\frac{1}{2}$۲ روپے زیادہ ہے۔ گھڑی کی قیمت معلوم کرو۔

روزمرہ کے کاروبار کی مثالیں کرائی جائیں۔ عام طور پر مکسوروں کے لیے لمبے سوالات دیئے جاتے ہیں جن کا عام زندگی میں کچھ فائدہ نہیں۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ ان قاعدوں میں عقلی کام بہت کم کیا جاتا ہے۔ مفصلہ ذیل سوال لاہور کے ایک بڑے سکول میں ایک جماعت حل کر رہی تھی۔

$4\frac{5}{19} + 3\frac{6}{17} + 1\frac{14}{19} + 2\frac{11}{17}$ کو حل کرو۔

طریق حل یہ تھا:۔ $4\frac{5}{19} + 3\frac{6}{17} + 1\frac{14}{19} + 2\frac{11}{17}$

$$= \frac{81}{19} + \frac{57}{17} + \frac{33}{19} + \frac{45}{17}$$

$$= \frac{1377 + 1083 + 561 + 855}{323}$$

$$= \frac{3876}{323}$$

$$= 12$$ جواب

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس طریقہ میں کس قدر دماغ اور محنت ضائع ہوئی۔

میں نے جماعت میں جا کر طلبہ سے سوالات کئے $\frac{5}{19}$ سے کیا مراد ہے؟ $\frac{14}{19}$ سے کیا مراد ہے وغیرہ وغیرہ بعدازاں دکھایا کہ مکسور ایک اور تین کو زبانی جمع کر سکتے ہیں۔ اسی طرح دوسری اور چوتھی مکسور کو۔ طلبہ نے میرے سامنے سوال زبانی حل کر لیا۔ طلبا خوش تھے کہ اتنا لمبا سوال زبانی حل ہو گیا۔ مگر جونہی میں کمرے سے باہر نکلا مدرس صاحب نے لڑکوں کو مخاطب کر کے کہا، لڑکو! سوال نکالنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ جو طریقہ میں نے

بورڈ پر سمجھایا تھا اور جو تم کر رہے تھے۔ وہ بہت اچھا تھا۔ یہ کچھ ایسا ویسا ہی ہے۔ وہی طریقہ استعمال کیا کرو۔

عام طور پر یہ بھی شکایت کی جاتی ہے کہ ہمارے سکولوں کے پڑھے ہوئے طلبہ بازار میں خرید و فروخت کے وقت قیمت وغیرہ آسانی سے دریافت نہیں کر سکتے۔ یہ شکایت ایک حد تک درست ہے۔ مگر شکایت کرنے والے اصحاب چند امور کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

(۱) دکاندار ایک ہی قسم کے سوالات ہر وقت نکالتے ہیں۔ مثلاً آٹا۔ دال بیچنے والا سیر۔ من۔ چھٹانک وغیرہ کے متعلق کام کرتا ہے۔ کپڑا بیچنے والا ہر وقت گز۔ گرہ وغیرہ کے متعلق اور سونے، چاندی والا تولہ ماشہ رتی کے متعلق۔ مگر گاہک کو سارے پیمانوں سے ضرورت کے مطابق عمل کرنے پڑتے ہیں۔ اس لئے اسے دیر لگتی ہے۔

(۲) سکولوں میں پڑھے ہوئے جواب کسوروں تک صحیح نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر دکاندار تخمیناً جواب نکالتے ہیں۔

سکولوں میں تخمیناً جواب نکالنے کی عادت ڈالنی چاہیئے۔

(۳) سکولوں میں پونے۔ ڈیوڑھے۔ ڈھائے اور اونٹے کے پہاڑے عام طور پر اچھی طرح یاد نہیں کرائے جاتے۔ اگر یہ پہاڑے ازبر ہوں۔ تو کوئی وجہ نہیں۔ کہ لین دین میں طلبا، جلدی جواب نہ نکال سکیں۔

(۴) سکولوں میں چند ایک ایسے عملوں پر وقت ضائع کیا جاتا ہے۔ جن کی ضرورت عام لین دین میں نہیں۔ مثلاً ذواضعاف اقل۔ عادِ اعظم کے لمبے لمبے سوالات۔ کسور ملتف۔ کسور مسلسل کے لمبے لمبے سوالات۔

اگر ان کو چھوڑ دیا جائے۔ تو بہتر ہوگا۔

سکولوں میں روزمرہ کے سوالات کو پوری پوری توجہ نہیں دی جاتی۔ نیز آسان طریق عمل پر زور نہیں دیا جاتا۔

اگر مفصلہ ذیل باتوں کو مدنظر رکھا جائے تو حساب کی درست تعلیم میں بہت کچھ مدد ملیگی۔

(۱) حساب کے ابتدائی تصورات کو مرئی توضیحات سے واضح کرنا چاہیئے۔ مگر ہر وقت اشیاء اور تصاویر سے کام نہ لینا چاہیئے۔

(۲) پہاڑے اچھی طرح ازبر ہونے چاہئیں۔

(۳) سکوں اور پیمانوں کو بذریعہ استعمال سکھانا چاہیئے۔

(۴) قاعدوں کو دلائل پر مبنی کرنا چاہیئے۔

(۵) جواب کا تخمیناً اندازہ لگانے میں مشق کرانی چاہیئے اور سوال نکالنے کے بعد پڑتال کی عادت ڈالنی چاہیئے

(۶) روزمرہ لین دین کے سوالات کرائے جائیں۔

(۷) سبق کے آغاز میں اور دہرانے کے لئے زبانی سوالات کرائے جائیں۔

(۸) سوالات کے حل کرنے میں آسان طریق عمل سوچنا چاہیئے۔ تاکہ بے فائدہ محنت اور وقت ضائع نہ ہو۔
(۹) ہر ایک سوال کے لئے قاعدہ بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔ جیسا کہ عام طور پر کیا جاتا ہے۔ سود میں مدت نکالنے کا قاعدہ۔ شرح نکالنے کا قاعدہ وغیرہ وغیرہ۔ سود میں صرف ایک قاعدہ کافی ہے۔

تعلیم بچگاں

(مسٹر ہریش چندر سہگل بی۔اے، بی، ٹی)

یہ اصول کہ بچوں کیلئے تعلیم ضروری ہے۔ عام لوگوں میں زمانہ سے مقبول ہو چکا ہے تعلیم کو عام اور لازمی کرنے کے لئے چند سالوں سے سرگرم جد و جہد ہو رہی ہے۔ اور اس شعبہ میں صوبہ پنجاب کو دوسرے صوبجات کی نسبت زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ مگر اس سوال پر کہ یہ تعلیم کیسی ہو ابھی تک واجب غور نہیں ہوا۔ یوں تو تعلیم کا سارا سلسلہ ہی تشویش پیدا کرنے والا ہے۔ مگر تعلیم کی ابتدائی منزل جس پر آئندہ منزلوں کا انحصار ہے۔ خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ صرف اس لئے نہیں کہ اس کا بطور بنیاد تسلی بخش اور مضبوط ہونا لازمی ہے۔ بلکہ اسلئے بھی کہ اس کی حالت بالائی منزل کی نسبت زیادہ قابل افسوس ہے۔ مضمون کو زیادہ طول نہ دینے کے خیال سے ابتدائی تعلیم کی موجودہ حالت کے وجوہات پر حاشیہ آرائی نہ کرتا ہوا میں صرف چند ایک ضروری امور کی طرف اساتذہ کرام کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

سب سے اوّل اُستاد کو یہ بات مدنظر رکھنی چاہیئے کہ اُس کا فرض محض لڑکوں کو پڑھنا لکھنا اور حساب کے سوال حل کرنا سکھلانا ہی نہیں۔ بلکہ صحیح معنوں میں تربیت دینا ہے۔ دراصل تربیت محض پڑھنے لکھنے کے مقابلہ میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اور اس کی طرف خاص طور پر دھیان دینا لازمی ہے۔ استاد کو اپنا تعلیمی معیار حاصل کرنے کے لئے سب سے اوّل چھوٹے بچوں کا ہمدرد بننا ضروری ہے۔ اس ہمدردی کا رشتہ قائم ہو جانے کے بعد باقی کام خاصا آسان ہو جاتا ہے۔ اور اس رشتے کے پیدا نہ ہونے کی صورت میں استاد کی کوشش کا بیشتر حصہ اکارت ہی جاتا ہے۔ ہمدردی سے یہ مراد نہیں۔ کہ بچوں کو ضبط نہ سکھایا جائے۔ بلکہ اس سے یہ مراد ہے۔ کہ ہم کھیل کود و پڑھائی وغیرہ باقاعدہ سکھلائیں۔ مگر ایسا کرتے ہوئے ہم محبت کے جذبے سے متاثر ہوں۔

دوسری قابلِ غور بات ہے صفائی - بچوں کے لئے نہادھو کر صاف کپڑے پہن کر مدرسہ میں آنا نہایت ضروری ہے - اس بارے میں والدین تو عام طور پر بڑی بے پرواہی سے کام لیتے ہیں - اُستاد بچارے پڑھائی لکھائی میں اس قدر مشغول ہوتے ہیں کہ انہیں فرصت ہی کہاں - کہ بچوں کی صفائی کی طرف دھیان دے سکیں - اگر ہم اس وقت کا انتظار کرتے ہیں جب والدین خود اس قدر تعلیم یافتہ ہو جائیں گے - کہ وہ بچوں کو صاف رکھنا اپنا فرضِ اولیں سمجھیں گے - تو ہمیں نہ معلوم کتنے سال انتظار کرنا پڑیگا - بہرحال استاد کو یہ احساس ہونا چاہیئے - کہ بچے کی پڑھائی کی نسبت بچے کے جسم اور لباس کی صفائی زیادہ ضروری ہے - اس کے دو علاج ہو سکتے ہیں - یا تو بچوں کے والدین کے ساتھ اس بارے میں سمجھوتہ کیا جائے - یا ان کو صاف بنانے کا سکول میں بندوبست ہو -

اگر ہم فرض کرلیں - کہ استاد ہمدرد ہے اور بچے صاف ہیں - تو اب ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ استاد کونسا پڑھانے کا طریقہ اختیار کرے - جس سے بچوں کی جسمانی ذہنی اور اخلاقی نشوونما تسلی بخش ہو سکے -

جب تک پڑھانے کے طریق کے متعلق تجربات نہ کئے جائیں - پڑھائی کے طریقہ کی تفصیل کوئی شخص بھی پختہ طور پر نہیں دے سکتا - ہاں ہمارے طریقے کی بنیاد کیا ہو - اس کے متعلق چند ایک باتیں وثوق سے کہی جاسکتی ہیں - بے انتہا لڑکے اور لڑکیوں نے اب تک پڑھنا لکھنا تو سیکھ لیا ہے - مگر جس طریقے سے انہوں نے تعلیم حاصل کی ہے وہ تسلی بخش اس لئے نہیں کہ دوران پڑھائی میں استاد کو تو اکثر حالتوں میں قدرے دلچسپی ہوتی ہے مگر بچوں کے لئے یہ عمل باعثِ تکلیف ہی ہوتا ہے - امریکہ میں پروفیسر ڈیوی نے تعلیم کے بارے میں تجربات کئے ہیں - وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے - کہ بچوں کی تعلیم کا ان کی روزانہ زندگی کے ساتھ جو وہ عام طور پر گاؤں یا شہر کے کوچوں میں گذارتے ہیں - ایک خاص تعلق ہونا چاہیئے - بلکہ ان کی شہری یا دیہاتی زندگی مدرسے کی تعلیم کی بنیاد ہونی چاہیئے بچے سکول میں وہی کھیل کھیلیں - جو وہ گھر میں کھیلتے ہوں - وہ حتی الوسع وہی راگ گائیں اور وہی کہانیاں سنیں - جن سے ان کو قدرتی رغبت ہے - کھیل کھیلنے - راگ گانے اور کہانیاں سنانے کے دوران میں ہی وہ پڑھنا لکھنا اور حساب کے سوال حل کرنا بھی سیکھیں - ان مشاغل کے علاوہ بڑھئی کا کام کرنا بچوں کی تعلیم کا ایک ضروری جزو ہونا چاہیئے - پروفیسر ڈیوی کے اس تجربے کے نتیجوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت سے نئی قسم کے سکول امریکہ میں رائج ہو گئے ہیں - ان مدارس کی خاص خوبی یہ ہے کہ بچے پڑھنا لکھنا سیکھنے میں دلچسپی لیتے ہیں - سکول میں ہر کام خوشی خوشی کرتے ہیں - اور اسے اپنا ہی کام سمجھتے ہیں - بیگار خیال نہیں کرتے - تمام دن سکول میں بچے خوش و خرم رہتے ہیں - بعض کو تو اپنے مدرسے سے اس قدر الفت ہو جاتی ہے - کہ وہ گھر جانا پسند ہی نہیں کرتے -

یہ چند سطور لکھنے سے میرا مدعا یہ ہے کہ اساتذہ پنجاب کے مدارس کا امریکہ کے سکولوں سے مقابلہ کریں اور سوچیں کہ کن ذرائع سے ہم بھی اپنے بچوں کیلئے تعلیم حاصل کرنا آسان اور باعثِ خوشی بنا سکتے ہیں *
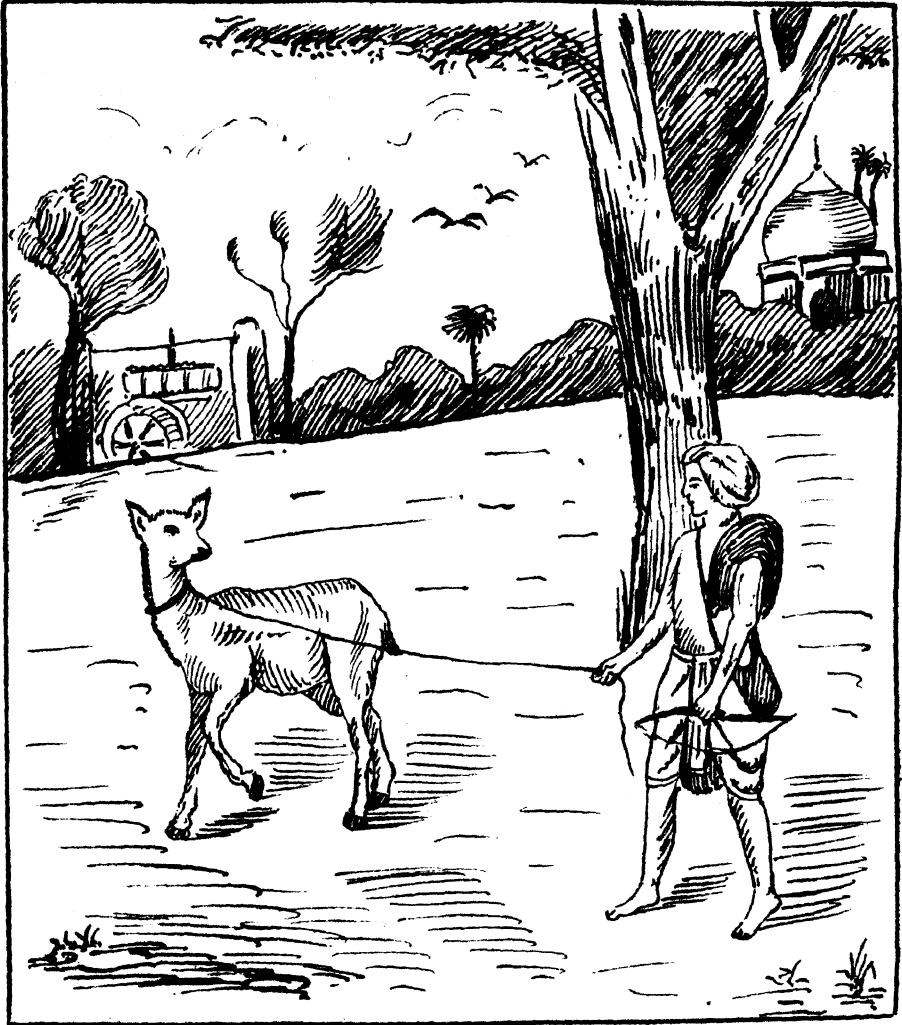
گردن میں ستمگر ڈالا رسن کا پھندا
تعزیر کس خطا کی؟ کس جرم کی سزا ہے؟

ہرن کی فریاد

(از اندرجیت شرما بچھراؤں ضلع میرٹھ)

صیاد! تو نے مجھ کو کیوں قید کر لیا ہے
کیا بے زباں نے ظالم تیرا برا کیا ہے؟

گردن میں اے ستمگر ڈالا رسن کا پھندا
تقصیر کس خطا کی کس جرم کی سزا ہے؟

باندھے ہوئے کمر ہے تو جور پر جفا پر
کیوں ہاتھ دھو کے پیچھے اس جان کے پڑا ہے!

افسوس تو نے میری جانی نہ قدر و قیمت
آہو کی شکل میں یہ اک لعل بے بہا ہے

معلوم ہی نہیں ہے تجھ کو مری حقیقت
پہلو میں میرے کعبہ تیرے سجود کا ہے

قائم ہے جس کے دم سے تیرا وجودِ ہستی
مخلوق میں اسی کی خالق وہی مرا ہے

تیری رگوں میں جس کا ہے جذبۂ محبت
اس دل میں بھی اسی کا جوشِ جنوں بھرا ہے

دونوں ہیں ایک بُوٹے دو گل ہیں اک چمن کے
تجھ سے نہ میں الگ ہوں مجھ سے نہ تُو جدا ہے

فطرت کا راز ہے یہ تو چشم دل کو وا کر
غفلت کا پڑ گیا ہے پردا سا تیرے دل پر

اک روح پر ہے سب کا دار و مدارِ ہستی
اک ذات سے ہے قائم باغ و بہارِ ہستی

اک بحرِ بے کراں سے قطرے جدا ہوئے ہیں
اک آفتاب کے ہیں روشن شرارِ ہستی

دل پر ترے چڑھا ہے کیا رنگِ امتیازی
یکساں ہیں جب سبھی کے نقش و نگارِ ہستی

نقشِ دوئی مٹا دے الفت کی زندگی میں
ذرّوں میں کر نہ پیدا تو انتشارِ ہستی

ذی روح کوئی تیرا زیرِ نگیں نہیں ہے
قبضہ میں تو سمجھتا ہے کیا دیارِ ہستی

ویران کر کے اپنے دل کے حرم کو ناداں
تعمیر کر رہا ہے اپنا مزارِ ہستی

جاندار کو ستانا ہے عدل کے منافی
جاتا رہے گا تیرا عز و وقارِ ہستی

دو روزہ زندگی پر غافل ہے فخر بے جا
دل میں ترے بھرا ہے یہ کیا غبارِ ہستی

ناشاد کر کے مجھ کو دلشاد تُو نہ ہوگا
برباد میں جو ہوں گا آباد تُو نہ ہوگا

ارشاداتِ عالیہ

ہز اکسلنسی مہاراجہ یمین السلطنت سرکشن پرشاد بہادر شادؔ باالقابہم
صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی

اُس نے کہا کعبہ ترا، میں نے کہا چہرا ترا — اُس نے کہا چہرا ترا میں نے کہا جلوہ ترا
اُس نے کہا جینا ترا - میں نے کہا ہستی تری — اُس نے کہا مرنا ترا میں نے کہا پردا ترا
اُس نے کہا کیا کام ہے میں نے کہا تربیت بد — اُس نے کہا کیا شغل ہے میں نے کہا سودا ترا
اُس نے کہا کیا کفر ہے میں نے کہا گیسو ترے — اُس نے کہا اسلام کیا میں نے کہا چہرا ترا
اُس نے کہا دل کیا ہوا میں نے کہا تو نے لیا — اُس نے کہا کیا چور ہوں میں نے کہا غمزہ ترا
اُس نے کہا مندر ہے کیا میں نے کہا تو دل ترا — اُس نے کہا کعبہ ترا میں نے کہا کوچا ترا
اُس نے کہا مقصد ترا، میں نے کہا تو ہی تو ہی — اُس نے کہا قسمت تری میں نے کہا منشا ترا
اُس نے کہا خدمت تری میں نے کہا ہے بندگی — اُس نے کہا کیا نام ہے میں نے کہا بندا ترا

اُس نے کہا وہ کون تھا خلوت میں خواہانِ وصال
میں نے کہا وہ شادؔ تھا عاشق ترا شیدا ترا

(مرسلہ مسٹر عتیق)

ان اشعار میں جس بلیغ طریقہ پر معزز ناظم نے خداتعالیٰ کی حمد کی ہے۔ وہ قابل صد ہزار تحسین ہے۔ ۱۲

ہزاکسلنسی راجہ راجایان مہاراجہ یمین السلطنت سرکشن پرشاد
بہادر شاد صدراعظم دولت آصفیہ حیدرآباد (دکن)

حضرت سعدی

لالہ ہردیال صاحب چوپڑہ بی اے ٹی آئی
ایس ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس گجرات

پنڈت مرلی دھر صاحب سود کل بی اے
ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس جالندھر
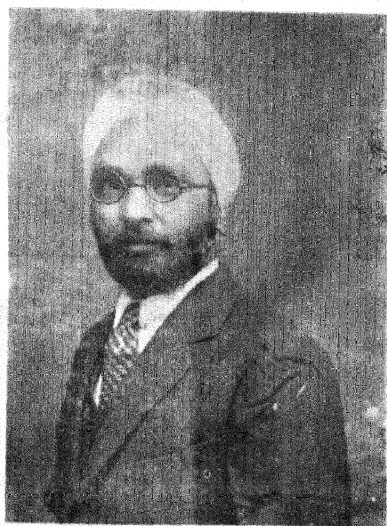
سردار جگت سنگھ صاحب بی اے بی ٹی
ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس امرتسر

INTELLIGENCE TEST

اور

پہیلیاں

(جناب لالہ ہردیال صاحب چوپڑہ بی۔ اے۔ پی۔ ای۔ ایس)

مکرم بندہ سردار صاحب!

نمستے! آپ کے رسالہ رہنمائے تعلیم نے صوبہ کی پچیس سال ایسی اچھی خدمت کی ہے کہ حقیقت میں اُسکی تعریف نہیں ہو سکتی۔ خوش قسمتی سے مجھے اس سے اس کے بچپن سے ہی تعارف حاصل ہے۔ اور میں ان مشکل گھڑیوں کو خوب جانتا ہوں۔ جن میں سے اس کو طفولیت کے ایام سے گزرنا پڑا ہے۔ اب تو ایشور کی کرپا سے یہ مقبول عام ہو گیا ہے۔ اور مضامین بھی ہر قسم کے ناظرین کے مذاق کے مطابق ہوتے ہیں مگر وہ وقت بھی تھا۔ جب ناظرین میں مذاق پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔ صوبہ کی تعلیمی خدمت اور وہ بھی بےغرضانہ حقیقت یہ ہے کہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ میں آپ کو اس جوبلی کے موقعہ پر مبارکباد دیتا ہوں۔ اور کم فرصتی کے باوجود ایک مختصر سا مضمون ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔ جو امید ہے۔ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

(ہردیال)

گزشتہ زمانے میں طریقہ تعلیم عموماً انفرادی تھا۔ چند دنوں کے بعد استاد شاگرد ایک دوسرے کے عادات سے

واقف ہو جاتے تھے۔ استاد پر فوراً ظاہر ہو جاتا تھا کہ طالب علم ذکی ہے یا غبی۔ اور شاگرد پر ظاہر ہو جاتا تھا کہ معلم خوش مزاج یا تلخ۔ خوشامد پسند ہے یا انکساری کے زیور سے مرصع۔ غرض حالات کے مطابق ایک دوسرے کے ساتھ ایسا ربط ہو جاتا تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں تحصیل علم کر کے شاگرد رشید ہونے کا دعویٰ کرنے کے قابل ہو جاتا تھا اب بھی مسجدوں اور پاٹھ شالاؤں میں یہ طریق مروّج اور کامیاب ہو رہا ہے۔

جہاں زیادہ تعداد کی تعلیم کا سوال ہو۔ اور ساتھ ہی خرچ کا بار بھی گراں ہونے کا اندیشہ ہو۔ اور موزوں عمارات اور مناسب سامان کی کچھ کمی ہوئی ہو۔ وہاں یہ طریقہ قابل عمل معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے اجتماعی طریقہ تعلیم رائج کیا گیا۔ اس سے ایک بڑی تعداد طلبا کی تھوڑے خرچ سے بظاہر تعلیم یافتہ ہو جاتی ہے اگرچہ سرسری طور پر دیکھنے سے اس میں بہت نقص دکھائی نہیں دیتے۔ مگر نظر عمیق سے دیکھنے سے معلوم ہونے لگتا ہے کہ ذہین وکند۔ ذکی اور غبی سب ایک ہی رسی میں باندھے جا رہے ہیں۔ جو تیز چلنا چاہتے ہیں۔ ان کو چلنے نہیں دیتے۔ اور جو آہستہ آہستہ چل سکتے ہیں۔ ان کو گھسیٹا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ ہوشیار طلبا کی طاقت اور وقت ضائع ہوتا ہے۔ اور کمزور طلبا بچارے قسمت کے مارے کورے کے کورے رہ جاتے ہیں۔

سالوں مدرسہ میں پڑھ پڑھ کر ان پڑھ رہ جانا۔ مہینوں پانی میں رہ کر بن نہائے نکل آنا اسی طریق تعلیم کا نتیجہ ہے۔ آئے دن رپورٹوں میں شکایت ہوتی ہے۔ کہ ایک بھاری تعداد طلبا کی پہلی جماعت میں داخل ہوتی ہے مگر ان کا ۲۵ فیصدی بھی پرائمری پاس نہیں ہوتا۔ اور دس فیصدی بھی انٹرنس تک نہیں پہنچتے۔ اس حالت کے لئے ذمہ دار زیادہ تر اجتماعی طریقہ تعلیم ہے۔ جس میں مدرّس کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ انفرادی طور پر طلبا کی ضروریات کو دیکھ اور سمجھ سکے۔ اور اپنی تعلیم کی رفتار اور اپنی گفتار کو ان کی کم وبیش قابلیت کے مطابق کر سکے اس لئے جن کے ہاتھ پلے کچھ نہیں پڑتا۔ وہ بستر ابوریا باندھ کر چل دیتے ہیں۔ اور ان کے پیچھے لبا اوقات وہ بھی چل دیتے ہیں۔ جن کی طبع آزمائی کے لئے کافی سامان مہیا نہیں۔ مگر ایسے طلبا کی تعداد عموماً کم ہوتی ہے عموماً یہ بچارے قسمت پر شاکر ہو کر اپنی روشنی طبع کی شمع کو مدھم کر لیتے ہیں۔ اور وہ پات جو ہونہار بروے کے دکھائی دیتے تھے۔ بڑے ہو کر دکھائی نہیں دیتے۔

اس بھاری نقص کو محسوس کر کے ہی (Dalton plan) ڈالٹن پلین، اور مانٹ سوری سسٹم وغیرہ کی اختراع عمل میں لائی گئی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں جماعت بندی عمر کے لحاظ سے کم ہوتی ہے۔ لبا اوقات ایک طالب علم کی ذہنی عمر اس کے سالوں کی عمر سے زیادہ ہوتی ہے۔ اور کئی موقعوں پر ایک بڑی عمر کے طالب علم کو چھوٹی عمر کے ذہن رسا طلبا کے ساتھ ملنا پڑتا ہے۔ یہ بھی لازمی نہیں سمجھا جاتا کہ جو طالب علم حساب میں پانچویں جماعت کے ساتھ ہے۔ وہ اردو بھی ضرور اسی جماعت کے ساتھ پڑھے۔ اگر اسکو ذہنی کرے

زیادہ مَس ہے۔ تو وہ آٹھویں جماعت کے درجہ کے برابر اردو پڑھ سکتا ہے۔ جس طریقہ امتحان سے ایسے طالب علموں کی جماعت بندی کی جاتی ہے وہ (Intelligence test) سسٹم ہے۔ اب یہ طریقہ امتحان (Experimental Psychology) کی امداد سے اس قدر وسیع ہو گیا ہے۔ کہ بلا تامل طلباء کو ان کی ذہنی طاقت کے مطابق تعلیمی کام سپرد کر دیے جاتے ہیں۔

ہمارے صوبہ میں ابھی یہ طریق بالکل ابتدائی حالت میں ہے۔ اور جو تجربہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو موقع بھی کم ملتا ہے۔ اس لئے کچھ بڑے پیمانہ پر عمل درآمد کہیں ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ مگر چھوٹے پیمانے پر ہر ایک مدرس اپنی جماعت کے کئی فرق ذہانت کے لحاظ سے کر سکتا ہے۔ اگر وہ پہیلیوں اور معموں کو اپنی جماعت کے روزانہ کام کی تکان دور کرنے کے لئے استعمال کیا کرے۔ تو چند دنوں میں ہی فرق نمایاں ہونے لگے گا۔

ممتحن خصوصاً اگر وہ انسپکٹر کی شکل میں ہو۔ تو طلباء اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے۔ اور عموماً اس کی روانگی کی خبر سن کر ہی خوش ہوتے اور اطمینان کی شکل دیکھتے ہیں۔ مگر میں ذاتی تجربہ کی بنا پر عرض کرتا ہوں۔ کہ اگر جماعت میں دلچسپ اور حسب لیاقت پہیلیاں پوچھنے والا انسپکٹر آجائے۔ تو طلباء کی دلچسپی اس قدر بڑھ جاتی ہے۔ کہ وہ جھکنے میں نہیں آتے۔ اور انسپکٹر کے لئے بھی یہ معلوم کرنا مشکل نہیں ہوتا کہ طلباء کی ذہنی تعلیم کس درجہ پر ہے۔

عرصہ تیس سال کا ہوا۔ کہ پہیلیاں اور کہانیاں ہر گھر اور کوچے میں بچے ایک دوسرے سے پوچھتے اور دل بہلایا کرتے تھے۔ اور اپنے بزرگوں کے پاس بیٹھ کر اس ذہنی شربت کا لطف اڑایا کرتے تھے۔ مگر اب یہ نظارہ کہیں شاذ و نادر ہی دکھائی دیتا ہے۔ تعلیمی لحاظ سے ایک بڑی کمی واقع ہو گئی ہے اور مدرسین جتنی جلدی اس کو رواج دے کر اس کمی کو پورا کریں گے۔ اُتنا ہی وُہ اپنے کام کو آسان بنانے میں کامیاب ہوں گے۔

ناظرین کی دلچسپی کے لئے میں چند پہیلیاں اور معمہ جات مثال کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ طبع آزمائی کے بعد اگر وہ اپنے طالب علموں کے ذہنی ہاضمہ کو تیز کرنے کے لئے استعمال کریں گے۔ تو یقیناً ایک مفید مطلب نسخہ کا کام دینگی۔ یہ نہیں کہ یہ کوئی نئی چیز ہے۔ یا عجوبہ ہے۔ مگر بہت عام ہونے کے سبب ہم اس کی قدر و قیمت بھول گئے ہیں۔ ان میں سے بہت سی پنجابی زبان میں ہیں۔ اسلئے شاید بعض اصحاب کو اسکے سمجھنے میں کچھ دقت ہو مگر پنجابی طلباء کو غالباً نہ ہوگی۔

جماعت اوّل

اِک سی کڑی اوہدے پراندا اڑی ——— سُوئی

(۲) ماچھیاں دی جھوٹی کدے لبی کدے موٹی ~~~~ مشکیزہ
(۳) ٹُسکا ڈھینگر آنڈے دیوے ~~~~ چرخا
(۴) چونے گچ مسیت بوا کوئی ناں ~~~~ انڈا
(۵) ماں جمی ناں پُت کوٹھے تے ~~~~ آگ اور دھواں
(۶) اپنی گوٹھڑی سارے اندر لپی ~~~~ دیئے کی روشنی
(۷) آلا بھریا کوڈیاں وچ تونک نچے ~~~~ منہ میں زبان
(۸) نِکا کاکا گھر دا راکھا ~~~~ دِیا
(۹) نیلی لیرے موتی بدھے۔ سونے گوا چے راتی لدھے ~~~~ آسمان اور تارے
(۱۰) ہتھ لایاں اوہ میلا ہووے منہ لایاں اوہ ہسّے ~~~~ شیشہ

جماعتِ دوم

(۱) جوان مویا کوئی روندا نہیں ~~~~ سانپ
(۲) چنبا (چنبیلی) کھڑیا کوئی چُندا نہیں ~~~~ رات
(۳) سیج وچھی کوئی سوندا نہیں ~~~~ دیا
(۴) ٹھانیدار نے قلعہ بنوایا۔ نہ اِٹّاں نہ گارا لوایا۔
چاروں پاسے سپاہی کھڑائے۔ نیڑے جاؤ تے ڈنڈے لائے ~~~~ بھڑوں کا چھتہ
(۵) چھوٹی جیئی ٹکڑی۔ آسمان نال جا ٹکری۔ ~~~~ دھوآں
(۶) اوسے ننگے ہوئے، ماں بھین کھُبی ہوئی ~~~~ بینگن اور مولی
(۷) اوہ لیٹی ہوئی تے اوہ بیٹھا ہویا ~~~~ ترا اور تربوز
(۸) آپ کالی تے پُتر بگے۔ پیو آیا تاں پُت اک نہ لبھے ~~~~ رات تارے اور سورج
(۹) اک جناور ایسا۔ اوہدی ٹوپی تے پیسا ~~~~ پوست کا ڈوڈا
(۱۰) چھوٹی جیئی کُڑی اوہدے جرا جرا دند۔ کھاندی کھاندی رجے ناہیں بھن چکاوے پنڈ۔ ~~~~ داتری
(۱۱) چھپڑی سُک گئی ٹیٹو مرگئی ~~~~ چراغ

ذیل میں تیسری سے چھٹی جماعت کی لیاقت کے مطابق بجھارتیں لکھی جاتی ہیں۔ اس سے یہ مدعا نہیں۔ کہ یہ ٹھیک
تول کر اسی جماعت کے لائق رکھی گئی ہیں۔ بلکہ یہ ہر ایک جگہ اور وہاں کے حالات پر منحصر ہوگا۔ قدا کوشش اور سوجھ

بچاد کام میں لانے کے لئے جوابات ساتھ نہیں دیئے گئے۔ مگر چونکہ راقم کو تجربہ ہوا ہے۔ کہ بہت سے اصحاب کوشش کے باوجود ناکام رہتے ہیں۔ اسلئے مضمون کے آخر میں جوابات اکٹھے دے دیئے گئے ہیں۔ امید ہے ناظرین بغیر پوری پوری کوشش کرنے کے جوابات کی امداد حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں گے۔ ورنہ وہ لطف جو تجسس کا نتیجہ ہوتا ہے حاصل نہ ہوگا۔

جماعت سوم

(۱) جل وچ ہویا۔ جل وچ مویا۔ جل وچ اوہدے سانس۔ نہ اوہدی ہڈی نہ اوہدا ماس۔
(۲) کالا سی کلتر سی۔ کالے پیو دا پتر سی۔ آڈوں پانی پیندا سی۔ بروٹی چھانویں بہندا سی۔
(۳) پنج پان والے۔ بتی نکن والے۔ بھاگو گنجی ہلان والی۔ گھسیٹا مٹرا کھین والا۔
(۴) پنجاں آدمیاں نے گٹھڑی چائی چادھری صبار۔ نکلی بی بی نے دھکا دتا گئی سمندروں پار۔
(۵) چار تھم چلائے جان۔ دو ویوے بلدے جان۔ دو چھج ہلدے جان۔ اگے سپ لیٹدا جائے۔ لوک تماشہ ویکھدا جائے۔
(۶) پاروں آیا بابا لودی۔ چھ لتاں تے اکو بودی۔
(۷) اکی جیئی کڑی۔ راجہ نال دی ٹکر کھان جا بہندی۔
(۸) ہلنا ہلاؤنا۔ یار ٹھنڈ پاؤنا۔
(۹) اک ویکھیا ایسا جٹ۔ چوہی دھتیاں تے پتر اٹھ۔
(۱۰) ایک رکھ تے باراں ٹال۔ اکتی پتر ہر ڈالی نال۔

جماعت چہارم

(۱) اونٹ دی بہنی۔ ہرن دی چال۔ کون جانور ایسا جس دی پوچھ ہے نہیں نال۔
(۲) آئی گلابو گئی گلابو۔ جاندی کسے نہ ڈٹھی۔ پانی نالوں تپلی پتا سے نالوں مٹھی۔
(۳) اک نام کرتار دں پاسیئے سن دے بھائی مٹھا۔ جیوندیاں نوں موئے پٹے تارن عجب تماشہ ڈٹھا۔
(۴) ہری سی من بھری سی۔ نال موتیاں جڑی سی۔ للہ جی کے باغ میں دوشالہ اوڑھے کھڑی تھی۔
(۵) چڑھ چونکی پر بیٹھی رانی۔ سر پر آگ بدن پر پانی۔
(۶) اک صندوقڑی وچہ باراں رخنے۔ ہر رخنے وچہ تی تی دانے۔ بجھن والے بڑے سیانے۔

(۷) پہلاں جمیاں میں۔ پھر جمی میری تائی۔ کچھ کچھ کے پیو جمایا۔ پھر جمی میری مائی۔

(۸) اوچے ٹبے بھابو وَ تے۔ میں جاداں تے بھڑ بھڑ ہتے۔

(۹) اندر بال تے اُتے چام۔ وچ بازار دے بکے عام۔ اسنوں کھاندے لوک تمام۔ ایسی چیز دا کی ہے نام۔

(۱۰) چِٹا سفید دُودھ ہی نہیں۔ چم چُٹ جھولی پایا پر تتر بھی نہیں۔ بنھ بنھا کے کچھری کھڑیا پر ادہ چور بھی نہیں۔

اس جماعت میں حسابی دلچسپ معمّے دیئے جاسکتے ہیں۔ شلاً ایک طالب علم دوسرے سے کہے۔

(۱۱) کوئی عدد (یا روپے) دل میں سوچ لو۔ اتنے ہی اس میں میرے جمع کرلو۔ آٹھ رام چندکے ڈال لو۔ چھ کرم چند کے ملالو۔ اس کو دو پر تقسیم کردو۔ سات فقیروں کو بانٹ دو۔ باقی مجھے بتادو۔ میں تم کو یہ بتادوں گا۔ کہ تم نے کیا عدد سوچا تھا۔

اسی طرح سے جغرافیہ کی پہیلیاں بنائی جاسکتی ہیں۔ شلاً پنجاب میں کوئی ایسی منڈی کا نام بتاؤ جس کے معنی

(۱۲) امرت کا تالاب ہو۔ یا جس کا نام ہی یہ ظاہر کرتا ہو۔ کہ لاتے جاؤ اور وہاں خرچ کرتے جاؤ۔

الغرض جماعت کی استعداد کے مطابق ایک سمجھدار اُستاد اپنے لئے درجنوں ایسی پہیلیاں بناکر بچوں کی دلچسپی بڑھا سکتا ہے۔ اور اُن کے اندر سوچنے اور سمجھنے کا مادہ پیدا کرسکتا ہے۔ اور بالآخر یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ کونسا طالبعلم ذہنی عمر میں بڑا ہے۔ اور کونسا چھوٹا۔ سالانہ ترقی کے وقت اگر ذہنی بڑی عمر والا کسی مضمون میں کمزور ہو۔ تو اس کو ترقی دینے میں تامل نہ کرنا چاہیئے۔ اور اس کے خلاف کم ذہنی عمر والے سے کمی پورا کرنے کی توقع رکھنا بالکل بیہودہ ہوگا۔ اس لئے ایسے طالب علم کو خواہ وہ ایک مضمون میں فیل ہو۔ کبھی ترقی نہ دینی چاہیئے۔

اگر انسپکٹر اصحاب بھی اپنے امتحان میں اس قسم کے چند سوالات کرکے جماعت کے ذہنی بڑی عمر اور کم عمر کے طلبا، کا اپنے لئے فیصلہ کرلیا کریں۔ تو انہیں رعائتی ترقی دینے میں ایک سائنٹفک اصول کی امداد مل سکے گی۔

جماعت پنجم

حصہ مڈل میں عموماً طلبا کی سوچنے اور سمجھنے کی طاقت قدرتی طور پر بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس لئے اس جماعت میں پہیلیاں زیادہ مشکل اور کھوج والی ہونی چاہئیں۔ شلاً

(۱) ایک عورت کو ہم نے دیکھا جل میں بیٹھی نہائے۔ ہڈیاں اس کی ایندھن ہوگئیں چمڑا شہر بکائے۔

(۲) چڑھ چوکی پر بیٹھی رانی۔ سر پر آگ بدن پر پانی۔

(۳) بیسوں کا سر کاٹ لیا۔ نہ مارا نا خون کیا۔

(۴) ایک دیکھا بوڑھا باوا چٹی گپ چوغہ ساوا۔ موتر اُسدا ایسا مِٹھا۔ کہ سارا جگ پیندا ڈٹھا۔

(۵) دو ٹانگیں پر وہ آدمی نہیں۔ چار اس کے تھن پر بھینس بھی نہیں۔ آٹھ اس کی ٹونٹیاں پر وہ سٹھانی بھی نہیں۔ سولہ اُس کی گائے پر گوجر بھی نہیں پر نسٹھ اس کے چیلے پر وہ جوگی بھی نہیں۔

(۶) ایک عورت اور ایک مرد کہیں جا رہے تھے۔ کسی نے عورت سے پوچھا۔ کہ یہ مرد رشتہ میں تمہارا کیا لگتا ہے۔ عورت نے جواب دیا۔ رشتہ تو مجھے معلوم نہیں۔ پر اس کی ساس اور میری ساس حقیقی ماں بیٹی ہیں۔ اب رشتہ تم ہی بتاؤ؟

(۷) وہ کونسا عدد ہے جسے تگنا کرو۔ تین یکساں ہندسوں کا ہو۔ دوبارہ تگنا کرو۔ تو بھی اسی طرح۔ اور سہ بارہ تگنا کرو تو بھی حاصل ضرب اسی طرح یکساں ہندسوں کی ہو۔

(۸) وہ کون سا حکمران گزرا ہے۔ جس کے نام کے پہلے اور دوسرے حرف کو ملائیں۔ تو میدانِ جنگ کے معنی دے اور تیسرے اور چوتھے کو ملائیں۔ تو فتح ظاہر کرے۔ اور باقی ماندہ حروف کو ملائیں۔ تو وہ شہر کے معنی دے۔

(۹) بالا سی تو سب جگ بھایا۔ بڑا ہؤا تو کام نہ آیا۔ میں نے کہہ دیا اس کا نام۔ بتاؤ پہیلی پاؤ انعام۔

(۱۰) میں آکھیا اد کی جیہڑا پانی وچہ ترے۔ خشک زمیں تے ٹکڑا نہ ہو نہ خوش حال پھرے۔ دُھر وچ دریا دے اوپر بیٹھ جائے کو۔ بیڑی واگوں لے دگے ذرا نہ رہے کھلو۔

جماعت ششم

اس جماعت کے لئے معمے عموماً ایسے ہونے چاہئیں۔ جن کے نکالنے میں خاصی محنت و غور و خوض کرنے کی ضرورت ہو۔ جتنی محنت زیادہ درکار ہوگی اسی قدر حل کرنے میں زیادہ لُطف آئیگا۔ اور کامیابی پر خوشی زیادہ ہوگی مختلف مضامین جو اس جماعت میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اُن سب کو پہیلیاں چننے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ذیل میں چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:-

(۱) ایک قلعہ کے گرداگرد چاروں طرف ۱۱ فٹ خندق ہے۔ ایک فوج جو اس قلعہ میں داخل ہونا چاہتی ہے اس کے پاس صرف دو شہتیر ہیں جو ۱۰½ فٹ سے زیادہ لمبے نہیں۔ بتاؤ وہ فوج اس قلعہ میں کس طرح داخل ہو سکتی ہے۔ جبکہ رسی وغیرہ کا سامان بھی پاس موجود نہیں۔

(۲) ایک مالی نے اپنے باغ میں کُل دس پھل دار درخت اس خوبصورتی سے پانچ قطاروں میں لگائے۔ کہ ہر ایک قطار میں چار چار درخت لگے ہیں۔ ذرا سمجھاؤ۔ کہ اُس نے کیسے یہ درخت لگائے ہیں۔

(۳) ذیل کے خاکے میں ایک سے پندرہ ہندسے ہیں۔ ایسی ترتیب سے انہیں خانوں میں لکھو۔ کہ ہر لحاظ سے مسلسل چار خانوں کا مجموعہ ۳۰ ہو۔

(۴) ایک تھانے دار نے اپنے خزانہ کے گرد اپنے ۱۲ سپاہیوں کا پہرہ اس طرح سے لگایا کہ وہ اس کے گرد چھ قطاروں میں کھڑے ہیں۔ مگر ہر ایک قطار میں چار سپاہی دکھائی دیتے ہیں۔

(۵) پنجاب میں کوئی ایسا دریا بتاؤ۔ جس کی سطح آب پر سینکڑوں کنبے بستے ہیں۔ اور ایسی جھیل بتاؤ جس کے پیٹ میں سے دریا چلا گیا ہے پر غائب نہیں ہوا اور جوں کا توں پھر نکل آیا ہے۔

(۶) میرا نام چھ حروف سے بنا ہے۔ میں ایک بڑا مشہور شہر ہوں۔ میرے تیسرے اور چوتھے حروف کو ملانے سے جھوٹی بات ظاہر ہوتی ہے میرے چھٹے اور تیسرے حروف کے ملنے سے ہی میرے جسم میں خون دورہ کرتا ہے۔ میرے پہلے دوسرے اور تیسرے حروف کے ملانے سے ایک خوفناک کاٹنے والا جانور بن جاتا ہے۔ میرے تیسرے پانچویں چھٹے اور پانچویں حروف کے ملانے سے وہ شے بن جاتی ہے۔ جس کے بغیر علم حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔ میرے تیسرے دوسرے اور پہلے حروف کو ملا کر سننے سے نہایت لطف آتا ہے بتاؤ ایسا اچھا میرا نام وہ کیا ہے؟

(۷) میرا نام نو حروف کا بنا ہوا ہے۔ اور ایک مشہور بہادر ہندو راجہ ہو چکا ہوں۔ میرے پانچویں۔ ساتویں۔ چھٹے اور آٹھویں حروف کے ملنے سے ملک سیراب ہوتے ہیں۔ میرے دوسرے۔ آٹھویں۔ پانچویں اور چھٹے حروف سے پنجاب کے ایک دریا کا نام بن جاتا ہے۔ پہلے، چھٹے، آٹھویں اور دوسرے سے اگر بادشاہ رعیت سے برتے تو وہ اس کی غلام ہو جاتی ہے۔ اور ساتویں اور آٹھویں اور نویں کے ذریعہ سے ہی وہ راج کرتا ہے۔ تیسرا اور پہلا اگر معمولی انسان کو ہو جائے۔ تو ڈاکٹر بلانا پڑتا ہے۔ مگر کوئی سادھو کرے۔ تو بڑا سکھ پاتا ہے۔ اور تیسرے اور دوسرے کے ملنے سے اس بھوسگرے تر جاتا ہے۔ پہلے دوسرے۔ پانچویں اور چوتھے کو ملانے سے جو بن جاتا ہے۔ اس کو تو اب عورتیں بھی پسند نہیں کرتیں۔ میرے پہلے۔ چوتھے، دوسرے، چھٹے، ساتویں اور آٹھویں حروف کے ملانے سے وہ چیز بن جاتی ہے۔ جو شاہوں کا نشان ہوتی ہے۔ اور جس کو لوگ جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ چوتھے۔ پانچویں اور آٹھویں کے ملنے کے بغیر زندہ رہنا مشکل ہے۔

(۸) کوئی ایسی چیز بتاؤ۔ جو چھوڑ دیں۔ تو بھاگ جائے۔ کھا جائیں تو ٹھنڈک دے۔ باہر رکھیں تو اڑ جائے۔ سر پر رکھیں۔ تو موت کر سا لا بدن بھر دے۔ بوتل میں ڈالیں تو اس میں بھی ٹھیک آ جائے اور نہر میں ڈالیں تو وہ بھی بھر جائے روٹی اس کے بغیر پکتی نہیں۔ عمارت اس کے بغیر بنتی نہیں۔ باغ اس کے فراق میں سوکھ کر کانٹا ہو جائے۔ سب کو پیا لگے پر کسی کی گردن پر چڑھ بیٹھے ——— سینکڑوں مسکینوں کی جان لے۔

(۹) آج کل انگریزوں کو ایک ایسا نوکر مل گیا ہے۔ جو رات کو روشنی کر دیتا ہے۔ دن کو کارخانہ چلاتا ہے۔ دوپہر کو چار پکا دیتا ہے۔ اور ہزاروں میلوں پر جھٹ پٹ خبر پہنچا دیتا ہے۔ اور منوں اسباب اٹھا کر بغیر شکایت ساتھ چل دیتا ہے۔ وہ کون ہے؟

(۱۰) میرے پاس ایک ایسی چیز ہے۔ جو بولتی ہے پر پرندہ بھی نہیں جو چلتی ہے پر چوپایا بھی نہیں۔ آدمی کی جیب میں چھپ کر بیٹھ جاتی ہے اور عورت کی کلائی کی شان ہو جاتی ہے۔ ریل گاڑی اس کی مدد کے بغیر چل ہی نہیں سکتی۔ بڑے بڑے شہروں میں اونچے میناروں پر چڑھ جاتی ہے۔ بتاؤ کیا ہے؟

جوابات

جماعت سوم۔ (۱) گملا (۲) بینگن (۳) انگلیاں۔ دانت۔ زبان اور حلق (۴) لقمہ (۵) ہاتھی (۶) ترازو (۷) کنگھی (۸) پنکھی (۹) دن رات گھنٹے اور پہر (۱۰) سال۔ ماہ اور دن

جماعت چہارم (۱) مینڈک (۲) بید (۳) سرناہی (۴) مکئی (۵) حقّہ (۶) سال ماہ اور دن (۷) دودھ۔ دہی۔ لسی۔ مکھن (۸) کپاس (۹) آم (۱۰) روپیہ

جماعت پنجم۔ (۱) سن (۲) حقّہ (۳) ناخن (۴) ہمالیہ (۵) روپیہ۔ اٹھنی۔ چونی۔ دونی۔ آنہ۔ پیسے (۶) مرد کی بیوی کی ماں۔ یعنی اُسکی بھی ماں۔ (۷) ۱۱۱ (۸) رنجیت سنگھ (۹) چراغ (۱۰) سرناہی

جماعت ششم کے جوابات لکھنے کی ضرورت نہیں۔ سوچنے والے خود بخود ان کا جواب نکال لیں گے۔

حصہ اپر مڈل کی جماعتوں کے لئے تو معمّاجات اس قدر دلچسپ اور وسیع پیمانے پر بن سکتے ہیں۔ کہ اگر طلباء کی توجہ اس طرف کھینچی جائے۔ تو اپنی طبع آزمائی سے ہفتہ وار کلبوں اور جلسوں میں ایک پُر لطف تعلیمی شغل کا کام دیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ کامیاب ہیڈ ماسٹر پیشتر بھی اس قسم کے کام کسی نہ کسی شکل میں ضرور اپنے مدرسہ میں کراتے ہونگے لیکن اگر ہر ایک مدرسہ میں رواج پا جائیں۔ تو ایک مفید اور ضروری بات ثابت ہوں گے۔

کارآمد باتیں

۱۔ مصیبت کے وقت گھبرانا نہ چاہیئے۔

۲۔ بیحیائی جوان مردوں کا شیوہ نہیں۔

۳۔ جو کام تم خود کر سکتے ہو اس کیلئے کسی دوسرے کو تکلیف مت دو۔

۴۔ محنت دولت و بزرگی کی کنجی ہے۔

۵۔ خیرات کا اثر بعد میں مفید ثابت ہوتا ہے۔

۶۔ بد عادتوں سے قوت احساس کم ہو جاتی ہے

۷۔ صبر گرچہ تلخ است، ولیکن بر شیریں دارد۔

۸۔ محنت کبھی اکارت نہیں جاتی۔

۹۔ کسی کام میں تعجیل سے کام نہیں لینا چاہیئے۔

میدان کھیل کا نظارہ

بہادر کھلاڑی کرکٹ کھیل رہے ہیں
شاباش میرے شیر!
خوب ہٹ لگائی

تعلیم کا اصل مدعا

(جناب چوہدری پران ناتھ صاحب دت ایم اے ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس کرنال)

قبل اس کے کہ نفس مضمون کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہ ضروری ہے کہ ہندوستان کی تاریخ ارتقائے تعلیم پر ایک تمہیدی مگر مختصر تبصرہ کیا جائے۔ ہندوستان کے تمدن کو بلحاظ ارتقائے تعلیم حسب مطابقت تاریخ تین زمانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی عصر قدیم۔ عصر متوسط اور عصر جدید۔

عصر قدیم میں ہم صرف اُس زمانہ کو شامل کرتے ہیں۔ جب کہ اس ملک میں صرف السنۂ قدیمہ مثل سنسکرت اور پالی زبانوں کی تعلیم ہوتی تھی۔

عصر متوسط سے وہ زمانہ مراد ہے۔ جب کہ ہندوستان کی قدیم زبانوں کے ساتھ دیگر السنۂ مشرقیہ مثل عربی، فارسی کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔ اور عصر جدید میں ان تمام زبانوں کے ساتھ مگر بہ ترجیح تمام انگریزی کی تعلیم بھی شامل ہوئی۔ ان تینوں زمانوں میں تعلیم کی غایت اصلی فلسفۂ رائج الوقت کے ماتحت حسب ضرورت زمانہ جُداجُدا رہی ہے۔ ازمنۂ ماضیہ میں جب کہ تعلیم و تعلّم کا استحقاق صرف برہمنوں کی مقدس ذات تک محدود تھا۔ اس کا مدعا خالصتہً تزکیۂ نفس و روح، تربیت قوائے ذہنیہ اور تحفظ آئین و مسائل مذہبی تھا۔ اسی لئے تعلیم بالکل دھارمک تھی۔ اور اخلاقی پہلو غالب۔

قرون وسطیٰ میں جس میں مسلمانوں کا دور حکومت بھی شامل ہے۔ اس اخلاقی غایت کے ساتھ جزوی طور پر اس خیال کی بھی ابتدا ہوئی۔ کہ حکومت وقت کے دفتری کاروبار میں تعلیم یافتہ لوگوں کو ملازمت میں ترجیح دی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ ہم اس ارتقاء کے آخری یعنی جدید دَور میں داخل ہوتے ہوئے معتبر شواہد کی بنا پر دیکھتے ہیں کہ مدعائے تعلیم کا روحانی عنصر فلسفۂ جدیدہ کے زیر اثر مادیت کا رنگ اختیار کرنے لگا۔ افلاطون کا قدیم نظریۂ تعلیم "علم، محض علم کے لئے" یعنی بغیر کسی دنیاوی مفاد کی لگاوٹ کے ضعف پذیر ہوتا گیا۔ میں چاہتا ہوں کہ قدیمۂ کرام کے سامنے عصر جدید کے تعلیمی ارتقاء کا تبصرہ کسی قدر وضاحت سے پیش کروں۔

حکومت انگلشیہ کو جس وقت ابتدائے سلطنت میں ہندوستان کی تعلیم کے مسئلہ پر غور کرنا پڑا۔ اس وقت یہ بھی ایک اہم ضرورت تھی کہ قطع نظر ترقی تمدن و تہذیب کے حکومت کی مشینری کو چلانے کے لئے ایسے انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کی کثیر تعداد درکار تھی۔ جو فرمانروایان ملک کا ہاتھ انتظام سلطنت میں بٹائیں۔ مگر چونکہ اس زمانہ میں ہندوستانیوں کا اخلاقی تخیل یورپ کے فلسفۂ جدیدہ کے مفاد منتج (Utilitarian.) نقطۂ نظر کے ادراک کا

حاصل نہ ہو سکا تھا۔ اس لئے اشاعتِ تعلیم میں حکومت کو گوناگوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اور باوجود سالہا سال کی تحریص و ترغیب کے جو بھی تھوڑی تعداد انگریزی تعلیم سے متصف ہوتی تھی۔ وہ متواتر سرکاری عہدوں پر مامور ہوتی رہی۔ جوں جوں نظام حکومت کے شعبے اور محکمے وسعت پاتے رہے "تعلیم یافتہ" لوگوں کی مانگ بڑھتی رہی۔ یہی عمل ایک صدی سے بھی زیادہ زمانہ تک جاری رہا۔ مگر ایک وقت ایسا ضرور آنے کو تھا۔ جب کہ پیداوار مانگ سے متجاوز ہو۔ کیونکہ اشاعتِ تعلیم کی کوشش حکومت کی طرف سے بیش از پیش شد و مد کے ساتھ جاری رہی ہے۔ بلکہ اس مد میں اب تک کوئی جزر پیدا نہیں ہوا۔ اسلئے نتیجۃً ملک میں ایسے تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد عرصہ سے ضرورت سے بہت زیادہ ہو چکی ہے۔ جن کا مدعا اکتسابِ علم سے حصولِ ملازمت تھا۔ مگر اس وقت گورنمنٹ کا منشا اشاعتِ تعلیم سے یہ نہیں کہ ہر تعلیمیافتہ سرکاری ملازمت کا جویاں ہو۔ اگرچہ حکومت نے اپنے نقطۂ نظر کو بڑے عرصہ سے بدل دیا ہے۔ مگر ایک متوسط الخیال ہندوستانی اور بالخصوص دیہاتی والدین اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کے لئے صرف غرض ملازمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے پیش کرتے ہیں اور چونکہ لوگ اپنے عینی تجربات کی بنا پر تعلیم اور ملازمت کی وابستگی کو مدت ہائے مدید سے مشاہدہ کرتے آئے ہیں اس لئے ان کے لئے مدعا تعلیم کا ملازمت قرار دینا کوئی امرِ تعجب نہیں۔ مگر بحیثیت الجنٹ اشاعتِ تعلیم یہ صرف ہمارا کام ہے۔ کہ ہم اس بارے میں والدین کی راہنمائی کرتے ہوئے ان کو تبلائیں کہ فی زمانہ تعلیم کا نصب العین کیا ہونا چاہئے؟ جس کی تشریح آئندہ پیش کی گئی ہے۔

تعلیمی حلقوں میں ماہرینِ تعلیم نے مدعاءِ تعلیم کے متعلق ایسے بسیط و جامع مضامین پیش کئے ہیں۔ کہ ان کی تکرار طول لاطائل ہے۔ اگرچہ اس خیال سے یہ مضمون پامال اور افسردہ ہے۔ مگر میں نے آئندہ سطور میں دیہاتی تعلیم کے مسئلہ کو مبحث قرار دیتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

اہل شہر دیہاتیوں سے زیادہ متمدن اور مہذب ہو چکے ہیں۔ مگر دیہات میں ابھی آبادی کا کثیر حصہ یعنی تقریباً ۹۰ فیصدی ہندوستان کی دیہاتی آبادی تعلیم و تمدن سے عاری ہے۔ اسوقت دیہاتی تعلیم کا مسئلہ صوبجاتی حکومتوں کے لئے خاص مشکلات پیش کر رہا ہے۔ جو پرائمری یا ابتدائی تعلیم کی اشاعت سے حل کیا جا رہا ہے۔ اور اس ضمن میں یہاں یہ تبلادینا بیجا نہ ہوگا۔ کہ پنجاب میں پرائمری تعلیم کی توسیع موجودہ ڈائرکٹر صاحب بہادر تعلیم پنجاب کے حسن تدابیر سے اتنی ہو چکی ہے۔ کہ اس صوبہ کو ملک کے دیگر صوبجات میں امتیاز خاص حاصل ہو چکا ہے۔ مگر با ایں ہمہ ابھی دیہاتی آبادی کا صرف چند فیصدی حصہ تعلیم یافتہ کہا جا سکتا ہے۔ باوجود محکمہ کی کوشش بلیغ کے ابھی پنجاب کا بہت تھوڑا حصہ تعلیم سے بہرہ ور ہو سکا ہے۔ اس کے اسباب چند در چند ہیں۔ اور محکمہ کو اشاعتِ تعلیم میں بے شمار مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ میں ان مشکلات کی طوالانی فہرست میں سے صرف ایک مشکل کو اپنے مبحث کے دائرہ میں رہتے ہوئے بیان کرنا چاہتا ہوں، یعنی پنجاب کے اُن اضلاع میں جہاں ابتدائی اور ثانوی مدارس میں تعدادِ طلبا مایوس کن ہے۔ اس کا سبب عام لوگوں

کی بے اعتنائی بلکہ تنفر ہے۔ یہ تنفر اور بے اعتنائی جن اسباب کا نتیجہ ہے۔ وہ چارگونہ ہیں۔ جن کو یکے بعد دیگرے میں نے کسی قدر وضاحت سے بیان کیا ہے۔

۱۔ محکمۂ تعلیم اور والدین کے درمیان اختلافِ مدّعائے تعلیم۔

۲۔ ابتدائی نیز ثانوی تعلیم میں اقتصادی عنصر کا فقدان۔

۳۔ موجودہ تعلیم کا گراں ہونا۔

۴۔ تعلیم یافتہ طبقہ کی بے روزگاری۔

اگرچہ بادی النظر میں آپ کو یہ چار علیحدہ علیحدہ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مگر دراصل ان سب کی تہ میں وہی غلط نصب العین کا تعین پوشیدہ ہے۔ تاہم ان میں سے ہر ایک انفرادی بحث کا متقاضی ہے۔

۱۔ موجودہ زمانہ میں جب کہ دنیاوی تعلیم کا مدعا یہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ وہ متعلم کو عملی زندگی میں کامیاب بنانے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ اور جس وقت ہم ہندوستانی تعلیم یافتہ لوگوں میں بیکاری پاتے ہیں۔ تو موجبِ حیرت و استعجاب ہوتا ہے۔ مگر اس حیرت و تعجب کو دور کرنے کے لئے صرف اتنا خیال کرنا کافی ہے۔ کہ جو لوگ تعلیم پاکر بیکار ہو گئے ہیں۔ انہوں نے دورانِ تعلیم میں یا ان کے سرپرستوں نے ان کی تعلیم کے زمانہ میں کبھی کسی مدّعا اور غایت کا خیال اور فیصلہ نہیں کیا۔ قطع نظر تعلیم کے دوسرے اثرات کے جن میں تمدن و تہذیب۔ تربیت ذہن۔ اصلاح خصائل۔ درستیٔ اخلاق اور قومی کیرکٹر کا استحکام وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ فی زمانہ تعلیم کا مقصد بیشتر اقتصادی ہے۔ یعنی اہل حرفہ خواہ وہ زراعت پیشہ ہوں، یا تجارت پیشہ۔ دستکار ہوں یا مزدور، اپنے اپنے اشغال متعلقہ میں تعلیم کی بدولت ترقی اور فروغ حاصل کریں۔ اور اس زندگی کی کشمکش میں جب کہ مسئلہ بقائے لائق ترین (Survival of the fittest) کارفرما ہے ۔ وہ اس قابل ہو سکیں کہ زمانہ اُن کو مقابلہ کے میدان میں شکست دے کر بالکل نیست و نابود نہ کر دے۔ مگر بالعموم لوگ ابھی تک تعلیم کو بغرض حصول ملازمت حاصل کرنے کا رجحان رکھتے ہیں۔ اگرچہ زمانہ کی ناساعدت ایک عرصہ سے اُن کو اشارہ کر رہی ہے۔ کہ ان تلوں میں تیل نہیں رہا۔ مگر لوگوں کی قدامت پسندی ہنوز اصلاحِ خیال میں سدِّ راہ ہے۔

۲۔ موجودہ تعلیم میں اقتصادی عنصر کے فقدان سے جو مطلب ہے۔ اس کو ایک تمثیل سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ دیہاتی کاشتکاروں کی زندگی کا مشاہدہ بتلاتا ہے کہ ان کے خاندان کا ہر فرد، خواہ وہ زمرۂ اناث سے ہو یا ذکور سے ایک فرض خاص رکھتا ہے۔ جس کی ادائیگی خاندان کے کسبِ معاش میں ایک اقتصادی قیمت رکھتی ہے۔ اگر ان کا پیشہ کاشتکاری فرض کیا جائے۔ تو خاندان کا ہر باتمیز بچہ مشاغل کشاورزی میں اپنے والدین کو بلا اُجرت نقد جو خدمت ادا کرتا ہے وہ بصورت عدم موجودگی اس بچہ کے بمعاوضہ زرِ نقد کرانی پڑتی ہے۔ اس لئے کاشتکاروں کے بچے گویا ایک بازاری قیمت رکھتے ہیں۔ چنانچہ جس وقت اُن سے بچوں کو مدرسہ میں داخل کرانے کے لئے کہا جاتا ہے۔ تو ان کا تذبذب

اکراہ، اور نارضامندی تمام تر گویا اسی مالی نقصان کے خیال پر مبنی ہوتے ہیں۔ مگر اُن کے لئے جو امر تعلیم سے منافرت پیدا کرنے میں سب سے زیادہ ممد ہوتا ہے۔ وہ ان کے بچوں کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ یعنی جو والدین اپنے بچوں کو کسی بیرونی دباؤ کی وجہ سے مدرسہ میں داخل کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ وہ اکثر پرائمری درجے سے زیادہ نہیں پڑھاتے۔ جن کے لئے بچوں کو علی العموم پانچ سال مدرسہ میں صرف کرنے پڑتے ہیں۔ پرائمری مدارس میں بچوں کے آبائی پیشوں کی کوئی تربیت نہیں ہوتی۔ اس لئے ایک پرائمری پاس لڑکا اس پانچسال میں اپنے والدین کے پیشہ میں بجائے مفید نفری ہونے کے ایک رکن معطل ہو جاتا ہے۔ گو اس معطلی کی میعاد زیادہ نہیں ہوتی۔ اور تھوڑے عرصہ کی تربیت سے وہ پھر ایک مفید رکن بن جاتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے اگر اسکی تعلیم مڈل تک ترقی کر جاتی ہے تو زمانۂ معطلی اکثر حالات میں اتنا غیر متعین ہوتا ہے۔ کہ بالآخر اس کو ملازمت کی جستجو کرنی پڑتی ہے۔ جس کا دروازہ تقریباً بند ہو چکا ہے۔ اسکی بیکاری اس کے سرپرستوں کے لئے وبال اور سراسر مالی نقصان کی مترادف ہوتے ہوئے وہ آئندہ کے لئے نہ صرف اپنے اقران و امثال میں بلکہ جملہ اہلِ دیہہ کیلئے تعلیم کے لئے بے سود ثابت کرنیکا مجسّم پروپیگنڈا ہو جاتا ہے اور سرپرستوں کو اس کی بد تعلیمی کا خمیازہ اٹھانا پڑتا ہے۔

اس تعلیم العوام (mass education.) کے قابلِ غور نقص کا ازالہ جزواً خود عوام کے اختیار میں ہے۔ اور جزواً محکمۂ تعلیم یا حکومت کے۔ ایک طرف عوام کو لازم ہے۔ کہ وہ غایتِ تعلیم کی صحیح تفہیم کے بعد اپنے بچوں کے تعلیمی معیار کو صرف پرائمری تک محدود نہ رکھیں۔ بلکہ محکمہ کے اصلی منشار کے مطابق اُن کو اپنے پیشوں کی ٹرننگ کے لئے متعلقہ اداروں میں بھیجیں۔ جبکہ دوسری طرف حکومت کو بھی دیہاتی تعلیم کے نصاب میں طلبا، کے آبائی پیشوں کی تربیت کا اہتمام زیادہ وسیع پیمانہ پر مہیا کرنا چاہیئے۔ جو عوام کو کم سے کم خرچ پر میسر ہو سکے۔ تاکہ طلبار بعد اختتام مدتِ تعلیم اپنے جاہل والدین کی نسبت زیادہ مفید کاریگر ثابت ہوں۔ اور ملازمت کا رجحان ان کی طبیعت سے یک قلم محو ہو جائے

گزشتہ چند سالوں سے اور بالخصوص اس سال کے دوران میں ملک کی اقتصادی حالت میں جو افسوسناک تنزل ہوا ہے۔ اُس کا سب سے بڑا سبب عوام کی تعلیمی پسماندگی ہے۔ تعلیم یافتہ ممالک ہر ضرورت زندگی کے پیدا کرنے میں تعلیم کی بدولت ایسے وسائل اختیار کر رہے ہیں۔ جن سے کہ وہ فطرتی موانعات اور مشکلات کا مقابلہ زیادہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔ مگر ہندوستان جہاں تعلیم گویا اب تک مفقود ہی ہے۔ اُن فطری رکاوٹوں کا مقابلہ مصنوعات سے نہیں کر سکتا۔ ہر زمیندار اور کاشتکار خوب جانتا ہے۔ کہ زمینوں کی سابقہ پیداوار میں اتنا انحطاط ہو گیا ہے۔ کہ اگر اب مصنوعی وسائل سے اسکی طاقت کو برقرار نہ رکھا گیا۔ تو کاشتکار طبقہ قریب بہ ہلاکت پہنچ جائیگا۔ ان مصنوعی وسائل کاشتکاری و دیگر دستکاریوں کے نظام کا طریقہ بغیر تعلیم ناممکن ہے۔ اس لئے فی زمانہ تمام اہلِ حرفہ کو اپنی بقائے نوع کے

لئے زمانہ کا مقابلہ تعلیمی ہتھیار سے کرنا ہے۔ جس کا مدعا اکتسابِ فنون ہونا چاہیئے۔ نہ کہ اکتسابِ چاکری۔

یہاں یہ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہیں کہ موجودہ عالمگیر ارزانی اجناس کا سبب ایک فرانسیسی ماہر اقتصادیات متمدن ممالک کی کثرتِ پیداوار بتاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کی منڈیوں میں اجناس و میوہ جات کی ارزانی پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ اس نے ایک باغات کے مالک سے پوچھا کہ اس نے اپنی پیداوار کو درختوں سے کیوں نہیں اتارا؟ تو اس نے جواب دیا کہ منڈی میں میوہ جات کی کثرت نے ان کے نرخ میں اتنی ارزانی پیدا کر دی ہے کہ درختوں سے اتارنے میں جو خراش ہاتھوں پر آتے ہیں۔ ان کے لئے جس کار بالک لوشن کی ضرورت ہوتی ہے اس کی قیمت بھی وصول نہیں ہوتی۔ یہ کثرتِ پیداوار مصنوعی وسائل کاشت کا ذریعہ ہیں۔ لیکن برخلاف اس کے ہندوستان میں قلتِ پیداوار کی شکایت ہے۔ "وائے برحالِ ما"

۳۔ تعلیم کی گرانی کا سوال پرائمری درجات تک تو لازمی تعلیم کے قانون کے نفاذ سے علاج پذیر ہو چکا ہے۔ مگر اعلیٰ تعلیم اب تک ایک متوسط والدین کے ذرائع آمدنی سے باہر ہے۔ پرائمری تعلیم کا ناکافی ہونا سطور بالا میں ثابت کیا جا چکا ہے۔ اس لئے حکومت کی توجہ اعلیٰ تعلیم کی ارزانی کے وسائل اختیار کرنے کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے اور امید ہے کہ اس مشکل کا حل بھی جلد ممکن ہو سکیگا۔

۴۔ تعلیم یافتہ طبقہ کی بیکاری کا مسئلہ اور اُس کا حل ایک حد تک نمبر ۱ کے ضمن میں بیان کیا جا چکا ہے۔ تاہم اسکی وضاحت اتنی کافی ہے کہ سرپرستوں کا فرضِ اولین اپنے بچوں کی تعلیم کے متعلق یہ ہے کہ وہ انکی فطری میلان طبیعت کا صحیح اندازہ لگا کر انکو صرف اُسی قسم کی تعلیم کیلئے مخصوص کریں۔ جو اُن کو آئندہ زندگی میں مفید ثابت ہو سکے۔ فی زمانہ اصناف تعلیم کی فہرست اتنی طویل ہے۔ کہ تمام علوم و فنون مروجہ کا یہاں ذکر کرنا فضول ہوگا۔ لیکن اس بارے میں سب سے اچھا اور معتبر رہنما صرف طبقہ معلمین ہے۔ جن کا فرض ملکی بہبودی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ہے کہ وہ ہر بچہ کے فطری رجحان کا بغور مطالعہ کر کے سرپرستوں کی رہنمائی کریں۔ اور طلباء کو غیر مانوس اور غیر فطرتی تعلیم کی خرابیوں سے متنبہ کرتے رہیں۔

میں یہ ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ بچوں کے فطری رجحان کا اندازہ لگانا بجائے خود ایک فنِ خاص ہے جسکی مہارت حاصل کرنیکے لئے ثانوی مدارس کے معلمین کو زمانہ تربیت میں بچوں کی نفسیات Child Psychology کے مطالعہ کا موقعہ دیا جاتا ہے۔ مگر اس کا شمول نارمل سکولوں کے نصاب میں بھی لازم ہے تاکہ پرائمری مدارس کے معلمین بھی اس فن کے ضروری اصول سے واقفیت حاصل کر کے خود متمتع ہوتے ہوئے دوسروں کو بھی مستفید کر سکیں۔

اِسیطرح دیہاتی رقبوں میں تعلیمی اشاعت کرنیوالوں کو جن میں میرے ہم عہدہ اصحاب اور انکے معاونین شامل ہیں۔ لازم ہے کہ وہ دیہات کے لوگوں کی رہنمائی اس بارے میں خاص طور سے کریں۔ اور جستجو تعلیم کے عنصر کو موجودہ نظام تعلیم میں داخل ہونیسے باز رکھیں۔ اس مقصد کے حصول کیلئے جو وسائل خاص اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ انکا ذکر کسی آئندہ مضمون میں کرونگا۔

بیوہ کی فریاد

(اس نظم کی خوبیاں - ۱ - بے عطف و اضافت - ۲ - ہر شعر مردف ہے)

کسی کی یاد دل میں ہے کہ جس سے جی نڈھال ہے — کہوں اگر تو کیا کہوں عجب طرح کا حال ہے

عجب طرح کا حال ہے بہت خراب حال ہوں — غموں سے ہوں گھری ہوئی غموں سے پائمال ہوں

نہ وہ زمیں نہ وہ فلک نہ اب وہ کائنات ہے — وہ زندگی ہی اب نہیں نہ دن ہے وہ نہ رات ہے

یہ دل جو نامراد ہے کبھی یہ بامراد تھا — ہے یاد جس کی اب مجھے کبھی یہ اس کو یاد تھا

وہ آرزو ہے کونسی جو آج پا بہ گل نہیں — ہے نام دل کا دل مگر جو سچ کہوں تو دل نہیں

گھٹا اٹھی تو ہے مگر پپیہا آج گائے کیا — تڑپ مری مٹائے کیا لگی مری بجھائے کیا

پریم سے بھرے ہوئے بچن کہ جن سے کان آشنا — وہ مست آنکھ مدبھری کہ جس سے جان آشنا

وہ بات بات پر ہنسی وہ چھیڑ پیار پیار میں — قرار اک تڑپ میں وہ تڑپ وہ اک قرار میں

کبھی ادھر سے تاکنا کبھی ادھر سے دیکھنا — وہ میرے دل کے شوق کو میری نظر سے دیکھنا

غرض وہ دن کہ جب مرے چمن میں اک بہار تھی — غرض وہ دن کہ جب خوشی میرے لئے سنگار تھی

غرض وہ دن کہ نغمہ زن مسرتوں کا ساز تھا — غرض وہ دن کہ حسن جب میرا نظر نواز تھا

غرض وہ دن گھڑی نہ تھی فلاکتوں کے دور میں　　غرض وہ دن پھنسی نہ تھی مصیبتوں کے جور میں

غرض وہ دن کہ دل سے جب نشان غم کا دُور تھا　　غرض وہ دن کہ آنکھ میں بھرا ہوا سرور تھا

غرض وہ دن کہ میں بھی جب کسی کے دل کا ناز تھی　　غرض وہ دن نیاز کے کہ جب میں بے نیاز تھی

غرض وہ دن خیال تھا کہ اب نہ جائیں گے کبھی　　چلے گئے کچھ اس طرح کہ پھر نہ آئیں گے کبھی

غضب ہے ہے شباب میں مرا سہاگ لُٹ گیا　　سفر میں تھا جو ہمسفر اسی کا ساتھ چھٹ گیا

مری سکھی سہیلیو خبر تو لو کہ کیا ہؤا　　کبھی تو آ کے پُوچھ لو یہ حشر کیا بپا ہؤا

یہ سچ ہے مجھ غریب کا کوئی رفیق اب نہیں　　یہ سچ ہے غم نصیب کا کوئی شفیق اب نہیں

کہو تو یاد ہیں وہ دن کہ دل تھے جب ملے ہوئے　　کہاں ہے وہ شگفتگی کہ دل تھے جب کھلے ہوئے

کہو وہ عیش کیا ہؤا وہ راحتیں کہاں گئیں　　وہ پیار آج کیا ہؤا وہ الفتیں کہاں گئیں

فغاں میں اب وہ جوش ہے کہ جس کی انتہا نہیں　　جگر میں اب وہ درد ہے کہ جس کی کچھ دوا نہیں

خیال ہے خزاں میں بھی مجھے اسی بہار کا　　غضب ہے چھوڑتا نہیں فریب انتظار کا

اجل کی ایک شکل ہے یہ درد اس بلا کا ہے　　دوا کروں تو کیا کروں کہ وقت اب دعا کا ہے

مری طرح نہ زندگی کسی کی یُوں عجیب ہو

نصیب موت ہو اگر تو زندگی نصیب ہو

عرش ملسیانی

سردار بکرم سنگھ صاحب بی اے بی ٹی ای ای ایس
ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس راولپنڈی
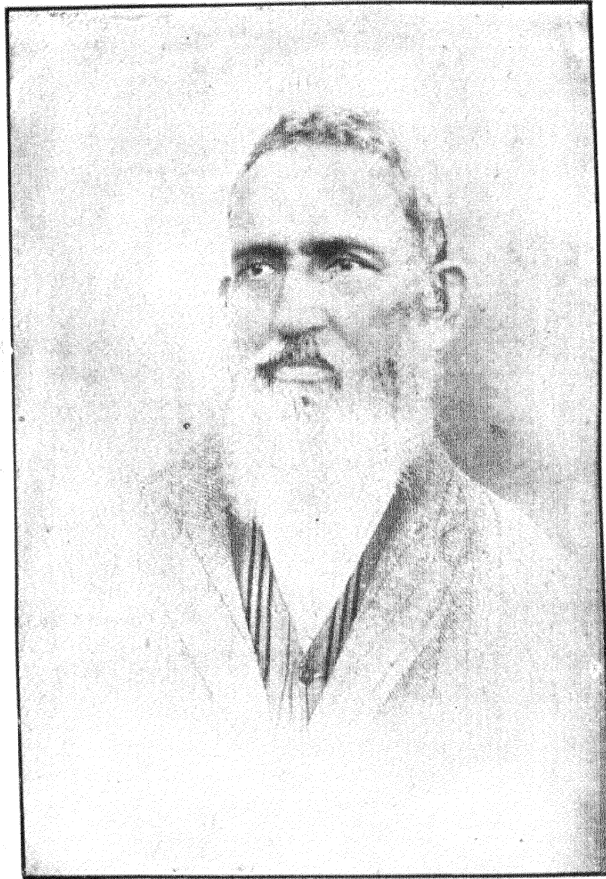
پنڈت رلیا رام صاحب ریٹائرڈ پروفیسر علوم مشرقیہ سنٹرل
ٹریننگ کالج لاہور

ہمارا تعلیمی معیار کیوں گر رہا ہے؟

(جناب ایس۔ایس شرما ایم۔اے۔دہلی)

جس گھر میں ایک آدمی بیمار ہوتا ہے۔گھر والے سب دکھی ہو جاتے ہیں۔جائے غور ہے کہ جس ملک کے ۹۵ فیصدی باشندے جہالت کے مہلک مرض میں مبتلا ہوں۔وہ کیسے خوشحال رہ سکتا ہے؟

آج کون ہے۔جو تعلیم کی ضرورت کو محسوس نہیں کرتا۔اور ہندوستان کی نجات کا اسے واحد ذریعہ نہیں سمجھتا۔علم تمام برکتوں کا منبع ہے۔اسی کی بدولت انسان نے عالم سفلی کی ماہیت کو سمجھا۔عالم علوی کی حقیقتوں کو جانچا۔قدرتی طاقتوں سے نوکروں اور خادموں کا کام لیا۔اور نیک و بد میں تمیز کی۔اس کو فروغ دینے کے لئے کیا کیا کوششیں نہیں ہوئیں نئی نئی سکیمیں بنیں۔نئے نئے کورس بنائے گئے۔ٹریننگ کلاسیں کھولی گئیں۔پرائمری کی تعلیم مفت اور لازمی قرار دی گئی۔جو دن کے سکولوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ان کے لئے رات کے مدرسے بھی کھولے گئے۔ان تمام کوششوں کے باوجود بھی تعلیمی ترقی کی نسبت شکایت ہی سننے میں آتی ہے۔اور غور کرنے پر یہ شکایت بہت حد تک درست بھی ثابت ہوتی ہے۔جتنا وقت اور روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔اسکے مطابق فائدہ نہیں پہنچ رہا۔آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کو سمجھنے کے لئے ہمیں موجودہ تعلیمی نظام کا غور سے مطالعہ کرنا چاہیئے۔اور دیکھنا چاہیئے۔کہ اس میں کیا کیا خامیاں ہیں۔

سب سے بڑی خامی جو دیکھنے یا سننے میں آتی ہے۔وہ یہی ہے۔کہ عام طور پر مدرسین پوری توجہ سے فرائض انجام نہیں دیتے۔بچوں کی اخلاقی اور جسمانی تربیت سے تو وہ اپنا کچھ تعلق ہی نہیں سمجھتے۔اور درس و تدریس کی ذمہ داری ایک بوجھ خیال کی جاتی ہے۔کسی قوم کا بنانا یا بگاڑنا۔اس کے استادوں کے ہاتھ میں ہے۔استاد ہی قوم کے بچوں میں انسانیت کی روح پھونکتا ہے۔وہی انہیں آئندہ زندگی میں سوسائٹی کے لئے مفید رکن بناتا ہے۔اس لئے اس کی ذمہ داری بہت بڑی ہے۔اس کا مرتبہ بلند ہے۔وہ قابل عزت ہے۔مگر ہمارے ملک میں اس کی کیا حالت ہے؟ ایک ان پڑھ مزدور تو روپیہ روز کی مزدوری بھی حاصل کر لیتا ہے۔مگر مدرس کے کام کا صلہ ۱۲ر روز ہی کافی سمجھا جاتا ہے۔اور پھر اس سے یہ بھی امید کی جاتی ہے۔کہ جہاں وہ بچوں کی تعلیم کا ذمہ دار ہے۔اس کے ساتھ ہی وہ ان کی اخلاقی۔جسمانی اور روحانی تربیت کا بھی نگراں ہو۔اس کی ذات غیرت۔خودداری اولوالعزمی۔عالی ظرفی اور بلند خیالی وغیرہ صفات سے مزین ہو اور ہمارے بچوں میں بھی ان شرائف انسانی کا بیج

ہوئے۔ جائے غور ہے۔ کہ جو شخص اپنی ضروریاتِ زندگی کیلئے بھی محتاج ہو۔ جسے خورد و نوش کے فکر سے بھی نجات نہ ہو اور جس کا خیال بسا اوقات انہیں مشکلات کا حل ڈھونڈھنے میں لگا رہتا ہے۔ ہم کس طرح امید کر سکتے ہیں۔ کہ وہ اتنی بڑی ذمہ داریوں کا بار کامیابی سے اٹھا سکیگا۔ اور اپنا دماغ اپنی توجہ اور اپنا وقت آزادی سے بچوں کی تعلیم و تربیت میں صرف کر سکیگا۔ اس کے بھی بچے ہیں۔ جن کی تعلیم کا بار اس کی گردن پر ہے۔ اس کے رشتہ دار بھی ہیں۔ جن کی شادی غمی کی بدولت اور ان کی زیر باریاں اُسے برداشت کرنا ہیں۔ اُسے بھی اچھی سوسائٹی میں رہنا ہے۔ اور اس کے مطابق اپنی حیثیت رکھنی ہے۔ ۱۲ آنے روز میں وہ کیا کر سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ کمی پوری کرنے کیلئے اُسے آمدنی کے دیگر راستے تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ اور جتنا دماغ توجہ اور اپنا وقت اس طرف صرف کرنا پڑتا ہے۔ اسی نسبت سے اس کے اصلی کام یعنی تعلیم میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مدرسوں میں تعلیمی کام کامیابی سے نہیں چل رہا۔

ہم مدرسے کی عمارت پر ہزاروں روپیہ صرف کر دیتے ہیں۔ اس کو فرنیچر اور دیگر سامانِ تعلیم۔ کھیل اور لائبریری وغیرہ سے آراستہ کرنے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ مگر جب استادوں کے رکھنے کا سوال آتا ہے۔ تو روپیہ کی کمی نظر آتی ہے۔ اور سستے سے سستے ٹیچر رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جن کا گزارہ بھی قلیل تنخواہ میں بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔ ہماری یہ بے جا کفایت شعاری اس روپیہ کو بھی ضائع کرنے کا موجب ہوتی ہے۔ جو ہم نے عمارت اور سامان پر لگایا ہے۔ مدرسے کی زینت اس کی عمارت اور فرنیچر سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کی اصلی زینت استاد ہے۔ جب وہی مطمئن نہیں۔ جب وہی شکم پروری کے تفکرات سے آزاد نہیں۔ اور اپنا دل و دماغ سکول کی بہتری کے لئے وقف نہیں کر سکتا۔ تو یہ عالیشان عمارتیں اور قیمتی سامان ہمیں کیا فائدہ پہنچائیں گے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ پہلے اُستادوں کو مطمئن رکھنے کا انتظام کرتے۔ اور پھر بقایا روپیہ کو عمارتوں اور دیگر سامان پر صرف کرتے۔ تاکہ ہمارے بچوں کی تعلیم و تربیت میں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔ اور اُن کا وقت اور قوت اس طرح ضائع نہ ہوتی جیسے آجکل ہو رہی ہے کتنے بچے ہیں۔ جو بلا گھر پر انتظام کئے صرف مدرسے ہی کی مدد سے اپنا تعلیمی کورس سال بہ سال باقاعدہ طور پر پورا کرتے ہیں؟ جواب مایوس کُن ہے۔ بچوں کا قیمتی وقت ہماری بے توجہی سے ضائع ہو رہا ہے۔

ہندوستان میں اُستاد کا درجہ بہت افضل گنا جاتا تھا ہے۔ کیا امیر کیا غریب راجاؤں تک نے استاد کا درجہ اپنے سے بالاتر مانا ہوا تھا۔ کیونکہ راجا تو لوگوں کی جان و مال کا محافظ ہوتا ہے اور استاد ان کے دلوں کا مالک راجا کی حکومت اس کے جیتے جی ہے مگر استاد کی سلطنت کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا ہے

ہر سلطنت انجام پذیر است بمیعاد
جز سلطنتِ فیض دہِ حضرتِ اُستاد

اُستادوں کے گزارے کا ایسا انتظام ہوتا تھا۔ کہ انہیں اس طرف توجہ دینے کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی

تھی - وہ بچوں کی بہتری کے ذرائع سوچنے میں ہر وقت آزاد تھے - اور عملی کام کے لئے ان کے دل ودماغ وقف تھے -

آج کل بھی جو ملک شاہراہ ترقی پر گامزن ہیں - ان کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں استادوں کی قدر ومنزلت بہ نسبت کسی اور طبقے کے لوگوں کے زیادہ ہے - اور ان کی تنخواہیں ان کی حیثیت برقرار رکھنے اور ضروریات زندگی پوری کرنے کیلئے کافی سے زیادہ ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ پوری توجہ سے گلشن قومی کے ان سب سے زیادہ بار آور پودوں کی پرورش کرتے ہیں - اور ان کی اصلاح اس خوبی سے ہوتی ہے کہ وہ بڑے ہو کر نہ صرف اپنے ملک وقوم کی زینت ہی ہوتے ہیں بلکہ بنی نوع انسان کی فلاح وبہبودی کا باعث بنتے ہیں - اسلئے ضروری ہے - کہ ہم تعلیم کے اس پہلو پر توجہ دیں - اور استادوں کی مشکلات کو دور کرنے کے ذرائع اختیار کریں - جب تک ایسا نہیں ہوگا - ہمارا تعلیمی کام کبھی کامیاب نہیں ہوگا - یاد رکھو مدرسہ کوئی سیرگاہ نہیں ہے - بلکہ وہ ایک میدانِ رزم ہے - جس میں سینکڑوں نوجوانوں کی زندگی اور موت کی بازی لگی ہوئی ہے - جب اس لشکر کا کمان افسر ہی افسردہ دل یا فرض سے غافل ہو - تو وہ بیچارے اپنے فرائض کو کیا سمجھ سکتے ہیں ؎

از مدرسہ ہر ملک پذیرفتہ عمارت
غارت شدہ گر گشتہ ہم از مدرسہ غارت

جائے افسوس ہے کہ ہمارے ملک کے امرا اپنے گھوڑوں کو سدھانے کے لئے تو اچھے سے اچھے چابک سوار تلاش کرتے ہیں - مگر اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے سستے سے سستے ٹیچر کی - یہی وجہ ہے کہ ان کے گھوڑے تو سدھے ہوئے اور باقاعدہ ہوتے ہیں - مگر ان کے بچے اکھڑ اور ناتراشیدہ ! یہ نہیں ہوسکتا - کہ ایک اَن پڑھ آدمی جانور کو تو سدھائے اور ایک پڑھا لکھا آدمی انسان کے بچوں کی اصلاح نہ کرسکے - فرق صرف یہ ہے کہ جانوروں کو سدھانے والا پوری کوشش سے کام کرتا ہے کیونکہ وہ اپنی محنت کا صلہ حسب منشا پاتا ہے - مگر انسان کے بچوں کی اصلاح کرنیوالے کا دل مرجھایا ہوا رہتا ہے کیونکہ اُسے اس کی محنت کا صلہ کافی نہیں ملتا - ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے استادوں کو مطمئن کریں - ان کی حیثیت کو بنانے میں مدد دیں - تاکہ ان کی قدر ہو - اور وہ دل وجان سے بچوں کی تعلیم وتربیت میں کوشش کریں - بغیر اس کے محض تعلیم کی نئی سکیمیں اور ٹریننگ سکول ہمیں ایک قدم بھی آگے نہیں لیجاسکتے -

لطیفہ

مسافر:- کیا یہ راستہ محفوظ ہے ؟
راہنما:- بالکل محفوظ ہے - مگر اس سے صرف لڑھکنا خطرناک ہے

سکولوں میں مضامین کی تقسیم

(از مولوی غلام ناصر خان صاحب نگار بی۔اے)

یوں تو تعلیم و تعلم کا مسئلہ بنفسہٖ پیچیدہ ہے۔ مگر سب سے اہم مسئلہ جس میں ایک ہیڈ ماسٹر کو اکثر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اساتذہ میں مضامین کی تقسیم ہے۔ عموماً ہیڈ ماسٹر اساتذہ کی قابلیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایسا کیا کرتے ہیں۔ پھر بھی بہت سی خامیاں ہیڈ ماسٹر کی ناتجربہ کاری اور بعض دفعہ جنبہ داری کی وجہ سے اس انتظام میں نظر آتی ہیں۔

سب سے پہلے میں اساتذہ کی ممکن قابلیت اور ڈگریوں کا ذکر کرونگا۔ جو اپنے ساتھ لیکر اسکولوں میں آتے ہیں۔ میرے پیش نظر صرف انگلش اسٹاف ہے۔ اور اس میں بھی جی اے وی اساتذہ کو بحث سے خارج کرتا ہوں۔ اب مدرس یا تو بی ٹی ہوگا یا ایس ای وی اور لازمی طور سے بی اے بھی ہوگا۔ اور یا زیادہ سے زیادہ ایم اے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کونسے مضامین ہیں جو سکولوں میں داخل نصاب ہیں اور ایف اے اور بی ٹی میں بھی پڑھائے جاتے ہیں۔

سب سے پہلے تو سائنس ہی ہے اور اُس کے واسطے بلا استثنار تمام سکولوں میں سائینس ماسٹر جدا ہی ہوتے ہیں۔ لہذا اس سلسلہ میں اُن کا ذکر کرنا فضول ہے۔ اب رہے جغرافیہ۔ حساب اور تاریخ۔ ان میں جغرافیہ صرف ایف۔ اے تک ہے آگے ندارد۔ تاریخ پڑھانے کے واسطے ہر وہ گریجویٹ جس نے B.A. تک تاریخ کا مطالعہ کیا (ٹرینینگ میں بھی اُس کے پاس لازماً یہی مضمون ہوگا) مناسب اور موزوں ہستی ہے حساب کے واسطے وہ گریجویٹ جس کے پاس حساب کے دونوں کورس یا صرف ایک ہو یا آنرز اسکول پاس ہو بہت ہی مناسب ہوگا۔ جغرافیہ میں ہر گریجویٹ کا مبلغ علم اتنا ہوگا۔ جتنا کہ اُس نے انٹرنس میں پڑھا ہے۔ ایسی حالت میں اُن اساتذہ کو ترجیح دینا چاہیئے کہ جن کو اس مضمون سے خاص دلچسپی ہو۔ ہاں اگر ایف۔ اے تک جغرافیہ دان اساتذہ بھی موجود ہوں تو وہ دوسروں پر قابل ترجیح سمجھے جائینگے۔

اوپر میں نے جتنی صورتیں اساتذہ کی بیان کی ہیں وہ عنقا کا حکم نہیں رکھتیں بلکہ تبعد لوکثیر ہر سکول میں موجود ہوتی ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ اوروں کی لیاقت سے کافی فائدہ نہ اُٹھایا جائے۔ صوبہ بھر میں ہیڈ ماسٹر صاحبان اسی قاعدہ کو ملحوظ رکھکر مضامین کی تقسیم کرتے ہیں۔ البتہ اتنا اور ہوتا ہے کہ کسی خاص شخص

کو غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے ایسا مضمون بھی دیدیتے ہیں کہ جس کی سند اُس کے پاس نہیں ہے مگر اُس مضمون میں خاص دلچسپی رکھتا ہے اور ایک سند یافتہ شخص سے کہیں بہتر پڑھا سکتا۔ ایسی مثالیں شاذ ہوتی ہیں اور اصول نہیں بن سکتیں۔

تقسیم مضامین کے سلسلے میں اب ایک نئی بات اور پیدا ہو جاتی ہے۔ جسے تدریسی اصطلاح میں کلاس ٹیچر سسٹم (تمام مضامین کا اُستاد) اور سبجکٹ ٹیچر سسٹم (مضمون واحد کا اُستاد) کہتے ہیں بہت کم سکول ایسے ہیں۔ جہاں اول الذکر طریقہ کو ثانی الذکر طریقہ پر ترجیح دیجاتی ہے۔ اور اس کی تائید میں ایک یہ دلیل بتائی جاتی ہے کہ ایک ہی ٹیچر اگر تمام مضامین پڑھائے تو کامیاب رہ سکتا ہے کیونکہ وہ بیشتر اوقات ایک ہی کلاس میں رہنے کی وجہ سے لڑکوں کی طبایع کو اچھی طرح مطالعہ کر سکتا ہے۔ اُس کا ضبط بھی اچھا رہ سکتا ہے اور اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے ہر مضمون میں کافی دلچسپی کا اظہار کریگا' یہ تین دلائل ہیں جن کے متعلق یہ عرض کر دینا کافی ہے کہ جو ٹیچر بھی دوسرا مضمون پڑھانے آیگا۔ وہ بھی ان تینوں باتوں کا جاننے والا اور سمجھنے والا ہوگا۔ طبایع طلبہ کا مطالعہ کرنا اور ضبط کا قایم رکھنا ہر ٹیچر کا وصف ذاتی ہے اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو ٹیچر کہلانے کا مستحق نہیں۔ اب رہا ذمہ داری کا سوال۔ سو ہر ٹیچر اپنے مضمون کا ذمہ دار اور جوابدہ ہے۔ خواہ وہ کلاس ٹیچر ہو یا سبجکٹ ٹیچر۔ مَیں یہ بتانیکو تیار ہوں کہ ایک گھنٹہ روز پڑھانے والے استاد کے مقابلہ میں پورے وقت پڑھانے والے کا ضبط اچھا ہو سکتا ہے مگر کسی قدر۔

پھر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ضبط کے معمولی سے فرق کیوجہ سے قابلیت اور لیاقت کو ضبط کی قربانگاہ پر کیوں بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔ اب مَیں اسی طریقے کے موٹے موٹے بعض نقص بیان کرتا ہوں۔ فرض کیجئے۔ ایک ٹیچر ساتویں جماعت کو انگریزی حساب۔ تاریخ وجغرافیہ پڑھاتا ہے۔ اُس کے ہفتہ میں کل پیریڈ ۲۵ ہونگے اس حساب سے تقریباً ۵ پیریڈ روزانہ ایک ہی کلاس میں ہو گئے۔ کیونکہ نصف یوم کی تعطیل بھی ہوتی ہے۔ لڑکوں کی کیا اور بڑوں کی کیا۔ طبایع عام طور سے جدت پسند ہوتی ہیں اور پھر بچوں کی۔ وہ تو یہی چاہتے ہیں کہ ہر گھنٹے میں نئی چیز نئی بات اور نیا ماسٹر آئے اور جائے۔ ۵ یا ۴ گھنٹے تک ایک ہی ٹیچر کے ساتھ جھک جھک کرتے رہنا اُن کی دلچسپی میں اضافہ نہیں کرتا۔ اُستاد بھی ایک جگہ قطب صاحب کی لاٹ بنے بنے اکتا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پڑھائی تو ہوتی ہے مگر ہیڈ ماسٹر صاحب کے دکھانے کو۔ لڑکے خاموش بیٹھے رہتے ہیں مگر ماسٹر کے ڈر سے۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ ایک ماسٹر سے کہا جاتا ہے کہ تم فلاں جماعت کو حساب پڑھاؤ۔ غریب ٹیچر کا یہ کہنا کہ اس مضمون سے مجھے دلچسپی نہیں۔ اپنی کسر شان سمجھتا ہے اور چونکہ وہ پڑھانے کا نوکر ہے۔ مجبوراً

پڑھانے پر گلا دھر لیتا ہے اور صرف اتنا ہی پڑھا سکتا ہے جتنا لالہ موہن لال کے حساب میں بذریعہ مثالوں کے واضح کیا گیا ہے۔ اگر کسی اور کتاب کا سوال یا کسی ایسی مشق کا جو ماسٹر صاحب تیار کر کے نہ لائے ہوں۔ سوال دیا جائے تو ماسٹر صاحب غائب۔ بھلا جب خود استاد ایک مضمون سے دلچسپی نہیں لیتا۔ تو لڑکوں میں اُس مضمون کیلئے کیا خاک دلچسپی پیدا کر سکیگا۔

ایک بڑے ماہر فن تعلیم کا قول ہے "خدارا! کبھی ایسے مضمون کو پڑھانے کی کوشش نہ کرو جس میں تمہیں خود دلچسپی نہ ہو۔ صاف انکار کر دو"

بھلا اس طرح مارے باندھے کے پڑھانے سے کہیں کام چل سکتا ہے۔ تمام مضامین پڑھانے سے استاد چوں چوں کا مربہ بن جاتا ہے اور شکسپیر کے لفظوں میں Jak of all trade and master of none کا مصداق ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر ایک ہی مضمون پڑھانے کو دیا جائے تو اُس میں کثرت مطالعہ اور مزاولت سے (Speciality) ماہر خصوصی بن سکتا ہے اور اپنے سکول کو اپنے مطالعہ اور تجربہ سے بہت فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ جس طرح ہر سکول میں سائنس ماسٹر ہوتا ہے۔ اسی طرح جغرافیہ اور ریاضی کا ماسٹر بھی علیحدہ ہونا چاہیئے۔ اس کے واسطے مخصوص کمرے ہوں۔ جہاں جس وقت طلبا جائیں تو اپنے آپ کو اسی مضمون کے ماحول میں پائیں۔ اُسی مضمون کے متعلق تصاویر سے کمرہ سجا ہو اس صورت سے کام بخوبی اور زیادہ کامیابی سے چل سکتا ہے۔

معدودے چند سکولوں کے علاوہ باقی تمام سکول سبجکٹ ٹیچر سسٹم پر ہی کاربند ہیں اور بہت اچھے نتائج نکال رہے ہیں۔ ایک کامیاب ہیڈ ماسٹر کے لئے ضروری ہے کہ کلاس ٹیچر سسٹم کے مالہ وما علیہ پر ٹھنڈے دل سے غور کرے اور جیسا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں اگر اُس کو خوش قسمتی سے کوئی جوہر قابل مل جائے تو اُس سے تمام مضامین پڑھوا سکتا ہے۔ مگر ہمیشہ اور ہر حالت میں اسی قاعدہ پر عمل پیرا ہونا خلاف عقل ہے۔

لطیفہ

ظفر: "کیا اب بھی نعمت اللہ تمہارے زیر علاج ہے؟"
ڈاکٹر: "جی نہیں، میں نے چند دن سے اس کا علاج کرنا ترک دیا ہے۔"
ظفر: "مجھے بڑی خوشی ہوئی اب وہ خطرہ سے باہر ہو گیا ہے۔"
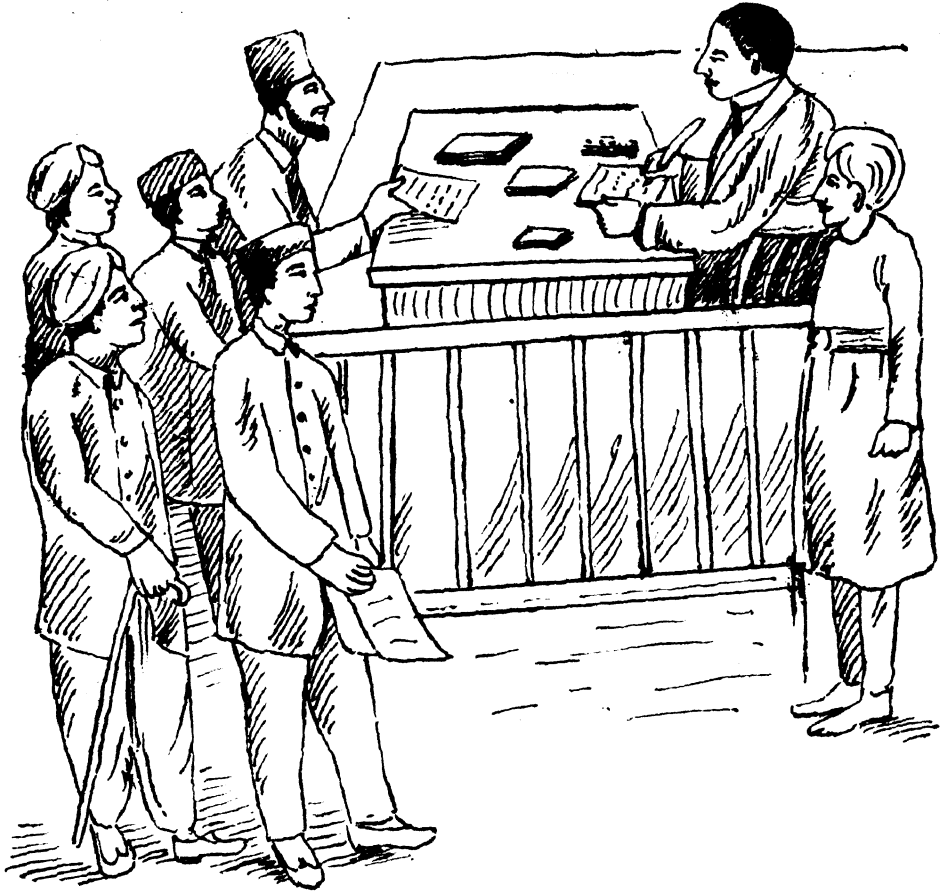
مدرسین (پریزیڈنٹ ڈسٹرکٹ بورڈ سے) "جناب عالی! تنخواہ کیلئے تین تین چار چار ہفتے انتظار کرنا پڑتا ہے
ہم سخت تکلیف میں رہتے ہیں۔"

پریزیڈنٹ "کاغذات مرتب کرنے میں کچھ دیر ہو ہی جاتی ہے۔"

مدرسین "جناب عالی! گورنمنٹ سکولوں میں بھی تو کاغذات مرتب ہوتے ہیں - وہاں پہلی تاریخ کو تنخواہ تقسیم
ہو جاتی ہے ہمیں بعض اوقات دو مہینے ورنہ ایک مہینہ تو ضرور منتظر رہنا پڑتا ہے۔"

پریزیڈنٹ "ہمارے خیال میں پندرہ تاریخ سے پہلے ملنی تو مشکل ہے۔"

مدرسین "تو ڈسٹرکٹ بورڈ کے کلرک پہلی تاریخ کو کس طرح وصول کر لیتے ہیں؟"

دیہاتی رقبہ میں جماعت اوّل کی حالت کو بہتر بنانے پر ایک نظر

(جناب لالہ رام کشن صاحب ڈھنڈہ بی اے (آنرز) بی۔ ٹی)

اس مسئلے پر دو پہلوؤں سے نگاہ ڈالی جا سکتی ہے۔

ا۔ ایسی خصوصیات کا مطالعہ جو بچے کی ذات سے تعلق رکھتی ہیں۔

ب۔ ایسے حالات کی چھان بین جو بچے کی ذات اور تعلیم پر اثر ڈالتی ہے۔

پہلی جماعت کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے بچہ کی ذات کا مطالعہ یا بالفاظِ دیگر اس کی فطرت کا موازنہ ضروری ہے۔ یہ ایک امر واقعی ہے۔ اور اس کی صحت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ کہ دیہاتی بچے شہری بچوں سے کئی امور میں بالکل مختلف واقع ہوئے ہیں۔ شہری بچے عموماً چست و چالاک - - - - - صاف ستھرے۔ ہوشیار۔ باتونی اور مدرسہ میں پابندیٔ اوقات کے عادی ہوتے ہیں اور اس کے برعکس دیہاتی بچے مقابلتاً ڈھیلے ڈھالے۔ میلے کچیلے۔ کند ذہن۔ کم گو اور اوقات مدرسہ سے لاپرواہ ہوتے ہیں۔ شہری بچوں کے والدین اکثر حالات میں اپنے بچوں کے نیک و بد سے باخبر، شستہ اور اس امر کے اہل ہوتے ہیں کہ ان کی آئندہ زندگی کو کس سانچہ میں ڈھالا جائے۔ برخلاف اس کے دیہاتی بچوں کے باپ اپنے بچوں کی آئندہ زندگی سے بے خبر ناخواندہ یا کم تعلیم یافتہ اور دیہاتی مدرس کے صلاح و مشورہ کے پابند ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دو شہری اور دیہاتی بچوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ گویا دیہاتی رقبہ جات میں جماعت اول کی حالت بہتر بنانے میں ہمیں ایسے امور پر بھی کافی توجہ دینا پڑتی ہے۔ جو شہری رقبہ جات میں معمولی اور غیر ضروری خیال کئے جاتے ہیں۔ نیز یہ امر کہ دیہات میں تعلیم کا پرچار شہروں کی نسبت دیر بعد ہوا۔ اور اب بھی شہری آبادی دیہاتی آبادی سے تعلیم میں پیش رو ہے

ظاہر کرتا ہے۔ کہ طریق کار و طرز اصلاح دیہاتی رقبہ جات میں شہروں کی نسبت کس قدر مختلف ہوگا۔

ضمن ب کی زد میں مندرجہ ذیل اسباب خصوصاً اثر انداز ہیں۔ جن کا مطالعہ نہایت ضروری ہے!

(۱) اُستاد

(۲) مدرسہ

(۳) سامانِ تعلیم

(۴) طریقۂ تعلیم

اُستاد کی شخصیّت

یہ ایک ایسا پیچیدہ سوال ہے۔ کہ جس کے حل پر ساری کامیابی اور ناکامی کا انحصار ہے۔ یہاں پر بالتفصیل یہ جتانے کی ضرورت نہیں کہ استاد کن اوصاف کا مالک ہونا چاہیئے۔ یا یہ کہ اس کی ذات کس طرح سے ان بچوں پر اثر ڈالتی ہے۔ جو اس کے زیر تعلیم ہیں۔ چونکہ یہ ایسے امور ہیں۔ جن پر بارہا روشنی ڈالی جا چکی ہے اور ماہرین تعلیم مدرسین یا محکمہ تعلیم سے انس و ہمدردی رکھنے والے اصحاب ایک بڑی حد تک اپنے ذہن میں ایک کامل استاد کا نقشہ کھینچ سکتے ہیں۔ اور وہ اس بات سے بھی باخبر ہیں کہ استاد کے ہاتھ میں بچوں کی زندگی کا بنانا اور بگاڑنا ہر دو ہیں۔ جیسے رنگریز سفید کپڑے پر جو رنگ جمانا چاہے۔ جما سکتا ہے بعینہٖ ایک قابل اُستاد اپنے شاگردوں کو اپنے رنگ میں یا کسی ایسے رنگ میں جسے وہ چاہے رنگ سکتا ہے مجھے ایسے شاگردوں سے واقفیت حاصل ہے۔ جنہوں نے اپنے استادوں سے اُن کی حرکات و سکنات۔ طرز و طریق گفتگو تک کو اپنی ذات کا جزو بنا لیا ہے۔ بعض حالات میں لڑکوں کے دستخطوں سے یہ پہچان ہو سکتی ہے کہ وہ فلاں استاد کے شاگرد ہیں۔ مختصراً جماعت اول کے لئے ایک ایسے استاد کی ضرورت ہے۔ جو باتوں کا دھنی نہ ہو۔ بلکہ عملی نمونہ پیش کرنے والا ہو۔ جسے اپنے کام سے کام ہو۔ بچوں کے ساتھ بچہ ہو کر رہے۔ جو اُن کے ساتھ کھیل سکتا ہو۔ جو بچوں سے مانوس ہو۔ اور انہیں محبت کرے۔ جس میں لوہے کی سی مقناطیسی کشش ہو۔ جس سے بچے خائف نہ ہوں۔ جو سادگی اور صفائی کا نمونہ ہو۔

عام طور پر شکایت ہے کہ اب نارمل اسکولوں سے قابل استاد نہیں نکلتے۔ اور نارمل سکولوں کے

اُستادوں کا خیال ہے۔ کہ نارمل سکولوں میں اچھا مصالحہ نہیں پہنچتا۔ عموماً کمزور اور کم لیاقت امیدوار آتے ہیں۔ یہ باہمی شکوہ شکایت درست بھی ہے اور نہیں بھی۔ یہ معلوم کرنا کہ کس حد تک اس صورتِ حالات کے ذمّہ دار موجودہ تعلیمی کورس یا نارمل سکول ہیں مشکل ہے۔ یہ (Arguing in vicious circle) والا معاملہ ہے نارمل سکول کی پیداوار پر عام سکولوں میں تعلیمی ترقی کا انحصار ہے۔ اور نارمل سکول بہتر پیداوار اس وقت تک نہیں دے سکتے۔ جب تک ان کے پاس بہتر جنس نہ آئے۔ گویا ہر دو لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن اس امر سے انکار مشکل ہے۔ کہ جب تک جماعت کا انچارج قابل استاد نہ ہو۔ اس جماعت کی تعلیمی ترقی حسب خواہش نہیں ہوسکتی۔ موجودہ (Expansion) کے زمانے میں نارمل سکولوں میں داخلے کے معیار کو بلند کرنا شاید ممکن نہ ہو۔ یا کم از کم ناقابلِ عمل ہو۔ لیکن یہ کمی زمانۂ تربیت کو ایک سال کی بجائے دو سال کر دینے سے پوری ہوسکتی ہے۔ جے۔ وی مدرسین کے لئے دو سالہ کورس جیسا کہ ایس۔ وی کیلئے ہو چکا ہے۔ یا ہو رہا ہے۔ کر دیا جائے تو کہیں زیادہ بہتر نتائج کی امید ہے

کوئی وقت تھا جب کہ دیہاتی مدرس کو سوائے درس و تدریس کے کوئی کام نہ تھا۔ اس وقت اس کی توجہ کا مرکز تمام تر یا زیادہ تر اس کی جماعت یا جماعتیں تھیں۔ اور وہ ان کی حالت کو بہتر بنانے میں ہی کوشاں رہتا تھا چونکہ اسی میں اس کی ترقی کا راز پنہاں اور درحقیقت اس کی نجات کا راستہ تھا۔ اُسے اچھی طرح سے معلوم تھا۔ کہ اس کی ترقی کا انحصار اس کے تعلیمی کام پر ہے۔ لیکن برعکس اس کے آجکل مختلف اقسام کے فرائض (خواہ ان فرائض کی ادائیگی کے لئے مدرس کو معاوضہ یا الاؤنس مل جاتا ہے) ان کی توجہ کو منتشر کر رہے ہیں۔ اس کا اثر بحیثیت مجموعی سکول کی تعلیمی حالت پر پڑتا ہے۔ اور جماعت اول جو بیش از بیش توجہ کی محتاج ہے۔ نظر انداز ہو جاتی ہے۔ اس تحریر سے یہ مطلب نہیں کہ مدرسین ڈاکخانہ کا کام۔ دیہاتی بنکوں کا کام یا وثیقہ نویسی کا کام نہ کریں۔ اور نہ یہ مقصد ہے کہ جملہ محکمہ جات کا باہمی تعاون بند ہو جائے۔ اس سے صرف مدعا واقعات کا اظہار ہے جن سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ مدرسین پر دن بدن تعلیمی کام کے علاوہ ایسے فرائض کا بار بڑھتا جا رہا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے۔ جس سے آنکھ بند نہیں ہوسکتی۔ اور جلد یا بدیر ہمیں ان واقعات کی وجہ سے کشمکش سے دوچار ہونا اور مناسب حل سوچنا پڑے گا۔

(۲) مکان یا کمرہ مدرسہ

جہاں استاد کی ذات مدرسہ کے جملہ طلبا کو عموماً اور جماعت اول کے بچوں کو خصوصاً متأثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ وہاں کمرہ جماعت بھی ایک ایسا جزو ہے۔ جو ان بچوں کی تعلیمی ترقی میں امداد دینے والا ہے

انسانی فطرت کا ایک خاصہ ہے۔ کہ جب ہم کسی نئی چیز سے پہلی دفعہ آشنائی حاصل کرتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ تو عمدہ سے عمدہ (Impression) ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کوئی نیا افسر آئے تو ماتحت صرف اس خیال سے کہ نیا افسر اچھے خیال لیکر جائے۔ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ نئی دُلہن بیاہ کرلاتے ہیں۔ تو سارے گھر والے یہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ اچھے خیالات لیکر میکے واپس جائے نیا استاد آتا ہے۔ تو وہ خوب تیار ہو کر سبق پڑھاتا ہے۔ نیا دھوبی اچھے کپڑے دھو کر لاتا ہے۔ گویا انسانی فطرت کا ہی یہ تقاضا ہو کہ پہلے Impression اچھے سے اچھے ہوں۔ اگر یہ عام حالات میں درست ہے تو پھر اس نئے عزیز مہمان کیلئے کیوں نہ مدرسہ یا کمرۂ مدرسہ ایسا ہو۔ کہ جہاں سے وہ پہلے ہی اچھے خیالات لیکر واپس گھر جائے۔ اور پھر روز خوشی خوشی مدرسہ آئے۔ اگر کمرۂ مدرسہ جہاں جماعت اول بیٹھتی ہے سکول کا بہترین کمرہ یا بہترین کمروں میں سے ہو۔ جہاں تعلیمی چارٹ۔ تصاویر۔ نقشہ جات۔ کیلنڈر وغیرہ آویزاں ہوں۔ صاف ستھرا ہو۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ نئے مہمان اس مہمان خانے میں تشریف لاکر محظوظ نہ ہوں۔ اور واپسی پر شام کو گھر جاکر اس کی تعریف نہ کریں۔ یا اگر ایسا ہونا مشکل ہو۔ تو انہیں باہر کھلی اور ہوادار جگہ میں بٹھایا جائے ایک ایسے کمرہ میں جہاں جگہ کی قلت ہو۔ نئے مہمانوں کو بٹھانا ایک طرح سے ان کو کمرۂ تعلیم یا مدرسہ سے بدظن کرتا ہے۔

(۳) سامانِ تعلیم

سامانِ تعلیم کا اثر بھی تعلیم پر واضح اور صاف ہے۔ کوئی طالب علم بغیر اردو پرائمر۔ تختی۔ قلم دوات کے تعلیمی ترقی حاصل نہیں کرسکتا۔ ابتدا میں زمین پر ریت ڈال کر مفرد حروف کی تحریر کی مہارت کرائی جائے۔ یہ کم خرچ اور بالانشیں ہے۔ ایسی مشق سے مفرد حروف اوران کی بناوٹ اور ہاتھ کی حرکات میں ربط ضبط قائم ہو جائیگا یہ آخرش تختی اور کاپی کی تحریریں بڑا کام دے گا۔ شروع میں کاغذ کے پرزہ پر مفرد حروف لکھ کر دینے کی بجائے گتوں پر کٹے ہوئے مفرد حروف یا اُن پر خوشخط لکھے ہوئے دینا زیادہ مفید ہے۔

(۴) طریقۂ تعلیم

چونکہ نارمل سکول میں مختلف طریقۂ تعلیم پر عملی طور سے بحث کیجاتی ہے۔ اور مدرسین بہت کچھ وہاں سیکھ کر آتے ہیں۔ ان کا اعادہ بے مزہ ہے۔

چند عملی دقتیں اور ان کا مناسب حل

۱۔ سب سے اوّل دقت طلبہ کے داخلہ اور ان کی فراہمی کی ہے۔ آج کل فراہمی طلبا کا مسئلہ ہر ایک مدیکلر استاد، افسران معائنہ اور ماہران تعلیم کی توجہ اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ جب تک طلبا مدرسوں میں آتے نہیں۔ ان کی بہتر تعلیم کا انتظام کیونکر ہو۔ تعداد ہی ترقی کا بہترین انڈیکس Index گنا جاتا ہے۔ مختلف مقامات اور علاقہ جات میں مختلف طریقوں سے کام کرنے کی ضرورت ہے لیکن پروپیگنڈا اور بچوں کے والدین اور پبلک سے باہمی تعاون دو ایسے ستون ہیں۔ جن پر ترقیٔ تعداد کی سقف مضبوطی سے کھڑی رہ سکتی ہے۔ ماہ اپریل میں شہروں کے ہائی سکولوں میں جو کشمکش داخلے کے لئے کی جاتی ہے۔ اس سے مدرسہ اور دُکان میں مشابہت کا گمان پڑ جاتا ہے۔ جہاں مہذب اور ترقی یافتہ ممالک میں اشتہار بازی سے کام لیا جاتا ہے۔ دُکان دار گاہک کی کشش کے لئے windowshows کا انتظام کرتا ہے۔ رنگ برنگ کی بجلی کے لیمپوں سے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتا ہے۔ وہاں مدرسہ میں جہاں ابتدائی تعلیم ایسی قیمتی شے کی فروخت کا انتظام ہے کیونکر نہ وقتاً فوقتاً ایسے (Exibitions and shows) کا انتظام کیا جائے۔ کہ جس سے بچے مانوس ہوں۔ اور والدین ان کو بھیجنے پر راغب ہوں۔ Exibitions and shows سے میرا مطلب یوم الوالدین۔ جلسۂ تقسیم انعامات اور Scouting shows کا ہے۔

۲۔ بچوں کا سکول میں رکھنا

جس طرح دولت کمانا اتنا مشکل نہیں۔ جتنا اس کا سنبھال کر رکھنا۔ اسی طرح طلبا کی فراہمی اتنی مشکل نہیں۔ جتنا کہ ان کو بعد فراہمی مدرسہ میں حاضر رکھنا۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ افسران معائنہ کی تشریف آوری کے موقعہ پر ترغیب و تحبت سے طلبا کو سکول میں داخل تو کرا آتے ہیں۔ لیکن بعد میں طلبا سکول چھوڑ جاتے ہیں۔ اس واسطے نہایت احتیاط کی ضرورت ہے۔ ذرا سی زجر و توبیخ سے یا اُستاد کی لاپرواہی سے طلبا جماعت اول حاضر یا سبق چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے بچوں کو ہوشیاری اور طریقے سے ہی مدرسہ میں رکھا جا سکتا ہے۔

یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ہر ایک نیا پرندہ جو قفسِ مدرسہ میں داخل ہوتا ہے اسے مانوس کیا جائے۔ اور پھر باقاعدہ سبق پڑھایا جائے۔ کسی ایک دن بھی اسے سبق نہ پڑھانا اُسے مدرسہ سے بدظن کرنا ہے۔ اگر وہ ایک آدھ دن غیر حاضر ہوتا ہے تو اس کے سرپرست یا والدین سے پرسش ضروری ہے۔ بدنی سزا کا دینا ہر ایک نئے پرندے کو ہمیشہ کے لئے سکول سے پرواز کرانا ہے۔

وقتاً فوقتاً شیرینی کی تقسیم سے بچوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

۳۔ طلباء کا گروہوں میں تقسیم کرنا۔

یہ دِقّت درحقیقت حل طلب ہے۔ چونکہ جماعت اول کے طلباء سال کے ہر حصہ میں داخل مدرسہ ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے داخلہ پر کوئی قید نہیں۔ اور اگر نئے طلبا کو سبق نہ دیا جائے تو بھی مشکل ہے۔ بدیں وجہ مدرس انچارج کے پاس متعدد اور مختلف سیکشن بنتے جاتے ہیں۔ اگر وہ ایک ایک طالب علم کو علیحدہ علیحدہ سبق دیتا ہے۔ تو یہ اس کے قویٰ ذہنی کا فضول خرچ ہے۔ بہتر بات تو یہ ہے کہ جتنی جلدی ان طلبا کو ہم سبق گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اُتنا ہی فائدہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انفرادی سبق جماعتی سبق سے زیادہ موثر ہوتا ہے لیکن ایک استاد سے چالیس پچاس طلبا کے انفرادی سبق کی امید رکھنا اُسے مار ڈالنا ہے۔ متعدد گروہوں کی تقسیم کا کام دو طریقوں سے ہو سکتا ہے۔

ا۔ بڑی جماعتوں کی طرح داخلہ کا موسم مقرر کیا جائے۔ خواہ سال میں پہلے تین یا چار دفعہ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن آہستہ آہستہ داخلہ سال میں صرف دو دفعہ کر دیا جائے۔

ب۔ بصورتِ دیگر جو طلبا دیر سے داخل مدرسہ ہوں۔ انہیں زیادہ سبق دے کر آگے والوں کے ساتھ ملایا جائے لیکن اس میں پھر دو دقتیں ہیں۔ ۱۔ جو طلبا بعد میں داخل ہو کر پہلے داخل شدہ طلبا کے ساتھ مل جاتے ہیں وہ اُن کی ندامت کا باعث ہوتے ہیں۔ اور بعض وقت جماعتی سبق کی خاطر [illegible] (۲ [illegible] دینے کی وجہ سے ایسی کمزوری رہ جاتی ہے۔ جو لڑکے کو کبھی تاب نہیں آنے دیتی۔

۴۔ حاضری کی باقاعدگی

یہ ایک سچائی ہے کہ عموماً دیہاتی مدارس میں جماعت اول کی حاضری سب سے خراب ہوتی ہے۔ جب تک حاضری باقاعدہ نہ ہو تعلیمی حالت کا بہتر ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن سا ہے۔ مستقل ترقی اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ طلبا حاضر باش ہوں۔ ان کا اُستاد یعنی جماعت اول کا انچارج بچوں کے والدین اور سرپرستوں سے ذاتی طور پر واقفیت حاصل کرے۔ اور غیر حاضر طلباء کے بارے میں ان سے موقعہ پر مل کر بات چیت کرے۔ اور وقتاً فوقتاً ہیڈ ماسٹر کی توجہ میں یہ بات لاتا رہے۔ کہ فلاں لڑکا غیر حاضر رہے۔ اور وہ باتوں ہی باتوں میں ان کے والدین سے باز پرس کرتا رہے۔ اور اُن سے میل ملاقات رکھے۔

مدرسں انچارج بدنی سزا سے کلیتہً اجتناب کرے - پھر کوئی وجہ نہیں کہ حاضری بہتر نہ ہو - لازمی تعلیم کی کمیٹیاں بھی اس شکل کی حل میں امداد دے سکتی ہیں -

۵ - اوقات مدرسہ

دیہات کے مدارس میں جماعت اوّل کی حالت بہتر بنانے میں ایک رکاوٹ اوقات مدرسہ بھی ہے مدرسہ کے کھلنے اور بند ہونے کا وقت جو مڈل اور ہائی سکولوں میں موزوں ہے - وہ پرائمری اور لوئر مڈل مدارس میں جو عام طور پر چھوٹے چھوٹے گاؤں میں واقع ہیں - مفید نہیں - دیکھنے میں آتا ہے کہ یہ لڑکے ایک، ایک، دو دو کرکے آتے ہیں - اگر صبح صبح کچھ بچے آ بھی جاتے ہیں - تو موسم گرما میں خاص کر وہ نہایت ہی غلیظ اور گندہ حالت میں ہوتے ہیں - منہ ہاتھ تک دھو کر نہیں آتے - ان بچوں کو رخصت تو باقی جماعتوں سے پیشتر مل جاتی ہے لیکن ان کی حاضری کا وقت صبح ہی ہے - نئے اوقات مدرسہ پرائمری اور لوئر مڈل مدارس میں بہترین نتائج دکھا سکتے ہیں - بعض رقبہ جات میں مدرسہ دو دفعہ کھلتا ہے یعنی صبح آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک - بعد دوپہر دو بجے سے پانچ بجے تک - یہ دیہات میں موزون اوقات مدرسہ ہیں - آٹھ بجے تک چھوٹے چھوٹے بچے بخوبی مدرسہ میں حاضر ہو سکتے ہیں - اور گیارہ بجے تک کوئی خاص گرمی نہیں ہوتی - یہ اوقات مدرسہ سات بجے سے بارہ بجے والے وقت سے بہتر معلوم ہوتا ہے -

ایک نمونہ کی جماعت

جماعت اوّل جس میں پچیس یا زیادہ سے زیادہ تیس لڑکے ہوں - ایک نمونہ کی جماعت کہلا سکتی ہے تعلیمی حالت کو بہتر بنانے کا ایک نقشہ جس سے ترقی جماعت اول کی جانچ پڑتال ہوتی رہتی ہے جو ضلع انبالہ کے سکولوں میں رائج ہے نہایت آزمودہ چیز ہے - اس میں مندرجہ ذیل خانے ہوتے ہیں -

[illegible]	[illegible]	[illegible]	اپریل				مئی				جون				جولائی
			[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	علیٰ ہذا القیاس

جماعت اوّل کے کام کی نگرانی

ا۔ ہیڈ ماسٹر۔ مدرس انچارج کی نکتہ چینی ہی نہ کرے۔ بلکہ اصلاح دے۔ اور جن لائنوں پر اُستاد نے شروع سال سے کام چلایا ہے۔ اُنہیں لائنوں پر ہیڈ ماسٹر وقتاً فوقتاً اصلاح دیتا رہے۔ انچارج مدرس کو ہر روز نئے طریقہ پر ڈالنا جماعت کی ترقی کو روکنا ہے۔ محض "ایسا ہونا چاہئیے" "ویسا ہونا چاہئیے" ہی کام کو بہتر نہیں بنا سکتے۔

ہیڈ ماسٹر جماعت اوّل اور انچارج مدرّس کو اپنی بہترین دولت سمجھے۔ اس کے دل میں انچارج جماعت اول کی عزت کسی دوسرے استاد سے کم نہ ہو۔ وہ جماعت اول کے مدرس کو امتیازی مدرس تصوّر کرے۔ اور جماعت اوّل کو شانِ مدرسہ۔ وقتاً فوقتاً جماعت اوّل کا امتحان لیتا رہے۔ گاہے ماہے چھوٹے چھوٹے انعامات سے ان کی حوصلہ افزائی کرتا رہے۔ نقشہ انفرادی ترقی کی باقاعدہ پڑتال کرتا رہے۔

ب۔ افسرانِ معائنہ کے ذمہ بھی اس جماعت کے بہتر بنانے کے خاص فرائض ہیں۔ اگرچہ وہ زیادہ معائنے نہیں کرسکتے۔ لیکن وہ اس اصول پر کہ جماعت اوّل ہی مدرسہ کی بنیادی جماعت ہے، عمل پیرا ہوتے ہوئے جماعت اوّل کا امتحان سب سے پہلے کریں۔ نقشہ انفرادی ترقی کی جانچ پڑتال کریں۔ بشرطِ ضرورت عملی طور پر نمونہ کا سبق دیں۔

رائے بُک میں ایک خاص اور مکمل نوٹ جماعت اوّل پر دیا جائے

اساتذہ اور قومی ترقی

(جناب چودھری محمد عبداللہ بی اے آنرز سنٹرل ماڈل سکول لاہور)

جوں جوں زمانہ سائنس، فلسفہ، علم الاخلاق اور نفسیات میں ترقی کرتا جاتا ہے۔ علم و عمل کے ہر شعبے میں نئے نئے نظریات قایم کئے جا رہے ہیں۔ محققین کی آئے دن کی تحقیقات نے لوگوں کے خیالات میں اہم تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ ہر بات کی تہ تک پہنچنے کی سعی کی جا رہی ہے۔ ماہرین فن تعلیم بھی اپنے حلقۂ عمل میں پورے زور اور استقلال کے ساتھ نئے نئے انکشافات کرنے میں مشغول ہیں۔ علم النفس (سائی کالوجی) کی جدید تحقیقات نے مدرس کے نقطۂ نگاہ میں عظیم الشان تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ اور مدرس کا دائرہ عمل اب بہت وسیع ہو گیا ہے فی زمانا اس کی کوشش صرف اپنے طلبار کی ذہنی ترقی تک ہی محدود نہیں رہی۔ بلکہ ان کی اخلاقی اور جسمانی تربیت اُس کے اہم ترین فرائض میں داخل کی گئی ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ موجودہ زمانہ میں اُستاد کا کام حیوانِ ناطق سے با اخلاق انسان بنانا قرار دیا گیا ہے۔

اس مقصد کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات کا اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ کسی قوم کی مجموعی اور انفرادی ترقی میں استاد کا کس قدر دخل ہے۔ مشاہیر عالم کے واقعات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خداداد قابلیتوں کے علاوہ اُنکے اوج ترقی پر پہنچنے کے ذرائع میں قابل مائیں اور کامل اُستاد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کامل اُستاد کی زیر تربیت ایک معصوم بچے کی مثال ایسی ہی ہے۔ جیسے ایک کمہار کے ہاتھ میں خمیر کی ہوئی مٹی۔ وہ جس طرح کی شکل چاہتا ہے۔ اس سے تیار کر لیتا ہے۔ بعینہٖ اپنے فن میں ماہر اُستاد بھی اپنے طلبار کو جس اخلاقی سانچے میں ڈھالنا چاہے۔ ڈھال سکتا ہے۔

بچے کی فطرت میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ وہ ہر لحظہ اپنے گرد و پیش کے واقعات اور مشاہدات سے اثر پذیر ہوتا رہتا ہے۔ صانع حقیقی نے قوائے ذہنی میں یہ خاصیت ودیعت کر دی ہے۔ کہ ایام طفولیت میں قبول کردہ تاثرات کو وہ تا دمِ حیات ضائع نہ ہونے دیں۔ چنانچہ ایک معمولی سے تجربہ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو سکتی ہے۔ کہ بچپن کے تاثرات کس قدر مستقل صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور انسان کا ہر فعل کسی نہ کسی حد تک اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جس شخص نے بچپن میں ڈراؤنی کہانیاں یا قبرستان اور مرگھٹوں کے متعلق بے بنیاد روایات یا جن بھوت کے افسانے سُنے ہوں۔ یا جس شخص کی بچپن میں تربیت کرنے والے کسی قسم کی توہم پرستی کا شکار رہوں۔ تو خواہ وہ شخص کتنا ہی تعلیم یافتہ

کیوں نہ ہو جائے۔ اور کتنا ہی ان باتوں کو بیہودہ اور بعید از عقل خیال کیوں نہ کرے۔ پھر بھی وہ کلی طور پر ان خیالات کے اثرات سے آزادی حاصل نہیں کر سکتا۔ اور ایسے حالات پیش آتے رہتے ہیں۔ جن میں اس کی حرکات و سکنات سے اُن تاثرات کی موجودگی کا علم بخوبی ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اکیلا اندھیرے میں یا دوپہر کے وقت کہیں دور دور بڑا بیں گزرے۔ تو ضرور گھبراہٹ اور بے چینی محسوس کرتا ہے۔ اس ذہنی کیفیت کا باعث وہی تاثرات ہوتے ہیں۔ جو اس نے بچپن کی حالت میں قبول کئے تھے۔

یہی حال اچھے تاثرات کا ہے۔ وہ بھی انسان کا مرتے دم تک ساتھ دیتے ہیں۔ پس اگر بچے کی تربیت ایسے ماحول میں کی جائے جس سے کہ وہ عمدہ اثرات کو قبول کر سکے۔ تو یہ امر نہایت ہی خوشگوار نتائج کا باعث ہو گا۔ بڑے بڑے جرنیلوں اور مدبروں کے سوانح حیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنے تربیت کنندگاں خاص طور پر اپنے اساتذہ کے نمونے اور تعلیم سے فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ جیمز گارفیلڈ جو ادنے حالت سے ترقی کر کے ۱۸۸۰ء میں ممالک متحدہ کا پریزیڈنٹ بنا۔ ایک مرتبہ اپنے اُستاد کے صرف اس چھوٹے سے لیکن معنی خیز فقرے سے کہ "اگر تم اچھی طرح دل لگا کر پڑھو۔ تو ہو سکتا ہے۔ کہ تم ایک روز جرنیل بن جاؤ"۔ اتنا متاثر ہوا۔ کہ اُس نے اپنے دل میں عہد کر لیا کہ وہ ضرور شوق سے تعلیم حاصل کر کے بڑا آدمی بنیگا۔ اور آخر وہ اپنے ارادے میں باوجود بے شمار مصائب و مشکلات کے کامیاب ہوا۔

طلباء کو اپنے اساتذہ پر ایک خاص اعتماد ہوتا ہے۔ اس اعتماد سے استاد بے انتہا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اور اس حقیقت سے کام لے کر وہ اپنے طلبا کی رہنمائی نہایت آسانی سے کر سکتا ہے۔ دیکھا گیا ہے۔ کہ چھوٹے بچے اپنے استاد کو سب سے زیادہ لائق اور قابل ترین ہستی تصور کرتے ہیں۔ اس کا ہر لفظ ان کے لئے ایک ثابت شدہ حقیقت ہوتا ہے۔ جسے وہ بے چون و چرا مانتے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کے اعتماد کا یہ حال ہے کہ وہ ہرگز یہ گوارا نہیں کرتے۔ کہ ان کا کوئی بڑے سے بڑا عزیز بھی ان کے استاد کے خلاف کوئی بات بنائے۔ یا اُن کی تصحیح کرے۔ اگر آپ پانچ چھ سال کے بچے کو کہیں کہ بھئی میاں یہ لفظ جو تم پڑھ رہے ہو غلط ہے یوں نہیں یوں ہے! تو وہ جھٹ کہہ دے گا۔ کہ نہیں جی ماسٹر صاحب نے اسی طرح بتلایا تھا۔ الغرض یہ ایک ایسی بات ہے۔ جو استاد کے سوا کسی دوسرے کو میسر نہیں۔ اس سے فائدہ اٹھا کر اپنے طلبا کی آئندہ زندگی کو وہ جس طرح چاہے۔ قوم یا ملک کی خدمت کا بہترین ذریعہ بنانے میں کامیاب ہو سکتا ہے

چنانچہ انگریزی میں ایک مثل ہے جسکا مفہوم یہ ہے کہ "آج کا بچہ کل کا باپ ہے"۔ یعنی بڑا ہو کر آدمی جن عادات اور اخلاق کا اظہار کرتا ہے۔ ان کی بنیاد اس نے بچپن ہی میں ڈالی ہوتی ہے۔ اور وہی ابتدائی تاثرات اس کی کامیابی یا ناکامی کا باعث ہوتے ہیں۔ اس نظریے کو پیش نظر رکھ کر جو کہ فی زمانہ ایک مسلمہ حقیقت کا مرتبہ رکھتا ہے۔ اس امر کے

تسلیم کر لینے سے کسی عقلمند انسان کو انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ اقوام کی ترقی میں اساتذہ کا بہت بڑا دخل ہے۔ قوم افراد کے مجموعے کا نام ہے۔ اور اساتذہ کا کام انفرادی زندگی کی اصلاح اور تکمیل ہے۔ لائق اور ماہر فن اُستاد وعظ و نصیحت اور نیک نمونہ سے اپنے طلباء کے خیالات میں حیرت انگیز تبدیلیاں پیدا کر دیتے ہیں۔ اور توہم پرستی اور استبداد و جہالت کی زنجیروں کو توڑتے ہوئے انہیں پستی اور ذلت کے گڑھے سے نکال کر ترقی اور کامیابی کی منزل پر پہنچا دیتے ہیں۔

محنت۔ دیانت۔ فرمانبرداری۔ پابندی احکام۔ شجاعت۔ غیرت۔ کفایت شعاری۔ حلم۔ تعاون۔ صفائی رحم۔ شفقت۔ احسان۔ مروت اور شکرگزاری وغیرہ عمدہ خصائل کی بنیاد اس زمانے میں رکھی جاتی ہے جبکہ طلباء اپنے اساتذہ کی صحبت میں تعلیم حاصل کرنے میں مشغول ہوتے ہیں۔ اس طرح سے بری عادات سے نفرت کا مادہ بھی اس عمر میں بڑھتا اور ترقی کرتا ہے۔ اور اگر بچے کی تربیت صحیح طور پر ہو رہی ہو۔ تو خود بخود اسکی طبیعت غفلت۔ تساہل۔ بدعملی۔ حسد۔ کینہ۔ خود غرضی اور بے مروتی وغیرہ بد اخلاقیوں سے اجتناب کرنے لگ جاتی ہے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ یہ تمام باتیں جن پر آئندہ زندگی کی کامیابی یا ناکامی کا دارومدار ہے اس طریق سے اپنا اثر کرتی ہیں کہ بالکل محسوس نہیں ہوتا۔ اس وقت کی سیکھی ہوئی باتیں خواہ وہ اچھی ہوں یا بری۔ تمام عمر انسان کا ساتھ دیتی ہیں۔ اور راسخ ہو کر فطرت ثانیہ بن جاتی ہیں۔ جوان ہو کر کسی شخص کے کیریکٹر کی بنیاد اُنہی باتوں پر ہوگی۔ جو اُس نے ایام تعلیم میں اخذ کی تھیں۔ جس طرح کہ ایک ننھے سے پودے کی ٹہنی کو جس طرف جھکا دیں۔ بڑا ہو کر درخت بھی اسی طرف کو جھکا رہیگا۔ یہی حال انسان کا ہے۔ بچپن میں جس طرف اس کی طبیعت کا رجحان ہو گیا۔ جوان ہو کر اسی قسم کا وہ نمونہ پیش کرے گا۔

پس کسی قوم کے افراد کی زندگیوں کو سنوارنے میں استاد کی ہستی کو کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور قومی ترقی چونکہ دراصل انفرادی آمدنی کے مجموعے کا نام ہے اس لئے یہ کہنا بے جا نہیں کہ کسی قوم کی ترقی کا باعث وہ قابل فخر اساتذہ ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں اس قوم کے نونہالوں نے تربیت پائی ہو۔

اگر یورپ کی تاریخ کا سرسری نگاہ سے مطالعہ کیا جائے۔ تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔ کہ ان ممالک کی اقتصادی ترقی۔ عام بیداری اور اس کے ساتھ احیا و ترویج علوم و فنون میں حکما اور محققین کے علاوہ ماہرین فن تعلیم نے نمایاں اور قابل قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ انگلستان اور وسطی یورپ کی ترقی سے پہلے وہاں کے طریقہ تعلیم میں کمینیس۔ لاک۔ روسو۔ ہربرٹ۔ پسٹالوزی ایسے ماہرین فن تعلیم نے ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا۔ جس کی بدولت درسگاہیں صرف درسگاہیں ہی نہیں۔ بلکہ صحیح معنوں میں تربیت گاہیں بن گئیں۔ اور تمام یورپ میں ایک عام بیداری کی لہر پیدا ہو گئی۔

پس ہر وہ قوم جو چاہتی ہے کہ پستی اور ذلت کے گڑھے سے نکل کر معزز اقوام میں شمار ہو۔ اور جس کی کوشش ہے کہ جہالت کی تاریکیوں سے نکل کر علم کی روشنی میں ترقی کی راہ پر گامزن ہو۔ اور جس کی خواہش ہے کہ اس کے افراد دنیا میں وقار۔ خودداری اور عزت سے زندگی بسر کریں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس ثابت شدہ نظریے سے فائدہ اٹھائے۔ اور آئندہ نسل کی بہتری کا جو سب سے اہم لیکن سب سے آسان ذریعہ ہے۔ اس سے کام لے۔ اُسے چاہئے کہ اساتذہ کے راستے میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو دور کرے۔ اور ان کی حالت کو بہتر بنا کر ان سے تعاون کرے۔ یہی ایک طریق ہے۔ جس سے کہ قوم کی حالت قلیل ترین عرصے میں سدھر سکتی ہے

معجزہ

عجز اس لفظ کا مادہ ہے۔ اور اس کا اطلاق ایسے خلاف عادات واقعات پر ہوتا ہے۔ جو انسان کو حیران کر دیں جوں جوں لوگ تعلیم یافتہ ہوتے جا رہے ہیں۔ معجزات کی حقیقت کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اکثر معجزات کے وجود ہی سے انکار ہو رہا ہے۔ اور اکثر ایسے ہیں۔ جن کیلئے موجودہ تعلیم یافتہ لوگ طرح طرح کی حجتیں کر رہے ہیں۔ کسی میں راوی کے بیان پر شک کرتے ہیں۔ کسی میں لوگوں کی لاعلمی اور ناواقفیت کو آگے لایا جاتا ہے۔ راوی کے بیان کو جاننے سے پہلے اُس کے ثقہ ہونے کا یقین حاصل کیا جاتا ہے۔ پھر اُس کے بیان کردہ واقعات کو درایت کی کسوٹی پر کسا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہر ایک معجزہ کی حقیقت بیان کی جاتی ہے۔ کہ کیوں لوگ اسے ایک معجزہ خیال کرتے ہیں تاہم ابھی تک ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جو معجزات کے اچھی طرح سے قائل ہیں۔ یہ معجزات نہ صرف ذی روح چیزوں سے وابستہ ہیں۔ بلکہ اکثر میں تو اشجار اور دیگر جمادات کو بھی ذی روح ہستیوں کی طرح صاحب ارادہ ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ معجزات کسی خاص گروہ اور فرقے کی ملکیت اور جدت نہیں ہیں۔ قدیم سے قدیم مذاہب میں بھی اس کے نشانات بکثرت نظر آتی ہے۔ چونکہ ابتدا میں لوگوں میں تحقیق کے شوق عنقا تھے۔ بلکہ اکثر اوقات ان معجزات کی چھان بین کفر قرار دی جاتی تھی۔ اسلئے سادہ لوح لوگ اسی بات کے قائل ہو جاتے تھے۔ جو خلاف قدرت یا عادت اُن کو ایسا کرنے پر مجبور کر دے۔ آج بھی گمنام اور پس اُفتادہ علاقوں میں ایسے بہت سے لوگ پائے جاتے ہیں۔ جو عام لوگوں کو اپنے معجزات سے قائل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب کبھی یہ لوگ خواندہ اور واقف افراد سے دوچار ہوتے ہیں۔ ساری معجزنمائی بھول جاتے ہیں۔ بعض لوگ اپنے حلقہ میں اسلئے معجز ملنے جا رہے ہیں۔ کہ وہ جس چیز کو چھو دیتے ہیں۔ وہی میٹھی ہو جاتی ہے۔ حالانکہ ہر خواندہ اور ہر واقف آدمی اسی کی طرح چیزوں کو میٹھا کر سکتا ہے۔ لوگ یہ سوچنے کی کوشش نہیں کرتے کہ چیزیں میٹھی کس طرح ہو سکتی ہیں۔ بلکہ فوراً ہی اُن کے دماغ پر چیزوں سے

میٹھا ہو جانے کا حیران کن عمل یہ اثر پیدا کر دیتا ہے۔ کہ ہو نہ ہو۔ یہ کوئی خدا کا خاص فرد ہے۔ جس کو اس نے اپنی طاقت میں سے کچھ حصّہ خاص طور پر عطا کیا ہے۔

بعض مذہبی معجزات ایسے ہیں۔ کہ دنیا اُن کو دانستہ مانتی چلی جا رہی ہے۔ کیونکہ اُن کا وجود کسی خاص فرقے کی زندگی اور موت سے تعلق رکھتا ہے اور اگر اُن معجزات کی صداقت سے صریحًا انکار کر دیا جائے۔ تو اس فرقے کی مذہبی حیثیت جلد ہی گر جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ وہاں اُن لوگوں کو اشاعت و تبلیغ مذہب کیلئے اور سابق پیروان مذہب کو راسخ الاعتقاد بنانے اور رکھنے کیلئے ایسا کرنا ضروری نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ باوجود علم سائینس کے دن بدن بڑھتے جانیکے چند مسیحائی معجزات آجتک نہ صرف مشرق بلکہ مغرب میں بھی بدستور قائم ہیں۔ جہاں کہ علم سائینس اپنے پورے عروج پر ہے۔

اب ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ ان معجزات کا اتنا بڑا اثر کیوں ہے؟ وجہ یہ ہے کہ یہ معجزات شروع دنیا سے آدمی کے ساتھ چلے آتے ہیں۔ اور اب ہولے ہولے اپنی قدامت کے لحاظ سے سرشت انسانی میں ایک طرح سے گھر کر چکے ہیں۔ اگر ہم ان کو مٹانا اور ان کا اثر زائل کرنا چاہیں۔ تو جلد کامیابی ناممکن ہے۔ کیونکہ کروڑوں سال کے پروپیگنڈا کا اثر آن واحد میں دُور کرنا کوئی آسان امر نہیں ہے۔ اور پھر اُس حالت میں جب کہ مذاہب اپنی زندگی کے لئے ان کے احیا کی پرزور کوشش کرتے رہیں۔ اور یہ باتیں لوگوں کے دلوں پر اُس وقت سے جمی ہوئی ہیں۔ جبکہ اُن کے دل ہر قسم کی واقفیت سے پاک تھے۔ شروع کے تصورات اور نقوش کو مٹانا اور دُور کرنا نہایت ہی مشکل ہوا کرتا ہے۔

ضعیف الاعتقاد لوگ ہر زمانے ہی میں ہوتے ہیں۔ ان کی کمزور طبیعت میں عجز کا مادہ زیادہ ہوتا ہے معجزات کے زیادہ اور پہلے قائل بھی لوگ ہوا کرتے ہیں۔ اس کے بعد معجزہ یا واقعہ عام ہو کر لوگوں کی دلچسپی حاصل کر لیتا ہے عام لوگوں میں اگرچہ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہوتی۔ جو ہر ایک بات کی چھان بین کے عادی ہوتے ہیں۔ لیکن وہم اور نقل کی عادت اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کی صحبت اور رسوخ اُن پر اپنا اثر کرتا ہوا۔ اپنا ہم خیال بنا لیتا ہے معجزات کو جنم دینے والے عام طور پر ایسے لوگ ہوتے ہیں۔ جو معجزے کے ہیرو سے کسی نہ کسی شکل میں کم و بیش وابستہ ہوتے ہیں۔ یا توہم مذہب ہونے کے لحاظ سے وہ تقدس کے جذبہ کے زیر اثر معجزہ کو جنم دیتا ہے۔ اور یا پھر رشتے کی نزدیکی کے باعث کسی خاص فرد کا عام لوگوں سے الگ قرار دینے کی کوشش کرتا ہوا اخلاق عادت یا دیگر خوارقات اس سے منسوب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تا کہ لوگ اُسے ایک غیر معمولی انسان خیال کرنا شروع کر دیں۔

جب کبھی معجزات نے جنم لیا ہے۔ مخالف بھی اپنی آواز بلند کرتے رہے ہیں۔ لیکن معجزات کی اشاعت

کرنے والوں کو بہت زیادہ مخالفت پیش نہیں آئی۔کیونکہ ضعیف الاعتقاد لوگوں کی تعداد زیادہ ہونے کے باعث اُن کو اپنے بہت سے ہم خیال پیدا کرنے میں ہمیشہ کامیابی حاصل ہوتی رہی ہے۔آج جبکہ تمدن کافی ترقی کر چکا ہے۔متمدن لوگوں میں ایسے لوگ مل سکتے ہیں۔جو کسی بھی معجزہ کے موید بنائے جا سکتے ہیں۔ ہر ملک عام طور پر اور ہندوستان خاص طور پر اپنے بزرگوں کی عزت کرنا فرض جانتا ہے۔اُن کے احکام وارشادات کی تعمیل ہی میں اپنی سعادت خیال کرتا ہے۔چونکہ ہمارے بزرگ ان معجزات کے جنم داتا اور موید تھے۔لہٰذا یہ معجزات ہم کو اُن سے وراثتاً مل رہے ہیں۔ہم اور ہم میں سے بعض ان معجزات کی حقیقت سے واقف ہو کر بھی یہی مناسب خیال کرتے ہیں۔کہ بزرگوں کو ناراض نہ کریں۔

جُوں جوں لوگوں کے علم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔معجزات کی قوت کم ہوتی جاتی ہے۔آجتک بہت سے امراض کے اسباب دریافت ہو چکے ہیں۔اُن کے متعلق جس قدر معجزات لوگوں میں مشہور تھے۔بہت سے اُن میں سے ہمیشہ کی موت مر چکے ہیں۔سائنس اور معجزات میں سخت بیر ہے۔جہاں سائنس سے لوگ واقف ہوئے۔معجزات کی حقیقت پہنچاننے لگے۔بس معجزات کا خاتمہ ہوا۔بعض لوگ واسدیو کا پیالہ عورتوں میں لئے پھرتے ہیں۔اور اُن کے سامنے اُس میں پانی بھرتے ہیں۔کتھا یہ سُناتے ہیں۔کہ دیکھو۔جونہی پانی شری کرشن مہاراج کے چرن چھوتا ہے۔فوراً نیچا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔نادان عورتیں سائینس کے اصول کو کیا جانیں۔وہ خیال کرتی ہیں کہ یہ شخص متھرا نگری کا رہنے والا ہے۔اسی لئے شری کرشن مہاراج نے اپنی شکتی میں سے اُس کو کچھ حصہ دیا ہے۔ورنہ پانی کس طرح نیچے بہ سکتا ہے۔جب کہ پیالہ ابھی آدھا ہی بھرا ہوتا ہے۔ہم یہ تو مانتے ہیں۔کہ کرشن بھگتی سکھانے کا یہ اچھا اور آسان ذریعہ ہے۔لیکن اس میں مداری یا متھرا باشی کی کیا کاریگری ہوئی۔بات یہ ہے کہ پُرانے لوگوں نے اول تو تاریخیں لکھی بہت کم ہیں۔اور اگر لکھی ہیں تو اس طرح کہ تواریخ میں مضمون بندی شامل کر دی ہے۔پھر ان تواریخ کی تقدیس نے ان کے حرف حرف کیلئے لوگوں کے دلوں میں ایک خاص جگہ پیدا کر لی۔عام ذہن باریکیوں اور مضمون بندی کی صنائع وبدائع استعارات وتشبیہات کو سمجھنے سے اُن کی اصل مراد سے ناواقف رہے۔اور الفاظ پر یقین کرنے کی کوشش کرنے لگے نتیجہ یہ ہوا۔کہ جہاں کہیں کتاب میں ذکر تھا۔کہ فلاں نے دُعا کی۔کہ چاند کچھ دیر نظر نہ آئے۔وہاں یہ سمجھ لیا گیا۔کہ فلاں پیغمبر نے چاند کے ٹکڑے کر دیئے۔اور جہاں ذکر تھا۔کہ فلاں نے سمندر پر پُل باندنے میں کمال کر دکھایا وہاں یہ کہا جانے لگا۔کہ اجی۔مہاراج نے جس پتھر کو ہاتھ لگایا۔وہی پانی پر تیرنے لگا۔ہم تقدیس اور خوش اعتقادی میں تو اس سے بھی آگے جانے کو تیار ہیں۔لیکن سائنس کچھ کرنے نہیں دیتی۔کریں کیا؟

امرناتھ طپش موگوی

مسئلہ فیثاغورث کا ریاضی پر احسان

(مولوی محمد عزیز الدین صاحب سنٹرل ماڈل سکول لاہور)

حکمائے یونان نے جس دماغ سوزی جانفشانی اور عرق ریزی سے نئے نئے انکشافات اور معلومات دنیائے عالم کے سامنے پیش کئے۔ اس کا ایک زمانہ معترف ہے۔ اور دنیا کبھی ان کے احسان اور شکریہ سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی۔

حکیم افلاطون۔ ارسطو۔ سقراط۔ بقراط۔ ارسطا طالیس۔ بوعلی سینا۔ فیثاغورث کے نام سے کون واقف نہیں۔ جس عزت اور احترام سے لوگ ان کو یاد کرتے ہیں۔ اس سے ان کی عظمت اور شان کا اندازہ ہوسکتا ہے یہ سب کیوں؟ اسلئے کہ انہوں نے ایسے ایسے اصول پیش کئے جن سے بے انتہا مفید کام نکلے بیتی طور پر ہم حکیم فیثاغورث کا ریاضی کے متعلق دریافت کردہ خاص اصول پیش کرتے ہیں۔ کہ "مثلث قائم الزاویہ میں دونوں ضلعوں کے مربعوں کا مجموعہ وتر کے مربع کے برابر ہوتا ہے" یا اس کے برخلاف وتر اور ایک ضلع کے مربعوں کا فرق دوسرے ضلع کے مربع کے برابر ہوتا ہے۔

فرض کرو ایک تکون کے دو ضلعے ا و ب ہیں اور وتر ج ہے۔ پس $\text{ا}^2 + \text{ب}^2 = \text{ج}^2$ یا $\text{ج}^2 - \text{ا}^2 = \text{ب}^2$۔

چونکہ دو اعداد کے مربعوں کا فرق ان اعداد کے مجموعہ و فرق کے حاصل ضرب کے برابر ہوتا ہے۔ پس
$\text{ج}^2 - \text{ا}^2 = (\text{ج} + \text{ا})(\text{ج} - \text{ا})$

یہ ایک ایسا مفید اور کارآمد اصول ہے۔ کہ اسکی مدد سے ہم بیسیوں مشکل مشکل سوالات آسانی سے حل کرسکتے ہیں۔ ریاضی کی جملہ شاخوں جیومیٹری۔ حساب۔ الجبرے میں اس کا استعمال بے انتہا مشکلات کو حل کرتا ہے ہم اس کے ثبوت میں ریاضی کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

مثال نمبر ۱۔ دو برابر بانس ایک دوسرے سے ۴۰ فٹ کے فاصلہ پر گاڑ کر ان پر ۱۰۰ فٹ لمبا رسا باندھ کر ایک بازیگر تماشا کرنے اس پر چڑھا۔ اتفاق سے رسا ایسی جگہ سے ٹوٹا کہ بازی گر ایک بانس سے ۳۰ فٹ کے فاصلہ پر زمین پر آگرا۔ بتاؤ رسا کہاں سے ٹوٹا۔

یہ سوال اسی اصول کی بنا پر حل کیا جاسکتا ہے۔ شکل سے ظاہر ہے کہ رسے کے جھکاؤ سے دو
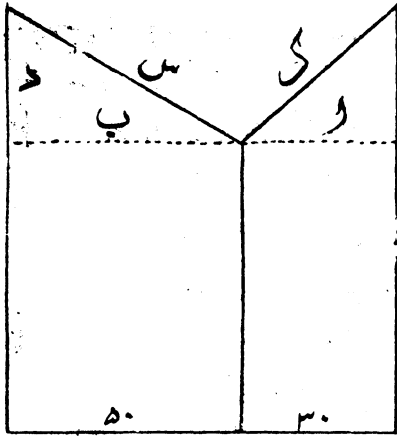
قائم الزاویہ تکونیں پیدا ہوگئی ہیں۔ جن کے ج و د ضلعے باہم برابر ہیں۔ چونکہ دائیں طرف کی تکون میں ک^2 = ج^2 + ا^2 اور بائیں طرف کی تکون میں س^2 = د^2 + ب^2، پس س^2 - ک^2 = (د^2 + ب^2) - (ج^2 + ا^2)۔

اور چونکہ د و ج آپس میں برابر ہیں۔ پس س^2 - ک^2 = ب^2 - ا^2 = (۵۰)^2 - (۳۰)^2 = (۵۰ + ۳۰) (۵۰ - ۳۰) = ۸۰ × ۲۰ = ۱۶۰۰ مربع فٹ۔

اور چونکہ س^2 - ک^2 = (س + ک) (س - ک) = ۱۶۰۰ مربع فٹ۔

اور (س + ک) = ۱۰۰ فٹ

پس (س - ک) = $\frac{۱۶۰۰}{۱۰۰}$ = ۱۶ فٹ۔

پس س یعنی رسے کے لمبے ٹکڑے کا طول = $\frac{۱۰۰ + ۱۶}{۲}$ = ۵۸ فٹ

اور ک یعنی رسے کے چھوٹے ٹکڑے کا طول = $\frac{۱۰۰ - ۱۶}{۲}$ = ۴۲ فٹ۔

مثال ۲۔ ایک درخت ۹۰ گز بلند تھا وہ ہوا کے زور سے کہیں بیچ میں سے ٹوٹ کر اس طرح گرا کہ اس کا سر اس کی جڑ سے ۳۰ گز کے فاصلہ پر زمین سے جا لگا۔ بتاؤ درخت کتنی بلندی سے ٹوٹا؟

حل۔ شکل سے معلوم ہوتا ہے کہ ا ب درخت مقام ج سے ٹوٹ کر اس طرح زمین پر جا لگا۔ کہ ا ج د ایک قائم الزاویہ تکون پیدا ہوگئی۔ جس کا ج د وتر = ج ب

چونکہ (ج د)^2 - (ج ا)^2 = (ا د)^2 = (۳۰)^2 = ۹۰۰ مربع گز

اور (ج د)^2 - (ج ا)^2 = (ج د + ج ا) (ج د - ج ا)

اور (ج د + ج ا) = ۹۰ گز

پس (ج د - ج ا) = $\frac{۹۰۰}{۹۰}$ = ۱۰ گز

پس ج ا کا طول = $\frac{۹۰ - ۱۰}{۲}$ = ۴۰ گز

پس درخت ۴۰ گز کی بلندی سے ٹوٹا۔

مثال ۳۔ ایک مینار ۶۰ فٹ بلند ہے۔ اس کی چوٹی پر ایک بندر اور ایک کوا بیٹھے تھے۔ مینار کی جڑ سے ۴۰ فٹ کے فاصلہ پر ایک روٹی کا ٹکڑا پڑا تھا۔ بندر تو مینار سے نیچے اتر کر اس ٹکڑے تک پہنچا۔ لیکن کوا سیدھا اوپر

کو کچھ فاصلہ اُڑ کر پھر وتری رستے ٹکڑے تک پہنچا معلوم ہوا۔ کہ بندر اور کوّے کو یکساں فاصلہ طے کرنا پڑا۔ بتاؤ کوّا کتنا سیدھا اوپر کو اُڑا؟
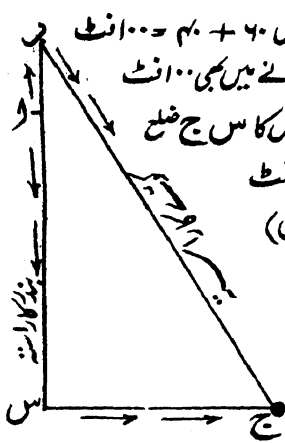
حل۔ شکل سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بندر کو روٹی کے ٹکڑے تک پہنچنے میں ۶۰ + ۴۰ = ۱۰۰ افٹ فاصلہ طے کرنا پڑا۔ اور کوّے کو ا سے ب تک جا کر پھر ج تک آنے میں بھی ۱۰۰ افٹ ہی طے کرنا پڑے۔ اس طرح جو ب ج س مثلث پیدا ہوگئی۔ اس کا س ج ضلع ۴۰ فٹ ہے۔ اور س ب اور ب ج کا مجموعہ ۶۰ + ۱۰۰ = ۱۶۰ افٹ

چونکہ (س ج)² = (ب ج)² − (ب س)² = (ب ج + ب س) (ب ج − ب س)

= (۴۰)² = ۱۶۰۰ مربع فٹ

اور (ج ب + ب س) = ۱۶۰ افٹ

پس (ج ب − ب س) = ۱۶۰۰/۱۶۰ = ۱۰ افٹ

پس ب س = (۱۶۰ − ۱۰)/۲ = ۷۵ فٹ

پس ا ب = ۷۵ − ۶۰ = ۱۵ افٹ

پس کوّا ۱۵ افٹ اونچا اڑا۔

مثال ۴۔ ایک کنول کا پھول پانی کی تہ سے ا فٹ اونچا تھا۔ ہوا کے زور سے جھکتا ہوا ۷ فٹ کے فاصلہ پر پانی کی سطح سے جا لگا۔ تو پانی کی گہرائی معلوم کرو۔
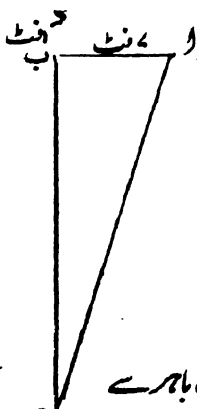
حل۔ کنول کی ڈنڈی و پانی کی گہرائی اور پانی کی سطح سے ایک قائم الزاویہ مثلث ا ب ج پیدا ہوگئی ہے۔ جیسا کہ شکل سے ظاہر ہے۔

چونکہ ا ج = ج د اور ا ج − ج ب = ا فٹ

نیز (ا ج)² − (ج ب)² = (ا ج + ج ب) (ا ج − ج ب) = (۷)² = ۴۹

پس (ا ج + ج ب) = ۴۹/۱ = ۴۹ فٹ

پس ج ب = (۴۹ − ۱)/۲ = ۲۴ فٹ

پس پانی کی گہرائی = ۲۴ فٹ۔

مثال ۵۔ ایک گول زمین کے ٹکڑے کا نصف قطر ۴ افٹ ہے۔ اس کے گرد سب طرف باہر سے ۷ فٹ چوڑی زمین کھود کر اس کی مٹی اندر کے ٹکڑے پر ڈال کر اس پر ۵ فٹ اونچا چبوترہ بنانا چاہتے ہیں۔ بتاؤ باہر کی زمین کو کتنا گہرا کھودنا چاہیے؟ نیز اس کی سطح چبوترہ کی سطح سے کتنی نیچی ہو جائیگی؟
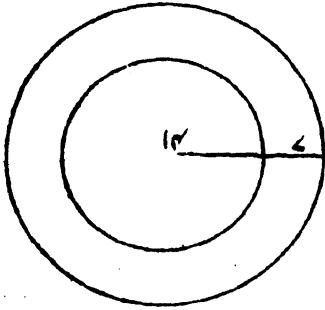
اس سوال کے حل کرنے کا عام قاعدہ حسب ذیل ہے۔

اندر کے ٹکڑے کا نصف قطر = ۱۴ فٹ

اسلئے اندر کے ٹکڑے کا رقبہ = ۱۴ × ۱۴ × $\frac{۲۲}{۷}$ =
۶۱۶ مربع فٹ۔

باہر کی زمین ملا کر کل گول ٹکڑے کا نصف قطر = ۱۴ + ۷ =
۲۱ فٹ

کل زمین کا رقبہ = ۲۱ × ۲۱ × $\frac{۲۲}{۷}$ = ۱۳۸۶ مربع فٹ

بیرونی ٹکڑے کا رقبہ = ۱۳۸۶ - ۶۱۶ = ۷۷۰ مربع فٹ

چونکہ اندر کی زمین ۵ فٹ اونچی بنانا چاہتے ہیں۔ پس اندر کی زمین کی جسامت = ۶۱۶ × ۵ = ۳۰۸۰ مکعب فٹ

چونکہ باہر کی زمین سے اتنی ہی مٹی نکالنی منظور ہے۔ جتنی اندر ڈالنی چاہتے ہیں۔ پس باہر کی زمین سے جو مٹی اُٹھائی جائیگی اس کی جسامت بھی وہی ہو گی جو اندر کی زمین کی ہوئی ہے۔

پس اس کی جسامت = ۳۰۸۰ مکعب فٹ

پس بیرونی زمین کی گہرائی = ۳۰۸۰ ÷ ۷۷۰ = ۴ فٹ

پس بیرونی زمین کو ۴ فٹ گہرا کھودنا چاہیئے۔

لہذا اندرونی و بیرونی زمین کی سطح کی بلندی میں فرق = ۴ + ۵ = ۹ فٹ۔

اصول زیر بحث کی مدد سے یہ سوال آسانی سے زبانی حل ہو سکتا ہے۔ جس کا قاعدہ مندرجہ ذیل ہے:۔

اندرونی کل زمین کے نصف قطروں میں نسبت = ۱۴ : ۲۱ فٹ

اندرونی و بیرونی زمین کے رقبوں میں نسبت = $(۱۴)^۲ : ((۲۱)^۲ - (۱۴)^۲)$

= $(۱۴)^۲ : ((۲۱ + ۱۴)(۲۱ - ۱۴))$

= $(۱۴)^۲ : (۳۵ × ۷)$

= ۱۹۶ : ۲۴۵

= ۴ : ۵

چونکہ رقبوں میں ۴ : ۵ ہے پس بلندی اور گہرائی میں اس سے اُلٹی نسبت یعنی ۵ : ۴ ہو گی۔

پس اندر کی زمین کو ۵ فٹ اونچا کرنے کے لئے باہر کی زمین کو ۴ فٹ کھودنا پڑے گا۔

پس دونوں سطحوں کی بلندی میں فرق = ۴ + ۵ = ۹ فٹ۔

اب مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس سوال کے حل کرنے میں اتنی لمبی لمبی رقومات حاصل ہوتی تھیں۔ کہ جن کا شمار کرنا بھی دشوار تھا لیکن اس اصول کی مدد سے وہ کس آسانی سے زبانی حل ہو گیا۔

نقشہ متعلقہ عمارت لیڈز ٹریننگ کالج

تعلیمی رپورٹ

پنجاب کا رقبہ ۹۹۸۶۶ مربع میل ہے۔ آبادی ۲۰۶۸۵۰۲۴ ہے جن میں سے ۱۱۳۰۶۲۶۵ آدمی اور ۹۳۸۷۵۹ عورتیں ہیں یعنی آبادی فی مربع میل ۲۰۷ ہے۔

سنہ ۱۹۲۷و۲۸ء میں ۹٫۷۷ فیصدی مرد اور ۱٫۵۳ فیصدی عورتیں تعلیم پاتی تھیں۔ لیکن سنہ ۱۹۲۸و۲۹ء میں عورتیں ۱٫۶۷ ہو گئیں۔ اور مردوں کی تعداد گھٹ کر ۹٫۴۱ رہ گئی۔ جہاں پہلے سال کل ۶٫۰۴ فیصدی طلبا تعلیم پاتے تھے وہاں اب ۵٫۹ فیصدی طلبا رہ گئے۔ تعداد طلبا کا خیال کیا جائے۔ تو لڑکیاں سنہ ۱۹۲۷و۲۸ء میں ۹۳۹۶۱ پڑھتی تھیں اور لڑکے ۱۲۴۸۱۳۱ پڑھتے تھے۔ سنہ ۱۹۲۸و۲۹ء میں جہاں لڑکیوں کی تعداد ۱۰۲۰۳۲ ہو گئی یعنی ۸۰۷۱ کی بیشی ہوئی۔ وہاں لڑکوں کی تعداد ۱۲۲۰۷۶۹ رہ گئی۔ یعنی ۲۷۳۶۲ کی کمی ہوئی۔ یہ کمی حلقہ وار اس طرح ہے۔

انبالہ ڈویژن ۲۶۶۲۳ کی کمی — جالندھر ڈویژن ۱۰۱۷ کی بیشی — لاہور ڈویژن ۹۲۶۴ کی کمی
راولپنڈی ڈویژن ۴۰۶ کی کمی — ملتان ڈویژن ۷۳۶ کی کمی

یعنی انبالہ ڈویژن میں سب سے زیادہ کمی ہوئی۔ اس کے برعکس جالندھر ڈویژن میں تعداد بڑھ گئی۔ اسی وجہ سے فیصدی طلبا کی تعداد میں کمی واقع ہوئی۔ نہ صرف طلبا کی تعداد میں کمی ہے۔ بلکہ درسگاہوں کی تعداد میں بھی کمی ہے۔ سنہ ۱۹۲۷و۲۸ء میں لڑکیوں کی درسگاہیں ۴۰۱۷ اور لڑکوں کی درسگاہیں ۱۵۰۴۲ تھیں۔ کل ۱۹۰۵۹ درسگاہیں تھیں۔ سنہ ۱۹۲۸و۲۹ء میں لڑکیوں کی درسگاہیں ۴۱۱۸ ہو گئیں یعنی ۱۰۱ زیادہ ہوئیں اور لڑکوں کی درسگاہیں ۱۳۹۸۱ رہ گئیں یعنی ۱۰۶۱ کی کمی ہوئی۔ کل درسگاہیں ۱۸۰۹۹ رہ گئیں۔ یعنی کل کمی ۹۶۰ کی ہوئی۔ پنجاب میں ۵½ مربع میل پر بحساب اوسط ایک درسگاہ ہے۔ شہر میں ایک مربع میل میں کئی کئی درسگاہیں ہیں۔ لیکن گاؤں میں درسگاہیں دُور دُور ہیں۔

جہاں درسگاہوں اور طلبا کی تعداد میں کمی واقع ہوئی۔ وہاں خرچ میں پچھلے سال کی نسبت ۱۲۸۰۷۵ کی بیشی ہوئی۔ کل خرچ ۳۰۲۱۵۵۵ روپے ہوا۔ اس میں ۵۵٫۹۵ فیصدی گورنمنٹ نے ۱۲٫۹۳ فیصدی میونسپل کمیٹی و ڈسٹرکٹ بورڈ نے خرچ کیا ۲۰٫۰۴ فیصدی فیس سے حاصل ہوا۔ اور ۱۱٫۰۸ فیصدی دیگر ذرائع سے حاصل ہوا۔

لوگ اس بات کو پڑھ کر متعجب ہونگے۔ کہ اس کی کیا وجہ ہے۔ کہ طلبا اور مدرسوں کی تعداد میں کمی ہو گئی۔ اور خرچ بڑھ گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پنجاب میں بہت سے رات کے مدرسے تھے جو برائے نام سکول تھے۔

لیکن طلباء ان میں نہ آتے تھے - یہ سکول بند کر دیئے گئے - اس کے علاوہ موجودہ وزیر تعلیم صاحب نے طلباء کی تعداد ٹھیک ٹھیک ظاہر کرنے پر خاص طور پر توجہ دی - تعلیم کی بہتری کی طرف توجہ دی گئی - فی الواقع طلبا کی تعداد میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی - بلکہ بیشی ہوئی ہے - اگر والدین کو کافی طور پر سمجھایا جائے - پراپیگنڈہ ورک کافی مقدار میں کیا جائے - تو تعداد میں بہت اضافہ ہو سکتا ہے -

دیگر اطراف میں ترقی } اگرچہ بظاہر تعداد طلبا میں کمی واقع ہوئی ہے - لیکن اگر دیگر جانب نظر دوڑائی جائے - تو معلوم ہو گا - کہ بہت کچھ قابلِ قدر ترقی ہوئی ہے - لوئر مڈل سکولز کافی تعداد میں بڑھا دیئے گئے - اعداد حسب ذیل ہیں -

	لوئر مڈل	اپر مڈل	میزان
۱۹۲۲ء	۴۱۲	۲۴۴	۶۵۶
۱۹۲۳ء	۴۳۸	۲۷۰	۷۰۸
۱۹۲۴ء	۵۸۸	۲۹۹	۸۸۷
۱۹۲۵ء	۸۸۳	۳۲۳	۱۲۰۶
۱۹۲۶ء	۱۳۴۲	۳۹۱	۱۷۳۳
۱۹۲۷ء	۱۶۵۸	۴۵۶	۲۱۱۴
۱۹۲۸ء	۱۹۸۹	۵۲۹	۲۵۱۸
۱۹۲۹ء	۲۲۲۱	۵۹۵	۲۸۱۶

یہ بات قابلِ ذکر ہے - کہ پرائمری کلاس کے طلبا کی تعداد ہائی سکولز مڈل سکولز اور لوئر مڈل سکولز میں ۴۳۰۳۸۲ ہے - محض پرائمری سکولوں میں ۳۵۹۸۴۴ پڑھتے ہیں - گویا ۵۰ فیصدی سے زیادہ طلبا پرائمری کے ایسے سکولوں میں تعلیم پاتے ہیں - جہاں قابل اور تربیت یافتہ مدرسین تعلیم دیتے ہیں -

طلبا کی تعداد میں اصلاح } بہت پرائمری سکولوں کو لوئر مڈل سکولوں میں تبدیل کرنے کا نتیجہ یہ ہوا - کہ جہاں پہلے چوتھی جماعت میں کم طلبا رہ جاتے تھے اب پرائمری کی اعلےٰ جماعتوں میں طلبا کی تعداد میں اضافہ ہو گیا -

ایک مدرس والے سکولوں میں کمی } یہ ظاہر ہے کہ ایک مدرس چار جماعتوں کی نگہداشت اچھی طرح نہیں کر سکتا - نہ طلبا کی تعلیم میں پوری دلچسپی لے سکتا ہے - اس لئے اس سال اس طرف خاص توجہ دی گئی - کہ ایک مدرس والے سکولوں کی تعداد میں کمی کی جائے - اس طرف روپیہ کی کمی کی وجہ سے کافی توجہ نہ دی جا سکی - کیونکہ یہ امداد سال کے آخر میں دی گئی - ایک مدرس والے سکول ابھی تک پنجاب میں ۱۲۴۲ اور ہیں - کل مدرسین کی تعداد ۳۵۶۵۷ ہے جس میں سے ۲۳۸۶۱ تربیت یافتہ ہیں یعنی ۶۷ فیصدی پچھلے سال صرف ۶۲ فیصدی تربیت یافتہ مدرسین تھے - سکولوں میں کل طلبا کی تعداد ۱۰۳۶۱۸۶ ہے - جو پرائمری مڈل و ہائی سکول میں تعلیم پاتے ہیں - یعنی بحساب اوسطاً فی مدرس ۲۹ طلبا پڑھتے ہیں -

برانچ سکول اس سال جہاں ایک مدرس والے پرائمری سکولوں کو کم کیا گیا۔ وہاں دوسری جماعت تک کے ایک مدرس والے برانچ سکول کھولے گئے۔ یہ سکول مڈل سکولوں کے ماتحت ہیڈ ماسٹر مڈل سکول کی مناسب نگرانی کے باعث بخوبی چلے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ دیہات کے لوگوں کو چھوٹے چھوٹے بچوں کے سکول بھیجنے میں آسانی پیدا ہو گئی۔

ابجد خوانوں کے لئے موڈل سکول ڈسکہ اور دیگر مقامات پر ایسے سکول چھوٹے بچوں کے لئے بطور نمونہ کھولے گئے۔ جہاں بچوں کو بہتر طریق پر تعلیم دی جائے۔ کیونکہ بچوں کی تعلیمی ترقی پر ہی آئندہ کی ترقی منحصر ہے۔ اور اسی طرف اصلاح کی کافی ضرورت ہے۔

لازمی تعلیم میں اضافہ باوجودیکہ تعداد طلبا میں کمی ہوئی۔ مالی لحاظ سے بھی حالت بہتر نہ تھی۔ لیکن پھر بھی ایسے مقامات میں اضافہ ہوا جہاں لازمی تعلیم جاری کی گئی۔ ۴۲ رقبہ میونسپل کمیٹی اور ۲۰۴۰ دیہاتوں میں لازمی تعلیم جاری ہے۔

کھیل کود اور جسمانی ورزش پہلے کھیل کود اور ورزش جسمانی کا انتظام ڈرل ماسٹروں کے سپرد تھا۔ جو تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باعث جسمانی تربیت کی علت غائی اس کا صحتِ جسمانی سے تعلق قومی ترقی میں کھیلوں کا درجہ وغیرہ اصولوں کو نہ سمجھتے تھے۔ اس لئے یہ بہتر سمجھا گیا۔ کہ طلبا کی جسمانی تربیت کا انتظام بھی تعلیم یافتہ اصحاب کے سپرد کیا جائے۔ چنانچہ مسٹر ایچ ڈبلیو ہاگ کی زیر نگرانی بہت گریجوئیٹ اور انڈر گریجوئیٹ پی۔ ٹی کی تربیت حاصل کر کے نکلے ہیں جنھوں نے صوبہ کے سکولوں میں کھیل۔ ورزش اور سکاؤٹنگ میں نئی زندگی پھونک دی ہے۔ اور ریفریشر کورس قائم کر کے دیہاتی ٹیچروں کو کافی تربیت اس بارے میں دی گئی ہے۔

سکاؤٹنگ سکاؤٹنگ کی تربیت کا عملی پہلو یہ ہے۔ کہ سکاؤٹس نے میلے تہواروں پر انتظام کرنے۔ آگ بجھانے۔ ملیریا کے دنوں میں ادویات تقسیم کرنے میں کافی مدد دی ہے۔ جو سکاؤٹس ہندوستان سے انگلینڈ کی جمبوری میں شامل ہوئے تھے۔ انہوں نے وہاں کی پبلک پر اچھا اثر ڈالا۔

ریڈ کراس سوسائٹی اور کمیونٹی کونسل نارمل سکولوں اور دیگر سکولوں میں ریڈ کراس سوسائٹیاں کھلی ہوئی ہیں۔ جو طلبا کے ذریعہ بیماروں کی مدد کرتی ہیں اور لوگوں میں صحت کے اصولوں پر لیکچر دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہر ضلع میں ڈسٹرکٹ کمیونٹی کونسل اور رورل کمیونٹی بورڈ قائم ہیں۔ جو طلبا کی مدد سے گاؤں گاؤں اور قصبہ قصبہ میں اشاعتی کام کرتی اور جلوس نکالتی ہیں جس کا اثر پبلک ہیلتھ پر اچھا پڑتا ہے۔

اعلےٰ تعلیم — ۱۹۲۹ء میں ۱۳۶۹۵ طلبا انٹرنس میں شامل ہوئے۔ اور ۱۸، ۶۲ فیصدی طلبا کامیاب ہوئے۔ اعداد کا مشاہدہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ۱۹۲۳ء سے طلبا کی تعداد میں اضافہ نہ ہوا۔ پچھلے سال ۱۲۷۰۷ طلبا امتحان میں شامل ہوئے تھے۔ ایف۔ اے میں ۱۹۲۹ء میں ۳۳۴۸ طلبا امتحان میں شامل ہوئے۔ اور ۶۲ء ۴۸ فیصدی کامیاب ہوئے۔ بی اے میں ۱۷۱۴ طلبا شامل امتحان ہوئے۔ اور ۱۷، ۵۱ فیصدی کامیاب ہوئے۔ اس سے ظاہر ہے۔ کہ والدین کا کثیر روپیہ اعلےٰ تعلیم پر ضائع جا رہا ہے۔ تعداد طلبا میں بھی پچھلے چار پانچ سال سے کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام طلبا کا رجحان لٹریری تعلیم کی طرف نہیں ہوتا لیکن سب کو اعلےٰ تعلیم پانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ جن طلبا کا رجحان دستکاری اور زراعت کی طرف ہے۔ اُن کو اُسی قسم کی تعلیم دی جائے۔ اور لٹریری تعلیم صرف اُن طلبا کو دی جائے جنہیں اس تعلیم کا شوق ہے۔ تاکہ والدین کا روپیہ اور طلبا کا وقت ضائع نہ ہو۔

کالجیٹ سکولز — اس خیال سے کہ دیہات و قصبات کے طلبا کو گھر کے قریب اعلےٰ تعلیم مل سکے۔ انٹرنس کی نویں دسویں جماعتوں کے ساتھ فسٹ ایر اور سیکنڈ ایر کلاسیں جاری کی گئیں۔ پنجاب میں ایسے دس کالج ہیں۔ لیکن ان کالجوں نے کافی کشش پیدا نہیں کی۔ اور طلبا کی کثیر تعداد مرکزی درسگاہوں میں ہی داخل ہوتی ہے۔ اُمید ہے۔ آہستہ آہستہ یہ کالج کشش کا باعث بن جائیں گے۔

اعلےٰ درسگاہیں — شہر لاہور میں گورنمنٹ کالج۔ فورمن کرسچن کالج۔ ڈی اے وی کالج۔ سناتن دھرم کالج۔ دیال سنگھ کالج اور اسلامیہ کالج کافی رونق پر ہیں۔ ان میں طلبا کی تعداد میں کافی ترقی ہو رہی ہے۔ پچھلے سال مسٹر جے۔ آر فرتھ کے گورنمنٹ کالج سے اور ڈاکٹر رائیس کے فورمن کرسچن کالج سے الہ آباد چلے جانے کی وجہ سے بڑا نقصان ہوا۔ اس سال پنڈت رگھبر دیال صاحب شاستری کی بے وقت موت سے سناتن دھرم کالج کو کافی نقصان اُٹھانا پڑا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں پوسٹ گریجوئیٹ کلاس کے طلبا کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا۔

یونیورسٹی کی تعلیم — پنجاب یونیورسٹی نے تحقیقات کے محکمہ میں کافی کام کیا ہے۔ ۱۸ مسودے طیار کئے گئے۔ جن میں سے ۱۱ شائع ہو چکے ہیں۔ جن کی شہرت نہ صرف ہندوستان میں بلکہ یورپ و امریکہ میں بھی ہے۔ یونیورسٹی کی طرف سے کئی طلبا یونیورسٹی کے خرچ پر بیرونی ممالک میں تحقیقات کا کام کر رہے ہیں۔

مدرسین کی قابلیت میں اصلاح — پچھلے سال مدرسین کی قابلیت میں کافی اصلاح ہوئی ہے۔ اب تربیت یافتہ مدرسین کی تعداد پنجاب میں ۷۰ فیصدی سے ۷۵ فیصدی

ہوگئی ہے۔ یہ تعداد دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں بھی حوصلہ افزا ہے۔ لیکن جب تک مدرس ٹریننگ کالج و نارمل سکولوں سے حاصل کردہ تربیت کو پورے طور پر تعلیم میں استعمال نہ کریں۔ اس سے خاطر خواہ فائدہ نہیں ہو سکتا۔

وسیع خیالی پچھلے سالوں کے مقابلہ میں اب سکولوں میں نئی نئی تحریکیں جاری کی گئی ہیں۔ مثلاً ریڈ کراس سوسائٹی۔ سکاؤٹنگ۔ دیہات سدھار سکیم یہ ایسے امور ہیں جن سے طلبا میں اپنی ذات کو دوسروں کی خدمت میں لگانے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اور اس سے طلبا کے دل و دماغ وسیع ہو جاتے ہیں۔ اور اس سے طلبا کو زیادہ خوشی حاصل ہوتی ہے۔

لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم عورتوں اور لڑکیوں کی تعلیمی توسیع کے لئے جو ذرائع اختیار کئے گئے۔ اُن کے خاطر خواہ نتائج نکل رہے ہیں۔ اعداد سے ظاہر ہے۔ کہ درسگاہوں اور طلبا کی تعداد میں خاصہ اضافہ ہُوا ہے۔ سب سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ اعلےٰ جماعتوں میں لڑکیاں کافی تعداد میں داخل ہونے لگی ہیں۔ کنیارڈ ہائی سکول لاہور نے عورتوں کی اعلےٰ تعلیم کے بارے میں کافی کام کیا ہے۔ اس سال مختلف مقامات پر لڑکیوں کے ہائی سکول کھولے گئے ہیں۔ ان سکولوں میں طلبا کی تعداد میں خاص اضافہ ہُوا ہے۔ یہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ کہ سکولوں کو وسعت دی جائے تاکہ طلبا کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لئے کافی ہو۔ لیڈی میکلیگن کالج نے مس اسی مسٹ صاحبہ کی رہنمائی میں کافی کام کیا ہے۔ وکٹوریہ سکول میں مس بوس صاحبہ نے طلبا کی تعلیمی ترقی میں بیش بہا خدمات سرانجام دی ہیں۔ وہ ماہ جولائی میں ریٹائر ہوگئیں۔ طلبا کی ٹریننگ کی طرف خاص توجہ دی گئی ہے۔ لیڈی میکلیگن کالج کے ساتھ زنانہ جے اے وی اور ایس وی کلاسیں کھولی گئی ہیں۔ جگہ جگہ اضلاع میں مڈل سکولوں اور ہائی سکولوں کے ساتھ جے وی کی ٹریننگ کلاسیں کھول دی گئی ہیں۔ اس بارے میں مس سٹریڈ فورڈ نے کافی کام کیا ہے۔

خاص تعلیم دستکاری کی تعلیم امیدوار پیشے کے سکولوں اور دستکاری سکولوں کے لئے کافی درخواستیں دیتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ طلبا کا رجحان ادھر کافی ہوتا جاتا ہے۔

ورنیکلر مڈل سکولوں میں زراعتی تعلیم پچھلے سال ایک کمیٹی اس بارے میں مقرر کی گئی تھی جس نے دیگر تجاویز کے علاوہ بڑی تجویز یہ کی تھی۔ کہ زراعت کی تعلیم دوسری تعلیم کے ساتھ ساتھ دی جائے نہ کہ علیحدہ چنانچہ مڈل سکولوں میں زراعت جاری کردی گئی ہے۔ جہاں ایسے مڈل سکولوں کی تعداد پچھلے سال ۱۲۸ تھی وہاں سنہ ۱۹۲۹ء میں ۱۴۴ ہوگئی۔ زراعت کے بارے میں لالہ لچھمن داس جی بی اے نہایت تن دہی سے کوشش کررہے ہیں۔

یوروپین کی تعلیم اگرچہ یورپین سکولز علیحدہ ہیں جن میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ مگر ان سکولوں میں ہندوستانی اور اینگلو انڈین بچے بھی تعلیم پاتے ہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے لیکن ان کے تعلقات یورپین بچوں کے ساتھ نہایت خوشگوار ہیں۔ ان میں اہم تبدیلی کی گئی ہے۔ کہ محکمہ کا انٹرنس کا امتحان اُڑا کر کیمبرج سکول سرٹیفکیٹ امتحان جاری کر دیا ہے۔ اس تبدیلی کو پسند کیا گیا ہے۔ اور طلبا دیگر بیرونی امتحانات کے بوجھ سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔

مسلمانوں کی تعلیم یہ امر تسلی بخش ہے کہ اگرچہ اس سال طلبا کی تعداد میں عام طور پر کمی واقع ہوئی ہے۔ لیکن مسلمان طلبا کی تعداد میں ۵۴۲۸ کی بیشی سیکنڈری جماعتوں میں ہوئی ہے۔ ساتھ ہی کالج اور ٹریننگ انسٹی ٹیوشنز میں مسلمان طلبا کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے۔

اچھوتوں کی تعلیم اچھوت طلبا کی تعلیمی ترقی بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ایک خاص افسر اس فرقہ کی تعلیمی ترقی کے متعلق تجاویز پیش کرنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ چنانچہ گورنمنٹ کی طرف سے اس کے متعلق رزولیوشن شائع ہوئے ہیں۔ ان رزولیوشنز اور رپورٹ پر اگلے سال ۱۹۳۱ء سے عملدرآمد ہوگا۔ لوگوں کے دلوں سے ان کے برخلاف تعصبات کم ہو رہے ہیں۔ چنانچہ بجائے خاص مدرسے میں داخل ہونے کے عام سکولوں میں ان کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اگرچہ اعلےٰ جماعتوں میں ان کی تعداد ابھی بالکل تھوڑی ہے۔ لیکن جب تجاویز پر عمل درآمد ہوگا۔ تو یہ کمی بھی دور ہو جائیگی۔

جرائم پیشہ فرقے کی تعلیم جرائم پیشہ فرقہ کی تعلیم کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ طلبا میں کھیلوں اور دیگر صحت افزا امور کی طرف شوق پیدا کیا گیا ہے۔

غرضیکہ تعلیم کے ہر شعبہ میں ترقی کی گئی ہے۔ اگر لوگوں نے ادھر توجہ دی تو تعلیم کا پودا پنجاب میں نہایت حوصلہ افزا نتائج پیدا کریگا۔

(بہاری لال ٹیچر نورمل سکول حصار)
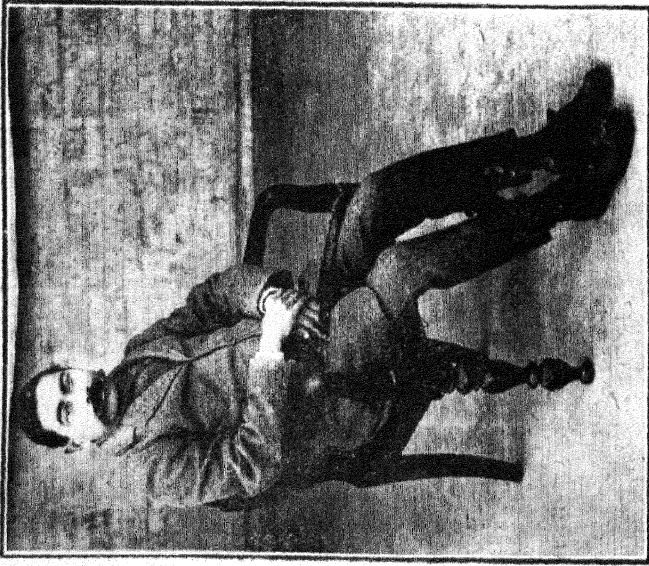
شہید تعلیم

پستا لاژی

1746 تا 1827

منشی پریم چند صاحب بی اے

لالہ تلوک چند صاحب محروم بی اے
تاریخ تصویر 1915
اور تاریخ پیدائش 1885

شیخ خادم محی الدین صاحب ایم ای
ڈی (لیڈز) بی اے بی ٹی (پنجاب)

در فضیلت علم

(تضمین اشعار حضرت امیر خسرو دہلوی)

(از جناب تلوک چند صاحب محروم بی اے)

علم سے روشن دل و جان و دماغ — علم مٹاتا ہے جہالت کے داغ
منحرف اس سے نہ ہو اے بافراغ — علم ہے تیرے لئے روشن چراغ

"آنکہ چراغیش نباشد براہ
در شبِ تاریک در افتد بچاہ"

علم کی امداد سے اے با شعور — چاہئے افزائش نور و سرور
حیف کی جائے کہ ز راہِ فتور — علم ہو پیرایۂ کبر و غرور

"شمع شب افروزی کاشانہ ایست
نہ زپئے آتش زدن خانہ ایست"

نور ہیں انوار سحر سے سوا — جلوۂ خورشید و قمر سے سوا
علم ہے سو گنج گہر سے سوا — قیمتی ہے معدنِ زر سے سوا

"مرد کہ از علم تونگر بود
کے نظرش بر گہر و زر بود"

علم کے عالم میں ہے جس کا گذر — دولتِ جاوید سے ہے بہرہ ور
ہاتھ میں اس کے نہیں گو مال و زر — پھر بھی معزز ہے وہ صاحب ہنر

"آنکہ بزندانِ جہالت گم است
ہست گدا گرچہ زرش صد خم است"

منعمِ جاہل کا زر و مال کیا — طبل و علم ۔ دولت و اقبال کیا
بوم کو ہے نازِ پر و بال کیا — زیورِ جُلِ زر خرِ بدفال کیا

"گرچہ گشد گاو ۔ جوالِ گہر
بار زیادت بودش بے ہنر"

علم نہیں حیلہ و فن کے لئے — اور نہ آرائشِ تن کے لئے
بلکہ ہے اعمالِ حسن کے لئے — خدمتِ ابنائے زمن کے لئے

"آنکہ بہ تعلیم دل افروزدت
نہ از پئے دوزخ سبق آموزدت"

پڑھ کے بہت علم جو خود بیں ہوا — چھوڑ کے گوہر وہ صدف چیں ہوا
دشمنِ عقل و خرد و دیں ہوا — صورتِ ابلیس کج آئیں ہوا

"سبق ادب کز پئے خود بینی است
مطلعِ دیباچۂ بے دینی است"

ہمدمِ جاں جس نے کیا علم کو — واقفِ اسرارِ حقیقت ہے جو
حلم کا پیکر ہے وہ فرخندہ خو — خوئے تکبر کی نہیں اس میں بو

"فائدہ علم یقیں است خاص
کت دہد از بادۂ تکبر خلاص"

راہ برِ راہِ عمل گر نہیں — علم جہالت سے وہ بہتر نہیں
نخل ہے لیکن وہ ثمرور نہیں — ہے گلِ تصویر، گلِ تر نہیں

"علم کز اعمال نشانیش نیست
کالبدے دارد و جانیش نیست"

علم کہ ہے بدرقۂ بے بدل — در رہِ دشوار گزارِ عمل
بے حرکت ہو وہ اگر مثلِ شل — کارِ جہاں میں نہ ہو کیونکر خلل

"عالمِ بے کار نیابد برے
گرچہ بصد حیلہ برآرد سرے"

طریقۂ تعلیم کی ترقی

فن تقریر کی ابتدا پہلے پہل جب انسان عالم وجود میں آیا۔ تو اُس نے قدرت کا مشاہدہ کیا۔ اشیاء کے خواص معلوم کئے۔ اور ان خواص کی مدد سے اشیا کے نام رکھے۔ مثلاً سانپ کو چلتے دیکھا۔ اُس کی آواز کو سرسر سے تعبیر کیا۔ اور اُس کا نام سرسر کرنے والا سرپ یا سپ یا سانپ رکھا۔ اسی طرح جانوروں پرندوں کی آوازوں کے نام رکھے۔ اشیا کے نام رکھے۔ اس طرح زبان بن گئی۔ اور الفاظ کے ذریعہ اپنے خیالات ایک دوسرے پر زبانی ظاہر کرنے لگے۔ نسلاً بعد نسلٍ زبان بذریعہ بول چال سیکھتے رہے۔ آب وہوا۔ مقام کی علیحدگی کی وجہ سے لوگوں کی زبان مختلف ہے۔ پہاڑیوں کی زبان کا لب ولہجہ اس قسم کا ہے گویا دریا چل رہا ہے۔ اس میں پتھر بہتے جارہے ہیں۔ اور شوروغل پیدا کررہے ہیں۔ یہ نظارے پہاڑوں پر اکثر ملتے ہیں۔

فن تحریر کی ابتدا جب زبان بن چکی۔ تو تحریر کے ذریعہ اپنے خیالات دوسرے پر ظاہر کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ پہلا خیال، قدرتاً یہ تھا کہ جب کسی چیز کو خیال دلانا ہو تو اُس کی تصویر بنا کر بھیجدی۔ گائے کا خیال دلانا ہوا تو گائے کی تصویر بنا دی۔ اسی طرح تصاویر کی مدد سے بات چیت ہوتی رہی۔ آہستہ آہستہ مختصر کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ گائے کی بجائے صرف سینگ کی تصویر بنا دی (ا) عربی میں گائے کو الف کہتے ہیں۔ اس نشان کا نام الف ہوا۔ اسی طرح گھر کو ایک چوکور شکل سے ظاہر کیا۔ اور آگے ایک نقطے سے گھر کا چوکیدار ظاہر کیا ▭ عربی میں گھر کو بیت کہتے ہیں اس کا نام بیت ہوا۔ بگڑ کر بے ہوگیا اور شکل (ب) یہ رہ گئی۔ اسی طرح اونٹ کو اونٹ کی گردن ح سے ظاہر کیا۔ اونٹ کو عربی میں جمل کہتے ہیں۔ اس لئے (ج) اس صورت کا نام جیم رکھا۔ اس طرح مختلف حروف بن گئے۔

آوازوں کا تصوّر مختلف اشیا کے مختلف نام تھے۔ اب خیال پیدا ہوا۔ کہ ہر ایک شے کو الگ الگ نشان سے ظاہر کریں۔ تو بے شمار نشان ظاہر کرنے پڑینگے۔ جتنے زبان میں الفاظ ہیں۔ اتنے ہی نشانوں کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے سوچا گیا۔ کوئی ایسی تدبیر اختیار کرو۔ کہ (۱) نشانیاں کم سے کم ہوں (۲) ان نشانیوں کی مدد سے کل الفاظ ظاہر کئے جا سکیں۔

چنانچہ آم۔ رام۔ کمان۔ مال میں مشترک آواز م کا تصور ہوا۔ اس طرح کل مشترکہ آوازوں کو معلوم کیا۔

آپ - پانی - رُوپ میں پ کی آواز - اور - دور - موت میں آ و کی آواز مشترک ہے - اب ان آوازوں کا مشاہدہ کرکے دیکھا - کہ م - پ وغیرہ الگ ظاہر نہیں ہو سکتے جب تک ان کے زبر زیر پیش وغیرہ کی آواز نہ لگائی جائے - لیکن اَ - آ - اِ - ای - اُ - اُو وغیرہ آوازیں اکیلی الگ ظاہر کی جا سکتی ہیں - پہلی قسم کی آوازوں کا نام حروف صحیح رکھا - جو بذات خود بلا امداد زیر زبر وغیرہ آواز نہ دے سکیں - اور اَ آ اِ وغیرہ آوازوں کو جو بذات خود اپنی آواز دے سکتے ہیں - حروف علت کے نام سے پکارتے ہیں -

حروف کی ترتیب ہندی - پنجابی - بنگالی وغیرہ زبان والوں نے حروف علت و حروف صحیح کو الگ الگ ترتیب دی - پہلے وہ حرف علت جو حلق سے ادا ہوں - جیسے اَ آ دوسرے وہ حروف علت جو تالو سے ادا ہوں - جیسے اِ ای بعد میں وہ جو ہونٹ سے ادا ہوں - جیسے اُ اُو - بعد میں مرکبات - حروف صحیح کو اس طرح مترتب کیا - کہ حلق والے آواز الگ مثلاً ک کھ وغیرہ تالو والے - ج چھ وغیرہ الگ اس میں بھی اس بات کو مدنظر رکھا - کہ حلق کے نیچے سے بولا جائے وہ پہلے - جو ذرا اوپر سے بولیں وہ بعد میں ک کھ گ گھ وغیرہ - تاکہ سیکھنے میں آسانی ہو - جن میں زبان کو گھمانا پڑتا ہے وہ بعد میں رکھے -

حروف کی نشانی کی خصوصیت حروف کو بغور مشاہدہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے - کہ بعض حروف کی شکل وہی ہے - جو بولنے سے زبان تالو وغیرہ سے بنتی ہے اگر لام کی آواز ادا کی جائے - تو زبان ( ) ایسی صورت اختیار کرتی ہے - چنانچہ اس کی شکلیں ل میں ملتی ہیں سب میں زبان کے سر مڑنے کی شکل مشترک ہے - اسی طرح م میں گھنڈی مشترک ہے - اور منہ سے ادا کرنے سے بھی ایسی شکل بنتی ہے - یہ بہت ممکن ہے - کہ آوازوں کی شکلیں آواز ادا کرکے اور منہ کی بناوٹ کا مشاہدہ کرکے بنائی گئی ہوں -

حروف کو ملانے کا طریق پھر حروف کو ملانے کا طریق جاری ہوا - ہندی والوں نے یہ قاعدہ رکھا - کہ ساکن حرف اگلے حرف میں مل جائے - سکتی میں ک ساکن ہے - اس لئے ت میں مل جائے - اسی طرح قاعدے بن گئے -

طریق تہجی اب یہ سوچا گیا - کہ بجائے مختلف الفاظ پڑھا کر اتنا وقت خرچ کرنے کے یہ بہتر ہے - کہ مختلف آوازوں کے نام بتائے جائیں - اور اعراب لگا کر اُن کا ملانا سکھایا جائے - اس طرح حروف کے نام الف بے پے وغیرہ سکھائے گئے - پھر اَ اِ اُ بَ بِ بُ کے ذریعہ مختلف اعراب کی مدد سے اُن کو ادا کرنا سکھایا گیا - اس طریق کا نام طریق تہجی رکھ گیا -

طریق الصوت حروف کے نام اور آواز الگ رکھنا وقت طلب تھا - اس لئے ہند والوں نے حروف

کے نام اُن کی آوازوں پر رکھے۔ اور اِن آوازوں کو ک کھ گ گھ وغیرہ کو سکھا کر حرف علت کی مدد سے انکی گردان سکھائی گئی۔ کَ کا کِ. کی کُ کُو کے کَے کو کَو کں کہ وغیرہ اس طرح حروف کو ملاکر الفاظ بنانے سکھلائے گئے۔ اس طریق کا نام طریق الصوت رکھا گیا۔

طریق دیکھو بولو (بین وگول) اوپر کے طریق سے سکھلانے میں کئی دقتیں پیش آئیں۔ اوّل تو بچے اور بڑے آدمی کے سیکھنے میں فرق ہے۔ بچہ خشک حروف یاد کرنا پسند نہیں کرتا۔ بڑا آدمی تو اِن کی اہمیت سمجھ کر یاد کرلیتا ہے۔ دوسرے یہ خیال بھی غلط ثابت ہُوا۔ کہ ک کھ کی مدد سے بچے کو مشترکہ آواز کا تصور ہو جائیگا۔ جب تک یہ نشانی ایک اوک وغیرہ مستعمل نہ ہوں تب تک بچہ ک کے کچھ معنی نہیں سمجھتا۔ تیسرے بچہ گھر میں کچھ بولتا تھا۔ سکول میں آتے ہی . . . . . . اس نے ایک ناگوار تبدیلی محسوس کی۔ نیز ماہرین فن طریق تعلیم نے بچے کو سکھانے کے لئے نئے اصول ایجاد کئے تھے۔ یہ طریقہ بالکل اُس کے برخلاف نظر آیا۔ نامعلوم بات سکھا کر معلوم کی طرف چلنا بالکل اصول کے خلاف تھا۔ اس لئے ایسا طریق سوچا گیا۔ جو بچے کی فطرت کے مطابق ہو۔ یعنی بچے کو مقرون چیز آم دکھا کر اُس کا نام پوچھا جائے۔ پھر آم لکھ کر دکھایا جائے۔ اس طرح الفاظ کا پڑھنا لکھنا سکھایا جائے۔ جب بچے سو پچاس لفظ پڑھ لیں۔ تو بذریعہ تحلیل آم رام شام سے مشترکہ آواز آم کا تصور دلایا جائے۔ اِس دِن گِن وغیرہ سے مشترکہ اعراب (زیر) کا تصور دلایا جائے۔ جب مشترکہ آواز کا تصور ہو جائے۔ تو پھر اعراب کی مدد سے حروف کو ملاکر الفاظ بنانا سکھایا جائے۔ اِس طرح بچہ جلدی اور آسانی سے پڑھنا سیکھتا ہے۔

طریق کہانی یا طریق بیکن یہ محسوس کیا گیا۔ کہ بچہ کہانی کو پسند کرتا ہے۔ اس لئے شروع میں بچہ کو کہانیاں سُنائی گئیں۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ جس بچے کو بات چیت کرنی آجائے۔ وہ پڑھنا جلدی سیکھتا ہے۔ اس لئے پہلے ایک دو ماہ بچوں کو کہانی سُنانے۔ اور بات چیت کرنے میں صرف کئے۔ پھر کہانی کی مدد سے فقرے اور الفاظ سکھلائے گئے۔ پھر الفاظ کی مشترکہ آواز اور کہانی کی مدد سے حرف کا تصور دلاکر حروف سکھلائے گئے۔ اور بعد میں اعراب و حروف کو ملاکر پڑھنا سکھایا گیا۔ یہ طریق بیکن کہلایا۔ لکھنا پڑھنا ساتھ ساتھ سکھایا گیا تاکہ تصور گہرا ہو۔

پروجیکٹ میتھڈ یہ مشاہدہ کیا گیا۔ کہ بچہ عملی کام کو پسند کرتا ہے۔ اس لئے بجائے زبانی کہانی سُنانے کے عملی طور پر کہانی سمجھائی گئی۔ ایک لڑکے کو کوا بنا کر گھڑا رکھ اس میں کنکر ڈلواکر طلبا کو کہانی کا تصور دلایا۔ پھر کہانی سنائی گئی۔ اس طرح عملی کام کی مدد سے پڑھنا سکھایا گیا جس سے بچے کو اور بھی دلچسپی ہوئی۔ طلبا نے کھیل کو اپنا مقصد قرار دیا۔ اور اس منشا کو سامنے رکھ کر خوشی خوشی پڑھنا لکھنا سب کچھ

سیکھنا شروع کیا۔ اس طریق کا نام پروجیکٹ میتھڈ رکھا گیا۔

کنڈر گارٹن میتھڈ فروبل صاحب نے محسوس کیا۔ کہ محض لکھنا پڑھنا تعلیم نہیں ہے۔ بلکہ لکھنا پڑھنا تو بعد میں بھی آسکتا ہے۔ اصل تعلیم اور ہے۔ اور بچہ اس تعلیم کو خود بخود حاصل کرتا رہتا ہے۔ ایک ان پڑھ بچے اور ان پڑھ نوجوان کی معلومات میں فرق ہے۔ اس لئے یہ سوچا۔ کہ چھوٹی عمر میں طلبا پڑھنے لکھنے سے کتراتے ہیں۔ اس لئے پڑھنا لکھنا مناسب وقت پر سکھایا جائے۔ شروع میں طلبا کی معلومات میں اس طرح اضافہ کیا جائے۔ کہ وہ خوشی خوشی علم حاصل کریں۔ چنانچہ طلبا کی حرکات وسکنات کا مشاہدہ کیا۔ اور دیکھا بچے مٹی کی چیزیں بناتے ہیں۔ انہیں توڑتے پھوڑتے ہیں۔ اینٹیں کھڑی کر کے اُس کی عمارت بناتے ہیں۔ سرکنڈے اور تیلیوں کو جوڑ کر طرح طرح کی چیزیں بناتے ہیں۔ طلباء گانے کو پسند کرتے ہیں۔ ایسا کرنے سے اُن کے ہاتھ اور آنکھ کی تربیت ہوتی ہے۔ اس لئے فروبل صاحب نے تحفے اور مشغلے بنائے۔ مٹی۔ کاغذ اور رنگے کے ذریعہ طلبا قسم قسم کی اشیا بناتے ہیں۔ تحفوں کی مدد سے جوڑ جوڑ کر نئی نئی اشیا بناتے ہیں۔ اس طرح طلبا میں غور و خوض کرنے اور ایجاد کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ اُن کے ہاتھ اور آنکھ کی تربیت ہوتی ہے۔ چنانچہ تین برس سے سات برس کی عمر کے بچے اسی قسم کے سکولوں میں پڑھتے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ گاتے بھی جاتے ہیں۔ یہ نہایت دلچسپ بات تھی۔ ہمارے سکولوں میں جاری ہو کر بند ہو گئی ضرورت ہے کہ پھر سے جاری ہو۔

مونٹی سوری میتھڈ صرف لکھنا پڑھنا تعلیم نہیں۔ بلکہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے حواس کی تربیت ضروری ہے جو اس علم کے دروازے ہیں۔ مکان میں گھسنے کے لئے دروازہ کا صاف ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح علم کے اندر داخل ہونے کے لئے حواسوں کا تربیت یافتہ ہونا ضروری ہے۔ پس تعلیم کا ایسا طریق جاری کیا جائے۔ جس میں طلبا دلچسپی لیں اور جس سے حواس کی تربیت بخوبی ہو۔ مثلاً مختلف قد کی تیلیاں اور مکعب گوے رکھ کر نظر سے اُن کا بڑا چھوٹا معلوم کرنا۔ دیا سلائی کے بکسوں میں مختلف اوزان رکھ کر ہاتھ سے اندازہ کرنا۔ مختلف رنگوں میں تمیز۔ مختلف بوتلوں میں پانی بھر کر اس میں مختلف مقدار کی کھانڈ یا نمک ڈال کر کمی و بیشی میں تمیز کرانا۔ آواز کی شناخت۔ نیز یہ معلوم کرنا کہ یہ آواز کس کی ہے۔ کدھر سے آ رہی ہے کس قسم کی ہے۔ وغیرہ اسی طرح ناک آنکھ کان زبان ہاتھ۔ حسِ عصبی کی تربیت کرانا۔ تعلیم کا بڑا ضروری حصہ ہے۔ مختلف طریق سے اشیا کی شناخت مثلاً سونف کو سونگھ کر دیکھ کر۔ چھو کر اوپر سے ڈال کر آواز کی مدد سے۔ اُس کا ذائقہ چکھ کر سونف کی شناخت کرنا۔ فاصلوں کا اندازہ کرنا وغیرہ غرضیکہ اس طرح مشق کرائی جائے کہ طلبا کے حواس کی تربیت ہوتی چلی جائے۔ اس طرح تعلیم بہ آسانی اور دلچسپی کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس طریق کا نام مونیٹسوری میتھڈ ہے۔

جماعتی تعلیم پہلے ہر ایک طالب علم کو الگ الگ تعلیم دی جاتی تھی۔ اس طرح مدرس کا بہت سا وقت خرچ

ہوتا تھا۔ اور طلباء کا ہرج بھی ہوتا تھا۔ یہ محسوس کیا گیا۔ کہ طلبا مل جل کر کام کرنے سے خوش ہوتے ہیں۔ اس لئے ہم لیاقت طلبا کے گروہ بنا کر تعلیم دینے کا سسٹم رائج کیا گیا۔ یہ طریقہ جماعتی تعلیم اور اجماعی تعلیم کہلایا۔

بٹالوبہ میتھڈ یہ محسوس کیا گیا کہ طلبا کا ذہن مختلف اور قابلیت مختلف ہے۔ اس لئے سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکنا درست نہیں۔ اس لئے جماعت کے طلبا کو ذہن کے لحاظ سے تقسیم کر لیا۔ ایک جماعت میں ذہین درمیانے اور کمزور طلبا کے گروہ بنائے گئے۔ اور سب کو حسب لیاقت تعلیم دی گئی۔ اس طرح کمزور طلبا کے دماغ میں وہ بات ڈالنے کی کوشش نہیں کی جاتی......... جسے وہ نہیں سمجھ سکتے۔ اور ہوشیار و ذہین طلبا دقیق باتوں سے محروم نہیں رہتے ہیں۔ اس طریق کا نام بٹالوبہ میتھڈ ہوا۔

ڈالٹن پلین یہ مشاہدہ کیا گیا کہ جس طرح تمام اشخاص کو ایک ہی وقت ایک مقدار میں ایک قسم کی غذا کھانے کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح تمام طلبا کو ایک ہی قسم کی تعلیم ایک ہی وقت میں ایک ہی مقدار میں دینا مشکل ہے۔ اس لئے یہ طریقہ ایجاد ہوا۔ کہ مختلف مضامین کے لحاظ سے طلبا کے کمرے ہوں۔ ہر ایک طالب علم کا نصاب مقرر کر دیا۔ اور وہ خود اپنی کوشش سے اُسے ختم کرے۔ مشکلات اُستاد حل کریں۔ کمرے میں لائبریری ہو۔ اور اُس مضمون کی مختلف کتب ہوں جس کا وہ کمرہ ہے۔ اس طریق کا نام ڈالٹن پلین یا اسائن منٹ سسٹم ہے۔ اس طریق سے ذہین طلبا کو خوب فائدہ ہوتا ہے۔ اور کمزور طلبا بیکار بیٹھے استاد کے مُنہ کو نہیں تکتے۔

پروجیکٹ سسٹم ان تمام طریقوں میں طلبا کا نصاب محکمہ تجویز کرتا ہے۔ مدرس محکمہ کی پیروی کرتا اور طلبا سے کام لیتا ہے۔ یہ طلباء کا مقصد نہیں ہوتا۔ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ طلباء خود بخود دل کر کھیلتے ہیں۔ اور جب رکاوٹ ہوتی ہے تو خود ہی سزا جزا دے لیتے ہیں۔ اس طرح اُن کو حسب مرضی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ پس یہ طریق سوچا گیا۔ کہ طلبا حسب مرضی لوہار یا بڑھئی کی نقل کر کے کام کریں یا مکان بنائیں۔ استاد رہنمائی کرے۔ خود ہی سزا جزا دیں۔ اس طرح اُن کو چٹھی لکھنے کی ضرورت ہوگی۔ حساب رکھنے کی ضرورت ہوگی۔ اشیا منگوانے کی ضرورت ہوگی۔ اور یہ معلوم کرنا چاہئیں گے کہ یہ اشیا کہاں سے سستی اور اچھی مل سکتی ہیں۔ غرضیکہ کسی امر کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے طالب علم کو پڑھنے لکھنے حساب جغرافیہ اور تاریخ کی ضرورت پڑیگی۔ اور طلبا حسب موقع حسب ضرورت سب کچھ سیکھتے جائینگے۔ اور وہ مخصوص پیشوں کو بخوبی سرانجام دینے کے قابل بنینگے۔ یہ سب کچھ ان کے دلی شوق اور آزادی کا نتیجہ ہوگا۔ یہ پروجیکٹ سسٹم یا پروجیکٹ میتھڈ یعنی با مقصد کام کا طریق ہوا۔

نیچرل طریق یا قدرتی طریق تعلیم آجکل جرمنی میں سکول اور کالجوں کو قید خانہ سمجھتے ہیں۔ نوجوان

طلبا ننگے پیر اور ننگے سر بسر کرتے ہیں ۔ زمین پر سوتے ہیں ۔ قدرت کا مشاہدہ کرتے ہیں ۔ اور براہ راست قدرت سے حسب ضرورت تعلیم حاصل کرتے ہیں ۔ غرضیکہ مغربی دُنیا میں ایک عظیم تغیر و تبدل ظہور میں آرہا ہے مسٹر فورڈ نے تیس کروڑ روپیہ نوجوانوں کی تحریک چلانے کے لئے وقف کیا ہے ۔ اور ایک ہزار ایکڑ زمین حاصل کر کے اس میں ہل چلانا ۔ گھریلو دستکاری سکھانا جاری کیا ہے ۔ جس کو سیکھ کر نوجوان اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں ۔ سادہ زندگی بسر کریں ۔ غرضیکہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے ۔ جوں جوں ہم طلبا کی حرکات سکنات کا مشاہدہ کرتے ہیں اُن کے حل کرنے کے لئے نئے نئے طریقے سوچتے ہیں ۔ نئے نئے تجربے کرتے ہیں ۔ اسی طرح طریق تعلیم میں ترقی ہوتی چلی جارہی ہے اور چلی جائیگی ۔ بہترین سے بہترین طریق تعلیم دینے کے لئے نکلینگے ۔ لیکن جو لوگ اپنے دل و دماغ کو تالے لگا کر بیٹھ جاتے ہیں ۔ کھڑے پانی کی طرح اُن کا دماغ خراب ہو جاتا ہے ۔ اور کوئی ترقی نہیں کر سکتے ۔ ؎

رُکاؤ خوب نہیں طبع کی روانی میں
کہ بُو فساد کی آتی ہے بندپانی میں

بہاری لال ٹیچر نارمل سکول حصار

پنجاب میں سنہ ۲۹-۱۹۲۸ء میں تعلیم کی حالت

قسم درسگاہ	تعداد درسگاہ مردانہ	اوسط خرچ فی طالب علم	تعداد درسگاہ زنانہ	اوسط خرچ فی طالب علم
		روپے آنے پائی		روپے آنے پائی
آرٹ کالج	۳۲	۱۸۸-۲-۹	۲	۵۵۸-۱۰-۱۱
مختلف پیشے کے کالج	۸	۶۶۲-۹-۰	۱	۶۰۳-۵-۹
ہائی سکولز	۳۱۵	۴۶-۵-۸	۳۲	۷۹-۱۰-۱
مڈل سکولز	۳۰۴۸	۱۴-۸-۱۰	۱۰۰	۲۶-۳-۵
پرائمری سکولز	۵۵۲۰	۹-۱۴-۳	۱۴۰۹	۱۲-۴-۸
خاص مدارس	۲۲۸۸	۲۹-۱۱-۹	۶۲	۱۱۸-۷-۷
میزان	۱۱۲۱۱	۲۰-۱۱-۹	۱۶۰۶	۲۳-۷-۰

پنجاب میں یورپین و اینگلو انڈین کی تعلیم

آبادی مردانہ	فیصدی طلبا	آبادی مستورات	تعداد طلبا فیصدی	اوسط فیصدی	کل خرچ	اوسط خرچ فی طالب علم
						روپے آنے پائی
۱۸۰۷۸	۹۶۰۹	۷۶۳۶	۲۱/۱۹	۱۲/۷۳	۱۰۶۵۵۳۰	۳۳۱-۱۰-۶

نوٹ (۱) کل ۳۲۷۳ طلبا یورپین مدارس میں پڑھتے ہیں جن میں سے ۳۶۰ غیر یورپین ہیں۔

" (۲) لڑکیوں کی زیادہ تعداد کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ یورپین اصحاب عام طور پر لڑکوں کو یورپ میں تعلیم دیتے ہیں۔

قسم تعلیم	فرقے	۱۹۱۹ و ۲۰ء	۱۹۲۰ و ۲۱ء	۱۹۲۱ و ۲۲ء	۱۹۲۲ و ۲۳ء	۱۹۲۳ و ۲۴ء	۱۹۲۴ و ۲۵ء	۱۹۲۵ و ۲۶ء	۱۹۲۶ و ۲۷ء	۱۹۲۷ و ۲۸ء	۱۹۲۸ و ۲۹ء	
پرائمری — مرد	ہندو (اعلیٰ ذات)	۱۲۶۵۳۰	۱۲۳۳۹۱	۱۳۳۶۰۳	۱۶۵۰۹۲	۱۷۲۹۵۸	۱۸۱۶۶۰	۲۰۳۹۴۱	۲۲۷۳۴۱			
	مسلمان	۱۳۶۰۲۳	۱۲۷۵۸۸	۱۷۴۳۹۳	۲۴۶۸۱۲	۲۵۶۸۱۸	۲۸۷۱۶۷	۳۳۱۶۹۰	۳۸۰۲۹۶			
	سکھ	۳۲۲۱۵	۴۷۵۲۲	۵۲۹۵۲	۶۱۱۸۶	۶۳۷۷۳	۶۶۹۶۹	۷۷۸۱۵	۸۹۸۲۴			
	اچھوت	۲۰۳۵	۱۹۳۲	۳۲۵۲	۶۲۵۱	۸۱۲۷	۸۶۹۴	۱۳۲۷۸	۱۳۲۸۶			
	دیگر اقوام	۵۶۸۵	۷۰۴۳	۵۹۹۴	۷۸۴۳	۸۷۰۸	۹۴۱۸	۱۱۰۰۴	۱۱۷۶۷			
پرائمری — عورتیں	ہندو (اعلیٰ ذات)	۳۰۴۴۲	۳۱۸۱۱	۳۲۳۵۵	۳۲۴۹۲	۳۳۲۱۰	۳۴۰۲۷	۳۶۵۷۵	۳۰۳۹۲			
	مسلمان	۱۵۱۵۴	۱۴۸۱۲	۱۵۰۱۱	۱۶۱۱۵	۱۶۰۵۲	۱۶۲۴۴	۱۹۲۳۸	۲۲۳۴۵			
	سکھ	۹۲۸۶	۹۲۹۰	۴۱۳۹	۹۳۱۱	۹۳۷۳	۹۳۷۰	۱۰۹۰۷	۱۲۳۳۷			
	اچھوت	۱۳۱	۷۰	۱۷۴	۳۳۸	۳۸۴	۴۸۱	۸۵۴	۳۹۸			
	دیگر اقوام	۲۸۲۷	۲۹۴۴	۲۹۹۷	۳۶۰۱	۲۹۳۶	۳۰۵۷	۳۷۸۵	۳۳۵۴			
مڈل و ثانوی — مرد	ہندو	۴۰۰۲۶	۴۴۵۵۲	۴۷۹۴۲	۵۲۰۲۵	۵۸۵۴۶	۶۲۴۱۷	۶۶۳۴۶	۷۰۷۳۹			
	مسلمان	۲۵۸۴۴	۲۸۹۸۵	۳۲۱۷۵	۳۶۵۲۰	۴۲۱۶۱	۴۸۸۲۱	۵۴۸۵۳	۹۱۶۴۲			
	سکھ	۱۳۴۶۳	۱۵۵۴۰	۱۷۶۸۰	۱۹۷۸۳	۲۱۹۴۸	۲۳۹۴۲	۲۶۴۱۹	۲۷۷۳۲			
	اچھوت	۹۷	۱۰۹	۱۵۶	۲۷۹	۴۴۹	۵۶۷	۷۴۹	۱۰۲۲			
	دیگر اقوام	۱۳۰۵	۱۳۵۷	۱۵۰۸	۱۶۵۵	۱۶۶۴	۱۷۸۶	۱۸۸۹	۱۷۷۰			
مڈل و ثانوی — عورتیں	ہندو	۷۳۹	۸۱۸	۷۸۰	۷۶۴	۹۱۸	۹۳۹	۱۱۰۱	۱۲۵۹			
	مسلمان	۲۷۵	۲۶۲	۳۳۳	۳۸۲	۳۹۶	۴۴۳	۴۷۸	۵۴۰			
	سکھ	۲۴۹	۲۵۳	۲۲۲	۲۹۰	۳۰۲	۲۸۷	۳۵۱	۴۲۰			
	اچھوت	۰	۲	۰	۱۳	۰	۰	۱۴	۲			
	دیگر اقوام	۹۳۴	۸۸۵	۸۶۱	۷۲۲	۹۲۹	۷۷۱	۹۸۰	۱۰۶۶			
اعلیٰ تعلیم مع مشرقی علوم — مرد	ہندو	۲۸۷۰	۲۷۲۰	۲۷۷۲	۲۹۷۷	۳۲۴۲	۳۶۴۶	۳۹۸۶	۴۲۰۵			
	مسلمان	۹۲۶	۹۰۸	۹۸۲	۱۰۸۳	۱۲۶۸	۱۵۳۲	۱۷۸۸	۱۸۹۵			
	سکھ	۶۹۷	۵۶۲	۶۳۰	۷۱۱	۹۳۴	۱۰۲۶	۱۲۶۵	۱۳۰۷			
	اچھوت	۰	۰	۰	۰	۱	۰	۰	۰			
	دیگر اقوام	۷۲	۷۶	۸۸	۸۴	۸۲	۹۴	۱۲۶	۱۶۹			
اعلیٰ تعلیم مع مشرقی علوم — عورتیں	ہندو	۱۴	۱۱	۱۲	۱۶	۲۱	۲۲	۲۱	۳۳			
	مسلمان	۱	۱	۱	۱	۰	۱	۸	۱۲			
	سکھ	۱	۰	۲	۴	۹	۹	۹	۷			
	اچھوت	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰			
	دیگر اقوام	۲۲	۲۱	۲۱	۱۷	۱۹	۲۷	۲۳	۲۵			

"اُردو انشا پردازی کی تعلیم و تدریس"

(از ابو الظفر جناب قاضی فتح محمد صاحب فاتح منشی فاضل (میٹرک) ایس وی)

زبان اور اس کی انشا پردازی کی قدر و قیمت

زبان کی انتہائی رسائی اور اسکے دامن وسیع کی بے پناہی مسلم ہے۔ اور اسکے عروج وارتقا سے اقوام و امم کی قدر و منزلت معظم۔ اسکے وجود و عدم میں ملل عالم کی حیات و ممات کا راز مستتر ہے۔ اور اسکے فروغ و کمال میں فضل و کمال گیتی کا ارتقا و اعلا مضمر۔ اسے اپنا سکہ چلانے کیلئے نہ دلب سلطانی سے دریوزگی کی احتیاج ہے۔ اور نہ لوہا منوانے کیلئے قوار و قربانی سے استعانت کی پروا۔ اسکی کمال کی رسائی اور بلند نگاہی فاتحانِ عالم کیلئے باعث حیرت ہے۔ اور اسکی تسخیر کشور کشایانِ گیتی کیلئے عبرت اندوز۔ یہ بیک جنبش وہاں اڑکر پہنچتی ہے۔ جہاں پرطائرِ اندیشہ پر نہیں مار سکتا۔ یہ اپنی تدریج و توسیع کی راہیں خود بخود پیدا کر لیتی ہے اور راہ کی دشواریاں آسانی آسان کر لیتی ہے۔ اسکی ضیا پاشیاں کبھی مہر منیر کی چمک اور اسکی جلوہ ریزیاں کبھی ماہ مبین کی دمک بنکر چشم حیرت کو پیام خیرگی دیتی ہیں۔ اگر زبان اور عبارت سے مضغۂ گوشت سے جسم انسانی کی جان ہو اور بولی ملک و مملکت کی روح رواں تو بلا شبہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زبان کی جان جان یا [illegible]

وہ قومیں جو مدنیت و مدنیہ اور عرصۂ ہائے دراز تک کوس لمن الملک بجا چکی ہیں۔ یا جنہوں نے بسیط ارض و ربع مسکوں پر بادل کی طرح محیط ہو کر اپنی سطوت و جلالت کا لوہا منوایا ہے اور شہنشاہانِ من سے باج و خراج خزانہ مدینت فراہم کیا ہے وہ یک قلم حرف غلط کی طرح لوح دہر سے مٹادی گئیں جنکی زبان اور انشا علمی افلاس و علمی فلاکت سے مملو و مشحون تھی۔ برعکس اسکے وہ اُمتیں جنکا دائرۂ اثر و اقتدار تنگ اور پائے عزو اشتہار تو لنگ رہا ہے۔ مگر انکی زبان کی فصاحت آشامی اور انشا کی بلاغت انتسابی مقبول خاص و عام ہوئی۔ اور انکا قلمی سکہ انہیں دنیائے ادب میں زندہ جاوید بنا سکا۔ ع ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما۔

کسی زبان کا علمی وقار اور عملی معیار معلوم و متعین کرنے کیلئے اسکی انشا پردازی کو محک حقیقت پر گھسنے سے آشکارا ہوتا ہے۔ اور اسی عمل سے اس زبان کی کیف و کمیت کا راز افشا ہوتا ہے۔ اگر زبان عارض ہے۔ تو انشا اس کا غازہ۔ اگر وہ سونا ہے تو یہ سہاگہ۔ اگر زبان دریا ہے۔ تو انشا اسکی روانی اگر وہ جلوہ ہے تو یہ اسکی درخشانی۔ بہر حال اس ازلی مناسبت کی تشریح میں تشبیہات و استعارات کی قید و بند سے نکل کر ہم یہ کہتے ہیں کہ جیسا کہ کسی زبان کی شستگی۔ پختگی۔ شیرینی۔ دل نشینی۔ گراں مائگی۔ پر مائگی۔ سلاست۔ فصاحت۔ لطافت۔ بلاغت۔ وسعت۔ رفعت۔ نثر و نظم۔ قدامت اور کرامت کی حقیقی آئینہ دار بلکہ سرمایہ دار اسکی انشا پردازی ہے۔ اور انشا پردازی کی تربیت سے زبان کمال کے منتہا درجہ پر پہنچ سکتی ہے

موجودہ دورِ ترقیات میں بھی صرف وہی اقوام سرمایہ دار فضل و کمال محسوب ہوتی ہیں۔ جنکی زبان ساطع اور انشا قاطع ہے یہی راز اروی کے تقاضا سے بیدار قومیں اپنی زبان کو پختہ سے پختہ تر اور خام سے پختہ بنانے میں شبانہ روز کی عرق ریز محنتیں اٹھا رہی ہیں۔ اور مختلف ذرائع سے اپنی زبان کی اثر اندازی منوا رہی ہیں۔ زبان اردو اور اسکی انشا پردازی کی تاریخی حیثیت اور انکی اشتراکیت محتاج شرح و بسط نہیں۔ اس ملکی عالمگیر زبان نے مدت قلیل میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ جسکی نظیر ملنا گو نہ مشکل ہے۔ ابھی کل کی بات ہے

کہ پیروانِ زبانِ اردو اور بہی کوشانِ انشائے اردو اسکی علمی بے مائیگی پر متاسف تھے اور آج اسکی ترقی یافتہ نرالعزیزی پر سرتسلیمِ خم نظر آتے ہیں

اُردو کا موجودہ معیار دنیائے ادب میں اردو کو جس سطحِ ارفع پر لایا جا رہا ہی - اور اسے اطرافِ عالم میں قبولیت کا موقعہ دلایا جا رہا ہی - اسمیں محکمہ تعلیم کی مساعیٔ بلیغ کے علاوہ علمی انجمنیں - رسائل کی سالقت، وداعہ جد وجہد مستحق مبارکباد ہیں اردو صحائف و جرائد کی روزافزوں فراوانی اور مضامین گوناگوں کی ارزانی نے ثابت کر دیا ہی کہ اردو کی رفتارِ ترقی بیحد امید افزا بلکہ تعجب انگیز ہے اور اسکا خوش آئند مستقبل ملک کے لئے باعثِ خیر و برکت ثابت ہوگا - اگر چندے اسی نہج پر محکمہ تعلیم کا دستِ شفقت اسکے سر پر رہا - تو اسے بہت جلد قدیم زبانوں میں امتیازی درجہ نصیب ہو جائیگا - محکمہ تعلیم نے اشاعتِ تعلیم کے باب میں گزشتہ رُبع صدی کے دوران میں جسقدر سرگرمیاں دکھائی ہیں - ان میں سے اردو کو ذریعہ تعلیم بنا کر ملکی زبان قرار دینا اردو نوازی کا کامل ثبوت ہے۔

انشاپردازی کی اصناف اور انکی تدریس کا طریق تعلیمی کائنات میں جو رتبہ اردو کو حاصل ہی - وہ سب پر عیاں ہی یعنی زبان کی حیثیت سے مروج ہونیکے علاوہ بڑی حد تک ذریعہ تعلیم بھی ہی اور ماشاء اللہ اسکی انشاپردازی بھی مکمل ہو چکی ہی - مگر انتہائی افسوس سے کہا جاتا ہی کہ مدارس میں ابھی تک اسکی تعلیم انشاپردازی کے اعتبار سے (جو عملی ترقی کا پہلو ہی) اصلاح کی محتاج ہی اور کارکنانِ اردو کی بیش از پیش توجہ مبذول کئے جانے کی دست نگر - اس اجمال کی تفصیل رقم کرنا ایک مصیبت کا سامنا کرنا ہی اور اسکی تشریح لکھنا طول کا موجب ہے اسلئے مختصراً کہا جا سکتا ہی - کہ انشاپردازی کے دونوں پہلو تقریری اور تحریری تشنۂ تکمیل ہیں اور مدرسینِ اردو کی مزید توجہ کے منتظر اسلئے مناسب ہے

کسی زبان کی انشاپردازی کی داغ بیل سوقت تک منڈھے نہیں چڑھ سکتی جبتک اُسے اصل زبان کی تعلیم سے مرتبط نہ کیا جائے یا اس زبان کی انشا سکھانے والے اساتذہ گہری دلچسپی رکھنے والے نہوں - یا اسکی ترویج کے اسباب نادر ہوں - لیکن یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہی کہ ترویج کی راہیں بھی کشادہ ہیں اور اساتذہ کی جماعت ٹرینڈ ہونیکی حیثیت سے اردو کی علمبردارانہ خدمتگذار موجود ہی - اگر کوئی کمی زبان کی انشاپردازی کو نامکمل بنا دینے کا باعث بنی ہوئی ہی تو وہ اول الذکر ہی یعنی زبان کو انشا سے منفک رکھکر خشک طریقہ سے پڑھایا جاتا ہی جسے بعض سہل انگار و تغافل شعار اساتذہ کی کور سوادی پر محمول کرنا بجا ہی - کیونکہ اگر زبان کو انشا سے مرتبط و متحد کر کے پڑھایا جائے - اور اسے الگ مضمون نہ سمجھا جائے - تو انشاپردازی (مدارس میں) بہترین منصب حاصل کر سکتی ہی اور ناظمینِ تعلیم کی سرگرمیاں حقیقت آشنا ہو سکتی ہیں - جب انشاپردازی عبارت سے اظہارِ خیالات و زورِ بیان ہی تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ زبان سے ان مطالب کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کی جائے - زبان اور وہ زبان جو ذریعہ درس و تدریس ہے اس نمط سے پڑھائی جائے جس سے اسکی انشا کی تربیت ہی نہ ہوتی رہے بلکہ وہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔

تقریری انشاپردازی اردو کی تقریری انشاپردازی باآسانی بہترین صورت اختیار کر سکتی ہی - کیونکہ اس سے ہمیں اور زبانوں کی نسبت زیادہ سابقہ رہتا ہی - پنجم جماعت تک پہنچتے پہنچتے لڑکوں میں اردو فقرے بولنے اور گفتگو کرنے کی مبتدیانہ استعداد پیدا ہو جاتی ہی - اگر پنجم اور ششم جماعتوں میں تقریری انشاپردازی کی مشق زیادہ کرائی جائے - تو بیحد مفید ہی کیونکہ تقریری انشاپردازی پر تحریری انشاپردازی کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔

اوائل میں مجوزہ سکیم کے مطابق گاہی ماہی اشیاء کے اسباق یا تعریفیہ مضامین یا گفتگو کے طریقہ پر انشاپردازی کی تمہید رکھنی چاہی۔

اور کتابی مضامین کی ترادف متضاد مطلب بیانی وقصہ کہانی کا اختصار وغیرہ پر زور دینا چاہئے۔ تقریری انشاپردازی کی سکیم مڈل کی جماعتوں میں انگریزی کی تحریری انشاپردازی کی سکیم سے مربوط ہونی چاہئے۔ تاکہ بچوں کیلئے آسانیاں پیدا ہوجائیں۔ گو ان جماعتوں میں انگریزی اور اردو کی انشاآموزی کا نصب العین متفاوت ہوتا ہے یعنی انگریزی کا مدعا زیادہ تر ذخیرۂ الفاظ بڑھانا ہوتا ہے اور اردو کا اظہار خیالات و ترتیب فقرات وغیرہ۔ مگر جسقدر زبانوں کا ارتباط روا رکھا جائیگا۔ اسی قدر زیادہ موثر و مفید ہوگا۔

مڈل کی جماعتوں میں اردو کی انشاپردازی (تقریری) کی عمارت محض سوالات پر کھڑی کرنی چاہئے۔ کیونکہ بچے باوصف خواص حقائق سے آگاہ ہونے کے اظہار خیالات کی قدرت سے معرا ہوتے ہیں اسلئے سوالات کی خوبی ان کیلئے خضر راہ کا کام دیگی انہیں جوابات دینے میں دلیری ہوگی۔ اور یہی انشاپردازی ہے سوالات میں جامعیت کا خیال رکھنا مقدم سمجھا جائے مثلاً عمارت مدرسہ پر تقریری انشاپردازی کراتے وقت مندرجہ ذیل سوالات حاصل مضمون ہیں:-

(۱) عمارت کس جگہ واقع ہے؟ (۲) اسکی ساخت کیسی ہے؟ (۳) اسکا نظارہ کیا ہے؟ (۴) کمروں کی ترتیب کیسی ہے؟
(۵) ہوا اور روشنی کی تقسیم کیونکر ہے؟ (۶) کنواں کس سمت واقع ہے؟ (۷) باغیچہ کی حالت کیا ہے؟ (۸) کھیل کے میدان کی نسبت کیا خبر ہے؟
(۹) عمارت کی بست کشاد کا اہتمام کیا ہے؟ (۱۰) کتنی جماعتوں پر منقسم ہے؟ (۱۱) تعداد اطفال کیا ہے؟ (۱۲) استاد کتنے ہیں وغیرہ وغیرہ

ان کے جوابات کو اسی ترتیب سے جمع کیا جائے۔ تو تحریری مضمون بھی مکمل ہوسکتا ہے۔

زبانی اسباق کی صورت میں پیش پا افتادہ مضامین پر اظہار خیالات کرایا جائے۔ جو فوراً تصور یا نظر کے سامنے آجائیں۔ فقرات مختلف اطفال سے مرتب کرائے جائیں۔ ترتیب و اسلوب کا خاص خیال رکھا جائے۔ جب فقرے بنانے کی اہلیت بچوں میں پیدا ہوجائے تو انہیں ترتیب و تربیط کی طرف مائل کیا جائے۔ بلکہ یہ انکی مشق کے ساتھ ساتھ آسان ہوتا جائیگا۔ دوران گفتگو میں کشادہ دلی کا برتاؤ کرنا چاہئے تحسین و آفرین میں بخل روا نہ رکھا جائے۔ جو انشاپردازی کی ترقی کی سب سے بڑی محرک ہے انشاپردازی کی مقبولیت کا اصل الاصول سلاست ہے۔ اور اسی تقریری انشاپردازی میں ہمیشہ نصب العین بنانا چاہئے۔ کوئی بات یا جملہ جب ہی موثر ہوسکتا ہے جبکہ وہ کان کی راہ دل میں اتر جائے اور اگر اُسے کان سے دماغ کی طرف صعود کرنے کی فرصت درکار ہو تو اسکی اثرپذیری معلوم۔ بقول حضرت اکبر ؎

ایسا کہئے کہ بیٹھ جائے دل میں ایسا سنئے کہ کہنے والا اُبھرے!

ہائی کلاسوں میں مسلسل تقاریر کی مشق کرانی چاہئے۔ پہلے اطفال کو سوچنے کا موقعہ دینا چاہئے۔ پھر بیان کرنے کا۔ بغیر غور و خوض کے خیالات کا ظاہر کرنا آسان امر نہیں ہوتا۔ ادبی مجالس کا انعقاد۔ اور انجمن انشاپردازی کے تقریری پہلو کو تقویت دینا مفید نتائج پیدا کرتا ہے۔ اور اصل میں اردو زبان کی حقیقی خدمت بھی یہی ہے کہ بچوں کو قوت گویائی میں زیادہ روانی دبدبہ گوئی پیدا کیجائے۔ ورنہ انکا فارغ التحصیل ہونیکے بعد صمٌ بکمٌ رہنا بیحد افسوسناک تذکرہ ہے۔ قوت بیانیہ کی تربیت بیحد ضروری ہے جسے مدرسین نے گلدستۂ طاق فراموشی بنا رکھا ہے!

انشاءاللہ تحریری انشاپردازی پر پھر کبھی عرض کرونگا +

ماسٹر جگت سنگھ

مینجنگ پروپرائٹر رسالہ ہذا

لالہ آگیا رام صاحب سچدیو منشی فاضل

یادِ صُبح

(از جناب سید مظفر حسن صاحب رضوی)

یاد ایامِ صبحِ نورانی — اب نہ تُو ہے نہ وہ درخشانی
سچ بتا کیوں چھپا لیا منہ کو — اے مری صبح کی درخشانی
نہیں آتا نظر کئی دن سے — کیوں نہ ہو رنج میں فراوانی
پھول کملا کے رہ گئے ہیں تمام — سُرخ رنگت ہوئی ہے اب دھانی
اے للہ مری پیاری صبح — پھر دکھا اپنا روئے نورانی
کیا کہوں کیا ہے حال دل میرا — کیا کہوں کس قدر ہے حیرانی
شوقِ دیدار جب بڑھا حد سے — بحرِ حسرت میں آئی طغیانی
کیا ہوا تیرا جلوۂ زیبا — کیا ہوا تیرا حسنِ لاثانی
وہ ترا حُسن دیکھ کر جس کو — ہو جاتا تھا آئینہ پانی
چھُوٹ کر تجھ سے طائرانِ چمن — نہیں کرتے ہیں اب غزلخوانی
مِٹ گئے وہ خوشی کے سب آثار — چھا گئی اک جہاں میں ویرانی
دلِ بے تاب مضمحل ہے بہت — کچھ ہے تشویش کچھ پریشانی
سُن لیں یہ نکتہ صاحبانِ فہم — ہو سمجھنے میں تاکہ آسانی

چھیڑو ناصرؔ نہ داستانِ فراق
قصۂ غم بہت ہے طُولانی

تصویر پر نظم

تجھ کو زیبا تھا کہ ہوتی ساقی ساغر بدست
دیکھتا ہوں کیوں تجھے اے نازنیں خنجر بدست

اس قدر بھڑکا دیا کیا دل کی آہوں نے تجھے
یا نگاہ بد سے دیکھا بدنگاہوں نے تجھے

کس مصیبت میں تجھے خونریز ہو جانا پڑا
کیوں تجھے اے نازنیں چنگیز ہو جانا پڑا

یہ غضب یہ قہر یہ غصہ یہ ہیبت یہ جلال
شیر مردوں کو ترے آگے ٹھہرنا ہے محال

صنف نازک میں یہ جرأت آج تک دیکھی نہ تھی
یہ شجاعت یہ بسالت آج تک دیکھی نہ تھی

سورماؤں میں جیالوں میں ترا چرچا ہے آج
آن پر مرمٹنے والوں میں ترا چرچا ہے آج

آدمی عزت کی خاطر شعلہ خو اتنا تو ہو
آبرو والوں کو پاس آبرو اتنا تو ہو

مشتعل چہرے سے روشن شان نسوانی تری
خون کے چھینٹوں سے رنگیں پاک دامانی تری

حسن پر غصے کی سرخی رنگ ہے تصویر میں
یا بکھیرے ہیں لعل تو نے دامن شمشیر میں

اپنی دھن میں محو ہے تو اس قدر اے مہ جبیں
ہوش کچھ سر سے دوپٹے کے سرکنے کا نہیں

تیرے تیور کہہ رہے ہیں سامنے آئے کوئی
جب یہ حالت ہو تو کیونکر تجھ کو سمجھائے کوئی

کیا خبر کس کس کی تو نے ختم کر دی زندگی
ہے تری شمشیر براں خون کی پیاسی ابھی

سنگدل اتنی نہ ہو نسوانیت اپنی نہ چھوڑ
حسن کی دیوی ہے تو معصومیت اپنی نہ چھوڑ

جوش ملسیانی

خیالاتِ قمر

(از جناب قمر [illegible])

وہ تکتے ہیں ہر سمت راہیں تمہاری — جو دیکھے ہوئے ہیں نگاہیں تمہاری

انہیں میں سما کر پہنچتے ہو دل میں — نگاہیں ہماری ہیں راہیں تمہاری

نظر میں مری کب سماتا ہے کوئی — کہ دیکھی ہیں میں نے نگاہیں تمہاری

پہنچتی ہیں یہ عرشِ اعظم سے اونچی — غضب کی ہیں اونچی نگاہیں تمہاری

وہ بے تیغ و بے تیر ہوتا ہے بسمل — بنی ہیں یہ قاتل نگاہیں تمہاری

کبھی تیر ہیں اور کبھی تیغِ قاتل — وہ سیدھی وہ ٹیڑھی نگاہیں تمہاری

خوش آئے نہ کیوں مسلکِ عشقِ وحدت — بتائی ہوئی ہیں یہ راہیں تمہاری

دو عالم کی آنکھوں کے پھرنے کا کیا غم — مگر پھر نہ جائیں نگاہیں تمہاری

قمر تم بھی الفت میں کیا دل جلے ہو

نکلتی ہیں کیوں گرم آہیں تمہاری

میکدۂ ریاض

(از جناب لسان الملک خیام العصر حضرت ریاض خیرآبادی مدظلہ)

تیسرے فاقے ہمیں دانۂ انگور سے ملے
ہم یہ سمجھے کہ بھرے ساغرِ بلّور سے ملے

کتنے کعبے ملے رستے میں کئی طور ملے
اِن مقامات سے ہم کو وہ بہت دور ملے

ایسے بھی کتنے ہیں اللہ خدا کے بندے
اس خدائی سے الگ سب بتِ مغرور ملے

نہ سہی جلوہ ترا جلوۂ محبوب سہی
یا خدا دیکھنے کو وہ رُخِ پر نُور ملے

وہ بھی بخشے گئے ہم بادہ کشوں کے ہمراہ
آج جنّت میں ہمیں ناصحِ مغفور ملے

مجھ سے کاوش تھی اُسے تیری مژہ نے ڈالے
گہرے گہرے مجھے دل میں کئی ناسُور ملے

یہ بھی قسمت نہ ملے دیر میں ناقوس کوئی
اے سرافیل تمہیں پھونکنے کو صور ملے

آئے جنّت وہیں خود جا نہ سکیں جنت میں
ایسے بھی تیری گلی میں کئی معذور ملے

خاک ہو کر نہ رہی خاک بھی ان کی باقی
خاک میں یوں جم و کے قیصر و فغفور ملے

دعوتِ شیخ بھی تھی انجمنِ ساقی میں
آ کے جنّت میں بھی کمبخت انہیں انگور ملے

عرش کو طور کو کعبے کو وہیں سے دیکھوں
دیکھنے کو مجھے وہ روضۂ پر نور ملے

آئی غربت میں اجل شام کو لے دامنِ صبح
اب کفن اور کفن کے لئے کافور ملے

تیشہ بردوش وہاں جاؤں کہ جو کہتے ہیں
کوہکن سے ہمیں اچھا کوئی مزدور ملے

عید تک راہ پر آجائیں گے ناصح رندو
رمضاں میں انہیں افشردۂ انگور ملے

دور سے دل کو تجلی تری روشن کر دے
یہ سیہ خانہ ہمیں نُور سے معمُور ملے

نام جو کچھ ہوا انہیں کہتے ہیں سب لوگ ریاضؔ
آج ہم کو وہ بڑے شاعرِ مشہور ملے

پنجاب کا تھوڑا سا علاقہ عہد نامۂ لاہور کے رو سے ۱۸۴۶ء میں سرکار انگریزی کے ماتحت آیا۔ اور ۱۸۴۹ء میں سارا صوبہ سرکاری مقبوضات میں آ گیا اس وقت اس صوبہ کا انتظام ایک بورڈ آف کنٹرول کے ماتحت تھا جسے قدرتاً ملک میں انتظام قائم کرنے اور شورو شر فرو کرنے کی طرف زیادہ متوجہ ہونا پڑا اور صوبہ کی تعلیمی حالت پر کماحقہ توجہ نہ دی جاسکی۔ اور وہ بدستور اول معبدوں کے متعلق رہی جہاں ہر قوم کا نمائندہ مذہبی تعلیم کے ساتھ کسی قدر فارسی زبان کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ البتہ پٹ شالاؤں میں ہندو یا مسلم پاندے تجارتی سہولتوں کو مدنظر رکھ کر تقریری حساب اور بہی کھاتہ رکھنے کے طریق سکھایا کرتے تھے اگرچہ جب کبھی تھوڑا ممبران بورڈ نے تعلیمی معاملات میں دلچسپی کا اظہار کیا مگر کہا جاسکتا ہے کہ ان کے انتظامی فرائض نے انہیں ۱۸۵۲ء تک بہت کم ٹھوس کام کرنے کا موقع دیا۔

مسلمانوں اور سکھوں کے راج میں فارسی سرکاری زبان تھی جو تعلیم یافتہ اشخاص اور سرکاری حکام کی زبان کہلاتی تھی جس کی تعلیم مکاتب۔ فارسی خوان مدارس اور خالص فارسی مدارس بہم پہنچایا کرتے تھے اساتذہ عام طور پر مسلمان ہوتے تھے مگر ہندو بھی پڑھا تا مل انہی سکولوں میں برغبت تمام علم حاصل کرتے تھے لکھنا سکھایا جاتا تھا اور فارسی کی مشہور کتب خاصکر گلستان بوستان پڑھائی جاتی تھیں۔ ان سکولوں کے اخراجات معبدوں کی ملحقہ اراضی کی آمدنی یا معبدوں کے دیگر ذرائع سے بہم پہنچتے تھے حکام وقت بھی سرپرستی فرماتے رہتے تھے۔

مسٹر آرنلڈ اپنی تعلیمی رپورٹ سال ۵۶ و ۶۵۷ میں ذکر کرتے ہیں کہ ایسے مکاتب کے طلبا کی تعداد ۲۴۹۶۸ تھی سال ۶۷۹ و ۸۰ کی تعلیمی رپورٹ میں ان کا اندازہ ۵۲۳۲۰۷۰ لگایا گیا ہے۔ ڈاکٹر لیٹنر یہ تعداد کم از کم ۶۰۱۶۸ بتاتے ہیں۔ سال ۸۲ و ۱۸۸۳ء کے لفٹنٹ گورنر صاحب بہادر کی رائے میں اس وقت ۱۰۹ ۱۳ مدارس اور ۱۳۲۵۸۸ طلبا زیر تعلیم تھے۔

بورڈ آف کنٹرول نے ابتدائی عملداری میں حکام ضلع اور انڈین سول سروس کے افسران سے توقع کی کہ وہ اپنے اپنے علاقہ کی تعلیمی سرپرستی کریں چونکہ ملک کے دیگر صوبجات کی نسبت پنجاب بہت دیر سے سرکاری مقبوضات میں شامل ہوا لہذا یہاں کی تعلیمی ترقی بھی ان کے مقابلہ میں دیر سے ہوئی۔

فروری ۱۸۵۳ء میں اس بورڈ کی بجائے چیف کمشنری قائم ہوئی۔ اور اس عرصہ میں تعلیم کا انچارج جوڈیشل کمشنر ہوتا تھا ضلع کے حکام ضرورت پر اسی سے تعلیمی امور میں مشورہ کرتے تھے ستمبر ۱۸۵۴ء کے بعد یہ اختیارات صاحب فنانشل کمشنر کے سپرد ہوئے چونکہ تعلیم دینے کیلئے ذریعہ تعلیم زیادہ غور طلب تھا لہذا قرار پایا کہ اردو زبان کو فارسی کا نعم البدل قرار دیا جائے۔ اگرچہ بعض مقامات

میں اردو کے ہمراہ فارسی کو بھی بدستور وقعت دی گئی تھی مگر بالآخر ۱۸۵۵ء میں اردو تمام صوبہ کی سرکاری زبان قرار پا گئی۔ اور اس کی تعلیم کے ساتھ فارسی کی تعلیم کو بھی لازمی قرار دیا گیا۔

اس وقت کے مدارس موجودہ تقسیم پر منقسم نہ تھے بلکہ ہر ضلع کے صدر مقام میں ایک اعلٰے سکول "ضلع سکول" ہوا کرتا تھا۔ جہاں دیگر مضامین کی تعلیم کے ساتھ انگریزی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ تحصیلوں کے صدر مقام کے مدارس تحصیلی مدارس کہلاتے تھے اور ابتدائی تعلیم کا کام دیتے تھے گو ان میں سے بعض مدارس میں انگریزی تعلیم بھی رائج تھی۔ سب سے پہلا گورنمنٹ سکول مسٹر ایڈورڈس سپرنٹنڈنٹ ریاستہائے کوہی نے شملہ میں یکم مارچ ۱۸۴۸ء کو کھولا۔ کرنیل ایبٹ نے اسی سال ایک سکول ہوشیارپور میں جاری کیا۔ مسٹر ایڈورڈس نے مختلف مقامات پر تیرہ ۱۳ ضلع سکول کھولے جن میں ۲۱۲ طالب علم زیر تربیت تھے امرتسر کے ڈپٹی کمشنر کی تجویز پر وہاں ایک گورنمنٹ سکول قرار پایا جس کے لئے سرکاری امداد پانچ ہزار سالانہ روا رکھی گئی۔ یہ سکول مئی ۱۸۵۱ء میں کھلا۔ راولپنڈی گجرات شاہپور ملتان جہلم اور جالندھر میں بھی ضلع سکول کھولے گئے اور سال ۱۸۵۴ء کے اختتام تک صوبہ میں کل آٹھ سرکاری سکول تھے تحصیلی سکولوں کی تعداد ۳۶ تھی جو ابتدائی سکول کہلاتے تھے۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی شمال مغربی صوبہ سے منتقل ہو کر پنجاب میں شامل ہوا۔ اس وقت تک دیسی مکتب اور پاٹھ شالائیں اپنا تعلیمی کام جاری رکھے رہیں۔ سکیم تعلیمی صوبہ شمال مغربی (حال صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ) کی رائج تھی جس کے رو سے اردو اور ہندی لکھنا پڑھنا حساب، مساحت اور جغرافیہ سکھایا جاتا تھا۔ انکے معائنہ کیلئے وزیٹر مقرر تھے اور سب سے بڑا تعلیمی افسر وزیٹر جنرل کہلاتا تھا مگر صوبہ گور کی سکیم کو پنجاب کے موافق نہ پاکر مئی ۱۸۵۴ء میں مندرجہ ذیل سکیم قرار پائی:۔

۱۔ تحصیلوں کے صدر مقامات میں پچاس سکولوں کے اجرا کی اجازت ہو اور مدرسین کی تربیت کیلئے چار نارمل سکول ہوں۔

۲۔ وزیٹر جنرل کے ساتھ ۱۲ ضلع وزیٹر اور ۵۰ پرگنہ وزیٹر مقرر ہوں۔

۳۔ لاہور میں ایک سنٹرل کالج جاری کیا جائے۔

لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ہند کیطرف سے یہ سکیم منظور ہو کر آئی اور ہدایت ہوئی کہ خزانہ عامرہ سے ایک لاکھ روپیہ تعلیمی امور پر صرف کیا جائے ایسٹ انڈیا کمپنی (جو اس وقت ہند کی حکمران تھی) کے چارٹر کی تجدید کے ساتھ ڈائرکٹران کمپنی نے "ایجوکیشن ان انڈیا" کیلئے ایک فرمان صادر کیا جسے تعلیمی میگنا چارٹا ۱۸۵۴ء کہا جاتا ہے جس کے رو سے مراعات ذیل روا رکھی گئیں:۔

۱۔ تعلیم کا علیحدہ محکمہ قائم کیا جائے۔ ۲۔ صوبہ کے صدر مقام میں یونیورسٹی بنائی جائے۔

۳۔ مدارس میں اساتذہ کی بہم رسانی کیلئے ٹریننگ انسٹی ٹیوشنز قائم کی جائیں۔

۴۔ موجودہ سرکاری کالج اور ہائی سکول قائم رہیں اور بشرط ضرورت دیگر سکول کھولے جائیں۔

۵۔ نئے مڈل سکول کھولے جائیں اور ورنیکلر مدارس یعنی مکاتب پر پوری توجہ دی جائے۔

۶۔ پرائیویٹ اصحاب کی فیاضی کی داد دیتے ہوئے جو وہ تعلیم کی اشاعت کیلئے روا رکھیں امداد کے طریق عمل رکھے جائیں۔

تعلیم کی اشاعت کے اغراض و مقاصد سابقہ ہی قائم رکھے گئے اور عوام کی تعلیم کا ذریعہ ورنیکلر قرار دیا گیا۔ اور اعلیٰ تعلیم کیلئے انگریزی کو ذریعہ تعلیم مانا گیا۔ اس سے پہلے ورنیکلر تعلیم پر کافی غور نہ ہوتا تھا مگر اینگلو ورنیکلر اور ورنیکلر مدارس اب ایک ہی لائن پر آ گئے۔ کالجوں ہائی سکولوں اور مڈل سکولوں میں وظائف دیئے جانے کا طریق عمل میں آیا۔ اور تعلیم نسواں کو بھی سرکاری تائید حاصل ہو گئی سرکاری تعلیمی اخراجات کا اندازہ تین لاکھ روپیہ سالانہ قرار دیا گیا۔

غدر کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا عہد حکومت ختم ہو جانے اور ہندوستان کے براہ راست تاج برطانیہ کے ماتحت آ جانے پر ۱۸۵۹ء میں دوسرا فرمان عطا ہوا ان دونوں فرامین اور سال ۱۸۶۶-۶۷ء کے فرامین کے بعد مفصلہ ذیل انتظامات مستقل صورت میں عمل میں آئے۔

جنوری ۱۸۵۶ء میں سررشتہ تعلیم پنجاب کا وجود قرار دیا گیا اور ایک ڈائرکٹر جنرل بمشاہرہ ۱۲ سو روپیہ ماہوار مقرر ہوا۔ افسران معائنہ کی ذیل میں دو یورپین انسپکٹر اصحاب چھ چھ سو روپیہ ماہانہ پر۔ دس ڈپٹی انسپکٹر اصحاب ۸۰ سے ۱۵۰ روپیہ ماہانہ تک۔ ۱۷ سب ڈپٹی انسپکٹر ۲۰ روپے سے ۶۰ روپے ماہوار کے مقرر ہوئے۔ ڈپٹی انسپکٹر اور سب ڈپٹی انسپکٹر بجائے ضلع وزیٹر اور پرگنہ وزیٹر کے تھے۔ چونکہ ۱۸۵۴ء کے چارٹر میں ڈائرکٹران کمپنی کی صریح ہدایت تھی کہ ڈائرکٹر جنرل اور انسپکٹر اصحاب ہمارے سول سروس کے ممبران ہوا کریں۔ لہذا مسٹر آرنلڈ اسسٹنٹ کمشنر پنجاب جنوری ۱۸۵۶ء میں صوبہ کے پہلے ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم مقرر ہوئے ہر دو یورپین انسپکٹر اصحاب شرقی اور غربی حلقہ کے انچارج قرار پائے۔ باقی عہدہ داران کیلئے صوبہ میں قابل آدمی نہ ملنے سے دیگر صوبجات سے آدمی منگائے گئے اور سررشتہ تعلیم صاحب فنانشل کمشنر کے ماتحت رہا۔ مگر غیر صوبجات کے افسران معائنہ مفید ثابت نہ ہوئے چنانچہ انہیں جواب دیا گیا گو ان میں سے بعض قابل اشخاص کی تنخواہ پر اسی جگہ رہ گئے اور اب افسران معائنہ کا نام بجائے ڈپٹی انسپکٹر و سب ڈپٹی انسپکٹر ڈسٹرکٹ محرر رکھا گیا۔ اور بعد میں ہر ضلع میں ایک قابل افسر معائنہ مقرر کیا گیا جسے ضلع کے تعلیمی فنڈ سے تنخواہ ملتی تھی اور صاحب ڈائرکٹر کو براہ راست گورنمنٹ پنجاب کے ماتحت رکھنا منظور ہوا۔

علاقہ دہلی کے پنجاب میں شامل ہونے پر ایک تیسرا یورپین انسپکٹر رکھا گیا اور سال ۱۸۶۲ء میں موجودہ سرحدی صوبہ کیلئے جو پنجاب کا ایک حصہ تھا چوتھا انسپکٹر مقرر ہوا جس کا صدر مقام ملتان ہوا سال ۱۸۶۴ء تک یہ چاروں تعلیمی حلقے بدستور کام کرتے رہے مگر اسی سال بنگال کمیشن کی سفارش پر تمام یورپین سکولوں کا چارج لاہور سرکل انسپکٹر کے ہاتھ دیا گیا اور باقی سرکلوں کو اسکے کام کا کچھ حصہ دیا گیا ۱۸۶۳-۶۴ء میں ہر سرکل کیلئے ایک ہندوستانی ڈپٹی انسپکٹر بھی مقرر ہوا۔ اور ہر ضلع میں ایک ایک چیف سکول محرر مقرر ہوا جسے ۳۰ سے ۷۰ روپے [illegible] تک ضلع کے تعلیمی فنڈ سے تنخواہ ملتی تھی۔ اگرچہ یہ مفید ملازم ثابت ہوئے مگر ایسے ذمہ داری کے عہدہ کیلئے انکی پوزیشن موزوں نہ سمجھی گئی لہذا سال ۱۸۷۰ء سے یہ افسران ڈسٹرکٹ انسپکٹر اصحاب سے جنکی تنخواہ سو روپیہ ماہوار اور اس سے زیادہ تھی تبدیل ہوئے جنہیں ۱۸۷۳-۷۴ء سے صوبہ کے تعلیمی فنڈ سے تنخواہ ملنے لگی سال ۱۸۷۶-۷۷ء تک صوبہ میں ۱۴ ڈسٹرکٹ انسپکٹر اور ایک ڈسٹرکٹ انسپکٹرس اور ۲۶ چیف سکول محرر تھے نئی سکیم کے مطابق ۲۰ ڈسٹرکٹ انسپکٹر ایک ڈسٹرکٹ انسپکٹرس اور ۱۰ چیف سکول محرر ہوئے اور انکی تنخواہوں میں ایزادی روا رکھی گئی۔

تعلیم جو آج تک مفت تھی اخراجات کی بیشی کو ملحوظ رکھتے ہوئے مفت نہ رہ سکی اور فیس کا وصول کیا جانا روا رکھا گیا۔ کاشتکار لوگ اس سے مستثنیٰ تھے کیونکہ تعلیمی اخراجات میں وہ مالگذاری کے ساتھ ایک خاص فیصدی حصہ دیا کرتے تھے۔

لہ ۱۸۵۵-۵۶ء

پرائمری تعلیم میونسپل کمیٹیوں اور لوکل باڈیز کے ماتحت ہوئی اور سیکنڈری تعلیم کے اخراجات سرکاری روپیہ سے ادا ہونے لگے مدارس کی موجودہ تقسیم ہائی، مڈل و پرائمری سال سنہ ۶۸ و ۱۸۶۹ء سے قائم ہوئی ابتدائی سکولوں میں جماعتوں کی تعداد آٹھ سے گھٹا کر چار کر دی گئی۔ اور سنہ ۷۰ و ۱۸۶۹ء سے ابجد خوانان۔ لوئر پرائمری اور اپر پرائمری کے معیار کی کامیابی لازمی قرار دی گئی۔ ان گیارہ سال کے عرصہ میں خاصی ترقی ہوئی سنہ ۱۸۶۶ء میں گورنمنٹ پرائمری سکولوں کی تعداد ۱۴۰۳ اور زیر تربیت طلبا کی تعداد ۹۷،۱۹۵ تھی! مدادی سکولوں کی تعداد ۱۲۶ اور تعداد طلبا ۹۷،۴۲ تھی۔ یونیورسٹی صوبہ میں نہ ہونے کی وجہ سے طلبا انٹرنس کا امتحان کلکتہ یونیورسٹی کا دیتے تھے۔ اور اعلےٰ امتحانات بھی وہیں دیتے تھے۔

سال سنہ ۸۳ و ۱۸۸۴ء میں ۲۰۳۰ امیدواران نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا سکولوں کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس کا طریق بھی سال سنہ ۶۹ و ۱۸۷۰ء سے عمل میں آیا یکم جنوری سنہ ۱۸۶۴ء سے لاہور گورنمنٹ کالج جاری ہوا جبکہ لاہور میں ایک اول درجہ کا گورنمنٹ ہائی سکول سنہ ۵۹ و ۱۸۶۰ء میں قائم ہوا تھا سنہ ۶۲ء میں بھی ایک اور کالج دہلی میں کھولا گیا مگر اُسے سنہ ۷۶ و ۱۸۷۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پیوست کر دیا گیا۔ پنجاب یونیورسٹی کالج لاہور زبان ہائے مشرقی کی تعلیم و اشاعت کیلئے سال ۶۹ و ۱۸۷۰ء میں کھولا گیا۔

ڈاکٹر لیٹنر (DR. LEITNER) گورنمنٹ کالج لاہور کے پہلے پرنسپل کی کوششوں سے ایک سوسائٹی بنام انجمن پنجاب قائم ہوئی جس نے کلکتہ یونیورسٹی کو زبانہائے مشرقی کی اشاعت کے منافی پاکر پنجاب یونیورسٹی قائم کئے جانے کی تجاویز پر زور دیا۔ صاحب ڈائرکٹر بہادر نے بھی ممبران انجمن سے اتفاق رائے کرکے انکی پُرزور تائید کی مگر وائسرائے ہند نے یونیورسٹی کے نفاذ کی بجائے پنجاب یونیورسٹی کالج کے اجرا کی اجازت دی۔ آخر ایکٹ سنہ ۱۸۸۲ء کے رو سے یونیورسٹی پنجاب قائم ہوئی جسے ورنیکل اور آرٹس ڈگریوں کے دینے کا حق حاصل ہوا نواب گورنر جنرل ہند نے قانون۔ میڈیکل۔ سائنس اور انجینئرنگ کی ڈگریاں عطا کرنے کا بھی اسے حق عطا کیا۔

نارمل سکولز۔ سال ۵۶ و ۱۸۵۷ء میں لاہور اور راولپنڈی نارمل سکول کھولے گئے۔ ایک سال بعد دہلی نارمل سکول وجود میں آیا۔ پانچ اور نارمل سکول بھی سنہ ۵۹ و ۱۸۶۰ء تک کھولے گئے مگر اخیر میں پہلے تینوں سکولوں میں پیوست کر دیئے گئے۔ کرسچن ورنیکلر تعلیمی سوسائٹی نے امرتسر میں ایک امدادی نورمل سکول کھولا ان سکولوں کا تعلیمی کورس شروع میں چھ ماہ ہوا کرتا تھا ہر دوسرے تیسرے سال بعض مدرسین کو دوبارہ بلایا جاتا تھا مگر بالآخر میعاد تعلیمی تین سال قرار دی گئی پہلے دو سال کی تعلیم کے بعد جونیئر ورنیکلر سند اور تیسرے سال کی تعلیم کے بعد سینئر ورنیکلر سند ملا کرتی تھی۔

سال ۶۹ و ۷۰ء میں مڈل سکول امتحان جاری ہوا اور مڈل پاس امیدوار نورمل سکول میں جانے لگے ان سکولوں میں تمام امیدواروں کو وظائف ملا کرتے تھے۔

سال سنہ ۸۰ و ۱۸۸۱ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور جاری ہوا جس کے پہلے پرنسپل آرڈک صاحب بہادر تھے اس کالج میں مڈل سکولوں کے ورنیکلر مضامین کیلئے ایس وی اور پرائمری و مڈل کلاسوں کی انگریزی تعلیم کیلئے جے اے وی اور ہائی کلاسوں کی تعلیم کیلئے ایس اے وی کلاسیں کھولی گئیں۔

گورنمنٹ بک ڈپو۔ کتب اور تراجم کا محکمہ سال سنہ ۱۸۵۷ء کے شروع میں قائم ہوا۔ یہ بک ڈپو صاحب ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم کے ماتحت کام کرتا تھا جسے سرکار سے دس ہزار روپیہ پیشگی ملا تھا ایک تعلیمی مطبع بھی قائم تھا جو سرکاری اخبار کی طباعت کے علاوہ ورنیکلر کتب بھی تیار کرتا تھا چند سال بعد بک ڈپو اپنے اخراجات کا خود متکفل ہو گیا اور سال ۷۶ و ۱۸۷۷ء میں نفع پر کام کرنے لگا سال سنہ ۱۸۹۷ء میں اس کی بجائے پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کا وجود ظہور میں آیا۔

اب سررشتہ تعلیم پنجاب اس قابل ہو چکا تھا کہ اپنی مساعی جمیلہ کو دیگر شعبوں میں بھی پھیلائے چنانچہ سال ۱۸۶۰ء میں میڈیکل سکول لاہور جاری ہوا اسب اسسٹنٹ سرجن اور ہسپتال اسسٹنٹ کلاسیں علے الترتیب پانچ اور تین سال انگریزی اور اردو ذریعہ تعلیم سے طبابت سے بہرہ ور ہوتی رہیں جیل سکول۔ انڈسٹریل سکول چیفس کالج وغیرہ بھی جاری ہوئے مسلمانوں اور دیگر پسماندہ اقوام کی تعلیم پر خاص توجہ ہوئی۔

انڈین ایجوکیشن کمیشن ۱۸۸۲ء کی بعض سفارشات: دیسی مکاتب اور پاٹھ شالاؤں کو برقرار رکھ کر میونسپل کمیٹیاں اور لوکل باڈیز کو نئے مدارس کھولنے کی ہدایت ہوئی۔ پرائمری تعلیم ورنیکلر میں ہی جاری قرار پائی اور سیکنڈری ایجوکیشن کے اخراجات سرکاری مصارف سے دیئے جانے لگے تعلیم نسواں پر بیش از بیش توجہ دی جائے اور ان کے مضامین بہ نسبت لڑکوں کے آسان ہوں نارمل سکول کھولے جائیں مشنریوں نے زنانہ ٹیچنگ کا جو کام جاری کیا ہوا ہے اس میں ان کی سرپرستی فرما کر معقول امداد دی جائے تعلیم نسواں کے لئے مستورات کا انتخاب بحیثیت انسپکٹرس وغیرہ مناسب خیال کیا گیا فیس میں بتدریج بیشی کی جائے محکمہ تعلیم کے افسران کی ہر سال سٹی میں ایڈیڈ اور ان ایڈیڈ سکولوں کے منیجر اصحاب کے ساتھ کانفرنس ہوا کرے ماتحت افسران معائنہ کے پراسپکٹس بہتر بنائے گئے اخلاقی اور جسمانی تعلیم پر زیادہ توجہ دی جائے چیفس مسلمانوں اور اچھوت اقوام کی تعلیم میں بیش از بیش دلچسپی لی جائے افسران معائنہ کی حالت و پراسپکٹس پر غور ہوا اور اسسٹنٹ انسپکٹر اصحاب کی تعداد سات قرار دی گئی شملہ اور کوہاٹ کے اضلاع کے بغیر باقی تمام ضلعوں میں ایک ایک ڈسٹرکٹ انسپکٹر مقرر ہوا۔

دوسرے ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم میجر فلر[۵۱] صاحب بہادر تھے ان کے جانشین کرنیل ڈبلیو آر ایم ہالرائیڈ[۵۲] صاحب بہادر کے عہد میں لاہور میں ایک مشاعرہ ہوا کرتا تھا چنانچہ مرحوم مولانا آزاد دہلوی مولانا حالی پانی پتی وغیرہ نامی شعرا کے کئی اس وقت کے کارنامے اردو کورسوں میں موجود ہیں درسی کتب نئی شکل و صورت میں شائع ہوئیں اور تعلیمی سکیم کے ساتھ ضابطہ تعلیم پنجاب کا وجود بھی عمل میں آیا۔ آپ کے بعد ڈاکٹر جے سارجنٹ[۵۳] صاحب بہادر کے عہد میں سررشتہ اور تعلیم و تعلم کا کام بتدریج ترقی پذیر رہا۔ آخر قرعہ مسٹر ڈبلیو بیل[۵۴] کے نام پڑا جنہوں نے ہر ضلع میں ایک ایک گورنمنٹ ہائی سکول نہایت وسیع پیمانے پر کھولا۔ ماتحت تعلیمی سکیم کی ترمیم کے بعد اسے نئے گریڈوں اور نئی صورت میں شائع کیا اور اب سرکاری ملازمت اس قابل ہو گئی کہ پرائیویٹ سکولوں سے بہتر سمجھی جاتی افسران معائنہ کی ذیل میں اے۔ ڈی۔ آئی اصحاب کا وجود منصہ شہود پر آیا امرتسر میں ایک نیا انسپکٹر سرکل قائم ہوا۔ جو آخر میں بند کیا گیا اور وہاں کے انسپکٹر مسٹر جے سی گاڈلے[۵۵] آپ کے جانشین قرار پائے۔ یہ بزرگوار خاموشی پسند اور کفایت شعاری کے دلدادہ تھے اس واسطے سررشتہ کے ماتحت تعلیمی حلقہ میں کوئی خاص تغیر و تبدل رونما نہ ہوا۔ آپ کی سبکدوشی پر مسٹر رچی[۵۶] سرحدی صوبہ سے تبدیل ہو کر پنجاب سررشتہ تعلیم کے ڈائرکٹر ہوئے۔ آپ کے عہد کی یادگار موجودہ چار جماعتوں کے پرائمری سکول ہیں۔ انگریزی تعلیم پانچویں جماعت سے شروع ہوئی اور زبانہائے مشرقی کا اخراج انگریزی سکولوں میں جماعت ہشتم سے قرار دیا گیا۔ اب تقسیم ڈیپارٹمنٹل [illegible] سکول۔ لوئر مڈل (جماعت پنجم و ششم) اپر مڈل (جماعت ہفتم و ہشتم) ہائی مدارس (جماعت نہم و دہم) مسٹر رچی کے ایجوکیشنل کمشنر گورنمنٹ آف انڈیا ہو جانے پر کرنیل ڈبلیو سی رائٹ[۵۷] صاحب بہادر قائم مقام اور بالآخر مستقل ڈائرکٹر ہوئے جن کے عہد میں لازمی تعلیم کا آغاز ہوا۔ اے ڈی آئی اصحاب کی تعداد پرائمری سکولوں کے اضافہ کی وجہ سے بڑھائی گئی۔

۵۱ ۱۸۷۰ء ۵۲ ۱۸۷۸ء ۵۳ ۱۸۹۰ء ۵۴ ۱۸۹۹ء-۱۹۰۱ء ۵۵ ۱۹۰۱ء-۱۹۰۵ء ۵۶ ۱۹۰۶ء-۱۹۱۲ء ۵۷ ۱۹۱۹ء

آپکے عہد کے بعد سررشتہ تعلیم پنجاب گورنمنٹ پنجاب (وزارت تعلیم) کے ماتحت منتقلہ محکمہ کی صورت میں تبدیل ہوا۔

سر جارج اینڈرسن بہادر بالقابہ موجودہ ڈائرکٹر اس عہد کی مستقل یادگار ہیں۔ آنریبل سر میاں فضل حسین صاحب وزیر تعلیم پہلی کونسل کا پورا عرصہ وزارت تعلیم کے فرائض سرانجام دیتے رہے آپ نے پسماندہ اقوام کے حقوق کو فروغ دینے اور انہیں محکمہ تعلیم میں اچھی حصہ دلانے پر توجہ دی اور ملازمت میں حتیٰ کہ ٹریننگ کالج اور کئی دیگر پروفیشنل کالجوں کے داخلہ میں تناسب کو روا رکھا گیا۔ اس حالت میں قدرتاً سابقہ بڑھی چڑھی اقوام کی قدرے حق تلفی ہوناتھی۔ تناسب کے پورا کرنے کیلئے جونیئر عہدہ داروں کو سینئر اسامیاں دی گئیں۔ امداد کے روپیہ میں بھی جو پرائیوٹ باڈیز کو ملتا تھا اس تناسب کو جگہ دی گئی۔ کونسل کی دوسری ٹرم میں آنریبل سر میاں صاحب موصوف دوبارہ وزیر تعلیم ہوئے مگر جینوا کانفرنس میں تشریف لیجانے پر آپکے قائمقام سر شیخ عبدالقادر صاحب حال جج ہائیکورٹ ہوئے۔ بعد میں میاں صاحب کے ریونیو ممبر ہونے پر رائے صاحب چودھری چھوٹو رام جی وزیر تعلیم ہوئے۔ تیسری ٹرم میں وزارت تعلیم کا قلمدان آنریبل مسٹر منوہر لال کے سپرد ہوا اور اب چوتھی ٹرم میں وزارت آنریبل ملک فیروز خاں صاحب نون ایم اے بیرسٹر ایٹ لا کے ہاتھوں میں دی گئی ہے۔

دوسری ٹرم میں سر جارج اینڈرسن کے رخصت پر جانے کے وقت مسٹر ای ٹایڈمن قائمقام ڈائرکٹر رہے اور تیسری ٹرم میں دوبار مسٹر آر سنڈرسن نے قائمقام ڈائرکٹری کے فرائض سرانجام دئے۔

سر جارج کے عہد ڈائرکٹری میں کفایت اور عمدگی کو ملحوظ رکھا گیا۔ گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج مفصلات میں قائم کئے گئے گورنمنٹ سکولوں کا جال صوبہ میں ہر جگہ پھیلا دیا گیا پست اور اچھوت اقوام کی تعلیم میں خاص دلچسپی لی گئی اب افسران معائنہ کی ذیل میں ہر تحصیل میں ایک ایک اے۔ ڈی۔ آئی صاحب مقرر ہیں جنکے دفتر کا کام ایک ایک سکرری محرر سرانجام دیتا ہے ہر ضلع میں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب کے علاوہ ایک ایک پرسنل اسسٹنٹ مقرر ہے۔ ڈویژنل انسپکٹر اصحاب پہلے واحد انچارج ڈویژن تھے پھر انکے خاص خاص شعبہ جات کے اسسٹنٹ مقرر کئے گئے۔ اب لاہور ڈویژن میں دو اور باقی ڈویژنوں میں ایک ایک ڈپٹی انسپکٹر صاحب ہیں۔ نورمل سکولوں کو عام طور پر مقامی ہائی سکولوں کے ساتھ پیوست کر کے ایک قابل پرنسپل صاحب کے ماتحت کر دیا گیا ہے اور خاص خاص ہائی سکولوں میں ایس وی یونٹس تعلیم حاصل کر کے لوئر مڈل مدارس کی ہیڈ ماسٹری کیلئے تیار ہو رہے ہیں پچھلے سال سے ایس وی کا کورس مستقل طور پر دو سالہ کر دیا گیا ہے۔ سنٹرل ٹریننگ کالج میں بی ٹی اور ایس اے وی کلاسوں کے علاوہ اورینٹل ٹیچروں کی ٹریننگ کلاسیں جاری ہیں لازمی تعلیم کا حلقہ بہ نسبت سابق بہت وسیع ہوگیا ہے۔ اور تعلیم بالغان کو بھی شروع کر رکھا ہے تعلیم نسواں کیلئے دو کالج اور کئی ہائی سکول اور نارمل سکول کھولے گئے ہیں۔

موجودہ سررشتہ تعلیم کی صورت یہ ہے

۱۔ آنریبل ملک فیروز خاں صاحب نون بالقابہ وزیر تعلیم۔

۲۔ سر جارج اینڈرسن صاحب بہادر ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب

۳۔ مسٹر رینل بی سی ایل ایم اے اسسٹنٹ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب

۴۔ میجر آر سنڈرسن صاحب بہادر ایم اے انسپکٹر ٹریننگ انسٹی ٹیوشنز پنجاب

۵۔ خان بہادر سید مقبول شاہ صاحب بی۔ اے آئی ای ایس انسپکٹر ورنیکلر ایجوکیشن

۶۔ لالہ رنگ بہاری لال صاحب بی اے بی ٹی پی ای ایس رجسٹرار امتحانات محکمہ

۷۔ لالہ شام چند صاحب بی ایس سی رپورٹر اطلاعات محکمہ سررشتہ۔

۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۰ء

لاہور ڈویژن

۱۔ خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب ایم اے آئی ای ایس انسپکٹر مدارس

۲۔ سردار تارا سنگھ صاحب ایم اے پی ای ایس ڈپٹی انسپکٹر مدارس

۳۔ شیخ محمد ظہور الدین صاحب بی اے پی ای ایس ڈپٹی " "

۴۔ باوا برکت سنگھ صاحب بی اے " ڈسٹرکٹ " ضلع لاہور

۵۔ سوڈھی جگت سنگھ صاحب بی اے بی ٹی ڈسٹرکٹ " ضلع امرتسر

۶۔ شیخ رحیم بخش صاحب بی اے " " " گورداسپور

۷۔ شیخ محمد نواز خانصاحب بی اے پی ای ایس " " سیالکوٹ

۸۔ لالہ دھیانا رام صاحب بی اے " " " گوجرانوالہ

۹۔ شیخ غلام حسین صاحب بی اے بی ٹی " " شیخوپورہ

جالندھر ڈویژن

۱۔ مسٹر من موہن ایم اے پی ای ایس انسپکٹر مدارس

۲۔ خانصاحب راجہ فاضل محمد خاں بی اے پی ای ایس ڈپٹی انسپکٹر

۳۔ پنڈت مرلی دھر صاحب موگل بی اے ڈسٹرکٹ انسپکٹر جالندھر

۴۔ سردار جوگندر سنگھ صاحب بی اے بی ٹی ڈسٹرکٹ انسپکٹر فیروزپور

۵۔ لالہ دیوا چند صاحب بی اے پی ای ایس " " ہوشیارپور

۶۔ لالہ امیر چند صاحب وج بی اے پی ای ایس " " لدھیانہ

۷۔ سردار امر سنگھ صاحب بی اے پی ای ایس " " کانگڑہ

انبالہ ڈویژن

۱۔ مسٹر جے لیچ ولسن ایم اے انسپکٹر مدارس (رخصتی)

۲۔ سردار دیو سنگھ صاحب ایم اے پی ای ایس قائمقام انسپکٹر مدارس

۳۔ پنڈت پران ناتھ صاحب بی اے پی ای ایس قائمقام ڈپٹی انسپکٹر مدارس

۴۔ لالہ پربھو دیال صاحب بی اے بی ٹی ڈسٹرکٹ " انبالہ

۵۔ چودھری پران ناتھ صاحب دت ایم اے ڈسٹرکٹ انسپکٹر کرنال

۶۔ پیرزادہ محمد نواز صاحب بی اے ڈسٹرکٹ انسپکٹر حصار

۷۔ ٹھاکر راما نند سنگھ صاحب ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس گوڑگانوہ

۸۔ لالہ رام سروپ صاحب ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس رہتک

۹۔ چودھری جھنڈو لال صاحب بی اے بی ٹی ڈسٹرکٹ انسپکٹر شملہ

راولپنڈی ڈویژن

۱۔ رائے بہادر مسٹر گنگا رام ایم اے آئی ای ایس انسپکٹر مدارس (رخصتی)

۲۔ خانصاحب لالہ رتن لال ایم اے پی ای ایس قائمقام انسپکٹر مدارس

۳۔ مولوی اللہ رکھا صاحب بی اے پی ای ایس ڈپٹی انسپکٹر مدارس

۴۔ سردار کرم سنگھ صاحب بی اے بی ٹی پی ای ایس ڈسٹرکٹ انسپکٹر راولپنڈی

۵۔ پیر محمد یعقوب شاہ صاحب ایم اے پی ای ایس ڈسٹرکٹ " جہلم

۶۔ لالہ ہربیال صاحب چوپڑہ بی اے پی ای ایس " " گجرات

۷۔ ملک غلام رسول صاحب شوق ایم اے پی ای ایس ڈسٹرکٹ انسپکٹر شاہ پور
۸۔ چودھری غلام محی الدین صاحب بی اے بی ٹی پی ای ایس ڈسٹرکٹ انسپکٹر میانوالی
۹۔ مفتی احمد سعید صاحب بی اے پی ای ایس " اٹک کیمبل پور

ملتان ڈویژن

۱۔ جناب شیخ عبد الحمید صاحب ایم اے پی ای ایس انسپکٹر مدارس
۲۔ لالہ مدد جان صاحب بی اے بی ٹی پی ای ایس ڈپٹی انسپکٹر مدارس
۳۔ لالہ رامچند صاحب بی اے " ڈسٹرکٹ انسپکٹر ملتان
۴۔ چودھری سردار عالم صاحب ایم اے " " ڈسٹرکٹ " مظفر گڑھ
۵۔ چودھری غلام حسین صاحب بھٹی " " " ڈیرہ غازیخان
۶۔ مولوی محمود الحسن صاحب بی اے " " " جھنگ
۷۔ " محمد حسین صاحب " " " لائل پور
۸۔ چودھری احمد حسن صاحب ایم اے " " " منٹگمری

مخفی نہ رہے کہ سر جارج کے عہد میں تعلیمی اسامیوں کی تقسیم اس طرح پر روا رکھی گئی تھی۔

انڈین ایجوکیشنل سروس } جس میں مسٹر رچی کے عہد میں سب سے پہلے سردار بہادر سردار ہری سنگھ صاحب سابق انسپکٹر ملتان کو ترقی دی گئی تھی۔ کرنیل رائٹ کے عہد میں ایک ہندوستانی اور سر جارج کے عہد میں اس سروس میں چند ممتاز ہندوستانی بزرگوار ترقی پذیر ہوئے۔

پراونشل ایجوکیشنل سروس } ۲۵۰ – ۲۵ – ۵۰۰ – ۲۵ – ۶۰۰
انتخابی گریڈ ۶۵۰ – ۳۰ – ۸۰۰

سبارڈی نیٹ ایجوکیشنل سروس }
ا۔ اینگلو ورنیکلر سیکشن ۔ ۲۰۰-۱۰-۲۵۰ ، ۱۴۰-۱۰-۱۹۰
۱۱۰-۵-۱۳۵ ، ۸۰-۴-۱۰۰ ، ۵۵-۳-۷۰
ب۔ ورنیکلر سیکشن ۔ ۱۴۰-۱۰-۱۹۰ ، ۱۱۰-۵-۱۳۵ ، ۸۰-۴-۱۰۰ ، ۵۵-۳-۷۰ ، ۴۰-۲-۵۰ ،

آخری ملازمت کے لئے پروفیسر روچی رام صاحب ساہنی نے سر جارج کے عہد میں کونسل میں ٹائم سکیل کا سلسلہ چھیڑا۔ مگر اس ملازمت کی بدقسمتی سے یہ سکیل منظور نہ ہو سکا۔ حالانکہ محکمہ تعلیم کے کلیریکل سٹاف کو بھی ٹائم سکیل کے مفاد سے بہرہ ور کیا ہوا ہے۔ کاش کہ سر جارج اور آنریبل ملک صاحب اپنے عہد کی یادگار میں اس تعلیمی ملازمت کو ٹائم سکیل کے طریق سے مالا مال کر کے ان کی دعائیں حاصل کر سکیں۔

(سچدیوا)

(از افتخار الشعراء منشی مہاراج بہادر صاحب برق دہلوی بی اے مصنف مطلع الانوار)

دولتِ علم سے بہتر نہیں دولت کوئی اس کے پلّے کی نہیں دہر میں ثروت کوئی
کسبِ تعلیم سے افضل نہیں حشمت کوئی اس سے بڑھ کر نہیں سرمایۂ راحت کوئی

یہ وہ دولت ہے لٹانے سے سوا ہوتی ہے
یہ نگیں وہ ہے کہ صیقل سے جلا ہوتی ہے

یہ وہ ثروت ہے کہ رہزن کا نہیں جس کو خطر یہ ہے وہ گنج کہ ہے رشکِ دکانِ گہر
نہ زوال آتا ہے اس شے کو نہ لگتی ہے نظر نفع ہی نفع ہے اس میں نہ زیاں ہے نہ ضرر

بارِ خاطر نہیں۔ یہ جان کا جنجال نہیں
سات تالوں میں رہے بند یہ وہ مال نہیں

یہ وہ دولت ہے کہ نادار ہے جس سے زردار یہ ہے وہ چیز کہ کر دیتی ہے قسمت بیدار
یہ ہے وہ مال کہ جس پہ زرِ دنیا ہے نثار یہ وہ شے ہے کبھی ہوتی نہیں جنسِ بے کار

بطنِ مادر سے کسی کے نہ یہ ساتھ آتی ہے
یہ وہ دولت ہے کہ تحصیل سے ہاتھ آتی ہے

ادب و اخلاق

فہرست مضامین

S. INAYAT.

فہرستِ مضامین

سید دل محمد ھضا - جالندھری منشی فاضل

منشی منوہر لال صاحب طالب بی اے ایل
ایل بی چکوال

ملک الشعرا مولانا غلام قادر گرامی مرحوم

فصیح الملک نواب مرزا داغ مرحوم دہلوی

داغ مرحوم

ہمارے مکرم و محترم جناب مولوی عبدالعزیز صاحب ایم۔ اے۔ نے اس سے پیشتر بھی ایک مبسوط مضمون مولانا حالی اور ان کی شاعری سے متعلق لکھ کر اپنی ادب نوازی کا ثبوت دیا تھا۔ یہ مضمون رسالہ ہذا کی کسی سابقہ اشاعت میں ناظرین نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ اب جناب موصوف نے حضرت داغ مرحوم کی شاعری پر ایک اجمالی تبصرہ تحریر فرمایا ہے۔ اس مضمون کی جدت ادا اور سلجھا ہوا انداز بیان ان کے مذاق صحیح کا نمایاں ثبوت ہے۔ رہنمائے تعلیم ان کی اس عنایت کا تہ دل سے شکر گزار ہے۔ ناظرین اس مضمون کو پڑھیں اور لطف اٹھائیں۔

{جوش ملسیانی

غدر سے چند ایک برس پہلے دہلی میں نواب غلام مصطفیٰ خاں شیفتہ کے ہاں ایک مشاعرہ ہوا جس میں حسب معمول مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ، شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، مفتی صدرالدین خاں آزردہؔ، حکیم آغا جان صاحب عیشؔ غلام علی خاں صاحب وحشتؔ جیسے قادرالکلام شعرا تشریف لائے۔ ان کے علاوہ مرزا زین الدین خاں صاحب عارفؔ، سید معین الدین صاحب معینؔ، حافظ قطب الدین صاحب مشیرؔ، مرزا رحیم الدین صاحب حیاؔ، میر مہدی حسین صاحب مجروحؔ، سید ظہیر الدین صاحب ظہیرؔ اور ان کے برادر خورد سید شجاع الدین صاحب عرف امراؤ مرزا انورؔ، مرزا قربان بیگ صاحب سالکؔ، مولانا امام بخش صاحب صہبائیؔ، مرزا پیارے صاحب شہرتؔ، مرزا قادر بخش صاحب صابرؔ، میاں خدا بخش صاحب تنویرؔ، غلام احمد صاحب تصویرؔ، عبدالقادر صاحب توقیرؔ، آغا مرزا صاحب برخوردار داغ المتخلص بہ شاغل بھی موجود تھے۔ ان میں سے بعض نوجوان اور بعض ضعف پیری کو پہنچ چکے تھے مگر بعض ابھی تک صغیر سن تھے۔ دہلی کے فضلا و شرفا کا نواب صاحب کے مکان میں مجمع تھا۔ چھوٹے موٹے شعرا کی غزلیں ہو چکیں تو شمع ایک نوخیز جوان کے سامنے لائی گئی جس کا چھریرا بدن چوڑے پائینچے والے پاجامے اور انگرکھے میں خوب سج رہا تھا۔ سر پر چہار گوشہ سرخ مخمل کی مطلا محمد شاہی ٹوپی تھی۔ میانہ قد نہایت مطبوع ملیح چہرہ چمکیلی آنکھیں حرکات و سکنات سے چلبلا پن ٹپکتا تھا۔ اسوقت کوئی بارہ تیرہ کا سن تھا۔ شعر عرض ہے کہکر بے تکلف غزل پڑھنی شروع کی۔

شرر و برق نہیں شعلہ و سیماب نہیں ۔۔۔ کس لئے پھر یہ ٹھہرتا دل بیتاب نہیں

شعر پڑھنا تھا کہ واہ واہ، احسنت، واللہ کیا شعر ہے، یہ عمر اور یہ صفائی، خوب، قلم توڑ دیا، خوب مذاق

پایا ہے" کا شور برپا ہوگیا۔ شعروں میں زبان کی چاشنی اور پختگی تو تھی ہی مگر پڑھنے والے کے رنگ ڈھنگ نے ان میں اور جان ڈال دی۔ آواز تھی کہ اتار چڑھاؤ کے اعتدال سے فضائے ہوائی میں تھرتھراتی ہوئی دلوں میں بیٹھ جاتی۔ اور اس پر لطف یہ کہ نہ تو گلپھڑے پھولتے اور نہ رگیں تنتیں۔ ہاتھوں کے اشاروں تک سے بھی کام نہ لیتے۔ مومن خاں نے پہلے بالوں کو سنوارا اور آغا جان عیش کے کان میں آہستہ سے کچھ کہا اور پھر دونوں نے سر ہلایا۔ مرزا غالب نے ایک شعر دوبارہ پڑھوایا۔ استاد ذوق چپکے بیٹھے رہے۔ مرحبا اور واہ واہ میں غزل ختم ہوئی۔ مولٰنا صہبائی اور نواب غلام مصطفٰی خانصاحب نے مزید تعریف کی جواب میں مرزا داغ نے انداز سے تسلیمات عرض کی اور چپکے ہو بیٹھے +

(۲)

بلبل چمنستان فصاحت و صلصل سنبلستان بلاغت شہسوار عرصہ معنی پروری گوہر شب چراغ تاج سخنوری طوطئ ہندوستان نواب مرزا خاں داغ دہلوی ناظم یار جنگ دبیر الدولہ فصیح الملک بہادر مرحوم مغفور تاریخ ۱۲۔ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۱ء و ۱۴۔ بساکہ سمت ۱۸۸۸ بکرمی روز چہارشنبہ بمقام شاہجہان آباد دہلی محلہ بلیماراں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد نواب شمس الدین خاں نواب ضیاء الدین خاں والئے لوہارو کے بھائی تھے۔ بدقسمتی سے ۱۲۵۲ھ میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس وقت نواب مرزا خاں کی عمر صرف سات برس کی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کی والدہ نے مرزا محمد سلطان عرف مرزا فخر و خلف بہادر شاہ سے نکاح کر لیا اور حرم میں داخل ہو کر شوکت محل کا خطاب پایا۔ نواب مرزا خاں بھی والدہ کے ساتھ قلعہ معلی میں داخل ہوئے اور وہاں کے علوم و فنون سے مستفید ہونے اور شعر و سخن کے چرچوں کے دیکھنے کا انہیں بہترین موقع ہاتھ لگا۔ چنانچہ ادھر تحصیل علوم کے لئے مولوی سید احمد حسین صاحب کے شاگرد ہوئے ادھر سید امیر پنجہ کش دہلوی سے خوشنویسی میں استعداد حاصل کی اور فنون مثل شہسواری، سپہ گری، پھیکتی، بانک، علی مدد وغیرہ کی تکمیل کی۔ بہادر شاہ نے طبع موزون دیکھ کر آپ کو ذوق کا شاگرد کرا دیا + اسی طرح عمر بڑے چین اور خوشحالی سے گذرا کی کہ ۱۸۵۶ء میں شہزادے کا انتقال ہوگیا اور ۱۸۵۶ء میں غدر کی آفت ناگہانی نازل ہوئی اور جان و مال کے علاوہ لوگوں کی عزت و ناموس خطرے میں پڑ گئی۔ اس وقت داغ کی عمر صرف ۲۴ برس کی تھی۔ اس زمانے میں ریاست رامپور آفت زدگان غدر کے لئے ملجا و ماوا بنی ہوئی تھی۔ نواب یوسف علی خاں صاحب والئے ریاست نہ صرف عالم اور علم دوست تھے۔ بلکہ نہایت عادل اور مہربان فرمانروا تھے ان کے خوان نعمت سے ہزاروں آشفتہ حال پرورش پاتے تھے۔ داغ بھی مع تمام اہل و عیال وہاں پہنچے ان کی وہاں بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ نواب صاحب کے بعد ان کے جانشین نواب کلب علی خاں

مرحوم نے بھی بڑی خاطر و مدارات کی۔ ریاست میں انہیں ایک ذمہ دار اسامی بھی دیدی گئی اور نواب صاحب کی معیت میں آپ نے فریضۂ حج بھی ادا کیا۔ اس عرصہ میں شعر و سخن کی بڑی گرم بازاری رہی مشاعروں میں امیر مینائی، جلال، اسیر، حیا، ہجر، قلق، عروج، تسلیم سے بڑے معرکے رہے۔ نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد ایک کونسل مقرر ہوئی جس کے صدر جنرل عظیم الدین خان تھے۔ مرزا داغ کی ان سے نہ بنی۔ لہذا آپنے ایک طویل سفر اختیار کیا۔ اور لاہور، امرت سر، کشن کوٹ، بنگلور، علی گڑھ، متھرا، جے پور، منگرول اور اجمیر میں اپنے شاگردوں کے ہاں گئے۔ اس کے بعد حیدر آباد کا عزم کیا۔ وہاں آپ کو پہلی مرتبہ ناکامی سے واپس آنا پڑا۔ مگر کلام کی شہرت کی وجہ سے آپ کو دوبارہ حیدر آباد طلب کیا گیا۔ وہاں پہنچتے ہی حضور نظام کے استاد مقرر ہوئے اور مبلغ چارسو پچاس روپیہ ماہیانہ مقرر ہوا۔ یہ مشاہرہ از روئے قدر دانی بعد کو ایک ہزار کر دیا گیا اور تاریخ ورود حیدر آباد سے ادا کر دینے کا حکم صادر ہوا۔ حیدر آباد میں آپ ایک مرنجاں مرنج زندگی گذارتے رہے۔ سوائے نامی مشاعروں کے اور کہیں نہ جاتے۔ آپنے میر انیس کی طرح بڑی آزاد طبیعت پائی تھی۔ خاص ضرورت کے سوا آپ نہ کبھی کسی امیر کے ہاں گئے اور نہ کسی کی مدح سرائی کی ۷۴، برس کی عمر میں ۱۷۔ فروری ۱۹۰۵ء کو بعارضہ فالج بیمار رہ کر راہئ ملکِ بقا ہوئے اور وہیں حیدر آباد میں مدفون ہوئے۔ رحمہ اللہ علیہ۔

(۳)

گیٹے کا قول ہے کہ اگر تم کسی شاعر کے خیالات کو اچھی طرح سمجھنا چاہتے ہو تو اوّل اس کے زندگی کے حالات کو سمجھو۔ نواب مرزا خاں نے عمر کے پہلے بیس پچیس برس عیش و عشرت میں گذارے کہ یکایک سارے کنبے کا بوجھ ان کے کاندھوں پر پڑ گیا۔ اس پر غدر کے مصائب و آلام اور دوستوں کے فراق نے ان کا دل خراشا۔ انہیں اہل و عیال سمیت رام پور جانا پڑا اور وہاں مد مقابل شعرا کی جا و بیجا چوٹیں سہنا پڑیں۔ اس طرح چالیس برس بسر ہو گئے اور پھر ذاتی تفرقے کی بنا پر انہیں رام پور بھی چھوڑنا پڑا۔ بالآخر تمام ہندوستان پھر کر انہیں حیدر آباد میں جائے امان ملی۔ ان واقعات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم ان کی شاعری کے تین عصر بنا سکتے ہیں۔

(۱) **جوانی کا کلام** ـ مرزا نے اپنی جوانی کا زیادہ حصہ عیش و عشرت اور بے فکری میں گزارا اس لئے اس زمانے کا کلام حسن و محبت کے لطیف جذبات سے لبریز ہے یہ جذبات خیالی نہ تھے بلکہ شاعر کے ذاتی تجربات تھے۔ شوخی، بانکپن، نزاکت، نوک جھوک، راز و نیاز کی باتیں، ہجر کے صدمے، فراق کی داستانیں، جوانی کی ولولہ انگیزیاں جو اس زمانے کے کلام میں پائی جاتی ہیں وہ کسی زمانے کے کلام

میں نہیں۔ دراصل انہیں باتوں میں داغ کا معراج کمال ہے ۔ یہ تمام کلام گلزار داغ کے نام سے رامپور میں چھپا۔ چند ایک شعر ملاحظہ ہوں :۔

کہا ہے دیندار اس صنم کو ہزار طوفاں اٹھا اٹھا کر
لگائیں وہ تہمتیں کہ بولا خدا خدا کر خدا خدا کر

کہا نہ کچھ عرض مدعا پر وہ لے رہے دم کو مسکرا کر
سنا کیے حال چپکے چپکے نظر اٹھائی نہ سر اٹھا کر

تری محبت نے مار ڈالا ہزار ایذا سے مجھکو ظالم
رلا رلا کر گھلا گھلا کر جلا جلا کر مٹا مٹا کر

عجیب تیرا یہ خاکداں ہے اسی کی ہے روشنی جہاں ہے
فلک نے اختر بنا لئے ہیں چراغ ہستی بجھا بجھا کر

جہاں لگی آنکھ کچھ یونہی سی وہیں چبھی پھانس سی جگر میں
کہ درد دل کی چمک نے کیا کیا دکھائے صدمے جگا جگا کر

نہیں تو ہو جو کہ خواب میں ہو نہیں تو ہو جو خیال میں ہو
کہاں چلے آنکھ میں سما کر کدھر کو جاتے ہو دل میں آ کر

ستم کے جو لذت آشنا ہوں کرم سے بے لطف بیمزا ہوں
جو تو وفا بھی کرے تو ظالم یہ ہو تقاضا کہ پھر جفا کر

شراب خانہ ہے یہ تو زاہد طلسم خانہ نہیں جو ٹوٹے
کہ توبہ کرتی گئی ہے توبہ ابھی یہاں سے شکست پا کر

جو ظلم کرنا تھا سر پہ میرے تو اور فتنے اٹھائے ہوتے
اٹھائی ہے تم نے تو قیامت رقیب کو بزم میں بٹھا کر

نگہ کو بیباکیاں سکھاؤ حجاب شرم و حیا اٹھاؤ
بھلا کے مارا تو خاک مارا لگاؤ چوٹیں جتا جتا کر

رقیب اچھے ہیں میں نے مانا برا ہمیں تو نے دل سے جانا
بھلوں سے کرتے ہیں سب بھلائی کسی برے کا تو کچھ بھلا کر

جناب سلطانِ عشق وہ ہیں کریں جو اے داغ اک اشارہ
فرشتے حاضر ہوں دست بستہ ادب سے گردن جھکا جھکا کر

(۲) **غدر کے بعد کا کلام** ۔ اس میں وہ غزلیں شامل ہیں جو رامپور کے مشاعروں میں یا رامپور کی سکونت کے ایام میں کہی گئیں۔ داغ اس زمانے میں بڑے بڑے استادانِ فن کے مقابلے میں غزلیں پڑھتے تھے اور انہیں طرح طرح کی نکتہ چینیوں سے احتیاط کرنی پڑتی تھی۔ اس لئے اس زمانے میں بڑی سرمغزنی عرق ریزی اور جانفشانی سے کام لیتے تھے مگر سلاست اور روانی کو جو اُن کے کلام کا خاصہ ہے۔ کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ یہ کلام بھی عشقیہ جذبات سے لبریز ہے۔ ہاں کہیں انقلاب زمانہ سے موثر ہوتے ہیں۔ تو دنیا کی نیرنگی پر ایک آدھ شعر ان کی زبان پر آجاتا ہے خصوصاً جب انہوں نے ایام غدر کے مظالم اپنے سامنے دیکھے۔ اور اس وجہ سے انہیں اپنے قدیمی وطن دہلی کو اور عزیز رفیقوں کو ہلاکت، فلاکت، بے عزتی اور مصیبت کے نرغے میں چھوڑ کر نکلنا پڑا تو ان کے جذبات کو کیسے ٹھیس نہ لگتی۔ آخر اُبل اُبل کر شہر آشوب لکھ ڈالی۔ کلام ملاحظہ ہو:۔

(۱) دہلی کی تعریف میں کہتے ہیں ۔

یہ شہر وہ ہے کہ ہر انس و جان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ ہر قدر دان کا دل تھا

یہ شہر وہ ہے کہ ہندوستان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ سارے جہان کا دل تھا

رہی نہ آدمی یہاں سنگ وخشت کی صورت
بنی ہوئی تھی جو ساری بہشت کی صورت

ظہیر دہلوی کہتے ہیں۔

یہ شہر وہ ہے کہ غنچہ تھا حسن والوں کا — یہ شہر وہ ہے کہ تختہ تھا نونہالوں کا
یہ شہر وہ ہے کہ مجمع تھا مہ جمالوں کا — یہ شہر وہ ہے کہ مرجع تھا ذی کمالونکا
یہ وہ زمیں ہے زمیں جسکی زر اگلتی ہے
یہ خاک وہ ہے کہ اکسیر ہاتھ ملتی ہے

(۲) داغ :-

فلک نے قہر وغضب تاک تاک کر ڈالا — تمام پردۂ ناموس چاک کر ڈالا
یکایک ایک جہاں کو ہلاک کر ڈالا — غرض نہ لاکھ کا گھر اس نے خاک کر ڈالا
جلیں ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچیں ہیں کانٹوں میں جو پتیاں گلاب کی تھیں

ظہیر:-

یہ وہ الم ہے کہ اس غم سے سب ہلاک ہوئے — لگا کے چرخ سے بیچین تا سماک ہوئے
ہلاک گور میں آسودگانِ خاک ہوئے — کفن بھی ساتھ گریباں کے چاک چاک ہوئے
نہ روزِ حشر سے کم تھی عذاب کی صورت
خدا دکھائے نہ اِس انقلاب کی صورت

(۳) داغ شہر سے نکلنے کو یوں ادا کرتے ہیں :-

برنگِ بوئے گل اہلِ چمن چمن سے چلے — غریب چھوڑ کے اپنا وطن وطن سے چلے
نہ پوچھو زندوں کو بیچارے جس چلن سے چلے — قیامت آئی کہ مردے نکل کفن سے چلے
مقام امن بھی ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی ہا ہا
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی ہا ہا

جگہ جگہ تھے زمیندار دار کی صورت — چڑھے ہی آتے تھے سر پہ بخار کی صورت
بلا سے کم نہ تھی ہر ایک گنوار کی صورت — پھبی نہ ان سے پر اہلِ دیار کی صورت
کسی جگہ جو کوئی ہو کے بیقرار آیا

تو اہل قریہ یہ بولے کہ لو شکار آیا

زباں جو بدلیں تو صورت بدل نہیں آتی | ملیں جو خاک بھی منہ پر تو مل نہیں آتی
کسی طرح کسی پہلو سے کل نہیں آتی | پکارتے ہیں اجل کو اجل نہیں آتی
جو سر کو پھوڑیں تو پتھر پڑے برستے ہیں
جو لوٹیں کانٹوں پہ کانٹے الگ کھسلتے ہیں

ظہیر:۔

نکلنا شہر سے خلقت کا بے سروساماں | وہ جانا پردہ نشینوں کا با سرِ عریاں
وہ چاک چاک گریباں لگا کے تا داماں | وہ دار و گیر سپاہ شریر بے ایماں
دراز دست تطاول ستم شعاروں کا
فلک کو یاس سے تکنا جفا کے ماروں کا

نکلتے شہر سے ہیں پر نکل نہیں سکتے | ہزار چال سے چلتے ہیں چل نہیں سکتے
کروڑ شکل کو بدلیں بدل نہیں سکتے | قدم قدم پہ ہے لغزش سنبھل نہیں سکتے
کمندِ موت نے کیا بند بند جکڑے ہیں
زمینِ شہر نے اک اک کے پاؤں پکڑے ہیں

(۴) داغ:۔

بنا ہے خالِ سیہ رنگ مہ جمالوں کا | دوتا ہوا ہے قدِ راست نونہالوں کا
جو زور آہوں کا لب پر تو سوز نالوں کا | عجیب حال دگرگوں ہے دلی والوں کا
کوئی مراد جو چاہی حصول بھی نہ ہوئی
دعائے مرگ جو مانگی قبول بھی نہ ہوئی

ظہیر:۔

گلوں سے جسموں پہ اک مردنی سی چھائی تھی | وہ مہ سے چہروں پہ گویا چھٹی ہوائی تھی
غضب وہ پردہ نشینوں کی بے ردائی تھی | غرض کہ آنے سے پہلے قیامت آئی تھی
بیان کیجے نصیبوں کی کیا بُرائی کا
وہ دشت اور وہ پھرنا برہنہ پائی کا

(۵) داغ:۔

پیادہ پا ہوں رواں شہسوار صد افسوس — لہو کے گھونٹ پئیں بادہ خوار صد افسوس
ذلیل و خوار ہوں اہلِ وقار صد افسوس — ہزار حیف دلِ بیقرار صد افسوس
جھکے ہیں بارِ الم سے تنے ہوئے کیسے
بگڑ گئے ہیں یکایک بنے ہوئے کیسے

ظہیر:-
نہالِ گلشنِ اقبال پائمال ہوئے — گلِ ریاضِ خلافت لہو میں لال ہوئے
یہ کیا کمال ہوئے اور کیا زوال ہوئے — کمال کو بھی نہ پہنچے تھے جو زوال ہوئے
جو عطر گل کو نہ ملتے ملے وہ مٹی میں
جو فرشِ گل پہ نہ چلتے ملے وہ مٹی میں

(۶) داغ:-
جہاز ایسا تباہی میں آگیا اپنا — ملا نہ تحتِ ثریٰ تک کہیں پتا اپنا
رہا نہ آہ زمانے میں آشنا اپنا — بجز خدا کے نہیں کوئی ناخدا اپنا
کسی سے ڈوبے ہوئے ایسے کب نکلتے ہیں
یہاں سے حضرتِ الیاس بچ نکلتے ہیں
پئے محاسبہ پرسش ہے نکتہ دانوں کی — تلاش بہرِ سیاست ہے خوش زبانوں کی
جو نوکری ہے تو اب یہ ہے نوجوانوں کی — کہ حکم عام ہے بھرتی ہے قید خانوں کی
یہ اہلِ سیف و قلم کا ہو جب کہ حال تباہ
کمال کیوں نہ پھرے دربدر کمال تباہ

ظہیر:-
جہاں کی تشنۂ خوں تیغ آبدار ہوئی — سنان و نیزہ ہر اک سینہ سے دوچار ہوئی
رسن ہر ایک بشر کے گلے کا ہار ہوئی — ہر ایک سمت سے فریادِ گیر و دار ہوئی
ہر ایک دشت قضا میں کشاں کشاں پہنچا
جہاں کی خاک تھی جس جس کی وہ وہاں پہنچا
ہر ایک شہر کا پیر اور جوان قتل ہوا — ہر اک قبیلہ و ہر خاندان قتل ہوا
ہر ایک اہلِ زبان خوش بیان قتل ہوا — غرض خلاصہ یہ ہے اک جہان قتل ہوا

گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

(۸) گرمی کا نقشہ دیکھئے۔

داغ:- جو تھی تو افعیٔ کاکل کے زہر کی گرمی | جو تھی تو شعلہ عذاران شہر کی گرمی
نہ دیکھیں جو نگہ خشم و قہر کی گرمی | اٹھائیں ہائے وہ جلتی دوپہر کی گرمی

طپش سے ریگ بیاباں بھی آفتاب ہوئی
زمیں مگر کرۂ نار کا جواب ہوئی

دیکھئے مرزا داغ نے اس تڑاقے کی گرمی میں تعشق کو نہ چھوڑا۔

ظہیر:- وہ دھوپ اور وہ ریگ طپاں وہ گرم ہوا | وہ فوج فوج ہر اک سو سے زغنۂ اعدا
وہ کینہ ورزیٔ غارتگران بے پروا | اور اسپہ ظلم گنواروں کا وہ کہ وا ویلا

جو ہم سے سنتے ہیں وہ انقلاب کی باتیں
تو لوگ کہتے ہیں کرتے ہو خواب کی باتیں

وہ گل سے چہرے حرارت سے تمتمائے ہوئے | وہ گورے بدن خاک میں ملائے ہوئے
لبوں پہ آہ جگر میں الم سمائے ہوئے | جفا کی تیغ کے سب زخم دل پہ کھائے ہوئے

وہ داغ مرگ عزیزاں وہ دشت پیمائی
وہ ریگ خار مغیلاں وہ آبلہ پائی

اس زمانے کی غزلیں "آفتاب داغ" میں جمع ہیں۔ چند ایک شعر ملاحظہ ہوں:-

کچھ آنے لگا جیسے اثر آہ رسا میں | دل اور ہوا میں ہے جگر اور ہوا میں
تمکین تری شوخی میں تو شوخی ہے حیا میں | غمزہ ترے انداز میں انداز ادا میں
فریادیٔ فرقت ہیں بہت چاہنے والے | کیسی ہو جو آجائے اثر سب کی دعا میں
تو دوست ہے کسطرح نہ لیں تیری بلائیں | ہم کو دیا کرتے ہیں دشمن کی بلا میں
اس دام سے چھٹنا کوئی آسان ہے ظالم | تو دل میں ہے دل لف میں ہے زلف بلا میں
تجھے اس بت مہ وش کے بہت چاہنے والے | انگشت نما داغ ہوا ساری سبھا میں

ہر دل میں سنئے درد سے ہے یاد کسی کی | ملتی نہیں فریاد سے فریاد کسی کی

گھبرا کے اگر موت بھی مانگوں تو کہیں وہ ۔۔۔ جاگیر نہیں ہے عدم آباد کسی کی
ہے الفتِ دشمن میں برا حال کسی کا ۔۔۔ اے حضرتِ دل کیجئے امداد کسی کی
کمبخت وہی داغ نہ ہو دیکھیو کوئی ۔۔۔ بیچین کئے دیتی ہے فریاد کسی کی

مٹ گئے عشق میں گھر سینکڑوں ویراں ہو کر ۔۔۔ پھر گئی آنکھ تری گردشِ دوراں ہو کر
کیوں نہ مر جائیے اس چھیڑ پہ قرباں ہو کر ۔۔۔ دل میں چبھتی ہے تمنا تری مژگاں ہو کر
جب کہیں جاتے ہو آتے ہو پشیماں ہو کر ۔۔۔ تم کو جانا نہیں آتا ابھی مہماں ہو کر
اس کو حسرت نہ رہے دشمنِ ایماں ہو کر ۔۔۔ کوئی دن دیکھ لو اے داغ مسلماں ہو کر

سانس بیتاب قدم تیز پریشان نظر ۔۔۔ آئے ہو کیا طرفِ گورِ غریباں ہو کر
دیکھنے والے ہی سو عیب لگا دیتے ہیں ۔۔۔ کوئی جو چاہے کرے آنکھ سے پنہاں ہو کر
داغ تو کعبے سے جاتا تو ہے بتخانے کو ۔۔۔ شرم آتی نہیں کمبخت مسلماں ہو کر

(۳) کہولت کے زمانے کا کلام ۔ اس عمر میں آپ کے عشقیہ جذبات کا شعلہ مدھم پڑ گیا تھا ۔ نہ تو آپ کی طبیعت میں وہ وارفتگیاں رہی تھیں نہ جوانی کا جوش وخروش اور نہ زندگی کی چہل پہل ۔ ہاں کہنہ مشق ہونے کی وجہ سے کلام نہایت پختہ اور حشو وزوائد سے بالکل پاک ہو گیا تھا ۔ یہ مجموعہ "مہتاب داغ" کے نام سے مشہور ہے ۔ اس مجموعے میں کہیں کہیں داغ زندگی کی پر اسرار گھاٹیوں پر اتر آتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر زندگی سے کس قدر موثر ہو رہا ہے ۔

دل نہیں دم نہیں دماغ نہیں ۔۔۔ کوئی دیکھے تو اب وہ داغ نہیں
اہلِ محشر سے میں پوچھونگا خدا لگتی بات ۔۔۔ تم نے دیکھا بھی ہے دنیا میں کبھی شاد مجھے

وفات کے وقت کچھ کلام غیر مطبوعہ رہ گیا تھا ۔ اسے اول اول سید علی احسن نے فراہم کر کے ورثا کی اجازت بغیر لاہور سے "یادگار داغ" کے نام سے شائع کیا ۔ مگر بعض غزلیں نامکمل رہ گئی تھیں ۔ اس لئے نقادِ سخن لالہ سریرام صاحب ایم ۔ اے مصنف خمخانۂ جاوید نے ان کے جانشینوں سے تمام مسودے حاصل کر کے اس دیوان کو بطور ضمیمے کے مہتاب داغ کے ساتھ شامل کر دیا ۔ ان دواوین کے علاوہ ایک مثنوی مسمّٰی بہ فریادِ داغ ہے جو مرزا کی اپنی عشقیہ داستان ہے ۔ اس زمانے کی ایک غزل ہے ۔

تو وہ ہے سب بت کافر ترے قربان گئے ۔۔۔ جو خدا کو بھی نہ مانیں وہ تجھے مان گئے ۔

دعوئ مہر و وفا پر وہ بُرا مان گئے — الٹے نادم ہوئے احسان کے احسان گئے
تیرے عاشق کا جنازہ نہ گیا ہو آگے — ابھی اس راہ سے کچھ لوگ پریشان گئے
یا الٰہی کہیں لٹتی تو نہیں راہ عدم — جانے والے جو یہاں چھوڑ کے سامان گئے
خانۂ دل ہے الٰہی کہ مسافر خانہ — کتنے ہی آئے یہاں کتنے ہی ارمان گئے
آزمائش ہی پہ ٹھیرا تھا محبت کا ثبوت — اب تو پہچان گئے جان گئے مان گئے
بندۂ عشق ہوا ایسے کہ آلٰہی توبہ — تم تو معشوق کو اے داغ خدا جان گئے

(۴)

داغ کا اسلوب کلام بھی نرالا ہے۔ غزل گوئی میں ان کا شجرہ نسب کسی سے نہیں ملتا۔ ان سے پہلے غزل گوئی کے دو مستقل مسلک تھے۔ پہلا یہ کہ عشق مجازی کے جذبات نہایت سوز و گداز کے ساتھ پاکیزہ الفاظ میں بیان کئے جائیں۔ میر تقی اس فن میں استاد ملنے جاتے ہیں۔ سید انشا، جرأت اور مرزا غالب نے اس رنگ میں خوب جدت طرازیاں دکھائیں۔ کسی نے اس میں رندی و ہوسناکی کا طرہ لگایا اور کسی نے اس میں فلسفی تحقیق کے نگینے جڑ دئے۔ دوسرے یہ کہ عشق حقیقی کو عشق مجازی کی اصطلاحات میں بیان کیا جائے یہ میر درد میر اثر اور راسخ کا رنگ ہے اور ذوق نے اسے پایۂ کمال تک پہنچایا۔ بلکہ اس میں انقلاب زمانہ اور اخلاقیات کے مضامین کا اضافہ کیا۔ مرزا داغ ان میں سے کسی مسلک کی تقلید نہیں کرتے۔ غزل گوئی میں ان کی انوکھی چال ہے۔ یہ اپنی غزلوں میں معشوق سے بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ چھیڑ خوانی کرتے ہیں شوخیاں دکھاتے ہیں۔ ناراض ہو جاتے ہیں۔ اور پھر خود ہی مناتے ہیں۔ اور مناتے مناتے سحر ہو جاتی ہے اور پھر دل بہلاتے ہیں کہ ناراض تو نظاہر ہے" تجھے داغ دل جانتا ہے کسی کا"۔ غرض سو طرح کی اٹھکھیلیاں کرتے ہیں۔ داغ کی شاعری ان کی چلبلی طبیعت، چنچل نرالی عادات، تیکھاپن، تر و تازگی، اور شوخی کا پتہ دیتی ہے۔ دیوان پڑھنے والے کے سامنے نوجوان داغ مسکراتا ہوا گذر جاتا ہے۔ ان کا ہر ایک شعر دل کی چٹکی لیتا ہے۔ اور جگر مسل ڈالتا ہے۔ اس پر روزمرہ کی خوبی محاورہ کی بندش اور صفائی سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رامپور کے مشاعروں میں امیر مینائی اور جلال جیسے استادان فن کہا کرتے تھے کہ یار اخیر میں غزل پڑھنے کا کیا فائدہ۔ مشاعرہ کے اختتام پر تو داغ کی غزل سب کی نوک زبان ہوتی ہے۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ منشی امیر احمد مینائی کو اپنا رنگ چھوڑ کر مرزا داغ کے مسلک پر چلنا پڑا۔ مرزا کے کلام میں سوقیانہ پن نہیں۔ لکھنؤ والوں کی طرح بے جوڑ قافیوں کو باندھتے ہوئے غزل کا الف لیلہ نہیں بنا دیتے۔ ذیل میں چند ایک خصوصیات کلام درج کی جاتی ہیں۔

(۱) کلام نہایت صاف سلیس ہوتا ہے۔ لفظ ہموار ہوتے ہیں۔ ترتیب عبارت بالکل نثر کی سی ہوتی ہے جو بڑے بڑے گہرے تخیلات کو عام فہم بنا دیتی ہے۔ یعنی داغ کا کلام تعقید سے پاک اور سہل ممتنع ہوتا ہے۔ شعروں میں محاورہ خوب باندھتے ہیں۔ داغ کا کلام پڑھنے سے اردو زبان بڑی آسانی سے سیکھی جاسکتی ہے۔ مثلاً ذیل کے ابیات میں دوسرے محاسن کے باوجود "اٹھ جانا" اپنے مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے:۔

منصفی دنیا سے ساری اٹھ گئی ۔۔۔ اے بتو ایمانداری اٹھ گئی
وہ ہجوم میں ہمیرے کب آئے کہ جب ۔۔۔ بیٹھ کر مخلوق ساری اٹھ گئی
رہ گئے لاکھوں کلیجہ تھام کر ۔۔۔ آنکھ جس جانب تمہاری اٹھ گئی
کس سے رکھے داغ چشم دوستی ۔۔۔ اٹھ گئی یاروں سے یاری اٹھ گئی

"ملنے" کے استعمال

ملاتے ہو اسی کو خاک میں جو دل سے ملتا ہے ۔۔۔ مری جاں چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے

ذیل کی غزل میں بے ساختگی، زبان کی صفائی، روزمرہ کی خوبی اور محاورہ کی بندش ملاحظہ ہو:۔

صاف کب امتحان لیتے ہیں ۔۔۔ وہ تو دم دیکے جان لیتے ہیں
پھر نہ آنا اگر کوئی بھیجے ۔۔۔ نامہ بر سے زبان لیتے ہیں
یہ سنا ہے مرے لئے تلوار ۔۔۔ اک مرے مہربان لیتے ہیں
کون جاتا ہے اس گلی میں جسے ۔۔۔ دور سے پاسبان لیتے ہیں
منزل شوق طے نہیں ہوتی ۔۔۔ ٹھیکیاں نوجوان لیتے ہیں
کر گذرتے ہیں ہو بری کہ بھلی ۔۔۔ دل میں جو کچھ وہ ٹھان لیتے ہیں
وہ جھگڑتے ہیں جب رقیبوں سے ۔۔۔ بیچ میں مجھ کو سان لیتے ہیں
تیرے خنجر سے بھی تو اے قاتل ۔۔۔ نوک کی نوجوان لیتے ہیں
ضد ہر اک بات پر نہیں اچھی ۔۔۔ دوست کی دوست جان لیتے ہیں
مستعد ہو کے یہ کہو تو سہی ۔۔۔ آیئے امتحان لیتے ہیں
داغ بھی ہے عجیب سحر بیاں ۔۔۔ بات جن کی وہ مان لیتے ہیں

(۲) تیکھاپن اور شوخی جو داغ میں خاص ہے:۔

نہ کسی شخص کی عزت نہ کسی کی توقیر — عاشق آتے ہیں تمہارے کہ غلام آتے ہیں

دیکھیں تو کیسے فتنے ہیں نیچی نگاہ میں — آئینہ رکھ دے کاش کوئی ان کے سامنے

مے پی تو سہی توبہ بھی ہو جائے گی زاہد — کمبخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی

گرے ہوتے الجھ کر آستاں سے — چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا — جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

بتوں سے اب معافی چاہتا ہوں — خدا سے کچھ کہا تھا بیخودی میں

(۳) میر تقی کا سا سوز و گداز ہے۔ دو شعروں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

نہیں آتے نہ آئیں وہ گئے تاب و توان جائیں — تجھی پر آج ہم اے بیقراری صبر کرتے ہیں

خدا جانے ہوئی ہیں دفن کیا کیا حسرتیں دل میں — پھپھولوں سے مرے سینے پہ عالم ہے مزاروں کا
کبھی بیٹھے کبھی اٹھے کبھی لوٹے کبھی تڑپے — تماشا دید کے قابل ہے تیرے بیقراروں کا

---

(۴)۔ اختصار۔ لاکھ دینے کا ایک دینا ہے — دل بے مدعا دیا میں نے

حاصل ہوئے مزے ترے خنجر کے غیر کو — سر پر ہمارے مفت کا احسان ہو گیا

مرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے — چمن اڑ گئے آندھیاں آتے آتے

۵۔ خیالات میں تڑپ ہوتی ہے:۔

رہ گئے ہم پاس میں اس رنگ کا رونا کیسا — پانی ہو ہو کے بہا خون تمنا کیسا

ثبات بحر جہاں میں اپنا فقط مثالِ حباب دیکھا ‌ ‌ ‌ ‌ نہ جوش دیکھا نہ شور دیکھا نہ موج دیکھی نہ خواب دیکھا

۶۔ رندی و ہوسناکی اور اس پر ظرافت کا طرفہ۔

زاہد تری محفل میں چرچا ہی نہیں مے کا ‌ ‌ ‌ ‌ اس سے تو یہ بہتر تھا کچھ ذکرِ خدا ہوتا

زاہد بڑا مزا ہو اگر یوں عذاب ہو ‌ ‌ ‌ ‌ دوزخ میں پاؤں ہاتھ میں جام شراب ہو

حشر میں اینڈتے ہوئے یارب ‌ ‌ ‌ ‌ کسی کے تقصیر وار پھرتے ہیں

یقیں ہے کہ ہو جائے آخر کو سچی ‌ ‌ ‌ ‌ مرے منہ میں تیری زباں آتے آتے

۷۔ بلند خیالی۔ ‌ ‌ روز مرتا ہوں روز جیتا ہوں ‌ ‌ ‌ ‌ زندگی کا کوئی حساب نہیں

جو ہو سکتا ہے اس سے وہ کسی سے ہو نہیں سکتا ‌ ‌ ‌ ‌ مگر دیکھو تو پھر کچھ آدمی سے ہو نہیں سکتا

بندگی ایسی غلامی کو اگر قتل نہ ہو ‌ ‌ ‌ ‌ قتل کر ڈال جو کرتا نہیں آزاد مجھے

تکرار الفاظ سے یا مختلف الفاظ کے پے در پے لانے سے خوبی پیدا کر دیتے ہیں:۔

بظاہر نہ جانے نہ جانے نہ جانے ‌ ‌ ‌ ‌ تجھے داغ دل جانتا ہے کسی کا

کسی نے کچھ ان کو ابھارا تو ہوتا ‌ ‌ ‌ ‌ نہ آتے نہ آتے یہاں آتے آتے

دل کو سمجھائیں گے بہلائیں گے پھسلائیں گے ‌ ‌ ‌ ‌ بعد مر جانے کے ملجائیگی فرصت کیسی

آزمایش ہی پہ ٹھہرا تھا محبت کا ثبوت ‌ ‌ ‌ ‌ اب تو پہچان گئے جان گئے مان گئے

تری محبت نے مار ڈالا ہزار ایذا سے مجھکو ظالم ‌ ‌ ‌ ‌ رلا رلا کر گھلا گھلا کر جلا جلا کر مٹا مٹا کر

ہماری آنکھوں نے بھی تماشا عجب عجب انتخاب دیکھا ‌ ‌ ‌ ‌ برائی دیکھی بھلائی دیکھی عذاب دیکھا ثواب دیکھا

عبدالعزیز۔ ایم۔ اے۔ منشی فاضل

کامیابی

(از جناب منشی دیا نرائن صاحب نگم۔ بی۔ اے۔ ایڈیٹر "زمانہ" کانپور)

ظاہر ہے کہ دنیا میں ہر شخص کو ہر وقت اور ہر کام میں کامیابی کی ضرورت ہے۔ ہر ایک کوشش اور ہر ایک محنت کی غرض، مدعا اور نتیجہ کامیابی ہے۔ درحقیقت وہ کام ہی نہیں جس میں پورے طور سے حصول مدعا نہ ہو۔ ایک چھوٹے درجہ کے طالب علم سے لیکر قوم اور ملک کے بڑے بڑے مدبر تک۔ ایک غریب خوردہ فروش سے لے کر ملک التجار تک۔ معمولی کسان سے راجہ مہاراجہ تک۔ ایک چپراسی سے اعلیٰ ترین حاکم تک غرض جس کو دیکھئے اُسے اپنے پیشہ میں کامیابی مدنظر ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ دُنیا میں ہر ایک کو ہر کام میں کامیابی نہیں ہوتی؟ جب اُس کے حصول کی ہر ایک کو فکر ہے۔ اور اس لئے سب لوگ کوشش بھی کرتے ہیں تو پھر ہر فرد بشر منزل مقصود تک کیوں نہیں پہنچتا؟ کیا اس کے لئے معمولی سے زیادہ عقل اور اعتدال سے زیادہ محنت درکار ہے؟ بہت آدمی بظاہر محنت کرتے ہیں۔ اور اپنی مراد میں ناکام رہتے ہیں۔ اکثر دوسروں کی ناکامی کو اپنی کاہلی اور بیجا آرام طلبی کا بہانہ بنا لیتے ہیں۔ بعضے اپنے بے طریقہ محنت کا خاطر خواہ نتیجہ نہ پانے سے بیدل ہو کر سبھی کام کاج چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ یا تقدیر کے اندھا دُھند قائل ہو کر دنیاوی تدبیر سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان میں جہاں ہاتھ پیر چلانا داخل گناہ ہے۔ ایسی اور اسی قسم کی بہت سی مثالیں روزمرہ دیکھنے میں آتی ہیں۔ ایک آدمی کی ناکامیابی صرف اُسی کو نہیں۔ بلکہ بہت سے بندگان خدا کو بیدل اور پست ہمت اور کاہل بنا دیتی ہے۔ پس ضروری ہے کہ جو کام شروع کیا جائے وہ سوچ بچار کے بعد شروع ہو اور آغاز کے بعد اُس کے انجام بخیر کی ہمیشہ فکر رہے۔

کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ انسان کے دل میں اس کی آرزو بخوبی ذہن نشین ہو۔ دوسرے اس کے حصول کا مضبوط ارادہ ہو اور تیسرے مستقل مزاجی اور یکسوئی کے لئے مسلسل کوشش کرنے کا تہیہ ہو۔ اتنی ضروری باتوں پر دھیان دینے سے معمولی محنت کے ساتھ اوسط درجہ کی سمجھ کا آدمی بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

ہماری اکثر کوششیں محض اسی وجہ سے بیکار ہو جاتی ہیں کہ ہم ان کے لئے شروع سے آخر تک باقاعدہ محنت نہیں کرتے ہندوستانیوں میں ایسے بہت کم لوگ ہیں جو اپنے منشاء دلی اور اصلی غرض یا مدعا کو خود بھی بخوبی سمجھتے ہوں۔ یا جنہوں نے صحیح طور سے اپنی زندگی کی کوششوں اور محنتوں کے ماحصل پر غور کیا ہو مثال کے لئے ہندوستانی بچوں کی تعلیم کا مسئلہ

لیجئے۔ ایسے والدین کی تعداد بہت ہی کم ہوگی کہ جنہوں نے اپنی اولاد کی تعلیم شروع کراتے وقت یا اس سے قبل کبھی یہ سوچا ہو کہ ہمارا بچہ کیا کام کریگا۔ یا وہ کس کام کے لائق ہے یا کس غرض کے لئے ہم اُسے تعلیم دے رہے ہیں۔ عموماً یہی ہوتا ہے۔ کہ بغیر سوچے سمجھے پڑھانا شروع کر دیا اور جب تک اپنے ذرایع اور اس کی ہمت نے ساتھ دیا وہ پڑھا کیا۔ شروع سے ہم اس کو کسی خاص غرض کے لئے مخصوص نہیں کرتے۔ فراغت علم کے بعد جب فکر معاش ہوئی تو صاحبزادے ملازمت سرکاری کی طرف رجوع ہوئے۔ عرضی تان دی۔ اس میں نا کامیابی ہوئی وکالت کی طرف جھکے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ تجارت کا بھی حوصلہ ہے۔ لیجئے نہ اس کے رہے نہ اس میں ہوئے۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ ایسے طریقوں سے تضیع اوقات اور نقصان کے سوا اور کیا حاصل ہوتا ہے۔ چاہیئے کہ ضروری اور معمولی تعلیم کے بعد لڑکے کی طبیعت کی موزونیت۔ لیاقت کا اندازہ اور مزاج کا رُخ دیکھ بھال کر جس کام کے لایق ہو اس کی آئندہ تعلیم اسی لحاظ اور ڈھنگ پر کی جائے۔ پھر دیکھئے کہ اس دور اندیشی کے نتائج قابل اطمینان ہوتے ہیں یا نہیں۔ غرض ہر کام اور ہر ارادہ کے قبل اُس کے سب پہلوؤں پر غور کر لینا اور آخر نتیجہ و دلی مقصد معلوم کر لینا فرض ہے۔ ورنہ موہوم نتیجہ و نامعلوم اُمّید کے خیال سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

ارادہ کی مضبوطی کامیابی کی دوسری شرط ہے۔ یہ نہیں کہ گھڑی میں کچھ اور گھڑی میں کچھ دم بھر تو خیال رہا اور پھر فراموش۔ یکدلی ہر کام کے لئے لازمی ہے جو کام درپیش ہے۔ اور جو غرض حاصل کرنا ہے اس کا ہر وقت دھیان رہنا چاہیئے۔ یہ نہیں کہ باد نما کی طرح جس کسی نے چاہا رُخ بدلوا دیا۔

اس کے بعد مستقل مزاجی کے ساتھ باقاعدہ کوشش اور لگاتار محنت کی ضرورت ہے۔ محنت وہ چیز ہے۔ کہ خراب سے خراب اُجاڑ سے اُجاڑ زمین کو چمن و لالہ زار بنا دیتی ہے۔ درحقیقت جو نوجوان محنت کا عادی ہو گیا ہے۔ اُسے کامیابی کے بہت بڑے ذریعہ پر اقتدار حاصل ہو گیا ہے۔ محنت کسی کام کی نصف کامیابی ہے محنتی آدمی بھی بعض اوقات کسی نہ کسی وجہ سے ناکام ہوتے ہیں۔ مگر اُن کو کیا ڈر ہے۔ اگر مستقل مزاجی سے کوشش جاری ہے تو کسی نہ کسی روز ضرور کامیابی ہوگی۔ سمجھدار آدمی ناکامیابی کے سایہ میں نئے نئے تجربے حاصل کرتے ہیں۔ اور وہ پختہ و تجربہ کار ہو جاتے ہیں اور درحقیقت مستقل مزاجوں کی شکستیں منزل مقصود تک پہنچنے کے راستے میں مختلف قیام گاہوں کی طرح ہیں۔ ہندوستانیوں میں بلند حوصلگی اور فراخ ہمتی بہت کم ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض پیشوں کی طرف سب کا خواہ اس کے قابل ہوں یا نہ ہوں اس قدر جمگھٹا نظر آتا ہے۔ کہ دوسروں کی روٹیاں چھیننے کی کوشش میں بہت سے گھر بھوکے رہ جاتے ہیں۔ اور ہزاروں پیشے جو عام پیشوں سے بدرجہا زیادہ فایدہ مند اور نفع بخش ہیں۔ اُدھر کوئی راغب نہیں ہوتا۔ حالانکہ ہم کو معاش کے نئے ذریعے اور وسیلے پیدا کرنا چاہئیں۔ اور جس طرف بہت کم لوگ راغب ہوں اس طرف ہم کو خصوصیت سے کوشش و محنت کر کے اپنے پست ہمت ہموطنوں کو سبق دینا چاہیئے۔ دلیر آدمی اس سے کبھی نہیں ڈرتے کہ وہ کسی کام کو تنہا یا اوّل دفعہ کر رہے ہیں۔ بلکہ اس خیال سے اُن کی ہمت اور زیادہ بڑھتی ہے۔

ہمارے ملک میں یہ ایک عام قاعدہ ہو گیا ہے کہ کسی کام میں ایک آدھ مرتبہ ناکامیابی ہوئی یا خاطر خواہ نتیجہ نہ نکل سکا۔ تو چھوڑ بیٹھے۔ حالانکہ مستقل مزاجی سے مشکل سے مشکل کام آسان ہو جاتے ہیں۔ بہر حال تھوڑی بہت یا خفیف زک سے ہمیں اپنی ہمت نہ ہار بیٹھنا چاہیئے۔ کبھی کبھی بلکہ بیشتر ایسا ہوتا ہے۔ کہ قبل از وقت نتیجہ کی فکر ہوتی ہے۔ اور پوری کامیابی کی جستجو رہتی ہے۔ اور جہاں کہیں کوئی دیر طلب کام ہوا تو استغفر اللہ بے صبری ہوتی کہ خدا کی پناہ۔ برسوں کے کاموں کو دنوں کی میعاد بھی نہیں دیجاتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ بیموقع عجلت اور بے وقت جلد بازی سے سارا کام خراب ہو جاتا ہے۔ اور اس قابل افسوس بے صبری سے بہت سے کام انجام تک نہیں پہنچنے پاتے۔

یہاں پر میری یہ ہرگز مراد نہیں کہ نقصان وہ کام کو اندھے کی طرح کئے جائیں۔ بلکہ غرض یہ ہے کہ بخوبی غور و فکر کے بعد اگر کوئی کام نفع بخش ثابت ہو۔ تو اس کی ایک آدھ بار کی ناکامیابی سے ہمت نہ ہار بیٹھنا چاہیئے۔ بلکہ ثابت قدمی اور مستقل مزاجی سے اُس کو کئے جانا ضروری ہے۔

ہم کسی کام میں ہر وقت کوشش کرتے رہیں گے۔ تو ممکن نہیں کہ ایک نہ ایک روز ہمیں کامیابی نصیب نہ ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر کام کے لئے نفیس ہو۔ یا بھدا۔ بڑا ہو یا چھوٹا محنت اور استقلال ضروری ہیں۔

بعضوں کا یہ خیال ہے کہ ہر کام کے لئے معمول سے زیادہ عقل اور محنت کی ضرورت ہے۔ اکثر دیکھا گیا کہ جہاں کسی غبی یا سست لڑکے کو دیکھا۔ بس اس کی ناکامی کا فتویٰ دیدیا۔

بعضے دماغ ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کی ترقی کی رفتار سست مگر پختہ ہوتی ہے۔ جیسے بعض درخت ایسے ہوتے ہیں جنکا نشو نما بہت عرصہ میں ہوتا ہے مگر نہایت مضبوط اور شاندار ہوتے ہیں۔ دنیا کے بعض بڑے بڑے آدمی لڑکپن میں نہایت غبی سمجھے جاتے تھے۔ معمولی سمجھ اور اوسط درجہ کے مگر مسلسل اور باقاعدہ محنت ہر ایک انسان کو کام کے لائق بنا سکتی ہے۔ اکثر لوگ جو محنت کے عادی نہیں یا جو محنت کے نام سے بھاگتے ہیں وہ رعایت اور موقع کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اور ساری عمریوں ہی ضایع کر دیتے ہیں۔ رعایت اور ترقی میں طبعی عناد ہے۔ یہ دو باتیں ضدین ہیں۔ انکا اجتماع کسی طور پر ممکن نہیں۔ ممکن ہے کہ رعایت اور دوسروں کی امداد و اعانت سے اُس وقت یا موجودہ زمانہ میں کچھ ظاہری فایدہ ہو جائے۔ مگر وہ فایدہ ہرگز دیرپا اور مستقل نہیں ہو سکتا ہے۔ رعایت بغیر قابلیت کے دم بھر کا فایدہ اور چشم زدن کی چمک ہے۔ جہاں کہیں قابلیت ہے وہاں رعایت سے نفرت ہو گی۔ کیونکہ یہ اصلی ترقی کی ہارج ہے۔ اور یوں بھی ہے

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است   رفتن بہ پائے مردی ہمسایہ در بہشت

بعض صاحبوں کو کسی کام کو شروع کرنے کا کبھی معقول موقع ہی نہیں ملتا۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر ہمیں دنیا میں کوئی کام کرنا ہے تو موقع ہمیں خود تلاش کرنا چاہیئے۔ ہر ایک کام کے لئے درحقیقت ہر وقت موقع ہے۔ اور ہر مشکل کام محنت اور استقلال سے آسان ہو جاتا ہے۔

بسیرا

ایک جاپانی مصور کا شاہکار

رازِ تخلیق

(جناب مولوی عبدالغنی صاحب مدرس مڈل سکول گھونڈ)

(۱)

ہستی کے اُس سرے سے آیا ہے اک مسافر
میرے عزیز کے گھر
آ اُس سے جاکے پوچھیں کچھ اُس جہاں کی باتیں
اُس سرزمیں کی باتیں آیا ہے وہ جہاں سے
کیا واں بھی آدمی ہیں حرص و ہوا کے بندے
ہر دل کے ساتھ واں بھی کیا خارِ غم ہیں اٹکے
کچھ اس جہاں کی باتیں
آ اُس سے جاکے پوچھیں

(۲)

اے مرکزِ محبت خاموش ماہ پارے
معصومیت کے پُتلے
کیوں آگیا وہاں سے دنیا کے غمکدے میں
ہے یہ دیار ہستی رنج و الم کی بستی
غم ہے مصیبتیں ہیں دنیا میں آفتیں ہیں
تاریک ہے یہ دنیا اے راہِ حق کے جویا
دنیا کے غمکدے میں
کیوں آگیا وہاں سے

(۳)

تجھ کو جو دیکھتا ہوں ہوتا ہے دل میں برپا
طوفاں مسرتوں کا
اے حاصلِ جوانی اے شمعِ زندگانی
اے نُور کے ستارے تسکینِ جاں ہے تجھ سے
پیری کا تو عصا ہے معصوم و بے ریا ہے
اک حسن ہے سراپا اک عشق ہے دل افزا
اے شمعِ زندگانی
اے حاصلِ جوانی

(۴)

ہاں ہاں سمجھ گیا میں اور خوب پاگیا میں
آمد کا تیری منشا
اس صانعِ ازل نے اس خالقِ جہاں نے
فردوس کے چمن سے خوشبوں کے اُس جہاں سے
اک پھول خوش نما سا بھیجا ہمارے گھر میں
تا غم غلط کرے وہ ہم کشتگانِ غم کا
ہاں ہاں سمجھ گیا میں
آمد کا تیری منشا

(۵)

اے مخزنِ محبت اے نغمۂ مسرت آلودہ ہو نہ جائے دل تیرا معصیت سے
اے رازدارِ الفت تو فخرِ خانداں ہو عصمت کا اک جہاں ہو
ہاں ہاں سنبھل کے چلنا ظلمت کے اس مکاں میں ظلمت کے اس مکاں میں
ملبوسِ نور ہو کر آیا ہے تو جہاں میں ہاں ہاں سنبھل کے چلنا

بہار

واہ وا کس شان سے پھر اب کے آتی ہے بہار اک نیا انداز گلشن میں دکھاتی ہے بہار
نوجوانانِ چمن سرشار ہیں اس دور میں میکشوں کو مژدۂ راحت سناتی ہے بہار
پھونکتی ہے ایک روحِ تازہ ہر دل میں صبا عیسوی اعجاز سے مُردے جلاتی ہے بہار
کاکلیں کھولے ہوئی ہیں نوعروسانِ چمن نافۂ سنبل سے خوشبوئیں اڑاتی ہے بہار
ہے ہر اک فردِ بشر محوِ تماشائے جمال ہے صبا سرمست رقصاں زمزمہ گاتی ہے بہار
غنچۂ سربستہ کہنے کو ہے اپنا حالِ دل رازِ کلیوں کی چٹک سے کہہ سناتی ہے بہار
غازۂ خوش رنگ سے کرتی ہے تازہ روئے گل اور کفِ محبوب میں مہندی رچاتی ہے بہار
کر نہیں سکتا بیاں کچھ طالبِ کج مج زباں
دیدۂ بینا میں رنگ اپنا جماتی ہے بہار

طالب کاشمیری

ماسٹر لچھمی چند صاحب ودیارتھی بی اے بی ٹی
چیف ایڈیٹر رسالہ ہذا

پنڈت لبھو رام صاحب جوش ملسیانی منشی فاضل ادیب فاضل
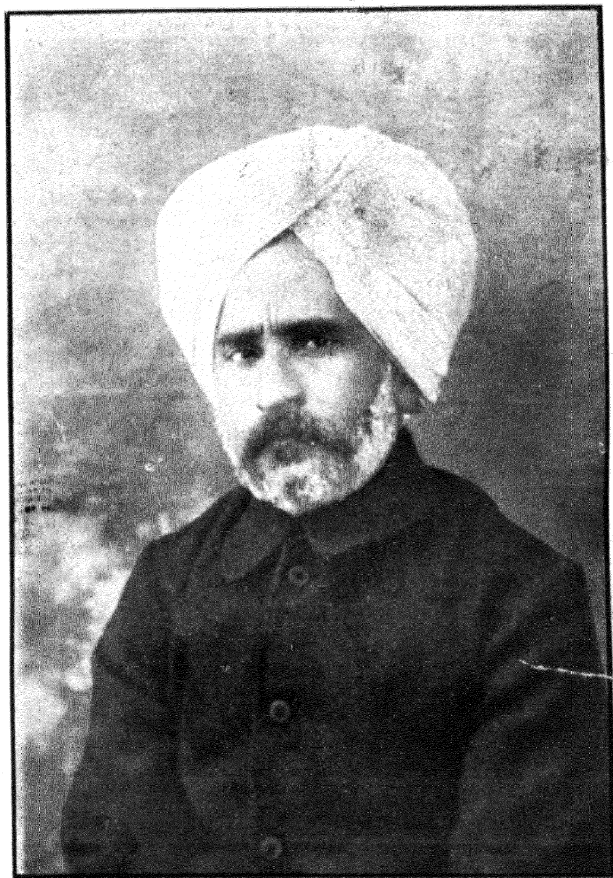
مولوی محمد نوح صاحب نوحؔ

خلف مولوی عبدالمجید صاحب (مرحوم) رئیس قصبہ نارہ پرگنہ کڑا ضلع الہ آباد

آپ کے والد ماجد مولوی عبدالمجید صاحب کو گورنمنٹ کی جانب سے غدر ۱۸۵۷ء کی خیرخواہی کے صلے میں ایک علاقہ ملا تھا جس کی سالانہ آمدنی دس ہزار روپیہ سے زیادہ ہے۔ آپ ۱۲۹۶ھ غالباً مطابق ۱۸۷۹ء میں بمقام موضع بھوانی پور تحصیل سلون ضلع رائے بریلی نانا شیخ علم الہدیٰ صاحب کے دولت کدہ پر پیدا ہوئے۔ ابھی اچھی طرح ہوش بھی نہ سنبھالا تھا۔ کہ مولوی عبدالمجید صاحب نے سرکاری ملازمت میں سب جج کے عہدے تک پہنچ کر ۲۶ جون ۱۸۸۳ء کو انتقال فرمایا۔ چونکہ آپ اس وقت بہت کم عمر تھے۔ اس لئے جملہ ریاست کا انتظام آپ کی نانی صاحبہ کے حقیقی بھائی سید حسن صاحب کے تعلق کیا گیا۔ دس بارہ برس تک خاندان کے باہمی جھگڑوں کے سبب سے آپ کی ریاست پر نادر شاہی حملے اعزا و اقربا کی طرف سے ہوتے رہے۔ جن کا اثر موجودہ سرمایہ پر بہت پڑا۔ اس بدنظمی کو دیکھتے ہوئے چودہ برس کے سن میں آپ نے انتظام جائداد کا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور چند ہی دنوں میں شر و فساد رفع ہوگئے۔ اور حکام رس کہلانے لگے۔

پہلے حافظ قدرت علی صاحب و مولوی یوسف علی صاحب ساکنان نارہ پھر حاجی عبدالرحمن صاحب جائسی آپ کی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے۔ پھر میر نجف علی صاحب سے فارسی کی انتہائی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کچھ دنوں تک نج کے طور پر اپنے مکان پر آپ نے انگریزی بھی پڑھی۔ شعر و سخن کا شوق بھی آپ کو میر نجف علی صاحب ہی کی صحبت میں ہوا۔ شروع شروع میں آپ انہی سے اصلاح لیتے رہے۔ لیکن آپ ذہین سلاست پسند و بلند خیال تھے۔ اس لئے استاد نے دوسرے استاد سے اصلاح کیلئے فرمایا۔ بہت ردوبدل کے بعد آخر کار نواب فصیح الملک دبیر الدولہ ناظم یار جنگ مرزا خاں صاحب داغ دہلوی کے حلقہ شاگردی میں داخل ہوئے۔

ابھی اصلاح لیتے ہوئے دو برس نہ ہوئے تھے۔ کہ استاد کی قدمبوسی کے شوق میں عزیز و اقربا سے چھپ کر آپ حیدرآباد پہنچے۔ آپ کو دیکھکر حضرت داغ نے فرمایا۔ کہ مجھے تمہارے نوح ہونے میں شک ہے۔ کیونکہ تمہارے کلام سے مجھے معلوم ہوتا تھا کہ نوح سن رسیدہ ہونگے۔ مگر جب آپ نے یقین دلایا۔ تو حضرت داغ نے بہت کچھ خاطر و مدارات کی۔ اور مزاحاً فرمایا۔ کہ ہم جانتے تھے۔ کہ نوح حضرت نوح کے ہم عمر ہونگے۔ لیکن یہ تو بہت کم عمر ہیں۔ آپ کو استاد کا کلام بہت یاد تھا۔ اس سے آپ کی نسبت حضرت داغ کا یہ لطیفہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ دیوان حافظ پہلے

دیکھا تھا۔ مگر حافظ دیوان آج ہی دیکھا۔ جب آپکے استاد نے آپ کے حیدرآباد پہنچنے کی خبر آپ کے گھر میں بھیجی۔ تو آپکے لانے کیلئے آپ کے عم زادہ بھائی منشی عبدالحمید صاحب تشریف لے گئے۔ ان کی خاطرداری بھی حضرت داغ نے بہت کچھ فرمائی۔ کچھ دنوں کے بعد آپ اپنے وطن واپس آئے۔ اور خطوط کے ذریعے اصلاح لیتے رہے۔ ابھی دو تین ہی سال گذرے تھے۔ کہ آپ نے اپنی محنتِ سخن سے ایسی ترقی فرمائی۔ کہ زیادہ غزلیں بغیر اصلاح واپس آنے لگیں۔ اس ترقی کو دیکھ کر حضرت داغ نے خود پھر دوبارہ اپنے پاس بلایا۔ اور اب مکرر ۱۹۰۲ء میں حسب الطلب استاد دکن گئے اور بہت دنوں تک رہ کر حضرت داغ و جناب ظہیر دہلوی سے مہری و دستخطی سندیں حاصل کیں۔ حضرت داغ آپ کو اپنا عزیز جانتے تھے۔ چنانچہ حضرت داغ کی صاحبزادی یعنی اہلیہ جناب نواب مرزا سراج الدین احمد صاحب سائل دہلوی آپ سے کسی قسم کی مغائرت نہیں فرماتیں۔ بے تکلف گفتگو کرتی ہیں۔ دوسری بار دکن سے مراجعت کے وقت حضرت داغ نے باہتمام سید رضی الدین صاحب کیفی تصویر کا ایک گروپ کھنچوایا تھا جس پر آپ کو خاص طور پر نمایاں جگہ دی گئی تھی۔ یہ گروپ آپکے کمرے میں اور تصویروں کے ساتھ آویزاں ہے۔ آپ کا کلام استاد کی زندگی ہی میں استاد کے کلام سے ملتا جلتا تھا۔ بیان کی شوخی زبان کی صفائی محاوروں کی بے تکلفی اور الفاظ کی پسندیدہ الٹ پلٹ حضرت داغ کے کلام کی طرح جناب نوح کے بھی کلام کی جان ہے ان باتوں کی تصدیق میں جی تو یہی چاہتا تھا۔ کہ ان اسناد کی نقلیں جو حضرت داغ و جناب ظہیر دہلوی نے آپ کو عطا فرمائی ہیں۔ درج کی جائیں۔ لیکن طوالت کا خیال ہے۔ یوں بھی شائقین آپکے دیوان اول و دوم میں دیکھ سکتے ہیں۔ حضرت داغ دہلوی کے انتقال کے بعد جانشینی کے جھگڑے بہت دنوں تک چلتے رہے۔ اور اس کے مدعی بہت سے تھے لیکن جب سے جناب سائل دہلوی نے اپنی تحریر کے ذریعے سے آپ کو حضرت داغ دہلوی کا جانشین مان لیا۔ اس وقت سے اس بحث میں زیادہ خامہ فرسائی کی نوبت نہیں آئی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں۔ کہ سب نے آپ کو جانشین مان لیا بلکہ ایک بڑی جماعت نے اس کو تسلیم کیا۔ اور چند لوگ مخالف رہے۔

آپ بڑے بڑے معرکۃ الآرا مشاعروں حیدرآباد۔ پٹنہ۔ گیا۔ بھوسا ول بین پوری بدایوں۔ فتح پور۔ غازی آباد۔ لکھنؤ سندیلہ مارہرہ۔ ہاپور۔ شاہجہان پور لشکر گوالیار۔ میرٹھ۔ الہ آباد وغیرہ وغیرہ میں شریک ہو کر داد سخن حاصل کر چکے ہیں۔ اور انہی مقامات سے آپ کو فصیح العصر تاج الشعرا ناخدائے سخن کے خطاب بھی ملے ہیں۔ آپکے دو دیوان سفینۂ نوح وطوفان نوح چھپ چکے ہیں پہلے دیوان کے دو ایڈیشن نکلے۔ اور اسقدر مقبول ہوا۔ کہ اب اس کی ایک کاپی بھی کہیں تلاش سے نہیں ملتی۔ دوسرا دیوان کچھ دن ہوئے شائع ہوا ہے۔ اس کی مانگ بھی اسقدر ہے جس سے یقین ہوتا ہے۔ کہ کئی ایڈیشن نکالنے پڑیں گے۔ تیسرا دیوان بھی قریب قریب تیار ہو چکا ہے۔ مگر ابھی شائع نہیں ہوا۔ ہمارے خیال میں اس وقت کوئی ایسا بڑا شہر نہ ہوگا۔ جہاں کوئی نہ کوئی آپ کا شاگرد نہ ہو۔ اس وقت شاگردوں

کی تعداد قریب قریب ۴۰۰ ہے ۔ اس تعداد میں چالیس پچاس آدمی نہایت اچھے کہنے والے ہیں ۔ اور بجائے خود صاحب دیوان ہیں ۔

ہزاروں پرچہ رسالہ گلدستہ اخبار اطراف عالم سے نکلے ۔ اور نکل رہے ہیں ۔ پیشتر ان میں بھی آپ کا کلام شائع ہوا ۔ اور ہوتا رہتا ہے ۔ اب دو چار سال سے آپ اپنا کلام رسالوں میں کم بھیجتے ہیں ۔ بیاض میں سے کسی شاگرد نے لکھ کر بھیج دیا ۔ تو چھپ گیا ۔ ورنہ عدیم الفرصتی مانع رہتی ہے ۔

آپکے دو صاحبزادے ابو الحسن اور محمد خضر ہوئے ۔ بڑے صاحبزادے کا انتقال تو چودہ برس کی عمر میں اور چھوٹے کا چھ برس کی عمر میں ہوگیا ۔ اس وقت سے کوئی اولاد نہیں ہوئی ۔ اس وقت ایک صاحبزادی اور ایک نواسہ مجید احمد سلمہ اور ایک نواسی ہے اسی نواسہ کے حق میں آپنے اپنی کل جائداد بذریعہ وقف علی الاولاد کے منتقل کر دی ہے ۔

اخلاق و عادات ۔

حضرت نوح کی طبیعت نہایت صلح کل اور مرنجاں مرنج واقع ہوئی ہے ۔ اور یہ اس محبت و ہمدردی کا لازمی نتیجہ ہے ۔ جو ان کی رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے ہے ۔ حلقۂ احباب بہت وسیع ہے ۔ اور سب ان کے حسن اخلاق و اوصاف حمیدہ کے مداح ہیں ۔ وہ اپنی طرف سے کبھی کسی کو ناراض ہونے کا موقع نہیں دیتے ۔ یہاں تک کہ کسی کی زبان سے غلط شعر سن کر بھی خاموش ہو رہتے ہیں ۔ اس خیال سے کہ ایسا نہ ہو کسی کی دلشکنی ہو جائے یا کوئی برا مانے ۔ ہجو یہ کلام سے ان کا دامن بالکل پاک ہے ۔ استادوں کا ادب و احترام اس حد تک ہے ۔ کہ استادوں کی زمین میں غزل کہنی سوء ادب خیال کرتے ہیں ۔ ان کے کلام میں ایسی غزلیں بہت کم ہیں جو پامال زمینوں میں لکھی گئی ہوں ۔ اگر کسی پرانی زمین میں یا کسی کے دیے ہوئے مصرع طرح پر غزل کہنے کا اتفاق ہوا ہو ۔ تو اسے امر مجبوری سمجھنا چاہئے ۔ ورنہ نئی نئی زمینیں خود تلاش کر لیتے ہیں اور ان میں اپنی شگفتہ طبیعت کے جوہر دکھا کر باغ و بہار کا منظر پیدا کرتے ہیں ۔ اگر استادوں کی زمین میں کچھ کہنے کو طبیعت چاہے ۔ تو ردیف یا قافیہ یا بحر میں تھوڑی سی تبدیلی کر لیتے ہیں تا کہ بے ادبی سے دُور رہیں ۔

شعرائے دہلی و لکھنؤ کے باہمی جھگڑوں میں کبھی شامل نہیں ہوتے ۔ اکثر ایسا ہوا ہے ۔ کہ کسی مشاعرہ میں داغ صاحب کی غیر طرحی غزل بطور تبرک پڑھی گئی ہے ۔ تو حضرت نوح نے امیر مینائی کی کوئی غیر طرحی غزل بھی خاص اصرار سے پڑھوائی ہے ۔ مشاعروں میں شعرا کا یہ جھگڑا کبھی ختم نہیں ہوتا ۔ کہ پہلے کون پڑھے اور اخیر میں کس سے پڑھوایا جائے ۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے ۔ کہ میں اخیر میں پڑھوں ۔ اگر مساوی حیثیت کے کئی شاعر کسی مشاعرہ میں جمع ہو گئے ہوں ۔ تو یہ جھگڑا اور بھی نازک ہو جاتا ہے ۔ مہتمم مشاعرہ کی شامت آجاتی ہے ۔ جس کا نام پہلے آگیا ۔ وہی ناراض ۔ ناچار یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے ۔ کہ حروف تہجی کے اعتبار سے غزل پڑھوائی جائے ۔ تا کہ کسی صاحب کو شکایت نہ رہے ۔ اس قسم کے جھگڑوں میں بھی

حضرت نوح اپنے انکسار کا ثبوت دیتے ہیں اور صاف کہدیتے ہیں کہ مجھے جس وقت کہا جائے گا۔ اسی وقت اپنی غزل پڑھ دونگا۔

کلام کی داد دینے میں بھی وہ بہت شہرت رکھتے ہیں۔ اور اس خاص وصف کی وجہ سے بھی کسی مشاعرے میں ان کا موجود ہونا غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ اس گئے گذرے زمانے میں بیچارے شعرا کو صرف واہ واہی اڑانے لئے پھرتی ہے۔ اگر اس میں بھی بخل روا رکھا جائے۔ تو فی الواقع شاعر کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ حضرت داغ ہی کے شاگردوں میں ایک نامور شاعر جن کا نام ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں (واقف اصحاب خود ہی سمجھ جائینگے) کچھ ایسی افتاد طبیعت رکھتے ہیں اور کچھ ایسے بے باک واقع ہوئے ہیں۔ کہ مشاعرہ میں اگر کسی نے کسی کو مکرر ارشاد ہو کہدیا۔ تو یہ فوراً بول اٹھتے ہیں۔ کہ نہیں کوئی ضرورت نہیں۔ ہم عصروں کا کلام سنتے ہیں۔ انصاف طبیعت پر غالب آگیا۔ تو کسی شعر پر یہ ارشاد ہو جاتا ہے۔ کہ یہ قافیہ آپ نے مجھ سے اچھا باندھا ہے۔ ورنہ ہر شعر پر یہ کہدیتے ہیں۔ کہ یہ قافیہ میں نے اچھا لکھا ہے۔ مختلف بہانوں سے ان کو مجلس سے الگ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ صحبت میں بے لطفی پیدا نہ ہو۔ کئی شعرا ایسے بھی دیکھے گئے ہیں۔ کہ کسی کے کلام پر سر ہلانا گناہ سمجھتے ہیں۔ اور اچھے سے اچھے شعر کی داد دینے میں نہایت بخل سے کام لیتے ہیں۔ برخلاف ان کے حضرت نوح غلط اور سقیم شعر سنکر خاموش رہیں تو رہیں۔ ورنہ ہر اچھے شعر کی داد دینے میں وہ بہت ہی فراخدل ہیں۔ اور یہ بات کچھ تصنع سے نہیں۔ ذوق سخن ان کو بے اختیار کر دیتا ہے۔

عام اخلاق و مروت کے لحاظ سے وہ ہندوستانی شرفا کا بہترین نمونہ ہیں۔ ایسے جامع جمیع اوصاف آدمی بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ ہر ایک ہندوستانی نوجوان کیلئے ان کا دستور اخلاق قابل تقلید ہے۔ اس گئے گذرے زمانے میں جب کہ ہر ایک چیز مغربی تہذیب کے طوفان میں بہ رہی ہے۔ مشرقی تہذیب کے عمدہ نمونے اگر انتخاب کئے جائیں۔ تو حضرت نوح کا نام نامی نہایت اچھا انتخاب ہے۔ اور کسی کو اس میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ ان کے اوصاف حسنہ پر ایک مبسوط مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ مگر چونکہ ہمارے مضمون کا موضوع ان کے کلام بلاغت نظام کا تبصرہ کرنا ہے۔ اس لئے دوسری مفید باتوں کو چھوڑ کر ان کے کمال شاعری پر ناظرین کی توجہ مبذول کی جاتی ہے۔

بیشتر اس کے کہ اہل ذوق حضرت نوح کے پایۂ سخن کا کوئی صحیح اندازہ کر سکیں۔ یہ جان لینا ضروری ہے کہ انہوں نے متروکات فصحائے حال کے علاوہ بہت سی ایسی پابندیاں اختیار کر رکھی ہیں۔ جو آج تک کسی نے اختیار نہیں کیں۔ مثلاً وہ قاتل بسمل مشکل وغیرہ قافیوں کے ساتھ مائل حائل حامل وغیرہ قوافی نہیں لاتے۔ حالانکہ تمام اساتذۂ سابق وحال نے اپنے کلام میں یہ تمام قافیئے مخلوط لکھے ہیں۔ وہ دریا صحرا کے ساتھ جلوہ.

شعلہ وغیرہ کے قافیے بھی نہیں لاتے بطلع اول کے دونوں مصرعوں میں قافیے اگر اردو زبان کے ہوں۔ تو غزل کے باقی اشعار میں بھی اردو کے قافیے لکھیں گے۔ اور اگر مطلع اول میں فارسی یا عربی کے قوافی آئے ہیں۔ تو غزل میں اردو کا کوئی قافیہ آنے نہ دیں گے۔ اگر مطلع اول میں ایک مصرع کا قافیہ اردو اور دُوسرا فارسی یا عربی ہے تو صرف اس صورت میں مخلوط قافیے باقی اشعار میں لکھیں گے۔

اس کے علاوہ اگر دو لفظ مل کر با معنی لفظ ہو جائے۔ تو اسے نہیں لکھیں گے۔ مثلاً ہے اور جان کو بالاتصال نہیں آنے دیں گے۔ کیونکہ ان کے ملنے سے لفظ ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ کوئی لفظ سین پر ختم ہوتا ہے۔ تو اس کا مابعد ایسا نہ لکھیں گے۔ جو سین سے شروع ہوتا ہو۔ کیونکہ ایک ہی آواز کے دو حرف مل کر ثقل پیدا کرتے ہیں۔ پر کی جگہ پہ نہیں لکھتے۔ کھا کر اٹھا کر کی جگہ کھا کے اٹھا کے نہیں لکھتے۔ ارمان کے ساتھ مہمان کا قافیہ مطلع میں نہیں لاتے۔ اس لئے کہ حرفِ روی سے پہلے میم دونوں میں مشترک ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بادی النظر میں ان پابندیوں کو شاید لزوم مالایلزم سمجھا جائے۔ اور یہ کہا جائے۔ کہ یہ زبان کو محدود کرنے کی کوشش ہے۔ یا اس سے شعر گوئی میں بہت سی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور یہ دشواریاں پہلے ہی کچھ کم نہیں۔ جو ماہرین فن نے اردو فارسی کی شاعری پر عائد کر رکھی ہیں۔ ایک مبتدی کی غزل پر فن کے لحاظ سے تنقید کی جائے۔ تو وہ بیچارا متحیر ہوتا ہے۔ اور پوچھتا ہے۔ کہ اتنی پابندیوں کے ہوتے ہوئے کوئی شخص اپنے خیالات آزادی سے کس طرح ظاہر کر سکتا ہے۔ ایک شخص اچھی مثنوی بحر ہزج مثمن سالم میں لکھتا ہے (مثلاً شاہنامہ اسلام) مگر جب اسے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ مثنوی کی مقررہ بحروں سے خارج ہے۔ تو اس کو اپنی محنت پر افسوس ہوتا ہے۔ ان بے انتہا پابندیوں پر اتنی کڑی بندشیں جو حضرت نوح نے التزاماً اختیار کر رکھی ہیں۔ اور بڑھا دی جائیں۔ تو شعر کہنا سخت دشوار ہو جاتا ہے۔ مگر انصاف سے دیکھا جائے۔ تو یہ پابندیاں پابندیاں نہیں۔ بلکہ اصلاحات ہیں۔ اور فی الحقیقت نہائت عمدہ اور قابل قدر ہیں۔ اور زبان کو حشو و زوائد اور عیوب و نقائص سے مبرا و منزہ کرنے والی ہیں۔

ہماری اس رائے سے ممکن ہے کہ بعض اصحاب کو اتفاق نہ ہو۔ مگر اس مضمون میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ باوجود ایسی دشوار پابندیوں کے اردو شاعری میں حضرت نوح نے کس قدر کمال دکھایا ہے۔ اور شہبازِ تخیل نے پہلے سے بھی زیادہ رشتہ بہ پا ہو کر کتنی رفعت تک پرواز کی ہے۔ ایسی کڑی زنجیریں بڑھا دینے پر بھی اگر کوئی سامری فن اپنی سحر بیانی کا معجزہ دکھا سکتا ہے اور اپنی خوش بیانی کا سکہ بٹھا سکتا ہے۔ تو بلاشبہ اس کی کوشش اور محنت کی وقعت ناقدانِ سخن کے نزدیک بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور ہر شخص اس مصنف کی سعی بلیغ کی داد

دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اتنی تمہید عرض کر چکنے کے بعد اب ہم کلام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ حضرت نوح کے نوادر افکار میں حمد۔ نعت منقبت۔ سلام۔ قطعہ۔ رباعی۔ مثنوی۔ مرثیہ اور غزل ہر قسم کا کلام موجود ہے۔ مگر زیادہ تر غزل لکھتے ہیں یہی وجہ ہے۔ کہ مجموعہ غزلیات دوسری قسم کے کلام کے مقابلے میں بہت زیادہ اور ضخیم ہے۔ اگرچہ کسی شاعر کی قادر الکلامی کا اندازہ نظم کی کسی ایک صنف سے بھی بخوبی ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے مزید ثبوت کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے۔ کہ اس کی طبیعت ہر قسم کا کلام لکھنے پر حاکمانہ قدرت رکھتی ہو۔ بہت سے شاعر ایسے تھے اور ایسے ہیں۔ کہ نظم کی ایک صنف میں تو خوب لکھتے ہیں۔ مگر دوسری صنف میں ان کا قلم شکستہ پا دکھائی دیتا ہے۔ حضرت ناسخ مرحوم غزل گوئی میں اتنے نامور اور مسلم الثبوت استاد تھے۔ مگر "مثنوی مصالح اعضائے انسانی" ان کے پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ زمانۂ حال کے بہت سے مشہور اور مشاق غزل گو ایسے ہیں۔ جو غزل کے سوا اور کوئی تقریبی یا ہنگامی نظم یا ملکی و قومی رنگ میں یا تو لکھ ہی نہیں سکتے۔ اور اگر لکھتے ہیں تو بہت ہی معمولی اور پھیکا لکھتے ہیں۔ مگر حضرت نوح کے کلام میں نظم کی ہر ایک صنف موجود ہے اور ہر صنف میں ان کی طبیعت کا رنگ یکساں ہے۔ ان کے کلام کی متعدد خصوصیتیں آگے چل کر بیان کی جائیں گی۔ قطعہ۔ رباعی۔ حمد۔ نعت۔ سلام۔ مرثیہ وغیرہ سب میں اپنی پوری قوت سے نمایاں نظر آتی ہیں۔ خوش بیانی اور استادانہ بندش کا رشتہ کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ جو کچھ کہتے ہیں۔ ایک رنگ میں کہتے ہیں۔ ان کے سلام اور مرثیے ان کے ظریفانہ کلام کے بالمقابل رکھ کر پڑھے جائیں۔ تو تعجب ہوتا ہے۔ کہ اتنا درد بھرا کلام لکھنے والا شخص ہنسی ٹھٹول کے ایسے مضامین کہاں سے نکال سکتا ہے۔

چونکہ کلام کا بڑا مجموعہ غزلیات کی صورت میں ہے۔ اس لئے پہلے غزل ہی پر بحث کی جاتی ہے۔ اس وقت غزل کے کئی نمونے دنیائے ادب کے سامنے ہیں۔ ایک تو وہ رنگ ہے جس میں حضرت داغ یا حضرت امیر نے قبولیت عام و شہرت دوام کا تاج حاصل کیا۔ ان دونوں باکمال استادوں کے شاگرد اسی رنگ کے شیدائی ہیں۔ دوسرا رنگ وہ ہے جس میں درد اور کیف کے سوا تیسری چیز نہیں ہے۔ اس قسم کی غزل شعریت کے اعتبار سے خواہ کتنی ہی بلند ہو۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ سرتاپا مرثیہ ہے۔ جس کو غزل کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس رنگ سے افسردگی۔ پژمردگی۔ بیزاری اور زار نالی کے سوا اور کوئی ایسا اثر پیدا نہیں ہوتا۔ جسے زندگی بخش کہا جا سکے۔ حالانکہ ملکی اور جماعتی ضروریات اس بات کا تقاضا کرتی ہیں۔ کہ شاعری تمام افراد ملک کے لئے حیات افروز ہو۔ اگر اس سے شگفتگی اور زندگی حاصل نہیں ہوتی۔ تو جمہور کو اس سے

کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس نظریہ کے مطابق اگر غزل کی جانچ کی جائے۔ تو حضرت داغ کی غزل سب سے بہتر نمونہ تسلیم کی جائے گی۔ تیسرا رنگ وہ ہے۔ جس میں صرف زبان ہی زبان ہے۔ اور تخیل کو اس میں بہت کم دخل ہے۔ یہ رنگ زبان کی خدمت گزاری کے لئے تو بیشک مفید ہے۔ مگر تخیل کے عدم سے وہ شاعرانہ کمال میں شامل نہیں ہو سکتا۔ زبان کی خوبی آرائش و زینت کا سامان ہوا کرتی ہے۔ اگر زینت پانیوالے کا وجود ہی بیچ میں نہ ہو۔ تو یہ سامانِ زینت کس کے لئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرز کو صرف باتیں ہی باتیں کہا جاتا ہے۔ مثلاً

ع تمہیں چاہو تمہیں چاہو تمہیں چاہو رقیبوں کو کبھی ہم نے نہ چاہا تھا نہ چاہیں گے نہ چاہا ہے

چوتھا رنگ فلسفیانہ و حکیمانہ ہے۔ افراد ملک کے لئے یہ رنگ بھی مفید ہے۔ بشرطیکہ بیان کی صفائی بھی اس کے ساتھ شامل حال ہو۔ مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ کوشش کی جاتی ہے۔ کہ شعر کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔ اور غزل معمّا بن کر رہ جائے۔ اس کے علاوہ ایک اور خرابی اس طرز میں مستزاد ہو رہی ہے وہ یہ کہ غیر متعارف الفاظ دور دور کے استعارے اور عجیب عجیب فارسی ترکیبیں جن میں غرابت کا عیب پایا جائے۔ نہایت کثرت سے استعمال میں آ رہی ہیں۔ اس لئے جب تک یہ عیوب موجود ہیں۔ اُس وقت تک اس قسم کی غزل چنداں سود مند نہیں ہو سکتی۔ پانچواں رنگ وہ ہے جس میں ملکی۔ قومی۔ تاریخی۔ اخلاقی اور ظریفانہ مضامین غزل کی طرز میں ادا کئے جاتے ہیں۔ اس قسم کی غزل کو غزل کہنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ تغزل کی کوئی بات اس میں نہیں ہوتی۔ یہ پانچوں نمونے مختلف طرز کے اس وقت ملک میں مروج ہیں۔ جن میں ایک مشترک خوبی یہ ہے کہ تہذیب جدید کے اثر سے جسے نئی روشنی کہا جاتا ہے۔ بالکل عریاں اور حیا سوز مضامین ہر قسم کی غزل سے مفقود ہو چکے ہیں۔ وجہ یہ ہے۔ کہ زمانے کے مذاق نے ایسی تمام خرافات کو قابل نفرت اور آداب مجلس سے خارج قرار دیا ہے۔ حضرت نوح کی غزل بھی اس اثر سے متاثر معلوم ہوتی ہے۔ کسی قسم کے برہنہ مضامین جن کا وجود دورِ آخر کے تمام شعرا کے کلام میں کم و بیش موجود تھا۔ ان کی غزل میں نہیں پائے جاتے۔

مذکورہ بالا قسم کی پانچوں غزلیں اگر ایک جگہ رکھی جائیں۔ اور غزل کی تعریف جو فن کی کتابوں میں درج ہے اس کے لحاظ سے اچھی غزل کا انتخاب کیا جائے۔ تو ہمارے خیال میں وہ غزل انتخاب میں آئے گی۔ جو پہلی قسم کے رنگ میں لکھی گئی ہے۔ حضرت نوح کی غزل بھی اسی رنگ میں ہوتی ہے جس کو پڑھ کر کسی قسم کی افسردگی یا بیزاری پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ شگفتگی و زندگی کا ایک دریا اپنی موج میں بہتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ زبان نہایت شیریں اور شستہ۔ اس پر سلیس اور عام فہم اتنی کہ ہر شخص سمجھ سکے۔ بیان اس قدر صاف اور سلجھا ہوا کہ شعر پڑھا اور دل میں اترا۔ بندشیں اتنی ٹھوس کہ کوئی لفظ اپنی جگہ سے نہیں ہلایا جا سکتا۔ حشو و زوائد کا نام تک نہیں پایا جاتا۔

مضامین اتنے بلند۔ تازہ اور دلکش گویا معانی کے آسمان پر بیشمار نورانی صورتیں اپنے جہاں آرا جمال کے جلوے دکھا رہی ہیں اور پکار پکار کر کہ رہی ہیں۔ کہ آنکھوں والو! ذرا ادھر تو دیکھو۔ ان جلوؤں کو ایک نظر دیکھ کر اگر ہوش باقی رہ جائے۔ تو پھر بتانا کہ ہم کیا چیز ہیں۔

مناسب یہ تھا کہ اس مقام پر کم سے کم تین چار غزلیں سالم نقل کی جاتیں۔ مگر ایک تو حضرت نوح کی غزل عموماً لمبی ہوتی ہے۔ وہ اپنی پُرگوئی کے تقاضے سے جب تک پندرہ یا بیس شعر بلکہ بعض حالتوں میں اس سے بھی زیادہ اشعار نہ لکھ لیں اور غزل کی زمین کو اپنی گرم رفتاری سے اچھی طرح پامال نہ کر ڈالیں۔ اس وقت تک ان کی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ کہ اس مضمون کی طوالت کا خوف بھی دامنگیر ہوتا ہے۔ اس لئے صرف ایک غزل جو مختصر بھی ہو۔ بطور نمونہ یہاں درج کی جاتی ہے۔ تاکہ اہلِ ذوق غزل کی مجموعی نوعیت کا اندازہ کرسکیں۔ اس کے بعد محاسن کلام کو تفصیل وار بیان کیا جائیگا۔

غزل

دل ملا کر دل کو وہ کرتا ہے کیوں دل سے الگ
ہونگے وقت سے جدا اب ہونگے مشکل سے الگ

درد و غم ارماں نہیں ہوتے کبھی دل سے الگ
یہ بھری محفل مری ہے ان کی محفل سے الگ

رہ گیا بس اب اسی پر زندگی کا آسرا
ہم کریں پہلو سے دل کو اپنے کس دل سے الگ

شمع کے سر بھی مصیبت آئی پروانے کے ساتھ
کر دیا دونوں کو اس نے اپنی محفل سے الگ

پہلے دو بچھڑے ہوئے آپس میں ملتے ہی نہیں
پھر جو مل جاتے ہیں تو ہوتے ہیں مشکل سے الگ

عشق میں تقدیر نے ڈالا یہ کیسا تفرقہ
دل ہوا مجھ سے جدا میں ہوگیا دل سے الگ

پہلے اس کو دیکھ پھر اے قیس اپنے دل کو دیکھ
ایک محمل اور ہے لیلےٰ کے محمل سے الگ

روز و شب رہتا ہے مجھ کو دھیان بزم ناز کا
ان کی محفل میں ہوں لیکن اہل محفل سے الگ

یہ نوائے سفاک تیرے عہد میں ممکن نہیں
تیغ گردن سے جدا ہو تیر ہو دل سے الگ

کیا انہیں طوفاں کا ڈر کیا انہیں موجوں کا خوف
نوحؔ بحر عشق میں رہتے ہیں ساحل سے الگ

اکثر ناقدانِ سخن اور کاملانِ فن نے اس بات کو تسلیم کیا ہے۔ کہ ہر غزل میں اچھے اشعار کی تعداد دو تین سے زیادہ نہیں ہوتی۔ باقی تمام شعر بھرتی ہوتے ہیں۔ جن میں کوئی خاص خوبی یا جدّت نہیں پائی جاتی۔ اس قول

کو ذہن میں رکھ کر مذکورہ بالا غزل کو دیکھا جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ تقریباً ہر ایک شعر لطف زبان وحسن بیان کی دولت سے مالا مال ہے اور اس میں شاعرانہ انداز کی وہ تمام خوبیاں اور اوصاف موجود ہیں۔ جو ایک باکمال استاد کے کلام میں ہوا کرتے ہیں۔

محاسنِ کلام۔

حضرت نوح کے کلام فصاحت نظام میں شاعرانہ حسنِ ادا کی وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جن سے شعر پر سحرِ حلال کی تشبیہہ صادق آسکے۔ مگر جس طرح ہر استاد کے کلام میں چند باتیں امتیازی حیثیت سے پائی جاتی ہیں اسی طرح ان کے کلام میں بھی بعض محاسن ایسے نمایاں طور سے نظر آتے ہیں۔ جو ان کو اپنے تمام ہم عصروں سے زیادہ متمائز کرتے ہیں۔ ان محاسن کی جھلک ان کے تمام مجموعہ کلام میں صاف نظر آتی ہے۔ یہاں ان مخصوص خوبیوں کی کسی قدر تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

پہلا نمایاں وصف ان کے کلام کا یہ ہے۔ کہ کلام نہایت سلیس اور عام فہم ہے۔ پڑھتے ہی دل میں اتر جاتا ہے پیچیدہ بیانی اور دشوار گوئی کا نشان تک نہیں پایا جاتا۔ اس وصف کو استادانِ سلف کے بعد حضرت داغ نے بہت نمایاں کیا تھا۔ اور یہ کہنا بالکل بے مبالغہ ہے۔ کہ حضرت نوح نے اس روش کو اتنی ترقی دی ہے کہ کلام کا اس سے زیادہ عام فہم اور سلیس ہونا بالکل ناقابل عمل دکھائی دیتا ہے۔ تخیل کو ہاتھ سے چھوڑ کر صرف زبان ہی زبان کو سرمایۂ شاعری سمجھ لیا جائے۔ تو شاید اس سے زیادہ ترقی کی گنجائش نکل سکے۔ لیکن تخیل اور زبان کو ساتھ ساتھ رکھا جائے۔ تو حضرت نوح کا کمال سخن اس خاص وصف میں منتہائے کمال ہے۔ بعض لوگ کمال شاعری کا معیار یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ صرف خواص ہی اس کو سمجھ سکیں اور عوام کیلئے اس کا سمجھنا لوہے کے چنے چبانے کا مصداق ہو۔ انہیں لوگوں کا یہ مقولہ ہے۔ کہ حضرت داغ کے طرز سخن نے شاعری کو بہت آسان کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ خیال سراسر غلط ہے اور اس پر دو زبردست اعتراض عاید ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاعر ملک اور قوم میں حیاتِ تازہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کا زندگی بخش کلام ایک قلیل التعداد جماعت تک جسے خواص سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیوں محدود رہے۔ کیا ملک اور قوم کے کثیر التعداد افراد اس کے حیات افروز افکار سے مستفید ہونے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ وہ بلاشبہ یہ حق رکھتے ہیں اور ہمارے خیال میں سب سے زیادہ حقدار وہی ہیں۔ کیونکہ عوام ہی اس نئی زندگی کے محتاج ہوتے ہیں۔ پس ایک خوش بیان شاعر اگر گونگے کی فارسی لکھتا چلا جاتا ہے۔ تو اس سے وسیع سطح آب کے ایک محدود حصے میں برائے نام ہلکا سا تموج پیدا ہو جانے کے سوا اور کوئی ہیجان پیدا نہیں ہوتا۔ آخر یہ تموج بھی تھوڑی دیر میں مٹ کر رہ جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے۔ کہ کلام

کا عام فہم ہونا بذاتِ خود کمال شاعری ہے۔ اسے شاعری کو آسان کر دینا کس طرح کر سکتے ہیں جب کہ یہ وصف فی الحقیقت ایک دشوار کام ہے۔ بمشکل سے مشکل۔ دقیق سے دقیق اور نازک سے نازک مضامین جو نثر میں بیان کرنا چاہیں۔ تو کئی سطروں میں بیان ہو سکیں۔ اگر چھوٹی سی بحر میں چند گنتی کے الفاظ استعمال کرنے سے بخوبی ظاہر ہو جائیں۔ تو یہی کچھ کم خوبی کی بات نہیں۔ خواہ ان الفاظ میں چند پیچیدہ استعارے اور مسلسل اضافتیں بھی کیوں نہ ہوں۔ لیکن شاعر نے ان پیچیدہ استعاروں اور مسلسل اضافتوں کو بھی استعمال نہ کیا ہو اور مضمون کو نہایت سلیس اور عام فہم رنگ میں بڑی وضاحت و صراحت سے بیان کر دیا ہو۔ تو اس سے زیادہ کمالِ شاعری اور کیا ہو سکتا ہے مثالیں ملاحظہ ہوں۔ ؎

اے دلِ زار وہ آتے ہیں عیادت کیلئے ۔۔۔ اب سنبھلنا ہی پڑا ہے کے سنبھالا ہم کو

دلِ زار کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اور کوئی غمخوار موجود نہیں ہے۔ بالکل بیکسی کا عالم ہے۔ لفظ سنبھالا سے ظاہر ہوتا ہے کہ مریض کی حالت کس قدر غیر ہے۔ سنبھلنا ہی پڑا۔ اس سے جو مجبوریاں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان کی تشریح دو چار لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک دریا ہے۔ جو ان تین لفظوں کے کوزے میں بند ہے۔ کیوں سنبھلنا پڑا اس کی وجہ مصرع اول میں بیان کی ہے۔ کہ وہ عیادت کے لئے آتے ہیں۔ مگر یہ وجہ محض ظاہری ہے۔ اصلی وجہ کو ناقابلِ اظہار سمجھ کر پردۂ راز میں رکھا گیا ہے۔ اب یہ سخن فہموں کا کام ہے۔ کہ اس راز کو ٹٹولیں۔ کہ وہ عیادت کو آئے ہیں۔ تو سنبھلنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ یہ اخفا اس شعر میں نہایت دلچسپ ہے۔ اور اس میں بہت سے مطالب پوشیدہ ہیں۔ علاوہ اس کے شعر کی ظاہری صورت کس قدر صاف اور دلکش ہے۔ سنبھلنا اور سنبھالنا کا لطف دیکھئے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ باوجود ان تمام خوبیوں کے شعر تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ ؎

غور سے دیکھ ذرا او دلِ مشتاقِ جمال ۔۔۔ طور پر کچھ نظر آتا ہے اُجالا ہم کو

مشتاقِ جمال کو جلوۂ جمال کہیں نظر نہیں آتا۔ وہ اس کی تلاش میں سرگردان و حیران ہو رہا ہے۔ اگر تھوڑی سی جھلک کہیں دکھائی دے جاتی ہے۔ تو بھی اس کو یقین نہیں آتا۔ وہ سمجھتا ہے۔ کہ ایسے نصیب کہاں۔ اس لئے غور سے دیکھنے کی تاکید کرتا ہے۔ کہ او دلِ مشتاقِ جمال۔ طور پر کچھ اجالا دکھائی دے رہا ہے۔ اسے غور سے دیکھ۔ کہ آیا یہ اسی مطلوب کا جلوہ ہے یا کچھ اور ہے۔ لفظ غور اس شعر میں بالکل اُستادانہ ہے ؎

لڑکھڑا کر کبھی قدموں پہ جو ساقی کے گرے ۔۔۔ پھینک کر جام و سبو اس نے سنبھالا ہم کو

آج تک کیوں نہ خبر لی نہ خبر لی تم نے ۔۔۔ آج تک کیوں نہ سنبھالا نہ سنبھالا ہم کو

پہلے شعر میں لڑکھڑانے کی وجہ لفظ ساقی اور جام و سبو سے ظاہر ہے۔ اس کو ظاہر نہ کرنا بھی بلاغت کا

حق ادا کرنا ہے۔ لفظ کبھی سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اتنی نہیں پی جاتے جس سے بالکل بدمست ہو جائیں۔ یہ لغزش کبھی کبھی ہوا کرتی ہے۔ مگر اس عالم میں بھی اتنا ہوش باقی رہتا ہے کہ گرتے ہیں۔ تو ساقی ہی کے قدموں پر گرتے ہیں اس کے بعد دوسرے مصرع میں ساقی کے التفات کو واضح کیا گیا ہے مضمون کا یہ حصہ نہایت پرلطف ہے۔ اس میں محاکات کا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔ ساقی نے دلی محبت اور ہمدردی و الفت کے تقاضے سے ہمیں سنبھالنے کی کوشش کی۔ پھینک کر جام و سبو۔ یہ الفاظ اس کوشش کی نہایت روشن تصویر ہیں یعنی ساقی نے اس قدر عجلت سے کام لیا اور اس قدر التفات کا ثبوت دیا۔ کہ جام و سبو کی جو اس کی عظمت کا سرمایہ تھے مطلق پروانہ کی۔ انہیں فوراً پھینک دیا اور ہمیں سنبھالنے پر آمادہ ہوا۔

دوسرے شعر میں لفظ آج تک سے جو طویل مصیبت ظاہر ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ شکایت کی تکرار اور وہ بھی دونوں مصرعوں میں تقابل کے ساتھ کیا مزا دے رہی ہے ؎

جس کی حد جس کی ہو کچھ میعاد بھی۔ وہ گرفتاری گرفتاری نہیں۔

کنایتہً اپنی طویل گرفتاری جس سے رہائی پانے کی کوئی صورت نہیں۔ اس شعر میں بیان کی گئی ہے۔ اور یہ اسلوب بیان بہت نادر ہے۔ شعر سرتا پا شعریت ہے۔ محبت میں گرفتار ہو کر آزادی کہاں۔ اگر کچھ عرصے کے بعد آزادی مل گئی ہے۔ پامال جائے گی۔ تو وہ عشق ہی نہیں۔ بلکہ محض مطلب برآری ہے۔ ایسی گرفتاری کو گرفتاری عشق نہیں کر سکتے۔ دوسرے مصرعہ کے آخر میں لفظ "بلکہ مطلب برآری ہے" کو محذوف سمجھنا چاہیئے۔ یہ حذف حسن بیان میں شامل ہے ؎

پہلے تم نے دل لیا پھر تم نے میری جان لی   بعد اس کے یہ کیا اب کیا کروگے اس کے بعد

بعد اس کے یہ کیا۔ اس کی تشریح مصلحتاً نہیں کی گئی۔ کیونکہ درحقیقت وہ ناگفتنی ہے۔ یہ ایک ایسی مصیبت ہے جو جان لینے سے بھی زیادہ تباہی پیدا کرنے والی ہے۔ اور قتل کر دینے کی سختی سے بھی زیادہ جابرانہ ہے۔ اس حد تک کہ بیان کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ با ایں ہمہ یہ یقین ہے۔ کہ ابھی اس جور و ستم کا خاتمہ نہیں ہوا۔ اسی وجہ سے پوچھنا ہے۔ کہ اب کونسی آفت برپا کروگے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہے۔ کہ اب اس سے زیادہ سختی اور کیا کروگے۔

یہ چند مثالیں اس غرض سے پیش کی گئی ہیں۔ کہ نازک سے نازک مضامین کو جن کی تشریح کئی سطروں میں ہوتی ہو۔ ایک شعر میں بیان کر دینا اور وہ بھی اتنے عام فہم۔ اتنے سلیس اور صاف پیرائے میں جس سے زیادہ صاف پہلو خیال میں نہیں آسکتا۔ فی الواقع کمال شاعری کا ثبوت ہے۔ اس خصوصیت سے متعلق زیادہ مثالیں پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ کیونکہ حضرت نوح کا کلام اس نعمت سے مالا مال ہے۔ یہاں تک کہ تمام مجموعہ کلام میں ہمیں ایک شعر بھی ایسا نظر نہیں آیا۔ جو عام فہم اور سلیس نہ ہو۔ ان کے کلام کا کثیر حصہ سہل ممتنع ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے۔ کہ حضرت نوح کا کلام بے ساختہ اور تصنع و آورد سے قطعاً پاک ہے۔ اور اس سے ان کی مشق سخن نمایاں اور مہارت تامہ کا ثبوت ملتا ہے۔ تصنع و آورد کا رنگ دو پہلو رکھتا ہے۔ معنوی بھی اور لفظی بھی۔ معنوی آورد وہ ہے۔ کہ ایک بے محل مضمون کو تکلف کے ساتھ اپنے کلام سے مربوط کر لیا جائے۔ کہ درحقیقت وہ ربط کھانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ لفظی آورد وہ ہے۔ کہ عجیب و غریب قسم کے الفاظ ناموزوں ترکیبیں اور زوائد جمع کر دئے جائیں۔ جن سے ایک سیدھا سادہ مضمون الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھ کر رہ جائے۔ یا مناسبات اور صنائع لفظی کا اس قدر خبط ہو۔ کہ ایک لفظ کے کئی کئی مناسبات ایک مصرعہ میں ٹھونسنے کی کوشش کی جائے۔ جیسا کہ امانت کے واسوخت میں ہے۔ مشاق اور ماہر فن دونوں قسم کے نقائص کو فوراً سمجھ لیتے ہیں اور خود کبھی اس خبط میں مبتلا نہیں ہوتے۔ کیونکہ ذوق سخن اس قسم کے کلام کو قبول کرنے سے ابا کرتا ہے۔ ان کی زبان سے لفظ بہت نپے تلے باون تولہ پاؤ رتی نکلتے ہیں۔ جو اپنی کم سے کم تعداد میں تمام مضمون پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ مصرعہ پر مصرعہ ایسا لگاتے ہیں۔ کہ اس سے بہتر مصرعہ خیال میں نہیں آ سکتا۔ اور اس میں ایک لفظ کی ترمیم کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ مثلاً مصرعہ ذیل۔

ایک فہرست مرے پاس ہے ویرانوں کی۔

کسی شاعر کو دیا جائے اور کہا جائے۔ کہ اس کی تضمین کر دو۔ تو اسے محسوس ہوگا۔ کہ اس پر مصرعہ لگانا اور اس میں ربط پیدا کرنا آسان نہیں ہے۔ مگر حضرت نوح نہایت بیساختہ کہہ دیتے ہیں ؎

جوش وحشت میں کسی سمت نکل جاؤں گا ۔۔۔ ایک فہرست مرے پاس ہے ویرانوں کی

یا ذیل کے مصرعہ پر (دل لگانا بھی ہمارا دل لگی کے ساتھ ہے) مصرعہ لگانا ہے۔ اب ہر شخص کو یہ سوچنا پڑے گا کہ کس طرح سے دل لگانے میں محض دل لگی پائی جاتی ہے۔ دور دور تک خیال دوڑائیں گے۔ یہاں تک کہ مجنوں اور فرہاد کی قبر پر بھی خاک چھانیں گے۔ مگر حضرت نوح دور نہیں جاتے۔ بے ساختہ بول اٹھتے ہیں ؎

جس نے شیدائی بنایا اس کے شیدائی ہیں ۔۔۔ دل لگانا بھی ہمارا دل لگی کے ساتھ ہے

دیکھیے یہ مصرعہ کس قدر چسپاں اور مربوط ہے۔ کہ اس سے بہتر اور کوئی مصرع خیال میں نہیں آ سکتا۔ ؎

تیسری خصوصیت الفاظ کی تقدیم و تاخیر سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ تقدیم و تاخیر نظم میں ناگزیر ہے۔ مگر اتنی نہیں ہونی چاہیے۔ کہ تعقید لفظی کا عیب پیدا ہو جائے۔ حضرت نوح کے کلام میں یہ امتیازی وصف ہے۔ کہ انہوں نے الفاظ کی تقدیم و تاخیر حیرت انگیز حد تک کم کر دی ہے۔ ان کے کلام میں ایسے اشعار کی تعداد جن کی نثر نہ بن سکے۔ اس قدر زیادہ ہے۔ کہ کسی استاد کے کلام میں ایسے اشعار اپنی کثیر تعداد میں نہ ہونگے۔ مثلاً

فلک کے پار ہوتی ہے کلیجے میں اترتی ہے ‏ ‏ ہماری ایک اک فریاد دو دو کام کرتی ہے
ہمارا دل ہو یا ان کی زبان دونوں ہی آفت ہیں ‏ ‏ یہ سب کچھ کر گزرتا ہے وہ سب کچھ کہہ گزرتی ہے

اب ہمارے دل میں اس بیدرد کی الفت نہیں ‏ ‏ اور اگر بالفرض ہے تو بھی کسی کے ساتھ ہے
آپ اپنے کو بھی دل سے بھول جانا چاہیئے ‏ ‏ ترکِ دنیا کا مزا ترکِ خودی کے ساتھ ہے

حسن روزافزوں جو پردے سے عیاں ہو جائیگا ‏ ‏ ایک وہ کیا ہیں فدا سارا جہاں ہو جائے گا
چرخ کی نامہربانی بھی مزا دے جائیگی ‏ ‏ کوئی اس کی ضد سے مجھ پر مہرباں ہو جائے گا
ہم کو اپنے عشق کے اظہار کی عادت نہیں ‏ ‏ بے کہے یہ خود بخود اُن پر عیاں ہو جائے گا

چوتھی خصوصیت جو حضرت نوح کو تمام شعرائے ماضی و حال سے امتیازی درجہ دیتی ہے - وہ ان کی زبان اور روزمرہ ہے - یہ بات مانی ہوئی ہے کہ اردو زبان کو ہندوستان میں اگر عام قبولیت حاصل ہو سکتی ہے - تو صرف اس صورت میں کہ اس میں سے فارسیت کا عنصر جس حد تک بھی کم ہو سکے - کم کر دیا جائے اور اسے عام تصنیفات میں اس قدر سلیس اور عام فہم لکھا جائے - کہ اس کا سننا اور سمجھنا کسی قسم کی دشواری پیدا نہ کرے جن شعرا نے اس اصول کو مدنظر رکھا ہے - ان کا کلام بیحد مقبول ہوا ہے - یہ بات ظاہر ہے - کہ جس کلام میں بڑے بڑے فارسی الفاظ اور مسلسل ترکیبیں داخل کی گئی ہیں - وہ زبان پر نہیں چڑھتا - اس کی وجہ یہ ہے - کہ ایسی زبان روزمرہ کے خلاف ہوتی ہے فصحا اپنی معمولی گفتگو میں جس قسم کی زبان استعمال کرتے ہیں - وہی بے تکلفانہ رنگ شاعرانہ انداز کے ساتھ کلام میں بھی قائم رکھا جائے - تو وہ بہت پرلطف معلوم ہوتا ہے - ورنہ زبان کے لحاظ سے ان نیچرل (غیر قدرتی) ہو جاتا ہے - ہمارا خیال ہے - کہ حضرت داغ نے اس ضرورت کو سب سے زیادہ محسوس کیا اور اپنے کلام کی بنیاد اسی اصول پر قائم کی - ان کے بعد ان کے شاگردوں نے اپنے اپنے مقدور کے مطابق ان کی پیروی کی - مگر پیروی پیروی میں بھی مراتب کا اختلاف ہوتا ہے - حضرت نوح نے اس اصول کی پیروی میں کمال کر دیا ہے - انہوں نے متروکات کی نہایت سختی سے پابندی کی ہے اور ان کے علاوہ مختلف قسم کے جدید متروکات بھی وضع کئے ہیں - فارسی عطف و اضافت کو انتہائی حد تک اڑا دیا ہے - آج کل کئی نامور شعرا صحت زبان کے مدعی ہیں - مگر ہم ان کے کلام میں فارسی کے حرف جار اور دوسرے فارسی الفاظ خالص فارسیت کے رنگ میں موجود پاتے ہیں - توالی اضافات - توالی عطف - توالی اضافات اور دوسری فارسی ترکیبیں مثلاً

تا بہ مردن - پس از مرگ - شرر آسا - شعلہ ساں - تا بہ خانہ - تا بہ فلک وغیرہ بے دھڑک استعمال ہو رہے ہیں
ان کے علاوہ یاں واں - یہ بھی لیکن - مگر یعنی شاید وغیرہ متروکات اچھے اچھے نامور اپنے کلام میں لکھتے چلے جاتے
ہیں عجیب عجیب فارسی ترکیبیں تراشی جا رہی ہیں اور ان کو استعمال کرنے والے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہیں - گویا بڑی
مہم مار لی ہے - مثلاً نواز ار - کیف زار - ضوستاں - جلوہ ستان - نوا ریز کیف ریز (زار ریز ستاں کی خوب مٹی خراب
ہو رہی ہے) وغیرہ - اس کے علاوہ دہلی و لکھنؤ کے بعض شعرا کلام کو عام افہام سے بالاتر بنانے کی مشق میں
مصروف ہیں اور اسے اردو شاعری کے اوج ترقی سے منسوب کیا جاتا ہے - وہ درد اور کیف کے سوا تیسری
چیز کچھ نہیں لکھتے - اور جو کچھ لکھتے ہیں - اسے پڑھ کر گونگے کے گڑ کی طرح دل ہی دل میں مزے لیتے ہیں -
ہمارے خیال میں اس قسم کے تمام مصنف زبان کی کوئی خاص خدمت نہیں کر رہے ہیں -

پس صحت کے لحاظ سے جن شعرا کو صحیح معنوں میں زبان کا خادم کہنا چاہیئے - ان کی تعداد نہایت قلیل ہے
اور اس قلیل تعداد میں حضرت نوح کو جو فوقیت حاصل ہے وہ اسقدر لاثانی ہے - کہ اس خاص وصف میں
کوئی شخص ان کا مدمقابل نہیں ہے - اور تو اور دہلی و لکھنؤ کے شاعروں میں بھی زبان کا وہ بیساختہ رنگ اتنی نمایاں
صورت میں نہیں پایا جاتا - جو حضرت نوح کے کلام میں جا بجا نظر آتا ہے - یہ کہنا بالکل سچا ہے - کہ حضرت داغ
نے خدمت زبان کا جو مشن شروع کیا تھا حضرت نوح نے اس مشن کو حد تکمیل تک پہنچا دیا ہے - ان کا کلام
اُردو زبان کی نہایت صحیح گرامر اور روزمرہ کا نہایت پاکیزہ و شستہ ہے - جس میں کہیں کوئی داغ یا دھبہ دکھائی
نہیں دیتا - اس اظہار کمال کے باوجود انہوں نے تخیل کا سررشتہ کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا - وہ دقیق سے
دقیق مضامین اسقدر صفائی و سلاست سے زبان اور روزمرہ کی پابندی قائم رکھ کر بیان کر جاتے ہیں - کہ
ایک سماں بندھ جاتا ہے - سننے والا سنتا ہے اور سر دھنتا ہے - مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

جو کسی کی ادا پہ فدا نہ ہوا جو کسی کی ادا پہ فدا نہ رہا — وہ جگر ہی نہیں وہ تو دل ہی نہیں وہ رہے نہ رہے وہ رہا نہ رہا
مرے ذہن میں ہے مرے ہوش میں ہے مری عقل میں ہے مری یاد میں ہے — وہ الگ بھی ہوا تو الگ نہ ہوا وہ جدا بھی رہا تو جدا نہ رہا
جو وہ غم نہ رہا تو وہ دل نہ رہا جو وہ دل نہ رہا تو وہ ہم نہ رہے — جو وہ ہم نہ رہے تو وہ تم نہ رہے جو وہ تم نہ رہے تو مزا نہ رہا

تینوں شعروں میں زبان کا جو رنگ دکھائی دیتا ہے وہ ہمارے دعوی کا نہایت روشن ثبوت ہے - پہلے
شعر میں فدا نہ ہوا اور فدا نہ رہا کا معنوی فرق ظاہر کیا ہے - اس قسم کے نکات حضرت نوح نے جا بجا حل
کئے ہیں - مصرعہ ثانی میں زور کلام کا جو نمونہ نظر آتا ہے وہ نہایت لاثانی و بے مثل ہے - پھر فیصلہ کی شان
دیکھئے - کس درجہ ناطق اور کس حد تک قطعی ہے

دوسرے شعر میں اپنی یاد داشت کو کس زور سے بیان کیا ہے - کہ مصرعہ اول کی ساخت دیکھ کر

حیرت پیدا ہوتی ہے۔ اس یادداشت کا مضمون کیا ہے۔ وہ مصرعہ ثانی میں بیان کیا گیا ہے۔ جو بجائے خود نہایت دقیق اور نہایت پیچیدہ روحانی مسئلہ ہے۔ وہ الگ بھی ہوا تو الگ نہ ہوا وہ جدا بھی ہا تو جدا نہ رہا۔ اللہ اللہ۔ کیا وجدانی کیفیت ہے اور سہل ممتنع کا رنگ کس قدر نمایاں ہے تیسرا شعر ایک غیرفانی ادبی شاہکار ہے۔ اتنے چھوٹے لفظوں سے جو یا تو دو حرفی ہیں یا سہ حرفی ہیں۔ اتنا بڑا کام آج تک کسی شاعر نے نہ لیا ہوگا۔ سلسلۂ کلام کی کڑی ایک دوسرے سے اس طرح ملتی جلتی ہے۔ کہ ربط کلام کا یہ نمونہ ڈھونڈے سے بھی نظر نہ آئیگا۔ چاروں ٹکڑوں میں سے ہر ایک ٹکڑا بجائے خود ایک مضمون ہے اور ہر ایک کی تشریح میں بہت سی قوت بیانیہ کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ غم محبت کے بغیر دل لہو کی بوند کے سوا کچھ نہیں۔ اور جب دل اسقدر حقیر و بے مایہ ہو جائے تو انسان کی فضیلت بھی حقیر و بے مایہ ہو جاتی ہے۔ طالب کا اس قدر حقیر و بے مایہ ہو جانا مطلوب کی شان کو بٹا لگاتا ہے ؎

اگر نہ بہر من از بہر خود عزیزم دار — کہ بندہ خوبی او خوبی خداوند است

اور جب مطلوب کی شان ہماری رسوائی کی وجہ سے کم ہو جائے۔ تو یہ ندامت اور بھی سوہان روح ہے جس سے محبت کا تمام سلسلہ بے لطف ہو جاتا ہے۔ اس قدر دقیق روحانی مسائل کو ایسی حیرت انگیز سادگی سے بیان کر جانا اور اس میں بھی زبان کا یہ رنگ بھر دینا ثابت کرتا ہے۔ کہ اس سے زیادہ کمال شاعری کا دشوار ہے ؎

وہ کرم وہ لطف کدھر گیا وہ خوشی کا وقت گذر گیا — انہیں اب نہیں جو ملال بھی مجھے ایک یہ بھی ملال ہے
کوئی آرزو نہ نکل سکی کبھی شکلِ غم نہ بدل سکی — جو امید تھی وہ امید ہے جو خیال تھا وہ خیال ہے
وہ ہجوم ظلم و جفا ہے اب وہ نزولِ قہر و بلا ہے اب — مجھے چار روز کی زندگی تری آرزو میں محال ہے
نہ وہ آئیں گے نہ بلائینگے یونہی جان لیں گے ستائینگے — انہیں اور دُھن ہے بندھی ہوئی مرے دل کو اور خیال ہے

پہلے شعر میں ملال نہ ہونے کا ملال حسن بیان کی نزاکت کو ظاہر کرتا ہے ؎

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

دوسرے شعر میں مصرعہ اول حسرت و یاس کی مجسم تصویر ہے۔ جس کا اثر دوسرے مصرعہ کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے۔ جو امید تھی وہ امید ہے۔ جو خیال تھا وہ خیال ہے۔ وہ خیال ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں ایک تو یہ کہ وہ اپنی اصلی صورت میں وہی کا وہی ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ محض خواب و خیال اور بے اصل ہے۔ حسنِ بیان اور یہ سادگی ؎

لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹول — سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

تیسرے شعر میں بھی وہی صنعت ترصیع موجود ہے۔ جو ہر ایک شعر کے مصرعہ اول میں پائی جاتی ہے۔ کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے لفظ وہ کافی تھا۔ مگر اظہار مصیبت کی تکرار نے اس زور کو دوچند کر دیا ہے۔ مصرعہ ثانی میں زندگی کو چار روز کی زندگی کہنا بالکل استادانہ طرز بیان ہے چار روز نے مصرعہ کے ظاہر و باطن دونوں کو چمکا دیا ہے۔ چوتھے شعر میں دُھن اور خیال کی صراحت نہیں کی گئی۔ اگر یہ اخفا ہے۔ تو عین مصلحت ہے۔ ورنہ روزمرہ بھی یہی ہے اور اس محل پر یہی کہدینا کافی ہوتا ہے۔ کہ وہ اور دُھن میں ہیں۔ میں اور خیال میں ہوں۔ اپنے لئے خیال اور ان کے لئے دھن کہنا بھی نکتے سے خالی نہیں ؎

پہلے میرا حال سُن پھر سن کے میرا حال دیکھ — دیکھ کر پھر غور کر پھر غور کرکے دل سے پوچھ
یہ تغافل ہے بُرا یہ بے رخی اچھی نہیں — رنج دل کا درد دل کا حال دل کا دل سے پوچھ

پہلے شعر کی ساخت اور اس میں مضمون کو سلسلہ درسلسلہ دیکھ کر حیرت پیدا ہوتی ہے۔ معاملہ کی بات کس خوبی سے کہی ہے۔ یہ اسلوب بیان بہت نادرالوجود ہے۔ سبحان اللہ۔ کیا ارشاد کیا ہے اور کس قدر بجا فرمایا ہے۔ ظاہری ہمدردی سے کیا ہوتا ہے۔ کیفیت تو سنی نہیں۔ پہلے وہ سن لو۔ پھر اس کی صداقت کا امتحان کرلو اور اس مصیبت کا اندازہ کرلو۔ پھر اس کے وجوہ پر غور کرو اور اپنے دل سے پوچھو۔ تو صاف معلوم ہوجائیگا کہ

(ع) اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

دوسرے شعر میں قافیہ کی بندش کس قدر مرغوب ہے۔ دل سے پوچھ یعنی سچے دل سے پوچھ۔ ورنہ یہ ظاہری اور اوپری ہمدردی مجھے کچھ فائدہ مند نہیں ہوسکتی۔ مصرعہ ثانی میں رنج دل کا درد دل کا حال دل کا۔ ان الفاظ کی تکرار سے جو زورِ کلام پیدا ہوا۔ وہ ظاہر ہے۔

اس ضمن میں صدہا مثالیں یہاں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جن سے ظاہر ہوسکتا ہے۔ کہ زبان کے لحاظ سے حضرت نوح کا پایۂ سخن کس قدر بلند ہے۔ لیکن طولِ کلام کے خوف سے صرف چند مثالیں بغیر کسی مزید تشریح کے اور درج کی جاتی ہیں ؎

کوئی کیوں اس پہ عاشق ہو کوئی کیا اسکا شیدا ہو — کسے معلوم کس کا تھا وہ کس کا ہے وہ کس کا ہو
گزرتی ہے بشر کی زندگی کس کس توہم میں — جو ایسا ہو تو ایسا ہو جو ایسا ہو تو ایسا ہو
تمہارے وعدۂ فردا پہ کیونکر اعتبار آئے — کبھی کچھ ہو کبھی کچھ ہو کبھی کیا ہو کبھی کیا ہو

مرا دل لے کے مجھ کو غم ترا بے انتہا دینا — یہ کیا باتیں ہیں کیا گھاتیں ہیں کیا لینا ہے کیا دینا
وہ اے قاصد بھلا کب ان تری باتوں میں آتے ہیں — بہت دشوار ہے ملنا ملا لینا ملا دینا

بعض اصحاب اِن تری باتوں کی جگہ تیری ان باتوں لکھ جاتے ہیں۔مگر حضرت نوح اس محل پر ضمیر مضاف الیہ کو مضاف سے ملحق رکھتے ہیں۔اور یہی دستور العمل فصیح درست ہے۔مصرعِ ثانی میں ملنا۔ ملا لینا۔ ملا دینا کا فرق کس خوبی سے ظاہر کیا ہے۔

کہاں شمشیر کا دم خم کہاں خونِ دلِ عاشق   اسے تلوار پر دیکھا اسے تلوار میں دیکھا

دو مختلف چیزوں میں فرق بیان کرنے میں یہ طریق استدلال بالکل نرالا اور نیا ہے۔جس میں زبان کے نکات حل کئے ہیں۔تلوار کا دم خم تلوار میں ہوتا ہے اور خون دل عاشق تلوار پر ہوا کرتا ہے۔اس لئے دونوں چیزیں بالکل مختلف ہیں ؎

آپ کے انداز کر چکتے مجھے اب تک ہلاک   وہ تو کہیئے غیب سے میری کمک ہوتی رہی

کیا کہیں ہم کہ سکے پھر بھی نہ اپنے دل کی بات   گفتگو ہونے کو ان سے دیر تک ہوتی رہی

پہلے شعر میں وہ تو کہیئے۔ یہ روزمرہ کس بے تکلفی سے نظم ہوا ہے۔دوسرے شعر میں رکن صدر بلحاظ مضمون باقی شعر سے کتنی مناسبت رکھتا ہے۔اسی شعر کے مصرعہ ثانی کی زبان اور اس کی بے تکلفی قابل داد ہے ؎

کسی کو بیٹھ کر ہم نے یہاں اٹھتے نہیں دیکھا   اگر اٹھتا ہے تو فتنہ تری محفل سے اٹھتا ہے

وہاں سے جو نکلتا ہے نکل جاتا ہے دم اس کا   وہ اٹھ جاتا ہے دنیا سے جو اس محفل سے اٹھتا ہے

یہ حیرت ہم کو ہوتی ہے تمہارے نازِ بیجا پر   جو دنیا سے نہیں اٹھتا وہ کیونکر دل سے اٹھتا ہے

جوان کو سرگذشتِ یارِ غم تحریر کرتا ہوں   تو میرے خط کا اک اک لفظ بھی مشکل سے اٹھتا ہے

اس زمین کو دیکھئے اور پھر ہر شعر میں ردیف کا ثبوت ملاحظہ کیجئے۔آخری شعر میں یارِ غم یہ ٹکڑا استادانہ ہے۔ایسی زمین میں خوش بیانی کا یہ کمال ؏

ایک ایک لڑی نظمِ ثریا سے ہے عالی

پانچویں خصوصیت لفظوں کا الٹ پھیر ہے۔جو شعر میں عجیب لطف پیدا کرتا ہے۔بادی النظر میں شاید اسے معمولی بات سمجھا جائے۔مگر معمولی بات میں بھی کوئی سلیقہ درکار ہے اور یہی سلیقہ ہے۔جو ہم اس خصوصیت کے تحت میں ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔اس الٹ پھیر سے اگر معانی میں اختلاف پیدا نہیں ہوتا اور مضمون وہی کا وہی رہتا ہے۔تو یہ الٹ پھیر کسی کمال میں داخل نہیں ہو سکتا۔بلکہ شاید اسے حشو کہا جائے۔لیکن اگر معانی میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔اور الفاظ تقریباً وہی رہتے ہیں۔تو یہ الٹ پھیر فی الواقع دلچسپ چیز ہے ؎

کیا کہوں کیا رات ہے کیا دن ہے کیا ایام ہیں   ہائے یہ برسات کے برسات کا برسات کی

برسات کے ایام برسات کا دن برسات کی رات۔ لف ونشر کی صورت میں کا۔ کے۔ کی تین حرفِ اضافت کو اس طرح جمع کر دینا نہایت دشوار ہے۔ حیرت پیدا ہوتی ہے۔ کہ یہ شعر کس طرح خلق ہوا۔

تمہاری طبیعت تمہاری نگاہ بدلتی رہے گی بدلتی رہی

مری تدبیر نے مجھ کو مری تقدیر پر ڈالا مگر اب دیکھئے تقدیر کیسا تدبیر کرتی ہے

نہ زیر فلک ہے نہ زیر زمیں ہے کہاں ہے مسرت کہیں بھی نہیں ہے
تمہاری تمنا بھی کیا دل نشیں ہے وہیں تھی جہاں ہے جہاں تھی وہیں ہے

اس شعر میں لفظ دل نشیں کی بندش کس قدر دل نشیں واقع ہوئی ہے۔ سخن فہم اس معنوی خوبی کا اندازہ کریں ؎

تری خوش خرامی کو میں جانتا ہوں قیامت ہے لیکن قیامت نہیں ہے
تری بات کا اور تیری زبان کا یقیں بھی ہے مجھ کو یقیں بھی نہیں ہے
ہوا نوحؔ پر خاتمہ شاعری کا سخن گو سخن دان سخن آفریں ہے

گلزار جہاں کو جب دیکھا اک شکل نظر آئی مجھ کو عالم سے الگ عالم سے جدا عالم سے نرالی پھولوں کی
پھر رت بدلی پھر آئی گھٹا پھر سرد ہوائیں چلنے لگیں ہو جائے پری نہلائے دُھن اب ڈالی ڈالی پھولوں کی

صبر بہت دشوار طلب چاہ بڑی تاخیر پسند ہوتے ہوتے ہونا ہے ہوتے ہوتے ہوتی ہے

مصرعہ ثانی اس قدر بے ساختہ ہے۔ کہ اس سے زیادہ بے تکلفی خیال میں نہیں آسکتی۔ اس مصرعہ پر مصرعہ لگانا دماغ پر مصیبت نازل کرنا ہے۔ یہ بات تو ظاہر ہے۔ کہ ردیف و قافیہ کے خیال سے شعرا پہلے مصرعہ ثانی فکر کیا کرتے ہیں۔ یا قافیہ اور اس کا مناسب پہلو سوچا کرتے ہیں۔ غالباً حضرت نوح نے بھی پہلے یہ مصرعہ ثانی تصنیف فرمایا ہوگا۔ اور پھر یہ سوچا ہوگا۔ کہ اس کا مصرعہ اول کیا ہونا چاہئے۔ اگر ہمارا خیال درست ہے تو اس تلاش کے لئے بے اختیار داد دینی پڑتی ہے ؎

وہی عشق کی ہیں مصیبتیں وہی ہجر کی ہیں شکائتیں جو کہیں ہم ان سے تو کیا کہیں جو سنائیں ہم تو سنائیں کیا
نہیں حسن پر ہے غرور بھی انہیں شرم بھی ہے لحاظ بھی بہ نظر کسی سے لڑائیں کیوں وہ نظر کسی سے ملائیں کیوں

ہمیں ضد جو ہے تو اسی سے ہے ہمیں کد جو ہے تو اُسی سے ہے ۔۔۔ اسی دل کی خاک اڑائیں گے کسی در کی خاک اڑائیں کیا
کبھی پوچھتے ہیں وہ حالِ دل کبھی سرگذشتِ غم و الم ۔۔۔ یہ بتا دے کاش کوئی ہمیں کہ بتائیں کیا نہ بتائیں کیا
اسے سو طرح کا خیال ہے ہمیں سو طرح کا لحاظ ہے ۔۔۔ کہیں آئے کیوں کہیں جائے کیوں کہیں آئیں کیا کہیں جائیں کیا

ان اشعار میں زبان کے نکات اور الفاظ کی مصوری جس خوبی سے نمایاں ہو رہی ہے۔ وہ حضرت نوح اور صرف حضرت نوح کا حصہ ہے۔

چھٹی خصوصیت معاملہ بندی ہے۔ جسے قدما کی اصطلاح میں تغزل کہا جاتا ہے اس میدان میں پہلے جرأت نے اور ان کے بعد مومن نے علم امتیازی بلند کیا تھا۔ مگر حضرت داغ نے اس میدان میں شہسواریوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کی معاملہ بندی ان کے قصر شہرت کا ایک ستون ہے۔ حضرت نوح کا دامن بھی اس دولت سے مالا مال ہے۔ انہوں نے راز و نیاز کے مضامین ہر غزل میں باندھے ہیں اور ہر جگہ ایک خاص قسم کا بانکپن محبوبانہ انداز میں نظر آتا ہے۔ جس میں لطیف اشارے اور دلچسپ نوک جھونک پائی جاتی ہے۔ قدما نے غزل کی جو تعریف لکھی ہے۔ اس کے لحاظ سے معاملہ بندی ہی غزل کا ایک واحد عنصر ہے۔ اس کو الگ کر دیا جائے۔ تو غزل غزلیت کے رتبہ سے گر جاتی ہے۔ قدما نے غزل کی بنیاد تغزل ہی پر قائم کی تھی۔ ان کے بعد طبائع کے مختلف اثرات اس میں اپنا عمل دخل جماتے گئے۔ اور معاملہ بندی کے ساتھ شوخی و ظرافت۔ ناؤ نوش رندانہ بے باکی وغیرہ مضامین بھی شامل ہو گئے۔ متصوفانہ مضامین۔ دنیا کی ناپائیداری۔ زمانے کی شکایت وغیرہ بھی اسی قبیل سے ہیں۔ اس طرح غزل کا ضروری عنصر تو وہی معاملہ بندی رہا۔ مگر دوسرے مضامین سے مل کر وہ ایک خوبصورت گلدستہ ہو گئی۔ چنانچہ متاخرین کی غزل اسی نمونہ کی ہے۔ جس میں حضرت داغ نے اپنی طبیعت کی شوخی سے عجیب قسم کا بانکپن پیدا کیا۔ حضرت نوح کی غزل بھی اس امتیازی خصوصیت کی علم بردار ہے۔ ؎

یہ باتیں بیوفائی کی تمہیں پر چھائی جاتی ہیں ۔۔۔ ذرا پھر تو کہو تم کون کس کے کام آتا ہے
اسے بھی روک رکھو تم اگر ملنے سے رُکتے ہو ۔۔۔ ہمارے لب پہ کیوں ہر دم تمہارا نام آتا ہے

اور تو الفت نہ نبھنے کا سبب کوئی نہیں ۔۔۔ یا بُرائی آپ میں ہے یا بُرائی ہم میں ہے

جہاں ہوں بیچ والے کیا وہاں باہم صفائی ہو ۔۔۔ کبھی کچھ کہہ دیا تم سے کبھی کچھ لکھ دیا ہم سے

بظاہر تو ہمارے عشق کی تعریف ہوتی ہے ـــ سمجھتے ہیں وہ جیسا دل ہیں اس کو ہم سمجھتے ہیں

ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ حضرت نوح غزل کا مقطع عموماً تخلص کی رعایت سے لکھتے ہیں اور اسمیں لفظ کشتی یا طوفان ضرور لاتے ہیں جس سے مقطع میں ایک حسن پیدا ہو جاتا ہے ۔ چند مثالیں اس کی بھی ملاحظہ ہوں ؎

نوح کی آنکھوں سے اٹھے سینکڑوں طوفانِ اشک ـــ اس کا رونا بھی تو اک دریا دلی کے ساتھ ہے

رونے کی کثرت سب نے بیان کی ہے ۔ مگر اس کی کثرت سے لفظ دریا دلی کسی نے منسوب نہ کیا ہوگا اس سے گریہ وزاری کے مضمون میں بھی شگفتگی کا عالم پیدا ہو گیا ؎

نوح سے واقف نہیں ہیں آپنے کیا کہ دیا ـــ آج تک طوفان کس کا ہر جگہ مشہور ہے

مصرعہ ثانی کے ساتھ یہ خوبی بھی وابستہ ہے ۔ کہ دیوان کا نام بھی طوفانِ نوح ہے ؎

پہلے ہی سے جانتا تھا نوح کو سارا جہاں ـــ ہو گئے مشہور وہ طوفاں اٹھا کر اور بھی

یہاں بھی ضمناً وہی کنایہ ہے ؎

طوفانِ بحرِ غم نے ڈبویا بہت مگر ـــ کشتی جنابِ نوح کی بچ کر نکل گئی

حضرتِ نوح کے طوفان کو سنتے ہیں فقط ـــ حضرتِ نوح کے دیوان کو ہم دیکھتے ہیں

آٹھویں خصوصیت محاکات ہے ۔ جس میں حضرت نوح نے اچھے اچھے شعر نکالے ہیں کسی کی قوت بیانیہ کا کمال دیکھنا ہو تو اس کے لئے محاکات کی مثالیں کافی ہوتی ہیں ۔ چند مثالیں درج کی جاتی ہیں ۔ خوف وہراس اور گھبراہٹ کی تصویر ملاحظہ ہو ؎

سانس رکتی ہے جو سینے میں کبھی ـــ ہاتھ اپنی نبض پر دھرتے ہیں ہم ۔

کبر وغرور کا مرقع اس طرح تیار کیا ہے ؎

کہ رہا ہے کوئی کس دعوے کے ساتھ ـــ عاشقوں کو قتل ہم کرتے ہیں ہم ۔

رفیق سے جدا ہو جانے کا رنج وافسوس کس حسرت ناک پیرائے میں ظاہر کیا ہے ؎

وہ لئے جاتے ہیں دل کو اپنے ساتھ ـــ دیکھتا جاتا ہے میرا دل مجھے

نزع کے عالم میں کیا کچھ ہوتا ہے ۔ یہ شعر اس کی کتنی صحیح مثال ہے ؎

نبض ساقط سرد جسم احباب چپ عاجز طبیب ـــ اب مرے اللہ کو کچھ اور ہی منظور ہے

رکن ضرب میں کچھ اور ہی منظور ہے ۔ یہ کنایہ کس قدر بلیغ واقع ہوا ہے ۔ ہے تو اخفا ۔ مگر صراحت سے

بھی زیادہ واضح

اب ہم انتخاب کے طور پر چند ایسے اشعار یہاں درج کرتے ہیں۔ جو بلاشبہ حضرت نوح کے لاثانی اور غیر فانی شاہکار ہیں۔ جن سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ کہ دنیائے شاعری میں اس وقت حضرت نوح کا پایۂ سخن کس قدر بلند ہے

یہ لفافہ بند رکھا کاتب تقدیر نے ۔ کھل نہیں سکتا کسی پر ماجرائے سرنوشت

آئینے کو توڑ ڈالا آپ کی تصویر نے ۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کسی میں زورِ حسن

کھل نہیں سکتا کے ساتھ بند رکھا، کا لطف ظاہر ہے۔ نوشتۂ تقدیر کے رازِ سربستہ کو لفافہ سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ جو نہایت بلیغ ہے۔ دوسرے شعر میں زورِ حسن کا جو ثبوت دیا گیا ہے۔ وہ نہایت لاثانی ہے۔ تصویر کی شعاعیں شیشے میں سے گزر کر باہر آتی ہیں اور دیکھنے والوں کی آنکھوں میں تصویر کا جلوہ پیدا کرتی ہیں۔ اس عمل سے یہ استدلال کیا گیا ہے۔ کہ آپ کی تصویر آئینے کو توڑ کر باہر آگئی ہے۔ اس سے بڑھ کر زورِ حسن اور کیا ہو سکتا ہے۔ تصوف کا یہ مشہور مسئلہ کہ حسن مطلق تقید و تعین کے زندان میں نہیں رہ سکتا۔ اس مصرعہ میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ آنچل اور چلمن کے باہر حسن کی جھلک دکھائی دینے کے بہت سے مضمون باندھے گئے ہیں مگر اس میں یہ زور کہ وہ آئینے کو توڑ کر باہر آجائے۔ آج تک کسی نے نہیں باندھا۔ یہ شعر نہیں بلکہ الہام ہے۔ مغربی شاعری بھی اس مضمون کا جواب نہیں دے سکتی۔ اردو زباں اس پر جتنا ناز کرے۔ کم ہے ؎

میرے دل پر تیر مارے آرزوئے تیر نے ۔ موت کے ارمان میں بے موت مرجانا پڑا

بے موت مرنے کا ثبوت رکن صدر کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ لفظ پڑا (مرجانا پڑا) کس قدر بے انتہا مجبوری کو ظاہر کر رہا ہے۔ دل پر تیر مارے۔ یہ ٹکڑا کتنا دردناک ہے۔ تیر کس نے مارے۔ تیر کی آرزو نے۔ نزاکتِ بیاں کی انتہا ہے۔ بے موت مرنا۔ اس محاورے کا استعمال اس سے بہتر صورت میں اور کیا ہو سکتا ہے ؎

وہ اٹھی وہ آئی وہ چھائی گھٹا برسات کی ۔ اب مرے ساقی تامل ہے تجھے کس بات کا

اک مرے دل پر عنایت ہے برابر سات کی ۔ رنج و غم اندوہ حرماں درد آزار اضطراب

پہلے شعر میں گھٹا کے تینوں استعمال گھٹا اٹھی۔ گھٹا آئی۔ گھٹا چھائی۔ ایک جگہ جمع کر دیئے ہیں۔ اس کے ساتھ لفظ وہ کی تکرار کتنی خوبصورت ہے۔ اٹھی کے بعد آئی اور آئی کے بعد چھائی اس حسن ترتیب کو بھی ملاحظہ کیجئے دوسرے شعر میں دو تین نہیں اکٹھے سات سات لفظ اور وہ بھی ہم جنس کس خوبی سے جمع کئے ہیں۔ یہ کام سخت دشوار تھا۔ سات ہم جنس لفظوں کو تلاش کرنا اور پھر انہیں ایک مصرعہ میں اس طرح جمع کرنا کہ حرف عطف سے بھی کام لینے کی ضرورت نہ پڑے۔ فی الواقع بہت بڑا کمال ہے۔ رنج غم اندوہ حرماں۔ اس ٹکڑے کو رنج

وغم اندوہ حرماں اس لئے نہیں لکھا۔ کہ فارسیت کا رنگ پیدا نہ ہو۔ دوسرے مصرعہ میں قافیہ معمول کی خوبصورتی اور اس کے ساتھ لفظ عنایت میں طنز۔ لفظ اک سے دل کی بیکسی کا ظاہر ہونا مزید برآں ؎

وصل کا وعدہ وہ کر سکتے نہیں ۔۔۔ ہائے اتنی بھی نزاکت ہے بُری

نزاکت کے بہت سے مضمون باندھے گئے ہیں۔ با ایں ہمہ اس مضمون کی نزاکت کچھ اور ہی نزاکت رکھتی ہے ؎

بعد مرنے کے بھی دل لاکھوں طرح کے غم میں ہے ۔۔۔ ہم نہیں دنیا میں لیکن ایک دنیا ہم میں ہے
یا الٰہی عقل سے باہر ہیں تیری حکمتیں ۔۔۔ یہ نہیں کھلتا کہ ہم تجھ میں ہیں یا تو ہم میں ہے

دل کے دے دینے میں دقّت ہے بہت ۔۔۔ جان دے دینے میں دشواری نہیں
زلفِ جاناں ایک ایسی رات ہے ۔۔۔ جو کسی بیمار پر بھاری نہیں
عیب سے ہے پاک ہر روشن ضمیر ۔۔۔ شمع کے شعلے میں چنگاری نہیں

یہ مضمون مختلف شعرا نے باندھا ہے۔ مگر حضرت نوح نے جو ثبوت پیش کیا ہے۔ وہ بالکل نیا اور نہایت روشن ہے ؎

مست آنکھوں کو دکھا کر مست اس نے کر دیا ۔۔۔ میری قسمت میں یہ دو ساغر تھے دو ساغر ملے
حضرت زاہد نہیں کعبے میں ہے کس کی تلاش ۔۔۔ سنگِ اسود مل گیا اب اور کیا پتھر ملے

پہلے شعر میں حسن بیان کی سادگی اور بے تکلفی ملاحظہ کیجئے۔ دو ساغر تھے۔ دو ساغر ملے۔ یہ ٹکڑا کس قدر دلکش اور بے ساختہ ہے۔ دوسرے شعر میں سنگِ اسود کی رعایت سے یہ کہنا کہ اب اور کیا پتھر ملے۔ رعایت لفظی کا کمال ہے۔ اور وہ بھی بالکل بے ساختہ۔ جس میں تصنع یا آورد کا شائبہ تک نہیں ہے ؎

اس رُخ پر نور سے کی تھی جو اس نے ہمسری ۔۔۔ آج تک داغِ ندامت وہ مہِ کامل میں ہے
غیر کو عزت ملی مجھ کو ہوئی ذلت نصیب ۔۔۔ یہ بھی ہے وہ بھی ہے سب کچھ آپ کی محفل میں ہے
کوئی آیا بھی ملا بھی اپنے گھر بھی چل دیا ۔۔۔ جو مرے دل میں تمنا تھی وہ اب تک دل میں ہے
اب ہمارے قتل کی دے تو شہادت کون دے ۔۔۔ ایک دم تھا تیغ کا وہ قبضۂ قاتل میں ہے

چاند کے داغوں کو عیب سے اکثر شعرا نے نسبت دی ہے۔ انہیں داغِ غم۔ داغِ فراق بھی لکھا ہے۔ مگر داغ ندامت کسی نے نہیں کہا ہوگا۔ دوسرے شعر میں لفظ سب کچھ کو دیکھئے اور اس میں جو لطیف طنز ہے۔ اس کی لطافت کو ملاحظہ فرمائیے۔ پہلے مصرعہ کا مضمون بہت معمولی تھا۔ مگر دوسرے مصرعہ نے اس کی شان ہی کچھ

سے کچھ کر دی ۔ پیش پا اُفتادہ باتوں سے کیسے کیسے لطیف نکتے نکالے ہیں ۔ تیسرے شعر کا مضمون کس قدر دلچسپ ہے ۔ جس کے لئے اتنی مصیبت اٹھائی ۔ وہ آیا بھی اور واپس بھی چلا گیا ۔ مگر دل کی تمنا اسی طرح دل میں رہی ۔ چوتھے شعر میں الفاظ کی مناسبت در عایت نہایت قابل داد ہے ۔ قتل ۔ قاتل ۔ شہادت ۔ تیغ دم ۔ قبضہ الفاظ ہیں کہ نگینے جڑے ہوئے ہیں ۔

اسکا غم اس کا تصور اس کی یاد اس کی تلاش ۔۔۔ ایک ہنگامہ ہماری زندگی کے ساتھ ہے
ہر طرف اس کی تجلی ہر جگہ اس کا جمال ۔۔۔ ہر کسی کے پاس ہے وہ ہر کسی کیساتھ ہے
دل دیا بھی تو دیا کس کو ستم ایجاد کو ۔۔۔ جو ہے کام اپنا وہی دیوانگی کے ساتھ ہے
جس نے شیدائی بنایا اس کے شیدائی بنے ۔۔۔ دل لگانا بھی ہمارا دل لگی کے ساتھ ہے
اس نگاہِ ناز کا مفہوم کچھ کھلتا نہیں ۔۔۔ ضد ہے دل کے ساتھ یا دل کی لگی کیساتھ ہے

ان اشعار کو دیکھئے ۔ یہ رنگ سخن ۔ یہ زبان ۔ یہ حسن بیان ۔ یہ استادانہ بندش ۔ یہ شعریت ۔ یہ فصاحت کس کس چیز کی داد دی جائے ۔ ربطِ کلام کو دیکھئے ۔ ایک مصرعہ پر دوسرا مصرعہ کس بے تکلفی سے لگایا گیا ہے ۔ اور کیسے کیسے معانی پیدا کئے ہیں ۔ کہ باید و شاید ؎

کچھ نہیں پھر بھی تو سب کچھ ہے دل بے آرزو ۔۔۔ مفلسی دنیا سے مٹ جائیگی اس مفلس کے بعد

حیرت کا مقام ہے ۔ کہ معمولی معمولی باتوں سے کیسے کیسے بلند معانی اخذ کئے ہیں ۔ دلِ بے آرزو کو مفلس کہنے کی وجہ تو ظاہر ہے ۔ اس مفلسی کو حقیر سمجھ کر یہ کہنا بھی آسان ہے کہ وہ کچھ نہیں ۔ لیکن کچھ نہیں کو سب کچھ یعنی بیش بہا ثابت کرنا آسان نہیں ہے ۔ اس کے لئے جو دلیل دی گئی ہے ۔ وہ نہایت زوردار ہے ۔ جس میں ضمناً یہ اشارہ بھی ہے ۔ کہ دل کا بے آرزو ہو جانا بہت ہی نادر الوقوع ہے ؎

ہزاروں شوخیاں پھر شوخیوں میں سینکڑوں غمزے ۔۔۔ تمہیں دنیا سے کیا مطلب کہ تم خود ایک دنیا ہو

دل لگانے سے نہ باز آئیں گے ہم ۔۔۔ جان جب تک ہے ہماری جان ہیں
توبہ توبہ میں تمہیں ظالم کہوں ۔۔۔ ایسی گستاخی تمہاری شان میں

ہم کو میخانے میں اس کی جستجو بیکار ہے ۔۔۔ ڈھونڈے گا آپ ہی چل پھر کے پیمانہ ہمیں

شمع جلتی ہو ۔ تو پروانے خود اس کو ڈھونڈ لیتے ہیں ۔ آگ جلتی ہو ۔ تو آکسیجن خود اس کے پاس آجاتی ہے اسی طرح پیمانہ بھی اپنے چاہنے والوں کے پاس خود آجائے گا ۔ گردشِ پیمانہ کی نسبت سے "چل پھر کے" یہ الفاظ

نہایت خوبصورت ہیں ؎

حسب خواہش مجھے میخوار پلا دیتے ہیں — کوئی تعداد مقرر نہیں پیمانوں کی
آتشِ عشق سے ہو کیوں نہ مجھے خاص لگاؤ — خاک بھی میرے عناصر میں ہے پروانوں کی

معنی آفرینی اور پروازِ فکر کا اندازہ کرنا ہو۔ تو یہی ایک شعر کافی ہے ؎

میری نظر سے ہے کہ تمہاری نظر سے ہے — ہنگامہ حسن و عشق کا برپا کدھر سے ہے۔

دل کو ہوا سکون طبیعت سنبھل گئی — دم کیا نکل گیا مری حسرت نکل گئی
پہلے تھی جو خلش وہ مرے دل میں اب نہیں — کانٹا نکل گیا کہ تمنا نکل گئی

قدرت میں بھی ہے دخل تمہاری نگاہ کا — جو بات اس نے چاہی کہ یہ ہو وہی ہوئی

یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پہلو رکھتا ہے۔ کیونکہ خدا جو چاہتا ہے۔ وہی ہوتا ہے ؎

دردمندانِ محبت کروٹیں بدلا کیے — ایک پوشیدہ چھری ہر چینِ بستر میں رہی
جس کو سب کہتے ہیں عقدہ نام ہے جس کا گرہ — تیرے گیسو میں رہا میرے مقدر میں رہی
جوشِ وحشت میں دیا قسمت نے میرا خوب ساتھ — مجھ کو بھی چکر میں رکھا خود بھی چکر میں رہی
کیوں نہ ہو دل کی تمنا کو محبت دل کے ساتھ — یہ اسی گھر میں پلی گھر میں بڑھی گھر میں رہی
قتل کا ارماں بھی تھا رسوائیوں کا ڈر بھی تھا — کچھ لگاوٹ کچھ رکاوٹ ان کے خنجر میں رہی

سانس مجھ میں آتی جاتی ہے فقط — اور آنے جانے والا کون ہے
تو نہیں تیرا تصور بھی نہیں — پھر مرا تڑپانے والا کون ہے
کوئی ناصح کو یہ سمجھاتا نہیں — وہ مرا سمجھانے والا کون ہے

جو نہ کہنا تھا وہ منہ پر کہہ گیا — دل لگی ہی دل لگی میں دل مجھے

میں ملاتا ہوں مگر آپس میں یہ ملتے نہیں — یوں مرے اجزائے دل کو اس نے برہم کر دیا

رنج کا عیش کا دل میں کوئی احساس نہیں　　غم نے دنیا ہی بدل دی ترے دیوانوں کی

نامہ بر خط کے تو ظالم نے اڑا ئے پرزے　　شکر کرتا ہوں کوئی حرف نہ تجھ پر آیا

حرف نہ تجھ پر آیا۔ اس کی داد کہاں تک دی جائے ؎

محبت کی محبت ہے عبادت کی عبادت ہے　　جہاں جلوہ کسی کا دیکھ لینا سر جھکا دینا

اے سلامی کس غضب کا ہے یہ منظر دھوپ میں　　آل حیدرؑ دھوپ میں آل پیمبرؐ دھوپ میں

دھوپ میں وہ تھے جنہیں اس سے بھی آگاہی نہ تھی　　چاندنی میں کس طرح رہتے ہیں کیونکر دھوپ میں

وہ علی اکبر جو نازک تھے گل تر سے سوا　　دیر تک لڑتے رہے اللہ اکبر دھوپ میں

پاؤں رکھنے میں بھی ان کے سو طرح کا فیض تھا　　شامیانہ گر د بنجاتی تھی اڑ کر دھوپ میں

سر ٹپکتی ہے ابھی تک ہر در و دیوار پر　　دھوپ اس غم سے کہ تھے سبط پیمبر دھوپ میں

اختر دھوپ میں۔ پتھر دھوپ میں۔ اس زمین میں حضرت میکش کی ایک غزل پڑھی تھی۔ مدت گزر گئی صرف ایک شعر یاد رہ گیا۔ جس میں کبوتر کا قافیہ ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

خط وہ کیا لیتے اثر نے بھی نہ کوٹھے پر دیا　　شام تک اڑتا رہا میرا کبوتر دھوپ میں

اس میں شک نہیں کہ یہ قافیہ بہت لاجواب بندھا ہے۔ اسی شکل اور محدود زمین میں حضرت نوح نے بھی ایک سلام لکھا ہے۔ یعنی نفس مضمون بھی محدود کر دیا ہے۔ مگر باایں ہمہ اس سنگلاخ زمین کو گلستان پر بہار بنا دیا ہے۔ چند شعر اوپر درج کئے گئے ہیں۔ دیکھئے کیا کیا گل کھلائے ہیں۔ پہلے اس سلام کا مطلع اسی طرح تھا۔ مگر بعد میں اس پابندی کی وجہ سے کہ مخلوط قوافی کیلئے مطلع میں بھی مخلوط قوافی کا آنا ضروری ہے۔ مصرعہ ثانی تبدیل کر دیا۔ اب طوفان نوح میں مصرعہ ثانی یہ ہے۔ ع

دھوپ میں ہاں دھوپ میں جلتی زمیں پر دھوپ میں

ہمیں چونکہ پرانا مصرعہ یاد تھا۔ اور یہ مصرعہ بھی مطلع کی شان کو دوبالا کرنے والا ہے۔ اس لئے وہی لکھ دیا۔ آخری شعر میں معنی آفرینی کا جو کمال دکھایا گیا ہے۔ وہ حضرت نوح کیلئے ہر طرح سرمایۂ افتخار ہے

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ صرف مجموعۂ غزلیات سے متعلق تھا۔ لکھنے کو تو اتنا کچھ لکھ دیا۔ مگر حق تو یہ ہے۔ کہ حق ادا نہیں ہوا۔ کلام کا جو انتخاب کیا گیا تھا۔ اس کا ایک چوتھائی حصہ بھی درج نہیں ہو سکا۔ محاسن

کلام کو ظاہر کرنے میں بھی ہمارا قلم بلا شبہ شکستہ پا رہا ہے۔ اگرچہ بہت سی خوبیاں اس کلام میں وجدانی کیفیت رکھتی ہیں۔ جن کو الفاظ میں بیان کرنا دشوار ہے۔ پھر بھی اس ضمن میں ابھی بہت کچھ لکھنے کی گنجائش تھی۔ طول کلام کے خیال سے قلم کو روک لیا گیا ہے۔ اب باقی اصنافِ سخن میں سے بعض حصوں کا نہایت مختصر انتخاب درج کیا جاتا ہے۔ تاکہ ناظرین کو معلوم ہو سکے۔ کہ تمام اصنافِ سخن میں حضرت نوح کا رنگِ سخن یہی ہے۔ اور یہ بات ان کی قادر الکلامی کے لئے نہایت زبردست شہادت پیش کرتی ہے

استادوں کی غزل پر خمسہ لکھنے کا رواج اردو زبان میں عام ہے۔ نظم کی یہ صنف بہت مشکل ہے۔ کیونکہ ایک تو غزل کسی نامور استاد کی ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ اس نامور استاد کی غزلیات میں یہ غزل ہوتی ہے۔ جو خمسہ کیلئے منتخب کیجاتی ہے۔ اس قسم کے بلند پایہ کلام پر مصرعے لگانا آسان کام نہیں۔ اپنی پرواز فکر کو اس نامور شاعر کی پرواز فکر تک پہنچانا اور اسی پائے کا کلام لکھنا ہوتا ہے اور یہ کمال بھی دکھانا ہوتا ہے۔ کہ نئے اور پرانے مصرعوں میں کوئی جوڑ اور پیوند شناخت میں نہ آسکے۔ پھر یہ خوبی پیدا کرنی ہوتی ہے کہ سننے والے اس بات کو محسوس کریں کہ شعر کے مضمون میں فی الواقع اتنی کمی رہ گئی تھی۔ جو ان جدید مصرعوں کے پیوند سے مکمل ہوئی ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ خمسہ کی خوبی شاعر کے بہت بڑے کمال کی شہادت پیش کرتی ہے۔ حضرت نوح نے مختلف مشاہیر کے کلام پر خمسے لکھے ہیں۔ یہاں دو تین مثالیں بطور نمونہ درج کیجاتی ہیں۔

حضرت اشک مرحوم سابق نواب رامپور کی غزل پر ایک خمسہ لکھا ہے۔ ان کی غزل کا ایک شعر یہ تھا ؎

شفا کیسی دوا کیسی یہ سب بیکار باتیں ہیں
محبت کا جو ہو بیمار اچھا ہو نہیں سکتا

اس کی تخمیس ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں ؎

عبث ہر وقت دعوے ہیں عبث ہر بار باتیں ہیں
جنہیں آساں سمجھتے ہو بہت دشوار باتیں ہیں
مسیحا نیز ممکن بس یہی دو چار باتیں ہیں
شفا کیسی دوا کیسی یہ سب بیکار باتیں ہیں
محبت کا جو ہو بیمار اچھا ہو نہیں سکتا

والی ریاست ٹونک کی غزل پر بھی ایک خمسہ لکھا ہے۔ اس میں ایک شعر یہ تھا ؎

جب ایسا ہے تو پھر ملنے ملانے میں تکلف کیوں
نہ مطلب آشنا میں ہوں نہ مطلب آشنا تم ہو

اب تخمیس ملاحظہ ہو ؎

جب ایسا ہے وہاں مجھ کو بلانے میں تکلف کیوں
جب ایسا ہے یہاں تک تم کو آنے میں تکلف کیوں

جب ایسا ہے تو منّتے مان جانے میں تکلف کیوں　　جب ایسا ہے تو پھر ملنے ملانے میں تکلف کیوں
نہ مطلب آشنا میں ہوں نہ مطلب آشنا تم ہو

حضرت داغ کی غزل کا ایک شعر یہ تھا ؎

جب ہوئی صبح آ گئے ناصح　　انہیں حضرت کو دیکھتا ہوں میں

تخمیس ملاحظہ ہو۔ کس شان کے مصرعے لگائے ہیں ؎

قابلیت بتا گئے ناصح　　مغز بک بک کے کھا گئے ناصح
ایک مجھکو ہی پا گئے ناصح　　جب ہوئی صبح آ گئے ناصح
انہیں حضرت کو دیکھتا ہوں میں

حضرت ظہیر دہلوی کا ایک شعر یہ تھا ؎

تیرے کوچے میں تیرے وعدے پر　　دوسرا تیسرا یہ پھیرا ہے

اس کی تخمیس یہ ہے ؎

اس طرف سے اُدھر اُدھر سے اِدھر　　میں لگاتا ہوں رات دن چکر
آج بھی جیسا جو ستم پرور　　تیرے کوچے میں تیرے وعدے پر
دوسرا تیسرا یہ پھیرا ہے

تخمیس کے یہ چند نمونے پیش کر چکنے کے بعد رنگِ جدید کا مختصر انتخاب پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ حضرت نوح کے بہت سے ہم عصر جو دنیائے شاعری میں کافی شہرت رکھتے ہیں۔ اس رنگ میں بالکل صفر ہیں۔ مگر حضرت نوح کا قلم اعجاز رقم اس رنگ میں بھی ویسا ہی خوش خرام ہے۔ جیسا کہ وہ رنگِ قدیم میں نظر آتا ہے۔

دربار دہلی پر ایک نظم لکھی ہے نظم کیا ہے۔ الفاظ کی ایک نادر مصوری ہے۔ دو تین شعر ملاحظہ ہوں ؎

چمکا اختر جاگی قسمت نکلا جوبن نکھری رنگت　　پلٹی صورت بدلی حالت آئی عشرت بھاگی عسرت
دلّی کے دربار کو دیکھو دلّی کے بازار کو دیکھو　　دلّی کی سرکار کو دیکھو دلی کی بھرمار کو دیکھو
پلٹن کے انداز نرالے پہرے پر مامور رسالے　　جان فدا کر دینے والے اکثر گورے اکثر کالے
آپس میں بے باکی دیکھی ہشیاری چالاکی دیکھی　　وردی نیلی خاکی دیکھی کیا کیا شان خدا کی دیکھی

ملکی اور قومی رنگ میں بھی بعض نظمیں لکھی ہیں۔ بیان کی صفائی۔ سلاست۔ روانی۔ بندش کی پختگی خیالات کی شگفتگی اور ہر جگہ شاعرانہ انداز عجب بہار پیدا کرتا ہے۔ چند شعر ملحوظ ہوں ؎

پھیلا نفاق باہم ہو اتفاق کیوں کر ... کچھ ہے یقیں تمہارا کچھ ہے گماں ہمارا
اقبال کی ترقی کوشش پہ منحصر ہے ... پھر ہے زمیں ہماری پھر آسماں ہمارا
اللہ سے ہم اپنے مذہب کی خیر مانگیں ... مٹ جائیگا کسی دن یہ بھی نشاں ہمارا
باہم سے دوستی کا دم لوگ بھر رہے تھے ... یا ہو گیا مخالف سارا جہاں ہمارا

ہندو مسلمان کے عنوان سے چند شعر غزل کی طرز میں لکھے ہیں۔ ان میں بھی وہی آن بان موجود ہے

۵ ہند کی آن بان ہیں دونوں ... تن ہے ایک جان ہیں دونوں
خلق اس پر ذرا نگاہ کرے ... اپنے خالق کی شان ہیں دونوں
بار اپنا اٹھا نہیں سکتے ... اس قدر ناتوان ہیں دونوں
نہ حرم ہے نہ اب وہ تپ خانہ ... ٹوٹے پھوٹے مکان ہیں دونوں
فرض ان پر ہے اس کی رکھوالی ... ملک کے پاسبان ہیں دونوں
تیر اوروں پہ کیا لگائیں گے ... خود یہ اُتری کمان ہیں دونوں
کوئی صورت نہیں صفائی کی ... دل میں یوں بدگمان ہیں دونوں

غور فرمائیں۔ ہر شعر ایک انداز میں کہا ہے۔ ایک رنگ میں لکھا ہے۔ جو کسی حال میں پھیکا نہیں ہوتا اساتذوں کی ٹھوس بندشیں۔ بیان کی سادگی۔ طرز ادا کا بانکپن ہر شعر سے نمایاں ہے

تاریخ نویسی میں بھی حضرت نوح کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ اس میں بھی ایک خصوصیت یہ ہے۔ کہ آپ تدخلہ یا تخرجہ کو کبھی پسند نہیں کرتے۔ اور اس کو عجز طبیعت سمجھتے ہیں۔ جو تاریخ لکھی ہے۔ اس میں سال تاریخ جمع یا تفریق سے بے نیاز ہے۔ حالانکہ اکثر مورخین تدخلہ و تخرجہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور بعض مشاہیر نے اس میں نادر خوبیاں پیدا کر کے عیب کو ہنر بنا دیا ہے۔ مثلاً

الف کشید ملائک ز فوت اکبر شاہ

فوت اکبر شاہ کے اعداد میں سے الف کا ایک عدد کم کیا ہے۔ مگر معنی کے لحاظ سے صنعتِ ایہام پیدا ہو گئی ہے۔ کیونکہ محاورے میں الف کشیدن کے معنی افسوس کرنا ہے۔

یا حضرت امام حسینؑ کی شہادت کا سالِ تاریخ کسی نے اس طرح لکھا ہے۔ ع

سرِ دیں را بریدہ بے دینے

اس میں دین کا سر یعنی دال کاٹ کر باقی ی اور ن کے اعداد ساٹھ شمار کئے ہیں اور یہی سالِ شہادت ہے

لیکن انصاف یہی ہے کہ مادہ تاریخ سالم ہونا چاہیئے۔ کیونکہ سالم عدد نکال نہ سکنے کا عیب ہر حال میں قائم رہتا ہے۔ خواہ تدخلہ و تخرجہ میں کتنی ہی خوبی کیوں نہ پیدا کی جائے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

حافظ ابوالقاسم صاحب کے فرزند کی تاریخ ولادت یہ ہے۔ فرزندِ حافظ (۱۳۱۲ ہجری)

حضرت بیخود بدایونی کے دیوان کا سالِ تاریخ یہ ہے۔ تصویرِ بیخود (۱۳۲۸ ہجری)

ایک مکان کا سالِ تعمیر یہ ہے۔ منظرِ رشکِ بہار (۱۹۱۸ عیسوی)

اب اخیر میں ظریفانہ کلام کا کچھ اقتباس درج کیا جاتا ہے جس سے حضرت نوح کی طبیعت کا چلبلا رنگ بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ یہ حضرت اکبر الٰہ آبادی کے رنگ سے بہت کچھ مشابہت رکھتا ہے ؎

بدلے وہ سب طریقے یاروں نے زندگی کے ۔۔۔ شربت پہ خاک ڈالی ہوٹل میں چائے پی کے

واعظ کے وعظ سے ہے لیکچر کی شان پیدا ۔۔۔ منبر پہ ہو رہے ہیں اوصاف ممبری کے

ہیٹ کو ملنے لگی سر پر جگہ ۔۔۔ خیر مانگیں شیخ جی دستار کی

پہلے لیتے تھے خبر اخبار سے ۔۔۔ اب وہ لیتے ہیں خبر اخبار کی

سبحان اللہ۔ سے اور کی کے فرق سے معانی میں زمین آسمان کا فرق پیدا ہو گیا ؎

جب یہ پوچھا حکم کیا لکھا گیا درخواست پر ۔۔۔ کہدیا دفتر سے تم کو نقل لینی چاہیئے

اور دفتر سے اگر طالب ہوا میں نقل کا ۔۔۔ تو وہ بولے اس کی بھی درخواست دینی چاہیئے

اہلِ مشرق سے نہیں کرتے وہ بات ۔۔۔ اہلِ مغرب کی یہی پہچان ہے

نوکری ملنے میں آسانی نہیں ۔۔۔ پاس ہو جانا بہت آسان ہے

ڈھونڈتے ہیں کونسلوں میں سیٹ وہ ۔۔۔ اپنے گھر سے جن کو اطمینان ہے

روز کے چندوں سے عاجز آ گئے ۔۔۔ لیجئے حاضر ہماری جان ہے

ہے نئی تعلیم کا یہ انقلاب ۔۔۔ اپنی بی بی تک پرائی ہو گئی

دستِ مغرب کے جو دامن بچ گیا ۔۔۔ تو گلو گیر آ کے ٹائی ہو گئی

ریل پر قربان ہوٹل پر نثار ۔۔۔ باپ دادا کی کمائی ہو گئی

پاس آیا کے جو میں آیا گیا   خانساماں سے لڑائی ہوگئی

اس کشتِ زعفران کو دیکھئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت نوح نہیں۔ بلکہ اکبر الہ آبادی بول رہے ہیں۔ دوسرے شعرانے بھی اس رنگ میں لکھنے کی کوشش کی بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ مگر حرکتِ مذبوحی کے سوا اور کچھ نہ کرسکے۔ عجزِ طبیعت سے مجبور ہوکر رہ گئے۔ لوگوں نے پکھڑوں کی پھبتیاں اڑائیں۔ اور رسوائے خلق ہوکر خاموش ہو جانا پڑا۔ بات یہ ہے۔ کہ اختلافِ طبائع کی وجہ سے ہر شخص ہر میدان کا مرد نہیں ہوتا۔ میدانِ شعر کے شہسواروں کی بھی یہی حالت ہے۔ لاکھوں میں کوئی ایک شاعر ایسا ہوتا ہے۔ جس کی طبیعت ہر ایک سانچے میں ڈھل سکے۔ ہر رنگ میں لکھ سکے اور اچھا لکھ سکے۔ حضرت نوح کی طبیعت بھی ایسی ہی ہیولا صفت واقع ہوئی ہے۔ کہ ہر رنگ کا روپ بھر لیتی ہے اور ہر پردے میں گونا گونی و بوقلمونی کے نظر فریب جلوے دکھاتی ہے۔ وہ عاشقوں میں عاشقِ جاں باز۔ شاہدوں میں شاہدِ طناز۔ خانقاہ میں صوفی کبود پوش۔ میخانے میں رندِ دریا نوش۔ رزم میں تیغ جوہر دار۔ بزم میں طوطی خوش گفتار۔ بیماروں میں بیمار۔ خاکساروں میں خاکسار۔ بزمِ عزا میں نوحہ گر۔ قومی مجالس میں ریفارمر۔ غرض کہ ہر قسم کے اندازِ بیان پر حاکمانہ قدرت رکھتی ہے۔

اس تمام بحث کا ماحصل یہ ہے کہ دنیائے شاعری میں اس وقت حضرت نوح کا دم غنیمت ہے۔ انہوں نے دہلوی یا لکھنوی نہ ہونے کے باوجود اردو زبان کا وہ کمال ظاہر کیا ہے۔ جو بلاشبہ لاثانی ہے۔ وہ صحیح معنوں میں حضرت داغ مرحوم کی جانشینی کے مستحق ہیں۔ انہوں نے اردو زبان کی ایسی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ اور اسے اس قدر مقبول اور ہر دلعزیز بنا دیا ہے۔ کہ اس سے زیادہ ترقی دشوار معلوم ہوتی ہے۔ اخیر میں دعا ہے۔ کہ خدائے پاک حضرت نوح کو صحت و دولت اور درازیِ عمر کی نعمتیں عطا کرے۔ تاکہ ان کے فیضِ سخن کا چشمہ باغِ سخن کو دیر تک سیراب کرتا رہے۔ فقط

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

جوشؔ ملسیانی

نیک و بد کی تمیز

(جناب پروفیسر محمد دین صاحب تاثیر ایم ۔ اے)

کسی آدمی کی نادانی اور جہالت کے ثبوت میں عام طور پر کہا جاتا ہے ۔ کہ اسے نیک و بد کی تمیز نہیں ۔ اس فقرے سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے ۔ کہ نیک اور بد میں تمیز کرنا بہت آسان ہے ۔ اور جو آدمی ایسی آسان بات نہیں جانتا ۔ وہ بڑا ہی کودن ہے ۔ زیادہ محتاط آدمی کسی کا نقص نکالتے ہوئے یہ کہہ دیتے ہیں کہ اسے اپنے نیک و بد کی تمیز نہیں" جن سے ان کا مطلب غالباً یہ ہوتا ہے کہ "مطلق" نیک و بد کی تمیز تو شاید مشکل ہے ۔ لیکن ہر شخص بآسانی یہ جان سکتا ہے کہ کونسی چیز اس کے لئے اچھی ہے اور کونسی بری ! — لیکن یہ امر اس قدر آسان نہیں ، جس قدر ان فقروں سے ظاہر ہوتا ہے ۔ نیک و بد میں تمیز کرنا کافی مشکل ہے ۔

اول تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے ۔ کہ آیا نیک و بد کے مختلف معیار ہیں ۔ کیا ہر آدمی یا مختلف گروہوں کے لئے اچھے اور برے کی تمیز مختلف ہے ۔ کیا ہر ایک کا اپنا اپنا "نیک و بد" ہے ۔ یا ہر ایک کے لئے یکساں اصول ہیں ۔ نیک و بد "مطلق" ہے ؟

عام طور پر سنا جاتا ہے ۔ کہ ہر مذہب ، ہر ملک بری چیزوں کو برا اور اچھی چیزوں کو اچھا سمجھتا ہے ۔ سب کے نیک و بد کے اصول ایک ہیں ۔ مگر یہ رائے بھی عام آراء کی طرح سطحی ہے ۔

چیزیں ، یا کام ہر ملک میں ایک حیثیت نہیں رکھتے ۔ مسلمان سود لینا برا سمجھتے ہیں ۔ ہندو جائز سمجھتے ہیں ۔ انگریزوں میں مرد اور عورتیں ملکر ناچتے ہیں ۔ ایشیا میں اسے بے حیائی کہا جاتا ہے ۔ سچ تو یہ ہے ۔ کہ ایک ہی فعل ایک ہی مذہب ، ایک ہی ملک ، ایک ہی شخص کے نزدیک اچھا اور برا ہو سکتا ہے ۔ کیونکہ کوئی کام اپنے طور پر نہ اچھا ہے نہ برا ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے ۔ کہ اگر فعل اچھے اور برے نہیں ہوتے ۔ تو پھر اچھا اور برا کیا ہوتا ہے ؟ — اس کا جواب ایک مثال سے ظاہر ہو سکتا ہے ۔

صبح کا وقت ہے ۔ سردیوں کی صبح ۔ جب لحاف خوب گرم ہوتا ہے ۔ اور آدمی کچھ جاگتا ۔ کچھ سوتا خیالی محل کی تعمیر میں مصروف ہوتا ہے عین اسوقت ایک فقیر نہایت کرخت آواز میں اسی کھڑکی کے نیچے جہاں تم سو رہے ہو ۔ گانا شروع

کرو دیتا ہے۔ تم کچھ دیر اس امید میں صبر کرتے ہو۔ کہ یہ بلا خود بخود ٹل جائے گی۔ مگر وہ کوے کی طرح ڈھیٹ بنا چلاتا ہی رہتا ہے۔ تم غصّے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے اٹھتے ہو۔ اور تمہارا غصّہ ہے بھی بجا۔ تم دیر تک پڑھتے رہے ہو اور صبح امتحان ہے۔ اس لئے تم اس تھوڑے سے وقت میں اچھی طرح آرام کرنا چاہتے ہو اور فقیر ہے بھی ہٹا کٹا مشٹنڈا جس کی مدد کرنا ضروری نہیں۔ ان خیالات کو لئے ہوئے تم لحاف کو پرے پھینک دیتے ہو۔ اور کھونٹی پر لٹکے ہوئے کوٹ میں سے کوئی سکّہ نکالتے ہو۔ پیسہ! نہیں پیسہ نہیں یہ بہت ہلکا ہے۔ روپیہ بہتر ہوگا۔ سو تم روپیہ ہاتھ میں لے کر فقیر کی آنکھ کا نشانہ باندھتے ہو۔ تم نشانچی تو اچھے ہو۔ مگر کچھ غصّہ، کچھ سردی، کچھ نیند، نشانہ چوک جاتا ہے۔ اور روپیہ آرام سے فقیر کی جھولی میں جا پڑتا ہے۔ وہ دعائیں دیتا ہُوا جلدی جلدی چلا جاتا ہے۔ جلدی، جلدی اس لئے کہ اُسے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آتا۔ خائف ہے کہ کہیں یہ روپیہ چھین نہ لیا جائے ـــــ کیا یہ روپیہ کی خیرات اچھا فعل ہے یا بُرا؟

ایک اور صبح لیجئے۔ امتحان ہی کی صبح ہے، ریاضی کے امتحان کی ـــ تم خوشی خوشی ایک پیسہ نہیں۔ روپیہ، کھڑکی میں سے نیچے فقیر کی جھولی میں پھینکتے ہو۔ تمہارا منہ خوشی سے تمتا رہا ہے۔ نشانہ پھر چوک جاتا ہے اور روپیہ فقیر کی آنکھ پر لگتا ہے۔ لہو بہنے لگتا ہے۔ اور وہ گالیاں دینے لگتا ہے۔ وہیں پاؤں پسار کر بیٹھ جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ ـــ کیا یہ روپیہ کی خیرات اچھا فعل ہے یا بُرا؟ ـــــ

ظاہر ہے کہ جس خیرات سے فقیر زخمی ہُوا ہے وہ نیک ہے اور جس سے اُسے خوشی ہوئی وہ بد! ـــ نیک و بد کا اطلاق ہمیشہ ذہنی حالت اور نیّت پر ہوتا ہے۔ فعل نہ اچھا ہوتا ہے نہ بُرا ـــ ایک آدمی بازار میں دوڑا جا رہا ہے۔ یہ کام نہ نیک ہے۔ نہ بد ـــ نہ جانے وہ کسی کے گھر آگ لگانے جا رہا ہے۔ یا کسی ڈوبتے ہوئے کو بچانے ـــ

یہ اس سوال کا ایک پہلو ہے۔ اس کے اور بھی کئی رُخ ہیں۔ مگر وہ زیادہ مشکل ہیں۔ ان پر پھر کبھی روشنی ڈالی جائیگی

لطیفہ

لالہ:۔ کیوں خاں صاحب! کل رات آپ کے ہاں چور آئے تھے۔ کچھ لے تو نہیں گئے؟"

خاں صاحب:۔ لالہ! لے کیا جانا تھا۔ ناک کٹ گئی۔ خدا کی قسم! کہتے ہونگے۔ خاں صاحب کے ہاں کچھ بھی نہیں"

مولانا الطاف حسین حالی
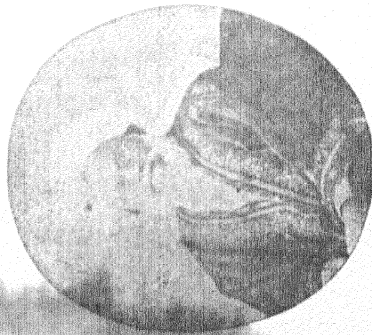
مولوی محمد حسین آزاد

ڈاکٹر سر سید احمد

علامہ شبلی نعمانی

پنڈت رتن ناتھ سرشار

سید مرحوم کے خط کا عکس

دو برس تک یعنی جب تک کہ میں گورنمنٹ آف انڈیا

لیجس لیٹف کونسل میں ممبر رہا مولوی ابوالحسن میرے پاس بطور

پرسنل اسسٹنٹ کے رہے — اوس عہدے کے لیے مجھے ایسے شخص کی مدد

درکار تھی جو انگریزی میں لایق ہو لو سب سے زیادہ یہہ کہ ایماندار

اور معتمد و راز دار ہو اور یہہ سب صفتیں مولوی ابوالحسن میں

موجود تھیں اور میں تصدیق کرتا ہوں کہ اونہوں نے مجھکو اوس

مشکل کام میں ہر طرح کی مدد دی اور بہت ایمانداری اور معتمدی

اور راز داری سے کام کیا اور اونکی انگریزی کی قابلیت اور لیاقت نے

مجھکو بہت بڑی مدد دی — وہ برابر کلکتہ و شملہ میں میرے ساتھ

رہے پس میں احسانمندی کے ساتھ یہہ سرٹفکٹ اونکو دیتا ہوں

مقام علیگڈہ

۱۴ — جنوری ۱۸۹۰ء

Syed Ahmed

(نواب حیدر یار جنگ بہادر نظم طباطبائی)

نیند آتی نہ طبیعت اگر آئی ہوتی
آنکھ لگتی نہ اگر آنکھ لگائی ہوتی

راز سے دل کے نہ کرتا جو زباں کو آگاہ
بات جو اپنی تھی کاہے کو پرائی ہوتی

دل سے حسرت کا نکلنا تھا اگر ناممکن
ساتھ لیتی ہوئی دل کو نکل آئی ہوتی

کبھی تدبیر جو بنتی تو بگڑ بیٹھتے ہم
کبھی تقدیر جو لڑتی تو لڑائی ہوتی

دل کے ارمان اگر تھے نہ نکلنے والے
دم نکلنے کی تو امید بر آئی ہوتی

گر پڑا پاؤں پہ اس کے تو کہا ٹھکرا کر
لوگ بیٹھے تھے ذرا شرم تو آئی ہوتی

تو نے احساں جو اٹھایا تھا کسی کا اے نظم
آنکھ پھر سامنے اُس کے نہ اُٹھائی ہوتی

نغمۂ صفدر

(مولوی [illegible] صاحب صفدر مینائی تلمیذ اکبر حضرت امیر مینائی استاد نواب صاحب رامپور ہز ہائنس نواب حامد علیخاں مرحوم)

ہائے اتنا بھی اے خنجرِ براں نہ ہوا
تو لپٹ کر مری گردن سے گریباں نہ ہوا

جان اگر گیسوئے محبوب بلائیں لے لیں
میں کبھی خوابِ پریشاں سے پریشاں نہ ہوا

فیضِ کامل سے ہو کیا جوہرِ ناقابل کو
عکسِ انساں سے کبھی آئینہ انساں نہ ہوا

حسرت اس قطرۂ خوں پہ جو اٹکا سرِ حلق
دل ہوا ہائے ترے تیر کا پیکاں نہ ہوا

بتکدے میں بھی کئے ہم نے خدا کو سجدے
لطف یہ ہے کہ جدا کفر میں ایماں نہ ہوا

جس قدر توبہ سے نادم ہے صفدر اے واعظ
اس قدر کوئی گناہوں سے پشیماں نہ ہوا

آبحیات

یعنی

حضرت عالیجناب جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر حافظ سید جلیل جانشین حضرت امیر مینائی

(از سید دل محمد رضا منشی فاضل ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول جالندھر شہر)

حافظ سید جلیل حسن صاحب جلیل المخاطب بہ جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر اپنے وطن نانک پور (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں نشو ونما اور علم ضروری پاکر قدیم فارسی زبان میں زبردست استعداد بہم پہنچائی۔ یہ وہ خوش نصیب اور صاحب کمال شاعر ہیں جن کو حضرت امیر مینائی کے فیضانِ صحبت اور تلمذ نے نہ صرف ادبی دنیا میں مشہور کیا بلکہ دنیوی فکر سے بھی فارغ البال کیا۔ آپ امیر مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور تا دمِ واپسیں شفیق استاد کے قدموں سے جدا نہ ہوئے۔ عروض وقوافی کے ساتھ ساتھ جملہ معلومات ونکاتِ شاعری کو حضرت امیر ہی کے خوانِ ادب سے حاصل کیا۔ رام پور میں امیر اللغات کا دفتر قائم ہوا تو اس کا دائرۂ ادارت آپ کے سپرد کیا گیا۔

حضرت امیر مینائی حیدر آباد تشریف لائے تو اپنے ہمراہ جناب جلیل کو بھی لائے اس وقت سے آپ حیدر آباد ہی میں اقامت پذیر ہیں استاد کی وفات کے بعد تمام تلامذۂ امیر نے آپ ہی کو جانشین استاد تسلیم کیا۔ بعد ازاں دکن میں آپ کو اور جناب اختر مینائی کو مہاراجہ سرپین السلطنہ بہادر کی مہمان نوازی اور سرپرستی کی عزت حاصل ہوئی اور دو رسالے محبوب الکلام و دبدبۂ آصفی کی ترتیب و اشاعت کا اہتمام آپ کے ہاتھ میں آیا۔ اسی زمانہ میں آپ نے تذکیر و تانیث پر ایک مبسوط کتاب لکھکر موجودہ زمانہ کی ایک بڑی ضرورت کو پورا فرمایا جس میں سات ہزار الفاظ کی تذکیر و تانیث بہت واضح طور پر بتائی گئی ہے۔ یہ رسالہ آپ کی محققانہ معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہے معہد الملک دکن کی ایک ضخیم تاریخ بھی آپ نے تالیف فرمائی ہے جو سنا جاتا ہے کہ اس وقت سرکار نظام کے حکم سے زیر طبع ہے ۱۳۲۷ھ ہجری میں نواب میر محبوب علی خاں بہادر سابق تاجدار دکن نے پانسو روپے ماہوار وظیفہ عطا فرمایا اور بجائے حضرت داغ کے اپنی استادی کا شرف بخشا اور جلیل القدر کے معزز خطاب سے سرافراز کیا۔ آپ کا پہلا دیوان تاجِ سخن اسی زمانہ کی یادگار ہے۔

حضور پُر نور نواب میر عثمان علی خاں بہادر سریر آرائے سلطنت ہوئے تو اپنے پدر عالی قدر کے جواہر ریزوں میں سے اس گوہر شاہوار کو بھی انتخاب فرمایا اور اپنی استادی کے شرف سے مشرف کیا اس وقت سے

آپ عطیاتِ شاہانہ سے سرافراز ہوتے رہتے ہیں۔ نواب فصاحت جنگ بہادر کا خطاب بھی مراحم خسروانہ میں سے ایک نمایاں سرافرازی ہے۔

آپ کا کلام بالخصوص حضرت امیر مینائی کے رنگ میں رنگا ہوتا ہے۔ دوسرا دیوان بھی چھپ گیا ہے جس کا نام "جانِ سخن" ہے۔ زبان کے لحاظ سے آپ کے دونوں دیوان اردو لٹریچر کے لبریز کارنامے ہیں۔ آپ کی زبان فصیح جملوں کی ترکیب سلجھی ہوئی استعارے قریب الفہم تلمیحات مانوس غرض جو صفات کسی شعر کو ذوق سلیم کیلئے پر لطف بنا دیتے ہیں وہ آپ کے کلام میں موجود ہیں اور یہ سب خوبیاں حضرت امیر مینائی کے فیضانِ صحبت کا نتیجہ ہیں۔

آپکے تصانیف حسب ذیل ہیں۔

(۱) "سوانح عمری امیر مینائی"۔ اس میں حضرت امیر مینائی لکھنوی کے حالات اور واقعات زندگی کا دلچسپ مرقع اور کلام کا بہترین انتخاب بھی دیا گیا ہے۔ نیز آپ کے کلام بلاغت نظام کی خصوصیت اور محاسن شاعری کو بھی اچھی طرح واضح کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ زبان نہایت پیاری ہے۔

(۲) "اُردو کا عروض" یہ رسالہ ۷۵ صفحات پر تمام ہوا ہے اور اس میں صرف انہیں بحوروں سے بحث کیگئی ہے جو اردو میں مستعمل ہیں اور فن عروض کے ضروری مسائل کے علاوہ بحور کے مدارج سے بھی اس میں بحث کی گئی ہے۔ یعنی یہ بتلایا گیا ہے کہ کون کون بحریں کس درجہ کی سمجھی جاتی ہیں۔ جو اس رسالہ کی خصوصیت ہے علاوہ اس کے اس امر کی بھی تشریح کی گئی ہے۔ کہ باوجود اختلافِ ارکان کے کون کون بحریں ایسی ہیں۔ جو ایک ہی سمجھی جاتی ہیں لائبریریوں اور شائقین کیلئے اس کا مطالعہ بیحد ضروری ہے۔

(۳) "کتاب تذکیر و تانیث" یہ اردو زبان میں تذکیر و تانیث پر مبسوط اور جامع کتاب ہے۔ اس سے بہتر ہندوستان میں اور کوئی کتاب نہیں شائع ہوئی۔ لائبریریوں میں اس کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ شائقین ادب کیلئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ ہم نے گذشتہ اوراق میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

(۴) "دیوان تاج سخن" حضرت قبلہ کا پہلا دیوان ہے جس میں زمانۂ شباب کا کلام ہے۔

اپنا دیوان مرقع ہے حسینوں کا جلیل ۔۔۔ نکتہ چیں تھک گئے پر عیب نکالے نہ گئے

جس قدر اس دیوان میں زبان کی صفائی رنگین حسن تخیل رنگ تغزل سہل الممتنع مضامین۔ زور بیاں۔ اور ندرت خیالات پائے جاتے ہیں۔ اور کسی دیوان میں نہیں۔ تمام ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں کیا اعلیٰ طبقہ کیا ادنیٰ طبقہ سب کی زبان پر حضرت کے اشعار جاری ہیں۔ اس سے بڑھکر اور کیا مقبولیت ہوسکتی ہے۔ یہ دیوان ۳۶۴ صفحوں کا ہے میرے خیال میں اس کا ایک ہی ایڈیشن نکلا تھا۔ اس دیوان کی اس قدر مانگ ہے کہ اردو کے کسی دوسرے دیوان کی شائد ہی ہو جب تک اس کے متعدد ایڈیشن نہ نکالے جائیں گے شائقین ادب کی تشنگی پوری نہیں

ہوسکتی۔

جان سخن۔ حضرت کا مشہور و مقبول دوسرا دیوان جو دوبارہ چھپکر تیار ہوگیا ہے۔ زیادہ تعریف فضول ہے۔ اس نادر دیوان کا مطالعہ کیجئے۔ اور زبان کی شیرینی کا لطف اٹھائیے۔

معراج سخن۔ یعنی نعت شریف منقبت و سلام وغیرہ۔ یہ مجموعہ کلام کیا باعتبار مضامین کی ندرت کیا باعتبار کتابت کیا باعتبار طباعت کیا باعتبار اپنے حسن ظاہری و باطنی کے اپنی آپ نظیر ہے۔ ؎

مل نہیں سکتی کہیں اس کی نظیر
کیجئے کس چیز سے تعبیر عشق "فضا"

اگر شائقین اس کو ملاحظہ فرمائیں گے۔ تو بہت لطف اٹھائیں گے۔

"سرتاج سخن" مدحیہ حضور نظام۔ قصائد و قطعات تاریخ کا یہ مجموعہ اپنی آپ نظیر اور اپنی آپ مثال ہے۔ اس کا مطالعہ شائقین ادب کیلئے نہایت ضروری ہے۔

کلام جلیل"۔ یہ رسالہ ۱۰۲ غزلوں کا مجموعہ ہے جو کئی بار چھپ چکا ہے اب کے خصوصیت کے ساتھ بڑے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی تصانیف ہیں۔ جن کا مجھے علم نہیں۔

آپ کے نتائج طبع گہربار تازہ تریں بارہا رسالہ رہنمائے تعلیم میں شائع ہوچکے ہیں۔ اور ہمارے ناظرین مطالعہ سے مستفید ہوچکے ہیں۔ تاہم پھر بھی میں حضرت کا نمونہ کلام پیش کرتا ہوں۔ تاکہ یہ مضمون لطف سے خالی نہ رہے۔

فغاں ہیں درد۔ دعا میں اثر نہیں آتا — جو تم نہیں ہو تو کوئی ادھر نہیں آتا۔
ترے خیال میں جو آئے ان سے کہہ دینا — مری سمجھ میں تو کچھ نامہ بر نہیں آتا

یہ رنگ گلاب کی کلی کا — نقشہ ہے کسی کی کمسنی کا
منہ پھیر کے یوا چلی جوانی — یاد آگیا روٹھنا کسی کا

بتان سنگدل نے آسیا کی چال سیکھی ہے — کہ مجھ کو پیستے ہیں اور خود فریاد کرتے ہیں
ہماری بیخودی کا حال وہ پوچھیں تو اے قاصد — تو کہنا ہوش اتنا ہے کہ تمکو یاد کرتے ہیں

کہہ دو یہ کوہکن سے کہ مرنا نہیں کمال — مر مر کے ہجر یار میں جینا کمال ہے
یہ اشک خوں نہیں جو ٹپکتے ہیں آنکھ سے — کچھ ماجرا جگر کا ہے کچھ دل کا حال ہے

کتنی گہری مرے ساقی کی نظر ہوتی ہے — مجھ کو پہروں میں کہیں اپنی خبر ہوتی ہے
بیوفائی کا ہو شکوہ کہ ستم کی فریاد — سب کا توڑ ایک لگاوٹ کی نظر ہوتی ہے

ناز بھی ہوتا رہے ہوتی رہے بیداد بھی — سب گوارا ہے جو تم سنتے رہو فریاد بھی

اے تمنا تجکو رو لوں شام وصل — آج تو دل سے نکالی جائیگی
آتے آتے آئیگا ان کو خیال — جاتے جاتے بے خیالی جائیگی
دیکھتے ہیں غور سے میری شبیہ — شاید اس میں جان ڈالی جائیگی

دل جلے عشق کے ڈرتے ہیں جل جانے سے — لذت سوز جگر پوچھئے پروانے سے

قفس میں رشک حسرت پر مدار زندگانی ہے — یہی دانے کا دانا ہے یہی پانی کا پانی ہے

پوچھئے یار کی خبر کس سے — جو گیا ہو کے بیخبر آیا

کرتا ہوں یاد شام سے ابروئے یار کو — خنجر سے کاٹتا ہوں شب انتظار کو
گلشن میں ان کی شوخی رفتار دیکھئے — چالیں سکھا رہے ہیں نسیم بہار کو

قاتل کا ہاتھ ہائے رکا بھی تو کب رکا — تھوڑی سی جان جب تن بسمل میں رہ گئی

بوئے مے پا کے میں چلتا ہوا میخانے کو — اک پری تھی کہ اڑا لے گئی دیوانے کو

صبا نے جب سے سنگھائی ہے مجکو بو تیری
چمن چمن لئے پھرتی ہے جستجو تیری

قاتل جو کہہ دیا انہیں بیزار ہو گئے
ایسے کھچے وہ آج کہ تلوار ہو گئے

ہوش اڑتے ہیں بتوں کے دیکھ کر داغ جگر
چوٹ ان پھولوں کی تم بھی اٹھا سکتے نہیں

راز دل کہکر بت کم سن سے خود رسوا ہوئے
جانتے تھے ہم کہ غنچے بو چھپا سکتے نہیں

لاش پر رونے سے بھڑکی اور رسوائی کی آگ
خاک ڈالو خاک پانی سے بجھا سکتے نہیں

منتظر موسم گل کے ہیں ترے دیوانے
ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے ہیں گریبانوں پر

رتبے میں وہ بلند ہے جو خاکسار ہے
دیکھا ہے بارہا کہ فلک پر غبار ہے

زخموں کے پھول کھل گئے تلوار جب چلی
قاتل کی تیغ ہے کہ نسیم بہار ہے

اچھا یہ مشغلہ ہے جدائی میں اے جلیل
وہ آئے یا نہ آئے یہاں انتظار ہے

چھیڑتا کیوں ہے خدا کیلئے صیاد مجھے
تو گرفتار ہوں آتی نہیں فریاد مجھے

دست و بازو کی نزاکت سے بہت ڈرتا ہوں
نیم بسمل نہ کہیں چھوڑ دے جلاد مجھے

ساری دنیا کے خیالات تھے دل میں لیکن
جب سے ہے یاد تری کچھ نہ رہا یاد مجھے

لالہ و گل بھی ترے چاہنے والے نکلے
کوئی پرخوں ہے کوئی داغ جگر رکھتا ہے

شاعری میں ہے عجب لطف خداداد جلیل
شعر اچھا ہو تو جادو کا اثر رکھتا ہے

تمہاری تیغ کے پھل نے مزا دیا ایسا
وہاں زخم کھلے رہ گئے دعا کیلئے

گلے سے کاش اتر جائے خنجر قاتل
یہی دوا ہے مرے درد لا دوا کیلئے

ساقی بہار آتے ہی رنگ اور ہو گیا
گلشن کے پھول دینے لگے بو شراب کی

رندوں کے ہاتھ سے نہیں ٹوٹی یہ ساقیا
نشے سے چور ہو گئی بوتل شراب کی

میری توبہ بھی کوئی توبہ ہے　　جب بہار آئی توڑ ڈالی ہے
ہجرِ ساقی میں ہے یہ حال اپنا　　چشم پرخوں ہے جام خالی ہے
کون آیا چمن میں جس پہ نثار　　پتہ پتہ ہے ڈالی ڈالی ہے
ہے اسی دن سے آئینہ حیران　　تم نے جس دن سے آنکھ ڈالی ہے

چھپنے والے تجھے خبر بھی ہے　　نگہِ شوق پردہ در بھی ہے
شمع کے ساتھ ہیں جلوں کب تک　　اے شبِ غم تری سحر بھی ہے
دل مرا آنکھ آپ کی بیمار　　جو ادھر رنگ ہے اُدھر بھی ہے

چمن کا رنگ پیدا ہو چلا خونِ شہیداں سے　　تری تیغِ ادا پھولوں کی ڈالی ہوتی جاتی ہے
بنے ہو تم جو ساقی مے کشی سے جی نہیں بھرتا　　صراحی پر صراحی آج خالی ہوتی جاتی ہے

ایک غزل بہت مقبول ہوئی۔ اس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

تمہارے حسن کے آگے مہِ کامل نہ ٹھہرے گا　　قسم حق کی کہ حق کے سامنے باطل نہ ٹھہرے گا
ملاؤ دل سے دل تمکو اگر تسکین دینا ہے　　تمہارے ہاتھ رکھنے سے ہمارا دل نہ ٹھہرے گا
جو تھم لیں قیس کی آہیں تو کرنا قصد صحرا کا　　کہ اس آندھی میں لیلیٰ پردہ محمل نہ ٹھہرے گا
تصور سے علاجِ بے قراری ہو نہیں سکتا　　تجھے جب تک نہ دیکھیں گے ہمارا دل نہ ٹھہریگا
قرارِ آتش پہ ہو سیماب کو کیونکر یہ ممکن ہے　　ترے دستِ حنائی میں ہمارا دل نہ ٹھہریگا
ہمارے دل پہ کیا موقوف ہے بیتاب ہو جانا　　وہ جس کے دل میں ٹھہریں گے اسی کا دل نہ ٹھہریگا
چلے ہیں کوئے جاناں کو نہ پوچھو شوق کا عالم　　قدم رہ جائیں دم رک جائے لیکن دل نہ ٹھہریگا
زبانِ حال سے کہتی ہیں موجیں بحرِ الفت کی　　سفینہ بیقراری کا لبِ ساحل نہ ٹھہرے گا
جدا ہوتے تو ہو لیکن یہی انجام ہونا ہے　　تمہارا دل نہ بہلے گا ہمارا دل نہ ٹھہرے گا

جو سر دینے کو آتے ہیں پلٹ کر وہ نہیں جاتے　　ہماری لاش ہی اب کوچۂ قاتل سے نکلے گی

اہل زباں کہیں بھی ہوں رہتے ہیں گلفشاں — گلزار ہو رہا ہے قفس عندلیب سے
جس نے مرض دیا ہے وہی چارہ ساز ہے — کیوں اپنے دل کا درد کہوں میں طبیب سے
غم تھا جو اپنے حصے میں اس سے بھی یاس ہے — غمخوار کتنے ہو گئے پیدا نصیب سے

دھڑکتے دل کو رکھ لو جیب میں تم — کوئی پوچھے تو کہ دینا گھڑی ہے

ضمیمہ

اس ضمن میں حضرت کے متفرق اشعار متعلقہ سہرا و تاریخی قطعات ملاحظہ ہوں

آب گوہر میں جو ڈوبا ہے سراسر سہرا — آتش حسن سے جلتا نہیں رخ پر سہرا
حبذا فرق مبارک پہ مرصع افسر — مرحبا چاند سے چہرے پہ منور سہرا
شوخ ایسا ہے کہ چھونے سے الجھ پڑتا ہے — مجکو حیرت ہے کہ گوندھا گیا کیونکر سہرا

موتیوں کا ہے جو سہرا سر نوشہ پہ جلیل
ہم بھی لکھ لائے ہیں گنجینۂ گوہر سہرا

شکریہ عطائے انبہ

فدوی کو شاہ نے جو کیا آم سے نہال — یہ جاں نثار خاص ہوا سرخرو کمال
نایاب آم لطف ہوئے رنگ رنگ کے — کوئی ہے زرد کوئی ہرا کچھ ہیں لال لال
شیریں سوا ہے شیرۂ جاں سے ہر ایک پھل — خوش رنگ و خوش گوار و خوش انداز و خوش جمال
خوشبو وہ ہے کہ سونگھ لے ان کو اگر مریض — ہو جائے فضل حق سے طبیعت ابھی بحال
منہ میں جلیل کے ہوں زبانیں اگر ہزار — اس مرحمت کا شکر ادا ہو یہ ہے محال

آج کل قطعہ تاریخ وہ پسند کیا جاتا ہے جس کے مصرعہ سے پورا مادہ نکلے تعمیہ تخرجہ کے حساب سے پاک ہو۔ حضرت نے اس فن میں بھی کمال کر دکھایا ہے۔ ملاحظہ ہوں چند نمونے :-

"قطعہ تاریخ جشن سالگرہ مبارک"

جو تشنہ کام تھے وہ آج ہو گئے سیراب — جلیلؔ چشمۂ رحمت ہے شہ کی سالگرہ
اٹھا جو دستِ دعا ہاتھ آ گئی تاریخ — کلیدِ گنجِ سعادت ہے شہ کی سالگرہ

انتخاب قطعہ تاریخ جشن کتخدائی ہمشیرگان بندگان عالی متعالی

۱۳۴۴ھ

داد دیتا ہوں میں تاریخ شادی کی جلیلؔ — آج ہیں اک بُرج میں دو ماہتاب و آفتاب

۱۳۴۴ھ

"تاریخ گلپوشی شہزادگان"

آج اس شاہ کے پیارے ہوئے گلپوش جلیلؔ — جو عطا پاش ہے مشہور خطا پوشی میں
تم وہ تاریخ لکھو جس کا ہو انداز جدا — گل کھلے عیش کے شہزادوں کی گلپوشی میں

۱۳۴۴ھ

مبارک باد بر موقع مسند نشینی شاہ دکن۔ کان اللہ لہٗ

یہ مسند شاہی تمہیں سرکار مبارک — یہ جشن مبارک ہو یہ دربار مبارک
غنچے جو چٹکتے ہیں تو آتی ہے یہ آواز — دولت کا چمن عیش کا گلزار مبارک
کہتی ہے یہ خود شاہ کی پیشانیِ روشن — تقدیر رسا طالعِ بیدار مبارک
احباب کو تری نگہ لطف سزاوار — دشمن کو ترا خنجر خونخوار مبارک

لکھتا ہوں جلیلؔ آصف سابع کی میں تعریف
کیونکر نہ مرے حق میں ہوں اشعار مبارک

تمام شد

تجلیاتِ اختر

(نواب اختر یار جنگ بہادر مینائی معتمد امور مذہبی سرکار نظام)

بجلی گراؤ ہنس کے نہ تم لالہ زار پر — آتی ہے آنچ میرے دلِ داغدار پر

دو ایک روز کیلئے چھپنا قمر کا ہے — ہونے دو ہے نقاب گر روئے یار پر

پردے میں چشمِ شوق کے اک آگ لگ گئی — پائی خطا نقاب کی جب روئے یار پر

کچھ سیرِ گل کا شوق نہیں گلعذار کو — مد نظر ہے چوٹ عروسِ بہار پر

یہ ارتباطِ شانہ و آئینہ تا کجا — برہم نہ سادگی ہو تمہارے سنگار پر

چینِ جبیں ہے محو اسی اہتمام میں — گرد نظر نہ آئے کہیں روئے یار پر

مستانِ عشق کو ہے ہمیشہ چڑھی ہوئی — موقوف یہ جنوں نہیں فصلِ بہار پر

اختر دعا کے واسطے کیونکر اٹھائیے ہاتھ

ہے اک جگر پہ ایک دلِ بیقرار پر

بادۂ کہن

(از جناب فیاض ہریانوی بی اے)

اس چمن سے لخت دل لے کر چلے ۔۔۔ ہم نئے پھولوں سے دامن بھر چلے
رہنے تھوڑی آئے تھے دنیا میں ہم ۔۔۔ سیر کر لی اور اپنے گھر چلے
لائے تھے مثل شرر تھوڑی سی عمر ۔۔۔ آنکھ ادھر کھولی اُدھر ہم مر چلے
لالے کی مانند ہم اس باغ میں ۔۔۔ داغ لینے آئے تھے لے کر چلے

امیر مینائی

پاک لوگ آئے ہیں لے پیر مغاں ۔۔۔ مے کدے میں بادۂ کوثر چلے

احسان شاہجہانپوری

بدر آخر ہو گیا بڑھ کر ہلال ۔۔۔ جس کو بڑھنا ہو، انہیں جھک کر چلے

اشم

کوہکن پر عشق میں ٹوٹے پہاڑ ۔۔۔ سختیوں کے قیس پر پتھر چلے
لے چلی مستانہ چال اپنا ثبات ۔۔۔ تھامنا! ہم اے پری پیکر چلے
پوچھتا ہے ضعف سے منزل میں شوق ۔۔۔ جو نہ چل سکتے تھے وہ کیونکر چلے

جلال لکھنوی

جز شکست دل نہ کچھ حاصل ہوا ۔۔۔ ہم انہیں ٹکڑوں سے جھولی بھر چلے

جلیسی پھلپھلی شری

مار ڈالے گی قفس میں بوئے گل　　ہم اسیروں سے ہوا نچ کر چلے
کیا دھرا تھا اس تہی خمخانے میں　　ہم بھی آ کر اپنا بھرنا بھر چلے

داغ دہلوی

المدد! اے ناخنِ غم! المدد!!　　زخم پھر میرے جگر کے بھر چلے
آئے تھے کوچے میں تیرے غمزدے　　حسرت آلودہ نگاہیں کر چلے

شائق فرخ آبادی

جادۂ راہِ حقیقت کا ہے عزم　　ساتھ میرے خضر سا رہبر چلے

صابر

مے بھی ہو، ساقی بھی ہو، صافی بھی ہو　　یار سے گاڑھی چھنے، ساغر چلے

صفی

پھر گھٹا آئی، پیو اے مے کشو!　　پھر بہار آئی ہے پھر ساغر چلے

عطا آرد

ناتوانِ عشق یوں چلتے ہیں راہ　　تھک کے بیٹھے، دم لیا، اُٹھ کر چلے

قیاس

اُس کی توبہ کا قمر کیا اعتبار　　توبہ کرنے کو بھی جو پی کر چلے

قمر

ہر قدم جس کو بٹھا دیتی ہو یاس　　اُٹھ کے راہِ شوق میں کیونکر چلے
ساقیا مے کا کبھی ایسا ہو دور　　توبہ ٹوٹے، خُم لنڈھیں ساغر چلے

کمال لکھنوی

دردِ الفت دے کے اپنے گھر چلے	آپ میرے حق میں یہ کیا کر چلے

لطیف

تم ابھی آئے، ابھی اُٹھ کر چلے	مفت کا احسان ہم پر دھر چلے

مدہوش

بے خودی ہے چار دن کے واسطے	چاہئے انسان کو جھک کر چلے

وصی

ساتھ ہو لیں دلدہی کو حسرتیں	ہم جو اُن کی بزم سے اُٹھ کر چلے
ہر طرف گردش ہو تیری آنکھ کو	بزم میں ساقی یہی ساغر چلے
حسرتیں کیا کیا لپٹ کر روتی ہیں	وصل کے ارمان جب باہر چلے

یاس لکھنوی

بارِ عصیاں سر پر اپنے دھر چلے	کیا زمانے سے سبک ہو کر چلے

ذہین

جوشِ وحشت میں بھی ہم ہشیار ہیں	پھوڑنے کو سر اسی در پر چلے

ناظم

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے	ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
ساقیا! یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ	جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

درد

ارمغانِ عزیز

داغ کے بعد لطفِ شعر عزیز
ہم نے تیری زبان میں دیکھا

نواب عزیز یار جنگ بہادر کب اور کس سن میں اور کس مقام پر پیدا ہوئے۔ بتدریج انھوں نے کیا کیا ترقیاں کیں۔ ماہوار یا سالانہ آمدنی کیا ہے؟ جاگیر کتنی ہے۔ مختلف علوم و فنون میں کہاں تک قدرت رکھتے ہیں؟ ان باتوں سے نہ مجھے کوئی تعلق ہے۔ نہ ان کے لکھنے کی میں ضرورت سمجھتا ہوں۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ اگر پورا مواد میرے پاس جمع ہوتا تو میں ضرور لکھتا لیکن مجبوری ہے ان کے کمالات کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ کوئی مقامی باخبر شخص یہ کام اپنے ذمہ لیگا۔ اور مفصل حالات زندگی اس کے ہاتھوں مکمل ہونگے!

پہلی بار میں نے غالباً ۱۹۰۱ء میں ان کو حضرت داغ دہلوی کے اس مقدس مکان پر دیکھا۔ جو حیدرآباد دکن محبوب گنج میں منڈی کے سامنے واقع تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سید علی احسن صاحب احسن و افتخار عالم صاحب آزاد مارہروی موجود تھے۔ جناب امیر مینائی لکھنوی کے انتقال کو بہت تھوڑا زمانہ گزرا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آپ نواب عزیز یار جنگ بہادر صرف خاص کے ناظم اور ایک معزز و مقتدر شخص اور قبلہ حضرت داغ کے شاگرد رشید ہیں۔ اس کے بعد روزانہ نہیں تو دوسرے تیسرے دن برابر انسے وہیں ملاقات ہو جاتی تھی۔ اور آپس میں شعر و سخن کے متعلق تبادلہ خیالات کا موقع مل جاتا تھا۔ اس بار تو مجھے حیدرآباد میں کم رہنے کا موقع ملا۔ اور میں جلد چلا آیا۔ دوسری بار میں ۱۹۰۴ء میں پھر گیا۔ اور زیادہ دنوں تک رہا۔ احسن صاحب آزاد صاحب اپنے وطن چلے آئے تھے۔ اُس وقت موجودہ لوگوں میں جناب مرزا خورشید عالم صاحب امراؤ مرزا صاحب نادان۔ نواب ابو المعظم مرزا سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی۔ یادش بخیر نواب میر حسین علی خاں صاحب امیر جاگیردار دکن۔ سید حامد حسین بیدل شاہجہانپوری موجود تھے اور داغ صاحب کا قیام ترپ بازار کی اعلیٰ شان کوٹھی میں تھا۔ ان باتوں کو چوبیس برس ہو گئے۔ آج نہ استاد ہیں۔ نہ وہ جلسے ہیں۔ امراؤ مرزا صاحب چل بسے۔ مرزا خورشید عالم صاحب بھی اٹھ گئے بیدل صاحب کا پتہ نہیں۔ ایک بار نانپور ضلع شاہجہانپور کے مشاعرے میں ملاقات ہوئی تھی۔ اتنا سنتا ہوں کہ ریاست جے پور میں وکالت کرتے ہیں۔ غرض اس پُرلطف زمانے کے ماتم کرنے کو عزیز یار جنگ دکن میں اور سائل صاحب دہلی میں اور میں نارہ ضلع الہ آباد میں زندہ ہوں۔

اس وقت میری عمر کا ۵۲واں سال شروع ہے۔ عزیز صاحب کی عمر بھی اسی کے لگ بھگ ہوگی۔ ممکن

ہے - وہ ایک سال وہ مجھ سے بڑے ہوں - یا اسی قدر میں اُن سے بڑا ہوں - وہ قریب قریب میرے ہم عمر ہیں - مشقِ سخن کا بھی زمانہ غالباً میرا اُن کا ایک ہوگا - اس صورت میں جو کچھ میری رائے اُن کے متعلق ہوگی وہ میرے خیال میں درست ہوگی - اور میں یقینی پورا پورا اندازہ ان کے متعلق کر سکوں گا - مگر ذیل کی باتیں دیکھنے سے کوئی صاحب یہ خیال نہ کریں کہ کسی خاص اثر میں میرے قلم سے اس قسم کے الفاظ نکلے ہیں - اور ایک بھائی نے دوسرے بھائی کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیا ہے - بلکہ جو کچھ میں لکھونگا - بغیر رعایت و مروّت کے لکھوں گا - شاعری کے جاننے والے اچھے برے کے پرکھنے والے - جھوٹ سچ کے پہچاننے والے اس وقت خدا کے فضل سے ہر جگہ موجود ہیں - یہ بات کھلنے کو نہ رہ جائے گی - کہ میں نے کہاں تک انصاف سے کام لیا ہے۔

ان کا پہلا دیوان اسی نام سے ۱۳۲۶ھ میں شائع ہوا - ایک جلد میرے پاس بھی آئی - میں نے اُسی وقت خیال کیا تھا کہ اپنے خیالات کا اظہار کروں لیکن ایسے اسباب پیش آ گئے - کہ میں اس ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا - اور یہ تمنا دل کی دل ہی میں گھٹ کر رہ گئی - اور اس کو کافی زمانہ گذر گیا - اب ان کا دوسرا دیوان "ارمغان عزیز" ۲۸۵ صفحات پر شائع ہوا ہے - اس دیوان میں غزلیں - سلام - مخمس - رباعیاں - کیا کچھ نہیں - چھپائی دیدہ زیب - کاغذ ولائتی - جلد بہت خوبصورت - غرض ایک اعلیٰ درجہ کی کتاب کے لئے جو خوبیاں اور انتظام ممکن ہیں - وہ سب نظر آتے ہیں - باطنی خوبیوں کی بحث میں اگر ہر غزل اور ہر غزل کے اشعار لئے جائیں گے - تو ایک دوسری کتاب ہو جائے گی - لہذا چند غزلوں کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں - بقیہ کلام کے متعلق ناظرین کی مبصر نگاہیں خود اندازہ کرلیں گی۔

سب سے پہلی غزل میں تین شعر قابل لحاظ ہیں۔

کچھ اس طرح مرے لب پہ خدا کا نام آیا
ہؤا یہ شور ، کہ موسےٰ کا ہمکلام آیا

"کچھ اس طرح" اس ٹکڑے کی وسعت اور خدا کے نام کی تخصیص کی داد کیا دی جائے - پھر "موسیٰ کا ہم کلام آیا" صرف ہم کلام ہی نہیں - موسیٰ کا لفظ بھی موجود ہے - اس لفظ نے شعر میں جان ڈال دی اور لطفِ معنی نے مطلع کو مطلعِ خورشید بنا دیا۔

ازل سے حُسن کے ہم قدرداں کچھ ایسے تھے
کہ زندگی میں ہمیں حور کا پیام آیا

یہ قاعدہ ہے کہ جو جس فن یا کمال کا قدرداں ہوتا ہے - اُسی کے سامنے اظہارِ کمالِ فن کیا جاتا ہے - چونکہ ہم حُسن کے قدرداں ازل ہی سے تھے - اس باعث سے مرنے کے بعد نہیں زندگی ہی میں یہ مژدہ سنایا گیا - کہ حور تم کو ملے گی - "حور کا پیام آیا" کے دو معنی نکلتے ہیں - ایک تو یہ خبر دی گئی کہ تم کو حور ملے گی - دوسرے یہ کہ خود حور نے

اپنے حسن کا قدر دان جان کر پیام دیا۔ زندگی کا لفظ شاعرانہ ہے۔ بعد مرنے کے جو بات حاصل ہوتی وہ زندگی ہی میں ہوگئی۔

کہو کلیم ہوئیں کیا حضور سے باتیں
ہمارا ذکر بھی کوئی دم کلام آیا

ایک معشوق کے دو چاہنے والے ہیں۔ ان میں سے ایک کی رسائی حریم ناز تک ہوگئی۔ اور دوسرا اس افتخار سے محروم ہے۔ جب پہلا مشتاق واپس آتا ہے تو دوسرا اشتیاق سے پوچھتا ہے۔ کہ وہاں کیا کیا باتیں ہوئیں؟ ہمارے سلسلۂ گفتگو میں کوئی میرا ذکر تو کچھ نہیں آیا واقعات کے لحاظ سے لاجواب ہے اور لطف زبان اور اندازِ بیان کے خیال سے بے نظیر ہے۔ کلام کے سبب سے موسےٰ نہیں استعمال کیا۔ کلیم کہا۔ اس سے وسعت نظر کا اندازہ کیجیے۔

"محبت تیری کیا، تیری وفا کیا"
ذرا پھر تو کہو تم نے کہا کیا

عاشق کے لئے معشوق کی معمولی ادا بھی غضب ہوتی ہے۔ اس کو دشنام محبت تکرار میں بھی نئے قسم کا مزا ملتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ میں معشوق کی الٹی سیدھی باتیں سنے جاؤں۔ چنانچہ یہی اس مطلع میں دکھایا گیا ہے۔ تم یہی کہے جاؤ، کہ نہ تیری محبت کوئی چیز ہے، نہ ہم تیری وفا کے قائل ہیں۔ مجھ کو تو اس میں بھی خاص لطف آتا ہے۔ "ذرا پھر تو کہو" اُف! اُف!! یہ ٹکڑا قیامت ہے۔ اور اس کو کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ جن پر یہ واقعات گزرے ہوں۔

گئی گزری ہوئی باتوں سے حاصل
اب ان کا شکوہ کیا ان کا گلا کیا

بعض موقع انسان کے لئے ایسے آتے ہیں۔ جن میں زبان سے یہی الفاظ نکلتے ہیں۔ کہ جو کچھ ہوا۔ وہ ہوا۔ گزری ہوئی باتوں کو جانے دو۔ ایسے ہی اشعار ہیں جو زبان پر رہ جاتے ہیں۔ اور ضرب المثل کا مرتبہ حاصل کرتے ہیں۔

اُنہیں سے کر رہا ہوں اُن کے شکوے
الٰہی خیر ہو مجھ کو ہوا کیا

جس کا شکوہ ہو۔ اگر اُسی سے کیا جائے۔ تو یقیناً وہ اور برہم ہوگا۔ خدا سے شکایت کرتا۔ اپنے پرائے سے کہتا تو خیر ایک بات بھی تھی۔ مگر مجھے یہ کیا سوجھی۔ کہ انہیں کا شکوہ انہیں کے آگے لے بیٹھا۔ اور ذرا بھی انجام کا خیال نہیں اب نہیں معلوم اس کا نتیجہ کیا ہو؟

چھوڑ کر پھولوں کا دامن باغ میں
اڑ رہی ہے نکہتِ برباد کیا

"اڑ رہی ہے"۔ اِس شعر میں خاص ٹکڑا ہے۔ اور اسی ٹکڑے نے اس شعر میں دو معنی پیدا کر دیئے۔ اُڑنے کے معنی فخر کرنے کے بھی ہیں۔ جب پھولوں کا دامن چھٹ گیا۔ تو نکہت کے لئے فخر کا موقع کیا رہ گیا۔ دوسرے معنی یہ بھی ہوتے ہیں کہ پھولوں کا دامن چھوڑ کر اڑ رہی ہے یعنی آوارہ و سرگشتہ پھرتی ہے "نکہتِ برباد"۔ اس موصوف صفت کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ نکہت اور وہ بھی برباد! سبحان اللہ۔

آپ کے حُسن کا جواب نہیں
ہمنے سارے جہان میں دیکھا

یہ سہل ممتنع کی ایک لاجواب مثال ہے۔ اور اس شعر کی نثر نہیں ہو سکتی۔

اٹھے تو ابر کی صورت گرے تو برق کی طرح
ہمیں بھی ضعف میں حاصل ہیں قوتیں کیا کیا

اوّل تو یہ زمین ہی میرے خیال میں نئی ہے۔ پھر یہ شعر قابل داد ہے۔ ابر اور برق کی قوت کس قدر بے پناہ ہوتی ہے۔ یعنی کوئی انتہا نہیں۔ اور پھر ضُعف میں ابر کی صورت اٹھنا اور برق کی طرح گرنا' یہ دو خاص فقرے ہیں۔ جب ضعف میں یہ قوتیں حاصل ہیں۔ تو اس وقت کی قوتوں کا اندازہ کیجئے۔ جب ضعف نہ رہا ہوگا۔ ابر اور برق۔ اور اٹھنا اور گرنا کا تقابل معمولی بات نہیں۔

پھاڑ کر دستِ جنوں دامانِ صبر
اپنے ہاتھوں آپ رُسوا ہو گیا

دستِ جنوں دامانِ صبر پھاڑ کر اپنے ہاتھوں رسوا ہو گیا۔ تعریف سے باہر ہے۔ دستِ جنوں اور اپنے ہاتھوں کیا خوب شعر کہا ہے۔ اگرچہ میں دامن کی جگہ دامان کا استعمال بُرا جانتا ہوں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ کوئی نہ لکھے۔ مجھے یا کسی کو حق نہیں کہ جو لفظ خود ترک کرے۔ اس پر اوروں کو بھی مجبور کرے۔ ہر شخص کے لئے کچھ خصوصیات ہوتی ہیں۔ انہیں میں سے یہ بھی میرے لئے ہے۔

سرگزشت عمر کا ایک ایک حرف
سارے عالم میں فسانہ ہو گیا

دنیا میں کوئی اچھی بری بات ایسی نہیں جو مشہور نہ ہو جاتی ہو۔ کچھ واقعات تو تحقیقات کے خیال سے سنے جاتے ہیں کچھ حالات آنے والی نسلوں کے لئے درسِ عبرت بنتے ہیں۔ پھر ایک ایک حرف کا فسانہ ہو جانا کس قدر اہمیت

رکھتا ہے۔ سرگزشت اگر فسانہ ہو جاتی تو شعر میں اتنی وسعت نہ پیدا ہوتی۔ جس قدر ایک ایک حرف کے فسانہ ہونے سے پیدا ہوئی۔

کاروانِ اشکِ غم کے ساتھ ساتھ
دل بھی پہلو سے روانہ ہو گیا

اگر یہ مضمون یوں ادا کیا جاتا کہ دل آنسوؤں کے ساتھ بہ گیا۔ تو کوئی خاص بات پیدا نہ ہوتی۔ اسلئے اتنے الفاظ اور خاص ترکیب کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اب کاروانِ اشکِ غم کے ساتھ دل کے روانہ ہونے میں ایک خاص لطف پیدا ہو گیا۔ دل نے دیکھا کہ کارواں تو چلا جاتا ہے۔ میں ہی تنہا رہ کر کیا کروں گا۔ لہذا وہ بھی دیکھا دیکھی کارواں کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ پھر آنسوؤں کا تعلق جو دل کے ساتھ ہے۔ اور دل کے روانہ ہونے میں جو اہمیت ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔

غزل

آرام اپنے بس کا ہے، بس میں نہیں ہے کیا
گلشن میں کیا دھرا ہے قفس میں نہیں ہے کیا

اپنی خوشی سے طائرِ جاں کس طرح اُڑے
اُلجھا ہوا یہ تارِ نفس میں نہیں ہے کیا

لیلیٰ سے پوچھتا رہا مجنوں یہ بار بار
آواز میرے دل کے جرس میں نہیں ہے کیا

وارفتگانِ عشق کو کیا اس سے واسطہ
کیا ہے ہوس میں اور ہوس میں نہیں ہے کیا

دونوں کا ایک ہی ہے حقیقت میں مدعا
پروانے کا مذاق مگس میں نہیں ہے کیا

گلشن کی یاد دیتی ہے رہ رہ کے چٹکیاں
سامانِ اضطراب قفس میں نہیں ہے کیا

قائل ہوں میں تو لذتِ آزار کا عزیزؔ
جو خار میں خلش ہے وہ خس میں نہیں ہے کیا

یہ غزل تمام وکمال قابلِ دید ہے۔ اوّل تو زمین نئی۔ پھر محدود قوافی۔ لیکن اس تنگی پر بھی کیا کیا شعر نکالے ہیں۔ اور ہر شعر میں وجدانی کیفیت پیدا کی ہے۔ پڑھیے اور پڑھتے جائیے۔ میں نے سب اشعار کئی کئی بار پڑھے اور ہر بار ایک نیا لطف اٹھایا۔

روگ جی کا فراق ہے گویا
سانس لینا بھی شاق ہے گویا

جان ہے گویا "شان ہے گویا" اس طرح پر لاہور سے وجاہت صاحب جھنجھانوی ایک نمبر کسی رسالے کا نکال

چکے ہیں۔ مگر فراق ہے گویا اور شاق ہے گویا یہ بھی خوب قوافی ہیں۔ اس زمین میں ایسا نفیس مطلع کہنا عزیز صاحب ہی کا کام تھا۔ دونوں مصرعوں میں کس قدر برجستگی ہے اور معنی بھی کیا خوب ہیں۔

تم سے کب تھی وصال کی امید
یہ بھی ایک اتفاق ہے گویا

وصال اور اتفاق کے لفظ اور دونوں الفاظ کے مفہوم نے عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔ تمہارا وصل اتفاق سے ہوگیا ورنہ اس کی امید نہ تھی۔ دیکھنے میں سطحی معنی یہ ہوئے مگر اندازِ بیان کچھ ایسا دل فریب ہے کہ داد دیئے بغیر نہیں رہا جاتا۔

دشمنی تو ہے دشمنی اُن کی
دوستی بھی نفاق ہے گویا

دوستی کو نفاق مان کر دشمنی کو کس قدر وسعت دی گئی ہے۔ جب ان کی دوستی نفاق کے برابر ہے۔ تو دشمنی کیا ہوگی۔ علاوہ اس کے "دشمنی تو ہے دشمنی اُن کی" اس ترکیب پر دل بے چین ہوا جاتا ہے۔

دل تو سنتا ہے کوئی اور سنے یا نہ سنے
پردۂ غیب سے آتی ہیں صدائیں کیا کیا

غیب کی آواز سے دل کا جو تعلق ہے۔ وہ سب جانتے ہیں۔ "کوئی اور سنے یا نہ سنے" اس فقرے کی روانی دیکھئے۔ ایسے موقع پر یہی الفاظ نکلتے ہیں۔ کوئی اور سنے یا نہ سنے دل تو سنتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ پردۂ غیب کی باتیں دل پر القا ہوتی ہیں۔

مے پرستوں کی دعاؤں کا اثر ہے ساقی
جھوم کر روز برستی ہیں گھٹائیں کیا کیا

عالم بادہ خواری میں گھٹاؤں کے جھوم کر برسنے کا لطف وہی لوگ جان سکتے ہیں۔ جو اس میں عملی طور پر حصہ لیتے ہیں۔ "اے ساقی! گھٹاؤں کا قاعدہ ہے کسی دن برسیں اور کسی دن نہ برسیں۔ مگر جو یہ روز لگاتار برس کر لطفِ مے نوشی بڑھاتی ہیں۔ تو یہ دعاؤں کا اثر ہے۔ اور کس کی دعاؤں کا۔ مے پرستوں کی دعاؤں کا۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے۔ کہ مے پرست اس قدر مقبول ہیں کوئی ان کی دعا خالی نہیں جاتی۔ مے کش یا مے خوار کہا جاتا تو وہ بات پیدا نہ ہوتی۔ جو مے پرست سے ہوئی۔ اس پرست میں عجب لطف ہے۔

مست کرتی ہیں لٹاتی ہیں مزا دیتی ہیں
میرے ساقی تری مستانہ ادائیں کیا کیا

اداؤں کے تین فعل بیان کئے ہیں - اور تینوں بلائے جان ہیں - ساقی کے لحاظ سے تینوں باتیں موقع کے ساتھ ایک ہی مصرع میں بیان کی ہیں - یہ کمال نہیں تو اور کیا ہے ایسے مصرع مشکل سے ہاتھ آتے ہیں

دیدنی ہے چمنِ دہر کا نقشہ بھی عزیز
رُت بدلتے ہی بدلتی ہیں ہوائیں کیا کیا

واقعاتِ عالم اور انقلاب زمانہ کو کس خوبی سے پیش کیا ہے - قانونِ قدرت یہی ہے کہ ادھر رت بدلی اور ادھر مخالف یا موافق ہوائیں چلنے لگیں -

نیرنگیٔ خیال کا اللہ رے اثر
صحرا ہوا چمن، کبھی صحرا چمن ہوا

نیرنگیٔ خیال کا لفظ تعریف سے بالاتر ہے - صحرا کا چمن اور چمن کا صحرا ہونا نیرنگیٔ خیال پر منحصر ہے - اگر یہ لفظ نکال ڈالا جائے تو دوسرا لفظ اس کی جگہ نہیں مل سکتا - اور شعر بے کار ہو جائے گا -

کچھ کم نہ تھی سیاہیٔ عصیاں مگر عزیز
مٹی میں دب کے اور بھی میلا کفن ہوا

اس زمین میں بیشتر استادوں کی غزلیں موجود ہیں - اور کفن کا قافیہ قریب قریب ہر شخص نے لکھا ہے - مگر یہ بھی خوب ہے - سیاہی عصیاں کیا کم تھی - اس سے پہلے ہی کفن میلا ہو چکا تھا - پھر قبر کی مٹی نے اور بھی میلا کر دیا - یہ "اور بھی" کی تعریف کہاں تک کی جائے -

جھوٹے وعدوں پر تھی اپنی زندگی
اب تو وہ بھی آسرا جاتا رہا

یہ شعر حسرت و یاس کا جیتا جاگتا مرقع ہے - صریحاً معلوم تھا - کہ سب جھوٹے وعدے ہیں - اور ان جھوٹے وعدوں کو بھی غنیمت جان کر ہم جی رہے تھے - لیکن اب جھوٹے وعدے بھی نہیں ہوتے - کوئی صورت زندگی کی باقی نہ رہ گئی - ہائے! ہائے!! اب تو وہ بھی آسرا جاتا رہا - "وہ بھی آسرا جاتا رہا" خوب کہا ہے -

کس دُھن میں کس خیال میں کس اشتیاق ہیں
دم توڑتا ہے آپ کا بیمار دیکھنا!

پہلے مصرع میں دُھن - خیال - اشتیاق تین لفظ ہیں - ایک لفظ کی دوسرے لفظ سے دوسرے لفظ کی تیسرے لفظ سے مناسبت میں جو خوبی ہے - وہ ظاہر ہے - ان تینوں لفظوں کی نشست و بندش اور اپنی اپنی جگہ معنی خاص لطف دے رہے ہیں - ردیف کے لحاظ سے (کس) میں بھی عجیب بات ہے - یہ نہیں ظاہر

کیا۔ کہ کیا دُھن ہے؟ کیا خیال ہے؟ کیا اشتیاق ہے؟ اس کا چھپا رہنا ہی بہتر تھا۔

میرے خدا نے مجھ کو دکھایا نصیب سے
کس کو نصیب تھا ترا دیدار دیکھنا

یہ اکثر اشعار میں دیکھا گیا ہے کہ اگر ایک لفظ مکرر آ جاتا ہے تو بُرا معلوم ہوتا ہے لیکن اس شعر میں نصیب دو جگہ ہے۔ مگر بُرا نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ ایک حُسن پیدا کر رہا ہے۔ یہ قوتِ مشق کی بیّن دلیل ہے۔ کہ عیب کو ہنر کی صورت میں دکھایا جائے۔

کیا اور کوئی دل کو نہ لیگا بجا درست
بے کار تم نے کہد یا بے کار ہو گیا

اس شعر کی ترکیب اور انداز بیان پر حضرت داغ کے شعر کا دھوکا ہوتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے۔ عزیز صاحب کے پردے میں داغ بول رہے ہیں۔ کیا اتنا صاف شعر کوئی کہہ سکتا ہے۔ پہلے مصرعہ کی شان روزمرّہ کی جان ہے۔ جس قدر بھی داد دی جائے۔ وہ کم ہے۔ طرز بیان پر دل لوٹ پوٹ ہوا جاتا ہے۔

آئینہ لیکے ذرا دیکھ لو صورت اپنی
عشق وہ راز ہے تم سے بھی چھپایا نہ گیا

تم افشائے راز کا بہت کچھ دعوے کرتے تھے۔ لیکن تم سے بھی نہ چھپا، اُدر سے کچھ اور صورت ہوگئی۔ آئینے کے صورت دیکھو تو قلعی کھُل جائے کہ دعوے غلط تھا۔ "تم سے بھی" کی تعریف امکان سے باہر ہے۔

سوتے فتنوں کو جگاتی رہی رفتار تری
میری سوئی ہوئی قسمت کو جگایا نہ گیا

اس مضمون کو بہت سے لوگوں نے لکھا ہے۔ لیکن یہ شعر معنی اور بندش کے لحاظ سے نیا ہے۔ طعنہ کے ذریعہ سے عاشق اپنا کام معشوق سے نکالنا چاہتا ہے۔ سوتے فتنوں کو جگایا تو کوئی بات نہ کی میری سوئی ہوئی قسمت کو تیری رفتار جگاتی۔ تو میں جانتا۔ یعنی جب سوئی ہوئی قسمت جاگتی۔ تو سب ارمان نکل جاتے۔ طریق بیان نرالا ہے۔

حلق میرا ہے جگر میرا ہے گردن میری
تیغ تیری ہے چھری تیری ہے خنجر تیرا

اس لف ونشر مرتب کو دیکھیئے۔ پھر تین چیزیں ادھر اور تین چیزیں اُدھر میرے خیال میں شاید الفاظ بھی

دونوں مصرعوں کے برابر ہیں۔ اس تقسیم کی خوبی قابلِ آفریں ہے۔

کیا رہا میرے لئے باغِ جہاں میں بلبل!
شمع پروانے کی ہے اور گل ترا تیرا

باغ جہاں میں کس قدر وسعت ہے۔ بظاہر شمع و پروانہ اور بلبل و گل سے زیادہ کوئی حقیقی عاشق و معشوق نہیں۔ لوگ عاشقانہ مضامین میں انہیں سے بیشتر نسبت دیتے ہیں۔ جب بلبل کیلئے گل اور پروانے کے لئے شمع مخصوص ہو چکی تو میرے لئے کیا رہ گیا۔

مجھ کو چپ رہنے کی عادت ہو گئی
ان کو لپکا پڑ گیا دشنام کا

دو حالتیں اپنی اور اُن کی دکھائی ہیں۔ ایک معنی تو یہ ہوئے۔ کہ مجھ کو خاموشی کی عادت ہو گئی۔ اور انکو دشنام کا لپکا پڑ گیا۔ دوسرے معنی یہ بھی ہوتے ہیں۔ کہ میری خاموشی نے ان کو دشنام پر اُبھار دیا۔ اگر میں خاموش نہ رہتا۔ تو شاید وُہ گالیاں نہ دیتے۔

جس کو دُنیا موت کہتی ہے عزیز
دوسرا اِک نام ہے آرام کا

اس میں کوئی شک نہیں۔ تمام دُنیا کی تکلیفیں زندگی تک منحصر ہیں۔ جب انسان مرجاتا ہے۔ تو نہ کوئی جھگڑا باقی رہتا ہے۔ نہ بے چینی ہوتی ہے۔ موت کو آرام سے نسبت بہت بجا اور درست ہے۔

عمر بھر مجھ کو حسینوں سے سروکار رہا
اِسے تاکا اُسے جھانکا یہی آزار رہا

ایک من چلے انسان کی زندگی کا ہو بہو نقشہ ہے۔ جس کے پہلو میں چُلبلا دل ہوتا ہے اُس کا یہی حال رہتا ہے ذرا غور کیجئے " اِسے تاکا اُسے جھانکا یہی آزار رہا " اور پھر " عمر بھر مجھ کو حسینوں سے سروکار رہا " کسی کو یہ مطلع پسند آئے یا نہ آئے، مجھے تو بے حد پسند ہے۔

بام پر وُہ تو کبھی روز برآمد نہ ہوئے
دیکھنے والوں کا میلا پسِ دیوار رہا

" وہ تو " یہ ٹکڑا قیامت ہے۔ ایسے الفاظ تلاش سے نہیں ملتے۔ حسنِ اتفاق سے مل جاتے ہیں۔

رازِ دل آنکھوں سے ظاہر ہو گیا
سلسلہ اشکوں کا مخبر ہو گیا

اوّل تو زمین نئی۔ اس پر محدود قوافی جب تک ہمارے اشک آنکھوں سے نہ نکلے تھے۔ راز دل مخفی تھا۔ مگر اشکوں کے جاری ہونے سے انکشاف ہوگیا۔ اس صورت میں اشکوں کے سلسلے کا مخبر ہو جانا کس قدر لگتی ہوئی بات ہے۔

خط کہاں کا بات تک اس نے نہ کی دیکھ کر قاصد کو تر بھر ہوگیا
جو نہ کرنا تھا کیا وہ عشق نے جو نہ ہونا تھا وہ آخر ہوگیا

یہ دونو اشعار سہل ممتنع کی عمدہ مثال ہیں۔ کون ان کی نثر کر سکتا ہے شمس العلما مولانا حالی صاحب کا فیصلہ ہے کہ عمدہ شعر کی تعریف یہی ہے جس کو سنایا جائے اُس کے دل میں فوراً یہ خیال آئے۔ کہ ایسا تو میں بھی کہہ سکتا ہوں۔ اور جب کہنے کو بیٹھے تو نہ کہہ سکے۔ دونوں شعر اس خاص صفت کی تحت میں آتے ہیں۔ ان سے بڑھ کر اور کیا صاف شعر کوئی کہے گا۔

اُڑا کر نہ لے جائے بادِ حوادث
ہوا ہو نہ جائے نشیمن کسی کا

بعض اشعار کیا قریب قریب وہ اشعار جن میں رعایت لفظی سے کام لیا جاتا ہے۔ فضول سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن بادِ حوادث کیلئے ہوا ہونہ جائے۔ اگرچہ ایک قسم کی یہ بھی رعایتِ لفظی ہے۔ مگر مفہوم اور اپنی بندش سے ایک خاص حُسن اس میں پیدا ہوگیا ہے۔ اور یہ مناسبت لفظی بہت دلکش معلوم ہوتی ہے۔

حال ابتر ہے شبِ غم نالۂ شب گیر کا
اس اندھیرے میں پتہ چلتا نہیں تاثیر کا

اس مطلع کو بار بار پڑھتا ہوں اور سر دھنتا ہوں، دل لُطف اٹھاتا ہے۔ زبان بیان نہیں کر سکتی۔ ایسے ہی مطلع شاعر کا نام روشن کرتے ہیں۔ کہاں تک اس کی شرح لکھوں دفتر درکار ہے۔

چھوٹ جاؤں قیدِ غم سے زندگی میں کیا مجال
ربعِ مسکوں ہے احاطہ خانۂ زنجیر کا

زندگی کا لفظ نگینہ ہے۔ اگر اس لفظ کو نکال کر دوسرا لفظ رکھئے تو وہ بات پیدا نہ ہو سکے گی۔ خانۂ زنجیر کو ربعِ مسکوں کہنا اور اس کڑی کو زندگی کے سلسلے سے ملانا۔ اور قیدِ غم سے مناسبت پیدا کرنی آسان کام نہیں۔ بڑی کوشش سے یہ شعر کہا گیا ہے۔ اور لاریب تعریف کا مستحق ہے۔

کوچہ گردی سے بچایا جوشِ وحشت میں مجھے
مہربانی طوق کی احسان ہے زنجیر کا

زنجیر کے احسان اور طوق کی مہربانی کو کیا اچھے الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ اگر یہ دونو چیزیں نہ ہوتیں۔ تو کوچہ گردی کی زحمتوں سے جوشِ وحشت میں بچنا محال تھا۔

نظر اُن کی نہیں اُٹھتی نہیں ملتی نہیں جمتی
نہیں کھلتا کدھر دیکھا کسے تاکا کسے جھانکا

یہ وہ پامال زمین ہے۔ جس پر قریب قریب تمام اساتذہ نے غزل کہی ہے۔ اور خوب خوب شعر نکالے ہیں۔ ناسخ و آتش کے علاوہ خود حضرت داغ دہلوی و جناب امیر مینائی لکھنوی کی متعدد غزلیں موجود ہیں۔ ایسی پامال زمین میں اب اچھے اشعار کا نکالنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ نظر کیلئے پہلے مصرعہ میں تین درجے قایم کئے گئے ہیں اور ایک درجے پر دوسرے درجہ کو ترجیح ہے۔ پہلے نظر اٹھتی ہے۔ پھر ملتی ہے۔ پھر جمتی ہے۔ اگر اس سلسلے میں کچھ تغیر کیا جائے۔ تو وہ سلسلہ باقی نہیں رہتا۔ پھر تین باتیں دوسرے مصرعہ میں بھی موجود ہیں۔ دیکھنا، تاکنا، جھانکنا ایک رشتے میں چھ موتی پرو دیئے ہیں۔

چھپاتے کس طرح مجھ سے کراماً کاتبین آخر
نظر میں تھا مری ایک ایک نقطہ فردِ عصیاں کا

جو میرے کرتوت تھے۔ میری نگاہ میں تھے۔ اس صورت میں کراماً کاتبین کا چھپانا بے کار تھا۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے خاص شعر ہے۔

آپ کی محفل ہے یا چوروں کا گھر
جس کو دیکھو چھینتا ہے دل گیا

بہت زمانے کی بات ہے۔ ممکن ہے مجھے میرا حافظہ دھوکا دیتا ہو۔ میں جس زمانے میں دکن میں تھا۔ سید امیر حسن صاحب فروغ لکھنوی وکیل ہائیکورٹ حیدر آباد نے اس طرح پر ایک مختصر سا مشاعرہ کیا۔ میں نے بھی شعر کہے۔ امراؤ مرزا صاحب ناداں و جناب سائل دہلوی نے غزلیں لکھیں۔ پہلے عزیز صاحب کا پہلا مصرعہ کچھ اور تھا۔ جس پر داغ صاحب نے یہ اصلاح فرمائی تھی

غیر کیا جانے غیب کی باتیں
میں سمجھتا ہوں آپ کا مطلب

"غیب کی باتیں" اور "آپ کا مطلب" اس میں کچھ ایسی خوبی ہے کہ دل لطف اٹھاتا ہے اور زبان کچھ نہیں کہتی۔

باتوں باتوں میں لے لیا دل کو
آنکھوں آنکھوں میں لے اُڑا مطلب

کس قدر صاف شعر ہے۔ اور بے ثباتی اور بے اثنا میں کیا لطیف نکتہ ہے۔

بے ثباتی کا اگر رنگ یہی ہے تو عزیز
رونقِ عالمِ ایجاد کہاں تک آخر

یہ زمین بھی نئی ہے۔ اب تک کسی کی غزل اس ردیف قافیہ میں نظر نہیں آئی۔ دنیا کی بے ثباتی کا خاص مرقع ہو
دوسرے مصرعہ میں غضب کا درد ہے۔ ہائے رونقِ عالمِ ایجاد کہاں تک آخر۔

دستِ نازک پر ترے رہ رہ کے تیری تیغِ ناز
صدمے ہوتی ہے مرا دل چیر کر سر کاٹ کر

پتھر کاٹ کر، انگلی کاٹ کر یہ زمین آسان نہیں ہے۔ جدید ہونے کے علاوہ مشکل بھی ہے۔ دستِ نازک پر ترے
تیغِ ناز کا صدمے ہونا۔ اس سبب سے کہ دستِ نازک سے دل چاک کرنے اور سر کاٹنے کی امید نہ تھی۔ لیکن یہ باتیں
ظہور پذیر ہوگئیں۔ اور اس نے خلافِ امید یہ اہم کام کر ڈالا۔ پھر تیغ کے دو فعل دکھائے ہیں۔ ایک دل چاک کرنا
دوسرے سر کاٹنا۔ نزاکت کے ساتھ ایک ہی کام کرنا مشکل تھا۔

جاں کنی کی قدر تو میری کسی نے بھی نہ کی
نام آور ہو گیا فرہاد پتھر کاٹ کر

جاں کنی اور کوہ کنی میں کتنا فرق ہے۔ جاں کنی کے مقابلے میں کوہ کنی کوئی چیز نہیں۔ لیکن فرہاد کوہ کنی کر کے
مشہور ہوگیا۔ اور اُس کی قدر اہلِ محبت میں ہوئی۔ اور میں نے جو اُس سے زیادہ اہم کام کیا یعنی جاں کنی کی۔ اُس کو کسی
نے بھی نہ دیکھا۔ خوب شعر ہے۔

کھل گیا جو بے گناہی کا زمانہ بھر میں راز
کٹ گیا ہے دل میں گردن میری خنجر کاٹ کر

گردن کاٹ کر خنجر کا کٹ جانا خوب بات کہی ہے۔ کٹ جانے کے معنی شرمندہ ہونے کے ہیں۔ چونکہ میں
بے گناہ تھا۔ اور خنجر نے میری گردن کاٹی۔ اس لئے وہ اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہوا۔ کٹ جانے نے عجیب بات پیدا
کر دی ہے۔

مشورے ہوتے ہیں غیروں سے وہاں ہر بات میں
میرے خط میں بھی بنائے لفظ اکثر کاٹ کر

ہر بات میں غیروں سے وہاں مشورہ لیا جاتا ہے۔ اور یہاں تک اس کی پابندی ہے۔ کہ میرے خط میں بھی
اکثر الفاظ تغیر و تبدل کر کے کچھ سے کچھ مضمون کر دیا۔ حالانکہ میری تحریر میں اس کی ضرورت ہی نہ تھی۔ کیا اچھا خیال

ہے۔ اور کتنے اچھے الفاظ میں ادا ہوا ہے۔

گرے گی طور پر بجلی مکرّر
اُٹھے شعلے دلِ غمناک سے پھر

"مکرّر" نے ردیف کو کس قدر مضبوط کر دیا ہے۔ ہلائے نہیں ہل سکتی۔ پھر مفہوم بھی کس قدر عمدہ ہے۔

جورِ معشوق ، گریۂ عاشق
ہیں یہ دونو حساب سے باہر

نہ جورِ معشوق کی کوئی حد ہے۔ نہ گریۂ عاشق کی کوئی انتہا۔ خوب بات کہی ہے۔

میرے حق میں بھی کچھ تو ہو ارشاد
کر چکے غیر کی شکایت بس

غیر کی شکایت تو کر چکے۔ مگر میرے متعلق کچھ ارشاد نہ ہوا۔ کہ مجھ سے تو کوئی شکایت نہیں۔ علاوہ اس کے دوسرے معنیٰ یہ بھی ہوتے ہیں۔ کہ غیر کی شکایت تو ہو چکی۔ اب میرے لئے کچھ ارشاد ہو۔ کہ میرے لئے کیا حکم ہوتا ہے۔

مبارک ہمصفیرو تم کو گلشن
ہمارا تو ٹھکانا ہے قفس بس

کیا حسرت ہے۔ اور کیا عبرت ہے۔ اور کیا صبر ہے۔ اسی میں ایک شعر اور بھی ہے۔

وہ میرا ان کے آگے شکوۂ غیر
وہ ان کا ہنس کے فرمانا کہ بس بس

کس قدر صاف صاف الفاظ ہیں۔ اور "ہنس کے فرمانے" نے تو جان ڈال دی ہے۔ کہ تم شکایت فضول کرتے ہو۔ اور یہ بھی معنی ہیں کہ بہت کچھ کہہ چکے۔ اب خاموش رہو۔ پھر قافیہ اور ردیف کا کیا کہنا۔

یہ شیوۂ وفا یہ عنایت غلط غلط
تم اور تم کو مجھ سے محبت غلط غلط

معشوق کسی سے وفا نہیں کرتے۔ عنایت سے ان کو تعلق نہیں رہتا۔ یہ دونوں باتیں ہوں گی۔ تو کسی مصلحت سے ہونگی۔ "تم اور تم کو مجھ سے محبت" ان الفاظ پر وجدانی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اندازِ بیان غضب ہے۔

مٹ جائے دل سے لذت آزار جھوٹ جھوٹ
ٹل جائے سر سے ہجر کی آفت غلط غلط

دونوں مصرعہ برابر کے ہیں۔ اور جھوٹ جھوٹ اور غلط غلط نے تو قیامت ہی برپا کردی۔

ترے دستِ کرم سے مجھ کو ساقی ہوا ساغر عنایت ایک پر ایک
چلی آتی ہے اُن کے ساتھ دل میں تمنا یاس حسرت ایک پر ایک

یہ قوافی اور یہ ردیف اور یہ بحر، دونوں شعر لاجواب ہیں۔

سمائی سارے عالم کی ہے مشکل
بڑھیگا حشر کا میداں کہاں تک

شاعر جو کچھ چاہے کہ سکتا ہے۔ ناممکن کو ممکن کرکے دکھانا اس کے نزدیک مشکل نہیں۔ غرض اس کی دُنیا الگ ہے۔ یہ اپنے خیال کا تنہا مالک ہے۔ اور اس کی ملکیت میں غیر کا تصرف نہیں۔

تھک تھک گیا ہوں ہجر کی شب اضطراب میں
کہہ کہہ کے ہائے ہائے جگر ہائے ہائے دل

علاوہ تناسبِ الفاظ کے واقعیت اس شعر میں بڑی حد تک ہے۔ اضطراب کے سبب سے ہائے ہائے جگر، ہائے ہائے دل کہہ کہہ کے تھک گیا ہوں۔ اضطراب کا بھی دل اور جگر سے جو تعلق ہے۔ وہ پوشیدہ نہیں

یوں ہر کسی کے سامنے کہنے سے فائدہ
دل سے کوئی سنے تو کہوں ماجرائے دل

کوئی دل سے سنے تو دل کا حال کہوں۔ بالکل بجا اور درست ہے۔ اور جب دل سے کوئی نہ سنے۔ تو دل کا ماجرا کہنا ہی بےکار ہے۔

کہنے کو ہم نے کہہ بھی دیا اضطراب میں
سننے کو تم نے سن بھی لیا ماجرائے دل

لیکن اثر کچھ نہ ہوا۔ عجیب رخ سے شعر کہا ہے۔ بندش کتنی پیاری ہے۔ اور الفاظ کس قدر اچھے ہیں۔

رکھ کے زاہد کے سامنے ساغر حُسنِ نیت کو دیکھتا ہوں میں
اسمیں سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں دل کی وسعت کو دیکھتا ہوں میں

جب ساغر سامنے آئیگا تو محال ہے کہ نیت درست رہ سکے۔ زاہد کا امتحان حُسنِ نیت کے دیکھنے کے خیال سے لیا جاتا ہے۔ واہ رے حُسنِ نیت! عجب لفظ رکھ دیا ہے۔ صرف نیت نہیں کہا۔ بلکہ حُسنِ نیت۔ یہی لفظ سارے شعر کی جان ہے۔

بظاہر دل ذرا سی چیز ہے۔ لیکن اس کی وسعت کا اندازہ کوئی نہیں کرسکتا۔ دُنیا بھر کے خیالات اس میں

رہتے ہیں۔ تمام زمانے کی کھپت یہیں ہوتی ہے۔ ترکیب کے لحاظ سے اور معنی کے اعتبار سے بڑا درجہ اس شعر کا ہے۔

ٹوٹا ہے دل کسی کی محبت میں اس قدر
لکھتے ہیں اپنا حال شکستہ قلم سے ہم

دل ٹوٹنے کا اظہار شکستہ قلم سے کیا جاتا ہے۔ یہ بھی ندرتِ خیال ہے۔ تناسبِ الفاظ نے عجب بات پیدا کر دی۔ اور پھر "اس قدر" نے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

اُن کو اس درجہ تنفر ہے دلِ عاشق سے
خط بھی لکھا تو کہیں دال نہیں لام نہیں

یہ بہت پامال زمین ہے۔ اکثر حضرات کی غزلیں اس طرح پر نظر آتی ہیں۔ مگر اس خوبصورتی کے ساتھ اب تک یہ قافیہ کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ دل کے لئے دال نہیں لام نہیں خوب ہے۔ ایسی باتیں اتفاق سے ملتی ہیں فکر سے نہیں ملتیں۔ خوب لکھا ہے۔ کیا کہنا۔

دیکھنا راہ پہ آجائے گی آتے آتے
گردشِ چشم تری گردشِ ایام نہیں

شعر سے مشاقی ظاہر ہوتی ہے۔ گردشِ ایام ایک ایسی چیز ہے۔ جس پر کسی کا زور نہیں۔ لیکن تیری گردشِ چشم آتے آتے کسی نہ کسی طرح راہ پر آ ہی جائے گی۔ پھر "دیکھنا" یہ لفظ توجہ کے قابل ہے۔ خصوصاً گردشِ چشم کے لحاظ سے تو بہت ہی موزوں ہے۔

آسماں دُور۔ زمیں سخت۔ زمانہ دشمن
رُبعِ مسکوں میں کہیں نام کو آرام نہیں

"زمیں سخت آسماں دُور" پورا پورا محاورہ نظم ہو گیا۔ اور پھر زمانہ دُشمن جب یہ تین شکلیں سامنے ہیں۔ تو ربعِ مسکوں میں آرام کا ملنا فی الحقیقت محال ہے۔ اور کہیں پناہ کی جگہ نہیں۔

جب ہے ساقی مہرباں تو مے کشو!
تم کو فکرِ بیش و کم آخر یہ کیوں

زمین بھی نئی شعر بھی نیا۔ جب ساقی مہربان ہے۔ تو بیش و کم کی فکر فضول ہے۔ شراب ختم ہونے پر اور مل جائے گی۔ کیونکہ شراب کا ملنا ساقی کی مہربانی پر موقوف ہے۔

دیدہ و دل کیا ڈبو دیں گے مجھے
ہو گئے دونوں بہم آخر یہ کیوں

آنسو دل میں رہتے ہیں۔ اور رونے کے وقت دل سے چل کر آنکھوں تک آتے ہیں۔ تو دیدہ و دل جب مل گئے۔ یقینی غضب آئے گا۔ یعنی مجھے ڈبو دیں گے۔

چار دن کی زندگی کے واسطے
اِس کی خواہش اُس کا ارماں کیا کریں

جب زندگی کا اعتبار نہیں۔ تو چند دن کے لئے کسی چیز کی خواہش کیوں کی جائے۔

ذیل کے اشعار میں سے اگر ہر شعر کے متعلق کچھ لکھا جائے۔ تو یہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔ لہذا بغیر اپنے اظہار رائے و خیالات کے درج کئے دیتا ہوں۔ نقاد اور مبصر نگاہیں خود فیصلہ کریں کہ یہ اشعار کیسے ہیں۔ اور دنیائے ادب میں ان کا صحیح وقار کہاں تک ہے۔

ناتوانی سے قدم اٹھتے نہیں — دو قدم پر ہے بیاباں کیا کریں
حُسن کا انکے عشق کا اپنے — تذکرہ بار بار کرتا ہوں
جانتا ہوں تمہارے وعدوں کو — اور پھر اعتبار کرتا ہوں
یہ نکلتے ہیں بےشمار آنسو — جب خطائیں شمار کرتا ہوں
نازنینانِ جہاں شعبدہ گر پکے ہیں — دیکھنے کو تو یہ بھولے ہیں مگر پکے ہیں
ہم لٹا دینگے محبت میں متاعِ ہستی، — ہم دکھا دینگے ارادے کے اگر پکے ہیں،
پختہ کاری کی خبر دیتی ہے خامی اُن کی — کان کے کچے ہیں مطلب کے مگر پکے ہیں
عشق کا بار اُٹھانے سے کُھلا یہ عقدہ — خام سب جن و ملایک ہیں بشر پکے ہیں
آ رہی ہے کھنچ کے فرقت میں لبوں پر بار بار — ناتوانی میں بھی جانِ ناتواں رُکتی نہیں
اڑ کے ہم پہنچیں گے منزل پر ہوائے شوق میں — کارواں رک جائے گردِ کارواں رُکتی نہیں
شوخی سے کشمکش نہیں اچھی حجاب کی — کُھل جائیگی گرہ ترے بندِ نقاب کی
ہوتے ہی صبح وصل کی شب دیکھتا ہوں کیا — تلوار بن گئی ہے کرن آفتاب کی

شیشے کھلے نہیں ابھی ساغر چلے نہیں — اڑنے لگی پری کی طرح بو شراب کی

ایسا نہ ہو کہ چھین لے محشر میں بدگماں — دو نقلیں چاہئیں مجھے فردِ حساب کی

ساقی کہاں کی بھول یہ کہنے کی بات ہے — دانستہ تو نے غیر کو دی ہے مرے نام کی

میری یہ عرض وصل کا امیدوار ہوں — اُن کا یہ قول آپ نے ناحق امید کی

دو آنکھیں دل کے ساتھ ملی ہیں اسی لئے — گنجائش ایک میں تھی کہاں ذوقِ دید کی

محشر میں عیبِ حسن نے اُن کو چھپا لیا — نظریں ٹٹولتی رہیں مشتاقِ دید کی

ہستی سے پھر چلے ہیں عدم کی طرف کو ہم — بدمستیاں ہیں یہ بھی شرابِ الست کی

نابود و بود میں تو نہیں کچھ بھی فاصلہ — حاجت ہے درمیاں میں فقط ایک جست کی

اُس نے ہنس کر بات میری ٹال دی — اُلجھنوں میں اور اُلجھن ڈال دی

تڑپ فرقت میں جانِ ناتواں کی — بنی تصویر مرگِ ناگہاں کی

پڑے ہیں ہجر میں جینے کے لالے — کہاں کی آرزو حسرت کہاں کی

کہانی ہجر کی آگے کسی کے — نہ کرنی تھی بیاں لیکن بیاں کی

دیتا ہے مجھ کو دل مرا رہ رہ کے مشورہ — جس وقت جاگتا نہ ہو دربان جائیے

بجلی کی طرح چال ہوا کی وہ چل گئے — دل میں رہے نظر میں پھرے پھر نکل گئے

میں اشتیاقِ دید میں بے چین اس طرف — وہ اُس طرف نگاہ بچا کر نکل گئے

غش کھا کے میکدے میں گرے تھے مگر عزیز — ساقی نے ہاتھ تھام لیا ہم سنبھل گئے

دیکھ کر بزم میں خالی ساغر — آنکھ میخواروں کی بھر آتی ہے

تیرے خنجر میں عجب ہے صیقل — موت کی شکل نظر آتی ہے

ناز کرتی ہیں دعائیں کیا کیا — کوئی امید جو بر آتی ہے

وہی منہ ہے وہی منہ میں زباں ہے
مگر جو بات پہلے تھی کہاں ہے

شکنجے میں تمہارا نیم جاں ہے
زمیں نیچے ہے اوپر آسماں ہے

نہ ہوگی سرگزشتِ عمر آخر
بڑا قصہ ہے لمبی داستاں ہے

بولنے کی مجھ میں اب طاقت کہاں
روح پہلے کھنچ گئی تصویر سے

وصل کا وعدہ پھر اس انداز سے
نیچی نظروں سے دبی آواز سے

آنکھ ان کی مجھ سے مل سکتی نہیں
بند ہے رستہ ہجوم ناز سے

اُس نے کچھ اس طرح پوچھا حالِ دل
مجھ کو کہنا ہی پڑا آرام ہے

اتنا بھی ہوش بے خودیٔ شوق میں نہیں
کس کا خیال ہے مجھے کس کی تلاش ہے

خالی نہیں اثر سے ہماری فغاں عزیزؔ
دلکش کبھی ہے اور کبھی دل خراش ہے

عزیزؔ اس باغِ عالم کی حقیقت کھل گئی مجھ پر
نگاہِ چشم نرگس سے زبانِ برگِ سوسن سے

دور ہم تم سے بھلا محفل میں کیونکر بیٹھتے
جسکے دل میں تھی جگہ اس کے برابر بیٹھتے

بدگمانی مجھے رہنے نہیں دیتی آگے
کیوں مِرے ساتھ مِرا نقشِ قدم ہوتا ہے

عشق جب آسان تھا آسان تھا
اب وہی دشوار سا دشوار ہے

دل میں اُترے دل میں ٹھہرے دل میں لے چٹکیاں
اے مصوّر مجھ کو اک تصویر ایسی چاہیئے

ہائے وہ انگڑائی لیکر اُن کا کہنا ناز سے
خنجر ایسا چاہیئے شمشیر ایسی چاہیئے

کیا ہے قید نزاکت نے اس طرح اُن کو
کہ اب کسی کے تصوّر میں آ نہیں سکتے

پھول بادہ سرو مینا غنچہ اک پیمانہ ہے
باغ کا یہ باغ ہے میخانے کا میخانہ ہے

گردِ کلفت سے معرا شست و شو سے بے نیاز
میری عریانی بھی گویا خلعتِ شاہانہ ہے

راز الفت کو چھپایا لیکن ان پر کھل گیا
سچ کہا ہے یہ کسی نے دل کو دل سے راہ ہے

ہوسِ دولتِ دنیا بھی بلا ہوتی ہے
جتنا کم کیجیئے اتنا ہی سوا ہوتی ہے

تھام لیتا ہے وہیں جھکے مجھے دستِ سبو
بیخودی میں جو ذرا لغزشِ پا ہوتی ہے

تعجب کیوں ہے بخشش پر ہماری تجھکو اے زاہد
خطا وارِ محبت تھے سزاوارِ کرم نکلے

گماں کیا کیا تھا اُن کو خانۂ دل کی تجلّی پر
تلاشی لی تو سینے میں مرے داغِ الم نکلے

غضب ہے، وہ عدو دونوں ہماری بزمِ ماتم میں
ہم آئے ہم بیٹھے ہم اُٹھے ہم نکلے

میں گرا قدموں پہ ان کے اضطرابِ شوق میں
اور وہ گھبرا کے دامن کی ہوا دینے لگے

اوّل اوّل ہم سمجھتے تھے محبت کو بُرا
آخر آخر تیرے دھوکے بھی مزا دینے لگے

بوند بھی آتشِ تر کی ساقی!
کیسی اُڑتی ہوئی چنگاری ہے

گلِ نازک پہ جب پڑنے لگی دھوپ
کیا بلبل نے سایہ اپنے پَر سے

دیا ہے خط سے پہلے میں نے انعام
چلا ہوں حال کیسی نامہ بر سے

پہلے خمسے میں سے

بدل گئے ہیں زمانے کے اندنوں نقشے
ہیں صرف مہر و محبت کے چرچے ہی چرچے
حیل کے چشم مروت سے اٹھ گئے پردے
یہ قول اُن کا ہے میری بلا ملے تجھ سے
بلائیں اسکی بھی لوں گر ملے بلا اُن کی

دوسرے خمسے میں سے

کسی کے طرّۂ زلفِ دراز نے دل پر
کسی کے عشوۂ جادو طراز نے دل پر
کسی کے شیوۂ راز و نیاز نے دل پر
کسی کے غمزۂ و انداز و ناز نے دل پر
کئے وہ ظلم کہ جس کا شمار مشکل ہے

سلام کے دو چار شعر

غضب کی چلتی پھرتی برق ہے شمشیر سرور بھی
اِدھر نکلی اُدھر پہنچی یہاں ٹھہری وہاں چمکی

سعادت کا شقاوت کا عوض مقصود تھا ورنہ
نہ جنت کی ضرورت تھی نہ حاجت تھی جہنم کی

گھٹا دی چلتے چلتے لشکرِ کفار کی کثرت
بڑھا دی تیغِ شاہِ دین نے آبادی جہنم کی

دیا سجدے میں شہ نے سر شہادت ایسی ہوتی ہے — قیامت نے کہا اُٹھکر قیامت ایسی ہوتی ہے

دھیان آتا ہے شہِ تشنہ دہن کا جس دم — ایک دریا مری آنکھوں سے رواں ہوتا ہے

عابدِ زار کی زاری نہیں دیکھی جاتی — جان آنکھوں میں ہے چہرے سے نمایاں غم ہے

تعلق ہے غلامی کا مجھے شبیر و شبّر سے — گدا ہوں میں اسی در کا بنا ہوں میں اسی گھر سے

سلاموں کے بعد ایام ہجر کے نام سے ایک طولانی نظم ہے۔ اگر اُسے بھی لکھتا ہوں۔ تو طوالت کا خیال ہے۔

دو ایک رباعیاں بھی ملاحظہ فرما لیجئے:-

پُر نور و ضیا بخش جہاں بانی ہے — کیا دورِ عزیز دورِ عثمانی ہے

دفتر کے ہیں اوراق طبق گردوں کے — یہ مہرِ فلک بھی مہرِ سلطانی ہے

دیگر

محروم رہے وصل سے ناشاد رہے — ہر وقت اسی فکر میں برباد رہے

اللہ سے چاہیں گے ترے ظلم کی داد — یہ یاد رہے یاد رہے یاد رہے

دیگر

پھر پھول مہکتے ہیں بہار آئی ہے — پھر قلب بھڑکتے ہیں بہار آئی ہے

پھر باغ میں ہے دورِ مئے نابِ عزیز — پھر جام چھلکتے ہیں بہار آئی ہے

کہاں تک لکھوں اور کن کن خوبیوں کو دکھاؤں اور کس کس بات کی تعریف کروں۔

پہلے دستور نہ تھا لیکن اب رواج ہو گیا ہے کہ ہر تصنیف یا تالیف کے ساتھ مصنف یا مؤلف کے حالات عمر درج کیے جاتے ہیں اور تصویر بھی دی جاتی ہے۔ اگر اس دیوان میں کوئی کمی ہے تو یہی ہے کہ حالات زندگی درج نہیں۔ اگرچہ تصویر ہے۔ یقین ہے کہ یہ کمی آئندہ ایڈیشن میں پوری کر دی جائیگی۔ دیوان مبلغ دو روپیہ بھیجنے یا وی پی منگوانے پر عالی جناب نواب عزیز یار جنگ بہادر "عزیز" عزیز منزل کنگ کوٹھی روڈ حیدر آباد دکن سے مل سکتا ہے۔ فقط۔

نوح ناروی

رہنمائے تعلیم کا دفتر لاہور شہر کی رام گلی میں ہے - آدمی جس چیز کا نام بار بار لیتے ہیں ۔ اس کی چھپی ہوئی طاقت اور چھپے ہوئے اثر کو بھول جاتے ہیں۔ مگر تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی تعلیمی رہنمائی اسی میں ہے - کہ اُن کو شہروں اور قصبوں اور اُن کی گلیوں کے ناموں کے ذریعہ تعلیم دی جائے - اگر ان ناموں میں کوئی تعلیمی بات موجود ہو۔

رام گلی ایسا نام ہے کہ اس کو سُن کر ہر ہندو کے دل میں اپنے مشہور اور مضبوط کیرکٹر کے اوتار سری رام چند جی مہاراج کا خیال آجانا چاہئیے - اور جب اُس اچھے نام کی گلی میں کوئی بات دیکھی جائے یا سنی جائے - تو فوراً اس نام کی لاج رکھنے کے لئے اس برائی کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئیے۔

ہردوار میں ہر کی پیڑی ہے - سنسکرت زبان میں ہر کا لفظ خدا کے مفہوم کو ادا کرتا ہے - اس لحاظ سے ہردوار کے یہ معنی ہوئے کہ "خدا کے قریب" اور ہر کی پیڑی کا مطلب بھی یہ ہوا کہ خدا کے پاس جانے کا زینہ - میں نے ہردوار کی پیڑی پر بے شمار ہندو عورتوں اور مردوں کو اشنان کرتے دیکھا ہے - اور وہاں میں بہت دن رہا ہوں - میں یہ دیکھنا چاہتا تھا - کہ دریا میں نہانے والے ہر کی پیڑی کے اصلی مفہوم کو سمجھ کر غسل کرتے ہیں یا محض رسم و رواج کے دریا میں غوطہ لگاتے ہیں۔

ہندوستان میں ہزاروں مقامات کے نام تعلیمی نقطۂ نظر سے رکھے گئے - مگر لوگ اب ان ناموں کے مقصد کو بھولتے جاتے ہیں - اگر رہنمائے تعلیم جیسا مفید تعلیمی کام کرنے والا پرچہ اس طرف توجہ کرے - کہ ہندوستان کے سب شہروں اور آبادیوں کے ناموں پر غور کر کے ایک مضمون لکھے - اور اس سے تعلیمی نتائج نکالے - تو ہندو قوم کے لئے یہ مضمون بہت مفید ہو گا -

ہندو طلباء کو اپنے ناموں پر بھی غور کرنا چاہئیے - ہندوؤں کے نام سب سے زیادہ سری کرشن جی مہاراج کے مختلف ناموں پر رکھے جاتے ہیں - اور اس کے بعد رام چندر جی کے نام پر - جن طلباء کے نام کسی مشہور اوتار یا پیشوا کے نام پر ہوں - ان کو چاہئیے - کہ اپنے نام کی لاج رکھیں - اور کوشش کریں - کہ جو تعلیم ان بزرگوں نے انسانی ترقی و تکمیل کے لئے ان تک پہنچی ہو - اس کی پیروی کریں - اور اس کا نمونہ بنیں -

کیا رہنمائے تعلیم رام گلی کے لئے آئندہ کچھ کام کرنا چاہتا ہے؟ اگر ایسا ہو۔ تو میرے خیال میں اس کی نہایت عمدہ خدمات جو اس نے سالہا سال سے ملک کی کی ہیں۔ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکنے لگیں گی۔

حسن نظامی دہلوی

بچّے

اپنے بڑوں سے

ہمیں کھیل کود میں مصروف دیکھ کر تم کہتے ہو

"یہ ننھے بچے ہیں"

لیکن کیا یہ کل ہی بات نہیں

کہ تم بھی ننھے بچے ہی تھے

ہاں! اور اب کل ہی تو وہ دن آرہا ہے

کہ ہم بھی مرد اور عورت ہوں گے۔

اور بحر و برّ کے مالک بنیں گے۔

کھیل میں تو ہم بچّے ہیں۔

لیکن گھر اور مدرسے میں ہمارے مستقبل کا دھیان کرو۔

ہمیں بحر و بر پر حکومت کرنے کے قابل بنا دو۔

ہماری رہنمائی عقل و دانش سے کرو۔

ہمیں راستی کا سبق پڑھاؤ

اگرچہ ہم بچے ہیں۔

لیکن تمہاری ہر حرکت کو غور سے دیکھ رہے ہیں۔

ہمارے ان کھیل کے دنوں میں تم اپنی اچھی مثال پیش کرو

ہم تو ہمیشہ تمہارے ہی قول و عمل کی نقل اتارنے والے ہیں۔

(ایلا ویلر ولکاکس)

منصور احمد (جائنٹ اڈیٹر رسالہ "ہمایوں" لاہور)

میری حماقتیں

جب انسان سے کوئی حماقت سرزد ہو جائے ۔ تو اس کے چھپانے کی کوشش کرتا ہے ۔ کیونکہ اسے یہ بات ناگوار خاطر ہوتی ہے کہ اس کی حماقتوں کا علم دوسروں کو ہو جائے ۔ لیکن بعض ایسی حماقتیں ہوتی ہیں ۔ کہ مرورِ زمانہ سے اُن کی اہمیت کم ہو جاتی ہے ۔ اور پھر ان کے ظاہر ہو جانے سے زیادہ کوفت نہیں ہوتی ۔ بلکہ بعض اوقات تو اُن کے بیان کرنے میں لُطف حاصل ہوتا ہے ۔ میرے خیال میں جب کبھی کسی سے کوئی حماقت سرزد ہو جائے تو اسے کسی نہ کسی پیرایہ میں ضرور ظاہر کر دینا چاہیے ۔ تاکہ دوسرے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اس سے سبق حاصل کر سکیں ۔ چنانچہ میری عادت ہے کہ ایسے موقعوں پر اپنی حماقت کسی فرضی شخصیت کی طرف منسوب کر کے احباب کے سامنے بیان کر دیا کرتا ہوں ۔ اور طرزِ بیان ایسا اختیار کرتا ہوں کہ ان کو شبہ تک نہیں ہوتا ۔ کہ میں اپنی تعریف کر رہا ہوں ۔

لیکن جن حماقتوں کا میں اب ذکر کرنا چاہتا ہوں ۔ ان کو میں کسی فرضی شخصیت کی طرف محض اسلئے منسوب نہیں کرتا کہ سطورِ مذکورہ بالا پڑھ کر آپ پر اصلیت فوراً روشن ہو جائیگی ۔ اور آپ سمجھ جائیں گے کہ کسی اور کے پردہ میں میں اپنی حماقتوں کو بیان کر رہا ہوں (ع) کوئی معشوق ہے اِس پردۂ زنگاری میں ۔

جب میری عمر کوئی پانچ سال کی تھی ۔ میرے والد صاحب مجھے ایک رات ایک ڈراما دکھلانے کے لئے لیگئے میرا خیال ہے کہ ان کو ضرور مفت پاس مل گیا ہوگا ۔ ورنہ وہ ایسی فضول خرچی کرنیوالے نہیں کہ پیسے خرچ کر کے ڈرامہ دیکھنے جائیں ۔ اور پھر ایک بچہ کے ٹکٹ پر پیسے ضائع کریں ۔ مجھے اب یہ بھی یاد نہیں کہ ڈراما کون سا تھا ممکن ہے " خدا دوست " ہو ۔ کیونکہ بچپن میں جو میں نے دو یا تین ڈرامے دیکھے ہیں ۔ ان میں سے صرف " خدا دوست " کا نام مجھے یاد ہے ۔ اس ڈرامے کا پلاٹ بھی میری یاد سے بالکل محو ہو چکا ہے ۔ اور میرا خیال ہے کہ جب میں ڈرامہ دیکھ رہا تھا ۔ اُس وقت بھی میں اچھی طرح نہ سمجھ سکتا تھا ۔ کہ کیا ہو رہا ہے ؟ البتہ ایک سین کا ذرا سا حصہ مجھے یاد ہے ۔ وہ یہ تھا ۔ کہ ایک قاضی صاحب کے دربار میں ایک آدمی آیا جس کی کسی نے ناک کاٹ ڈالی تھی اس کی ناک پر مرہم کی پٹی لگی ہوئی تھی ۔ اور وہ قاضی کے دربار میں فریاد کرنا چاہتا تھا ۔ یہ ایکٹر ہمارے پڑوس میں رہا کرتا تھا ۔ اور مجھے شبہ ہے ۔ کہ اسی نے ہمارے لئے ایک ایسے پاس کا انتظام کیا تھا ۔ جس کو " چہ گفت " کہتے ہیں ۔ اس نے

قاضی صاحب کے دربار میں آکر اس قسم کا فقرہ کہا " اگر اجازت ہو تو میں کچھ عرض کردں " لیکن قاضی صاحب نے بالکل توجہ نہ دی۔ مظلوم نے پھر اسی فقرہ کو دہرایا۔ مگر قاضی صاحب نے پھر پروانہ کی۔ میرا خیال ہے کہ قاضی صاحب کو ضرور دوسری طرف سے رشوت مل گئی ہوگی۔ اُن کی بے التفاتی کا یہ عالم دیکھ کر مجھے بڑا جوش آیا کہ مظلوم کی فریاد سن کر اس کی بات کا جواب تک نہیں دیتے۔ اس شخص نے جب تیسری دفعہ پھر اجازت طلب کی۔ تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں فوراً اپنی کرسی پر کھڑا ہوگیا۔ اور زور سے چلایا " بیشک اجازت ہے "۔ میری آواز نے تمام تماشائیوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ اور وہ چھوٹے سے بچے کو کرسی پر کھڑے ہوکر چلاتے ہوئے دیکھ کر میری حماقت پر ہنسنے۔ اور زور زور سے تالیاں بجانے لگے۔ ایک صاحب نے جو میرے پاس کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے گود میں لیلیا۔ اور شاید یہ کہا کہ " چپ چاپ تماشہ دیکھا کرتے ہیں "۔

ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو۔

میں ایک دفعہ چند دوستوں کے ساتھ لاہور گیا۔ اگرچہ میں اس سے پہلے کئی دفعہ شالامار باغ کی سیر کرچکا تھا مگر میرے ساتھی اس سے محروم تھے۔ اس لئے میں دو ٹانگے کرایہ کرکے ان کو شالامار باغ لیگیا۔

جب ہم وہاں پہنچے تو معلوم ہؤا کہ وہ دن صرف عورتوں کے لئے مخصوص تھا۔ مجھے بڑا افسوس ہؤا۔ کہ چلنے سے پہلے اس بات پر کیوں نہ غور کرلیا۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ ہفتہ میں ایک دن عورتوں کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ پتہ نہ تھا۔ کہ وہ کونسا دن ہے۔ ٹانگہ والوں نے بھی مجھے یقین دلایا۔ کہ انہیں بھی اس کا علم نہ تھا۔ کہ وہ دن عورتوں کیلئے مخصوص ہے۔ اور میں نے ان کی باتوں میں آکر اس کا یقین کرلیا۔ ٹانگہ والوں نے بڑی ہمدردی سے کہا۔ کہ وہ موجودہ کرایہ سے صرف ایک ایک روپیہ زائد لیکر ہمیں شاہدرہ کی سیر کرانے کو تیار ہیں۔ خیر ہم شاہدرہ چلے گئے۔ ہم اندر داخل ہونے لگے تو ایک ٹانگہ والے نے کہا چونکہ ہمیں اندر کچھ وقت لگ جائیگا اسلئے انہیں آدھ گھنٹہ کی چھٹی ملنی چاہیئے۔ اس پر ایک تجربہ کار نے کہا کہ ان کو یہیں رہنا چاہیئے۔ مگر میں نے اس میں ہرج نہ دیکھ کر ٹانگہ والوں کو اجازت دیدی۔ کہ جہاں چاہیں چلے جائیں اور پھر ایک گھنٹہ تک واپس آجائیں

جب ہم ایک گھنٹہ کے بعد باہر نکلے۔ تو وہاں کوئی ٹانگہ والہ موجود نہ تھا۔ اور نہ کہیں آس پاس نظر آتا تھا۔ اپریل کا مہینہ تھا۔ اور دوپہر کا وقت۔ دھوپ تیز تھی۔ اس لئے میرے دوست میری طرف قہر آلود نگاہیں ڈال رہے تھے۔ مگر میں نے کہا کہ میں خود شاہدرہ سٹیشن پر جاکر ان کی تلاش کرتا ہوں۔ اور ابھی ان کو لاتا ہوں۔ چنانچہ میں سٹیشن کی طرف روانہ ہوگیا۔ جس کا راستہ بھی مجھے معلوم نہ تھا۔ خیر دو تین مرتبہ راستہ پوچھنے کے بعد سٹیشن پر پہنچا۔ تو وہاں بھی ٹانگہ والوں کا کوئی نشان نہ پایا۔ مقبرہ پر جب میں واپس پہنچا تو اپنے احباب کو بھی نہ پایا۔ میں نے خیال کیا کہ ان کو کوئی اور سواری مل گئی ہوگی۔ اور غلطی کی سزا دینے

کے لئے وہ مجھے اکیلا چھوڑکر روانہ ہو گئے ہونگے۔ چنانچہ میں پیدل شہر کی طرف چل پڑا۔ مگر ابھی آدھ میل بھی نہ گیا ہونگا۔ کہ دھوپ کی برداشت نہ کر سکا۔ اور یہ سفر پہاڑ نظر آیا۔ پھر میں سٹیشن کی طرف لوٹا کہ کسی ریل گاڑی سے لاہور چلا جاؤں۔ جب میں سٹیشن پر پہنچا تو گاڑی بالکل تیار کھڑی تھی۔ میں جلدی سے اس زمانہ کے قاعدہ کے مطابق گارڈ کے پاس گیا اور کہا کہ ٹکٹ لینے کا وقت نہیں۔ اس لئے میں بغیر ٹکٹ سیکنڈ کلاس میں سوار ہو رہا ہوں۔ لاہور جا کر پیسے دے دونگا۔ (چونکہ فاصلہ تھوڑا تھا۔ اس لئے میں سیکنڈ کلاس میں جلدی سے سوار ہو گیا۔ ورنہ میں تو عموماً تھرڈ کلاس میں سفر کیا کرتا ہوں۔ کیونکہ فورتھ کلاس کوئی نہیں ہے)

جب لاہور پہنچا۔ تو میں نے گارڈ کو کہا کہ مجھ سے پیسے وصول کر لے (میری حماقتیں ملاحظہ فرماتے جائیے) اس نے کہا "کیا ضرورت ہے۔ ایک طرف سے باہر نکل جاؤ" مگر چور کی ڈاڑھی میں تنکا۔ اور پھر چور بھی ایسا جو بچہ ہو۔ اور جس کی ڈاڑھی اتنی گھنی ہو کہ تنکے کی تلاش میں گھنٹوں لگ جائیں۔ ابھی میں پلیٹ فارم پر ہی تھا۔ اور نکل جانے کے لئے موقع تلاش کر رہا تھا کہ ایک صاحب نے دور ہی سے مجھے بھانپ لیا۔ کہ میرے پاس ٹکٹ نہیں ہے انہوں نے ٹکٹ مانگا۔ تو میں نے اپنی رام کہانی کا آخری حصہ بیان کر دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ آپ گارڈ سے لکھوا کر لائیں۔ ورنہ ہم وزیر آباد سے کرایہ چارج کریں گے۔ ناچار ڈرتا ڈرتا میں پھر گارڈ کے پاس پہنچا۔ جو گاڑی سے اسباب اتروا رہے تھے۔ چونکہ آپ ایک صاحب نا عیسائی تھے اور ٹوپ پہنے ہوئے تھے۔ اس لئے میں ڈرتا تھا۔ کہ کہیں غصہ میں کچھ واہی تباہی نہ۔ ۔ ۔ ۔ دیں۔ جب میں نے صاحب بہادر سے کہا کہ ٹکٹ بابو آپ کی تحریر چاہتے ہیں" تو آپ فرمانے لگے "یہ بابو خواہ مخواہ تنگ کیا کرتے ہیں۔ لو یہ لو اور اس طرف سے نکل جاؤ" یہ کہکر آپ نے ایک تھرڈ کلاس کا ٹکٹ جو کاموں کے سے لاہور تک کا تھا۔ میرے حوالے کیا۔ چنانچہ میں تھرڈ کلاس والے مسافروں کے ساتھ باہر نکل آیا۔

اب میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ممکن ہے۔ ٹانگے والے کچھ دیر کے بعد شاہدرہ مقبرے پر پہنچ گئے ہوں۔ اور ہمیں وہاں نہ پاکر گالیاں دیتے ہوں کہ یہ بابو ہمارے پیسے مار کر بھاگ گئے۔ چنانچہ میں اس اڈے پر پہنچا۔ جہاں سے کہ ٹانگے صبح کے وقت کرایہ پر لئے تھے۔ اور اُن کو تلاش کرنے لگا۔ کہ ان کو کرایہ ادا کر دیا جائے مگر ان کو وہاں نہ پایا اور دوسرے ٹانگے والوں نے بھی اُن کا کچھ پتہ نہ دیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ مجھے ایسا بیوقوف نہ سمجھتے تھے۔ کہ باوجود اس قدر تکلیف اُٹھانے کے میں ان کو کرایہ دینے کے لئے ان کے پیچھے پیچھے پھروں اس لئے انہوں نے غالباً یہ خیال کیا ہو گا کہ میں اُن ٹانگہ والوں کے خلاف کوئی کارروائی کرنا چاہتا ہوں۔

خیر جب میں ہوٹل میں پہنچا تو میں اپنے دوستوں کو وہاں پاکر حیران ہو گیا۔ انہوں نے بتایا کہ جب میں ٹانگوں کی تلاش میں گیا ہوں۔ تو جلدی ہی ٹانگے وہاں پہنچ گئے تھے۔ اور وہ محض اس لئے بغیر میرا انتظار

کئے چل پڑے تھے۔ کہ ان سے کسی نے کہدیا تھا کہ میں کسی اور تانگہ پر سوار ہو کر شہر آگیا ہوں میرے خیال میں یہ اُن کی من گھڑت کہانی تھی۔ دراصل وہ مجھے سزا دینا چاہتے تھے۔ خیر جس صاحب نے کرایہ ادا کیا تھا۔ ان کو میں نے تمام رقم ادا کر دی۔ اگرچہ انہوں نے ایک دو دفعہ "نا" اور "نہ" بھی کی۔

اگر آپ اکتا نہ گئے ہوں۔ تو ایک دو اور باتیں بھی سُن لیجیئے۔ میں ایک سکول میں ٹیچر ہو گیا۔ میری ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ اپنے فرائض کو نہایت ایمانداری سے قواعد کے مطابق سرانجام دینے کی کوشش کروں۔ اور نہ کسی کے ساتھ بے انصافی روا رکھوں۔ اور نہ ہی کسی کی ناجائز رعایت کروں۔ (کہیں یہ بات خودستائی تو نہ سمجھی جائیگی؟) ایک دفعہ ایک غریب لڑکا میرا دیا ہوا کام کر کے نہ لایا۔ جب میں نے وجہ پوچھی تو اس نے گستاخانہ جواب دیا۔ میں نے "کوڈ" کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے کوئی سزا نہ دی۔ اور ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس رپورٹ کی۔ انہوں نے اس لڑکے کو خوب سزا دی۔ اور بعد میں مجھے کہا۔ کہ ایسے موقعوں پر مجھے خود جماعت میں ہی سزا دینی چاہیئے۔ جب میں نے "کوڈ" کا حوالہ دیا تو کہنے لگے آپ اس بات کی مطلق پروا نہ کریں۔ اور کام میں غفلت کرنیوالوں کو خوب سزا دیا کریں۔"

چند روز کے بعد دو تین لڑکوں کو کام نہ کرنے کی وجہ سے میں نے زدوکوب کیا۔ بدقسمتی سے وہ سکول کمیٹی کے ممبروں کے لڑکے تھے۔ پھر تو ایک شورِ محشر بپا ہو گیا۔ مجھ سے جواب طلبی ہوئی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے خوب ڈانٹا اور کہا کہ تمہیں لڑکوں کو مارنے کا کوئی حق نہیں۔ آئندہ ایسا کرو گے تو برخاست کر دیئے جاؤ گے۔" میں اس وقت رُعب میں آگیا۔ اور خاموش کھڑا رہا۔ جب لڑکوں کے سرپرست ہیڈ ماسٹر صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے بعد تشریف لے گئے۔ تو میں نے حوصلہ کر کے نہایت ادب سے ہیڈ ماسٹر صاحب کو وہ وقت یاد دلایا۔ جب انہوں نے سزا دینے کی اجازت مجھے بخشی تھی۔ وہ ہنس پڑے اور کہنے لگے "تم ابھی ناتجربہ کار ہو۔ تم میں ٹیکٹ نہیں ہے۔ سزا صرف اُن لڑکوں کو دینی چاہیئے۔ جو خاموشی سے سزا برداشت کر سکیں۔ اور تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ صرف غریب لڑکے ہی سزا کے مستحق ہوتے ہیں۔" یہ سنتے ہی میرا خون کھولنے لگا۔ مگر میں خاموش کھڑا سنتا رہا۔ آخر میں نے کہا "اگر کوئی امیر لڑکا سزا کا مستحق ہو اور اُسے سزا نہ دی جائے تو اس کا اثر اس لڑکے پر اور بھی بُرا پڑے گا۔" آپ فرمانے لگے۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ تم میں "ٹیکٹ" نہیں ہے۔ بھائی جان! ایسے موقع پر کسی نہ کسی بہانہ سے کسی غریب لڑکے کو خوب سزا دینی چاہیئے۔ تاکہ مجرم امیر لڑکے پر رُعب جم جائے۔ اور اگر وہ پھر بھی کام نہ کرے تو جائے جہنم میں۔" تھوڑے سکوت کے بعد آپ نے پھر وعظ کو جاری رکھا "تمہیں یہ بھی چاہیئے۔ کہ جماعت میں اپنی تمام توجہ سکول کمیٹی کے ممبران کے لڑکوں کی طرف رکھو۔ کیونکہ ان کی ترقی سے ہی تمہارا کام جانچا جائے گا۔ اگر ممبران کے لڑکے پڑھائی میں اچھے ہوں گے۔ تو ممبر سمجھیں گے کہ ساری جماعت اچھی ہے اور استاد بڑا قابل ہے اور

اس بات کا بھی خیال رکھو کہ امیر لڑکے تم سے خوش ہیں۔ اُن کی ہر وقت دلجوئی اور رعایت کرتے رہنا چاہئے کیونکہ کل کو یہی بڑے آدمی بنیں گے اور تمہیں ان سے کام پڑے گا۔"

ہیڈ ماسٹر صاحب نے اس کے متعلق ایک واقعہ بھی بیان فرمایا۔ کہ "ایک دار وغہ صفائی شہر کی کمیٹی کے ممبروں کے مکانات کے سامنے خوب صفائی اور چھڑکاؤ کرادیا کرتے تھے۔ اور شہر کی عام صفائی کی طرف سے بالکل غافل رہتے تھے کبھی کبھی ممبروں کو سلام بھی کر آتے تھے۔ ان سے ممبر ہمیشہ خوش رہے۔ اور ان کے برخلاف شکایات کو دشمنی پر مبنی کرکے ان کو ترقی پر ترقی دیتے رہے۔"

غرض ہیڈ ماسٹر صاحب نے کمال مہربانی سے ٹیکٹ پر ایک لمبا چوڑا لیکچر مجھے پلا دیا۔ مگر میں اپنی حماقت پر ڈٹا رہا اور اس لیکچر سے صرف اس قدر میں نے اخذ کیا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا 'ٹیکٹ' مساوی ہے بے ایمانی جمع بے انصافی کے۔ اور اس ٹیکٹ اور خودداری میں کوئی نسبت نہیں۔ میری ضد اور حماقت کا نتیجہ یہ ہؤا۔ کہ جلد ہی مجھے استعفاء دینا پڑا۔ اور اب تک بیکار ہوں۔

ارادہ تھا کہ چند اور حماقتوں کو بھی معرضِ تحریر میں لاؤں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ پہلے ہی کافی لکھ چکا ہوں۔ اس لئے اب اجازت چاہتا ہوں۔ ہاں! یہ تو فرمائیے کہ سب سے بڑی حماقت آپ کے نزدیک کونسی ہوئی؟ آپ میں غالباً اس کا جواب دینے میں اختلاف ہوگا۔ اس لئے میں اپنی رائے ظاہر کئے دیتا ہوں۔ میرے خیال میں سب سے بڑی حماقت یہ ہے کہ میں اب بھی ان حماقتوں سے تائب نہیں ہؤا۔

غزل

(عالیجناب نواب قدرت نواز جنگ بہادر "قدرت" ناظم نظم جمعیت سرکار عالی تلمیذ حضرت جلیل القدر ("جلیل" حیدر آباد دکن)

کیا ہے قتل جس دن سے کسی کو ـــ لب قاتل ترستے ہیں ہنسی کو
ازل سے مستِ جامِ بیخودی ہوں ـــ بھلا زاہد میں کیا جانوں خودی کو
کسی پر مر کے پائی عمرِ جاوید ـــ خضر دیکھیں ہماری زندگی کو
مرے زخموں کو ناحق تم نے چھیڑا ـــ نہ تھا کیا اور کوئی دل لگی کو

بتوں کا عشق ترکیا قدرت ہنسی ہے
تمہیں سونا پڑیگا زندگی کو

اخلاق و موعظت

پر

چند لطیف اشعار کا مجموعہ

جمع کردہ

شیخ محمد اسمٰعیل صاحب سکرٹری ورنیکلر پبلک لائبریری
پانی پت

ٹک دیکھ آنکھیں کھول کے اُس دم کی حسرتیں	جس دم یہ سوجھیگی کہ یہ عالم بھی خواب تھا	(میر)
دُنیا کی نہ کر تو خواستگاری	اس سے کبھو بہتر ورنہ ہوگا	(")
غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز	میر اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا	(")
معیشت ہم فقیروں کی سی اخوانِ زماں سے کر	کوئی گالی بھی دے تو کہہ بھلا بھائی بھلا ہوگا	(")
یہ عیش گہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے	ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہُو کا	(")
فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ	دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائیگا	(غالب)
دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہُوا	ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہُوا	(")
جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنئے	جو نا سزا کہے اسکو نہ نا سزا کہئے	(")
نہ سنو گر بُرا کہے کوئی	نہ کہو گر بُرا کرے کوئی	(")
روک لو گر غلط چلے کوئی	بخش دو گر خطا کرے کوئی	(")

نیکوں کو نہ ٹھیرائیو بد، اے فرزند | اک آدھ ادا ان کی اگر ہو نہ پسند | (حالی)
کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں | ہوں اسمیں اگر گلے سڑے دانے چند | (")
تیمور نے اک مورچہ زیر دیوار | دیکھا کہ چڑھا دانہ کو لیکر سو بار | (")
آخر سرِ بام لیکے پہنچا تو کہا | مشکل نہیں کوئی پیش ہمت۔ دشوار | (")
خدا رحم کرتا نہیں اس بشر پر | نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر | (")
کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر | خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر | (")
حکمت کو اک گمشدہ لال سمجھو | جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو | (")
یہی ہے عبادت، یہی دین وایماں | کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں | (")
مشقت کی ذلت جنہوں نے اٹھائی | جہاں میں ملی ان کو آخر بڑائی! | (")
کسی نے بغیر اسکے ہرگز نہ پائی | فضیلت، نہ عزت، نہ فرمانروائی | (")
ذخیرہ ہے جب چیونٹا کوئی پاتا | تو بھاگا جماعت میں ہے اپنی آتا | (")
انہیں ساتھ لے لیکے ہے یاں سے جاتا | فتوح اپنی اک ایک کو ہے دکھاتا | (")

سدا اُن کے ہیں اس طرح کام چلتے | (")
کمائی سے ایک اک کی لاکھوں ہیں پلتے | (")

جب ایک چیونٹا جس میں دانش نہ حکمت | بنی نوع کی اپنے بر لائے حاجت | (")
معیشت سے ایک اک کو بخشے فراغت | کرے ان پہ وقف اپنی ساری غنیمت | (")

تو اس سے زیادہ ہے بے غیرتی کیا | (")
کہ ہو آدمی کو نہ پاس آدمی کا | (")

تکرار تھی مزارع و مالک میں ایک روز | دونو یہ کہہ رہے تھے مرا مال ہے زمیں | (اقبال)
کہتا تھا وہ کرے جو زراعت اسی کا کھیت | کہتا تھا یہ کہ "عقل ٹھکانے تری نہیں" | (")
پوچھا زمیں سے میں نے کہ "ہے کسکا مال تو" | بولی "مجھے تو ہے فقط اس بات کا یقیں | (")
مالک ہے، یا مزارعِ شوریدہ حال ہے | جو زیرِ آسماں ہے وہ دھرتی کا مال ہے" | (")

شریر لڑکے

(جناب بھائی شبنداس صاحب پوری ایم اے، پی ای ایس اڈیٹر شعبہ پنجابی، ہندی)
(پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی۔ لاہور)

کیا والدین اور کیا استاد شریر لڑکوں کے ہاتھوں نالاں ہیں۔ مگر ہم اس بات پر غور نہیں کرتے کہ جب دنیا بھر کے لڑکے کم و بیش شریر ہیں اور ہم سب بچپن میں شرارتیں کرتے رہے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ شرارت چھوٹی عمر کا ایک قدرتی خاصہ ہے اور بچوں کا نچلا بیٹھنا ایک غیر طبعی حالت ہے۔ مگر بہت سے دیہاتی سکولوں میں تمام دن طلبا کو ایک ہی جگہ بٹھا کر مدرس صاحبان کتابی تعلیم دیتے ہیں۔ اور اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ دیکھو ہمارا ضبط ایسا اچھا ہے کہ ہمارے سامنے کسی لڑکے کی مجال نہیں ہے کہ ذرا بھی دم مارے۔ کوئی بول نہیں سکتا۔ مائیں بھی بچوں سے تنگ آ کر ان کو مدرسہ بھیج دیتی ہیں۔ کیونکہ وہ ان کو شرارت سے باز نہیں رکھ سکتیں۔ اور صرف مدرسہ میں اُستاد ہی ان کو قابو کر سکتے ہیں۔ مگر سچ پوچھو تو اس قسم کا ضبط خلاف قدرت ہے۔ اور بچوں پر جبر کرنا ہے۔ ولایت کے مدرس جو علم النفس سے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔ اور اس کے اصولوں کو عمل میں بھی لاتے ہیں۔ جان بوجھ کر لڑکوں کو گاہے ماہے شرارت کرنے کا موقعہ دیتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک سکول کے طلبار مل کر دوسرے سکول کے طلبار پر چھاپہ مارتے ہیں۔ اور مار پیٹ تک نوبت پہنچتی ہے۔ فریق ثانی مقابلہ کرتا ہے۔ جس فریق کی شرارت زیادہ کارگر ہوتی ہے۔ وہ فتحمند متصور ہوتا ہے۔ اور استادوں کی تحسین کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ میں کئی سال تک یورپین سکولوں میں اردو کی تعلیم کا انسپکٹر رہا ہوں۔ اور یورپین لڑکوں کے اوضاع و اطوار اور چال ڈھال کا مشاہدہ کرتا رہا ہوں۔ وہ ہندوستانی طلباء سے زیادہ شریر ہوا کرتے ہیں۔ مگر قواعد کے زیادہ پابند۔ زیادہ راست باز و صاف گو، زیادہ تندرست، خوش طبع اور چست ہوتے ہیں۔ اُن کے استاد کبھی ان کو بجا شرارت سے جبراً باز رکھ کر ان کی سپرٹ کو دباتے نہیں۔ اور چھوٹی چھوٹی شرارتوں کو خفیف سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایک دفعہ میں کوہ مری کے نزدیک گھوڑا گلی کے سکول میں معائنہ کے لئے گیا ہوا تھا۔ اور ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرہ کے دروازہ میں کھڑا ہیڈ ماسٹر صاحب سے باتیں کر رہا تھا۔ تفریح کی گھنٹی تھی۔ چند لڑکے سامنے کی ایک جماعت کے کمرہ کے باہر کھڑے تھے۔ اوپر کی چھت پر بورڈنگ ہوس تھا وہاں سے چند شریر لڑکوں نے اُن پر پانی پھینکا۔ وہ حیران ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ کہ یہ پانی کہاں سے آیا ہے۔ جن لڑکوں نے یہ شرارت کی تھی۔ وہ فوراً پیچھے ہٹ کر ہنس رہے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے برائے نام تنبیہہ کر کے ان کو وہاں

سے ہٹا دیا۔ اگر کسی دیسی سکول میں ہندوستانی ہیڈ ماسٹر کے روبرو اس قسم کی بات ہوتی۔ تو وہ اسے ایک اہم معاملہ سمجھ کر نہایت سنجیدگی سے اسکی تحقیقات کرتا۔ اور غالباً مجرموں کو بدنی سزا دیتا۔

میں نے کئی دفعہ مدرسوں کو یہ کہتے سنا ہے۔ کہ اجی اس سکول کے لڑکے بڑے شریر ہیں۔ عرصہ ہوا جب میں پشاور مشن کالج میں پڑھاتا تھا۔ تو ایک نئے ماسٹر صاحب پنجاب سے تشریف لیگئے۔ سرحدی علاقہ، آب و ہوا اچھی۔ لوگ قوی اور جوشیلے، لڑکوں میں غیر معمولی چلبلاہٹ دیکھ کر فرمانے لگے۔ کہ یہاں کے لڑکے بہت شریر ہیں۔ پرنسپل صاحب نے جب یہ سُنا تو فرمایا کہ "Did he expect them to be angels?" یعنی کیا اسے توقع تھی کہ وہ فرشتے ہوں گے؟ لڑکا اور شریر ہونا، یہ تو لازم و ملزوم ہیں۔ اگر لڑکا شریر نہیں۔ تو اُسکی جسمانی اور دماغی حالت تسلی بخش نہیں ہے۔ وہ ضرور نحیف البدن اور کند ذہن ہوگا۔

شرارت کی تحلیل کی جائے تو اس کے اندر ہم صحت۔ طاقت۔ جرأت۔ بشاشت۔ ذہانت کے اجزا پائیں گے۔ مجھے تو ہمیشہ شریر لڑکوں سے کامیابی کی امید رہی ہے اور میں اپنے پینتیس سالہ تجربہ کی بناء پر کہہ سکتا ہوں۔ کہ عموماً جو لڑکپن میں شرارتیں نہیں کرتا۔ وہ بڑا ہو کر کچھ نہیں کریگا۔ مدرسوں کو شرارت کے جذبے سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اور طلبار کو ورزش۔ کھیلوں۔ باغبانی۔ سکاؤٹنگ وغیرہ کے کاموں میں مشغول رکھ کر شرارت کی شکل کو بدل دینا چاہئے۔ اُن کو سست اور بے حس و حرکت رکھ کر مٹی کے مادھو نہیں بنا دینا چاہیئے۔

اب میں چند ایک شریر لڑکوں کا ذکر کرتا ہوں جس سے مذکورہ بالا بیان کی تائید ہوتی ہے۔

(۱)

میں ایک ہائی سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ ہائی سکول کا ایک لڑکا نہایت شریر سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک ماسٹر صاحب (غالباً ان کے دماغ میں خلل تھا) اصرار کرتے تھے کہ اس کو سکول سے نکال دیا جائے۔ میں نے اُسے جماعت کا مانیٹر مقرر کر دیا۔ اس نے مانیٹری کا کام ایسی خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ سالانہ جلسہ کے موقع پر بہترین مانیٹر ہونے کا انعام پایا۔ میں نے صدر جلسہ ڈپٹی کمشنر صاحب اور معزز حاضرین کے سامنے اس بات کا اظہار بھی کیا۔ کہ یہ لڑکا سب سے شریر سمجھا جاتا تھا۔ اب یہ سب سے اچھا منتظم اور اپنی جماعت کا ہر دلعزیز لیڈر ہونے کی وجہ سے انعام حاصل کر رہا ہے۔ یہ طالب علم بعد میں ولایت گیا اور ایک اعلےٰ امتحان پاس کر کے آیا۔ اور اب ہزاروں روپے کما رہا ہے۔

(۲)

جب میں پشاور کالج میں تھا۔ تو ایک شریر لڑکا جماعت کی پہلی قطار میں بیٹھا کرتا تھا۔ ایک دفعہ میں سپرٹ لیمپ جلا کر سائنس کا کوئی تجربہ کر رہا تھا۔ کہ دفعتہً میرے ریشمی کوٹ کو آگ لگ گئی۔ اس شریر لڑکے نے فوراً ہاتھ مار کر

آگ بجھا دی - باقی سب منہ دیکھتے رہے -

(۳)

۱۸۹۵ء میں بی اے کا امتحان دیکر میں ماسٹر بنا - نئے ماسٹر کا امتحان شریر لڑکے ضرور لیا کرتے ہیں چنانچہ دو چار لڑکوں نے شرارتاً مجھ پر سوالات کرنے اور شور مچانا شروع کیا - میں نے حکمت سے اپنے آپ کو سنبھالا - مگر مجھے اسی وقت یقین ہو گیا - کہ یہ لڑکے کچھ بن کر رہیں گے - چنانچہ ان میں سے ایک صاحب رائے بہادر وکیل ہیں - ایک صاحب کسی کالج کے پرنسپل ہیں -

(۴)

ہائی کلاس کا ایک طالب علم بڑا چلتا پرزہ اور طرار تھا - ایک دفعہ میں نے اُسے کسی استاد کی گستاخی کرنے پر سزا بھی دی تھی - وہ بھی خاص شریر لڑکوں میں سے تھا - اب وہ تھانیدار ہے اور امید ہے کہ کسی دن خان بہادر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس بن جائے گا -

(۵)

ایک طالب علم جو اوسط درجہ کا شریر تھا - ایک ایسے مقام میں پڑھتا تھا - جہاں ملیریا کا زور رہتا ہے - اور شریروں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے - ان حالات میں اسکی شرارت نمایاں تھی - اعلیٰ خاندان کا ہونے کی وجہ سے اپنی حیثیت کا خیال بھی اسکے دماغ میں جاگزیں تھا - ایک غریب ماسٹر کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل گئی - جس سے اس کی شان میں فرق آیا اور جس نے اُسے گستاخی کرنے پر آمادہ کر دیا - غلطی دونوں کی تھی - مگر ماسٹر صاحب کا وقار بھی قائم رکھنا ضروری تھا - میں نے دو بید مجرم کے ہاتھ پر لگا ہی دیئے - اس وقت تو بہت سٹپٹایا - مگر ذہین تو تھا ہی، اصلیت کو پا گیا اور دل میں کینہ نہ رکھا - عرصہ کے بعد ملا تو نہایت مؤدبانہ پیش آیا - اسوقت بی اے کا امتحان دینے والا تھا -

اور بھی اس قسم کی مثالیں دی جا سکتی ہیں اور تمام پرانے ٹیچر اپنے شاگردوں میں سے کامیاب شریروں کی مثالیں دے سکتے ہیں - اب میں ایک تاریخی مثال دے کر اس تحریر کو ختم کرتا ہوں -

قریباً دو سو برس ہوئے - انگلستان میں ایک لڑکا تھا - جسے شرارت کا پتلا بلکہ شرارت مجسم کہیں تو بیجا نہ ہو گا اُسکی شرارتوں کے حالات لکھنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے - باپ نے تنگ آکر اُسے ایسٹ انڈیا کمپنی میں نوکر کرا دیا - اور اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے ہندوستان بھجوا دیا - یہاں آکر اس نے وہ کارنامے کئے، کہ تاریخ کے صفحات میں اسکا نام ہمیشہ روشن رہے گا - ناظرین سمجھ گئے ہوں گے، کہ میری مراد لارڈ کلایو سے ہے - اس شریر لڑکے نے ہندوستان میں انگریزی سلطنت کی بنیاد ڈالی - اور وہ ہندوستان کا پہلا انگریز گورنر تھا -
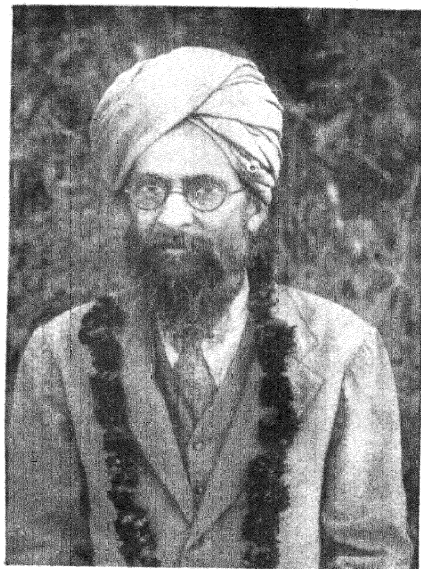
Bhai Bishan Dass Puri M. A. P. E. S.

Moulvi Mohd. Sharif "Qureshi".
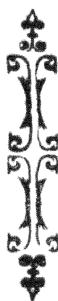
Syd. Ghazanfar Ali Naqvi B. A.

[illegible] PRESS BLOCK MAKERS & PRINTERS, ANARKALI LAHORE

Mr. F. M. Shujah M. Sc.

M. Fazal Mohayyud Din Qadri.

Syd. Mahmud B. A.

صبح و شام

(از جناب عبدالسمیع صاحب پال اثر صہبائی ایم اے ایل ایل بی پلیڈر سیالکوٹ)

آزادِ غم و حسرت ہے چہرۂ خنداں — پروا ہی نہیں اس کی کہ گیسو ہیں پریشاں
کہتے ہیں کہ ہوتے ہیں سبھی رہزنِ ایماں — یہ حسن تو ایماں کا ہے سرچشمۂ حیواں
کیا سادہ و پُر لطف جمالِ سحری ہے!

سب دشت و جبل حسن سے معمور ہوئے ہیں — ذراتِ زمیں غیرتِ صد طُور ہوئے ہیں
پردے رخِ محبوب سے کیا دور ہوئے ہیں — اشجار مئے نُور سے مخمور ہوئے ہیں
قدرت کی سراپا نشہ و مستی سے بھری ہے!

شام

ظلمت نے سب ارض و سما کو لیا گھیر — معمورۂ آفاق بنا درد کی تصویر
طاری ہے سکوں خلق پہ ہر سو شبِ دلگیر — خاموشیِ عالم میں ہے اکسیر سی تاثیر!
اس نغمۂ خاموش کی لے درد بھری ہے!

جو نیلے سے آکاش پہ روشن ہیں ستارے — کس حسن کے جلوے ہیں یہ بے سوز شرارے
مہتاب کی کرنیں ہیں کہ ہیں نور کے دھارے — اندوہ ربا روح فزا ہیں یہ نظارے
کس شاہدِ محبوب کی یہ جلوہ گری ہے!

جو نورِ سحر کا ہے سیاہیِ شبِ غم کی — جو نغمۂ مطرب کا ہو صحرا کی خموشی
مہتاب فلک پر ہو کہ ہو ابر میں بجلی — جس چیز سے پوچھو وہ بصد ناز کہے گی
اے پوچھنے والے یہ تری بے بصری ہے!

پیامِ شوق

(از جناب ضمیر حسن خاں صاحب دلؔ شاہجہانپوری)

سکون و ضبط بھی لے پیکِ یار لیتا جا ‍ ‍ ‍ ‍ پلٹ چلا ہے تو دل کا قرار لیتا جا

لکھا ہے خون کے قطروں سے رسالِ دردِ فراق ‍ ‍ ‍ ‍ ورق خلش و اضطرار لیتا جا

بجائے مہر ہوئی ثبت چشمِ پُرحسرت ‍ ‍ ‍ ‍ یہ نقش ہے ہمہ تن انتظار لیتا جا

بندھے ہیں لختِ جگر تارِ اشکِ رنگیں میں ‍ ‍ ‍ ‍ یہ دل پسند یہ خوش رنگ ہار لیتا جا

کسی کے زیرِ قدم آج ہیچ ہے دنیا ‍ ‍ ‍ ‍ شکیبِ جانِ محبت شعار لیتا جا

تمام عمر کا حاصل ہے جوشِ جذبِ نہاں ‍ ‍ ‍ ‍ متاعِ ہستیِ ناپائدار لیتا جا

تجھے ہے عذرِ اداء داستانِ عشق طویل ‍ ‍ ‍ ‍ مری زبان بھی اے غمگسار لیتا جا

وفورِ شوق جو سرمایۂ محبت ہے ‍ ‍ ‍ ‍ بصد نیاز پئے نذرِ یار لیتا جا

یہ چیز وہ ہے جو فائق ہے لاکھ چیزوں پہ ‍ ‍ ‍ ‍ خلوصِ عشق کا تو اعتبار لیتا جا

رہا رہا ہے جو تسکینِ دل کا سرمایہ ‍ ‍ ‍ ‍ مرے رفیق مرے راز دار لیتا جا

امینِ حضرتِ دلؔ آہ جو تمنا تھی

ملے نہ خاک میں اس کا غبار لیتا جا

تخیل کے کرشمے

یوں تو دنیائے تخیل کی ہر ایک چیز لبھانے والی ہوتی ہے مگر اس میں بعض مناظر ایسے بھی ہیں۔ جن میں ہم ناممکنات کو ممکنات کے رنگ میں جلوہ گر پاتے ہیں۔ عقلِ انسانی ان سیمیائی جلووں سے اس قدر متحیر و مبہوت ہو جاتی ہے کہ اسے اپنے مسلمہ دعاوی کے باطل ہو جانے کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اور وہ عالم وارفتگی میں ان شعبدوں کو جو حقائق کی صورت میں اس کے مذہب پر غالب آجاتے ہیں۔ خراجِ تحسین ادا کرتی ہے۔ شاعرانہ تخیل کے یہ کرشمے بالکل خلافِ قیاس باتوں کو قرینِ قیاس ثابت کر دیتے ہیں۔ اس انداز سے۔ کہ اس کی اعجاز نما ہنرمندی کی بے اختیار داد دینی پڑتی ہے۔ مثلاً خزاں کے موسم میں پھول نہیں کھلا کرتے۔ جو کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ بھی مرجھا کر رہ جاتے ہیں۔ مگر تخیل کی یہ بہار ملاحظہ فرمائیں۔ کہ کس طرح خزاں کے موسم میں پھول کھلا رہی ہے ؎ میکش

باغِ عالم میں شگفتہ رُو ہیں ہم پیری میں بھی　　　کون کہتا ہے خزاں میں پھول کھلتے ہی نہیں

سائنس کا یہ مسئلہ کہ خلا محال ہے۔ تمام حکمائے مشرق و مغرب نے تسلیم کیا ہے۔ مگر اس شعر کو دیکھئے۔ کس حکمت سے خلا کی ہستی ثابت کی ہے ؎

ہے یہی ترکیب ہوا ہم کو اگر اے فلسفی!　　　ثابت اپنے عالمِ دل میں خلا ہو جائے گا

زندگی اور موت میں جو فرق ہے۔ وہ سب کو معلوم ہے۔ موت میں زندگی کہاں! مگر اس شعر میں زندگی کو موت اور موت کو زندگی بخش ثابت کیا ہے۔ حضرت مومن کی اس مسیحائی کو ملاحظہ فرمائیں ؎

زندگی ہجر بھی اک موت تھی،　　　مرگ نے کیا کارِ مسیحا کیا!

بجلی بادل سے الگ نہیں ہوتی۔ مگر حضرت ناسخ کے زورِ تخیل نے اسے بھی الگ کر دکھایا ؎

دیکھ لو فرقت، نہ دیکھی ہو جو برق و ابر کی　　　خندہ زن جاتا ہے ظالم مجھ کو گریاں چھوڑ کر

دوست کے دیدار سے سکونِ قلبی حاصل ہوتا ہے۔ اور انتظار کی زحمت موت سے بدتر ہے۔ مگر حضرت جگر مرادآبادی کے اس شعر میں دنیا ہی دوسری ہے ؎

صورت دکھا کے پھر مجھے بے چین کر دیا　　　کچھ لطف آ چلا تھا غمِ انتظار میں

غالب مرحوم کا یہ شعر بھی اسی قبیل سے ہے ؎

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں　　　گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

دریا میں کشتی سب نے دیکھی ہوگی۔ مگر کشتی میں دریا آج تک نہ دیکھا ہوگا۔ اس کی سیر بھی کیجئے ؎ بیکش

آنکھ کے حلقے میں آکر رک گئی ہے سیل اشک　　　کشتی تھی دریا میں اب کشتی میں دریا ہو گیا

لطف یہ ہے کہ اس شعر میں دو نو حالتیں سامنے آگئی ہیں۔ یعنی دریا میں کشتی بھی اور کشتی میں دریا بھی۔ اسی طرح ترقی اور تنزل دونو کو ایک جگہ دیکھنا چاہو تو اس شعر کو پڑھو ؎ وجاہت

عمر بھی کیا چیز ہے، جتنی بڑھی اتنی گھٹی　　　اس ترقی میں نظر آیا تنزل کا جواب

پروانہ شمع پر فدا ہو جاتا ہے۔ اتنی بات تو سب جانتے ہیں۔ مگر اس کی جان بازی کا ایک جوہر یہ بھی ہے۔ کہ وہ جل جانے کے بعد خود شمع بن جاتا ہے۔ وہ کس طرح؟ دیکھئے ؎ جوش

دور کر دیتا ہے راہِ شوق کی تاریکیاں　　　شمع بن جاتا ہے ہر پروانہ جل جانے کے بعد

پانی میں آگ کس طرح روشن ہو جاتی ہے۔ یہ جادو کا تماشا بھی دیکھئے! ؎ ذوقؔ

مے ملا کر ساقیانِ سامری فن آب میں　　　کرتے ہیں جادو سے اپنے آگ روشن آب میں

نیک لوگوں کی صحبت سے بڑے بڑے گنہ گار پاک دامن ہو جاتے ہیں۔ مگر حضرت ذوقؔ نے اسے بھی غلط ثابت کر دیا ؎

صحبت صافی دلاں سے تیرہ دل کب صاف ہوں　　　زنگ سے آلودہ ہو جاتا ہے آہن آب میں

اللہ اللہ۔ اس تردید میں کتنا زور ہے۔ لوہا پہلے ہی تیرہ دل تھا۔ مگر صاف دل کی صحبت میں آکر اور بھی آلودہ ہو گیا

یہاں تک تو ہم نے وہ منظر دکھایا ہے۔ جس میں تخیل کی سحر کاریاں ناممکنات کو ممکنات کے رنگ میں نمایاں کرتی ہیں۔ اب ایک دوسرے منظر کی سیر کیجئے، جس کے بالکل مختلف اور متناقض و متضاد رنگ دماغ کی قوتِ فیصلہ کو دھوکے دیتے ہیں۔ کہ کس کو اصل کہے اور کس کو نقل۔ اگرچہ اپنے اپنے حسن میں سب لاثانی ہیں۔ مگر پھر بھی ایک کی چمک دمک دوسرے کی چمک دمک کو بالکل نابود کئے دیتی ہے۔ حضرتِ ذوقؔ بیوطن ہو جانے کو عزت و توقیر کا موجب سمجھتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں ؎

ہوتی غربت میں اگر قدر نہ خوش جوہر کی　　　تو کبھی کان سے باہر نہ نکلتا گوہر

پھر دوسری جگہ اس دعوے کے برخلاف یہ فتوے صادر کرتے ہیں ؎

ذوقؔ ہے ترکِ وطن میں صاف نقص آبرو　　　بکتا پھرتا ہے گہر ہو کر سمندر سے جدا

حضرت امیرؔ مینائی کے یہ دو شعر بھی اسی قبیل سے ہیں۔ اور لطف یہ کہ دونوں ایک ہی غزل میں ہیں ؎

پوچھا نہ جائے گا جو وطن سے نکل گیا　　　بیکار ہے جو دانت دہن سے نکل گیا

خنجر کھنچا جو میان سے چمکا میانِ صف　　　جوہر کھلے جو مرد وطن سے نکل گیا

عُرفی شیرازی نے اس لحاظ سے کہ دریا کے اوپر کی سطح سے راحت حاصل ہوتی ہے اور دریا کی تہ میں پہنچنے سے وہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ جو آگ میں جل جانے سے ہوتا ہے۔ یوں کہا تھا ع

روئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش است

مرزا غالب نے یہ مفہوم کس خوبی سے الٹا ہے ؎

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست ‏ ‏ ‏ ‏ قعرِ دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

یعنی بلا کا خوف خود بلا سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ چنانچہ دریا میں انسان جبھی تک بے چین رہتا ہے۔ جب تک کہ اُسے ڈوب جانے کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے۔ جب ڈوب گیا۔ پھر کچھ بھی بے چینی باقی نہیں رہتی۔ پس یوں کہنا چاہیئے کہ ع

قعرِ دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

حضرتِ ذوق نے یہ مضمون کہ ملکِ عدم میں اس دنیا سے زیادہ آرام ملتا ہے۔ اس طرح ثابت کیا تھا ؎

ہستی سے زیادہ ہے کچھ آرام عدم میں ‏ ‏ ‏ ‏ جو جاتا ہے یاں سے وہ دوبارا نہیں آتا

حضرت تسلیم لکھنوی نے اس مضمون کو اس طرح رد کیا ہے ؎

کیونکر میں کہوں ملکِ عدم عیش کی جا ہے ‏ ‏ ‏ ‏ جب روز یہاں چاک گریباں سحر آئے

دھوّاں ہمیشہ آگ کے اوپر ہوتا ہے۔ مگر اس شعر نے یہ کلیہ بھی غلط ثابت کر دیا ؎

مِسی مالیدہ لب پر رنگِ پاں ہے ‏ ‏ ‏ ‏ تماشا ہے تہ آتش دھوّاں ہے

اب اس کی تردید بھی ملاحظہ فرمائیں ؎ امیر مینائی

لازم ہے اس کے رُخ پہ نمودِ خطِ سیاہ ‏ ‏ ‏ ‏ ممکن نہیں ہے آگ کے نیچے دھوّاں رہے

زمانہ حال کے ایک زندہ شاعر نے یہ مضمون کہ طرزِ سبک روی میں ڈوبنے کا خوف باقی نہیں رہتا۔ اِس طرح باندھا تھا ؎

طرزِ سبک روی نے کیا بحر آشنا ‏ ‏ ‏ ‏ دیکھی نہ ڈوبتے کبھی کشتی حباب کی

ایک اور مدِمقابل نے اس مضمون کو کس خوبی سے مسترد کیا ہے ؎

نامعتبر ہے بحر میں طرزِ سبک روی ‏ ‏ ‏ ‏ ڈوبی نہیں تو ٹوٹیگی کشتی حباب کی

اسی زمین میں یہ دو شعر بھی جن میں تحریف کا پہلو موجود ہے۔ یاد رکھنے کے قابل ہیں ؎

اٹھ اٹھ کے کہہ رہی ہیں یہ موجیں شراب کی ‏ ‏ ‏ ‏ چل محتسب کہ کھل گئیں راہیں ثواب کی

پیشِ نظر جب آتی ہے صورت شراب کی پھر کس کو یاد رہتی ہیں باتیں ثواب کی ۔

حضرت بیخود دہلوی نے ایک مشہور غزل میں یہ شعر کہا تھا ؎

گزر جاتے ہیں دو دو دن ہمیں آب و دانے کے قفس میں کون کھائے بھیکر صیاد کے ٹکڑے

اس مضمون کی تردید کسی نے اس طرح کی ہے ۔ اور حق یہ ہے کہ دادِ سخن دی ہے ؎

رہا ہو کر بنائینگے نشیمن گرد و پیش اپنا نہ بھولینگے اسیرانِ قفس صیاد کے ٹکڑے

مرزا غالب کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

وائے گر تیرا مرا انصاف محشر میں نہ ہو، آج تک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائیگا

مرزا کی تقریر عقائد کی حد سے باہر نہیں گئی ۔ انہیں ابھی تک توقع ہے کہ محشر میں انصاف ضرور ہوگا ۔ البتہ یہ بدگمانی ضرور ستا رہی ہے ۔ کہ اگر وہاں بھی انصاف نہ ہوا ۔ تو یہ بڑے افسوس کی بات ہوگی ۔ حضرت آغا شاعر دہلوی نے اس شعر کا جواب لکھا ہے اور خوب لکھا ہے ؎

حشر میں انصاف ہوگا بس یہی سنتے رہو کچھ یہاں ہوتا رہا ہے ۔ کچھ وہاں ہو جائیگا

چلئے حضرت ! یہ طلسمی تماشا چھوڑنے کو جی تو نہیں چاہتا ۔ مگر ابھی بہت سے قابلِ دید نظارے باقی ہیں ۔ سب سے پہلے وہ دو سامنے کے منظر دیکھیں گے ۔ جن میں ایک نزاکت کا مرقع ہے ۔ جو گردِ نگاہ سے میلا ہو جاتا ہے ۔ دوسرا ناتوانی کی تصویر ہے ۔ جو بارِ نگاہ کی متحمل نہیں ۔ آؤ ! یہاں الگ بیٹھ کر اس بات پر غور کریں کہ دونوں میں سے پہلے کس کو دیکھیں اور کیونکر دیکھیں ۔

(جوش ملسیانی)

قیمتی باتیں

کسی نے حکیم بقراط سے پوچھا ۔ کہ ہم دولت سے کیا کیا خرید سکتے ہیں ۔ اور کیا کچھ نہیں خرید سکتے ؟

حکیم نے جواب دیا کہ :-

(۱) ہم ہمنشیں خرید سکتے ہیں ۔ نہ کہ دوست ۔

(۲) ہم عینک خرید سکتے ہیں ۔ نہ کہ نظر

(۳) ہم نرم بچھونے خرید سکتے ہیں نہ کہ نیند

(۴) ہم خوراک خرید سکتے ہیں نہ کہ بھوک ۔

(۵) ہم مقوی غذا خرید سکتے ہیں ۔ نہ کہ طاقت

(۶) ہم کتابیں خرید سکتے ہیں ۔ نہ کہ علم

صرف نحو اردو

(جناب خواجہ محمد عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی)

ضمیر معہود کی دو قسمیں، معہود خارجی۔ معہود ذہنی۔ معہود خارجی تو وہ ضمیر ہے۔ جو متکلم اور مخاطب کی تقریر میں کسی معلوم چیز یا کسی معیّن آدمی کی ضمیر واقع ہو۔ جس کو مخاطب اور متکلم دونوں بخوبی جانتے ہوں۔ جیسے وہ قلمی آم جو کل ہم نے اور تم نے کھائے تھے۔ معہود ذہنی وہ ضمیر ہے۔ جو ذہن متکلم میں ہو۔ مخاطب اسے جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔ جیسے ظفر ؏ وہ جو ہم سے تم سے قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔ یعنی وہ قول و اقرار متکلم کے ذہن میں ضرور ہے اور وہ مخاطب کو یاد دلانا چاہتا ہے۔

مصدر وہ اسم ہے۔ جس سے اور صیغے نکل سکیں۔ لیکن وہ خود کسی سے نہ بنا ہو۔

اردو میں مصدر کی چار قسمیں ہیں۔ اصلی۔ جعلی۔ فرعی۔ ترکیبی۔ اصلی مصدر کو مصدر وضعی بھی کہتے ہیں۔ اصلی مصدر وہ ہیں۔ جنکی علامتِ مصدر جدا کرنے کے بعد صیغہ امر واحد حاضر باقی رہ جائے۔ جیسے توڑنا۔ بگاڑنا۔ بتانا۔ لوٹنا آنا۔ جانا۔ ہونا۔ کرنا۔ داغ ؎

یہ نہ تھی ہماری قسمت، کہ وصالِ یار ہوتا ‏ اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ہوتا ماضی تمنائی ہے۔ اس کا مصدر ہونا ہے ناسخ ؎

آواز یہ آتی ہے لبِ آبِ بقا سے ‏ مرنا ہی یہاں خوب ہے جینا نہیں اچھا

مرنا اور جینا دونوں مصدر ہیں۔

جعلی یا غیر وضعی وہ مصادر ہیں۔ جن پر کسی دوسری زبان کے مصدر یا اسم پر مصدر کی علامت اضافہ کر کے مصدر بنا لیا جائے۔ جیسے فرمانا۔ قبولنا۔ شرمانا۔ غالب

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا ‏ زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

فرما' فارسی کا امر تھا۔ اس پر علامتِ مصدر "نا" اضافہ کر کے مصدر بنا لیا۔ آباد ؎

دل جلاتا ہے نہایت سوز ہجر اس ماہ کا ‏ اخگرِ دوزخ کو شرماتا ہے شعلہ آہ کا

یہ مصدر شرم سے بنا لیا گیا ہے۔

فرعی وہ مصادر ہیں۔ جو غیر زبان کے کسی مصدر یا اسم پر مصدر اصلی بڑھا کر مصدر بنالیں۔ جیسے قبول کرنا

آبرو دینا۔ سر اٹھانا۔ عرض کرنا۔ خواجہ وزیر سے

آبرو دے اے مرے قد خمیدہ تو مجھے! یار آنکھوں پر بٹھائے صورت ابرو مجھے

ناسخ سے

دشمنِ سر ہے تری گردن کشی مانند شمع افسرِ زر شوق سے رکھ پر نہ اتنا سر اٹھا

قلق سے

خود یہ کہتے ہوئے تو ڈرتے ہیں کہہ دے آداب عرض کرتے ہیں

آدمی بنانا۔ سحر سے

یار کہتا ہے کہ منظورِ خدا وصل نہیں آدمی تم کو بنایا ہے پری زاد نہیں

آرام کرنا۔ رند سے

نہایت نیند میں ہیں قصد ہے آرام کرنے کا بڑھاتے ہیں چھپڑوں کو بجلیاں بالے اترتے ہیں

ترکیبی مصدر وہ ہیں۔ جو اردو کے ماضی یا امر پر یا کسی مشتق پر ایک مصدر لگا کر بنائے جاتے ہیں۔ جیسے آبیٹھنا آپڑنا۔ اُٹھ جانا۔ رند سے

جذبۂ دل نے کیا تمہیں کھینچا بے بلائے جو پاس آ بیٹھے

مسرور سے

عارض نے ترے چمک چمک کر آئینے کی آب و تاب کھو دی

اُٹھ جانا رشک سے

خونِ دل پینے میں غم کھانے میں کل پڑنے لگی اٹھ گیا دنیا سے شاید میرا آب و دانہ آج!

مصدر کی پہچان یہ ہے کہ اس سے اور صیغے بن سکیں۔ اور آخر میں علامت "نا" ہو۔ کانا اور نانا اس لئے مصدر نہیں کہ ان سے دوسرے صیغے نہیں بن سکتے۔ مصدر کی علامت کا بدلنا فصحائے لکھنؤ خلافِ فصاحت سمجھتے ہیں۔ جیسے روٹی کھانا تھی اسکو روٹی کھانی تھی نہیں کہینگے۔ اسلئے کہ روٹی کا تانیث ہونا تھی سے ثابت ہوگیا۔ اب اسکی اتباع میں مصدر کا بدلنا غیر ضروری ہے۔ مصدر کے علاوہ اور سب صیغے تذکیر و تانیث کی حالت میں بدل جاتے ہیں۔ دوسرا سبب یہ بھی ہے۔ کہ اردو میں مصدر مذکر ہے۔ جیسے داغ سے

کیونکہ اسکی نگہِ ناز سے جینا ہوگا زہر دے اسپہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا۔

او مذکر لفظ کی علامت آخر یعنی حرف الف کبھی یائے معروف سے نہیں بدلتی۔ اس لحاظ سے بھی کھانی۔ جانی آنی وغیرہ خلاف قاعدہ صرف ہیں۔ مصدر علامت: بدلنے کی مثالیں صبا سے

اب تو میرے حال پر لطف و کرم فرمائیے! ہو چکی ہو نا تھی جو جور و جفا دو چار دن
نسیم لکھنوی سے

بھیجا نہ اسے تو جان لینا ! آسان ہے یہاں بھی جان دینا
جرأت سے

ہر بات کا بہتر ہے چھپانا ہی ، کہ یہ بھی ہے عیب کرے کوئی جو ظاہر ہنر اپنا
خواجہ وزیر سے

کب گوارا تھا پہننا ململی پوشاک کا ہو کے ڈھیلا ضعف سے اُترا یہ جامہ خاک کا
لیکن فصحائے دہلی کے ہاں مصدر کی علامت کا تانیث کی معیت میں بدلنا جائز ہے ۔

بہرحال قاعدہ صرف تو یہی ہے ۔کہ کوئی مذکر لفظ اسم تانیث کی معیت میں امالہ ہائے معروف قبول نہیں کرتا ۔ لیکن مصدر کبھی امر اور کبھی مستقبل کے معنوں میں جب مستعمل ہوتا ہے تو وہ حکم صیغے کا رکھتا ہے ۔ اور کبھی اسم فاعل کے معنوں پر بھی مستعمل ہوتا ہے ۔ ایسی حالت میں اس کا بدلنا جائز ہے ۔ انیس سے

ہر طرح سے یہ سرائے فانی دیکھی ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
آنی جانی یعنی آنے جانے والی ۔ ناسخ سے

خواب میں وہ آنے کا اب کیوں کرے وعدہ یعنی کب جدائی میں مجکو نیند آنی ہے
نیند آنی ہے ۔یعنی نیند آنے والی ہے ۔ خواجہ وزیر سے

سلائے قصہ خواں فرقت کی شب سو یہ کہانی ہے ترے زانو ہی کے تکیہ پہ ہم کو نیند آنی ہے
یہاں معنی مستقبل ہیں ۔ مصدر کبھی مستقبل کے معنوں پر آتا ہے ۔جیسے کل تم ہمارے یہاں آنا ۔یعنی آئیے گا ۔ ہمارا دوست آئے ۔ تو بٹھانا ۔یعنی بٹھائیے گا ۔

تقسیم ثانی سے مصدر کی دو قسمیں ہیں ۔ لازم اور متعدی ۔ لازم تو وہ ہے ۔جس کا فعل فاعل پر تمام ہو جائے ۔جیسے آنا فعل ہے ۔ آنیوالا اس کا فاعل ہے ۔ اردو میں پہلے فاعل آتا ہے ۔ پھر فعل ۔ متعدی میں فاعل کا فعل مفعول پر تمام ہوتا ہے ۔ پہلے فاعل ۔ پھر مفعول ۔ پھر فعل ۔ فعل لازم کی مثال داغ سے

چمپا کھلی گلاب کھلا ، موتیا کھلی
لیکن نظم کی مجبوریوں سے اس پر پورا پورا عمل در آمد شاعر نہیں کر سکتے ۔ جیسے داغ سے

سنتے ہیں داغ کل وہ آئے تھے
حالانکہ اس مصرعہ کو قاعدہ صرف سے اس طرح ہونا چاہئے تھا ع

داغ سنتے ہیں کل وہ آئے تھے۔

مثال متعدی کی امیر ؎

مجھ گدا کو دے نہ تکلیفِ حکومت اے ہوس چار دن کی زندگی میں بادشاہی کیا کروں۔

ہوس فاعل ہے۔ مجھ گدا مفعول۔ دے فعل۔ نظم کی دقت نے اس مصرعہ کو بھی صرف سے علیحدہ کر دیا امیر

قدم حضور کے آئے مرے نصیب کھلے

اسمیں مفعول مقدم ہوگیا ہے۔ قاعدے کی رو سے اس طرح ہونا چاہئیے تھا رو

حضور کے قدم آئے مرے نصیب کھلے

مفعول کو بغیر تخصیص کے فعل وفاعل پر مقدم کرنا خلاف صرف ہے اور فعل کو فاعل یا مفعول پر تقدیم دینا۔۔۔۔ خلافِ فصاحت واصولِ صرف ہے۔ اس عیب کا نام شعرا نے تعقید لفظی رکھا ہے۔ تعقید اگر قریب ہے تو وہ عیب میں داخل نہیں ہے۔ اور اگر بعید ہے تو وہ داخلِ عیب ہے۔ تعقید لفظی ومعنوی کا مفصل بیان یہاں ہم کسی دوسرے نمبر میں لکھیں گے۔

متعدی کی دو قسمیں ہیں۔ معروف ومجہول۔ معروف وہ ہے۔ جس کا فاعل معلوم ہو۔ غالب ؎

آج واں تیغ وکفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں

واں ضمیر فاعل۔ تیغ وکفن مفعول۔ باندھنا فعل۔ اسکو متعدی معروف کہتے ہیں۔

متعدی مجہول وہ ہے جس کا مفعول اور فعل معلوم ہو۔ فاعل معلوم نہ ہو۔ غالب ؎

گھر جب بنالیا ترے در پر کہے بغیر

گھر مفعول بنالیا فعل فاعل نہ معلوم۔ یہ متعدی مجہول ہے۔ اردو میں بعض مصادر غیر فصیح مستعمل کئے جاتے ہیں۔ جیسے پنہانا غیر فصیح سمجھا جاتا ہے۔ پہنانا فصیح ہے۔ دھرنا غیر فصیح ہے۔ رکھنا فصیح ہے۔

بعض مصدر لازم ایسے ہیں۔ جو متعدی نہیں بن سکتے۔ آنا۔ جانا۔ کھانا۔ پانا۔ فرمانا۔ ہونا۔ کانپنا تمام متعدی الاصل لازم نہیں بن سکتے۔ لانا۔ ڈالنا۔ مول لینا۔ چرانا۔ سونپنا۔ کرنا۔ لیکن اکثر لازم متعدی بن سکتے ہیں۔ اور اُن کا قاعدہ یہ ہے۔ کہ مصدر لازم میں علامت مصادر سے پہلے ایک الف زیادہ کر دیتے ہیں جیسے دیکھنا، دکھانا۔ سننا، سنانا۔ اٹھنا۔ اٹھانا۔ لیکن اس قاعدہ سے بعض مستثنےٰ ہیں۔ جیسے بکنا مصدر لازم ہے۔ اس کا متعدی مصدر بیچنا۔ ٹوٹنا مصدر لازم ہے۔ اس کا متعدی توڑنا ہے۔

پھٹنا مصدر لازم ہے۔ اس کا متعدی پھاڑنا۔

بھیگنا مصدر لازم ہے۔ اس کا متعدی بھگونا۔

گھسنا مصدر لازم ہے اس کا متعدی گھسیٹنا۔
گھسنا مصدر لازم ہے۔ اس کا متعدی گھسوانا۔

متعدی بدو مفعول بنانے کا قاعدہ یہ ہے کہ جو مصدر لازم ہے۔ متعدی بنایا گیا ہو۔ اس پر علامت متعدی اور علامت مصدر سے پہلے ایک واؤ لگا دو۔ اٹھوانا۔ سنوانا۔ چلوانا۔ اور جو مصدر متعدی الاصل ہیں۔ ان کو جب متعدی بدو مفعول بنانا ہو۔ تو ان پر واؤ الف لگا دو۔ جیسے ڈالنا مصدر متعدی الاصل ہے اس کا متعدی بدو مفعول ڈلوانا۔ چرانا متعدی الاصل ہے اس کا متعدی المتعدی چروانا ہے۔ کھانا متعدی الاصل ہے اس کا متعدی المتعدی کھلوانا ہے۔

بعض مصدر لازم ایسے ہیں جنکے متعدی بنانے میں الف تعدیہ نہیں لگایا جاتا۔ ان کو جب متعدی بدو مفعول بنائینگے۔ اس وقت تو اس میں بھی واؤ، الف زیادہ کریں گے۔ جیسے توڑنا سے تڑوانا۔ لوٹنا سے لٹوانا۔ کھینچنا سے کھچوانا۔

بعض مصادر متعدی جن میں الف تعدیہ نہیں ہے۔ غلطی سے لوگوں نے صرف الف تعدیہ لگا کر متعدی بدو مفعول بنا لیا ہے۔ جیسے سجنا سے سجانا۔ گوندھنا سے گوندھانا۔ سینا سے سلانا۔ کاٹنا سے کٹانا۔ لکھنا سے لکھانا، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب خلاف قاعدہ صرف اور غلط اور غیر فصیح ہیں اور قابلِ ترک ہیں۔

مصدر کی مثالیں۔ پھرنا مصدر لازم ہے اسکی متعدی پھیرنا۔ خواجہ وزیر ؎

یہ سر جھکانا یہ منہ پھیرنا ہے مانع دید　　مری نماز میں سجدہ نہیں سلام نہیں

روشن ہونا مصدر لازم ہے۔ اسکی متعدی روشن کرنا ہے خواجہ وزیر ؎

نہ داغ دو شبِ فرقت کا دن کو نام نہ لو　　ابھی چراغ نہ روشن کرو کہ شام نہیں

دیکھنا کی متعدی دکھانا اسکی متعدی۔ قدما دکھلانا نظم کرتے تھے۔ مگر اب متروک ہے۔ خواجہ وزیر ؎

مصحفِ رُخ کو وہ دکھلائیں اگر تیسویں دن　　نئی سپتی مجھے سوجھے کہوں سیپارے ہیں

اترنا لازم مصدر ہے۔ اسکی متعدی اتارنا صبا ؎

پھولوں کی سیج گردتھی صبح شبِ وصال　　باسی جو اس نے ہار اتارے پلنگ پر

چھٹنا مصدر لازم ہے۔ اسکی متعدی چھوڑنا مومن (ع)

انس و اخلاص دلاسا و کرم چھوڑ دیا۔

بندھنا مصدر لازم ہے۔ اس کی متعدی اگر قاعدہ سے بنائی جائے۔ تو بندھانا ہوتی ہے۔ لیکن باندھنا مستعمل ہے اور یہی فصیح و صحیح ہے خواجہ وزیر ؎

اپنے دروازے کی زنجیر سے باندھے مرے ہاتھ　　　اب تو در کار نہ کوئی اسے درباں ہوگا

دبنا مصدر لازم ہے اسکی متعدی دابنا بھی مستعمل ہے۔ مگر غیر فصیح اور غلط ہے۔ دبانا صحیح ہے ظفرؔ سے

دابو سر کس کا تم اور ہاتھ دباؤ کس کا　　　سب دبیل آپ کے ہیں اب ہے دباؤ کس کا

بعض مصادر لازم اور متعدی دونوں طرح مستعمل ہیں۔ جیسے رو دینا کہ مصدر لازم ہے۔ صفدر کو اتنا ستایا کہ کھسیانا ہوکر رو دیا اور متعدی بھی۔ جیسے مومنؔ سے

بات کہنے میں رو دیا میں نے　　　جو جواب آیا سو دیا میں نے

شرمانا بھی لازم اور متعدی دونوں طرح مستعمل ہے مگر معنوں میں اختلاف ہے۔ شرمانا، جھینپنا مصدر لازم ہے شرمانا، جھینپانا کے معنوں پر مصدر متعدی ہے۔ اور دونوں طرح مستعمل ہے ٭
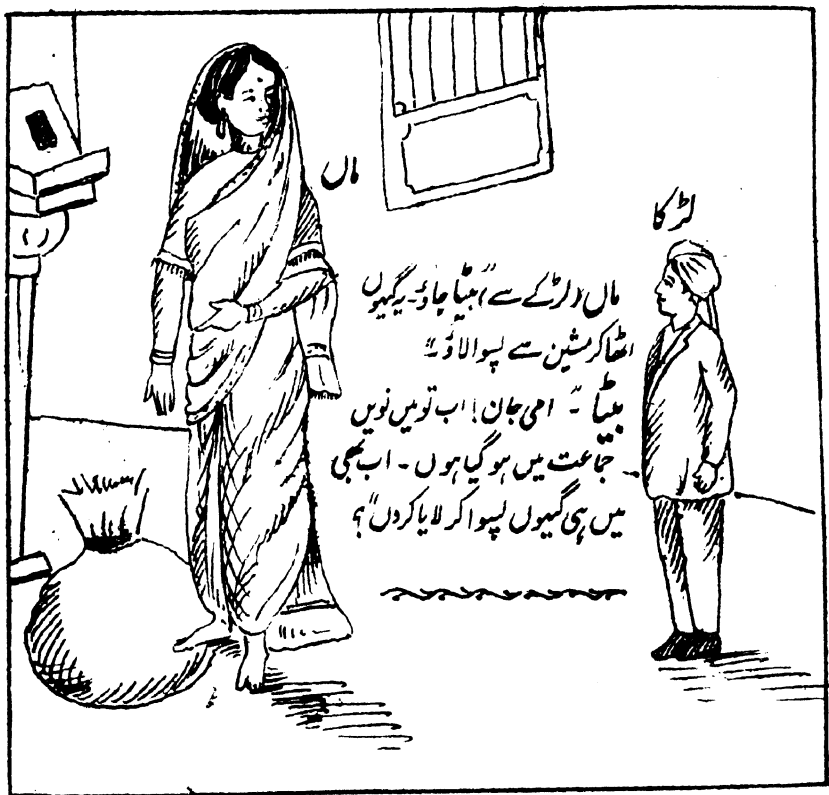
تعلیم اور ہنر

(از ضیاء الملک حضرت ملا رموزی صاحب)

آج سے کوئی سو دو سو برس پہلے کی بات ہے۔ کہ ہمارے آپ کے بزرگ دنیا کے ہر حصہ میں حکومت کرتے تھے، اور جن مقامات پر حکومت نہیں کرتے تھے۔ وہاں اُن کا نام عزت سے لیا جاتا تھا۔ اور کبھی کوئی ہندوستانی آدمی دنیا کے کسی اور ملک میں جاتا تھا۔ تو لوگ اُسے جُھک جُھک کر سلام کرتے تھے۔ اور تو اور دوسرے ملک کے بادشاہ ہمارے ملک کے بادشاہوں کو ریشم اور اطلس کے کپڑے۔ زیور۔ کھانے کے قیمتی برتن۔ گھوڑے اونٹ اور بس خچر تو نہیں باقی تمام چیزیں تحفہ بنا کر بھیجا کرتے تھے۔ اور خچر جو نہیں بھیجتے تھے سو اس لئے نہیں کہ ہم لوگ گدھے اور خچر کے قابل نہیں تھے۔ بلکہ اس لئے کہ خچر پر سوار ہو کر آدمی دو کوڑی کا ہو جاتا ہے۔ اور اس پر شہر بھر ہنستا ہے۔ غرض ہم ہندوستانیوں کی عزت چین میں تھی اور جاپان میں بھی۔ بس یہ ذرا افغانستان کے لوگ ہمیں خچر سمجھا کرتے تھے۔ تو ان کے سمجھنے سے ہوتا کیا تھا۔ دنیا بھر میں تو ہم عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اور بڑے بڑے بادشاہ ہندوستان دیکھنے کی خواہش کرتے تھے۔ تو یہ اس لئے نہیں کہ ہندوستانی لوگ کوئی تھیٹر کا تماشہ تھے یا بائسکوپ اور سرکس کی کمپنی تھے۔ یا گاما پہلوان تھے۔ بلکہ بات فقط یہ تھی۔ کہ اس زمانے میں ہم لوگ اپنا پورا وقت علم اور ہنر حاصل کرنے میں صرف کرتے تھے۔ اور چار چار دن تک حقہ نہیں پیتے تھے۔ اب اگر ہماری بات پر یقین نہ ہو تو تاریخ کی جس کتاب میں چاہو۔ دیکھ لو۔ یہی باتیں لکھی ہوئی ملیں گی۔ کہ واقعی ہم لوگ دنیا میں بڑی عزت والے سمجھے جاتے تھے۔

مگر اب جو دیکھئے۔ تو جناب ہمارے جو بھائی دیہات میں رہتے ہیں۔ اُنہیں گنوار خبطی۔ الو۔ گدھا اور گھوڑا تک کہا جاتا ہے۔ حالانکہ ہمارا ایک کسان بھی کبھی ہنہناتا نہیں۔ تو یہ کیوں۔ فقط اس وجہ سے کہ آج کل کے کسان بھائیوں نے اپنے بچوں کو بجائے علم اور ہنر سکھانے کے دھونی لگانا۔ حقہ اور شراب پینا اور ہل کھیر چلانا تو سکھا دیا۔ مگر یہ نہ ہوا کہ ایک خاندان کے تین آدمی تو ہل کھیر چلاتے اور اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اسکول میں داخل کر کے انہیں خوب علم پڑھاتے ہنر سکھاتے۔ تو چند دن کے بعد یہ بچے بڑے ہو کر کوتوال صاحب بھی ہو جاتے۔ اور کلکٹر صاحب بھی۔ پھر ہم اور آپ اور یہ اور وہ اور فلاں اور فلاں ہوتے۔ اور ان کو جا کر بہت زیادہ جھک کر سلام کرتے۔ اے صاحب! ایک وقت تو ایسے تعلیم یافتہ اور ہنرور ایسے بچوں کو بڑے لاٹ صاحب تک سلام کر گزرتے ہیں۔ پھر ہماری آپ کی حیثیت ہی کیا ہے؟ مگر وہ تو کہئے کہ یہ جو آج کل کسانوں اور زمینداروں کے بچے علم اور ہنر سے کورے دھرے ہوئے ہیں سو اس کا سبب یہ ہے

کہ اوّل تو سو میں سے ایک کسان اور دو سو میں سے دو زمیندار کچھ لکھے پڑھے ہوتے ہیں۔ تو جب یہ خود علم اور ہنر کے فائدوں سے بے خبر ہوتے ہیں تو یہ کیا جانیں کہ علم اور ہنر سے آدمی آج کل عزت پاتا ہے یا علم حاصل کر لینے سے آدمی اونٹ بن جاتا ہے۔ اور آپ لوگوں نے تو دیکھا ہوگا۔ کہ پنجاب کے اکثر زمینداروں کے لمبے لمبے اور موٹے موٹے لڑکے نہایت جاہل۔ گدھے اور بے ہنر ہو کر بھی کارتوس والی بندوقیں خرید کر دن رات شکار میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ تو یہ اس لئے کہ ان کے جاہل باوا کے ساتھ ہی ان کی والدہ بہت زیادہ جاہل ہوتی ہیں۔ بس ان سے ان کے بیٹے ضد کرکے اور مچل کر زیادہ قیمت کی بندوق یا انگریزی طرز کا پاجامہ کوٹ کُرتا اور ٹوپی لے کر دن رات شکار یا تھیٹر اور سینما میں اپنی عمر برباد کرتے پھرتے ہیں۔ نہ وہ خدا اور رسول کے احکام جانتے نہ ماں باپ کے حقوق پہچانتے نہ بزرگوں کے آداب سے واقف ہوتے ہیں۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے رام سروپ کمہار کے کالے گدھے کو کوٹ پتلون پہنا کر کسی تھیٹر میں چھوڑ دیا ہو۔ اور وہ ہے کہ ڈھینچوں ڈھینچوں کرتا پھرتا ہے۔ بس ماں باپ کی اس محبت اور جہالت سے تھوڑے ہی عرصہ میں یہ لاڈ پیار سے پالے ہوئے بچے چور۔ ڈاکو۔ شرابی بدکار۔ افیونی۔ غنڈے۔ لفنگے اور نہیں تو پھر کسی رئیس کے پاؤں دبانے والے نوکر اور غلام ہو جاتے ہیں۔ اور ساری برادری میں عمر بھر ذلیل رہتے ہیں لیسے بے ہنر اور جاہل بچے چاہے جتنا قیمتی لباس پہنکر بازار میں جائیں۔ پولیس والے ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور وہ یہ دریافت کرتے رہتے ہیں کہ ان جاہل لونڈوں کے پاس اتنا قیمتی لباس کہاں سے اور کس طرح آیا۔ جب کہ یہ نہ تو لکھے پڑھے ہیں۔ اور نہ کہیں نوکر چاکر اور اکثر کو تو وہ چانڈو خانوں اور رنڈیوں کے گھروں میں جا کر پکڑ بھی لیتے ہیں۔ اور پھر ان کے جاہل ماں باپ انہیں پولیس سے چھڑانے کیلئے رشوتیں دیتے پھرتے ہیں۔ اور کوتوالوں کے ہاتھ جوڑتے پھرتے ہیں تو ہم لعنت ہے ایسے بے ہنر اور جاہل لونڈوں پر۔ واللہ! اگر ہمیں کوئی پولیس والا یا موٹر چلانے والا ایک مرتبہ بھی جاہل کہہ کر پکارے تو بابا تو ہم اسی دن سے علم حاصل کرنا شروع کر دیں۔ یا زہر کھا کر مر جائیں۔ مگر لاحول ولا یہ پنجاب کے کسانوں کو ذرا بھی غیرت نہیں کہ وہ اپنے ایک ایک بچہ کو اگر علم نہیں تو کوئی ایسا ہنر تو سکھا دیں۔ کہ ان کا کا لا کا لا لڑکا محلّے اور برادری میں اور کچھ نہیں تو "مستری صاحب" ہی مشہور ہو جائے۔ اور جناب آپ جھوٹ سمجھیں گے۔ کہ ایک مرتبہ اگر پولیس نہ آگئی ہوتی۔ تو ہم نے دو چار جاہل اور بے ہنر لونڈوں کو مار ہی ڈالا ہوتا۔ کیونکہ بھئی! ساری موٹی موٹی اور پتلی پتلی کتابوں میں لکھا ہے کہ "جاہل آدمی اور مُردے میں بس اتنا فرق ہوتا ہے کہ جاہل کی قبر نہیں ہوتی۔ اور مُردے کی قبر ہوتی ہے۔ باقی جاہل آدمی مُردے سے کسی طرح کم نہیں ہوتا۔" خدا آپ کے اور ہمارے بچوں کو جہالت اور بے ہنری سے بچائے۔

اچھا جناب! ایک اور بات یہ ہے کہ جاہل اور بے ہنر بچے نہ گھر میں عزّت پاتے ہیں۔ نہ محلّے میں نہ گاؤں میں نہ قصبے میں۔ نہ شہر میں نہ برادری میں، نہ کوتوال صاحب کی نظروں میں نہ مجسٹریٹ صاحب کی نظر میں۔ یہاں تک، کہ

خود ان کے ساتھ کے اسکول جانے والے لڑکے انہیں جاہل گدھا بے وقوف، الّو، بیہودہ اور ذلیل کہتے ہیں۔ مگر افسوس کہ وہ پھر بھی علم اور ہُنر حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ حالانکہ اگر وہ چاہیں تو اپنے دادامیاں کی عمر میں بھی علم و ہنر حاصل کر سکتے ہیں۔ اور کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اندھے آدمی تک قرآن شریف کے اتنے مشکل تیس۳۰ پارے حفظ یاد کر لیتے ہیں اور قسم قسم کی چیزیں بنانا سیکھ جاتے ہیں۔ اور یہ جاہل لونڈے جدھر جاتے ہیں۔ چانٹے کھاتے ہیں۔ اور یورپ میں تو یہ قاعدہ ہے کہ جہاں بچہ دس برس کا ہُوا اور اس کے باوا نے یا والدہ نے اُسے اٹھا کر کسی دوسرے شہر میں علم و ہنر حاصل کرنے کے لئے بھیجدیا۔ مگر سُنا ہے کہ پنجاب میں دیہاتی لوگ اپنے بچوں کو دن رات تعویذ بنا کر گلے میں لٹکائے پھرتے ہیں۔ اور ذرا انہیں شرماتے۔

ایک بڑی مصیبت آج کل کے بچوں میں یہ ہے کہ اوّل تو وُہ علم و ہنر حاصل کرنے کے عوض غلیل اور سینما کے تماشوں میں مارے پھرتے ہیں۔ اور اگر خدا خدا کر کے وہ پڑھنے کے لئے اسکول جاتے ہیں۔ تو پھر کوٹ بھی مانگتے ہیں پتلون بھی۔ کالر بھی اور ٹائی بھی۔ موزے بھی اور بنیاین بھی۔ ترکی ٹوپی کی جگہ انگریزی ٹوپی اور بوٹ بھی۔ سائیکل بھی اور موٹر بھی۔ تو پھر یہ علم و ہنر حاصل کرنا کاہے کو رہا۔ گویا ماں باپ بوٹ سوٹ اور فیشن ایبل چیزوں کی دکان ہو گئے اس سے یہ ہوتا ہے کہ بچہ کو علم و ہنر سے زیادہ محبت فیشن کی چیزوں سے ہو جاتی ہے۔ اور پھر کسان لوگ اتنا روپیہ اُن کے لئے صرف بھی نہیں کر سکتے۔ اور اسی لئے وہ علم و ہنر کو ایک بڑی ہی گالی دے کر اپنے بچہ کو گنوار بنانا ہی پسند کرتے ہیں۔ مگر ایسے ماں باپ اصل میں تیسرے درجہ کے بیوقوف ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ بات اُن کے اختیار میں ہے کہ وہ شروع سے اپنے بچے کو گیہوں کی روٹی اور عمدہ قسم کی ترکاری ہی نہ دیں۔ اسی طرح کھادی یا کسی قسم کا ٹاٹ کے برابر موٹا کپڑا پہنائیں۔ کیونکہ اس قسم کے کھانے اور لباس سے بچہ میں بہادری۔ ہمت۔ اور کام کرنے کی قوت بڑھتی ہے اور اُس کا دماغ یہ انڈے اور پراٹھے کھانے والے لڑکوں سے زیادہ تیز ہو جاتا ہے۔ اور دُنیا میں جتنے بڑے اور مشہور بادشاہ اور عالم لوگ گذرے ہیں۔ ان کے حالات پڑھکر دیکھ لیجئے۔ کہ وہ ایسی ہی غذا اور لباس کے عادی تھے اسی لئے وہ اتنے بڑے آدمی ہو گئے۔ کیونکہ یہ بات بھی تو ہے کہ جو لوگ دنیا میں تکلیف اٹھا کر علم و ہنر حاصل کرتے ہیں۔ ان کو آخرت میں موتیوں کے محل ملتے ہیں۔ اور یہ جتنے امیر اور ہاکی فٹ بال کھیلنے والے لڑکے ہیں۔ اور امتحان فیل ہوتے رہتے ہیں۔ دیکھ لیجے گا کہ انہیں دوزخ میں تین یا چار مرتبہ جھونک دیا جائیگا۔ اس کے بعد شاید جنت میں جائیں، تو جائیں۔ اور ہمیں تو یہ بھی معلوم ہے کہ جن کاشتکاروں کے بچے علم و ہنر سے کورے ہوتے ہیں۔ پولیس والے تک اُن کی جان کے دشمن بنے رہتے ہیں۔ کیونکہ بے ہنر اور جاہل رہنے سے آدمی یا تو افیونی ہو کر بیٹھا کھانستا رہتا ہے۔ یا پھر مارے بھوک اور پیاس کے وہ ڈاکے اور چوری کا پیشہ اختیار کر لیتا ہے - - - - - - -

- - - - - - - وہ تو کہئے کہ ہم ملّا رموزی صاحب

بھی ان حرکتوں سے بال بال بچ گئے۔ ورنہ اگر یہ تھوڑا سا علم حاصل نہ کر لیتے۔ تو آج ہم بھی - - - - - - - - - ڈاکو بن کر کسی جیل خانے میں بیٹھے چکی چلا رہے ہوتے۔ مگر وہ تو خدا کا فضل تھا کہ ہماری والدہ صاحبہ نے ہمیں محلّے اور پڑوس کے لڑکوں کے ساتھ کبھی نہ ملنے دیا۔ - - - - - اور آپ مان لیجئے ہم آپ سے تحصیلدار صاحب کی قسم کھا کر کہتے ہیں۔ کہ بچوں کو بے ہنر اور جاہل بنانے میں یہ والدہ نام کی عورت بہت زیادہ اثر کرتی ہے۔ جہاں ایک دن اس کے ننھے بچے کو مولوی صاحب یا ماسٹر نے دس بارہ چانٹے رسید کر دیئے بس اس کی اماں بی نے گھر کو سر پر اٹھا لیا۔ اور صاف کہہ دیتی ہے میں نہیں پڑھاتی اپنے بچے کو۔ بس اس کے ساتھ پھر والد صاحب بھی کہہ دیتے ہیں کہ اچھا تو بس میرے ساتھ کھیت پر بھیج دیا کرو۔ یا دفتر میں یا کسی دکان پر ملازم رکھا دو۔ یا بنا دو۔ اور اسکول سے اٹھا لو۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ - - - کہ دنیا بھر میں جاہل بچوں کے باوا صاحب ہی اُلو، خبطی، جانور، گدھے اور بیوقوف مشہور ہو جاتے ہیں۔ اور کوئی نہیں جانتا۔ کہ اس کی جہالت کا سبب اس کی جاہل ماں ہے۔ تو بس آپ اُس طرف کے مردوں اور شہروں کو سکھا دیجئے کہ وہ اپنی عورتوں سے اپنے بچوں کو الگ رکھیں فقط دودھ پلاتے وقت اُن کے پاس رکھیں۔ اور جب بچہ دودھ پی کر فارغ ہو جائے۔ تو اُس سے اس کی ماں کا پردہ کرائیں۔ کیونکہ پردہ کرنا تو ویسے بھی عمدہ بات ہے۔ اسی طرح اُس طرف کے کوئی کوتوال صاحب مل جائیں۔ تو انہیں کچھ رشوت دے کر کہہ دیجئیگا کہ جب کوئی آدمی مجرم بن کر آپ کی کوتوالی میں آئے۔ تو اس سے حوالات کے اندر ہی یہ اقرار کرا لیں کہ وہ حوالات سے جاتے ہی اپنے تمام بچوں کو اسکول میں داخل کر دے گا۔ اور دیکھ لیجئیگا کہ اگر خدا نے ہم کو پچاس برس کے لئے ہی آپ کے شہر کا کوتوال کر دیا۔ تو ہم تو رات کے وقت گشت میں سوتے ہوئے بچوں کو اٹھا اٹھا کر کتابیں پڑھوایا کریں گے۔ کیونکہ تھوڑی دیر سو کر اگر کتاب پڑھو تو اتنی یاد ہوتی ہے۔ کہ عمر بھر بھول ہی نہیں سکتے۔

اور صاحب بڑے شرم کی بات ہے کہ انگریزوں کے بچے تو موٹروں اور ہوائی جہازوں پر بیٹھے پھریں۔ اور ہمارے آپ کے بچے محلّے کی گلیوں اور سڑکوں پر مارے مارے پھریں۔ تو یہ اس وجہ سے کہ انگریز کا بچہ تو پیدا ہوتے ہی لکھنے پڑھنے میں مصروف ہو جاتا ہے اور ہمارے بچے دن بھر بانسری بجاتے پھرتے ہیں۔ یا دکانوں پر بیٹھے بیڑی اور سگریٹ پیا کرتے ہیں۔ اس لئے جوان ہو کر نہ انہیں انگریزوں کی طرح کوئی بڑا عہدہ ملتا ہے۔ اور نہ موٹر کار۔ اور دیکھئے کس قدر کپڑے پھاڑ کر مر جانے کی بات ہے کہ آج کل سارے ہندوستان پر جو وزیر اور حاکم حکومت کر رہے ہیں۔ وہ سب کے سب کاشتکاروں اور مزدوروں ہی کے لکھے پڑھے بیٹے ہیں۔ چونکہ انہوں نے اپنی پوری عمر لکھنے پڑھنے میں صرف کر دی۔ اس لئے وہ آج حکومت کے افسر اور وزیر اعظم بنا دیئے گئے۔ اور ہمارے اور آپ کے بچے کھیتوں اور جنگلوں میں دن بھر گاتے پھرتے ہیں۔ اس لئے عمر بھر تحصیلدار صاحب کے

جوتے کھاتے ہیں۔ اور گنوار کہلاتے ہیں۔ اور اس میں سب سے زیادہ قصور ان کے گنوار ماں باپ کا ہے۔ اور یہ تو دیکھیے کہ جو بچے جاہل اور بے ہنر رہ جاتے ہیں۔ ان کی شادی بھی تو کسی حسین اور خوبصورت لڑکی سے نہیں ہوتی۔ بس کسی بھینی اور کالی صورت کی لڑکی سے ہو جاتی ہے۔ تو وہ بھی بڑی مشکل سے۔ اور جناب جب کالی صورت کی لڑکی سے شادی ہو جاتی ہے تو عمر بھی جی چاہتا ہے کہ یا اپنا گلا گھونٹ لیں۔ یا اپنی بیوی کا۔ اسی طرح علم و ہنر کے بغیر نہ گھر میں عمدہ سی چارپائی ہوتی ہے۔ نہ برتن۔ نہ میز اور نہ کرسی۔ نہ اعلیٰ درجہ کے کمرے اور نہ باغ۔ نہ صبح کو چائے اور بسکٹ اور نہ شام کو انڈا اور مرغی کا گوشت۔ بس ہر وقت سوکھی روٹی اور گنگا پرشاد کے ہاں کی دال کھانے کو ملتی ہے۔ اب اگر آپکے رسالہ پڑھنے والے ماں باپ اور اُن کے بچوں میں کچھ بھی جوش ہے۔ اور عقل ہے تو وہ ہمارا یہ مضمون پڑھ کر آج ہی سے علم و ہنر حاصل کرنے میں مصروف ہو جائیں گے۔ پھر دیکھ لیجئے گا کہ انشاء اللہ عمر بھر کیسے خوش رہتے ہیں پس جناب اس معاملہ میں تو ہمارے ننھے میاں کی والدہ یعنی ہماری "درجہ اول بیوی" ساری دنیا اور سونے چاندی سے زیادہ اچھی ہیں۔ کرتی یہ ہیں کہ صبح سویرے سے اپنے ننھے میاں کو ایک درجہ دوم کا چانٹا مار کر اٹھاتی ہیں۔ پھر اس سے خدا کی عبادت کراتی ہیں۔ پھر اُسے چائے پلاتی ہیں اگرچہ اس کے حصہ کے پراٹھے اور بسکٹ میں سے خود بھی کھا لیتی ہیں اور وہ روتا رہ جاتا ہے۔ بس اس کے بعد وہ اسے کتابیں پڑھاتی ہیں۔ اور ہانڈی بھی یا روٹی بھی پکاتی جاتی ہیں۔ پھر اُسے اسکول روانہ کر دیتی ہیں۔ اور جب وہ اسکول سے واپس آتا ہے تو ہماری کالی کالی صورت کی بیوی صاحبہ اس کی جیب کی تلاشی لیتی ہیں۔ کہ کہیں اس کی جیب میں تاش یا بیڑی یا سیگرٹ تو نہیں ہیں۔ کیونکہ آج کل کے لڑکے سیگرٹ کثرت سے پیتے ہیں۔ مگر وہ نہیں جانتے کہ پڑھنے کے زمانے میں سیگرٹ پینے سے دل اور دماغ خراب ہو جاتا ہے پھر وہ اُسے اپنے ساتھ چائے پلاتی ہیں۔ علیحدہ چائے اس لئے نہیں دیتی ہیں۔ کہ ہمارے ننھے میاں حد سے زیادہ شکر ڈال کر چائے پیتے ہیں۔ یا ایک دم دس بارہ بسکٹ کھا جاتے ہیں۔ پھر اُسے اپنے ساتھ لیکر چاندنی پر ٹہلتی ہیں یا ہمارے ساتھ تفریح کو ٹھنڈی سڑک پر بھیج دیتی ہیں۔ مگر اسے اکیلا گھر سے باہر نہیں جانے دیتی ہیں۔ کیونکہ چھوٹی عمر کے بچے جہاں اکیلے گھر سے نکلے۔ تو وہ یا تو ہاکی اور فٹ بال کے لڑکوں کے ساتھ گالیاں بکنا سیکھ جاتے ہیں۔ یا سیگرٹ پیتے پھرتے ہیں۔ یا سینما کا تماشا دیکھنے چلے جاتے ہیں۔ اور ان سب باتوں سے تعلیم بے کار ہو جاتی ہے۔ پھر وہ رات کو اُسے خود پڑھاتی ہیں۔ اگرچہ کبھی کبھی وہ پڑھاتے پڑھاتے خود ہی اونگھنے لگتی ہیں۔ اور بعض وقت تو وہ اپنے ہی ننھے کی کتابوں پر سر رکھ کر سو جاتی ہیں۔ مگر پڑھائے بغیر وہ سوتی نہیں ہیں۔ پس اگر آپ کی والدہ صاحبہ لکھی پڑھی ہوں۔ تو انہیں چاہئے کہ وہ اپنے بچے کو خود پڑھائیں۔ مگر یہ نہیں کہ آپ کے حصہ کی چائے خود پی جائیں۔ اور جو خود لکھی پڑھی نہ ہوں تو پھر آپ کو کسی ایسے ماسٹر کے حوالے کر دیں۔ جو تنخواہ تو لے کم اور پڑھائے زیادہ۔ اب اگر آپ ہماری اتنی باتیں مان لیں گے۔ یا مان لینگی تو انشاء اللہ ہم آئندہ اس سے بھی عمدہ باتیں آپ کو بتاتے رہیں گے یا بتاتی...

ہمیں کس اب ادارکر دو یجانب اللہ علیہ رحمتی ؟

ہوا محل

جے پور

یہ خوبصورت اور شاندار محل وسط شہر میں واقع ہے۔ اس میں نو منزلیں ہیں۔ جن میں بکثرت کھڑکیاں لگی ہوئی ہیں۔ جن پر بہت نفیس پردے پڑے ہوئے ہیں۔

حقیقت میں یہ بڑی ہوادار عمارت ہے۔ اسی وجہ سے اس کو ہوا محل کہتے ہیں۔ یہ عمارت عربی نمونہ کی بنی ہوئی ہے۔ جس کی ہر منزل میں بے انتہا کھڑکیاں ہیں۔ سب سے اوپر والی منزل میں برج قائم ہیں۔ جن پر سنہری کلس لگے ہیں۔ یہ مشرقی طرز کی بہترین عمارت ہے۔ جس کا سامنے کا رُخ بہت دلفریب ہے۔ اس کا گلابی رنگ بے حد جاذب انظار ہے۔ سر ایڈون آرنلڈ اس عمارت کے متعلق لکھتے ہیں "علاؤالدین کا جادو کا محل اور پری بانو کا مکان بھی اس سے بہتر نہیں ہو سکتے"

البرٹ ہال جے پور

فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کا فرش لکڑی کا ہے۔ اس میں خاص صنعت یہ ہے۔ کہ نازک نازک محرابیں بہت بھاری چھت کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس کے دونوں طرف بالمقابل دو کھڑکیاں ہیں۔ جن میں مختلف رنگوں کے شیشہ کے ٹکڑے تراش کر لگائے گئے ہیں۔ جن سے چرٹ، گھوڑے اور کوچوان کی شکل بن گئی ہے۔ یہ تمام کام بے حد قابل تعریف ہے۔

محرابوں کے اور چھت میں پرانے ہندو رشیوں کے اقوال کندہ ہیں۔ جن کا مطلب یہ ہے۔ کہ زندگی کو کس طرح پاکیزگی سے بسر کرنا چاہئے۔

وسطی برآمدہ میں چھ تصویریں جنگِ مہابھارت کی ہیں۔ جن میں ہر تصویر جیتی جاگتی معلوم ہوتی ہے۔

نیک و بد

(از حضرت ذہین)

ذہین جس میں بدی ہو زیادہ نیکی کم — وہ نیک نام جہاں میں ہو کس طرح مشہور

برائی کم ہو بھلائی زیادہ ہو جس میں — تو اسکے خُلق سے ہو گی نہ خلق اُس سے نفور

مقدّم اپنی غرض پر ہو غیر کا مقصد — یہ وصف جس میں ہوں لوگ اُس سے کیوں نہ ہوں مسرور

ہو اپنا فائدہ نقصان غیر کا یہ امر — کبھی پسند نہیں کرتے اہلِ عقل و شعور

خدا کی ذات فقط عیب سے منزّہ ہے — کم ایسے لوگ ہیں کم جن میں ہو فساد و فتور

ستم پہ فخر کوئی بے شعور کرتا ہے — کسی کو ناز کہ ہے وجہ فخر مجھ میں غرور

اگر ذلیل ہے زردار تو معزز ہو — اگر شریف ہے محتاج تو وہ ہے مقہور

غرض کہ بندے جہاں میں ہیں بے حساب و شمار — ہیں خال خال جو ہیں اہلِ درد اہلِ شعور

جو نفع غیر کا چاہے بڑا خردور ہے

کہ اس میں فائدہ ہو گا ذہین اُس کا ضرور

(از جناب امرناتھ صاحب طپش موگوی)

حبابِ ہستی اُبھر کے آخر شکستہ ساماں ضرور ہوگا
جہازِ عمرِ رواں ہمارا فنا کی موجوں میں چُور ہوگا

بھلے بُرے جس قدر عمل ہیں حساب اُن کا ضرور ہوگا
فقط وہ جنت میں جائے گا وہ جو ہر طرح بے قصور ہوگا

سنا ہے ہم نے کہ سب بہشتی پئیں گے جامِ شرابِ کوثر
اگر یہ سچ ہے تو مے کشوں کا لحاظ اُن کو ضرور ہوگا

اگر یہی ہے جنوں کا غلبہ کہاں کا محشر کہاں کی پرسش
دماغِ عرضِ نیاز کس کو دماغ ہی میں فتور ہوگا

زبانِ زاہد سے ہجوِ رنداں سنی تو پیرِ مغاں یہ بولا
یہ بدزبانی بُری ہے اس کا مواخذہ بھی ضرور ہوگا

کرم پہ مائل وہ ہو گئے ہیں مگر یہ کھٹکا ہے **طپش** مجھ کو
انہیں بھی اس پر غرور ہوگا مجھے بھی اس پر غرور ہوگا

صحت مقدم ہے یا تہذیب

(جناب سید غضنفر علی صاحب نقوی۔ بی اے سینیر انگلش ماسٹر گورنمنٹ سنٹرل ماڈل سکول لاہور)

بادی النظر میں مضمون کا عنوان ہی مضمون نگار کے لئے ایک اچھی خاصی کشمکش کا سامان پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ صحت اور تہذیب انسانی زندگی کے لئے دونوں زینت کا باعث ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ تندرست و توانا انسان غیر مہذب ہونا پسند کرے۔ یا دوسری صورت میں ایک مہذب انسان دائم المریض ہونا قبول کرے۔ گو صحت اور تہذیب لازم ملزوم نہیں تاہم انسانی زندگی کی تکمیل دونوں کی رہین منت ہے۔

جس تہذیب سے انسان کی روزمرہ زندگی کو چار چاند لگتے ہیں۔ اس تہذیب سے مجھے بحث نہیں۔ بلکہ مجھے آج کی صحبت میں اُس تہذیب کا ذکر کرنا منظور ہے۔ جو ہمارے نوجوانوں کا آجکل طرۂ امتیاز بنی ہوئی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں ہمارے ترچھے ٹیڑھے فیشن پر مرمٹنے والوں کی اندھا دُھند تقلید کی شرمندۂ احسان ہے۔

معیارِ تہذیب انسانی زندگی کے گرد و پیش کے حالات کے مطابق ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ جو چیز آج ہمارے نزدیک مرغوب ہے۔ کل بعینہٖ وہی ہمارے نزدیک معیوب سمجھی جاتی ہے۔ پتھر کے زمانے کے لوگ دھات کے زمانے کے لوگوں سے غیر مہذب خیال کئے جاتے تھے۔ پھر اس سے بعد کی نسلیں دھات کے زمانے کے لوگوں کو غیر مہذب اور حبشی وغیرہ کے خطابات سے یاد کرنے لگیں۔ غرض اسی معیار کی بنا پر آجکل کے ہمارے عزیز نوجوان اپنے اسلاف کو دقیانوسی اور اگلے وقتوں کے لوگوں میں شمار کرتے ہیں۔ اور کیا عجب ہے۔ کہ زمانۂ مستقبل میں بھی بانکے ٹیڑھے فیشن پرست نوجوان آنیوالی نسلوں کی نگاہوں میں مضحکہ خیز ہستیاں ثابت ہوں۔

تہذیب اور شرافت دو مترادف الفاظ ہیں۔ لغت کے اعتبار سے گو ان میں کسی قدر معنوی فرق ہو۔ مگر عام طور پر یہ دونوں الفاظ اُس سعید انسان کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ جسے عام طور پر ہم مہذب اور شریف سمجھتے ہیں۔ تھوڑے ہی عرصہ کی بات ہے کہ دنیا مہذب انسان اُسے خیال کرتی تھی۔ جو حسب ونسب کے لحاظ سے نجیب الطرفین ہو۔ بزرگوں کا ادب ہر وقت ملحوظ خاطر رہے۔ گفتگو میں اپنے بڑوں کی موجودگی میں سبقت نہ کرے۔ اگر رائے لی جائے تو نہایت ادب سے سنجیدہ الفاظ میں اظہار خیالات کرے۔ غریبوں یتیم بچوں اور رانڈ عورتوں کی مدد کرنا اُس کا سب سے پہلا فرض ہو۔ ماں باپ اور اُستاد کا دل سے فرمانبردار ہو۔ عزیز و اقربا سے حسن سلوک میں سب سے ممتاز ہو غرض چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کا ادب ہر وقت اس کا شعار ہو۔ مذکورہ بالا صفات سے جو شخص بھی متصف ہوتا تھا۔

سب اُسے مہذب اور شریف سمجھا کرتے تھے مگر آج کل کے ترقّی کے زمانے کے مہذب انسان کے لوازمات اور اُس کے فرائض بالکل مختلف ہیں۔ اگر آجکل کے ہندوستانی مہذب انسان کا روزانہ پروگرام سنو۔ تو پہلے مہذب انسان اور موجودہ مہذب انسان میں دُور کی نسبت بھی نہ پاؤ گے۔ نئی روشنی کے جنٹلمین کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ صبح کو ۹ بجے سے پہلے بستر سے نہ اُٹھے۔ اور وہ بھی نوکروں کے پے درپے اصرار سے کہ میاں اٹھو۔ پانی گرم ہے۔ چلم بھری پڑی ہے بیٹھک میں فلاں صاحب انتظار کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

جب ہمارے عزیز دوست بستر سے اُٹھتے ہیں۔ تو عجیب شان سے خوابِ استراحت سے بیدار ہوتے ہیں۔ نوکر کو بڑے بڑے مغلّظ الفاظ میں پکارا جاتا ہے۔ وہ بدحواس ہو کر بھاگا بھاگا آتا ہے۔ صابون۔ اُسترا۔ قینچی وغیرہ تمام ضروریات سامنے دیتا ہے۔ آپ شیونگ سے (حجامت) فارغ ہونے کے بعد گرم پانی سے منہ دُھوتے ہیں۔ اور چائے اور ڈبل روٹی کے توس نوش فرما کر کہیں خُدا خُدا کر کے بیٹھک میں ۱۰ بجے قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ اور وُہ صاحب جو بیٹھک میں ۷ بجے سے الانتظار اشدُّ من الموت کی سختی میں مبتلا تھے۔ ان کی جان کو رو دھو کر واپس ہو جاتے ہیں۔ اور یہ حضرت فوراً کوٹ پتلون ڈانٹ سائیکل پر سوار یہ جا وہ جا چمپت ہوتے ہیں۔ کوٹ پتلون زیبِ تن ہے۔ ہیٹ سر پر ہے۔ سائیکل پر سوار ہیں۔ مُنہ میں سگرٹ ہے۔ اور اگر زیادہ مہذب ہونگے۔ تو سائیکل کے پیچھے پیچھے ایک کُتّا بھی دوڑتا ہوا دکھائی دے گا۔

اگر سیر کی جی میں سما جائے۔ تو سیدھے شاہدرہ پہنچتے ہیں۔ جہاں اُنہی جیسے وقت کا خون کرنے والے جنٹلمین تاش اور شطرنج لئے پہلے سے ہی موجود ہوتے ہیں۔ شاہدرہ کی سیر یا شالامار کی سیر صحت کی بنا پر نہیں نہ اسلئے کہ اپنے اسلاف کے کارنامے دیکھکر دل ہی دل میں اپنے ناخلف ہونے کا اعتراف کریں۔ یا اور کچھ نہیں۔ تو انقلابات زمانہ سے ہی عبرت حاصل کریں۔ بلکہ اسلئے کہ شالامار باغ کی سیر اور پھر وہاں پر تاش اور شطرنج کی بازی لگانا۔ آجکل کے فیشن کی ضروریات میں سے ہے۔ غرض تمام دن ان حضرات سے وہاں اُن اُن لغو حرکات کا اظہار ہوتا ہے۔ کہ اُن کا کاغذ پر اظہار بھی سلیم الطبع اصحاب کے دل پر گراں گزریگا۔ سورج کے غروب ہونے کے وقت کہیں گھر میں تشریف فرما ہوتے ہیں۔ تو میز پر کھانا چُنا جاتا ہے۔ آپ ہر ایک کھانے میں نقص نکالتے جاتے ہیں۔ اور نوکروں اور ماماؤں سے جھڑپ پر جھڑپ لئے جاتے ہیں۔ کھانے سے فراغت پانے کے بعد ہی سینما کی سوجھتی ہے۔ وہ کیوں محض اسلئے کہ سینما کا تماشا آجکل کی ضروریات میں سے ہے۔ اگر ایسی تماشا گاہوں میں شرکت نہ کی جائے۔ تو آجکل کے شُرفا (جنٹلمین) اُنہیں پُرانے وقتوں کے دقیانوسی لوگ خیال کرنے لگیں گے۔ اور اُن کے لئے اس سے زیادہ دنیا میں اور کوئی ذِلّت نہیں ہے۔ اب جو شخص ایک یا دو بجے بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ رات گذرنے کے بعد بستر پر لیٹے تو کیسے ممکن ہے۔ کہ وُہ

۵ بجے علی الصباح ضروریات سے فارغ ہو کر ایک آدھ گھنٹہ کے لئے صبح کی ہواخوری کے لئے نکل جائے۔

سچ پوچھو تو آجکل تہذیب اور صحت دو متضاد چیزیں سمجھی جاتی ہیں۔ ایک شخص تندرست و توانا ہے۔ مگر ایک نازک اندام اور قبض سے ستایا ہوا جنٹلمین اُس تندرست و توانا انسان کو محض اس وجہ سے حقارت کی نگاہ سے دیکھیگا۔ کہ اُس کی گفتار اور رفتار میں نازنینوں جیسی لچک نہیں ہے۔ کبھی تو سر کے بالوں کی تراش دیکھکر پھبتی پہ پھبتی کسیگا۔ اور کبھی گردن کا موٹا پا دیکھکر اسے اَرنے بھینسے سے خطاب کریگا۔ اور اگر اپنی کیفیت پوچھو۔ تو جبتک رات کو سوتے ہوئے۔ ایک دو ڈوکچی ٹپل پلز (قبض کشا گولیاں) نہ کھالی جائیں۔ تو صبح کے وقت مشکلیں آسان نہیں ہوتیں۔ غرض انتہائے تہذیب یہ ہے کہ ہماری وضع قطع۔ چال ڈھال غرض تمام حرکات وسکنات ایک اچھی خاصی نازنین لیڈی کی حرکات وسکنات سے مشابہ ہوں۔ گویا موجودہ دور میں تہذیب اور نزاکت دو مترادف الفاظ ہوگئے ہیں۔ اسی ضمن میں مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا۔ جس کا ذکر کرنا غالباً ناظرین کی ضیافتِ طبع کا باعث ہوگا۔

ایک جاہل زمیندار نے بابو لوگوں کی ظاہری سج دھج دیکھکر اپنے بیٹے کو بھی تعلیم دلانے کے لئے مدرسہ میں بھیجنا شروع کیا۔ لڑکا نہا ہونہار۔ تھوڑے ہی عرصہ میں لکھنے پڑھنے اور کھیل کود میں اپنے ہم جولیوں سے سبقت لیگیا۔ ہائی کلاسز میں پہنچکر دوسرے طالب علموں کی دیکھا دیکھی۔ ایک دن اپنے باپ سے کہنے لگا۔ کہ مجھے تو کوٹ پیلون سلوادو۔ زمیندار باپ نے خوشی خوشی کوٹ پتلون بھی سلوادیئے۔ اور بیٹے کو بابوؤں کی طرح انگریزی لباس میں ملبس دیکھکر بہت خوش ہُوا۔ ایک دن بوڑھے زمیندار سے اُس کے ایک دوست ملاقات کے لئے آئے اثنائے گفتگو میں دوست نے زمیندار سے پوچھا۔ کہ سُنائیے آپ کا بچہ کس جماعت میں پڑھتا ہے۔

زمیندار۔ جناب۔ نوبیں جیمت (نویں جماعت) میں پڑھتا ہے۔

دوست۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ تمہارا لڑکا ہونہار ہے۔ اور تمہیں اس کی تعلیم کے متعلق کوئی شکایت نہیں۔

زمیندار۔ ہاں جی مجھے کوئی سشکیت (شکایت) نہیں میں تو لڑکے کو دیکھکر بہت ہی خوش ہوتا ہوں۔ اب تو اللہ کے فجل (فضل) سے کھڑے ہوکر پیشاب بھی کرنے لگا ہے۔

خیال فرمائیے۔ جاہل باپ کی نظر میں تہذیب کی ابتدا یہ ہے۔ کہ بچہ کھڑے ہو کر پیشاب کرنا سیکھے۔ خدا ہی کو علم ہے۔ کہ اس تہذیب کی انتہا کس نوعیت کی ہوگی ؎

صفائیاں ہو رہی ہیں جتنی دل اُتنے ہی ہو رہے ہیں میلے
اندھیرا چھا جائیگا جہاں میں اگر یہی روشنی رہے گی

مذکورہ بالا پروگرام سے معلوم ہو گیا ہوگا۔ کہ ہمارے نوجوانوں کی جن پر اہل ملک کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ کسقدر

معروف زندگی ہے۔ ۲۴ گھنٹوں میں اُن کے پاس کوئی ایسا وقت نہیں ہے جس میں وہ ورزش جسمانی۔ خدمت خلق عبادت خالق۔ اعزّ واقربا سے حسن سلوک کے لئے کچھ تھوڑا سا وقت ہی نکال سکیں۔ ہاں البتہ اگر تھوڑا بہت وقت فرصت کا ملتا ہے۔ تو وہ ہارمونیم باجے کی بھینٹ چڑھتا ہے۔ رات کو دس اور گیارہ بجے کے قریب جب کسی دن سینما کی نمایش ہو۔ ہاہاہا آآ وغیرہ کی بے ہنگام سروں سے محلّہ کو سر پر اُٹھالیا جاتا ہے۔ اگر اہل محلہ ان کے اس طرز زندگی کی شکایت کریں۔ تو انہیں دقیانوسی۔ قدامت پسند۔ خدا جانے کون کون سے مکروہ خطابات سے نوازا جاتا ہے۔

اگر ان خدائی فوجداروں سے پوچھا جائے۔ کہ اس ہاہاہا سے اہل محلّہ کو تکلیف دینے کے سوا آخر فائدہ ہی کیا ہے۔ تو تفریح طبع کا ڈھونگ رچانے کے علاوہ پھیپھڑوں کی صفائی کا عذر لنگ بھی پیش کیا جاتا ہے۔ اگر ان کی توجہ اشرف ورزش جسمانی کی طرف مبذول کرائی جائے۔ تو پھر ان کے دلایل کا ترکش تیروں سے خالی ہوتا ہے۔ سوائے اس کے کہ یہ کہکر منہ پھیرلیں۔ کہ پھیپھڑوں کی صفائی کا یہ دقیانوسی طریقہ ہے اور بس۔ اور کوئی دلیل نہیں دی جاتی۔ حالانکہ ہارمونیم باجا ہو۔ یا کوئی اور ارغنوں۔ یہ سب کے سب انسانی طبایع کو عیش و عشرت کی طرف مایل کرنے والے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے۔ کہ ایران کی سلطنت کی تباہی اسی علم موسیقی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ شہنشاہ ہند اورنگ زیب عالمگیر نے اسی بنا پر محفل رقص و سرود کو ممنوع قرار دیا تھا۔ تاکہ آنیوالی نسلوں کی طبایع اس زہریلے اثر سے محفوظ رہ سکیں۔ میراثیوں اور علم موسیقی کے شیدائیوں نے علم موسیقی کا جنازہ نکال کر محل شاہی کے پاس سے گذارا۔ شہنشاہ ہند نے ہجوم خلایق کو ننگے سر اور ننگے پاؤں ماتمی لباس میں دیکھکر فرمایا۔ کہ یہ کس کا جنازہ ہے۔ لوگوں نے عرض کیا۔ کہ خداوند نعمت یہ علم موسیقی کا جنازہ ہے۔ آپ نے مُسکرا کر فرمایا۔ کہ اسے کسی گہری قبر میں گاڑنا۔ جہاں سے پھر نہ نکل سکے۔ اُسے کیا معلوم تھا۔ کہ اُس کے بعد ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے۔ کہ خدا کے فضل و کرم سے گھر میں دو دو تین تین نہیں۔ تو ایک ایک ضرور میراثی نظر آئے گا۔

اسی ضمن میں مجھے ایک حکایت یاد آگئی ہے۔ جس کا اعادہ غالباً فایدہ سے خالی نہ ہوگا۔ کسی امیر نے محفل رقص و سرود آراستہ کی اُس کے ایک درویش صفت دوست کو اطلاع ملی۔ آپ نے ایک نصیحت آمیز خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا۔

اے گمراہی میں چلنے والے۔ اور اے وادئ باطل میں سرگشتہ۔ یہ کیا خیرہ سری ہے۔ جو سر میں سمائی ہے۔ یہ کیا بیہودہ خصلت ہے جو اختیار کی ہے۔ غفلت کا پردہ بصیرت کی آنکھ سے اُٹھا۔ اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت کے اندھے گڑھے میں نہ گرا۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ جو چیز آج بوئے گا۔ کل وہی پائیگا۔ یہ مرتبہ اور حشمت نہ رہا ہے۔ اور نہ رہیگا۔ اگر فقیر کی بات ہوش کے کان سے سُنکر

عمل کرے تو بہتر۔ ورنہ عمل کا بدلہ پائیگا۔

امیر نے یہ خط دیکھتے ہی حیران و پریشان ہو کر ایک عریضہ معافئے قصور کے لئے لکھا محفل رقص و سرود کو درہم برہم کر کے بدستور سابق خدمت خلق میں مصروف ہو گیا۔

ناظرین خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ اس آزادی کے زمانے میں اگر کوئی سلیم الطبع انسان کسی اپنے دوست کو محفل رقص و سرود کو منع کرے۔ تو معلوم نہیں کہ اس ناصح مشفق کی کیسی دُرگت بنے کبھی تو ان کی شان میں یہ پڑھینگے

لگے دفتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو ے جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

اور کبھی انہیں سڑی۔ سودائی۔ بدمزاج۔ لکیر کے فقیر وغیرہ القاب سے یاد کیا جائیگا۔

قصہ مختصر فیشن کا مرض ہماری رگ رگ میں ایسا پیوست ہو چکا ہے۔ کہ ہمیں اس کے علاج کا تو ایک طرف اس کا کبھی ہونے سے بھی احساس نہیں ہوا۔ یہ موذی مرض روز بروز ہماری صحت جسمانی کو گھن کے کیڑے کی طرح کھا رہا ہے۔ کیا انہی موجودہ نسلوں سے یہ توقع کی جائیگی۔ کہ کسی اڑے وقت میں اپنے ملک کے لئے مفید ہستی بن سکینگے۔ ایں خیال است و محال است وجنوں۔

میرے ایک دوست کو جرمنی کے شہر برلن میں نمایش دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ دنیا کی عجیب و غریب چیزیں مہیا کی گئی تھیں۔ مگر سب سے زیادہ جو چیز انہیں پسند آئی۔ وہ دو تصویریں تھیں۔ ایک تصویر میں کیا دیکھتے ہیں۔ کہ ایک کسان معمولی سی چٹائی پر بیٹھا ہے۔ دسترخوان سامنے بچھا ہوا ہے۔ بچے اور بیوی سب ارد گرد بیٹھے روٹی کھا رہے ہیں۔ ہر ایک کا چہرہ بشاش نظر آتا ہے تصویر کے نیچے بڑے موٹے حروف میں لکھا ہوا ہے۔ کہ **صحت بغیر دولت** دوسری تصویر میں ایک نہایت اچھا کمرہ دکھایا گیا ہے۔ جھاڑ فانوس سے آراستہ ہے پانچ سات میزیں نہایت ہی اچھے قرینے سے گل و گلدستہ سے سجائی ہوئی ہیں۔ صاحب خانہ ایک آرام کرسی پر تکلیف کی وجہ سے کروٹ پر کروٹ بدلتے ہیں۔ بچے ہیں۔ کہ باپ کی علالت دیکھ کر سہمے ہوئے ایک طرف کھڑے ہیں۔ نوکر اور ماما ئیں الگ اُداس اور پژمردہ ایک کونے میں بت بنی ہوئی ہیں۔ بیوی میاں سے بصد اصرار کہہ رہی ہے۔ کہ اگر تمہارا چپاتی اور شوربا کو جی نہیں چاہتا۔ تو خدا کے لئے یخنی کے ہی دو گھونٹ پی لو۔ پندرہ دن ہو گئے ہیں کہ ایک دانہ بھی اُڑ کر منہ میں نہیں گیا۔ مگر میاں ہیں کہ سر ہلاتے جاتے ہیں۔ کہ میرا کسی شے کے کھانے کو مطلق جی نہیں چاہتا۔ اور اس تصویر کے نیچے جلی قلم سے لکھا ہوا ہے کہ **دولت بغیر صحت**

میرے دوست بیان کرتے ہیں۔ کہ میری زندگی بھر میں کسی چیز نے اتنا گہرا اثر نہیں۔ جتنا ان دو تصویروں نے۔ اور آجکل یہ حقیقت صاف طور پر روشن ہے۔ کہ ہماری آجکل کی پُر تکلف زندگی دوسری تصویر کی زندگی

کے مطابق ہو بہو ہوتی چلی جارہی ہے۔

ناظرین خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ جس قوم کے نوجوانوں کی زندگی اسقدر پُر تکلف ہو کہ اُن کی وضع قطع۔ چال ڈھال طرزِ معاشرت وغیرہ میں عورت اور آدمی کی تمیز ہی باقی نہ رہے۔ تو کیا اُس قوم کے افراد سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ دشمن کے مقابلے میں اپنے ملک کی حفاظت تو درکنار۔ محض اپنی اور اپنے عزیزوں کی حفاظت کے لئے اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت دے سکیں گے نہیں ہرگز نہیں۔ اُن سے یہ توقع رکھنا۔ محض تحصیل حاصل ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے ایک نازک اندام دوست کے ہاں ایک چور نے نقب لگائی۔ ماشاءاللہ گھر میں اپنی اور اپنے بچوں کی حفاظت کے لئے صرف یہی تن واحد موجود تھے۔ چور نے چھُرا دکھا کر کہا۔ کہ اگر تمہیں اپنی زندگی مطلوب ہے۔ تو گھر کے صندوق کی چابیاں بتاؤ۔ اور جو کچھ زیورات کی قسم میں سے ہے۔ سب میرے حوالے کر دو۔ آپ نہایت لجاجت سے فرماتے ہیں۔ کہ لو میاں .... یہ ہیں چابیاں اور وُہ ہیں صندوق جو تمہارا جی چاہتا ہے لیلو۔ لیکن مجھے کچھ نہ کہنا۔ غرض دوسرے دن افسوس کے لئے آپ کے درِ دولت پر۔ نہیں۔ کیونکہ دولت وغیرہ سب چور لے اڑا تھا بلکہ غریب خانہ پر پہنچے۔ وہاں پہنچکر ایک اور حقیقت کا انکشاف ہوا۔ کہ اپنی ذات شریف نے اپنی چابیوں سے اپنے صندوقوں کو کھولا۔ اور تمام قیمتی پارچات۔ برتن اور زیور اور نقدی وغیرہ کو اکٹھا کر کے چادر میں باندھا اور چور کے سر پر اُس گٹھڑی کے رکھنے میں بھی آپ نے شرکت فرمائی۔ مگر ان کی شرافت دیکھو۔ کہ چور کے چلے جانے کے بعد بھی اہلِ محلہ کو خبر نہ کی۔ شاید یہ ڈر ہو کہ ایسا کرنے سے چور واپس آکر پھر چھُرے سے گردن الگ کر دے گا

یہ ہے ہمارے آج کل کے عزیز نوجوانوں کی خود حفاظتی تدابیر مجھے اپنے عزیز دوستوں سے آخر میں یہ عرض کرنا ہے۔ کہ یہ چند سطور اُن کی دل آزاری کے لئے نہیں لکھی گئیں۔ کیونکہ میرے نزدیک اس سے زیادہ کوئی اور گناہ نہیں۔ بلکہ اُن کی بہتری اور خیر خواہی کو مد نظر رکھکر تحریر میں لائی گئی ہیں۔ کوٹ پتلون وغیرہ پہننا کوئی گناہ نہیں البتہ صحت کے مقابلے فیشن پر ہی فریفتہ ہو جانا بُرا ہے۔

کمرے کی صفائی۔ بدن کی صفائی۔ کپڑوں کا اجلا رکھنا وغیرہ وغیرہ یہ نہایت ہی ضروری باتیں ہیں۔ مگر اس بات کو کبھی بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ صفائی اور فیشن دو مختلف چیزیں ہیں صفائی جسقدر صحت کے لئے مفید ہے۔ فیشن اسی قدر مضر ہے۔

لے میرے عزیز دوستو۔ ایک زمانہ آنے والا ہے۔ کہ جب ہماری آئندہ نسلیں اپنے تئیں موجودہ فیشن کے ہاتھوں ہلاکت کے گڑھے میں پائینگی۔ تو وہ ہم پر ایک دفعہ نہیں۔ دو دفعہ نہیں۔ بلکہ صبح و شام ہزارہا بار نفریں بھیجا کرینگی۔ خدا کرے۔ کہ ہم بہت جلد اس نامراد مرض سے رہائی حاصل کر کے اپنے لئے۔ اپنے اعزہ و اقربا کے لئے۔ اپنی سوسائیٹی کیلئے۔ اور اپنے ملک کے لئے اس چند روزہ زندگی میں کوئی مفید خدمت کر سکیں

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

نمکدان

رسالہ ہذا کی اشاعت ماہ جنوری ۱۹۳۰ء میں تک بند مبتدی حضرات کی بارگاہِ بے نیاز میں یہ گزارش گئی تھی کہ وہ براہ کرم ہمارے حال پر رحم فرمائیں اور اپنے حال پر بھی۔ مگر افسوس کہ ہماری آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ اور انکی لایعنی و بیمعنی ہرزہ سرائی کا سلسلہ برابر جاری رہا مبتدی ہونا کوئی بُری بات نہیں۔ بشرطیکہ طبیعت خداداد ہو۔ اور ملکہ شاعری سے فطری مناسبت رکھتی ہو۔ ہر ایک شاعر کو اس منزل سے گزرنا پڑتا ہی۔ مگر ہمارا روئے سخن ان اصحاب جنوں مآب کی طرف ہے۔ جنکو شعر و سخن سے اتنی بھی نسبت نہیں۔ جتنی عقل اور وحشت میں ہے۔ جب کوئی جن ان کے سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ تو شورش دماغ کے اثر سے دامنِ شعر کی دھجیاں اڑانی شروع کر دیتے ہیں۔ پیٹ کے دھندوں سے فرصت ہوئی اور لگے زمین شعر کو پامال کرنے۔ پھر اتنی خاک اڑاتے ہیں کہ بقول مولانا نظامی زمینیں چھ رہ جاتی ہیں اور آسمان آٹھ ہو جاتے ہیں۔ خرابی یہ ہو کہ اگر ان گرفتارانِ بلا کو یہ سمجھایا جائے کہ یہ طوق تمہاری گردن میں بہت تنگ ہے۔ اسے اتار ڈالو۔ کیوں مفت کی مصیبت مول لے رکھی ہے۔ تو یہ بندگانِ عالی متعالی اسے دخل در معقول اور گستاخی و بے ادبی پر محمول سمجھتے ہیں جہلِ مرکب کی وجہ سے یہ تو امید نہیں ہو سکتی۔ کہ یہ مہربان اپنے حال پر کچھ رحم فرمائیں۔ مگر کم سے کم اتنا تو ہو۔ کہ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں ناظرین غالباً مشتاق ہونگے کہ ان شاعری کے نام پر مرمٹنے والوں کا نام نہیں تو کلام ہی بطور نمونہ سنا دیا جائے۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ آسمانِ سخن سے کیا کیا انوار ان شہیدوں پر نازل ہوئے ہیں۔ یا یہ کہ سرگرانی کے ابرِ محیط سے کیا کیا پتھر برسے ہیں

لیجئے، یہ تبرک بھی حاضر ہے۔ جی تو نہیں چاہتا۔ کہ یہ گنجِ شائگاں اسطرح لُٹا دیا جائے۔ ممکن ہے کہ مصنف ہی کو ناگوار معلوم ہو۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ان کا کوئی اور ہمجنس اس سے مستفید ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بھی ایک طرح سے مصنف ہی کا فیض ہے کہ ان کے نایاب خزانے سے ان کے کسی غریب بھائی کا دامنِ عبرت مالا مال ہوا۔ اس تبرک کے لئے ہم ایسے جامع جمیع کمالات کو منتخب کرتے ہیں۔ جو اپنے نام نامی کے بعد لفظ 'صاحب' بھی لکھتے ہیں۔ خودستائی کے میدان میں گرم رفتاری کا سلسلہ اسی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ صاحب کے بعد وقفہ کی علامت لکھ کر (یعنی تھوڑا اسا دم لے کر) عالم و فاضل بھی لکھتے ہیں۔ پھر وقفہ لکھ کر شاعر و لیکچرار۔ پھر جرنلسٹ و میڈلسٹ تحریر فرماتے ہیں۔ کم بخت سطر ہی ختم ہو گئی ورنہ خدا جانے ابھی اور کیا کیا لکھتے۔ عالم و فاضل کا مطلب ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ خدا جانے، یہ کوئی ڈگری ہے۔ یا آپنے دو تخلص تجویز کر لئے ہیں۔ ایک دن کیلئے اور ایک رات کیلئے۔ دن کو عالم۔ رات کو فاضل حماقت ہو، تو کم سے کم اتنی تو ہو جیسی شاعر و لیکچرار اور جرنلسٹ و میڈلسٹ کی واو عطف بھی سر پیٹ کر رہ جائے۔

شعر سنیئے۔ ؎

عموماً آبِ دنیا اس طرح تغیُّر ہے ہوتا کہ جم جاتا ہے جذب ہوتا ہے اُڑ جاتا ہے بہ جاتا

آبِ دُنیا میں فصاحت کا دریا موجزن ہو رہا ہے۔ اور اس میں کئی خوبصورت مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ بہ جاتا کے بعد ہے اسلئے نہیں آیا۔ کہ بہاؤ کے زور سے شعر کا اتنا کنارہ کٹ گیا ہے۔ اس زور کا مقابلہ کرنا شاعر کی طاقت سے باہر تھا۔ قافیہ میں جو تغیر واقع ہوا ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ ورنہ شاعر نے ہوتا کا قافیہ جوتا ضرور لکھا ہوگا۔ پانی کے زور سے واؤ کٹ گئی۔ جوتا سے جاتا بن گیا۔ جذب کی تب ہوا یہاں لکھ دی ہے۔ حقیقت میں وہ بھی پانی کی قوتِ جاذبہ میں جذب ہو چکی ہے۔ اتنے مختلف اور متضاد اوصاف میں جو تناسب اور ربط قائم کیا ہے وہ لاثانی ہے۔ ورنہ ہے ہوتا اور بہ جاتا کے طوفان میں شاعری کا قصرِ بلند ضرور بہ جاتا۔ اب پانچواں شاہکار ملاحظہ فرمائیں ؎

اگر خواص پانی کے نہ ہوتے یہ تو مشکل تھی نہ کپڑے رنگ سکتے ہم نہ دھو سکتا انہیں دھوبی

خواص کو خواص باندھ کر جو کمال دکھایا ہے۔ اس پر ہمارا بہادر غواص جس قدر بھی رقاص ہو۔ کم ہے صحتِ الفاظ کا خیال کس شد و مد کے ساتھ ملحوظِ خاطر رہتا ہے۔ یہ شعر شاید سنہ میں گھنگنیاں بھر کر کہا ہے۔ رنگ سکتے میں جو دلکش اور نرالا رنگ بھر دیا ہے۔ اسے رنگین بیانی کا معجزہ کہنا چاہیئے۔

پانچ نمونے تو ان کی نظم کے ہیں۔ اب نثر بھی ملاحظہ فرمائیں۔ اسی نظم کے ہمراہ ایک اشتفاق نامہ بھی لکھا ہے اسمیں نظم کی تشریح اس طرح کی گئی ہے۔

”نظم مرسلہ ایک سائنس کا سبق ہے اور اگر آپ نے اسے پسند کیا۔ تو . . . . الخ

لفظ ایک کا استعمال بھی نہیں آتا۔ یہ سائنس کا ایک سبق ہے یا ایک سائنس کا سبق ہے۔ اس کے بعد حرفِ عطف کو دیکھئے۔ یہ پیوند شاید اس لئے ہے۔ کہ کلام میں بے ربطی پیدا نہ ہو۔ جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی۔ نظم نگاری کا مال وہ تھا نثر نگاری کا جمال یہ ہے۔ ہم حیران ہیں۔ کہ اس عالم و فاضل۔ شاعر و لیکچرار کی عقل پر ہنسیں۔ یا اس جرنلسٹ و ہیڈ لسٹ کی جان کو رو دیں۔

جوش ملسیانی

شعر سنیئے۔ ؎

عموماً آبِ دنیا اس طرح تغیر سے ہوتا — کہ جم جاتا ہے جذب ہوتا ہے اُڑ جاتا ہے بہ جاتا

آبِ دُنیا میں فصاحت کا دریا موجزن ہو رہا ہے۔ اور اس میں کیسے خوبصورت مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ بہ جاتا کے بعد "ہے" اسلئے نہیں آیا کہ بہاؤ کے زور سے شعر کا اتنا کنارہ کٹ گیا ہے۔ اس زور کا مقابلہ کرنا شاعر کی طاقت سے باہر تھا۔ قافیہ میں جو تغیر واقع ہوا ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ ورنہ شاعر نے ہوتا کا قافیہ جوتا ضرور لکھا ہوگا۔ پانی کے زور سے واؤ کٹ گئی۔ جوتا سے جاتا بن گیا۔ جذب کی ب ہوا یہاں لکھ دی ہے۔ حقیقت میں وہ بھی پانی کی قوتِ جاذبہ میں جذب ہو چکی ہے۔ اتنے مختلف و متضاد اوصاف میں جو تناسب اور ربط قائم کیا ہے وہ لاثانی ہے۔ ورنہ ہے ہوتا اور بہ جاتا کے طوفان میں شاعری کا قصرِ بلند ضرور بہ جاتا۔ اب پانچواں شاہکار ملاحظہ فرمائیں ؎

اگر خواص پانی کے نہ ہوتے یہ تو مشکل تھی — نہ پی سکتے نہ گل سکتے نہ دھو سکتے انہیں ہم بھی

خواص کو خواصّ باندھ کر جو کمال دکھایا ہے۔ [illegible] ہو کم ہے صحتِ الفاظ کا خیال کس شدومد کے ساتھ ملحوظِ خاطر رہتا ہے۔ [illegible] گھنگنیاں بھر کر کہاں سے۔ نگل سکتے ہیں [illegible] پانی کا [illegible] چاہئے۔

پانچ نمونے تو ان کی نظم کے ہیں۔ اب نثر بھی ملاحظہ فرمائیں۔ اسی نظم کے ہمراہ ایک اشتیاق نامہ بھی لکھا ہے اسمیں نظم کی تشریح اس طرح کی گئی ہے۔

"نظم مرسلہ ایک سائنس کا سبق ہے اور اگر آپ نے اسے پسند کیا تو ...... الخ

لفظ ایک کا استعمال بھی نہیں آتا۔ یہ سائنس کا ایک سبق ہے یا ایک سائنس کا سبق ہے۔ اس کے بعد حرفِ عطف کو دیکھئے۔ یہ پیوند شاید اس لئے ہے۔ کہ کلام میں بے ربطی پیدا نہ ہو۔ جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی۔ نظم نگاری کا کمال وہ تھا نثر نگاری کا کمال یہ ہے۔ ہم حیران ہیں۔ کہ اس عالم و فاضل۔ شاعر و لیکچرار کی عقل پہ ہنسیں۔ یا اس جرنلسٹ و ہیڈ ماسٹر کی جان کو رو دیں۔

جوش ملسیانی

فہرستِ مضامین

دیہات سُدھار

(مسٹر ایف۔ ایل برائن ایم اے بہادر آئی۔سی۔ایس ڈپٹی کمشنر جہلم)

پہلا باب۔ تعمیری پروگرام

شاہی زراعتی کمیشن کی رپورٹ مظہر ہے:۔کہ

"اگر صدیوں کی بے حسی کو دُور کرنا مقصود ہے تو یہ ضروری ہے کہ گورنمنٹ عالیہ کے تمام ذرائع "دیہات سُدھار" کے لئے وقف کئے جائیں۔ اس امر کی بیحد ضرورت ہے کہ دیہاتی آبادی کے ماحول سے تعلق رکھنے والے جملہ محکمہ جات متحدہ اور منظم کوشش کریں"۔

چنانچہ ہز ایکسیلنسی نواب وائسرائے صاحب ہند نے چند ماہ ہوئے مدراس میں عوام کو جو اُن کے خیر مقدم کے لئے جمع ہوئے تھے مخاطب فرمایا کہ

"گورنمنٹ زراعتی کمیشن کی کوششوں کو بار آور بنانے میں ہر ممکن سعی عمل میں لائیگی"۔

جب گورنمنٹ ہند دیہات سُدھار کا بیڑا اُٹھائے تو اہل دیہات کی آئندہ کی بہبودی ایک یقینی امر ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم حوصلہ اور استقلال سے آگے بڑھتے چلیں۔ مشکل یہ ہے کہ ابتدا کہاں سے ہو اور کس کام کی ہو۔ میں نے اِس مسئلہ اور اُس کے حل کو اپنی ہر سہ تصنیفات بعنوان "ہندوستانی دیہات کی از سر نو تعمیر" "سقراط ہندوستانی گاؤں میں" "گاؤں میں بوائے سکاؤٹ" میں وضاحت سے ظاہر کیا ہے۔ اور ان کتابوں کا ہندوستان کی متعدد زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ اس جگہ پر مختصراً عرض کرونگا کہ اس سوال کو چار حصص پر منقسم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ہمیں زمین کی پیداوار اور دیہاتی صنعتوں کی نشو و نما کو بڑھانا چاہئے۔

(۲) فضول خرچی کو کم کرنا چاہئے۔

(۳) صحت کو بڑھانا چاہئے۔

(۴) گھر کی حالت کو دُرست کرنا چاہئے۔ یعنی ہم مستورات کی تعلیم و تربیت کی طرف بیش از بیش متوجہ ہوں تاکہ وہ اپنے گھروں کو ٹھیک طور پر رکھ سکیں اور بچوں کی پرورش اور نگہداشت بخوبی کر سکیں۔

پہلے ہر دو امور کو مشترکہ مدنظر رکھنا ہوگا کیونکہ عوام کی دولت اور ذرائع آمدنی بڑھانے سے کیا فائدہ؟ جب وہ اس کے ساتھ اپنی دولت کو مقدمہ بازی۔ فضول اور تباہ کن رسوم یا زیورات وغیرہ پر ضائع کرتے رہیں۔ جب تک یہ بیجا اخراجات بند نہ ہو جائیں ہماری کوششیں بے سود ثابت ہونگی اور ان پر آب در غربال یا ٹوٹے ہوئے ڈول میں پانی والی مثال صادق ہوگی۔

دولت کی زیادتی ہمارا نصب العین نہیں بلکہ ہمارا مطمح نظر اُس کے انتساب کا ذریعہ ہونا چاہیئے۔ جہاں لوگ متمول ہیں۔ ہمیں اس سوال کے پہلے جُزو کی طرف دھیان دینے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ باقی ہر سہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ البتہ جہاں لوگ آسودہ حال نہیں ہمیں اُن کی مدد کرنا چاہیئے۔ تاکہ وہ بہتر طریق پر کاشتکاری کریں اور دیہاتی صنعتوں سے اپنے ذرائع روزگار بڑھا سکیں۔ فاقہ کش اور مفلس لوگ بجُز روٹی کے سوال کے اور کسی بات کا خیال بھی نہیں کر سکتے۔ ضلع گوڑگانوں بہت ہی مفلس تھا۔ جہاں پر خوفناک قحط پڑتے تھے۔ اس لئے ہمیں ہر ممکن صورت سے زمین کی پیداوار بڑھانے کی فکر لاحق تھی تاکہ غربا کو پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہو سکے۔ اسی ذیل میں دیہاتی صنعتیں بہت معاون ثابت ہوئیں۔ لیکن اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ مستورات کی مصروفیت میں مزید اضافہ نہ ہو۔ مردوں کے بیکار وقت کے لئے مفید صنعتیں تجویز کریں۔ جس علاقہ میں بارش کی کثرت ہوگی۔ مرد بیکار اور نکمے ہونگے اور عورتیں کاروبار میں زیادہ مشغول ہونگی اور افلاس کی زیادتی اور کاروبار کی خرابی اسی قدر ظہور پذیر ہوگی۔

مجھے زمین کی پیداوار بڑھانے کے اصول یہاں بیان کرنے کی حاجت نہیں۔ یہ میری کتاب میں بوضاحت ظاہر کئے گئے ہیں۔ اور اُن کا اطلاق گوڑگاؤں سے بھی زیادہ وسیع رقبہ پر ہو سکتا ہے۔ دیہاتی صنعتیں بیشمار ہیں۔ مُرغیاں پلنے کے علاوہ ریشم کے کیڑوں کی پرداخت سے بیشمار چیزیں تیار کی جا سکتی ہیں۔ لکڑی اور دھات کی اشیاء کے کئی کام جاری کئے جا سکتے ہیں۔ بالغ مرد زیورات ہرگز استعمال نہ کریں اور عورتیں بھی خاص خاص مواقع کے علاوہ ان کا عام استعمال نہ کریں۔ مقدمہ بازی کو کم کیا جائے۔ اور مجلسی رسومات کے اخراجات کم کئے جائیں۔ اس قسم کے پروگرام پر مزید زور دینے کی ضرورت نہیں۔

تیسرے صحت اور تشق یعنی صحت عامہ کی ترقی کے بغیر پہلی دونو باتیں فضول ہیں صحت ہی دولت ہے۔ ایک غریب شخص ایک دولت مند بیمار سے بہتر ہے۔ ہمارا نصب العین روپیہ نہیں بلکہ تندرستی ہے۔ جسکے بغیر (خوشی) حاصل ہی نہیں ہو سکتی۔ بیماری مفلسی کی ماں ہے۔ کیونکہ اس کے رونما ہونے پر وقت ضائع ہونا ہے۔ جو دولت کے نقصان کا مترادف ہے۔ انسانی بیماریوں کا ۹۹ فیصدی حصہ نجاست کا نتیجہ ہے۔ ملیریا بھی نجاست کی وجہ سے ہے ملیریا کے جراثیم مچھروں کی شکل میں نمودار ہو جاتے ہیں۔ اور گندہ اور غیر مصفّا حالات کی بدولت لوگوں میں بیماری کا

مقابلہ کرنے کی قوت جاتی رہتی ہے۔

غلیظ دیہات کے معنی بغیر کھاد کے کھیت کی موجودگی کے ہیں۔ جس کا صریحی نتیجہ پیداوار کی کمی اور نہایت معمولی فصل ہیں۔ پس سب سے زیادہ ضروری امر گاؤں کی صفائی ہے۔ اس کے لئے کھاد محفوظ رکھنے کے یا تو چھفٹ گہرے گوڑ گاؤں کے گڑھے یا تین فٹ گہرے چینی مشترکہ گڑھے کھودے جائیں۔ ہر ایک قطعہ زمین کے لئے ایک گڑھا ہو۔ جب پہلا بھر جائے یا پُر ہونے کے قریب ہو تو دوسرا گڑھا تیار کیا جائے۔

ایک دفعہ گڑھے کھود دیئے جائیں۔ تو گاؤں صاف ستھرا رہ سکتا ہے۔ جب ایک دفعہ لوگ کھاد کی اہمیت سمجھ جائیں۔ تو پھر دیکھئے کہ کیسی حیرت انگیز فصلیں پیدا ہونگی۔ اور پھر لوگ دیہات کی صفائی کو کھیتی باڑی کے کاروبار کا ایک ضروری جزو خیال کرینگے۔ اور ہر قسم کے کام کو بخوشی تمام انجام دینگے۔ اگر ایک دفعہ گڑھے کھود دیئے جائیں تو دیہات کے باشندوں کے رفع حاجات کی جگہ تیار ہو جائیگی۔ گڑھوں کے اردگرد پردہ بنا دیا جائے۔ اور دو لکڑیاں بیچوں بیچ رکھدی جائیں۔ اس سے رفع حاجات کی قدرتی جگہ تیار ہو جائیگی۔ یہ خود ہی صاف رہے گی۔ کیونکہ اس میں ہر روز کوڑا کرکٹ اور گوبر پڑتا رہیگا اور اس سے عفونت دبی رہے گی۔ پانی پینے کے کوؤں کے قرب و جوار کو صاف ستھرا رکھا جائے۔ گھروں میں کافی تعداد کھڑکیوں کی ہو۔ تو دیہات صحت و دولت کی شاہراہ پر گامزن ہونگے۔ گاؤں کی صفائی کے ساتھ ساتھ متعدی امراض یعنی چیچک۔ پلیگ۔ ہیضہ اور ملیریا کی حفاظت کی ضرورت ہے۔ اوّلیں ہر سہ امراض کا دفعیہ نہایت آسان ہے۔ یعنی چیچک کے لئے تین بار ٹیکہ پلیگ کے لئے پلیگ کا ٹیکہ۔ اور کوؤں کو ڈھانپنا۔ اور اُن پر پمپ یا رہٹ لگانے سے ہیضہ کو دُور رکھ سکتے ہیں۔ ان امراض کی پے درپے موجودگی ہماری جہالت اور غفلت پر وال ہے۔ ملیریا کسی قدر مشکل بیماری ہے اور معقول انتظام اور کوشش سے مغلوب ہو سکتی ہے۔ سکاؤٹوں کے لئے ایک سُنہری موقع ہے۔ لوگوں کو سکھلایا جائے کہ خوردنی اشیاء اور مصالحہ جات کی طرح کونین کو بھی گھروں میں رکھیں اور اس کا استعمال کریں۔ اور مچھردانی کو ساڑھیوں اور چوڑیوں کی خرید پر ترجیح دیں۔ دیہات کے قرب میں جوہڑ کو ڈھانپ دیں یا بند کرادیں۔

اس طرح اس مسئلہ عظیم کے ہر سہ پہلو حل ہوگئے۔ ہاں یہ امور چوتھے کی محض تمہید ہیں۔ مائیں گھر کی صفائی اور معیار زندگی کی ذمہ وار ہیں۔ پس انہیں عہد طفولیت سے ہی مدرسہ میں بھیجا جائے اور آئندہ زندگی کے کاروبار کے لئے تیار کیا جائے۔ پس انہیں عہد طفولیت سے ہی مدرسہ میں بھیجا جائے اور آئندہ زندگی کے کاروبار کے لئے تیار کیا جائے۔ انہیں اعلےٰ پیمانہ کی تربیت کی ضرورت نہیں بلکہ انہیں خانہ داری کی تربیت کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ بیوی۔ ماں اور گھر کی نگہبانی کی اہل ثابت ہو سکیں۔ انہیں پرورش اطفال کا علم ہونا چاہیئے۔ پارچات و شیدنی کی درستی و تیاری سے واقفیت۔ کھانا بنانے۔ کنبے کی صحت کو قائم رکھنے کے

طریقوں سے آگاہی ۔ سادہ دواؤں اور معالجات سے واقفیت ہونی چاہیئے ۔ اُن کی مناسب حد تک عزت ملحوظ رکھی جائے ۔ تاکہ وہ گھروں کی حقیقی مالکہ ثابت ہو سکیں ۔

غیر ضروری کاروبار کے بوجھ عورتوں کے کندھوں پر سے ہٹا دینے چاہئیں ۔ تاکہ اُن کو بچوں کی غور و پرداخت کے لئے اور اپنے مکانات کو شاندار اور صاف ستھرا رکھنے کے لئے کافی وقت مل سکے ۔ اور وہ اپنے خاوندوں کی رفیقہ بن سکیں ۔ اور ان سے خادماؤں کا سلوک ہرگز روا نہ رکھا جائے ۔ چکی سے آٹا پیسنے ۔ اور اُپلے تھاپنے کے کام یکدم بند کرنے چاہئیں ۔ اوّل الذکر کی جگہ خراس لگائے جائیں ۔ اور آخر الذکر کی بجائے کسی اور قسم کا ایندھن تلاش کیا جائے ۔ ہمارے گھروں اور دیہات کو پھولوں کی مہک سے معطر کیا جائے ۔ جب ہماری عورتیں تربیت یافتہ اور مہذب ہونگی اور ہمارے دیہاتی گھر شاندار اور خوشی سے معمور ہونگے ۔ تو دیہاتی لڑکے قصبات کا رُخ نہ کرینگے ۔ بیے چینی ۔ مقدمہ بازی اور لڑائی جھگڑے بہت کم ہونگے ۔ اگر میرا گھر آرام دہ ہوگا ۔ تو میں جھگڑوں میں کیوں شریک ہونگا ۔ اور اپنے پڑوسیوں کے خلاف کیوں مقدمہ بازی کرونگا ۔ اس وقت اگر مردوں کو زیورات پہننے سے بند کیا جاتا ہے یا اپنے بچوں کے چیچک کا ٹیکہ لگانے کے لئے دبایا جاتا ہے تو وہ کہدیتی ہیں کہ عورتیں اسکے سخت خلاف ہیں ۔ مگر وہ تعلیم یافتہ ہو کر کفایت شعاری اور صحت کے اصول کی پابندی ملحوظ رکھینگے ۔

ہر ایک ضلع کے حالات جُدا جُدا ہیں ۔ لیکن لڑکیوں کی تعلیم سے غفلت صحت اور کھاد کا اتلاف لاپرواہی اور غلیظ عادات یہ تقریباً تمام اضلاع میں پائی جاتی ہیں ۔ ضلع گوڑگاؤں میں قحط و مفلسی عام تھی ۔ ضلع جہلم میں زمین کا پُر آب ہونا اور لوگوں کے لئے کاروبار کی کمی مسائل عظیم ہیں ۔ طغیانیوں کے معنی فصل کی تباہی اور مویشیوں کے لئے چارہ کی عدم موجودگی کے ہیں ۔ بیکاری کے معنی لڑائی جھگڑا ۔ مقدمہ بازی ۔ گھر سے غفلت اور کام سے نفرت کے ہیں ۔ پہلا بڑا کام گڑھوں کی کھدائی ۔ گاؤں کی صفائی اور لوگوں کو صفائی کی عادات سکھانا ہے ۔ گڑھوں کو بطور پاخانوں کے تیار کیا جائے اور لوگوں کو اُن کے استعمال سکھا دیئے جائیں ۔ اس کے معنی ایک معرکۂ عظیم کے ہیں ۔ لیکن اولین عورتوں کے لئے یہ انتظام کئے جائیں کہ موجودہ رسم و رواج نہ ہی صحت بخش اور نہ ہی شائستہ ہیں ۔ گاؤں کی حفظانِ صحت ۔ صفائی پسند عادات کا اجراء باقی کاموں کو بالکل آسان بنا دیگا ۔ اور یہ حیرانی کی بات ہے کہ کس طرح سے خودداری ۔ خاندانی نار اور صفائی لوگوں کو بہتر حالات کی طرف راغب نہیں کرتے ۔ صفائی ترقی کی طرف پہلا قدم ہے ۔ اس کے بغیر کوئی ترقی نہیں ہو سکتی ۔ غلاظت اور گندگی کے یہ معنی ہیں کہ لوگ اپنی حالت پر قانع ہیں جسم صاف ستھرا ہو ۔ گھر کی صفائی اور گاؤں کی صفائی کے یہ معنی ہیں کہ لوگ بہتر حالت کی طرف متوجہ ہیں ۔ صفائی کے بعد لڑکیوں کی تعلیم اور گھر کے کام میں تربیت کا سوال آتا ہے ۔ دیہات سدھار ہم سب کا کام ہے ۔ وہ لوگ بہترین کام کر کے دکھلا سکتے ہیں جو دیہات میں رہائش اختیار کر کے

نئی زندگی کی مثال قائم کریں۔ ہم سب ایسا نہیں کر سکتے۔ جو لوگ ایسا نہیں کر سکتے اُن کو کسی نہ کسی طریق پر کچھ کام کر کے دکھلانا چاہئے۔ ہم کو تقریر کرنے والوں کے علاوہ میجک لینٹرن تصویروں کی ضرورت ہے۔ ہمیں مصنفین کتب۔ ناثر اور ناظم۔ ناٹک نویس۔ مصوّر اور راگیوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں اساتذہ اور اشاعت کنندہ کی ضرورت ہے تاکہ دیہات میں اس نیک خبر کی اشاعت ہو سکے۔ ہمیں ایسے لوگوں سے امداد کی ضرورت ہے جو میلوں کے مواقع پر لوگوں میں پرچار (اشاعت) کر سکیں اور اُن کے آرام و سہولت کا اسباب مہیا کر سکیں۔ ہمیں تمام قسم کے دستکار اور موجدوں کی ضرورت ہے۔ جو اپنی ایجادات سے اہل دیہات کو اُن کی کھیتی باڑی کے کام میں مدد دے سکیں اور ان کی بیوی کے لئے گھر کے کام میں سہولتیں بہم پہنچا سکیں۔ ہمیں ایسی عورتوں کی ضرورت ہے جو ہسپتالوں اور دایہ کے کام کے ذریعہ سے دیہاتی عورتوں کی مدد کر سکیں جس سے کہ اُنکی زندگی شاندار بن سکے۔ ہمیں ایسی کتب مطلوب ہیں جو خاص لڑکیوں کے لئے تصنیف کی گئی ہوں۔ ہمیں علم ادب۔ اخبارات رسالجات اور دیگر کتب مطلوب ہیں جو اہل دیہات کو تعلیم دے سکیں۔ جس سے وہ اپنے فرصت کے وقت سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ لوگ بوائے سکاؤٹس تیار کریں کیونکہ وہی ہمارے دوست اور ساتھی ہو سکتے ہیں۔ اخیر میں ہم چاہتے ہیں کہ دیہات اخبار کا گھر بن جائیں۔

ہمارے لئے کام کی کوئی کمی نہیں اگر ابنائے جنس کی مدد کے خواہشمند ہوں اور اُن کی زندگیوں کو خوشحال بنانا چاہیں۔ اس کا انعام یہ ہے کہ ہمیں دلی مسرت اور قلبی اطمینان حاصل ہوگا کہ ہم نے اپنے فرض کو ادا کر دیا ہے۔ اور ہم نے اُن کی حتے الوسع امداد کی ہے۔ ہم نے چار برس برابر جنگ عظیم میں معرکہ آرائی کی۔ اب ہمارے اور اُن کے درمیان صلح ہے۔ لیکن دو دشمن۔ کاہلی اور جہالت ایسے ہیں جن سے ہمیں زندگی بھر لڑائی کی ضرورت ہے۔ یہ دو دشمن ایسے ہیں جو گاؤں والوں کی تمام مصائب کا باعث ہیں۔ اُن کا نتیجہ ہی غلاظت بیماری۔ مفلسی اور مقدمہ بازی ہے۔ ان سے معرکہ آرائی کے لئے ہمیں اُن لوگوں کی مستقل فوج کی ضرورت ہے جو دیہات سُدھار کے لئے کمربستہ ہوں۔

اپنے زریں اصول۔ مواثیق اور خیالات کی رُو سے یہ جماعت صرف بوائے سکاؤٹس ہی کی ہونا چاہئے۔ ہر مدرسہ اس پلٹن کی تربیت گاہ ہو اور ہر جلسہ جہالت اور کاہلی کے خلاف معرکہ آرائی کے لئے ایک جنگی کونسل کا کام دے۔

رازِ حیات

(فضل محی الدین صاحب فضل قادری)

"کہو تو رازِ حیات کہدوں۔ حقیقتِ کائنات کہدوں ۔ وہ بات کہدوں کہ پتھر کے جگر کو بھی آب آب کردے"۔ (حفیظ جالندھری)

"امداد باہمی کو رائج کرنے سے ہندوستان کی زراعت کا مستقبل شاندار اور درخشاں بن سکتا ہے۔ (ملک معظم جارج پنجم)

"ہندوستان کے جسم میں پنجاب ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہے۔ اس لئے پنجاب کی ترقی پر ہندوستان کی ترقی کا انحصار ہے"۔

ہر کہ در قعرِ مذلت ماندہ است ناتوانی را قناعت خواندہ است (اقبال)

"جس ملک کا خاص پیشہ زراعت ہو ۔ وہاں اس سے بلند تر کوئی مقصد نہیں ہو سکتا۔ کہ کاشتکاروں کی خوشحالی میں اضافہ کیا جائے"۔ (لارڈ اروِن)

"اگر ہندوستان کو خوشحال دیکھنا چاہتے ہو۔ تو دیہات اور دیہاتیوں کی اصلاح کرو"۔ (ٹیگور)

"میں سب کے کام آؤں سب میرے کام آئیں۔ اس راز کی حقیقت امداد باہمی ہے"۔ (مسلم)

"ہمارے ملک کی نجات کا یہی ذریعہ ہے۔ کہ آمدنی میں اضافہ اور خرچ میں کمی کرنے کی کوشش کریں"۔

"بہتر کاروبار اور بہتر زراعت پر ہی بہتر زندگی منحصر ہے"۔ (ہاربس پلیننکٹ)

"تعلیم اور امداد باہمی کے ذریعہ سے کسی ملک کی اقتصادی۔ معاشرتی تمدنی اور اخلاقی زندگی میں انقلاب عظیم پیدا کرسکتے ہیں"۔ (سر ڈکلینڈ)

ع ۔ "کوآپریشن میں ہیں تیری بہتری کے راز سب"

"امداد باہمی کا محل تعلیم اور صرف تعلیم کی بنیادوں پر ہی کھڑا ہو سکتا ہے"۔ (لارڈ لنلتھگو)

"زرعی ممالک کے لئے زراعت ہی ایک بہترین اور مفید صنعت ہے"۔

جھگڑے چکادیئے ہیں امداد باہمی نے بچھڑے ملا دیئے ہیں امداد باہمی نے

کوآپریشن (امداد باہمی کے ذریعہ سے ہی کاشتکار زمین سے بہترین فائدہ حاصل کرسکتا ہے"۔ (ایچ کیلوٹ)

"دنیا میں تنظیم کے ذریعہ سے ہی خاطرخواہ ترقی ہو سکتی ہے اور بہترین تنظیم امداد باہمی ہے"۔

"اگر زمینداران پنجاب خوشگوار زندگی بسر کرنے کے تمنائی ہیں۔ تو ان کے لئے لازم ہے کہ کاشتکاری کے علاوہ کوئی اور پیشہ بھی اختیار کریں" (ڈارلنگ)

بربادی و تباہی وا فلاس آج ہے اس کا سبب خرابی رسم و رواج ہے

"ضرورت ہے کہ ہندوستان کے مزارعین بھی زراعت کے جدید طریقے اختیار کریں" (ملک فتح خاں نون)

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان زرعی ملک ہے۔ اور یہاں کے ۹۰ فیصدی باشندوں کا پیشہ زراعت لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حالات کس قدر یاس افزا ہیں۔ کہ خدا کی شان زراتی کا مظہر (کاشتکار) ایک حقیر و ذلیل زندگی بسر کر رہا ہے نبض شناسان ملک وقوم اور بہی خواہان وطن نے کاشتکار کی ناگفتہ بہ حالت کی تشخیص کر کے جن نتائج کا اظہار کیا ہے۔ وہ ہر چند خوشگوار نہیں ہیں۔ لیکن ایسے ضرور ہیں۔ کہ اگر مدبران ہند کی تمام تر توجہ اس طرف مبذول ہو جائے۔ تو یہ طبقہ جلدی ترقی کر سکتا ہے۔ ابھی اس کی بیماری اس حد تک نہیں پہنچی۔ کہ اُسے لاعلاج قرار دیا جائے۔ مختصر طور پر پنجابی کاشتکار کی خامیاں اور انکی اصلاح کے ذرائع بیان کئے جاتے ہیں۔ اُمید ہے کہ یہ سطور دیہاتی مدرسین کی اصلاحی جدوجہد کے سلسلہ میں انہیں اپنے مقاصد سے قریب تر لانے میں ان کی رہنمائی کریگی۔

تعلیم۔ اگر مجھ سے سوال کیا جائے۔ کہ کسی ملک کی ترقی کا انحصار کس بات پر ہے؟ تو میں جواب میں صرف ایک لفظ "تعلیم" کہہ کر اپنے جواب کو مکمل خیال کرونگا۔ یہاں تعلیم کے فوائد کا اعادہ چنداں دلچسپ نہ ہوگا۔ کہ بقول مولانا روم ع آفتاب آمد دلیل آفتاب

یہ اعداد و شمار ہندوستان کی پستی و پسماندگی کا ایک روشن ثبوت ہیں۔ کہ جہاں دیگر ممالک عالم امریکہ۔ جاپان۔ روس۔ جرمنی اور انگلینڈ میں ۷۰ فیصدی سے سو فیصدی تک لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔ وہاں ہندوستان کے ایک قلیل التعداد طبقہ (صرف ۵ فیصدی اشخاص) کا تعلیم یافتہ ہونا کیا پوزیشن رکھتا ہے؟

تعلیم کے فوائد میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ لیکن ایک مفید ذریعۂ ارتقا سے ایسی بے رُخی حددرجہ افسوسناک ہے۔ اور اس عدم توجہی کا باعث محض والدین کا بالخصوص مستورات کا تعلیم کے زیور سے عاری ہونا ہے۔ تعلیم بالغان۔ تعلیم نسواں اور لازمی تعلیم ہی جہالت کے مرض سے شفا حاصل کرنیکا مجرب نسخہ ہے

افلاس۔ ہندوستان بھی عجیب ملک ہے۔ اگر اوسط آمدنی فی کس روزانہ صرف ڈیڑھ آنہ ہے۔ جہاں اس کے مقابلہ میں دوسرے ممالک کی اوسط آمدن فی کس پندرہ روپے روزانہ تک ہے۔ تو اموات کی تعداد سب ممالک کی نسبت ہندوستان میں زیادہ ہے۔ گویا نقائص کی بھرمار اور محاسن کا فقدان ہے۔ سونے کی یہ چڑیا خود ہی اپنے پروں کو اس طرح توڑ کر پھینک چکی ہے۔ کہ تاب پریدن نہیں رہی۔ اور مجال پرزدن باقی نہیں

تلخ حقیقت کس قدر خون کے آنسو رلانے والی ہے۔ کہ وہ ہندوستان جو گندم۔ چائے۔ پٹ سن۔ روئی کی پیداوار میں دُنیا کے ریکارڈ کو شکست دیتا ہے۔ اپنے ملک کے باشندوں کا پیٹ پالنے میں ناکام نظر آتا ہے۔ لیکن یہ سب حالات ہمارے خود پیدا کردہ اور ہماری اپنی ہی جہالت و تغافل شعاری کا ثمرہ ہیں۔ افلاس کے اسباب پر سرسری نظر ڈالنے سے سب کچھ واضح ہو جاتا ہے۔ کہ حالات کی اصلاح کہاں تک ہمارے اختیار میں ہے۔

قرضہ۔ اس وقت صرف صوبہ پنجاب کے کاشتکاروں اور زمینداروں کے ذمہ ۱۳۰ کروڑ روپیہ قرضہ ہے۔ جس کا سالانہ سُود بیس کروڑ روپیہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ تمام صوبہ کا معاملۂ اراضی ۴½ کروڑ روپیہ سالانہ ہے۔ پنجاب کے ۸۳ فیصدی باشندے مقروض اور ساہوکاروں کی غلامی کا طوق گلے میں ڈالے ہوئے ہیں۔ پنجابی کاشتکار کی حالتِ موجودہ اس شعر کی مجسم تفسیر ہے۔ ؎

پھنسا ہے دامِ غلامی میں بال بال اس کا ۔۔۔ کیا ہے قرض نے خستہ خراب حال اس کا

قرضہ کی زیادتی کے اسباب میں بھی مقروضاں کی لاعلمی اور جہالت کا بُہت کچھ حصہ ہے۔ نہایت گراں شرح سُود پر قرض برداشت کرکے اسے غیر منفعت بخش اغراض پر صرف کرنا، بیاہ شادی اور دیگر رسومات پر "ناک" کی خاطر (جو بہرحال کٹ ہی جایا کرتی ہے) سود در سود کے رنگین جال میں پھنسنا، ایک سو روپیہ نقد لے کر ڈیڑھ سو کا تمسک تحریر کر دینا اور ایک ہنگامی واہ واہ کے لئے اپنے پاؤں پر سُنہری کلہاڑا چلانا پرلے درجہ کی جہالت، افسوسناک حماقت اور ڈوب جانے والی کشتی نہیں تو اور کیا ہے؟

پنجاب میں ساہوکاروں کی تعداد چار لاکھ ہے۔ جو ظاہر کرتی ہے۔ کہ دولتمند ابنائے وطن کو غریب کسانوں کا خون چوسنے میں کیسا مزا آتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ یہی روپیہ تجارت، صنعت و حرفت اور دیگر مفید پیشوں پر صرف کریں۔ تو نہ صرف وہ اس سے زیادہ منافع حاصل کریں۔ بلکہ غریبوں اور بیکاروں کی ایک کثیر تعداد کے لئے ذرائع معاش پیدا ہو جائیں اور ملک اپنی اندرونی ضروریات کے پورا کرنے کے قابل ہو جائے۔

کفایت شعاری۔ بیماری، تعلیم، شادی اور دیگر اتفاقی حاجات کے لئے ایسی رقم مطلوب ہے جو خانگی اور روزانہ ضروریات کی تکمیل کے بعد ہمارے پاس محفوظ ہو۔ لیکن بدقسمتی سے ہم اس احساس سے محروم ہیں۔ کہ ایسی ضرورتوں کے لئے آمدن کا ایک مخصوص حصہ پس انداز کرنا چاہیئے۔ اسی لئے ہماری عادت ہو گئی ہے۔ کہ قرض لے کر ان ضروریات کو پورا کیا جائے۔ آمدنی میں اضافہ اور خرچ میں کمی کرنے کی کوشش کرکے یہ عادت پیدا کرنی چاہیئے۔ کہ پس ماندہ رقم اتفاقی اخراجات کے لئے محفوظ رہے۔ اسراف یا ناجائز اخراجات کو بالکل ترک کر دیا جائے۔

زاید پیشے۔ امریکہ۔ انگلستان اور دیگر مہذب و متمدن ممالک کے کاشتکار اپنے اوقاتِ فرصت میں ایسے مشاغل میں مصروف رہتے ہیں۔ جو تفریح کے ساتھ آمدنی میں اضافہ کا باعث بھی ہوں۔ مثال کے طور پر سُنئے کہ لنڈن میں ۸ فیصدی زمینداروں نے مرغی خانے بنا رکھے ہیں۔ امریکہ کے کاشتکار سالانہ ۲۰ کروڑ پونڈ انڈوں کی فروخت سے حاصل کرتے ہیں۔ کیا یہ اعداد و شمار پنجابی کاشتکار کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لئے ناکافی ہیں؟ جو اپنے فرصت کے قیمتی لمحوں کی قدر نہ کرکے اُن کو اس طرح صرف کرتا ہے۔ جس کا انجام مقدمہ بازی یا اس قسم کی دوسری تباہ کن صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ حالانکہ پنجاب میں مفید ترین مشاغل اختیار کرنے کے لئے قدرتی سہولتیں زیادہ مہیا ہیں مستورات سارا دن گھروں میں بیکار بیٹھی رہتی ہیں۔ وہ مندرجہ ذیل امور میں مردوں کا ہاتھ بٹا کر آمدنی میں اضافہ کی گنجائش پیدا کرسکتی ہیں۔ جن کے لئے کسی غیر معمولی سرمایہ کی ضرورت نہیں۔

مرغیوں کی پرورش۔ ریشم کے کیڑے پالنا۔ لاکھ بنانا۔ ٹوپیاں بنانا۔ کشیدہ کاڑھنا۔ جلد سازی۔ رنگ و روغن کرنا۔ باغبانی۔ مویشیوں کی پرورش۔ ٹاٹ بنانا۔ کپڑا بُننا وغیرہ وغیرہ۔

ناجائز اخراجات۔ جس شخص کا بال بال قرضہ میں جکڑا ہُوا ہو۔ جو فرقہ اپنی ہر جائز ضرورت کے لئے بھی دوسروں کا دست نگر ہو۔ جس قوم کو اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کی ذرا بھی خواہش نہ ہو۔ اور جس ملک کے باشندوں میں کفایت شعاری کا احساس نہ ہو۔ لیکن جائز و ناجائز کے سوال پر غور کئے بغیر دل کھول کر خرچ کرنے کی قدیم عادت ہو۔ تو ضروری ہے کہ وہ شخص ذلت و حقارت کی زندگی وہ فرقہ پریشانی و پسماندگی کے ایام وہ قوم افلاس و تکالیف کا زمانہ اور وہ ملک غلامانہ ذہنیت کے سوا کسی تمنا کو اپنے دل کی گہرائیوں میں جگہ نہ دے۔ اور فضول و بیکار ہونگی۔ اس کی وہ ناکمل کوششیں جو وہ اپنے پنپنے کے لئے کریگا۔

مذکورہ حالات پنجابی کاشتکار کی غیر مطمئن زندگی کا تاریک پہلو ہیں۔ مقدمہ بازی شادی و اموات کے غیر ضروری اخراجات، اور دیگر فضول رسومات کی قیود نے اسے ایسا پابہ زنجیر کر رکھا ہے کہ اس کے دل سے احساسِ آزادی بھی سلب کر لیا ہے۔

ضرورت ہے کہ زمیندار و کاشتکار ہندوستان و پنجاب اور ملک و قوم کے اِن بڑھتے ہوئے ناجائز اخراجات کے خلاف ایک منظم و مؤثر طریقہ پر اجتہادی جدوجہد کا آغاز کیا جائے اور کامیاب ہونے کے لئے وسیع پیمانہ پر "اصلاحِ رسومات" کا جال پھیلایا جائے۔

قدامت پسندی۔ ایک شاعر کا یہ شعر ؎

"جولاہا زندگی کی دوڑ میں سب سے پسڈی ہے ٹکے گز چال چلتا ہے پرانی اس کی کھڈی ہے"

اور ایک ماہرِ فن کا یہ مقولہ کہ پنجابی کاشتکار اس ترقی و تہذیب کے زمانے میں بھی وہی قدیم آلات

زراعت استعمال کر رہا ہے۔ جو اُسے اپنے آباؤ اجداد یا یوں کہو کہ حضرتِ آدم سے بطور ورثہ ملے ہیں"۔ ہماری قدامت پسندی پر نمایاں اور صحیح طور پر روشنی ڈال رہے ہیں۔ اس وقت جبکہ جدید آلات زراعت کی ارزانی کی بدولت ہم اپنے وقت میں بچت اور پیداوار میں ترقی کر سکتے ہیں۔ پنجابی کاشتکار نئے آلاتِ زراعت سے صرف "نئے" ہونے کے خیال سے ڈرتا ہے اور ان کے فوائد ذہن نشین کرنے کے باوجود بھی ان سے خطرہ سا محسوس کرتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اپنی پرانی اور فضول رسومات کو ترک کرنا بھی اچھا خیال نہیں کرتا۔ تعلیم یافتہ کاشتکاروں کے نمونہ سے بتدریج یہ حالات کچھ تبدیل ہو رہے ہیں۔ لیکن جدت پسندی سے ابھی تک گریز ہے۔

منتشر قطعاتِ اراضی۔ وراثت کی تقسیم در تقسیم کے باعث زمین ایسے چھوٹے چھوٹے قطعات میں منقسم ہو گئی ہے۔ کہ بعض حالات میں تین ایکڑ زمین تیس یا اس سے بھی زیادہ قطعات میں جداگانہ کھیتوں کی شکل میں بکھری ہوئی ہے۔ اس پر طرّہ یہ ہے کہ یہ کھیت کوئی دو تین مربع میل کے وسیع حدود میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لئے اِن حالات سے زمینداران کو سخت مشکل کا سامنا ہے۔ آئے دن نقب شکنی کے مقدمات کی بھرمار رہتی ہے۔ کھیتوں اور پیداوار کی نگرانی اور حفاظت میں دِقت پیش آتی ہے۔ زمین کا ایک بیش بہا حصہ حدبندی کی نذر ہو جاتا ہے۔ آبپاشی کا انتظام ناممکن نہیں تو محال ضرور ہو جاتا ہے۔

ان تکالیف کا سدِّباب صرف "اشتمال اراضی" کے ذریعہ سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ اشتمال کے فوائد ذیل کی ایک معمولی مثال سے بخوبی ذہن نشین ہو سکتے ہیں۔

تحصیل پسرور ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں میں ایک شخص کی دس ایکڑ زمین ۴۴ قطعات میں منقسم تھی۔ اس نے اس سے فائدہ نہ حاصل ہوتا دیکھ کر لائل پور میں مزارع بننے کو ترجیح دی۔ اب اشتمال ہونے پر وہی زمین صرف دو قطعات میں جمع ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس شخص نے واپس آکر اپنی زمین میں کنواں بھی لگوا لیا ہے۔ اور آرام سے اپنی زمین کاشت کر رہا ہے۔ کسی اشتمال شدہ گاؤں کا سابقہ اور موجودہ نقشہ دیکھنے سے اشتمال کی وقعت ظاہر ہو جاتی ہے۔ ایک لاکھ ایکڑ سے زیادہ رقبہ پنجاب میں اشتمال اراضی کے زیر اثر نئے سرے سے تقسیم ہو چکا ہے۔ جس میں مزید آبپاشی کے لئے پانچ سو نئے کنوئیں بھی لگ چکے ہیں۔

ترقی زراعت۔ یہ خیال کہ "کاشتکاری ایک حقیر پیشہ ہے"۔ ہماری زرعی ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔ زرعی ممالک کے لئے زراعت ایک بہترین اور مفید صنعت ہے۔ زمین کی حیثیت اور پیداوار میں ابھی ترقی کی کافی گنجائش موجود ہے۔ ہمیشہ یہ مدنظر رہے۔ کہ "زمین کسان کے لئے ہے نہ کہ کسان زمین کے لئے"۔

جدید آلاتِ زراعت۔ آزمائے ہوئے بیج اور کھاد کے درست استعمال سے محکمہ زراعت کی ہدایات کے بموجب

ہم زمین کی موجودہ حیثیت اور پیداوار میں کئی گنا اضافہ کر سکتے ہیں۔

خرید و فروخت۔ ترقی زراعت وغیرہ کی ہر ممکن کوشش اس وقت تک بے سود ہوگی۔ جب تک کہ زمینداروں کو ضروریات کی خرید اور پیداوار کی فروخت کے لئے سہولتیں میسر نہ ہوں۔ مسٹر سٹرکلینڈ کا یہ قول حقیقت سے لبریز ہے کہ "غریب آدمی خرید و فروخت دونو موقع پر نقصان اُٹھاتا ہے"۔

زمین کی خرید و فروخت گاؤں کے معمولی دکاندار کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔ جو کہ زمیندار کی سادہ لوحی سے ناجائز نفع حاصل کرتا ہوا خرید و فروخت دونو موقع پر زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرتا ہے۔ ادھر زمیندار اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ کہ اس کے ساتھ لین دین کرے۔ انجمن ہائے بہم رسانی اشیاء و آڑھت کی دکانوں نے اس مشکل کے حل کرنے میں کسی حد تک آسانیاں بہم پہنچادی ہیں۔

ترقی نسل مویشیاں۔ اگر اعداد و شمار پر نظر ثانی کی جائے۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ زمیندار ہر سال خرید مویشی کے لئے ایک معتدبہ رقم قرض لیتے ہیں۔ زمیندار کی سالانہ خرید مویشی سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ہر سال اس کے بہت سے مویشی محض اس کی عدم توجہی کے باعث ضائع ہوجاتے ہیں۔ معمولی اور اچھی قسم کے مویشی کے اخراجات میں چنداں فرق نہیں ہوتا۔ لیکن کام میں نمایاں اور لازمی فرق ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کے کاشتکار معمولی اور ادنےٰ قسم کے مویشی کی خرید پر لاکھوں روپے ہر سال ضائع کردیتے ہیں۔ اور پھر بھی وہ ان سے اتنا کام نہیں لے سکتے۔ جو ایک اچھے اور عمدہ قسم کے مویشی سے لیا جاسکتا ہے۔

ترقی نسل مویشیاں کی انجمن ہائے اس بارے میں بہت کچھ مفید کام کر رہی ہیں۔

کھاد کی حفاظت۔ کھاد زمین کی طاقت کو برقرار رکھنے اور پیداوار بڑھانے کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جیسا انسان کے لئے اناج۔ مویشی کے لئے چارہ اور بچوں کے لئے دودھ۔ لیکن ہمارے ملک کے زمیندار ایسی ضروری چیز سے اتنی کوتاہی اور ایسا تغافل روا رکھتے ہیں۔ کہ گوبر جیسی قیمتی کھاد کو جلا کر ضائع کردیتے ہیں۔ مویشی کا پیشاب (جو ایک بہترین کھاد ہے) بلا مصرف خیال کیا جاتا ہے۔ کھاد ڈھیروں کی صورت میں جمع کی جاتی ہے۔ جس سے اس کا کارآمد جز برسات کے پانی اور سورج کی گرمی میں ضائع ہوجاتا ہے محکمہ زراعت کی سرگرمیاں اس ضروری امر کی جانب خاص طور پر منعطف ہونی چاہئیں۔

امداد باہمی۔ امداد باہمی ایک اقتصادی۔ مساواتی، اور اخلاقی عالمگیر تحریک ہے جو زمیندار کاشتکار شاہ و گدا سرمایہ دار مزدور۔ تاجر و پیشہ ور۔ حاکم و محکوم ہر اعلےٰ اور ادنےٰ طبقہ کے لئے مفید اور فیض رساں تسلیم کی گئی ہے۔

کاشتکار کی اقتصادی امراض کا شافی علاج۔ زمیندار کی مشکلات کا بہترین حل اور ملک کی ترقی کا اولین

زینہ امداد باہمی اور صرف امداد باہمی ہے۔

ہندوستان اس بارے میں بہت خوش نصیب ہے۔ کہ اس کو خود اس کے متعلق کوئی تجربہ نہیں کرنا پڑا۔ ورنہ جن ممالک میں اس کا آغاز کیا گیا ہے۔ بہت مشکلات اور تکالیف کے بعد کامیابی نصیب ہوئی۔ اور ہندوستان ان ممالک کے حاصل کردہ مفید نتائج پر بھی عمل پیرا ہونے میں پس و پیش کر رہا ہے ۱۹۲۶ء میں پنجاب گورنمنٹ نے ایک سرکاری کمیشن بیکاری کے اسباب پر غور کرنے کے لئے مقرر فرمایا تھا۔ اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے۔ کہ "ملک کی موجودہ بڑھتی ہوئی بیکاری کا واحد علاج یہ ہے۔ کہ امداد باہمی کے ذریعے سے پیداوار میں اضافہ کر کے تعلیم یافتہ طبقہ کو کاشتکاری کی طرف مائل کیا جائے۔"

دنیا کے مدبر و طبّاع افراد "امداد باہمی" کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں۔ حضور ملک معظم جارج پنجم دام اقبالہٗ کا ارشاد گرامی ہے۔ کہ "امداد باہمی کو رائج کرنے سے ہندوستان کی زراعت کا مستقبل شاندار اور درخشندہ بن سکتا ہے۔"

اس وقت تک امداد باہمی کے زیر اثر مندرجہ ذیل اقسام کی انجمن ہائے کا اجرا عمل میں آچکا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ امداد باہمی ہماری تمام مشکلات کا بہترین حل ہے۔

(۱) **انجمن لازمی تعلیم**۔ ممبران کے بچوں کی تعلیم کا انتظام کرتی ہے۔

(۲) **انجمن امداد قرضہ**۔ ممبران کی ضرورت کے لئے قرضہ بہم پہنچانا اس انجمن کا پہلا مقصد ہے۔

(۳) **انجمن ثالثی**۔ مقدمہ بازی کے تباہ کن اخراجات سے بچانے اور تنازعات کا فیصلہ کرنے کیلئے۔

(۴) **انجمن اصلاح رسوم**۔ ناجائز اور فضول رسومات کی بیخ کنی کے لئے امداد باہمی کا بہترین کارنامہ ہے۔

(۵) **بچت و کفایت شعاری کی انجمن**۔ ممبران میں کفایت شعاری کے جذبہ اور احساس کا پیدا کرنا اس کے مقاصد سے ہے۔

(۶) **انجمن صحت و صفائی**۔ ممبران کو صفائی کے اصول پر کاربند کر کے صحت کی عمدگی رکھنا اس انجمن کے قواعد کا خلاصہ ہے۔

(۷) **ترقی نسل مویشیاں**۔ مقاصد نام سے ظاہر ہیں۔

(۸) **اشتمال اراضی**۔ زمین کے چھوٹے چھوٹے اور پریشان قطعات کو یکجا کر کے دوبارہ تقسیم کیا جاتا ہے۔ اور یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ بڑے سے بڑے اور یکجا کھیت ایک شخص کو مل سکیں۔

(۹) **ادائیگی معاملہ**۔ معمولی چندہ ادا کر کے ممبر بن جاتے ہیں ممبران کا معاملہ اراضی انجمن ادا کرتی ہے۔

(۱۰) **انفکاک اراضیات**۔ زمین مرہونہ کو فک کرانے کے لئے بھاری رقوم کا قرضہ لمبی میعاد کے

لئے دیا جاتا ہے۔

(۱۱) **ترقی زراعت** (۱۲) **بہم رسانی اشیا** (۱۳) **انجمن ہائے مستورات۔**

(۱۴) **انجمن معاوضۂ نقصان فصل** ۔ممبران کی فصل کو ناگہانی حادثات سے نقصان پہنچنے پر یہ انجمن ان کی امداد کر کے نقصان کی تلافی کرتی ہے۔

(۱۵) **فوجی انجمن ہائے** ۔محکمہ فوج امداد باہمی کی برکات سے مستفیض ہو رہا ہے۔

(۱۶) **انجمن ہائے دستکاراں** ۔ پیشہ ور دستکاروں کی انجمن ہائے نہایت اعلےٰ پیمانہ پر اور کامیابی سے چل رہی ہیں۔

(۱۷) **دکان ہائے آڑہت** ۔ کاشتکاروں کی پیداوار امداد باہمی کے اصول پر فروخت کی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ پنجاب میں ماڈل ٹاؤن سوسائٹی اور نارتھ ویسٹرن ریلوے کے ملازمین کی انجمن امداد باہمی کی شعاعوں کا ایک معمولی پرتو ہیں۔

اخیر میں مجھے پھر یہی عرض کرنا ہے کہ ملک کی ترقی کا مسلّمہ ذریعہ (امداد باہمی) بھی تعلیم کے بغیر اپنے مقاصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

پنجاب بنکنگ انکوائری کمیٹی کی رائے ہے۔کہ "انجمن ہائے قرضہ کی کامیابی کے لئے ممبران میں بیش از بیش تعلیم کی ضرورت ہے"۔

صدر کو اپریٹو لیگ امریکہ کا ارشاد ہے۔کہ "امداد باہمی کی بُنیاد تعلیم ہے"۔

پس بہی خواہانِ ملک و قوم کا اوّلین فرض یہ ہے۔اور ضرورت اس امر کی متقاضی ہے۔کہ وہ اپنی تمام تر توجہات امداد باہمی اور اس کی بُنیاد (تعلیم) کی جانب مبذول فرما کر ملک کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو ساحلِ مراد پر لا کر مادرِ وطن سے دعائیں لیں ÷

قیمتی باتیں

جو چیز تم اپنے لئے پسند نہیں کرتے۔اسے دوسرے کیلئے پسند نہ کرو۔

یاد رکھو۔ ہر چمکدار چیز سونا نہیں ہوتی۔

دیہات سُدھار کے متعلق چند مفید باتیں

(از جناب پنڈت دینا ناتھ صاحب اگنی ہوتری۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول ہمیر پور)

لوکل سلف گورنمنٹ

لارڈ رپن جو رومن کیتھلک مذہب کے پیرو تھے ۱۸۸۰ء میں وائسرائے مقرر ہو کر ہندوستان میں تشریف لائے۔ انہیں ہندوستانیوں سے بہت ہمدردی تھی اس لئے انہوں نے ایسی اصلاحات جاری کیں جن کا مدعا یہ تھا کہ ہندوستانی سیاسیات میں کچھ مہارت پیدا کر لیں اور اپنی غلطیوں سے فائدہ اٹھائیں۔

چنانچہ ۱۸۸۳-۸۵ء کے دوران میں ایسے قوانین بنائے گئے جن کی رُو سے لوکل سلف گورنمنٹ کا وجود عمل میں آیا یعنی ڈسٹرکٹ بورڈ قائم کئے گئے اور میونسپل بورڈوں کے اختیارات کو وسعت دی گئی اور ان دونوں کے اکثر ارکان ووٹوں کے ذریعے منتخب کئے جانے لگے۔ اور کوشش کی گئی کہ سرکاری اشخاص کی بجائے غیر سرکاری اشخاص ممبر مقرر ہوا کریں لیکن یہ تجربہ ناکامیاب رہا اور لوگوں نے اس میں زیادہ دلچسپی نہ لی۔ غیر سرکاری صدر اپنے فرائض کے ادا کرنے میں ناکام رہے کئی مقامات پر میونسپلٹیاں بند کر دی گئیں۔ آخر ۱۹۲۱ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ سکیم کے رائج ہونے پر لوکل سلف گورنمنٹ کی اہمیت لوگوں کے ذہن نشین ہوئی اسے وزرا کے ماتحت کر کے محکمہ منتقلہ میں شامل کیا گیا اور وزرا کو کونسلوں کا جوابدہ قرار دیا گیا۔ حق انتخاب میں توسیع کی گئی۔ بورڈوں کے اختیارات بڑھا دیئے گئے اور اب دوبارہ کوشش کی جا رہی ہے کہ صدر غیر سرکاری اشخاص ہوں یہ مقامی بورڈ اپنے اپنے رقبوں میں تعلیم۔ حفظان صحت۔ سڑکوں اور آب پاشی کے ذمہ دار ہیں اور لوگوں میں احساس شہریت پیدا کر رہے ہیں۔ یہ تو بڑے بڑے شہروں کی بابت مختصر ذکر ہے لیکن سرکار دولت مدار نے چھوٹے چھوٹے قصبوں میں ٹاؤن کمیٹیاں بنا کر صفائی اور صحت کا انتظام لوگوں کے اپنے ہاتھ میں دیدیا ہے۔ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اس کا رقبہ اٹھارہ لاکھ مربع میل یا ایک ارب ۱۶ ½ ایکڑ ہے۔ یہ رقبہ سلطنت جرمنی سے ات گنا جاپان سے گیارہ گنا اور برطانیہ سے پندرہ گنا ہے۔ اور اگر براعظم یورپ کے رقبہ میں سے روس کا رقبہ نکال دیا جائے تو وہ ہندوستان کے رقبہ ہی کے برابر ہے۔ ہندوستان میں ۷ لاکھ ۸۸ ہزار گاؤں اور صرف ۲۳۱۶ شہر ہیں۔ ہندوستان میں چھ سو چھوٹی بڑی دیسی ریاستیں بھی ہیں۔ کل دنیا کی آبادی ۱۷۰

کروڑ ہے اور ہندوستان کی آبادی ۳۳ کروڑ ہے یعنی دنیا کی کل آبادی کا ⅙ حصہ ہندوستان میں رہتا ہے۔
اور ہندوستان کی کل آبادی کا ۹/۱۰ حصہ گاؤں میں اور صرف ۱/۱۰ حصہ شہروں میں رہتا ہے ۔

رورل کمیونٹی کونسل

اب ہندوستانیوں کو صحیح معنوں میں طرز تمدن سکھانے کی غرض سے گاؤں میں اصلاحات کا پھیلانا ضروری ہے ۔ اس مطلب کے لئے ہر ضلع میں رورل کمیونٹی کونسل بنادی گئی ہے جن کی شاخیں ہر تحصیل میں بھی جاری کر دی ہیں ان کا مطلب یہی ہے کہ ہر ایک گاؤں میں لوگوں کی توجہ تعلیم ۔حفظان صحت اور دیگر فوائد بہبودی کی طرف کھینچی جائے تاکہ وہ ہر ممکن طریقہ سے اپنی سیاسی ۔ ذہنی ۔اخلاقی اور سوشل زندگی کو بہتر بنا سکیں ۔مسٹر برین اور انکی اہلیہ محترمہ نے جو کام ضلع گوڑگانوہ میں دیہات سدھار کے متعلق کیا ہے اس تھوڑے سے وقت میں اس کا مکمل ذکر کرنا ناممکن ہے لیکن ان کی کتابیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم گاؤں میں رہتے ہوئے بھی اپنی مشکلات کے سمجھنے اور ان کے دُور کرنے سے غافل ہیں حالانکہ ایک انگریز ہماری مشکلات کا صحیح حل بتلانے کیلئے ہر وقت تیار رہے اور اس کوشش میں ہے کہ ہم ہندوستانی اپنی حالت کو سدھار کر ایک صاف ستھرے اور متحمل فرض شناس شہری بن جائیں ۔

مسٹر برین نے اپنی کتاب (THE REMAKING OF VILLAG INDIA) میں دیہاتیوں کی بُری رسومات کا ذکر کیا ہے اور انہوں نے ضلع گوڑگانوہ میں اپنے لائق اور محنتی عملہ کی مدد سے ان تمام دقتوں کو دُور کرنے کی غرض سے جو ذرائع استعمال کئے ہیں ان سب کا مفصل ذکر اس کتاب میں پایا جاتا ہے ۔

گاؤں کی بُری رسُومات

اس علاقے میں یہ ایک اچھی رسم ہے کہ گوبر کے اُپلے نہیں بنائے جاتے اور عورتوں کا قیمتی وقت بے فائدہ ضائع نہیں کیا جاتا بلکہ گوبر کو کھیتوں میں ڈال کر کھاد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے لیکن نہایت افسوس سے ذکر کرنا پڑتا ہے کہ خدا کی مفت دی ہوئی اور اشد ضروری دو چیزوں یعنی ہوا اور پانی کا جائز استعمال نہیں کیا جاتا اور نہ ان سے پورا فائدہ اٹھایا جاتا ہے ۔بہت کم گھر ایسے ہیں جن کے ہر ایک کمرہ میں ہوا کی آمد و رفت کا مکمل انتظام ہو ۔عام زمینداروں کے گھروں کی بناوٹ ایسی ہوتی ہے کہ گھر کا ایک ہی دروازہ ہے اور کوئی سوراخ یا روشندان اس میں نہیں ہے ۔گھر کے اردگرد چار دیواری نہ ہونے کی وجہ سے عورتوں کو ہر ایک موسم میں اندر ہی رہنا اور سونا پڑتا ہے اور یہ بھی ناقص رواج دیکھنے میں آیا ہے کہ گرمیوں کے موسم میں بھی رات کے وقت

سونے سے پیشتر دروازوں کو مکمل طور پر بند کر لیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں عموماً دیکھنے میں آتا ہے کہ عورتیں ناک کو جو خدا نے ہوا کو جسم کے اندر داخل ہونے کا دروازہ بنایا ہے سونے چاندی کے زیوروں سے بند کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں اور چہرے کی خوبصورتی اس میں سمجھتی ہیں کہ نتھنوں کو مکمل طور پر بند کر دیا جائے تاکہ سانس بمشکل لیا جا سکے اور اس پر طرّہ یہ کہ گھونگٹ نکال کر تازہ ہوا کو بالکل جواب دیدیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس خوشگوار علاقہ میں جہاں ہر وقت تازہ پانی اور ہوا میسر ہے اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر آبادی کے باوجود بھی اس قدر تپ دق کا مرض روز بروز ترقی کر رہا ہے جس کی شہادت ہسپتال کے رجسٹروں سے بخوبی مل سکتی ہے۔

۲۔ پانی کے ذخیروں اور چشموں کو صاف نہ رکھنے سے اُن میں میل کچیل جمع ہو جاتی ہے اور مضرِ صحت جراثیم کو کافی خوراک ملنے سے ان کی تعداد بہت بڑھ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے موسم برسات کے بعد گاؤں میں عموماً ملیریا وغیرہ کی بیماری پھیل جاتی ہے اور گھروں میں خوشی و آرام کی بجائے رنج و تکلیف کا دَور دَورہ ہو جاتا ہے جس کی وجہ قدرتی نہیں بلکہ ہماری اپنی غفلت اور لاپرواہی ہے۔

۳۔ عموماً گھروں میں پاخانہ اور غسل خانے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا اس لئے عورتیں اور بچے گھروں کے اردگرد جھاڑیوں میں چھپ کر رفع حاجت کرتے ہیں جس کی بدبو سے گھروں میں بیماری پھیل جاتی ہے۔ بچوں کی صحت کو نقصان پہنچتا ہے مثلاً آنکھوں کا دُکھنا۔ اسہال و پیچش وغیرہ۔

۴۔ علاوہ ازیں بیماری کا مناسب علاج نہیں کیا جاتا بلکہ جادو ٹونے کے ذریعے سے بیمار کی بیماری کو اَور بڑھا دیا جاتا ہے اور بیماری کے زیادہ بڑھ جانے پر نیم حکیموں کا علاج کرا کر مریض کو قریب المرگ کر دیا جاتا ہے پھر ڈاکٹری علاج کو بدنام کرنے کی غرض سے ہسپتال میں لاکر رسماً دکھانے کی غرض سے ڈاکٹر صاحب کا علاج شروع کیا جاتا ہے ابھی کچھ افاقہ نہیں ہونے پاتا کہ ڈاکٹر صاحب سے مایوسی کی باتیں کر کے مریض کو واپس گھر لے جاتے ہیں۔

۵۔ بچوں کی ولادت کے وقت جو غفلت اور لاپروائی کی جاتی ہے اُس کا بیان ہی نہیں ہو سکتا۔ زچہ اور بچہ کو ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا جاتا ہے ان کی صفائی اور خوراک کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا۔ تازہ ہوا کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ ان حالات میں کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ بچہ اور زچہ کی صحت قائم رہ سکے۔

تعلیمی حالت

۶۔ مختلف ممالک میں مدارس میں تعلیم پانے والے طلبا اور ملک کی کل آبادی کا تناسب مندرجہ ذیل ہے:۔

جاپان = ۳۸½ فیصدی   برطانیہ = ۲۹ فیصدی
ڈنمارک = ۳۵½ ،   فرانس = ۲۸ ،
جرمنی = ۲۹½ ،   امریکہ = ۲۷½ ،
ہندوستان = ۳½ ،

ہمارے ملک میں تعلیم کی بہت کمی ہے لیکن صوبہ بھر میں یہ ضلع باقی تمام اضلاع کی نسبت تعلیمی حالات کے لحاظ سے بہت پیچھے ہے یہاں سرکار دولت مدار کے اس قدر روپیہ خرچ کرنے کے باوجود بھی تعلیم سے پورا فائدہ نہیں اُٹھایا جاتا۔ بہت سے ایسے بچے ہیں جنہوں نے کبھی سکول کا مُنہ بھی نہیں دیکھا اس جدوجہد کے زمانے میں جبکہ تمام ممالک اس کوشش میں ہیں کہ ان کے سو فیصدی بچے تعلیم یافتہ ہوں یہاں حالت ہی اس کے برعکس ہے۔ بچوں کو تعلیم کی طرف مائل کرنے کی بجائے انہیں تعلیم سے نفرت دلائی جاتی ہے۔ اس تحصیل میں اس علاقہ کے باشندوں کی فوجی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مہربان گورنمنٹ نے ہائی سکول قائم کیا ہے ساتھ ہی زمینداروں کے لڑکوں سے نصف فیس لی جاتی ہے۔ پھر بھی آپ خیال فرمائیں کہ کتنے فیصدی بچے اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم کا تو یہاں کسی کو خیال ہی نہیں شائد ساری تحصیل میں ایک یا دو گرلز سکول ہونگے۔ اور ان میں بھی لڑکیوں کی بہت کم تعداد دیکھنے میں آتی ہے۔

والدین کا فرض

والدین سمجھتے ہیں کہ ان کا فرض صرف لڑکی کی شادی کر دینا ہے۔ ان کے دل میں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ شادی سے پہلے دیکھ لیں کہ آیا ان کی لڑکیاں خانہ داری کے بوجھ کے برداشت کرنے کے قابل ہیں یا نہیں؟ اور آیا وہ لڑکا جس کے ساتھ لڑکی کی شادی ہوگی اس بوجھ کو سنبھال سکتا ہے یا نہیں؟ اور اپنے فرائض کو پورے طور پر سمجھتا ہے یا نہیں؟ گُڈے اور گڑیوں کی شادی سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا اور عمر رسیدہ مرد کے ساتھ کم سن لڑکی کو ٹانک دینے سے سوائے مصیبت کے اور کچھ دیکھنے میں نہیں آتا۔

اب سوال یہ ہے کہ ان بُرائیوں کو روکنا اور دُور کرنا کس کا فرض ہے؟ کیا گاؤں کے بے علم اور جاہل باشندے جو رواج کے غلام ہیں ان کا فرض ہے یا تعلیم یافتہ فرقہ کا جو اپنا اور دوسروں کا بھلا بُرا سوچ سکتا ہے؟ ہماری مہربان گورنمنٹ نے اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ اس ملک سے بُری رسومات دُور کرنا ایک ضروری فرض ہے اپنی رعایا کے ہر ایک بشر کو موقع دیا ہے کہ وہ اپنے فالتو وقت کا اپنے ان پڑھ بھائیوں کو راہِ راست پر لانے کے لئے اپنی زندہ مثال یا نصیحت سے پورا فائدہ اُٹھائے نہ کہ ان کو گمراہ کرکے اندھیرے

میں چھینک دے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے پریذیڈنٹ صاحب بہادر اس بات پر اکثر زور دیا کرتے ہیں کہ ہر ایک ذیل میں رورل کمیٹیاں بن جائیں جو تحصیل کمیٹی کے ممبران کے تجربات اور نصائح سے فائدہ اٹھا کر ہر ایک گاؤں میں ہر ایک فرد بشر کی طبیعت کا میلان بُرائی سے ہٹا کر نیک اور مفید کاموں کی طرف لگائیں یہ معمولی کام نہیں اور نہ ہی ایک دن میں ہو سکتا ہے ۔ مکان کا بنانا اور پہاڑی کی چوٹی پر پہنچنا مشکل ہے لیکن مکان کا گرانا اور پہاڑی سے اُترنا آسان ہے ۔ اسی طرح ان نیک کاموں کے واسطے لگاتار کوشش کی ضرورت ہے کیونکہ یہ ہمارا اپنا کام ہے ۔ جب تک ہم اپنے کاموں کو بھی پوری طرح نہیں کر سکتے ۔ تو دوسروں کے مشکل کاموں میں ہاتھ ڈالنے سے کیا فائدہ ؟

اخیر میں مَیں استدعا کرتا ہوں کہ ہر ایک ممبر ضرور کسی نہ کسی نیک کام میں دلچسپی لے اور اپنے مفید تجربات سے دوسروں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرے ۔

انسدادِ رسُومات بد

۱ ۔ گھر میں تازہ ہوا کے آنے اور گندی ہوا کے خارج ہونے کا مکمل انتظام ہونا چاہیئے ۔ ہر ایک کمرہ میں کھڑکیاں اور روشندان رکھے جائیں ۔ تازہ ہوا کا خوف جو جاہل لوگوں کے دلوں میں گھر کر چکا ہے باہر نکال دیا جائے ۔ اور مضرِ صحت زیورات کا ترک کر دینا لازمی امر ہے ۔

۲ ۔ لوگوں کی توجہ باؤلیوں کو صاف سُتھرا رکھنے کی طرف مبذول کرائی جائے اور ذیلدار اور مدرسہ کے استاد اصحاب کو پانی کے ذخیروں کے صاف رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے ۔ پینے کے پانی کا چشمہ علیحدہ ہونا چاہیئے ۔ اور لوگوں کو وہاں نہانے اور کپڑے دھونے سے منع کر دینا چاہیئے ۔

۳ ۔ لوگوں کو ہدائت کی جائے کہ بیماری کی حالت میں فوراً نزدیک کے ہسپتال میں جا کر باقاعدہ علاج کرانا چاہیئے ۔ مریض کا جس طرح باقاعدہ اور خاطر خواہ علاج ہسپتال میں ہو سکتا ہے گھر پر نہیں ہو سکتا اگر حکیم سے ہی علاج کرانا منظور ہو تو لائق حکیم اور وید کی تلاش کرنا ضروری ہے نیم حکیم اور جادو ٹونے کرنے والوں سے پرہیز کرنا چاہیئے ۔

۴ ۔ بچہ کی ولادت کے وقت ہسپتال کی دایہ کو بلا لینا چاہیئے ۔ یا دائیوں کی ٹریننگ کا مناسب انتظام کیا جائے ۔ تاکہ ہر جگہ مناسب طور پر بچہ کی پیدائش کے وقت زچہ اور بچہ کا خاطر خواہ خیال رکھا جائے ۔

۵ ۔ بچوں کو نزدیک کے سکول میں بھیجکر تعلیم سے پورا فائدہ اُٹھانا چاہیئے ۔ اور کوشش کرنی چاہیئے

کہ علاقہ کے سو فیصدی بچے سکولوں میں بیٹھ کر لکھنا اور پڑھنا سیکھ جائیں۔ سکول کا وقت ضرورت کے مطابق تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

۶۔ شادی کے بارے میں شاردا ایکٹ پر عمل درآمد کیا جائے۔ اسی سے ہماری بہت سی سوشل برائیوں کا انسداد ہو سکتا ہے۔

۷۔ گاؤں کے باہر بہت دور فاصلہ پر رفع حاجت سے فارغ ہونا چاہئے۔ اور پاخانہ کو مٹی یا ریت سے ڈھانپ دیا جائے۔ جن گاؤں میں خاکروب نہ ہوں اور عورتیں گھروں سے باہر نہیں جا سکتیں انہیں چاہیئے کہ گھر کے نزدیک کھیت میں ایک خندق کھود کر اس کے ارد گرد ایک عارضی پردہ لگوالیں اور گھر میں اصول بنا دیں کہ رفع حاجت کے بعد پاخانہ کو مٹی یا ریت سے ڈھانپ دیا جائے۔ ایک خندق کے بھر جانے پر دوسری خندق کھود دی جائے۔ اور اسی پردہ کو وہاں سے اٹھا کر نئی خندق کے ارد گرد لگا لیا جائے۔ اگر ہر ایک گھر میں ایسا انتظام ہو جائے تو مکانوں اور گاؤں کا گرد و نواح صاف ستھرا رہ سکتا ہے۔ عورتوں اور بچوں کی صحت بھی ٹھیک رہتی ہے اور اس پر چنداں خرچ بھی نہیں ہوتا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ان باتوں کو عملی جامہ پہنایا جائے۔

نمونے کے گاؤں کی ضرورت

انگلستان اور یورپ میں امیر لوگ فرصت کے دنوں میں سیر و تفریح اور کچھ دنوں کے قیام کے لئے دیہات میں چلے جاتے ہیں۔ آب و ہوا کی تبدیلی اور قدرتی مناظر سے فائدہ اٹھا کر پھر اپنے کاروبار کے لئے شہروں میں آجاتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں گاؤں کے باشندے بھی فراغت ملنے پر تبدیلی آب و ہوا کے لئے کسی دوسرے میدانی شہر یا متبرک جگہ یا پہاڑی بستی ہی کا رُخ کرتے ہیں۔ کیونکہ گاؤں میں کوئی تفریح طبع کا سامان نہیں ملتا۔ سوائے شکستہ جھونپڑوں۔ گندے مکانات۔ گرد و نواح میں بکھرے ہوئے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر اور جہالت پسند اور اپنی گری ہوئی حالت پر ناز کرنے والے لوگوں کے اور کچھ دیکھنے میں نہیں آتا۔ نہ وہاں کوئی باغیچہ نہ اعلےٰ درجہ کا سکول نہ لائبریری اور نہ کوئی کلب نہ ڈاک خانہ و شفاخانہ نہ بیطار خانہ نہ کوئی بنک نہ زراعتی فارم اور نہ کسی خاص دستکاری کا شغل ہے غرضیکہ کوئی بھی ایسی چیز دیکھنے میں نہیں آتی جس سے ایک تعلیم یافتہ آدمی دل لگا کر کچھ دن گاؤں میں قیام کر سکے یہی خاص وجہ ہے کہ ہر ایک خواندہ آدمی چاہتا ہے کہ گاؤں کی بجائے کسی شہر میں ہی مکان بنا کر رہے۔ اس رَو کو روکنے کے لئے بہت ضروری ہے کہ لوگوں کی طبیعت کے میلان کو گاؤں کے سدھار کی طرف لگایا جائے

اور ایسی اصلاحات رائج کی جائیں جن سے ہمارے گاؤں بھی انگلستان کے گاؤں کی طرح صحت افزا اور دلکش بن جائیں تاکہ تعلیم یافتہ اور متمول لوگ بھی ان میں بآرام اپنی فرصت کا وقت گزار سکیں۔ اخیر میں استدعا کی جاتی ہے کہ آجکل کے امن وچین اور ترقی کے زمانہ میں ہر ایک آدمی کو ہمہ تن کوشش کرنی چاہیئے کہ اپنے گاؤں میں مذکورہ بالا مفید باتوں کو رائج کرے تاکہ یہ تمام مفید باتیں عملی جامہ پہن کر تمام ملک اور قوم کے لئے بہبودی و ترقی کا باعث ہوں اور ملک میں رنج و مفلسی کی بجائے شادمانی اور خوشحالی کا دَور دَورہ ہو اور دنیا کی مہذب و شائستہ قوموں کے ساتھ ساتھ ہم بھی راہ ترقی پر گامزن ہوں کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

خدا نے آجتک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

خمخانۂ ریاض

وعدہ کبھی سچا کوئی کرتا ہی نہیں ہے
اندیشۂ فردا تو گزرتا ہی نہیں ہے

دامن کی شکن دور سے لیتی ہے بلائیں
بل یار کے ابرو کا اترتا ہی نہیں ہے

دل سے ہے تو مرے سینے کے پھر داغ ہی اچھے
کمبخت ابھارے سے ابھرتا ہی نہیں ہے

سب جو لگئے اُسکو ترے عہدِ ستم میں
اب شکوۂ گردوں کوئی کرتا ہی نہیں ہے

جو اڑنے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں قفس سے
پر بیکسوں کے صیاد کترتا ہی نہیں ہے

اک خم ہے کہ سو بار اُبل جاتی ہے جس سے
اک جام ہمارا ہے کہ بھرتا ہی نہیں ہے

کیا چیز ہے اے بادہ کشو! موسم گل بھی
اس دور میں توبہ کوئی کرتا ہی نہیں ہے

اپنے ستم و جور سے لاکھ سکھا تو
درباں سے تمہاری کوئی ڈرتا ہی نہیں ہے

آلودۂ تہمت ہو وہ کیا رنگِ حنا سے
جو ہاتھ کبھی خون سے بھرتا ہی نہیں ہے

الجھن کبھی مٹتی نہیں یہ دل ہے کہ یارب!
گیسو ہے کسی کا کہ سنورتا ہی نہیں ہے

چھپ جاتی ہے کہ اے آہ بلا نے تو اثر کو
ڈرتا ہے وہ گردوں سے اترتا ہی نہیں ہے

نکھرا ہوا جب تک نہ کوئی بام پر آ دے
رنگِ شفق شام نکھرتا ہی نہیں ہے

تاریخ و سِیَر

فہرستِ مضامین

کلامِ نفیس

(از جناب سید یوسف صاحب نفیس بنگلوری تلمیذ جانشین امیر مینائی حضرت جلیل مدظلہ)

ارضِ حرم میں سنتے ہیں ہے قلت آب کی ساقی وہاں بھی نہر بہا دے شراب کی

ساقی لگا دے برف میں بوتل شراب کی بے چین کر رہی ہے تپش آفتاب کی

ڈورے نہیں ہیں آپ کی آنکھوں میں سرخ سرخ دامن میں جو رکھے ہیں یہ شاخیں گلاب کی

رحمت نے بڑھ کے میرے گناہوں کو لے لیا کیا دم بخود کھڑی رہی میزان حساب کی

ہے خالِ رخ سے عارضِ روشن کی آب و تاب عزت بڑھائی ذرہ نے کیا آفتاب کی

ساقی کی آرزو میں جو میں اشکبار ہوں ابرِ مژہ سے ہوتی ہے بارش شراب کی

نعمت جو بادہ خواروں کی یوں ہو تو لطف آئے دل کی جگہ بغل میں ہو بوتل شراب کی

دریا ترے کرم کا جو آئے گا جوش پر بہتی پھریں گی حشر میں فردیں حساب کی

کیا مل گئی ہے خاک میں موتی سی آبرو مٹی خراب ہو گئی چشمِ پُر آب کی

ہے دخترِ رز سے چوری چھپے ہم کو ساز باز یہ بھی ہے اک امنگ نئے [illegible] شباب کی

خمخانۂ جلیل کا یہ فیض ہے نفیس
ٹپکی ہیں ابرِ کلک سے بوندیں شراب کی

شہر آگرہ
جہانگیر کے عہد میں

(از جناب ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ایم اے پی ایچ ڈی)

اکبر اور جہانگیر کے عہد سلطنت میں یورپین سیاح اور تاجر کثرت سے ہندوستان آتے تھے اور یہاں کے اکثر بڑے بڑے شہروں میں انگریزوں، پرتگیزوں اور ولندیزوں کی تجارتی کوٹھیاں تھیں۔ انہی یورپینوں میں ایک شخص فرانسسکو پلسیرٹ ہالینڈ کا رہنے والا آگرے میں ایک تجارتی کوٹھی کا منیجر تھا۔ یہ شخص جہانگیر کے زمانے میں ۱۶۱۸ء میں ہندوستان آیا اور تقریباً آٹھ برس آگرے میں مقیم رہا۔ ایک مختصر سی کتاب میں جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے اس نے اپنے زمانۂ قیام کے تجارتی حالات کی رپورٹ لکھی ہے۔ اسی میں ایک باب شہر آگرہ پر بھی ہے اور گو وہ مختصر ہے تاہم چونکہ ایک یورپین کے قلم سے ایک اپنی آنکھوں دیکھی چیز کا بیان ہے لہذا تاریخی نکتۂ نظر سے اس کا مطالعہ فائدہ اور دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ہم خاص اس باب کے مطالب کو فائدۂ عام کی غرض سے یہاں پر دُہراتے ہیں:-

شہر آگرہ ۲۸، ۵ء۷۶ عرض بلد پر واقع ہے، وسعت میں یہ شہر بیحد بڑا ہے لیکن عمارات اکثر کہنہ ہیں اور شہر کے گرد فصیل نہیں ہے، بازار اور مکانات بھی کسی باقاعدہ ترتیب سے نہیں بنے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے امرا اور شہزادوں کے عالیشان محل جابجا موجود ہیں لیکن وہ اکثر گوشوں اور گلیوں میں پوشیدہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شہر آگرے کی ترقی آناً فاناً ہوئی۔ پہلے وہ علاقہ بیانہ میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اکبر نے ۱۵۶۶ء میں اسے اپنی رہائش کے لئے پسند کیا اور جمنا کے کنارے اُس نے ایک عالیشان قلعہ تعمیر کرایا۔ جمنا آگرے کے پاس بہتی ہے۔ اور چوڑائی میں تقریباً نصف میل ہے۔ باغات کی شادابی کی وجہ سے شہر ایک شاہی چمنستان معلوم ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے لئے کوئی قطعۂ زمین جو اُسے پسند ہو یا اُس کی ضروریات کے لئے موزون ہو خرید سکتا ہے۔ اسی وجہ سے شہر میں بہت بڑے بڑے قابل دید بازار نہیں ہیں، جیسا کہ لاہور، برہان پور، احمد آباد یا دوسرے شہروں میں ہیں۔

شہر میں آبادی بہت گنجان ہے اور ہندو مسلمان امیر اور غریب سب ملے جلے رہتے ہیں۔ اگر کہیں بادشاہ عصر (جہانگیر) بھی اپنے والد (اکبر) کی طرح اپنی قیامگاہ یہیں رکھتا تو شہر آگرہ دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتا۔ لیکن اب بھی شہر کی روز افزوں ترقی کا یہ حال ہے کہ جو دروازے اکبر نے شہر کی حفاظت کی خاطر تعمیر کرائے تھے (یعنی مادری یا مداری دروازہ، چہار سو دروازہ، نیم دروازہ، پٹو دروازہ اور نوری دروازہ وغیرہ) وہ اب شہر کے وسط میں

آ گئے ہیں اور اُن کے باہر جو نئی عمارتیں بنی ہیں وہ شہر کے اندر والی رقبے سے تین گُنا جگہ میں پھیلی ہوئی ہیں۔
شہر کا عرض اس کے طول سے بہت کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص نے دریا کے کنارے پر مکان بنوانے کی کوشش کی ہے اور بالخصوص اُمرا کے بیش بہا اور عالیشان محلات تو سب دریا کے کنارے پر ہیں جس کی وجہ سے وہاں کا منظر بیحد خوشنما ہو گیا ہے، یہ عمارتیں دریا کے کنارے کنارے چھ کوس تک چلی گئی ہیں، ہم ان میں سے بڑے بڑے محلات کے نام ترتیب وار بتلاتے ہیں:۔
شمال کی طرف سے شروع کر کے (دریا کے دہنے کنارے پر) پہلے بہادر خاں کا محل ہے، بہادر خاں قلعۂ اسیر گڑھ کا حاکم تھا جو برہان پور سے پانچ کوس کے فاصلے پر ہے، اس کے بعد راجہ بھوج کا محل ہے جو رائے رتن موجودہ گورنر برہان پور کا باپ تھا۔ رائے رتن پنجہزاری منصب رکھتا ہے۔ اس کے بعد ابراہیم خاں (سہ ہزاری) کا محل ہے، پھر رستم خاں قندھاری (پنجہزاری) کا، پھر راجہ کشن داس (سہ ہزاری) کا، پھر اعتقاد خاں (پنجہزاری) کا جو آصف خاں کا سب سے چھوٹا بھائی ہے، پھر شہزادہ خانم (جہانگیر کی بہن) کا جو مظفر خاں شاہ گجرات سے بیاہی تھی، اس کے بعد جہانگیر کی ماں کا، اس کے بعد خواجہ محمد طاہر (؟) دو ہزاری کا، پھر خواجہ بنسی کا جو پہلے سلطان خرّم کا داروغۂ مطبخ تھا، اس کے بعد وزیر خاں پنجہزاری کا، اس کے بعد شیخ پورہ (یا سکھ پورہ) ایک بہت وسیع چار دیواری ہے جس میں شاہ ماضی (اکبر) کی بیگمات رہتی ہیں۔ پھر اعتبار خاں خواجہ سرا کے محلات ہیں جو اکبر کی وفات کے وقت آگرے کا گورنر تھا، اس کے بعد باقر خاں سہ ہزاری کا محل ہے پھر مرزا ابو سعید ہزار و پانصدی کا، پھر آصف خاں (ہشت ہزاری) کا جو ان تمام محلات میں سب سے شاندار اور بیش قیمت ہے پھر اعتماد الدولہ (پنجہزاری) کا، پھر خواجہ عبد (ابو؟) الحسن پنجہزاری کا، پھر رقیہ سلطان بیگم[1] (جہانگیر کی بہن) کا،
اس سے آگے شاہ برج (قلعۂ آگرہ) شروع ہوتا ہے جس کی دیواریں سُرخ پتھر کی بنی ہوئی ہیں اور بلندی میں تقریباً اٹھارہ گز ہیں۔ قلعہ کا گھیر دو کوس کے برابر ہے۔ عمارت کی شکل اور بیش قیمتی کے لحاظ سے وہ دنیا بھر کی بہترین عمارتوں سے سبقت لے گیا ہے۔ اس کا جائے وقوع ایک اوسط درجے کی بلند زمین پر ہے اور ہر سمت سے اس کا منظر خوشنما ہے لیکن بالخصوص دریا کی جانب کا رُخ نہایت پُرعظمت ہے اس طرف اس کی عمارت پتھر کی جالیوں سے مزیّن ہے اور کھڑکیوں پر سُنہری کام کیا گیا ہے۔ بادشاہ جب ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشا دیکھتا تھا تو انہی کھڑکیوں میں آ کر بیٹھتا تھا۔ قلعے کے اندر تھوڑے فاصلے پر شاہی غسلخانہ ہے جو نہایت قیمتی سفید سنگ مرمر کا بنا ہے۔ اس کے اندر نشست کی چوکیاں زمین سے اونچی بنائی گئی ہیں۔ ان کے اوپر گنبد بنے ہیں جن کے باہر کی جانب سونا منڈھا ہوا ہے۔ ان گنبدوں کا منظر دُور سے اور نزدیک سے شاہانہ جاہ و جلال پر دلالت کرتا ہے۔ اس

[1] لیکن تاریخ میں رقیہ سلطان بیگم اکبر کی کسی بیٹی کا نام نہیں ملتا

سے پرے نور جہاں بیگم کا محل ہے۔ قلعے کی چار دیواری کے اندر کی سب جگہ شاہی محلات سے پُر ہے اور کہیں کوئی جگہ خالی نہیں۔ انہیں محلات میں مریم مکانی (جہانگیر کی والدہ) کا بھی محل ہے۔ تین محل خاص بادشاہ کے ہیں جن میں سے ایک کا نام اتوار ہے۔ ایک کا منگل اور ایک کا سنیچر، ان میں سے جو محل جس دن کے نام پر ہے اس دن کو بادشاہ اُس محل میں سوتا ہے۔ ایک پانچواں محل بنگالی محل کے نام سے موسوم ہے اس میں مختلف ممالک اور اقوام کی خواتین رہتی ہیں۔ قلعہ اپنی چار دیواری کے اندر ایک شہر کی مانند ہے جس میں بازار ہیں، دکانیں ہیں اور قلعے سے اس کی کوئی مشابہت معلوم نہیں ہوتی لیکن جب اسے باہر سے دیکھا جائے تو وہ ناقابل تسخیر نظر آتا ہے۔

قلعے سے گزر کر آگے نخاس ہے یہ ایک بہت بڑی منڈی ہے جہاں صبح کے وقت گھوڑے، اونٹ، بیل، خیمے، سوتی کپڑے اور بہت سی دوسری اشیا فروخت ہوتی ہیں، اس سے آگے بعض اور امراء کے مکان ہیں۔ جن میں خان اعظم کے بیٹے مرزا عبد اللہ (سہ ہزاری) کا مکان ہے، پھر آغا نور (سہ ہزاری) کا جو شاہی افواج کا سپہ سالار ہے۔ پھر جہان خاں (دو ہزاری) کا۔ پھر مرزا خرم پسر خان اعظم (دو ہزاری) کا۔ پھر مہابت خاں ہشت ہزاری کا۔ پھر خان عالم (پنجہزاری) کا۔ پھر راجہ بھاؤ سنگھ (سہ ہزاری) کا۔ پھر راجہ مان سنگھ آنجہانی (پنجہزاری) کا۔ پھر راجہ مادھو سنگھ (دو ہزاری) کا۔

دریا کے دوسرے کنارے پر شہر سکندرہ[1] ہے جس کی عمارتیں بہت خوبصورت ہیں اور بہت بارونق ہے۔ اس میں زیادہ آبادی دکاندار بنیوں کی ہے۔ پورب سے اور بھوٹان کے پہاڑی علاقے سے جتنا تجارتی مال آگرے میں آتا ہے وہ سکندرے میں سے گزرتا ہے اس میں سوتی مال بنگال سے آتا ہے اور ریشم پٹنہ سے، اس کے علاوہ سنبل رومی مستگی زنگار، بادیاں، سونٹھ اور ہزارہا قسم کی دوائیں اور جڑی بوٹیاں ہیں جن کی تفصیل احاطۂ بیان سے باہر ہے۔ یہاں نور جہاں بیگم نے ایک سرائے تعمیر کرائی ہے۔ اُس کی طرف سے یہاں سرکاری عہدہ دار متعین ہیں جو ہر قسم کے تجارتی مال پر محصول وصول کرتے ہیں۔ محصول ادا کرنے کے بعد سارا مال کشتیوں پر لاد کر آگرہ روانہ کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر قسم کا غلہ، گھی اور دیگر اشیائے خوردنی پورب سے آگرے میں آتی ہیں۔ اگر یہ سارا مال باہر سے نہ آئے۔ تو آگرے کے لوگوں کو خوراک بہم نہ پہنچ سکے اور شاید وہ فاقوں سے ہلاک ہو جائیں۔ اس تمام مال کے درآمد کی وجہ سے سکندرہ میں آمد و رفت بکثرت رہتی ہے۔ یہ شہر طول میں دو کوس تک چلا گیا ہے لیکن اس کا عرض کچھ ایسا زیادہ نہیں۔ اس میں بہت سے خوشنما باغ ہیں جن میں سے ایک باغ سلطان پرویز کا ہے ایک نور جہاں بیگم کا اور ایک اعتماد الدولہ کا جو آصف خاں اور نور جہاں کا والد تھا۔ وہ یہیں مدفون ہے اور اس کا مقبرہ آجکل زیر تعمیر ہے۔ اس پر ساڑھے تین لاکھ روپیہ خرچ آچکا ہے اور مکمل ہونے تک تخمیناً دس لاکھ کا خرچ اس پر اور ہوگا سو و باغ اور ہیں جو خود

---

[1] یہ سکندرہ وہ نہیں ہے جہاں اکبر کا مقبرہ ہے۔

بادشاہ کے ہیں۔ ایک کا نام چار باغ ہے اور دوسرا موتی محل۔ بہت سے اَور بھی ہیں جن کے گرد خوبصورت چار دیواریں اور عالیشان دروازے بنے ہوئے ہیں اور باہر سے یہ باغات قلعے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے شہر بہت بازیب ہے۔ ہندوستان کے امرا اپنی عظمت و شان میں ہمارے ہاں کے امرا سے بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ باغات جیتے جی اُن کی تفریح گاہیں ہوتی ہیں اور مرنے کے بعد وہ انہیں میں دفن ہوتے ہیں اور بسا اوقات وہ اپنے شاندار مقبرے اپنی زندگی ہی میں تعمیر کرا لیتے ہیں جن کی عمارت عموماً باغ کے عین وسط میں ہوتی ہے۔ اس قسم کے مقبروں کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ ان کو بالتفصیل بیان کرنا میرے لئے ممکن نہیں۔"

گلستانِ سخن

یہ مقدر ہے کہ بربادِ محبت میں ہوں — آپ سے کوئی شکایت ہے، نہ شکوا مجھ کو
مرے ساقی کے تصور نے یہ آنکھیں بخشیں — اب تو قطرہ بھی نظر آتا ہے دریا مجھ کو

داؤد قادری

ڈوبا ہوا ہوں یاد میں ہوش ہے گم فراق میں — مستِ مئے خیال کی آپ کو کچھ خبر نہیں
شعلۂ شمع طور نے پردے جو تھے اٹھا دئے — سوختۂ جمال کی آپ کو کچھ خبر نہیں
گردشِ چشم فتنہ گر نقشِ حیات و موت ہے — موت کی اور وصال کی آپ کو کچھ خبر نہیں
زلفِ سیاہ کے وصف میں ہوتی ہیں موشگافیاں — کھنچتی ہے کھال بال کی آپ کو کچھ خبر نہیں

واقف جبلی

تعلیم جغرافیہ میں کھلے میدان میں کام کرنے و سیر و سیاحت کرنے کی اہمیت

(جناب لمائے صاحب لالہ سوہن لال بی اے۔ بی ٹی۔ پی ای ایس سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور)

جغرافیہ مشاہدہ کا علم ہے۔ مقامی جغرافیائی حالات جن کو ہم مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ اس پر جغرافیہ کی تعلیم مبنی ہے۔ اگر بنیاد کمزور ہو۔ تو عمارت مستقل اور مضبوط نہیں بن سکتی۔ ہم دوسرے ملکوں کا جغرافیہ صرف اپنے گرد و نواح کے جغرافیئے کے مطالعہ ہی سے سمجھ سکتے ہیں۔ جتنا ہم اپنے جغرافیہ سے زیادہ واقف ہونگے۔ اتنا ہی ہم دوسرے مقامات کا جغرافیہ سمجھینگے۔

لاہور کے سکولوں کا معائنہ کرتے وقت میں نے اکثر طلباء سے پوچھا ہے۔ کہ لاہور کے نقشہ پر فیروزپور والی سڑک دکھلائیں۔ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ لیکن جب میں نے ان سے پوچھا۔ کہ اپنے سکول سے فیروزپور کو جانے والی سڑک دکھائیں۔ تو کوئی لڑکا نہیں دکھا سکا۔ اگر طلبا نقشہ سے اصلی سڑکیں نہ دکھلائیں۔ تو نقشہ کا کیا فائدہ؟ وجہ یہ ہے کہ لڑکوں کو اصلی سڑکیں دکھانے سے پہلے اُن کو چھپا ہوا نقشہ دکھلایا جاتا ہے۔ جب تک کہ ہم اصلی نہریں۔ ریلیں۔ سڑکیں۔ دریا۔ عمارات اور سکول سے ان کا محل وقوع نہ دکھائیں لڑکے نقشہ کا صحیح مفہوم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ مقامی جغرافیہ پر اہمیت دینے سے ہم لڑکوں کو نقشہ سمجھنے کے قابل بنا دینگے۔ طلبا مقامی جغرافیہ کا مطالعہ کرنے سے جغرافیہ کے اصول سمجھ سکتے ہیں۔

نباتات اور آب و ہوا کا انسان کے پیشوں پر اثر طلبا ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔ جب تک کہ اس کا اثر اپنے گرد و نواح میں نہ دیکھ لیں۔ ان کو مختلف قسم کی مٹی اور ان فصلوں کا جو اس مٹی میں پیدا ہوتی ہیں درست تصوّر نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ ایسی مٹی خود نہ دیکھ لیں۔ زبانی رٹ لینے سے کہ گندم کے لئے چکنی زرخیز مٹی اور کپاس کے لئے کالی مٹی کی ضرورت ہے۔ کچھ فائدہ نہیں جب تک کہ ایسی مٹی کو دیکھنے کا موقع نہ ملے۔ لڑکوں کو موسموں کی تبدیلی کے اسباب ہرگز سمجھ میں نہیں آسکتے جب تک کہ عمودی چھڑی کے سایہ کی مدد سے وہ یہ خود معلوم نہ کریں۔ کہ دوپہر کے وقت سورج ہمیشہ ایک ہی بلندی پر نہیں رہتا۔ کبھی یہ آسمان میں بہت

اونچا ہوتا ہے اور کبھی بہت نیچا۔

تعلیم کا منشا زندگی کے لئے تیار کرنا اور عمدہ شہری بنانا ہے۔ جغرافیہ اس مقصد کے حصول میں باقی مضامین سے زیادہ مدد دیتا ہے۔ پرائمری سکولوں میں سیاست مُدن (Civics) پڑھانے اور اس طرح طلبا میں نیک شہری بننے کی بُنیاد ڈالنے کے لئے مقامی جغرافیہ خاص ذریعہ ہے۔ گرد و نواح کے کھیتوں میں جاکر اُستاد سڑکوں، پلوں ریلوں۔ نہروں اور پانی کے تالابوں کی اہمیت طلبا کے دل پر نقش کر سکتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی معدوم کر دیا جائے۔ تو تمام قوم کو کتنا نقصان ہوگا۔ (اس سے طلبا کو بتایا جائے کہ) اُن کو کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہئے۔ جس سے اِن کو کسی قسم کا نقصان ہو۔ بلکہ اِن کے قائم رکھنے میں کوشاں رہنا چاہئے۔ مینے اکثر طلبا کو دیکھا ہے کہ پانی کے پمپ کو استعمال کرنے کے بعد کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ اُستاد اپنے طلبا کی توجہ اس پانی کی مقدار کی طرف مبذول کریں۔ جو اس طرح ضائع جاتا ہے۔ اور اگر تمام پمپ کھُلے چھوڑ دیئے جائیں۔ تو کس قدر نقصان ہوگا۔ اور اُن کے والدین کو پانی حاصل کرنے میں کس قدر زیادہ روپیہ ادا کرنا پڑیگا۔ اگر طلبا اس بات کو محسوس کریں تو پمپ کو کبھی کھُلا نہ چھوڑینگے۔ اگر گاؤں میں کوئی چشمہ یا کوآں ہو۔ تو اُستاد سیر کے دوران میں طلبا پر اسے صاف رکھنے کی ضرورت نقش کر سکتا ہے۔ اگر اُن کی ذراسی غفلت سے پانی میں کچھ جراثیم داخل ہو جائیں تو ہیضہ یا دوسری بیماریاں پھیل جائینگی اور تمام لوگوں کو بہت نقصان ہوگا۔

مقامی جغرافیہ پڑھتے وقت طلبا بعض نتائج خود اخذ کر لیتے ہیں۔ اس طرح اُن میں خود اعتمادی اور معمولی حالت میں درست کام کر لینے کی عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو آئندہ زندگی میں مفید ثابت ہوتی ہیں۔

مختصراً مقامی جغرافیہ کی تعلیم اور کھلے میدان کی سیر مندرجہ ذیل وجوہات سے لازمی ہے۔

(۱) یہ بُنیاد ہے جس پر جغرافیہ کا محل بنایا جاتا ہے۔

(۲) یہ مختلف قسم کے نقشہ جات سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ جو آئندہ زندگی میں مفید ہوتے ہیں۔

(۳) یہ جغرافیہ کے اصول سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

(۴) یہ طلبا کو سیاستِ مُدن کے سمجھنے میں اور اچھے شہری بننے کی تربیت دیتی ہے۔

(۵) یہ طلبا میں خود اعتمادی کا وصف پیدا کرتی ہے۔

مقامی جغرافیہ کی تعلیم سب جماعتوں میں ہونی چاہئے۔ ابتدا میں یہ طلبا کو جغرافیہ کا صحیح تصور قائم کرنے کے لئے ضروری ہے۔ ہائی کلاسوں میں یہ اور بھی لازمی ہو جاتی ہے۔ ہائی کلاسوں میں جانے تک طالب علم دُنیا کے جغرافیہ کی موٹی موٹی باتیں پڑھ چکتا ہے۔ اسے معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ کہاں تک قدرتی وسائل مثلاً مٹی، معدنیات پانی کی طاقت۔ جنگلات وغیرہ یورپ و امریکہ کے ملکوں میں کام میں لائے گئے ہیں۔ اب اسے معلوم ہو جائیگا کہ

کون سے قدرتی وسائل اس کے اپنے ملک میں موجود ہیں۔ اور یہاں تک اُن کو کام میں لایا جا سکتا ہے۔ اگر طالب علم خود بخود سوچنا شروع کر دے تو آئندہ زندگی کے کام کے لئے ایک اچھی بُنیاد قائم ہو جاتی ہے۔

جغرافیہ پڑھاتے وقت کھُلے میدان کا کام (۱) سکول کے احاطہ میں (۲) سکول کے نواح میں اور (۳) دُور کی جگہوں میں ہو سکتا ہے۔

ایسے کام کا وقت۔ یہ کام کچھ تو سکول کے وقت میں کچھ بعد ازاں۔ یا آدھی چھٹی یا کسی تعطیل کے دن ہو سکتا ہے۔ انفرادی طور پر یہ کام اکثر تعطیل کے دن ہی ہو سکتا ہے۔

۱۔ میدان کا کام جو سکول کے احاطہ میں ہو سکتا ہے (۱) **بارش کے بعد کھیل کے میدان کا مشاہدہ**
اگر ریت کا ایک چھکڑا میدان کے ایک کونہ میں ڈال دیا جائے۔ تو بارش کا اثر زیادہ نمایاں ہوگا۔
طلبا کی توجہ ان امورات کی طرف مبذول کرائی جائے۔ کہ (ا) پانی اونچی جگہ سے نشیب میں بہتا ہے۔
(ب) دریا۔ اس کا دایاں کنارہ۔ بایاں کنارہ۔ معاون۔ فاصل آب۔ طاس آب کا تصور۔
(ج) بارش کا پانی زمین پر بہتے وقت اپنے ساتھ مٹی بہائے جاتا ہے۔

(۲) **ان گڑھوں کا مشاہدہ جن میں پانی جمع ہو جاتا ہے۔** جب پانی خشک ہو جاتا ہے تو مٹی کے تین جزو (بجری۔ ریت۔ مٹی) صاف طور پر دکھائے جا سکتے ہیں۔ بجری سب سے بھاری ہونے کے سبب سب سے پہلے نیچے بیٹھتی ہے۔ بعدہٗ ریت اور اخیر میں نرم مٹی۔ مٹی کے دوسرے اجزا پانی اور نباتی مادہ ہیں۔ جو کوئی سا ٹکڑہ زمین کھودنے سے بہ آسانی دکھائے جا سکتے ہیں۔ جس مٹی میں ریت کی مقدار زیادہ ہو ریتلی مٹی کہلاتی ہے۔ اور جس میں نرم مٹی زیادہ ہو۔ چکنی مٹی۔ اور جس مٹی میں نباتی مادہ زیادہ ہو اسے (humus) کہتے ہیں اور یہ عموماً کالے رنگ کی ہوتی ہے۔

(۳) **ہموار زمین پر جہاں سورج تمام دن چمکتا ہے۔ عمودی چھڑی کے سایہ کا مشاہدہ۔**
سایہ کی سمت اور لمبائی میں مختلف تبدیلیاں مشاہدہ کرائی جائیں۔ ان کی مدد سے ہم چار جوانب (شمال۔ مشرق۔ جنوب۔ مغرب) نصف النہار۔ سورج کا روزانہ سفر۔ مقامی اور سٹینڈرڈ (standard) وقت کا فرق۔ مختلف تاریخوں میں دوپہر کے وقت سورج کی بلندی۔ مختلف مہینوں میں سورج کے طلوع و غروب کی ٹھیک جگہ وغیرہ وغیرہ پڑھا سکتے ہیں۔ اکثر لوگ خیال کرتے ہیں کہ سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور مغرب میں غروب ہوتا ہے۔ یہ صرف جزواً درست ہے۔ سورج سال میں صرف دو دن عین مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔ اور عین مغرب میں غروب ہوتا ہے۔

(۴) **قطبی ستارہ کا مشاہدہ۔** شمالی نصف کرہ میں یہ ہمیں ٹھیک شمال اور کسی مقام کا عرض البلد معلوم کرتے

میں مدد دیتا ہے۔

(۵) موسم کی معمولی تبدیلیوں کا مشاہدہ - زیادہ سے زیادہ (maximum) اور کم از کم (minimum) درجہ حرارت - گیلے اور خشک بلب (Bulb) والے تھرمامیٹر پر درجہ حرارت پڑھنا۔ ہوا کا دباؤ - ہوا کی سمت اور بارش کا روزانہ بغور مشاہدہ کرنا چاہئے۔ اور ان کو کتاب میں درج کرتے رہنا چاہئے۔ اگر طلبا ان باتوں کا مشاہدہ سارا سال نہ کر سکیں۔ تو کم از کم جنوری و جولائی کے مہینوں میں تو ضرور کرنا چاہئے۔ ان کی مدد سے ہم روزانہ - ماہانہ و سالانہ اوسط درجۂ حرارت اور ہوا کا دباؤ پڑھا سکتے ہیں۔ اور درجہ حرارت و ہوا کے دباؤ میں تعلق۔ بارش اور درجۂ حرارت میں تعلق۔ بارش پر ہواؤں کا اثر طلبا کے ذہن نشین کر سکتے ہیں۔ اپنے گاؤں یا شہر کی آب و ہوا کے متعلق درست تصور ہونے سے طلبا مقابلہ و تناسب سے دوسرے ملکوں کی آب و ہوا بھی سمجھ سکتے ہیں۔ گرم - سرد - بارش والا - خشک محض مقابلہ کی اصطلاحات (Relative terms) ہیں - ان کا مطلب صرف کسی مقام کی آب و ہوا دیکھنے سے ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ اس قسم کا عملی کام کئے بغیر آب و ہوا کے متعلق طلبا کے تصورات بہت سطحی رہتے ہیں۔

سکول کے نواح میں باہر کا کام

(الف) زمین کی مختلف قسم کی سطح اور اس کی خصوصیات کوؤں - سڑکوں - نہر - دریا - ریلوے لائن - مشہور عمارات وغیرہ کا محل وقوع اور ان کا چھپے ہوئے نقشے سے مقابلہ کرنا - تاکہ طلبا نقشہ کا مطلب سمجھنے کے لائق ہو سکیں۔

(ب) دریا کے کام کا مشاہدہ - جہاں تک ممکن ہو سکے - دریا کو سب سے اونچی جگہ سے مشاہدہ کرو - اور بتاؤ کہ (۱) اس کی گزرگاہ ہمیشہ ٹیڑھی ہوتی ہے - کبھی سیدھی نہیں ہوتی۔

(۲) کس طرح ایک کنارہ (پانی سے) ٹوٹ رہا ہے اور مقابل کا کنارہ نئی مٹی سے بن رہا ہے۔

(۳) ہر جگہ دریا کی رفتار یکساں نہیں۔

(۴) کس طرح لوگ دریا پر آمد و رفت کرتے ہیں؟

(۵) کہاں پر دریا میں آبشار ہیں یا رفتار تیز ہے اور کیوں؟

ان امورات کا اثر جو نواح میں رہنے والے لوگوں کے پیشوں پر ہوتا ہے - اسے اچھی طرح واضح کرو

شمالی ہندوستان کے دریاؤں کے متعلق (پڑھاتے وقت) طلبا کی توجہ مندرجہ ذیل سوالات پوچھنے کی طرف لگائی جائے۔

(۱) کیا یہ دریا سارا سال بہتا ہے یا صرف ایک موسم میں۔

(۲) اگر یہ سارا سال بہتا ہے تو کیا پانی کی مقدار سال بھر یکساں رہتی ہے۔
(۳) اس میں کب طغیانی آتی ہے۔ طغیانی کے بعد کناروں پر کیا رہ جاتا ہے۔
(۴) دریا سے کون کون سے فائدے اُٹھائے جاتے ہیں۔
(۵) اور کون سے فوائد تم تجویز کرتے ہو۔

(ج) موسلا دھار بارش کے بعد دکھاؤ۔ کہ بارش کا پانی ہموار زمین کی نسبت ڈھلان زمین کو زیادہ بہا کر لے جاتا ہے اور یہ بے گیاہ زمین سے زیادہ مٹی بہا کر لے جاتا ہے۔ بہ نسبت اس زمین کے جہاں گھاس یا درخت اُگے ہوں۔ یہ بھی واضح کرو کہ یہ بات پہاڑ کے دامن میں رہنے والے لوگوں کی زندگی پر بہت اثر ڈالتی ہے۔ ہوشیارپور اور گجرات کے ضلعوں میں برسات کے موسم میں بہت سے چھوٹے چھوٹے ندی نالے پہاڑ کی ڈھلانوں پر سے تیز بہتے آتے ہیں۔ یہ نالے مٹی بہا کر لے جاتے ہیں اور بہت سا رقبہ بنجر بنا دیتے ہیں اور ان زمین کے مالکوں کو غریب کر دیتے ہیں۔ اگر پہاڑ کی ان ڈھلانوں پر گھاس اُگائی جائے تو یہ نالے کوئی نقصان نہیں کر سکتے اس لئے دیہاتی لوگوں کے لئے یہ لازمی ہے کہ گھاس کو جڑوں تک کھائے جانے سے محفوظ رکھیں۔ انہیں اپنے مویشی اور بھیڑوں کو اس رقبہ پر نہ چرنے دینا چاہئے۔ بلکہ گھاس کو درانتی سے کاٹ کر مویشیوں کے لئے بطور چارہ استعمال کرنا چاہئے۔ ایسا کرنے سے گھاس کی جڑیں قائم رہتی ہیں۔ اور اگر بھیڑ بکریوں کو اس رقبہ پر چرنے دیا جائے۔ تو وہ گھاس کو جڑوں تک کو کھا جاتی ہیں۔

(د) نواح کے کھیتوں میں فصلوں کا مشاہدہ۔ ایک ہی کھیت کو کم از کم تین بار دیکھا جائے۔ تمام مشہور فصلوں کے بونے اور کاٹنے کے اوقات۔ وسائل آبپاشی اور کھاد اندازی اور مٹی کی قسمیں نوٹ کرنا ضروری ہے۔ کونسی فصلیں سیراب شدہ رقبوں میں بوئی جاتی ہیں اور کیوں۔ کن فصلوں میں کھاد ڈالا جاتا ہے۔ کیا (ایک کھیت میں) مختلف فصلیں بدل کر بوئی جاتی ہیں۔ کھیتوں پر کون سے جانور رکھے جاتے ہیں۔ کھیتوں سے منڈی تک فصلیں کس طرح لائی جاتی ہیں۔ پیداوار بڑھانے اور فصل اعلےٰ قسم کی اُگانے کے لئے کونسی تجاویز پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہ چند سوالات ہیں جو طلبا جب وہ کھیتوں میں جائیں تو پوچھ سکتے ہیں۔ اس سے ان کو ہندوستان اور دُنیا کے مختلف حصوں میں مختلف قسم کی ضروری فصلیں اُگنے کی وجہ سمجھنے میں مدد ملے گی۔ جو پرندے اِن کھیتوں میں آتے رہتے ہوں۔ انکا بھی مشاہدہ کیا جائے اور اُن پرندوں کی فہرست بنائی جائے جو کسانوں کے لئے مفید اور مضر ہیں۔ مفید پرندوں کو ہلاک نہ کیا جائے۔ کیونکہ وہ ان کیڑوں کو کھا جاتے ہیں۔ جو کسانوں کی فصلوں کو تباہ کرتے ہیں۔

(س) نواح کے درختوں کا مشاہدہ۔ مندرجہ ذیل امورات کا بغور مطالعہ کیا جائے

(۱) ہر ایک درخت کی جگہ کہ آیا وہ پانی سے دُور ہے یا نزدیک (۲) پتوں کی خاصیتیں کہ کیا وہ چھوٹے ہیں۔ موٹے ہیں یا لمبے اور چوڑے۔ نوکدار یا باریک ہیں (۳) انکی چھال موٹی ہے یا پتلی (۴) جڑیں لمبی ہیں یا چھوٹی (۵) کب انکے پتے جھڑ جاتے ہیں اور کب نئے پتے اُگتے ہیں (۶) درخت کے ہر ایک حصّہ سے کیا کام لیا جاتا ہے (۷) اِن درختوں سے مزید فوائد حاصل کرنے کے لئے کونسی تجاویز پیش کی جاسکتی ہیں (۸) کون کونسی صنعت کا ان درختوں پر انحصار ہے۔

اِن مشاہدات سے جنگلات کا مختلف جگہوں پر ہونا اور ان کے خاص فوائد سمجھنے میں مدد ملے گی۔

(س) **مشینوں اور کارخانوں کا مشاہدہ**۔ اگر نواح میں کوئی مشین ہو۔ مثلاً کپاس بیلنے کی۔ یا گنے بیلنے کی یا آٹا پیسنے کی وغیرہ وغیرہ تو اس کے متعلق مندرجہ ذیل باتیں دریافت کی جائیں۔

(۱) کس طاقت سے کام لیا جاتا ہے (بھاپ۔ تیل یا مویشی) (۲) کونسا کچا سامان استعمال ہوتا ہے اور وہ کہاں سے لایا جاتا ہے (۳) کونسی اشیا کارخانہ میں تیار ہوتی ہیں۔ وہ کہاں بھیجی جاتی ہیں اور کیوں؟ (۴) اس خاص جگہ میں وہ مشین لگائے جانے کے کیا وجوہات ہیں۔

(ط) **مال گدام اور ریلوے سٹیشن**۔ بچوں کو مختلف اطراف سے آنے والی لائنوں کا مشاہدہ کرایا جائے۔ کہ یہ کن کن شہروں سے آتی ہیں۔ وہ شہر کیوں مشہور ہو گئے ہیں۔ مال گدام میں بچے یہ دیکھیں کہ کونسی اشیا یہاں باہر سے آتی ہیں اور کونسی یہاں سے باہر بھیجی جاتی ہیں۔ اور معلوم کریں کہ کن شہروں سے وہ اشیا منگوائی جاتی ہیں۔ اور کن شہروں کو اشیا بھیجی جاتی ہیں۔ اور وہ اِن باتوں کی وجوہات بھی معلوم کریں۔

(ع) طلبا مختلف چونگی خانوں پر کھڑے کئے جائیں۔ تاکہ وہ نوٹ کر سکیں۔ کہ کونسا مال شہر میں آتا ہے اور کونسا مال باہر جاتا ہے۔ تب (طلبا کی) اس یادداشت پر جماعت میں بحث کی جائے۔ طلبا سے اپنے شہر کے ایک چھوٹے حصّے کا مکمل معائنہ کرایا جائے (کہ وہاں پر کس قسم کا مال ہے یا کام ہو رہا ہے) اور اُن سے اس کام کی رپورٹ لی جائے۔ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں کرسمس تعطیلات شروع ہونے سے پہلے طلبا کو ان کے اپنے گاؤں یا شہر کا جغرافیائی مطالعہ کرنے کے لئے چند سوالات دیئے جاتے ہیں اور طلبا اِن سوالوں کی روشنی میں جغرافیائی معائنہ (Survey) کرتے ہیں۔ چند طلبا اس بارہ میں حقیقت میں بہت ہی مفید رپورٹ تیار کرتے ہیں۔

(ف) اگر طلبا لمبے ریلوے سفر کا خرچ برداشت کر سکیں۔ تو ان کو کسی پہاڑی مقام۔ نہر کے منبع (Headworks) کوئلے کی کان۔ بندرگاہ یا صوبہ کا دارالخلافہ وغیرہ دیکھنے کے لئے لے جانا چاہئے۔ ایسی جگہوں پر جانا نہایت ہی سبق آموز ہے۔ اور جانے پر وہاں کے مختلف نظاروں۔ لوگوں کے پیشوں۔ انکی عادات و چال چلن کو دیکھا جائے اور ان پر بحث کی جائے۔ مقامی میلوں۔ عجائب گھر اور چڑیا گھر کو بھی دیکھنے جانا چاہئے۔ ان تمام مقامات کو دیکھتے وقت چند نکات کا احتیاط سے خیال رکھا جائے

(۱) ہر ایک مقام پر جانے سے پہلے خاص طور پر تیاری کی جائے۔ پہلے اُستاد خود اس جگہ کو دیکھنے جائے اور پیشتر سے فیصلہ کرے کہ کونسی اشیا قابلِ دید ہیں۔ اور اِن کے متعلق پوری واقفیت بہم پہنچا کر فیصلہ کرے کہ طلباء کو کون سے سوالات یا مشقیں بتائی جائیں۔ اور اس کے متعلق اُستاد کے لئے اُس ضلع کا جس میں سکول واقع ہے۔ واقفیت نامہ (gazetteer) مطالعہ کرنا لازمی ہے۔

(۲) طلبا کو پیشتر سے معلوم ہونا چاہئے کہ ان کو کیا کرنا ہے۔ اور اُن کو خاص خاص باتوں کا خلاصہ لکھتے جانا چاہئے۔

(۳) اس جگہ کا نقشہ ہر ایک طالب علم کے ہاتھ میں ہونا چاہئے۔ تاکہ اس جگہ کو دیکھنے کے بعد اس کے متعلق اُستاد ان کو سبق پڑھا سکے۔ اور تعلیم اور مشاہدہ میں تعلق قائم کر سکے۔ پھر مزید مطالعہ کی باتیں بتائی جائیں۔

(۴) کسی حالت میں ایک اُستاد کے پاس بیس سے زیادہ طالب علم نہ ہوں۔ اگر درست طور پر یہ کام کیا جائے تو یہ باہر کا کام طلبا کو نہ صرف اصولوں کو درست سمجھنے کے قابل بنائیگا۔ بلکہ یہ

(۱) سکول کے کام اور سکول کے باہر کی باتوں میں تعلق پیدا کریگا (۲) کام کو درست اور اصلی حالت میں رکھیگا۔

(۳) لڑکوں کو خوبصورت اور مفید اشیا کی وقعت معلوم کرنے کا شوق دلائیگا۔

سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں پچھلے سال طلبا مندرجہ ذیل مقامات کو دیکھنے گئے۔

(۱) دریائے راوی کے نواح میں کھیت (۲) جہانگیر کا مقبرہ (۳) قلعہ (۴) ریلوے ورکشاپ (۵) جلو میں بیروزہ کا کارخانہ (۶) فیروزپور Head works پر ستلج سے نئی نہروں کے نکلنے کی جگہ (۷) کھیوڑا کی نمک کی کانیں (۸) دہلی (۹) درہ خیبر (۱۰) ٹیکسلا (۱۱) پنجہ صاحب (۱۲) واہ میں سمنٹ کا کارخانہ (۱۳) کراچی

اِن مقامات کی سیاحت کے مکمل حالات پنجاب جیوگرافیکل ایسوسی ایشن کے عنوان سے پنجاب ایجوکیشنل جرنل (رسالہ) میں چھپ چکے ہیں۔ ہر دفعہ طلبا کو چھپے ہوئے پمفلٹ دیئے گئے۔ جن میں قابلِ دید چیزوں کے متعلق موٹی موٹی باتیں درج تھیں۔ مجھے صرف اتنا افسوس ہے کہ ان تمام مقامات کی سیاحت میں تاریخ وجغرافیہ کے تمام طلبا نے حصہ نہیں لیا ہے۔ بعض طلبا کو نصف ریلوے کرایہ ادا کرنے کا مقدور نہیں تھا۔ گزشتہ دسہرہ کی تعطیلات میں پنجاب جیوگرافیکل ایسوسی ایشن نے لاہو سے آگرہ اور بمبئی تک کا انتظام کیا۔ سفر کا خرچ یہ ہے۔

تیسرے درجہ میں ریل کے سفر کا خرچ ۶ روپے۔ دوسرے درجہ میں ریل کے سفر کا خرچ ۱۸ روپے

جغرافیہ پڑھانے والے معلموں کے لئے بندرگاہ۔ پانی روکنے کی فصیل (break water) جہاز ٹھہرنے کی جگہ۔ روشنی کا مینار۔ گھاٹ۔ اسباب اُٹھانے کی مشین (Crane) تیل کا گدام۔ کوئلے کا گدام۔ جہاز چونگی خانہ۔ مال گدام floating crane مدوجزر وغیرہ کا چشم دید علم نہایت لازمی ہے۔ وہ بندرگاہ۔

محمد صدیق شرر صا بھوگلپوری

حضرت عشرت رحمانی رامپوری
اڈیٹر ''نیرنگ'' دہلی
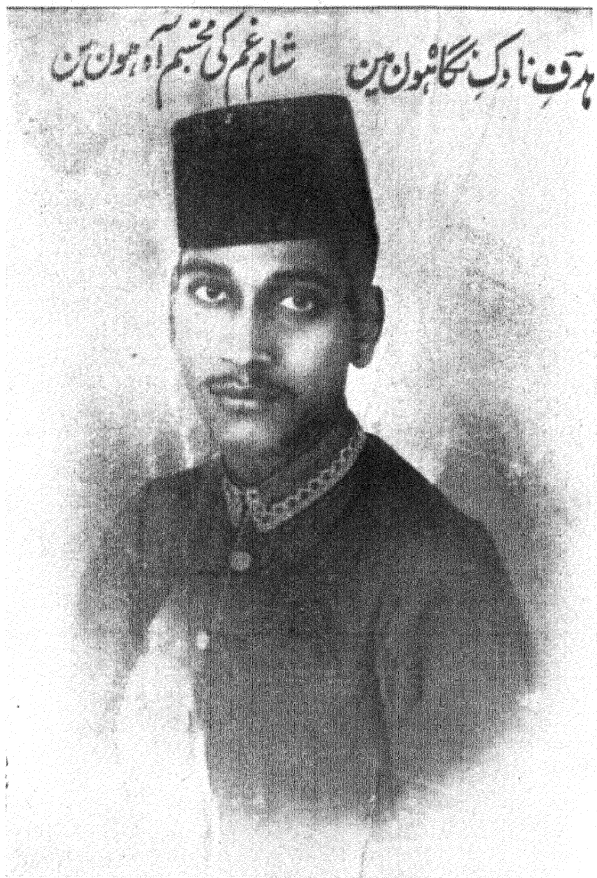
حضرت ہدف اجتہادی لکھنوی

فطرت کی محفل

(حضرت ہدف اجتہادی)

ہدف اب شہر میں رہنے سے دل اکتا گیا اپنا
اِن انسانوں کی بستی سے کہیں مل جائے چھٹکارا

جو قسمت سے ملے کشمیر کا اک پُر فضا جنگل
تو پھر گزرا کرے دلچسپیوں میں اپنا دن سارا

جہاں ہم جنس کا سایہ نہ دکھلائی دے کوسوں تک
بس اک آزاد مخلوقِ خدا کا ساتھ ہو اپنا

جدھر چاہا اُدھر پہنچے جہاں چاہا وہاں بیٹھے
نہ کوئی روکنے والا نہ کوئی ٹوکنے والا

پہاڑوں کا ہو دامن آبشاریں جس میں جاری ہوں
مکاں ہو جھاڑیوں کا اور بچھا ہو فرش سبزہ کا

بھلا دے میرے دل سے بے نظامی فرشِ قالیں کو
گلابوں کی ہو پنکھڑیوں کا سبزہ پر نکھار ایسا

ہو بے ترتیبیوں سے سارے جنگل کی چمن بندی
کہیں تختہ ہو بیلے کا کہیں تختہ چنبیلی کا

کسی جا پر کھلے ہوں چاندنی کے پھول جنگل میں
کہیں جوہی کے پھولوں سے بھرا ہو دامنِ صحرا

دماغ اُس بن میں پھولوں کی مہک سے مست رہتا ہو
لبھاتی ہو ہوا اٹکھیلیاں کر کر کے دل میرا

چراغوں کے عوض میں جگمگائیں رات کو جگنو
جھلاجھل چاند اور تاروں کی کر دے لطف کو دونا

ہو شب کو رقص طاؤسوں کا اس فطرت کی محفل میں
کلیلوں سے کریں پامال دن کو ہرنیاں سبزا

چمکتی ہو کہیں بجلی کہیں ہوں ابر کے لکّے
پھواریں ہوں کہیں پر اور کہیں پانی کا ہو جھالا

چہکتے پھرتے ہوں ہر سو پرندے صحنِ جنگل میں
پپیہوں کا کہیں غل ہو، کہیں ہو شور کوئل کا

کبھی تو "پی کہاں" سے اُنکی جنگل گونج اٹھتا ہو
ترانوں سے کبھی کوئل کے بڑھتا ہو جنون میرا

نہ سمجھیں غیر مجھ کو ایسے کچھ مانوس ہو جائیں
مرے چاروں طرف ہر وقت جھرمٹ رہتا ہو اُن کا

کوئی بیٹھا ہو زانو پر تو کوئی میرے شانہ پر
کبھی اِس کا سنوں نغمہ کبھی اُس کا سنوں گانا

جو پانی آرہا ہو جھیل میں بہہ کر پہاڑوں سے
تو بہنے کی صدا سے ساز کی آواز ہو پیدا

گرا کرتا رہے اس طرح پانی آبشاروں سے
کہ میں سمجھا کروں کوئی بجا یا کرتا ہے باجا

وہ محویّت ہو مجھ پر بھول بیٹھوں اپنی ہستی کو
نہ کچھ گرمی کی ہو پروا نہ کچھ سردی کی ہو پروا

اگر ہو اور کوئی بھی تو بس اُن کا تصوّر ہو
اور اک شِکرے پہ میں ڈل کے کنارے بیٹھا ہوں تنہا

قلم ہو ہاتھ میں کاغذ پر آنکھیں دل سے باتیں ہوں
"مصوّر چاندنی تصویر کو کیونکر بناتے ہیں"

ڈل کشمیر کی ایک خوبصورت اور مشہور جھیل کا نام ہے۔

امر ناتھ طپش موکوی
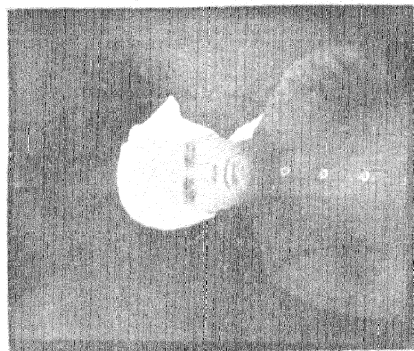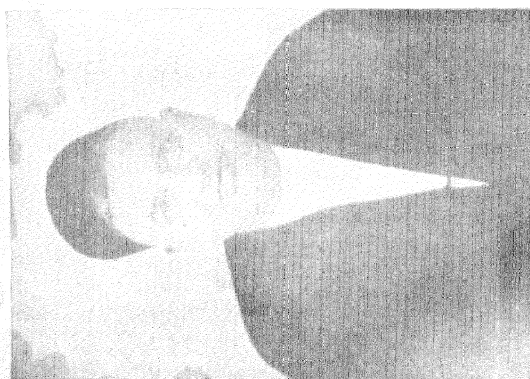
رائے بہادر پنڈت شو نرائن شمیم
ایڈوکیٹ ہائی کورٹ پنجاب

بخشي هوديال صاحب ٽيچر نورمل سڪول ٺٽه

سیام

رائے بہادر پنڈت شو نرائن صاحب شمیم ایڈووکیٹ ہائی کورٹ لاہور

سیامی قوم جزیرہ نما انڈو چائنا (INDO CHINE) میں ایک طاقتور قوم واقع ہوئی ہے۔ انہوں نے شروع زمانہ میں برما۔ پیگو۔ آنام اور ملایا کی سلطنتوں میں سے بہت سے حصے فتح کئے۔ لاؤس کی سلطنت کو زیر کیا جو دائن جنگ کے اردگرد تھی۔ اور لبانگ پرابانگ کو بھی اپنے ممالک محروسہ میں شامل کر لیا۔ اپنا دارالخلافہ دریائے منام کے کنارے اجوتھانام قائم کیا۔

اٹھارویں صدی کے اخیر میں برما والوں نے ایک زبردست مہم تیار کی اور سیامی سلطنت پر حملہ آور ہوئے۔ اجوتھا دارالخلافہ کو تباہ کر دیا۔ شاہی خاندان کا خاتمہ کر دیا۔ سیامی قوم میں سے اس کے بعد ایک حوصلہ والا شخص پیدا ہوا جس نے ۱۶ میل سمندر سے دور شمال کی جانب فوج کشی کر کے ایک دارالخلافہ بمقام بنگ کاک قائم کیا اور سیامی قوم کو آباد کرایا۔ ۱۸۲۴ء میں ایک غاصب پیدا ہو گیا اُس نے تخت و تاج چھین لیا۔ اس کے بعد ۱۸۵۱ء میں شاہ حال کا دادا تاجپوش ہوا جس کا نام شہزادہ مانگ کٹ تھا یہ ہستی سیام کے لئے برکت ثابت ہوئی۔ تاجپوشی سے پہلے یہ شہزادہ ایک بڑی مدت مندر میں تاریخ اور سائنس کا مطالعہ کرتا رہا اور انگریزی زبان سیکھتا رہا تھا جس دن سے وہ تخت پر بیٹھا اپنے ملک اور رعایا کی بہبودی میں مصروف ہوا۔ اُس نے یورپین سلطنتوں کے ساتھ عہد نامے کئے۔ نوجوان شہزادوں کی تعلیم کا انتظام کیا۔ موجودہ شاہ کا باپ چولالن کارن ستمبر ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوا۔ ۱۵ سال کی عمر میں اپنے باپ کے مرنے پر ۱۸۶۸ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کا باپ سورج گرہن کو نہایت سرگرمی سے دیکھتا دیکھتا علیل ہو گیا تھا اور اسی مرض میں مرا۔

خاندان سُری ونگی متوفی شاہ کی امداد میں شامل ہوا اور ترقی اور خوش انتظامی کا دور شروع ہو گیا۔ حقیقت یوں ہے کہ موجودہ شاہ کے باپ کو ایک امریکن معلم نے نہ صرف انگریزی میں تعلیم دی بلکہ اُس میں اینگلو سیکسن (ANGLO SAXON) قوم کی جوانمردی اور خود حوصلگی کے تتبع کی رُوح اس میں پھونک دی تھی۔ شاہ مرحوم ہنرمند تھا۔ فن لکڑی بازی میں ماہر تھا۔ گھوڑے کا کامل سوار تھا۔ موسیقی میں مہارت رکھتا تھا۔ شاعر تھا اور تمثیل (DRAFNE) کا مصنف تھا۔ اپنے بھائیوں اور بھتیجوں کو اُس نے سیر و سیاحت کی جانب راغب کیا تاکہ جو علم انہیں حاصل ہو ریاست کی خوش انتظامی میں اس سے امداد ملے ۱۸۷۲ء میں جوانی کی عمر میں اس شاہ نے ہندوستان کی بھی سیاحت کی۔ آؤ بھگت شایانِ شان بجناب لارڈ میو ہوئی۔ اس گورنر جنرل نے اُس کے ساتھ پدرانہ التفات کا سلوک کیا۔

۱۸۸۰ء سے ۱۸۹۱ء تک اڈنبرا (EDANBRAH) کا ڈاکٹر بیئرگون دار الخلافہ بنگ کاک میں رہائش رکھتا رہا اور شاہ مرحوم کے شہزادوں کی تعلیم کے لئے وہ اتالیق اور مشیر خاص رہا۔ انتظام سلطنت کے ہر صیغہ میں اصلاح کی گئی چنانچہ نئی سڑکیں بنائی گئیں۔ اور بیشمار مکانات اور تعمیرات سیامی حسن عمارت اور یورپین مضبوطی کے مرکب بنائی گئیں۔ پولیس کا سلسلہ بھی قایم کیا گیا۔ جرمن کارپردازوں کی مدد سے ڈاک کا سلسلہ ترمیم ہو کر اصلاحی طریق پر قایم کیا گیا حکومت سیام پوسٹل یونین (POSTAL UNEION) میں داخل ہوگئی۔

ملک کی پیمائش کی گئی انگریز قوم کے معلم بلوائے گئے سیامی دوشیزگان کی تعلیم انگریزی خاتونوں کے سپرد ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت بنک کاک میں سات آٹھ فرسٹ کلاس انگریزی مدرسے ہیں۔

عیسائی مذہب کے ساتھ رواداری مرعی ہے۔ شاہ مرحوم عیسائیوں کی حمایت کرتا تھا جو علم طب اور تعلیم کے دیگر شعبوں کے پڑھانے میں کوشاں تھے۔

شاہ مرحوم مصلحت خارجی میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ لندن میں سفارت قایم ہوئی اور شاہ کا سوتیلا بھائی شہزادہ دیواونگسی سیامی فارن آفس کے چارج میں رہا۔

شاہ مرحوم اپنی ریاست میں ہمیشہ دورہ کرتا تھا۔ فوج کو اس نے آراستہ کیا اور اس وقت (سال ۱۹۱۱ء) میں فوج کی تعداد ۲۶۰۰۰ ہے۔ کوپن ہیگن (COPEN HAGAN) سے کموڈور رچیلو (RVCHULO) بلوایا گیا اس نے بحری صیغہ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور بحری طاقت کو قایم کیا۔

مجلس انتظامیہ میں محکمہ جات کے افسر ۱۸۹۱ء میں شامل کئے گئے۔ ۱۸۹۵ء میں کونسل وضعان قوانین قائم ہوئی جس میں وزرا اور آٹھ شہزادے اور بیس ممبر نامزدگان سرکار شامل ہیں۔

۱۸۹۳ء میں شاہ مرحوم کا شامت اعمال سے فرانس سے تنازعہ پیدا ہو گیا ان دنوں شاہ عارضی طور پر فرائض ضروری سے قدرے علیحدہ ہو کر استراحت کر رہا تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ۱۰ اپریل کو دس فرانسیسی جہاز دریائے منام میں موجود ہو گئے۔ انہوں نے پکنام پر حملہ کر دیا چنتابون پر قبضہ کر لیا۔ دار الخلافہ پر گولہ باری کی دھمکی دی گئی سیام کو آخر صلح کرنا پڑی پچاس ہزار مربع میل کا رقبہ نذر کیا گیا۔ اور مصیبت یہ پڑی کہ ولیعہد وقت دو سال بعد فوت ہو گیا۔ اور شاہ حال ولیعہد نامزد ہوا۔

اب آگے سنئے۔ انگریز اور فرنچ قوموں کی رقابت کا پتہ ملتا ہے ۱۸۹۶ء میں فرانس اور انگلینڈ میں طے ہو گیا کہ منام کی وادی آزاد رہیگی۔ آخر ۱۹۰۴ء میں چنتابن سیام کو واپس دیا گیا مگر کراٹ کی بندرگاہ فرنچ کے پاس رہی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ میلوپری اور تبسر کے صوبے فرنچ رہے۔ تین سال بعد بتم مایک۔ سیام ریپ اور الگ کور اجو کمبودیا کی سرحد پر ہے فرانس کے حوالے کر دئے گئے۔ اس کے عوض میں کراٹ کی بندرگاہ سیام کو واپس ملی۔ ایک اور حق سیام کو یہ عطا فرمایا گیا کہ فرانسیسی مجرم سیاسی عدالتوں میں قابل تحقیقات قرار پائے۔

اب برٹش گورنمنٹ کی کیفیت سُنئے - انہوں نے بھی منظور کر لیا - کہ انگریز قوم کے مجرموں کے مقدمات سیاسی عدالتیں سُن سکیں - اس کا معاوضہ یہ ملا کہ ملائی ریاست کلنتن ترن گا نو - کیدہ - پرلس اس کے ہمسایہ جزائر برطانیہ کے حوالے ہوئے - اڈیٹر بدھسٹ ریوو (BUDHUST RAVU) ۱۹۱۱ء رقمطراز ہے کہ گو کچھ حصے ریاست کے ہاتھ سے نکل نکل گئے مگر جو صوبے بہت اچھے تھے وہ سیام کے پاس رہے - اس وقت اس ریاست کا رقبہ دو لاکھ مربع میل ہے - اور ۱۹۱۱ء میں آبادی سات لاکھ کے قریب تھی - شاہ مرحوم نے اخیر عمر میں رُوم - ویئنا - پیرس - کوپن ہیگن اور سٹاک ہالم کی سیاحت کی - بار ثانی انگلینڈ گیا - ملک معظم ایڈورڈ ہفتم کا مہمان رہا - اس کے شہزادوں نے جن میں شاہ حال بھی شامل ہے انگلینڈ - جرمنی - فرانس اور رُوس میں تعلیم پائی ہے - شاہ حال ۱۲ سال کی عمر میں انگلینڈ تعلیم کے لئے بھیجا گیا تھا - سنیڈہرسٹ (SANDHARST) کے فوجی مدرسہ میں رہا - پوسڈم (POSTDAM) میں کیڈٹ (CADET) رہا - اور الڈرشاٹ (ALDERSHOT) کے درہم لائٹ انفیٹری (DURHAM LIGHT INFERY) میں فوجی کام سیکھتا رہا - ایک سال اکسفورڈ یونیورسٹی میں بھی رہا -

شاہ مرحوم ساری عمر بُدھ بھگوان کی تعلیم کا پیرو رہا اور اُس کے مت کے اصولوں پر عقیدت رکھتا رہا - وہ ہر سال بودھی مقامات مقدسہ کی یاترا کیا کرتا تھا - تعلیم کے مرکزوں کی امداد اور حوصلہ افزائی کرتا تھا - پالی ٹکسٹ سوسائٹی کو اس نے مالی امداد دی - پالی بُدھی کتب مقدس اس نے سیامی حروف میں شائع کیں - القصہ ساری دنیا میں سیام ہی ایک واحد بودھی سلطنت ہے - شاہ مرحوم کے طفیل سیام اس وقت ایک مہذب اور ترقی یافتہ آزاد سلطنت ہے -

ہم ۱۹۱۱ء کا حال لکھ رہے ہیں جس کو اب ۲۶ سال کے قریب ہو گئے ہیں - اس عرصہ میں سیام نے اور زیادہ ترقی کر لی ہے - شکر ہے کہ سکھامنی گوتم بدھا کا نام لیوا کوئی شاہ تو ہے -

---

گلستانِ سخن

یہ فخر کم نہیں کچھ اپنے واسطے یارب — کہ ذات پاک کا تیری ظہور ہم سے ہوا

کہاں سے لائیں محبت میں صبر اے واعظ! — کہ دل جو دُور ہوا یہ بھی دُور ہم سے ہوا

کلیم ہی کیلئے سب وہ بے حجابی تھی — نہ سامنا کبھی اک دن حضور ہم سے ہوا

اس ابتدائے محبت میں حسن کی یہ کشش — جُدا ابھی سے دلِ ناصبور ہم سے ہوا

عینی نیشی

ریاست ٹراونکور کے دلچسپ حالات

یہ نہایت سرسبز و شاداب علاقہ جو ٹراونکور کے نام سے موسوم ہے۔ ہندوستان کے انتہائے جنوب میں واقع ہے۔ خط استوا کے قریب واقع ہونے کی وجہ سے اس کی پیداوار تقریباً وہی ہے۔ جسے منطقہ حارہ کی پیداوار کہا جاتا ہے۔ ناریل۔ تاڑ۔ الائچی۔ سیاہ مرچ اور کیلے کے درخت قطار در قطار میلوں تک چلے جاتے ہیں۔ خوبصورت سبزہ زار اور اشجار میوہ دار کی کثرت اس قدر ہے۔ کہ یہ علاقہ گلستان ہند (دی گارڈن آف انڈیا) کے نام سے مشہور ہے۔ اس سرسبز خطہ کے بصارت افروز مناظر صرف دیکھنے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہاں چند خاص باتیں ایسی ہیں جن کا مختصر ذکر ناظرین رہنمائے تعلیم کے لئے لطف سے خالی نہ ہوگا۔ یہ علاقہ ایک دلیسی ریاست ہے۔ آریہ قوم کی آمد سے پہلے جو بادشاہ یہاں عنانِ حکومت ہاتھ میں رکھتے تھے۔ انہیں کی اولاد آجتک یہاں برسرِ حکومت ہے یہ راجے آرین نسل سے نہیں ہیں۔ آرین قوم نے جہاں ہندوستان کے دوسرے قدیمی باشندوں کو شودروں میں شمار کیا۔ ان راجاؤں کو بھی اسی گروہ میں شامل سمجھا۔ البتہ برہمنوں نے ان راجاؤں کو اپنا حلقہ بگوش بنانے کے لئے تلادان کا دستور جاری کر دیا۔ اس لئے وہاں کے راجاؤں کو تلادان کے ذریعے ہندو دھرم کے حلقے میں لے آتے ہیں۔ اور پھر وہ شودر یا اچھوت نہیں سمجھے جاتے۔

طرزِ زندگی روایت ہے۔ کہ یہ لوگ پہلے بالکل ننگے رہتے تھے۔ یہاں کے برہمن بھی ننگے تھے لیکن جب سے سرکار انگریزی کی عملداری ہوئی سزائے جرمانہ وغیرہ کا خوف دلا کر ان کی عریانی کو ڈھانپا گیا۔ مگر اب تک اس عریانی کی یادگار میں ان کے ہاں سالانہ تیوہار منایا جاتا ہے۔ اس تیوہار کے روز راجا اپنے امرا و وزرا اور رؤسا و عمائد کو ہمراہ لے کر ساحل بحر پر جاتا ہے اور یہ سب لوگ بالکل برہنہ تن ہو کر وہاں غسل کرتے ہیں۔ اس روز کسی انگریز کو وہاں جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اب بھی یہ حالت ہے۔ کہ عوام الناس مرد ہوں یا عورتیں کمر کے گرد تھوڑا سا کپڑا لپیٹ لیتے ہیں۔ باقی جسم بالکل برہنہ ہوتا ہے۔ اور تمام کاروبار اسی حالت میں کرتے رہتے ہیں۔

ترا وندرم اس ریاست کا دارالحکومت ہے۔ عیسائی مشنریوں نے وہاں جا کر لڑکیوں کو یہ سکھایا کہ اپنے سینے کو کپڑے سے ضرور ڈھانپ لیا کریں۔ مگر دنیا میں نیک کوششوں کا انجام ہمیشہ اچھا نہیں ہؤا کرتا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ سیدھی بات الٹی ہو جاتی ہے۔ وہاں کے باشندوں نے اس کو بھی مداخلت بیجا قرار دیا اور ہنگامہ برپا کر دیا۔ عیسائی مشنریوں پر یہ بہتان تراشا گیا کہ یہ لوگ ہماری آزادی میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ فساد آخر فرو ہو گیا۔ اس کے بعد لڑکوں کے سکولوں میں بھی یہ حکم جاری ہؤا۔ کہ مڈل سکول کے لڑکے ایک کرتہ زیب تن کر کے

سکول میں آیا کریں اور جب ہائی کلاس میں تعلیم پا رہے ہوں ۔ تو ایک کوٹ پہنا کریں ۔ اس طرح آہستہ آہستہ تعلیم یافتہ لوگوں میں لباس پہننے کا رواج شروع ہوگا ۔

اس علاقہ میں نہ سر کو ٹوپی یا پگڑی سے ڈھانپنے کا دستور ہے اور نہ پاؤں میں جوتا پہننے کا رواج ہے غریب سے لیکر امیر بلکہ راجا تک ننگے سر اور ننگے پاؤں نظر آئیں گے ۔ البتہ شاہی خاندان کی مستورات اور بیگمات ایک چھتری اپنے سر پر تانے رکھتی ہیں اور اس امتیازی نشان سے ان کا رتبہ معلوم ہو جاتا ہے ۔

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے ۔ کہ یہاں پلنگ اور چارپائی وغیرہ پر سونے کا دستور بھی نہیں عموماً سب لوگ چٹائی پر سوتے اور آرام کرتے ہیں ۔ یہ چٹائی جو اس غرض کے لئے استعمال کی جاتی ہے ۔ وہاں سیتل پاٹی کے نام سے معروف ہے ۔ مختلف قیمت کی ہوتی ہے ۔ امیر و غریب اپنی حسب حیثیت چٹائی خرید کر استعمال میں لاتے ہیں ۔

قدرت نے اس ملک کو آب و ہوا کچھ ایسی عطا کی ہے کہ اوڑھنے کے لئے زیادہ کپڑے لینے کی چنداں ضرورت نہیں پڑتی ۔ آب و ہوا اگرچہ گرم ہے لیکن سانپ بچھو اور دوسرے زہریلے حشرات الارض یہاں بالکل نہیں پائے جاتے ۔ اور یہی وجہ ہے ۔ کہ پاؤں کو جوتا پہننے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ۔ اور نہ فرش زمین پر سو رہنے میں کوئی خطرہ ہے ۔

طرزِ معاشرت ایک نہایت عجیب بات جو اس علاقہ کو ہندوستان کے دوسرے حصص سے متمائز کرتی ہے یہ ہے ۔ کہ یہاں ایک عورت ایک ہی وقت میں کئی شوہر رکھ سکتی ہے ۔ اولاد باپ سے منسوب نہیں ہوتی ۔ بلکہ عورت سے منسوب ہوتی ہے ۔ جائداد کی مالک بھی عورت ہی ہوتی ہے ۔ برہمنوں میں یہ دستور ہے ۔ کہ سب سے بڑا لڑکا تو برہمن لڑکی سے شادی کرتا ہے لیکن دوسرے لڑکے شودر عورتوں سے ۔ یہاں یہی دو ذاتیں پائی جاتی ہیں ۔ برہمن اور شودر ۔

پیداوار کیلے اور ناریل یہاں بڑی بہتات سے ہوتے ہیں ۔ روٹی یا تو کیلے کی بناتے ہیں ۔ یا چاولوں کی ۔ گندم کی روٹی کا رواج نادر الوجود ہے ۔ چونکہ بارشیں سال بھر ہوتی رہتی ہیں ۔ اس لئے چاول نہایت کثرت سے ہوتے ہیں ۔ چاولوں کی تین تین فصلیں سال میں اٹھائی جاتی ہیں ۔ ناریل کی یہاں بارہ[۱۲] فصلیں ہوتی ہیں ۔ اور کیلے تو بارہ مہینے یہاں ملتے ہیں ۔ جو نہایت شیریں ۔ لذیذ اور خوش ذائقہ ہوتے ہیں ۔ ارزاں اس قدر کہ غریب امیر سب ان کو کھا سکتے ہیں ۔ ان لوگوں کے گھر عموماً بہت صاف اور پاکیزہ ہوتے ہیں ۔ ہر ایک گھر کے ساتھ ایک خانہ باغ بھی ہوتا ہے جس سے ان کی نفاست پسندی اور خوش مذاقی ظاہر ہوتی ہے ۔

عورت ہو یا مرد ۔ سب کے سر پر لمبے لمبے بال ہوتے ہیں ۔ اس لئے مرد اور عورت میں مابہ الامتیاز چیز صرف عورت کا سینہ ہے ۔ جو اس کے عورت ہونے کو ظاہر کرتا ہے ۔ ان لمبے لمبے بالوں کو یہ لوگ نہ تو گوندھتے ہیں اور نہ سکوں

کی طرح جوڑا بناتے ہیں۔ یہ بال ہر وقت کھلے رہتے ہیں۔ یہاں سے چل کر جوں جوں شمالی علاقوں کی طرف آتے جائیں سر کے بال کم مقدار میں ہوتے جاتے ہیں اور پورب میں آکر صرف ایک چوٹی رہ جاتی ہے۔

اس ملک میں جو مندر سب سے قدیم ہیں۔ وہ شیوجی کے مندر ہیں۔ ان میں شودروں کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ خدا کی قدرت ہے۔ کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں ایسی ایسی بوقلمونی و گوناگونی پائی جاتی ہے۔ کہ کسی دوسرے ملک میں اتنا اختلاف و تنوع نہیں دکھائی دیتا۔

پادری جے علی بخش۔ لاہور

جذباتِ عتیق

افسردہ پاکے اپنے دلِ داغدار کو ۔۔۔ سمجھا کیا خزاں میں ہمیشہ بہار کو

یہ جانکر کہ کشتہ ہوں اک گلعذار کا ۔۔۔ گُل کرگئی صبا مری شمعِ مزار کو

ساقی بانگاہِ مست سے اک بار دیکھ لے ۔۔۔ کافی ہے بس یہی مرے رفعِ خمار کو

بہرِ ثبوت سوزِ دروں لے پیامبر ۔۔۔ ہمراہِ نامہ رکھدوں دلِ بیقرار کو

ظالم خزاں نے لطفِ چمن کھودیا تمام ۔۔۔ کہہ دو صبا سے لائے منا کر بہار کو

مانوس شامِ غم کی ہے تاریکیوں سے دل ۔۔۔ رہنے دو بےچراغ ہمارے مزار کو

مجھ رند بادہ خوار سے قدر اسکی پوچھئے ۔۔۔ کیا جانے شیخ رحمتِ پروردگار کو

تیور پکارتے ہیں کہ ہشیار اے عتیق
وہ آرہے ہیں آہوئے دل کے شکار کو

غیر مطبوعہ

عتیق حیدرآبادی

قریبِ منزلِ مقصود

(بابو منوہر لال صاحب طالب بی۔اے (آنرز) ایل ایل بی۔ چکوال)

کشمیر بینظیر کی شان میں عُرفی کے بے مثال قصیدہ کی تقلید ناممکن۔ سفرنامۂ شمیم کے رنگ و بُو اور طرزِ نگارش کا انعکاس محال "پیسہ بٹور" سیاحوں کی "رہنمائے کشمیر" کی خشکیات ناپسند۔ اِن آنکھوں دیکھی باتیں سیدھے سادے الفاظ میں بیان کرنا مرغوب ہے۔

راولپنڈی کے ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی موٹروں کی فوج نظر پڑے گی۔ "چلو کوہ مری کشمیر!" "کوہ مری کی سواری!" "کشمیر جانے والو! چلو!" "کار۔ بابو جی!" کی صداؤں پر دھیان نہ دیجئے۔ سُنا اَن سُنا ایک کر دیجئے۔ ٹانگہ میں بیٹھئے اور شہر والے اڈّے سے سواری کا انتظام کیجئے۔ اس میں آپ کو فائدہ رہیگا۔ سُنی سُنائی نہیں کہتے تجربہ کی بنا پر کہتے ہیں۔ آگے آپ مانیں نہ مانیں، آپ کی مرضی۔

کرایہ پر بہت چُک چکاؤ ہوا۔ آخر دام ٹھہرے۔ کار ہو گئی۔ شہر والے اڈّے کی بغل میں پھل منڈی ہے کشمیر میں آم نہیں ہوتا۔ پنجاب سے جاتا ہے اور بہت مہنگا بکتا ہے۔ سیب، ناشپاتی، گلاس، بگگوگوشے، بادام، اخروٹ اور آلو بخارا وہاں کا ہی میوہ ہے۔ یہاں سے خریدنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ راستے میں کھانے کے لئے ضرورت ہو تو لے لیجئے۔ مٹھائی بھی لے لیں تو اچھا رہیگا۔ رستہ میں کام آئیگی۔ راشن رسد لے کر موٹر میں جمع کیا۔ بیٹھے اور موٹر چل دی۔

مری روڈ پر موٹر فراٹے بھرتی چلی جاتی ہے۔ لہلہاتی کھیتیاں، گرد پوش درخت جو موٹروں کی گرد پاشی کی مُنہ بولتی تصویر ہیں، کسانوں کی جھونپڑیاں اور مویشی پیچھے کو دوڑے جاتے ہیں۔ آپ کی موٹر زلف کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑک پر سانپ کی طرح مُڑتی، دوڑتی جاتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ کوہ مری کی سخت چڑھائی جو گھوڑوں کا دم توڑ دیتی ہے اُس کی طاقت پر کوئی اثر نہیں کر سکتی۔ سفید سڑک کا سانپ پہاڑ کی پیٹھ پر بل کھاتا ہوا چڑھتا جاتا ہے۔ ہم بھی اُس کی لکیر کو پیٹتے ہوئے اُس کے تعاقب میں ہیں۔ مری کے دلکش مناظر، چیل کے اُونچے اُونچے درخت اُن کے نیچے کھیلتے ہوئے پری پیکر بچے، دلکش پہاڑ، غیر مانوس چٹانیں اُن کے سایہ میں محوِ راز و نیاز نوجوان عاشق اور حسین معشوقہ، محبوبہ کا محبوب کُتّا جو آغوشِ محبت سے نکل کر ہماری برق رفتار سواری کا ناکام تعاقب کرتا ہے، ہم کو روک نہیں سکتے۔ مری بریوری کا مشہور کارخانہ چشمِ مشتاق تماشا کو پیغامِ دعوت دیتا ہے مگر ہم جنت نشان کشمیر

کے مشتاق دید ہیں۔ آستانِ یار پر سجدہ کرنے کی بیتابی رفتار ڈھیلی کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ہم مری کو جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتی، حسرت آمیز شوق سے دیکھتے ہوئے بھاگے جاتے ہیں۔ کوہ مری سے کوہالہ کے پُل تک غضب کی اُترائی ہے جو موٹر کی بریکوں اور شوفر کی لیاقت کی کسوٹی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ آپ یہاں تک بخیریت پہنچ گئے۔ ٹول وول کا جھگڑا طے ہوا اور چلے پُل کے اُس پار پہنچے تو ریاست کی حدود میں آگئے۔ دریائے جہلم کا نظارہ دل کو مسحور کئے لیتا ہے۔ اونچے اونچے پہاڑوں کے درمیان نیچے بہت نیچے دریائے جہلم جھاگ اُچھالتا دوڑا جا رہا ہے۔ اس فلک بوس بلندیوں سے آنے والے کے لئے اس قدر پستی شاید ناقابلِ برداشت ہے۔ جبھی اس طرح چیں بہ جبیں اور کف بدہن ہو رہا ہے۔ پہاڑ کی پیٹھ پر موٹر میں دوڑتے ہوئے مسافر اس نظارہ سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ہُوا کریں۔ اُن کی بلندی اُس کی پستی ہے۔ ہاں شہرت اور طاقت کی بلندیوں پر متمکن انسان دوسروں کی پستی اور بےبسی کو موجب فرحت سمجھتا ہے مگر یہ بھول جاتا ہے کہ اُن کی پستی ہی اُس کی بلندی کا باعث ہے۔

ریاست کی حدود میں پہنچتے ہی سڑک کے سانپ نے اوپر کا رُخ کیا۔ اس کی پیٹھ اور زیادہ ڈھلوان ہوگئی اور اُس پر چڑھنا مشکل تر ہوگیا۔ مگر ہماری رفتار یا بادپا موٹر کی برق رفتاری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ دریائے جہلم سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا اُدھر سے آرہا ہے جدھر ہم دوڑے جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سڑک اور دریائے جہلم دو روپہلی سانپ ہیں جو ساتھ ساتھ گو بلندی اور پستی پر مخالف سمتوں میں دوڑے جاتے ہیں۔ خدا جانے کب سے!

دومیل کے پُل سے تھوڑا نیچے کاغان کا نالہ کشن گنگا اپنا برفانی پانی دریائے جہلم کے شیر گرم پانی میں ملاتا ہے یہ سرد و معتدل طبیعتوں کا اتحاد دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ سر بفلک سبز پوش پہاڑ اس ملاپ کے ازلی شاہد ہیں تو دونوں نے یک زبان ہو کر کہا ؎

من تو شدم، تو من شدی، من تن شدم، تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اور دنیا جانتی ہے کہ یہ برسوں کے بچھڑے ایسے ملے کہ دوئی کا نام نہ رہا۔ تمام دنیا اس "یک قالب دو جان" کو دریائے جہلم کے ہی نام سے پکارتی ہے۔

بارہ مولا تک پہاڑوں کے درمیان کم و بیش ڈیڑھ سو میل کا فاصلہ، سڑک اور دریا ساتھ ساتھ چلتے ہیں سبزہ پوش پہاڑ، جن کی فلک بوس چوٹیوں پر سبز وردی والے پہرہ دار کھڑے ہیں، بڑی بڑی مخملی چٹانیں جن سے پانی کے موتی ٹپک رہے ہیں، غریب الوطن مسافروں کو دولتِ کیف سے مالا مال کرنے کے لئے کمربستہ کھڑے ہیں۔ یہ

کشمیر کے دو مناظر

ایک سیاح کے کیمرے سے

اسمبلی ہال
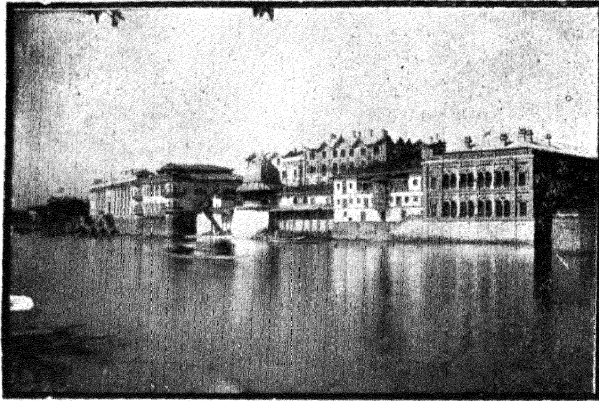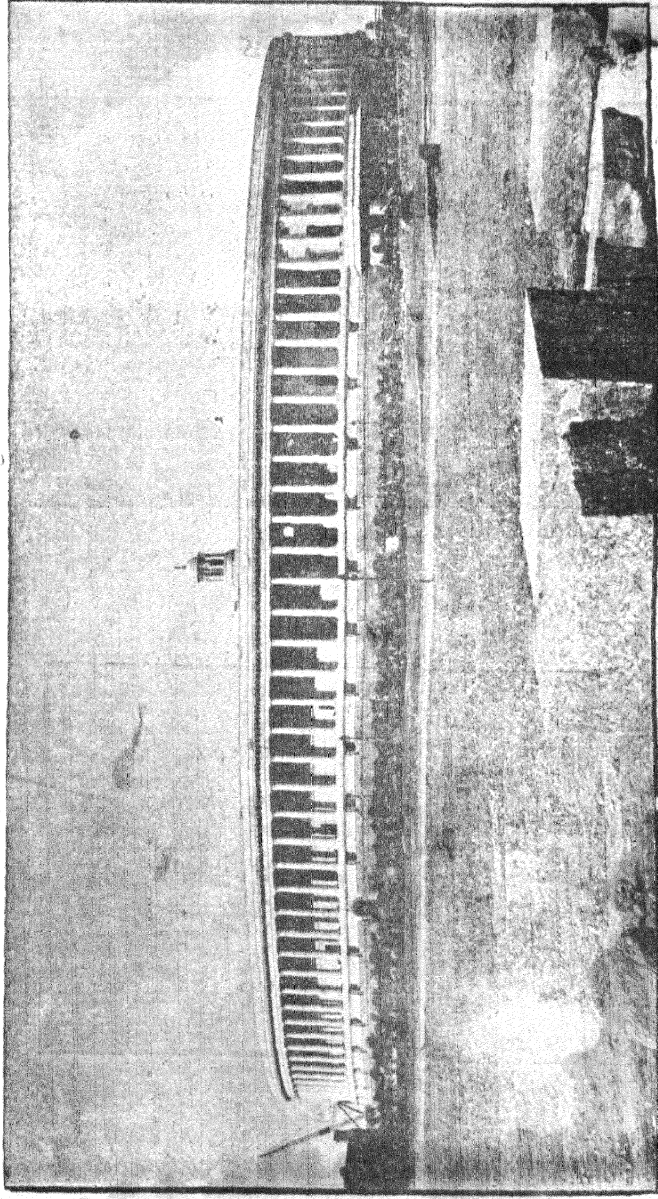
نئی دہلی کا ایک حصہ جس پر کروڑوں روپے صرف ہو چکے ہیں

نظارے دیکھ کر دل میں آتش اشتیاق اور زیادہ بھڑکتی ہے کہ یارب! جس فردوس زمین کی راہ میں پائیں باغ ہیں اس کی اپنی کیفیت کیا ہوگی جس جنت کا یہ اعراف ہے اس بہشت کا کیا کہنا؟

بارہ مولا سے سری نگر تک سڑک ایک سفید خط مستقیم ہے جو سرو کی دو شاندار سبز قطاروں سے [illegible] میلوں چلا گیا ہے۔ اس کا نظارہ رُوح کو راہِ راست کا منظر دکھاتا ہے۔ سڑک کے دونو طرف سروقد [illegible] رعنا سبز مخمل کے کوٹ زیب تن کئے، قطاریں باندھے، اٹینشن کی حالت میں کھڑے ہیں یقین جانئے یہ سب تزک و احتشام و زیبائش آپ ہی کی خاطر ہے۔ یہ فطرت کا بناؤ سنگھار، یہ دلفریب ترتیب، یہ اہتمام یہ انصرام آپ کا مناسب [illegible] کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔ اِس حسینہ کی دلکش مانگ کی سی سڑک پر موٹر میں گزرتے ہُوئے آپ دل ہی دل میں اِس دلفریب تیاری پر صاد کہیں گے اور ناظمِ فطرت کے حسنِ انتظام کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکینگے۔

لو صاحب! دریا کو تھوڑی دیر کے لئے الوداع کیئے۔ یہاں سے ہماری راہ جُدا ہے اُس کی جُدا۔ اچھا سری نگر میں پھر ملیں گے۔ مگر ذرا غروبِ آفتاب کے منظر کو جی بھر کر دیکھ لیں شاید پھر عمر بھر دیکھنا نصیب نہ ہو۔ سُورج کی ہلکی سُنہری کرنیں سطحِ آب پر محوِ رقص ہیں۔ اُدھر شام کی ہلکی ہلکی نسیم پہاڑوں کی چوٹیوں پر درختوں کو گدگدا رہی ہے۔ اشجار بھی اس منظر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ شاخیں اور پتے بھی صرف رقص مستانہ ہیں مگر نیلیں سبزۂ خوابیدہ کا الوداعی بوسہ لے رہی ہیں۔ اس ہمہ گیر ہریاول کے درمیان خود رَو طلائی پھولوں کا رقص بیخودانہ اور آئینہ دریا میں اس تمام منظر کا عکس دلفریب انسان کے دل میں عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے۔ یہ طلائی کرنوں سے مرصع سبزی دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہے اور اس کا عکس اس قدر دیرپا ہوتا ہے کہ وقت کا تیز آبی پانی بھی اسے نہیں دھو سکتا۔

خیر صاحب۔ سرینگر میں بہت نہ ٹھہرینگے۔ شالامار۔ نشاط۔ نسیم اور ڈل کی سیر ہوچکی۔ شنکر آچاریہ چشمۂ شاہی ہاروں بھی دیکھ لئے۔ قلعہ، مسجد، لائبریری، ہسپتال، ساتوں کدل، نہر، کلب گھر وغیرہ "رہنمائے کشمیر" لکھ کر سیاحتِ کشمیر کے اخراجات پورا کرنے والے "پیسہ ٹور" سیاحوں کے لئے رہنے دیجئے۔ بادام کے باغات سے دل و دماغ نُور و سرور حاصل کرچکے۔ شہر کی گندی گلیوں، خوفناک کتوں اور غلیظ باشندوں میں رہنے سے جی گھبراتا ہے۔

اسلام آباد چلیں گے۔ وہاں سے مٹن صاحب۔

مٹن صاحب بھی عجیب کیف آور منظر پیش کرتا ہے۔ شفاف پانی کے چشمے، دریا، گفائیں، پہاڑ کی پیٹھ پر دریا کی سی نہر ایسی چیزیں ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

مٹن صاحب سے اچھابل جائیں۔ راستے میں پُرانے مندروں کے کھنڈرات دیکھکر ان کے فن انجنیری کی داد نہ دینا محال ہو جائیگا۔ پتھروں کا طول وعرض اور حجم ووزن وغیرہ ماہر سیاحوں کے لئے چھوڑ دیجئے رُوحانی غذا کے لئے یہ چیزیں درکار نہیں۔ لگے ہاتھوں چشمہ ویری ناگ۔ ککڑ ناگ۔ گلگری بل بھی دیکھ آئیں۔ دو چار دن قیام کیجئے گا۔

جسم و روح کو طاقت و فرحت نصیب ہوگی - اچھابل کے پہاڑوں کی سرسبزی اور اُن کے دامن میں باغ جن میں مچھلیوں کی افزائشِ نسل کے لئے تالاب ہیں دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں - آخر کان کہاں تک آنکھوں کا کام کرینگے ؟

اُف ! امرناتھ جی کی یاترا تو نہ ہوسکی - شومئی قسمت نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا - بلانصیبا کشمیر کی ہری بھری وادیوں میں نقرئی چشموں، سیمابی دریاؤں اور فلک رفعت پہاڑوں کو پھاند کر آپہنچا - یاتری لوگ دوپڑاؤ نکل گئے - اب گھوڑا کہاں - پھر انہیں کیسے مل سکیں گے ؟ قہر درویش برجان درویش - مگر افسوس ہمارے ساتھ آپ بھی ڈوبے - آپ کو بھی امرناتھ جی کی زیارت نہ نصیب ہوئی تھی، نہ ہوئی - مگر ایک خیال ہے اگر پورا ہوگیا تو ممکن ہے اس چوک کی کچھ تلافی ہوجائے - اسلام آباد پہنچکر قسمت آزمائی کرینگے -

لیجئے صاحب ! آپ کی قسمت نے یاوری کی کشتی کا کرایہ ہوگیا - پانچ مسافر وہاں بیٹھے ہیں تین ہم ہیں - ایک کی گنجائش رہی - کوئی خدا کا بندہ آجائیگا - کھانا وانا سر شام کھا لیجئے - آج پورنماشی ہے - ماہ کامل کے طلوع ہوتے ہی کشتی لنگر اُٹھائیگی - اگر کامدار کشمیری مال خریدنا ہو تو خرید لیجئے سری نگر سے سستا ملیگا - اننت ناگ کے چشمہ میں اشنان کریں پھر پانی کے کنارے پتھروں پر بیٹھکر کچھ کھا پی لیں - شام کا کھانا کشتی میں کھائینگے - ماہ کامل کی ضیا پاشی، دریا کا سکون، فضا کی کیفیت کھانے کا مزا دوگنا کر دیگی -

بعض حضرات کو بلا تمیز موقع و محل اپنی پوزیشن قائم رکھنے کا خیال دامنگیر رہتا ہے - ان کے دماغ پر وضعداری کا بھوت مسلط ہوتا ہے - وہ خیال کرتے ہیں کہ دنیا ان کی پوزیشن کی ہر وقت نگران رہتی ہے شاید وہ یہ نہیں سمجھتے کہ دنیا کے پاس اس کے علاوہ اور کام بھی ہے ؟ وہ جہاں بھی جاتے ہیں مجسٹریٹ، جج، بیرسٹر، وکیل، پنڈت، مولوی، حاکم اور تاجر ہی بنے رہتے ہیں - وہ مسٹر، بابو، چودھری، شیخ کی کھلی اتارنا نہیں جانتے - ان کا کاروباری خول اس درجہ سخت اور لچکدار ہوجاتا ہے کہ اُنہیں پھر سے انسان بننا ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہوتا ہے اگر آپ اپنا کام کاج، شہر گھر چھوڑ کر قدرت کی گود میں آتے ہیں اس سے فیضیاب ہونا چاہتے ہیں تو رسمی نقاب کو اُٹھا دیں - شاہد قدرت سے فطرت ہی ہمکنار ہوسکتی ہے تو فطرت کو قدرت سے بے حجابانہ ہم آغوش ہونے دیں - یہ سمجھ لیں کشتی میں پانچ انسان بیٹھے ہیں - ہم بھی انسان ہیں - کیا ہم ایک رات بھی 'انسانوں' میں بسر نہیں کرسکتے کم سے کم بطور تجربہ ہی سہی - آج کی رات ان آدمیوں میں جو محض آدمی ہیں بسر کرینگے -

چودھویں کے چاند کی لطیف چاندنی فضا کو مہتابی بنا چکی ہے - ماہ کامل آئینۂ دریا میں اپنے رُخ منور کا عکس دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا ہے - اُس کی روپہلی کرنیں سطح آب پر کھیل رہی ہیں - حباب دریا اس حسن لطیف کو اپنے ہوائی گنبد میں قید کرنا ہی منتہائے ہستی سمجھے ہوئے ہے - اس پُر نور اور خاموش فضا میں ہماری کشتی دریا کے بہاؤ پر جا رہی ہے - ملاح کا لڑکا کشمیری زبان میں ایک دیہاتی گیت گاتا ہے - ہم اس کو

سمجھنے سے قاصر ہیں۔ مگر فضا اس سے گونج اٹھتی ہے۔ صبا اُسے سمجھتی ہے۔ یہ رُوح کی آواز ہے۔ ہماری رُوح اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اُس کی آواز کا زیر و بم دل کی گہرائی میں اُتر جاتا ہے۔ دل شرابِ کیف سے مخمور ہو کر اپنی ہستی، پوزیشن، وضعداری سے بے نیاز ہو جاتا ہے اُسے دنیا اور مافیہا کی خبر نہیں رہتی۔ ملاحوں اور ان کے بچوں کے دہقانی چہرے اِس ماحول میں بلا کے دلکش معلوم ہوتے ہیں۔ حُسن بے پردہ ایک وجد کا عالم طاری کر دیتا ہے۔

دریا کے دونو کناروں پر مکّی کے کھیت ہیں۔ ملاّح کشتی کو کنارے لگا کر کچھ بھٹے توڑتا ہے۔ کشتی میں لا کر بھٹے بھونے جاتے ہیں پھر وہ اپنے بال بچوں میں بحصّہ برابر بانٹ دیتا ہے۔ ملاّح کا لڑکا جس کی عمر مشکل گیارہ برس کی ہوگی میرا "دوست" بن گیا ہے وہ اپنے حصّہ میں سے ایک بھٹہ مجھے دینے پر مُصر ہے۔ اس مکّی کے ادھ بھُنے بھٹے کی لذّت کوئی مجھ سے پوچھے۔ دنیا کی کوئی نعمت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ ایک انسان نے ایک انسان کو دیا تھا۔ فطرت نے فطرت کو پہچان لیا۔ یہ اُس کا ثبوت تھا۔

چودھویں کے چاند کی چاندنی میں تمام رات کشتی کی آغوش اور دریا کی شفاف سطح پر چالیس میل کا فاصلہ طے کرنے کی یہ یاد آئینہ دل میں تصویرِ جاناں کی طرح محفوظ رہے گی۔ تمام رات نور کے دریا میں بادۂ کیف سے مسحور رہنے کی خوشی دل میں رہ کر دل کو دل بناتے رہے گی۔ سچ ہے حُسن دائمی خوشی کا سرچشمہ ہوتا ہے۔

آہ! کس کو معلوم ہے کہ اس سفر یا اس رات کے ختم نہ ہونے کی دل میں کیا کیا دعائیں مانگی گئی تھیں۔ آہ! وہ حالت "جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارہ ہو گیا" کی حالت سے بھی کہیں بہتر و برتر تھی۔ مگر دعا کے ساتھ اثر کو ضد ہے دعا قبول نہ ہوئی۔ صبح صادق نے اپنا رنگ جمایا۔ چاند کی روشنی پھیکی پڑنا شروع ہو گئی۔ تارے سطحِ آب پر جھلملانے لگے۔ یہ عالم بھی کچھ کم کیف پرور اور رُوح افروز نہ تھا۔ مگر سفر کے ختم ہونے کا خوف اور خطرۂ سحر مبدل بہ یقین ہونے لگا۔ آہ! اب تو شرابِ کیف کا اثر بھی زائل ہوا جاتا ہے۔ . . . . اِدھر جہلم کے پانی سے "کرنوں والے" نے سر نکالا اُدھر ہماری کشتی سری نگر کے گھاٹ پر آ لگی۔ ہم منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ اب اُترنے کے سوا چارہ نہ تھا لیکن

آہ! فریبِ منزلِ مقصود!

⁂

ہندوستانِ قدیم کی خوفناک رسم

"ستی"

ایک مصوّر مضمون

(از شیخ محمد اسماعیل صاحب سکرٹری اور نٹیل پبلک لائبریری پانی پت)

ہندوستان میں نہایت قدیم سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ جب بیوی کا شوہر مرجاتا تھا تو بیوہ اپنے مردہ شوہر کے ساتھ چتا میں بیٹھ کر زندہ جلادی جایا کرتی تھی۔ یہ خوفناک رسم اس قدر قدیم زمانہ سے یہاں رائج تھی کہ تاریخ اس کا ٹھیک زمانہ اور اُس کی ابتدا بتانے سے قاصر ہے کہ کب اور کس زمانہ میں اور کیوں اس رسم کی بنا پڑی اور سب سے اول کونسی عورت اِس کی بھینٹ چڑھی۔ اس رسم کا نام ستی تھا۔ اور جو عورت ہنسی خوشی ستی ہو جایا کرتی تھی اُس کا خاندان نہایت معزز اور باوقار گنا جاتا تھا۔ اُس کی تعریفیں ہوتی تھیں۔ اور اُس کی مثالیں دیجایا کرتی تھیں اور جو عورت ستی ہونے سے انکار کرتی یا چتا میں سے نکل کر کسی طرح بھاگ جاتی وہ ہمیشہ سوسائٹی میں ذلیل سمجھی جاتی تھی۔ اس رسم کی قدامت کا اس سے پتہ لگایئے کہ تاریخ قدیم کے اوراق پر جنگ مہابھارت سے بھی پہلے اس کے نقوش اور موجودگی کے آثار نظر آتے ہیں چنانچہ ہندو کلاسیکل ڈکشنری مصنفہ ڈبوی صاحب میں "مادری" کا جو راجہ پانڈو کی دوسری رانی تھی تذکرہ لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ راجہ کے انتقال کے بعد اُس کی لاش کے ساتھ ستی ہوگئی (صفحہ ۲۴۲)۔ بھائی پرمانند کی کتاب تاریخ پنجاب کے صفحہ ۱۱۴ میں بھی اس واقعہ کو دُہرایا گیا ہے۔

چاہے یہ رسم شوہروں سے انتہائے محبت کے باعث پڑی ہو۔ چاہے لوگ زبردستی بیوہ کو جلاڈالتے ہوں چاہے عورتیں شرماشرمائی ستی ہوجاتی ہوں۔ اور رسم و عادت کے مطابق انکار نہ کرسکتی ہوں۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ یہ رسم تھی نہایت وحشیانہ اور بے رحمانہ۔

جب مسلمانوں نے ہندوستان کو فتح کیا تو اس عجیب و غریب رسم کو دیکھ کر وہ کانپ اُٹھے اور حیران رہ گئے۔ ان کے نزدیک یہ انتہا سے زیادہ قبیح فعل تھا مسلمان بادشاہ اس کے قطعی انسداد پر تیار ہوئے مگر خود غرض اور جاہل برہمنوں نے اُن کو بتایا کہ یہ رسم نہیں بلکہ مذہبی حکم ہے۔ اور اس کا روکنا فساد اور جھگڑے کا موجب ہوگا۔ چونکہ مسلمان

اس بات سے ہندوستان میں نہایت احتراز کرتے تھے کہ ہندوؤں کے مذہبی اعتقادات اور دینی رسوم میں رکاوٹ ڈالیں۔ اس لئے مجبور ہوکر خاموش ہو رہے۔ مگر یہ حکم دے دیا گیا کہ کوئی عورت بادشاہ یا علاقہ کے حاکم اعلےٰ کی اجازت کے بغیر ہرگز ہرگز ستی نہ کی جائے ورنہ ستی کرنے والوں۔ اس میں شریک ہونے والوں اور اُس میں اعانت کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جائیں گی۔ اور گورنروں کے نام خفیہ احکامات جاری کر دیئے گئے کہ حتی الامکان اجازت دینے میں توقف کیا کریں۔ اور جس طرح بنے عورت کو سمجھا بجھا کر ستی ہونے سے باز رکھا کریں۔ چنانچہ مشہور سیاح ابن بطوطہ کے سفرنامہ کے مطالعہ سے ہمارے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے جو محمد تغلق کے عہد میں ہندوستان آیا تھا۔ اور جس نے دو ایک ستیوں کا حال اپنا چشمدید لکھا ہے۔

ڈاکٹر برنیر ایک فرانسیسی سیاح جو شاہجہان اور اورنگ زیب کے زمانہ میں ہندوستان آیا تھا۔ اپنے سفرنامہ میں ستی کا بہت لمبا بیان لکھتا ہوا رقمطراز ہے:۔

"آجکل پہلے کی نسبت ستی کی تعداد کم ہوگئی ہے کیونکہ مسلمان جو اس ملک کے فرمانروا ہیں اس وحشیانہ رسم کے نیست و نابود کرنے میں حتی المقدور کوشش کرتے ہیں۔ اور اگرچہ اس کے امتناع کے واسطے کوئی قانون مقرر کیا ہوا نہیں ہے کیونکہ ان کی پالیسی کا ایک جزیہ ہے کہ ہندوؤں کی خصوصیات میں جن کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے دست اندازی کرنا مناسب نہیں سمجھتے بلکہ ان کی مذہبی رسوم کے بجا لانے میں اُن کو آزادی دیتے ہیں۔ لیکن تاہم ستی کی رسم کو بعض ایچ پیچ کے طریقوں سے روکتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی عورت بغیر اجازت اپنے صوبہ کے حاکم کے ستی نہیں ہوسکتی اور صوبہ دار ہرگز اجازت نہیں دیتا جب تک کہ قطعی طور پر اس امر کا یقین نہیں ہو جاتا کہ وہ اپنے ارادہ سے ہرگز باز نہ آئے گی۔ صوبہ دار بیوہ کو بحث مباحثہ سے سمجھاتا ہے اور بہت سے وعدے وعید کرتا ہے اور اگر اُس کی فہمائش اور تدبیریں کارگر نہیں ہوتیں تو کبھی ایسا بھی کرتا ہے کہ اپنی محل سرا میں بھیجدیتا ہے تاکہ بیگمات بھی اس کو اپنے طور پر سمجھائیں مگر باوجود ان سب امور کے ستی کی تعداد اب بھی بہت ہے خصوصاً ان راجاؤں کے علاقوں اور عملداریوں میں جہاں کوئی مسلمان صوبہ دار متعین نہیں ہے۔"

(سفرنامہ ڈاکٹر برنیر جلد دوم صفحہ ۱۷۰)

مگر اورنگ زیب نے جرأت سے کام لے کر اس رسم کے قطعی طور پر امتناع کے احکامات صادر کر دیئے چنانچہ مہتہ جیمنی جی بی۔ اے وکیل اپنے ایک مضمون میں جو اخبار رہنما مراد آباد کے ۱۸ فروری ۱۹۲۶ء کے پرچہ میں شائع ہوا ہے لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب نے اپنے صوبوں کے گورنروں کو جو دس احکامات لکھ کر بھیجے تھے ان میں سے دسواں حکم یہی تھا کہ آئندہ سے رسم ستی قطعی طور پر ہر جگہ بند کر دی جائے۔ چنانچہ دسمبر ۱۶۶۳ء سے اس

پر عملدرآمد شروع ہوگیا۔

اورنگ زیب کی وفات تک تو اس حکم پر عمل ہوتا رہا۔ مگر اس کی وفات کے بعد چونکہ اس کے جانشین لائق قابل اور طاقتور نہ تھے لہٰذا یہ رسم پھر جاری ہوگئی اور دہلی کے بادشاہ اپنے خانگی اور سیاسی جھگڑوں اور بغاوتوں میں مبتلا رہنے کے باعث اس کے انسداد کی طرف متوجہ نہ ہوسکے۔ اور اس طرح یہ رسم پھر عام طور پر سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔

جب ہندوستان کی قسمت تقدیر نے انگریزوں کے حوالے کی تو انہوں نے بھی شروع شروع میں بڑی کوشش کی کہ کسی طرح اور کسی تدبیر سے صلح و نرمی کے ساتھ یہ رسم دُور ہو جائے۔ مگر ان سے بھی برہمنوں نے وہی بات کہی جو مسلمانوں سے کہی تھی کہ یہ مذہبی معاملہ ہے اس میں دخل دینا مناسب نہیں ورنہ بڑا فساد ہوگا۔ مجبوراً ایسٹ انڈیا کمپنی چُپ رہی۔ ۱۸۱۲ء میں کمپنی نے اپنے مجسٹریٹوں کے نام ستی کے متعلق وہی احکامات جاری کئے۔ جو مسلمان اپنے ابتدائی زمانہ میں کر چکے تھے۔ اور حکم دیدیا گیا کہ مجسٹریٹ ستی ہوتے وقت خود اطمینان کر لیا کرے کہ آیا عورت کی ستی میں ہندو شاستروں کے قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی تو نہیں ہو رہی اور کہ آیا عورت اپنی مرضی سے ستی ہو رہی ہے یا جبراً۔ اگر ایسا ہو تو روکیں۔ اسی اثناء میں متعدد مرتبہ پارلیمنٹ انگلستان میں اس رسم کے خلاف سرگرم مباحثے ہوتے رہے مگر چونکہ برہمن اسے مذہبی رسم بتاتے تھے اس لئے کسی کو جرأت نہ پڑی کہ ہندوؤں کی اس رسم کے انسداد کی طرف عملی قدم اُٹھاتا۔

یہ تدبیریں اور مباحثے ہو ہی رہے تھے کہ خود ہندوؤں میں سے ایک نامور شخص اس رسم کے انسداد کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہ راجا رام موہن رائے تھا جو عربی۔ فارسی۔ سنسکرت اور انگریزی کا زبردست فاضل اور برہمو سماج کا بانی ہوا ہے۔ اُس نے اس رسم کے انسداد کے متعلق ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا۔ بیسیوں پمفلٹ اور اشتہارات اس کے خلاف شائع کئے۔ کتابیں لکھیں۔ مباحثات کئے جن میں زبردست دلائل کے ساتھ اس امر کو ثابت کیا کہ دھرم شاستر میں ہرگز ستی کا حکم نہیں۔ اور یہ رسم نہایت ظالمانہ۔ وحشیانہ اور زمانہ جاہلیت کی یادگار ہے۔ اور جس قدر جلد یہ مٹ جائے اتنا ہی دنیا کو امن ملے گا۔ اُس نے گورنمنٹ کو بھی متعدد رزولیوشن اور میموریل بھیجے اور کوشش کا کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔ یہاں تک کہ اس فاضل شخص کی تحریروں سے متاثر ہوکر کمپنی کو بھی یقین آگیا کہ دھرم شاستروں میں اس کے متعلق کوئی حکم موجود نہیں۔ اور لارڈ ولیم بنٹنگ نے جو اُس وقت گورنر جنرل تھے جنگی اور ملکی عہدہ داروں سے مشورہ کے بعد ۱۴۔ دسمبر ۱۸۲۹ء کو حکم نافذ کر دیا کہ "آج سے تمام برٹش انڈیا میں رسم ستی قطعی طور پر بند کر دی گئی" اس طرح راجہ رام موہن رائے کی بدولت یہ رسم ہمیشہ کے لئے ہندوستان سے موقوف ہوگئی۔

ہم ستی کا ایک دردناک نظارہ بھی شریکِ اشاعت کر رہے ہیں جس سے اس دردناک رسم کی ہولناکی کا کچھ کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک عورت کس طرح آگ کے شعلوں میں نہا رہی ہے۔ دیکھ کر سنگدل آدمی کا بھی دل کانپ جائے۔ حیرت ہے اُن بہادر عورتوں پر جو خوشی خوشی ستی ہو جاتی تھیں اور زبان سے اُف نہ کرتی تھیں۔ راجہ رام موہن رائے جن کے سر اس کے انسداد کا سہرا ہے اور لارڈ ولیم بنٹینگ جنہوں نے اس کے امتناع کا حکم جاری کیا۔ دونوں کی تصاویر بھی ہم مضمون میں دے رہے ہیں۔

راجہ رام موہن رائے

لارڈ ولیم بنٹینگ

ستی کا خوفناک نظارہ

مزارِ سعدیؒ

(از جناب خواجہ ف م شجاع منعمی۔ بی ایس سی آنرز۔ ایم ایس سی ایم آر اے ایس پروفیسر ایس ای کالج بہاولپور)

شہر شیراز سے سعدی کا مزار کوئی تین میل کے فاصلے پر شمال مشرقی کونے میں واقع ہے۔ دو تین کچی سڑکیں وہاں پر جاتی ہیں۔ مگر گاڑیوں کی آمد و رفت بہت ہے۔ راستے میں وہی برساتی نالہ پڑتا ہے جس کو رُود خانہ کہتے ہیں۔ مزارِ سعدی کو سعدیہ کہتے ہیں اور اس گاؤں کو جو اس کے قریب ہے اسی رعایت سے سعدیہ یا دہِ سعدی کہتے ہیں۔

مزار کے گرد دُور فاصلے پر پہاڑیاں نظر آتی ہیں۔ خشک بے برگ و گیاہ۔ جن کے دامن میں انگور کی وسیع کاشت میلوں تک ہوتی ہے۔ اُن کو پانی آسمان سے خدا ہی بھیجتا ہے اور بس۔ انگور اچھے ہوتے ہیں۔

ایک بھدی سی شکل کی چار دیواری ہے جس کی دیوار کوئی دس فٹ بلند ہے۔ اس میں دو دروازے ہیں۔ ایک تو مزار کے رُخ کے سامنے جو کافی بڑا ہے اور لوہے کی موٹی سیخوں سے جالی دار بنایا گیا ہے۔ اوپر کی محراب کا باقی ماندہ حصہ بھی جالی بنا کر بھر دیا گیا ہے۔ دوسرا پہلو کا دروازہ جو آپ سعدی کے سامنے موجود ہے اس میں لکڑی کے طاق لگے ہیں۔ احاطے کی انتہائی لمبائی ۲۳۲ فٹ اور چوڑائی ۲۰۶ فٹ کے قریب ہے۔ (قدم سے ناپ کر)۔

سمتوں کے لحاظ سے احاطہ اور مزار کے کونے سامنے کا بایاں اور پیچھے کا دایاں مشرق مغرب کی سمت میں واقع ہیں۔ تاہم جو قریب تر ہے۔ ہم اسی کو مشرقی دیوار قرار دے سکتے ہیں یعنی داخل ہونے کا بڑا دروازہ اس لحاظ سے جنوب کی طرف آتا ہے اور مزار کا رُخ جنوبی جانب واقع ہے۔ مزار کی پشت شمالی دیوار کہلائی۔ اس تمام چار دیواری میں کوئی قبر نہیں۔ باہر اس کے نواح میں بھی کوئی قبر نہیں۔ اگر داخلی بڑے دروازے میں سے داخل ہوں۔ تو سامنے پھولوں کی چار لمبی کیاریاں ہیں جن میں درخت بھی لگے ہوئے ہیں۔ کچھ نارنج کے چھوٹے چھوٹے پودے ہیں پانچ بلند و بالا چیل کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ ایک نہایت شاندار سرو کا درخت دائیں طرف کی کیاری میں لگا ہوا ہے۔ باقی احاطے کے بہت سے رقبے میں پھولوں کی کیاریاں موجود ہیں جو ترتیب سے لگائی گئی ہیں۔ کچھ چیلوں کے درخت ان کیاریوں میں اب لگائے گئے ہیں اور وہ ابھی تک بہت چھوٹے ہیں۔

عمارت اس احاطے کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ دو منزلہ عمارت۔ لمبائی ۹۸ فٹ چوڑائی ۲۲ فٹ۔ سامنے اوپر نیچے لکڑی کے جالیدار بستے لگے ہوئے ہیں جو اوپر نیچے پھسلتے ہیں۔ اس عمارت کو کوئی تین فٹ

کی کرسی دیکر بنایا گیا۔ اور تین سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانا پڑتا ہے۔ اس کے مرکز میں اوپر اور نیچے کی منزل میں دو محرابیں ہیں۔ اسی نیچے کی محراب میں سے اوپر جانے کی سیڑھیاں ہیں۔ اوپر کی منزل میں ایک تو مرکزی محراب ہے۔ اس کے دونو طرف دو دو کوٹھڑیاں ہیں۔ ان کوٹھڑیوں میں لوگ آتے ہیں۔ رات بھر ٹھہرتے ہیں۔ عورتیں آتی ہیں۔ یہاں پر قیام کرتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ نیچے کی منزل میں مرکزی محراب کے دونوں طرف دو دو کوٹھڑیاں ہیں۔ دائیں طرف کے کونے کی

مزار سعدی کا خاکہ

(پیمانہ کے مطابق نہیں)
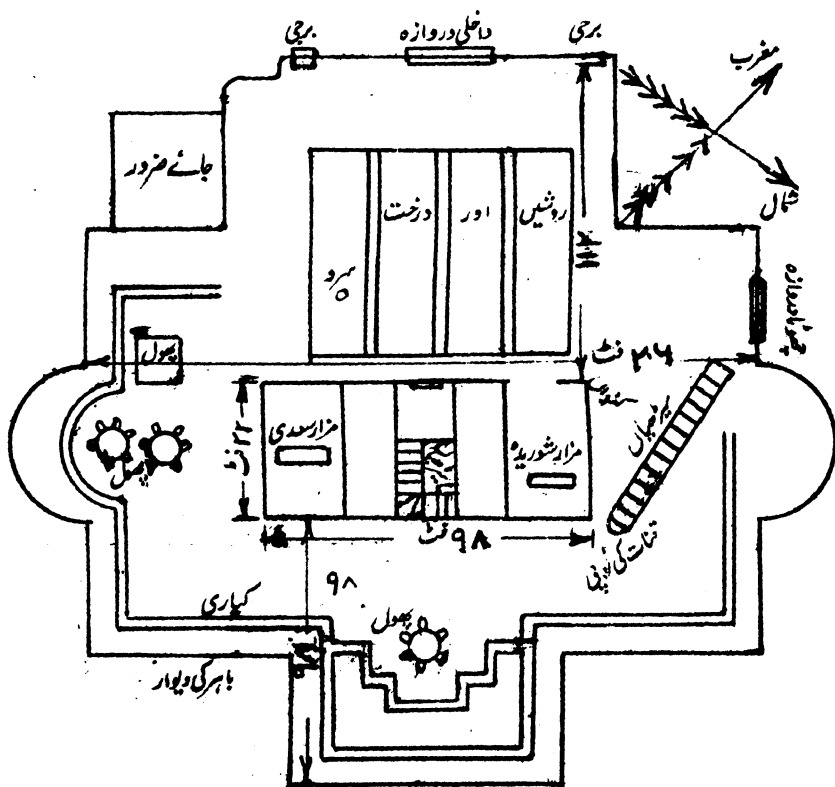
کوٹھڑی میں سعدی کا مزار ہے۔ بائیں طرف کے کونے کی کوٹھڑی میں شوریدہ کا مزار۔ شوریدہ ایک اندھا شاعر تھا۔ منتقی نام۔ فصیح الملک کہلاتا تھا۔ مرا تو موجودہ قوم نے اس کی اپنی خواہش کے مطابق یہاں مزار بنوا دیا۔ اسی کوٹھڑی میں اس کا عکس سرہانے لٹک رہا ہے۔ خطِ نستعلیق میں اُس کا اپنا پتا لکھا ہے۔ اسی کے اشعار سعدی کے مقبرے کے اندر دیواروں پر لگے ہوئے ہیں اور اُس کی اپنی قبر پر بھی۔ اُس کو فوت ہوئے تھوڑا عرصہ ہی ہوا ہے یعنی چند سال۔

اُطاقِ مزارِ سعدی میں داخل ہونے کے دو دروازے ہیں۔ ایک تو باہر بالکل کونے میں چھوٹا سا دروازہ بنا ہوا ہے۔ قفل لگا رہتا ہے۔ کھلوا لینا آسان بات ہے۔ اس سامنے کے رُخ پر مزار کی تمام دیواروں پر لکڑی کے آئینہ دار بستے بنے ہوئے ہیں۔ جو اوپر نیچے پھسلتے ہیں۔ دروازہ بھی اوپر کو چڑھتا ہے۔ مگر آئینے ندارد ہیں یعنی خلا ہے۔ ایک اور دروازہ جنوبی دیوار میں واقع ہے اس میں لکڑی کے طاق لگے ہیں۔

سعدی کی قبر کا تعویذ سنگِ باسی کا بنا ہوا ہے اور زمین سے کوئی ۲۰۔ انچ بلند۔ پہلے ایک فراخ چبوترہ چھ انچ اونچا بنایا ہے۔ اسی پتھر کا۔ اس کا رقبہ اتنا ہے کہ اُس کے کناروں سے چاروں پہلوؤں سے نو انچ کے قریب جگہ چھوڑ کر قبر کا تعویذ کھڑا ہے۔ جس کی اونچائی کوئی ۱۴۔ انچ ہوگی۔ اس چبوترے کے کنارے پر دھات کا بنا ہوا موٹی جالی کا کٹہرا کھڑا ہے جس کو محکم کرنے کے لئے لکڑی کا حاشیہ اور ایک مرکزی تختی لگی ہے۔ اس لکڑی کا رنگ فیروزی ہے۔ یہ کٹہرا کوئی پانچ فٹ بلند ہوگا۔ اوپر سے کھلا ہوا۔ تعویذ کے اوپر یہ لکھا ہے:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انت الباقی وکلُّ شیئ ھالِک

کریم السجایا جمیل الشیم	نبی البرایا شفیع الامم
شفیع الوریٰ خواجۂ بعث و نشر	امام الوریٰ صدر دیوانِ حشر
امامِ رسل پیشوائے سبیل	امینِ خدا مہبطِ جبرئیل
شفیعٌ مطاعٌ نبیٌ کریم	قسیمٌ جسیمٌ نسیمٌ وسیم
نماند بعصیاں کسے درگرو	کہ دارد چنیں سیدِ پیشرو
چہ نعتِ پسندیدہ گویم ترا	علیک الصلوٰۃ اے نبی الوریٰ
درودِ ملک بر روانِ تو باد	بر آلِ تو و پیروانِ تو باد
خصوصاً شہنشاہِ دُلدل سوار	علی ولی صاحبِ ذوالفقار
خدایا بحق بنی فاطمہ	کہ بر قولِ ایماں کنی خاتمہ

اگر طائتم رد کنی در قبول ... من و دست و دامان آل رسول
خدایت ثنا گفت و تبجیل کرد ... زمین بوس قدر تو جبریل کرد
ترا عز لولاک تمکین بس است ... ثناء تو طٰہٰ و یٰسین بس است
بود اہل عالم ز وصف تو لال ... فزون از قیاس است جاہ و جلال

چہ وصفت کند سعدی ناتمام
علیک الصلوٰۃ و علیک السلام

نیچے فرش پر یزد کی بنی ہوئی دری بچھی ہے جس میں نیلے سوت سے نقش بنے ہوئے ہیں۔ اس دری پر لکھا ہے کہ یہ دری شیخ سعدی کے مزار کے لئے وقف ہے اور کسی کو اجازت نہیں کہ یہاں سے اس کو اٹھائے۔ اس طرح سے دوسرے مزاروں پر بھی جو اسی طرح کی دریاں ہیں ان کے اندر رُبنائی میں یہ حرف لکھ دیئے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں تو یہ لازم ہے کہ مقبرہ میں جانے وقت آدمی جوتا کھول دے۔ مگر یہاں یہ رواج نہیں۔ جوتا پہنے آپ اس دری کے اوپر گھوم سکتے ہیں۔ مزاروں پر صاحب قبر کی تصویر لگانے کا یہاں رواج ہے۔ مشرقی دیوار کے مرکز میں شیخ سعدی کی تصویر ایک چوکھٹے میں لگی ہے۔ یہ اس اصل کا عکس ہے جو لندن کے عجائب خانے میں موجود ہے۔ یہ تصویر فرش سے کوئی ساڑھے تین فٹ کی بلندی پر پتھر کے ایک ٹکڑے پر رکھی ہے جس پر خط کوفی میں عربی کے حروف کندہ ہیں۔ یہ پتھر کا ٹکڑا اس تعویذ کا باقی ماندہ ٹکڑا ہے جو ایک ناظم شریعت نے تڑوا دیا تھا۔ اس تصویر کے دونو طرف دو اور چوکھٹے ہیں جن میں آئینے لگے ہوئے ہیں۔ یہ ناظم شریعت شیعہ تھے۔ اور سعدی کو سُنی سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے قبر کو پامال کر دیا۔ اور تعویذ کے ٹکڑے کر دیئے۔ مگر "دشمن چہ کند چو مہرباں باشد دوست"۔ وہ ناظم شریعت مرے اور دنیا کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ سعدی کا مقبرہ پھر سے نیا بن گیا۔

اس کوٹھڑی کی جنوبی دیوار میں یعنی جو داخلی دروازے کے سامنے ہے تمام لکڑی کے چوکھٹے بنائے ہیں جیسے کہ شیشے لگانے کے لئے کھڑکی میں بناتے ہیں مگر شیشے ندارد ہیں۔ اسی پہلو میں دائیں طرف عمارت کے کونے میں بھی ایک دروازہ ہے۔ باقی تین دیواریں اینٹ کی بنی ہوئی ہیں۔ مغربی دیوار میں ایک دروازہ ہے۔ ان تینوں دیواروں کے اوپر کوئی آٹھ فٹ کی بلندی پر اشعار کی دو سطریں تینوں پہلوؤں میں برابر چلی گئی ہیں۔ سبزی مائل سنگ مرمر میں سیاہی سے لکھا ہوا ہے۔ اوپر نیچے حاشیہ آئینے کے ٹکڑوں کا بنایا ہے۔ یہ اشعار شوریدہ کے ہیں اور ان میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح سے قوام ملک جہان کرم حبیب اللہ نے ان کو نئے سرے سے درست

کرایا اور مرمت کیا۔
اس کمرے کی لمبائی ۱۸ فٹ اور چوڑائی بھی اتنی ہی ہوگی۔ چھت سے ایک مٹی کے تیل کا ۱۴ لائن کا لمپ لٹک رہا ہے۔ کمرے کے اندر سفیدی کی گئی ہے۔ چھت محراب دار ہے اور ڈاٹ کا مُنہ شمالاً جنوباً رکھ کر بنائی گئی ہے۔ اور نوک کا خط دکھائی دیتا ہے۔
احاطے کا داخلی دروازہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے اس کے دونوں طرف کونوں پر دو نوکدار بُرجیاں بنی ہوئی ہیں۔ تمام احاطے میں چھوٹے چھوٹے پتھر بکھرے ہوئے ہیں۔ جن سے گرد نہیں اُڑتی۔ جگہ بہت صاف ستھری اور عمدہ ہے۔ لوگ صبح شام تفریح کے لئے آتے ہیں۔ چہارشنبہ تو اس کے لئے مخصوص ہے۔ بڑی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے۔
اس احاطے کے اندر ایک قنات آکر کھلتی ہے جس کو آپ سعدی یا چاہِ سعدی کہتے ہیں۔ مخفی نہ رہے کہ یہاں پہاڑ میں پانی سطحِ زمین کے بہت قریب ہے چونکہ پہاڑ کے سر پر برف پڑی رہتی ہے اور اس کے جسم کے اندر پانی جمع رہتا ہے۔ اس لئے اس میں ایک سوراخ کرتے ہیں یعنی کوآں سا کھودتے ہیں۔ پانی نکل آتا ہے اس پانی کو زمین کے اندر اندر نالی بنا کر نیچے لے جاتے ہیں۔ چونکہ پہاڑ کا پہلو اُونچا ہے اس لئے پانی نیچے کو چلا جاتا ہے۔ یہ نالی کافی بڑی ہوتی ہے مگر کچی۔ اس میں اکثر مقامات پر سیدھا شگاف سطحِ زمین تک کر دیتے ہیں تاکہ ہوا روشنی وغیرہ آئے اور کام کرنے میں آسانی رہے۔ یہ پانی زمین کے نیچے نیچے بہتا چلا آتا ہے۔ اس کی ڈھلوان کو کم رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اس پانی کی اونچائی زمین کی سطح کے برابر ہو جاتی ہے چونکہ زمین زیادہ ڈھلوان ہوتی ہے اس پانی کو کھیتی باڑی کے کام میں لاتے ہیں۔ اور اس سے فصل پیدا کرتے ہیں۔
اسی طرح کی ایک قنات احاطۂ سعدیہ میں کھلتی ہے۔ مگر یہ ابھی سطحِ زمین سے نیچے ہے۔ شاید کوئی تیس فٹ کے قریب۔ کئی سیڑھیاں نیچے جانا پڑتا ہے جو پتھر کی بنی ہوئی ہیں۔ نیچے جاؤ تو ایک دائرہ کی شکل میں کوئی ڈھائی فٹ چوڑا حاشیہ لگا ہوا ہے۔ اندر کا قطر کم و بیش ۱۲ فٹ ہوگا۔ اس کے بیچ میں پانی کی نہر چلتی ہے۔ اس مقام کے عین اوپر زمین میں سیدھا شگاف کر کے اوپر ہوا کے اخراج کے لئے جالی کی ایک ٹوپی سی بنا دی ہے۔ اس قنات کا پانی نہایت ٹھنڈا میٹھا اور مزیدار ہے۔ بیچ میں مچھلیاں بھی ہیں۔ یہاں سے مرد عورتیں پانی بھرنے آتے ہیں۔ شہر کے جو لوگ عورتیں مرد یہاں آتے ہیں وہ نہاتے بھی ہیں۔
اس کو آب سعدی یا چاہِ سعدی کہتے ہیں۔ اچھی خاصی ایک پانی کی نہر ہے۔ کوئی تین فٹ چوڑی ڈیڑھ فٹ گہری۔ صاف شفاف سفید میٹھا اور ٹھنڈا پانی۔ یہی پانی آگے کو بہتا ہے تو مزار کی زیارت کے قریب کے کونے

پر ایک کو اس بنادیا ہے۔ اس میں سے ڈول کے ذریعے پانی نکالتے ہیں۔ بات ایک ہی ہے۔ یہ پانی زمین کے نیچے نیچے آگے جاتا ہے۔ اس کے زور سے دو تین پن چکیاں چلتی ہیں۔ وہ بھی زمین کے اندر کافی گہرائی پر واقع ہیں۔ ایک میں دھان صاف کئے جاتے ہیں۔ پھر یہ پانی باغوں میں جاتا ہے کھیتوں کو سیراب کرتا ہے۔ لوگ اسی میں نہاتے ہیں۔ کپڑے دھوتے ہیں اور اسی کو پیتے ہیں۔

اتفاق کی بات اور خالق دوجہان کی قدرت ہم نے پہلی دفعہ مزار سعدی کو اس روز دیکھا جب یہاں مرد عورتوں اور بچوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ آدمی پر آدمی گرا پڑتا تھا۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ چہار شنبہ تو یہاں کے لئے مخصوص ہے اور ماہ صفر کا آخری چہار شنبہ تو سال بھر کا ایک میلا ہوتا ہے۔ اتفاق سے ہم بھی اُسی روز گئے۔ احاطہ سعدی تو لشکر ملخ کی طرح سے پُر تھا۔ اس کے باہر پانی پر بہت ہجوم تھا اور یہاں سے لے کر شہر کی طرف کوئی ڈیڑھ میل تک پانی کی نہر کے اوپر (یعنی یہی پانی نیچے کو بہتا ہے) تمام عورتیں ہی عورتیں نظر آتی تھیں۔ عورتوں کی تعداد تقریباً آٹھ ہزار ہوگی اور مردوں کی ایک ہزار۔ بس یہی سمجھ لو۔ کہ جس طرح سے گندم کے ایک انبار میں چند دانے جو کے غلطی سے مل جاتے ہیں۔ اس طرح سے کوئی مردانہ چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ سیاہ ریشم کے دل بادل نظر آتے تھے۔ کالی کالی گھٹائیں سفید سفید چہرے۔ مترنم آوازیں اور کبک دری کی چال۔

سعدیہ سے شہر کی طرف آئیں تو غالباً ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے سے باغ دل کشا کی دیوار شروع ہو جاتی ہے۔ گرد تمام اونچی اور کچی دیوار ہے۔ دروازہ جنوب کی طرف صرف ایک ہے۔ بیچ میں دو منزلہ شاندار عمارت بنی ہوئی ہے۔ دُور سے بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ باغ بہت سرسبز ہے اور کافی بڑا ہے۔ ہر طرح کے پودے پھل پھول کے لگے ہوئے ہیں۔

اقوال زریں

لوگ شکایت کرتے ہیں کہ دنیا میں کوئی سچا دوست نہیں ملتا۔ ان کو چاہئے۔ کہ اس بات پر غور کریں آیا وہ بھی کسی کے سچے دوست ہیں۔ اور کسی کے واسطے وہ بھی اپنی پیاری زندگی قربان کرنے کے لئے تیار ہیں؟

(ماخوذ)

پہاڑ کی سیر

(لالہ کوڑو رام صاحب بی اے بی ٹی سیکنڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول کھروڑ پکا)

مجھے تعطیلاتِ گرما میں پچھلے چند سالوں میں کشمیر شملہ ۔ کوئٹہ ۔ کسولی ۔ دہرم پور وغیرہ پہاڑی مقامات کی سیر کا موقعہ ملا ہے ۔ بیمار آدمیوں کو تو خاص خاص حالات میں پہاڑ جانا ہی ہوتا ہے ۔ مگر تندرست اور اوسط درجہ کے آدمیوں کے لئے بھی پہاڑ ایک نہایت صحت بخش اور مفید حیثیت رکھتے ہیں ۔ عام لوگوں میں یہ ایک غلط خیال بیٹھا ہوا ہے کہ پہاڑوں کی سیر تو صرف امیروں کا چوچلا ہے ۔ کسی زمانہ میں شاید یہ مثال صادق آسکتی ہو مگر آجکل تو یہ بالکل خلاف واقعات ہے ۔ موجودہ سائینس کی ترقی نے دنیا کے دُور دراز دشوار گذار مقامات کو نزدیک تر کر دیا ہے سڑکوں اور موٹروں کی چند سالہ ترقی اور ریلوے کی نئی لائینوں کی ایزادی سے اب غریب سے غریب آدمی بھی ان مقامات کی سیر سے لطف اُٹھا سکتا ہے مگر ہم لوگوں میں اس بات کا کھاٹا ہے کہ ہمیں ان باتوں کا مذاق ہی نہیں ہے ۔ یورپ کے ممالک کو لیجئے وہاں لوگ جہاں دن رات اپنے دنیاوی مخمصوں اور دھندوں میں بے حد مصروف رہتے ہیں وہاں وہ اپنی تفریح و آرام کا بھی خیال رکھتے ہیں یہی وجہ ہے ۔ کہ ان ممالک کی اوسط عمر ہندوستان سے تقریبًا دُگنی ہے ۔ یہ بالکل بجا ہے کہ جہاں ہم لوگوں کو کمانا نہیں آتا وہاں لطفِ زندگی حاصل کرنا بھی نہیں آتا ۔ یہاں کے دُکاندار ۔ پیشہ ور ۔ ملازم اور کاشتکار زندگی کا واحد مقصد یہی سمجھتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے ان کو کم تکلیف کرنی پڑے ۔ پیٹ پالنے کے لئے خواہ کتنی مشقت برداشت کرلیں مگر صحیح آرام و تفریح کی طرف ذرا بھی توجہ دینے کو تیار نہیں ۔ ہفتہ میں ایت وار کی رخصت منانا تو ترقی یافتہ ممالک کا معمول ہے ۔ یہ تعطیل ہندوستان میں ہوتی ہے مگر یہ صرف ملازموں کے لئے ہی ہے ۔ دیگر حلقہ کے لوگ بالکل نہیں جانتے کہ تعطیل کیا بلا ہے اور اس کی غرض کیا ہے ۔ البتہ تیوہاروں کے موقعہ پر کچھ نہ کچھ مذہب کے دائرۂ اثر میں کرہی لیتے ہیں ۔ افسوس تو یہ ہے کہ یہاں کے ملازم لوگ بھی تو ایت وار یا تعطیل کا جائز فائدہ نہیں اُٹھاتے وہ اسے محض سونے میں گذار دینگے یا گھر پر دفتری نوشت وخواند میں ۔ برعکس اس کے ترقی یافتہ ممالک کے لوگ باہر سیر کو نکل جاتے ہیں ۔ ایت وار کا تو ذکر کیا ہے لمبی تعطیلات میں بھی وہ گھر پر نہیں رہتے سمندر کی سیر کو یا کسی باہر کے خوبصورت مُلک مثلاً سوئٹزرلینڈ وغیرہ میں نکل جاتے ہیں اور لطف اٹھا کر اپنی تکان رفع کرتے ہیں اور تعطیلوں کے بعد تازہ دماغ اور نئی طاقت لیکر کام میں لگ جاتے ہیں ۔ ہم لوگ تعطیلوں کو

میں نہیں مناتے۔ ہمارے لئے سیر و تفریح یا تماشا محض فضول خرچی اور عیاشی کا مترادف HOLIDAY BRAIT ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں۔ آپ انگریزوں کو دیکھیں معمولی رخصتوں میں بھی کوئی سیر و سفر کو جا رہا ہے کوئی شکار کر رہا ہے کوئی دریا کی سیر اور مچھلی پکڑنے میں مصروف ہے کوئی گھوڑ دوڑ اور پولو میں مشغول ہے کوئی ہینڈ کیمرہ لیکر ارد گرد کے نظاروں کی تصویریں لے رہا ہے کوئی اپنے بال بچوں کو ساتھ لئے دریا یا نہر کے کنارے سیر و تفریح میں مصروف ہے۔ خوبصورت نظاروں اور صحت بخش ہوا اور پھل پھول کے لئے پہاڑ خاص شہرت رکھتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہندوستان کا کوئی صوبہ ایسا نہیں جہاں کہ قدرت نے ایسے دلفزا نظارے مہیا نہ کئے ہوں۔ پھر ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم ان سے فائدہ نہ اٹھائیں ع

چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

ناظرین نے سیر کشمیر، سیر شملہ وغیرہ کے متعلق بہت سے مضامین مفصل پڑھے ہونگے اس لئے میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سال میں کم از کم ایک بار ہر ایک وسط درجہ کا آدمی چند یوم ان مقامات پر جا کر لطف اٹھا سکتا ہے اس سے نہ صرف دماغ اور جسم میں نئی طاقت و فرحت آتی ہے اور کام کرنے کی دُگنی طاقت پیدا ہوتی ہے بلکہ یہ بھی کہ خوبصورت نظاروں صحت بخش ہوا اور آب سرد و گرم کے چشموں۔ پہاڑوں کے جنگلوں اور سبزہ زاروں میووں اور پھل پھول کی کثرت سے قدرت خدا کی طرف دل کھچ جاتا ہے خواہ مخواہ کی تنہائی اور پُرلطف جگہ میں بیٹھکر اس کی عبادت کرنے اور قدرت کے سراہنے کو جی چاہتا ہے خاص خاص صحت افزا مقامات کی زندگی ضرور مہنگی ہے مگر ایک عارضی مسافر و سیّاح کیلئے تو کوئی تکلیف نہیں اکثر حصۂ سفر پیدل چلکر نظاروں سے دُگنا لطف حاصل کر سکتے ہیں۔ ریل یا موٹر کا کرایہ بھی ایسا نہیں کہ معمولی آدمی برداشت نہ کر سکے سچ تو یہ ہے کہ کشمیر کی سیر کا جو لطف اس کو جہلم سے اسلام آباد دا ننت ناگ تک پیدل سفر کرنے میں آیا وہ موٹر کے ذریعے مطلق نہیں آسکتا تھا۔ ان مقامات کی خوشگوار آب و ہوا کے اثر سے معمولی آدمی پندرہ یا بیس میل روزانہ پیدل چلکر بالکل نہیں تھکتا جگہ جگہ پڑاؤ ہیں اور کھانے پینے کا سامان مل جاتا ہے۔ موٹریں ہر وقت دوڑ رہی ہیں۔ دیہات کے لوگ بڑے مہمان نواز ہیں۔ راستے میں دودھ پھل پھول سستا مل سکتا ہے۔ پچھلے دنوں میرا ایک دوست صرف بیس روپے میں کشمیر کی سیر کر کے آیا اکثر حصۂ سفر اس نے پیدل کاٹا ایک ہفتہ سری نگر رہا۔ مسافروں کیلئے ہر ایک جگہ سرائیں گوردوارے اور مساجد موجود ہیں امیروں کیلئے معمولی درجہ سے اعلیٰ درجہ کے ہوٹل موجود ہیں۔ بال بچوں کے ساتھ آدمی جائے تو کفایت رہتی ہے معمولی مکان دس بارہ روپے کرایہ میں لیکر کھانے پینے کے اخراجات میں گھر میں کفایت ہو جاتی ہے البتہ پہاڑ میں رہ کر جو آدمی سست رہتا ہے روزمرہ صبح شام سیر و ورزش نہیں کرتا چشموں اور نظاروں کا لطف نہیں اٹھاتا عمدہ خوراک نہیں کھاتا وہ گھاٹے میں رہتا ہے اس کیلئے پہاڑ میں آنا نہ آنا برابر ہے۔ پہاڑ کا لطف تو اسی وقت ہے کہ آپ زیادہ سے زیادہ وقت کھلی ہوا اور سیر و تفریح میں گذاریں حتیٰ کہ جو مریض بہت کمزور ہو چکے ہوں اور چل پھر نہ سکتے ہوں ان کے لئے پہاڑ مفید ہونے کی بجائے مضر ہیں

خارِ راہ

(بابو منوہر لال صاحب طالب بی اے (آنرز) ایل ایل بی چکوال)

(۱)

خارِ راہ کہتا ہے مجھ سے کس لئے ہے احتراز ۔۔۔ کیا تری دنیا میں کانٹوں کی جگہ کوئی نہیں

سر پہ شاہوں کے دھرا ہے دیکھ تو کانٹوں کا تاج ۔۔۔ وہ شہنشہ باغ و صحرا جن کے ہیں زیرِ نگیں

(۲)

اس لئے کرتا ہے غافل مجھ سے شاید اجتناب ۔۔۔ تا کہ ہو جائے نہ دامانِ تصنّع تار تار

پا بُسی کو میں بڑھوں تو تُو ہٹا لیتا ہے پیر ۔۔۔ اور بڑھ جائے گا کیا ناداں ترا اس سے وقار

(۳)

سُن کے میں بولا۔ کہ جو سمجھا ہے تو میں وہ نہیں ۔۔۔ اس لئے تیرے شکوک اور وسوسے ہیں سب فضول

میری دنیا میں تو کانٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں ۔۔۔ ہیں مرے خارِ تمنا ہی مجھے حسرت کے پھول

حفظانِ صحت
فہرست مضامین
صحتِ طلاب
لالہ موہن لال صاحب ایم اے بی ٹی صفحہ ۲۶۹
پیاس اور برف
ڈاکٹر شیاما چرن صاحب میڈیکل افسر
صفحہ ۲۸۲

(افسر الشعراء علی سکندر صاحب جگر مراد آبادی)

ہاں چلے دور میں ساقی مئے گلفام چلے — دن چلے رات چلے صبح چلے شام چلے

کیسے بیمارِ غمِ عشق کا اب کام چلے — پاؤں دکھنے لگے جب اُٹھ کے وہ دو گام چلے

جھک گئے سر تری دہلیز پہ سب آپ سے آپ — کچھ کسی کی نہ چلی جب ترے احکام چلے

گڑ گیا فرطِ ندامت سے زمیں میں ہمہ تن — نالے جب دل سے نکل کر طرفِ بام چلے

بہ دل کی حقیقت سے تو واقف ہی نہیں — باندھ کر شیخ کہاں جامۂ احرام چلے

کچھ پاس نہیں فکر ہے مے خواری کی — قرض مل جائے کہیں سے تو مرا کام چلے

پاؤں لٹکائے ہوئے قبر میں بیٹھے ہیں جگر
دیر چلنے میں نہیں صبح چلے شام چلے

صحتِ طلاب

(جناب لالہ موہن لعل صاحب ایم اے۔ بی ٹی ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول فاضلکا)

عام طور پر عامۃ الناس بعض باتوں کو غیر ضروری تصور کر کے ان کی جانب کم توجہ دیتے ہیں۔ مگر حقیقتاً ایسی اشیائ جو بادی النظر میں نہایت معمولی دکھائی دیتی ہیں۔ اگر انہیں نظرِ عمیق سے دیکھا جائے۔ تو وہی اشیا نہایت اہم ثابت ہوتی ہیں بعینہ یہی حالت تندرستی کی ہے جس کی طرف لوگ بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس کی قدر و قیمت کو محسوس نہیں کرتے حالانکہ اگر ہم اس کی اہمیت کو سمجھیں۔ تو ہمارے طلبا اور عام بھائیوں کی جسمانی حالت اتنی کمزور نہ ہو جس قدر آج ہمیں دکھائی دیتی ہے ہم وہ توجہ صحت کی طرف نہیں کرتے۔ جو ہمیں ضروری طور پر کرنی چاہیئے۔ اس بے توجہی کا خمیازہ جو ملک بھگت رہا ہے۔ سب پر عیاں ہے۔

ہمارے ملک میں بیماری اور موت نے گھر بنا لیا ہے۔ صحت عامہ کا یہ حال ہے۔ کہ یہاں ہر سال دس لاکھ آدمی مرضِ تپ دق کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بعض بعض شہروں میں فی ہزار ۵۰۰ بچے سال میں اپنے والدین اور لواحقین کو داغِ مفارقت دے جاتے ہیں۔ ایک ہندوستانی کی اوسط عمر ۲۳ سال ہے۔ برعکس اس کے زیادہ مہذب اور شائستہ ممالک کے باشندوں کی اوسط عمر ۴۵ سے ۵۵ سال تک ہے ع ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بہ کجا۔

ڈاکٹری معائنہ کے مطابق طلباء کی صحت کا یہ حال ہے کہ ایامِ طفلی میں ۷۰ فیصدی طلبا کے دانت خراب ہو جاتے۔ پچاس فیصدی کی بینائی کمزور ہو جاتی ہے۔ ستر فیصدی گلے کی شکایت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ غرض صحیح الجسم طلباء کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ اس صورت میں ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ ہمارے طلاب کی صحت ویسی طمانیت بخش نہیں جیسی کہ ہونی چاہیئے۔

انسانی جسم ایک بے نظیر مشین ہے۔ اس کا ایک ایک پرزہ ایسا بے بہا ہے کہ اگر خدانخواستہ انگلی جسم سے کٹ جائے۔ تو پھر ویسی انگلی مطلق نہیں بن سکتی۔ دانت ٹوٹ جائے۔ تو دنیا کے تمام دندان ساز ویسا دانت ہرگز نہیں بنا سکتے۔ بدقسمتی سے کہیں آنکھ پھوٹ جائے۔ تو دنیا کے تمام چشم ساز مل کر ویسی قدرتی آنکھ نہیں بنا سکتے۔ الغرض آنکھ۔ دانت۔ زبان یعنی جسم کا ہر ایک عضو ایک نایاب پرزہ ہے۔

ہمیں خداوند کریم کا بار بار شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ کہ ہمارے تمام اعضاءِ جسم صحیح و سالم ہیں۔ ہم آنکھوں سے قدرت کے عجیب و غریب مناظر کا مطالعہ کر کے محظوظ ہوتے ہیں۔ اور کانوں سے قدرت کی دلفریب و دلکش راگنیوں کو سن کر مسرور ہوتے ہیں۔ اور زبان سے قدرت کی گوناگوں اور بوقلموں اشیاء کا ذائقہ چکھ کر شکریہ بجا لانے میں مشغول ہوتے ہیں۔

یہ جسم قدرت کی دی ہوئی پاک امانت ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس امانت میں خیانت نہ ہونے دیں۔ ورنہ ہم کو تمام عمر پچھتانا ہوگا۔ مگر ع پھر پچھتائے کیا ہووت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

ذرا غور سے سوچیں کہ ہمیں جسم کیوں عطا ہوا۔ اور جسم کا خیال رکھنا کیوں ضروری ہے؟ اس کے جواب میں کسی نے کیا خوب کہا ہے" جان ہے تو جہان ہے"۔ بغیر صحت کے دُنیا کی تمام نعمتیں ناکارہ ہیں۔ تمام مناظر قدرت بے معنی ہیں۔ جسمانی صحت نہ ہو تو تاجر اپنے کاروبار میں فروغ نہیں پا سکتا۔ طالب علم اپنے اعلیٰ مقاصد میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ عابد اپنی عبادت میں پورا نہیں اُتر سکتا۔ ملک کا مدبر اپنے فرائض کی ادائیگی میں قاصر رہ جاتا ہے۔ غریب اپنی شکم پروری نہیں کر سکتا۔ المختصر تندرستی کے بغیر علمی، اخلاقی، روحانی، مجلسی اور اقتصادی ترقی ناممکن ہو جاتی ہے۔ سچ ہے "تندرستی ہزار نعمت ہے"۔ یہ وہ نعمت ہے۔ جس کے مقابلے میں دُنیا کی تمام نعمتیں ہیچ ہیں ؎

تندرستی ہزار نعمت ہے ✣ قدرِ صحت مریض سے پوچھو

مدرسین کے فرائض دربارہ صحتِ طلبا۔

مدرس کو چاہئے کہ اول تو خود صحت کے اصولوں سے بخوبی واقف ہو اور اُن پر عمل پیرا ہو۔ اور پھر طلبا پر اُن اصولوں کی اہمیت واضح کرے۔ اس کے علاوہ اُسے عام بیماریوں کی تشخیص اور علاج معالجے کے متعلق آگاہی حاصل کرنی چاہئے۔ دانت بینائی۔ گلے وغیرہ کا معائنہ کرنا سیکھنا چاہئے۔ ہفتہ وار اپنی جماعت کے طلبا کی پوشاک۔ ناخن اور دانتوں کا ملاحظہ کرے۔ ہر ماہ اُن کے گلے اور آنکھ کا ملاحظہ کرنا لازمی سمجھے۔ نیز اُن کی چھاتی کا ناپ اور وزن کا ریکارڈ رکھے۔ الغرض ہر ایک طالب علم کے متعلق جسم کی صفائی۔ بینائی چشم اور دانتوں وغیرہ کے متعلق مکمل ریکارڈ رکھے۔ اور ان کے والدین سے رابطۂ اتحاد پیدا کر کے ان تمام کمزوریوں کے قلع قمع کرنے میں ہمہ تن کوشاں رہے۔

کم از کم ہفتہ میں ایک دفعہ ضرور طلبا کو تندرستی کے متعلق ہدایات دینی چاہئیں۔ گاہ بگاہ جماعت میں کسی ڈاکٹر صاحب کا لیکچر کرانا چاہئے۔ اور کمرۂ جماعت میں صحت کے متعلقہ موٹے موٹے اصول جلی حروف میں لکھوا کر لگانے چاہئیں۔ جو نمونہ کے طور پر دیئے جاتے ہیں کبھی کبھی نمائش صحت کے ذریعہ طلبا پر صحت کے اصول منقش کرے۔ نیز بڑی جماعتوں کے طلبا کی صحت کے لٹریچر میں دلچسپی بڑھائی جائے۔

مدرسین کی مشکلات اور اس کا حل۔

اکثر استاد کم فرصتی کی شکایت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پڑھائی کا کام اتنا ہوتا ہے کہ کسی اور کام کے لئے وقت نہیں۔ مگر انہیں یاد رکھنا چاہئے۔ کہ تعلیم کا مقصد محض طلبا کو امتحان پاس کرانا نہیں۔ بلکہ ساتھ ہی اُن کی اخلاقی اصلاح اور جسمانی فلاح بھی مطلوب ہے۔ مزید برآں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اگر طلبا کی صحت عمدہ ہوگی۔ تو اُن کا دماغ روشن ہوگا۔ اور زیادہ کام کر سکینگے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پڑھائی میں ترقی ہوگی۔ اُستاد کا کام پیشتر سے بیشتر تشفی بخش ہوگا۔

اس اہم مضمون پر جس قدر خامہ فرسائی کی جائے۔ کم ہے جغرافیہ حساب اور تاریخ کی تعلیم انتظار کر سکتی ہے۔ انگریزی اور اردو کی تعلیم بھی انتظار کر سکتی ہے۔ مگر حفظانِ صحت اور اصول تندرستی کی تعلیم کا انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ جب مدرسے میں کوئی لڑکا پہلی جماعت میں داخل ہو۔ تو پہلی تعلیم جو اُسے دینی چاہئے۔ تندرستی کے متعلق ہو۔ مطلب یہ ہے کہ مدرّس کو طالب علم کے دل پر نقش کر دینا چاہئے۔ کہ اس کا اوّلین فرض جسم کی نگہداشت ہے۔ دماغ اور چلن کی تربیت دوسرے درجہ پر ہے۔

آج کل یہ دیکھکر سخت افسوس ہوتا ہے کہ طلبار کو حساب۔ تاریخ۔ جغرافیہ میں خوب مہارت۔ انگریزی اور اردو زبان دانی میں خوب لیاقت ہوتی ہے۔ بلکہ سکول کا کوئی مضمون نہیں۔ جس پر عبور نہ ہو۔ مگر صحت کے اصولوں سے مطلق شناسائی نہیں ہوتی طلبار کے لئے تاریخ جغرافیہ حساب اور انگریزی پڑھنا ضروری ہے۔ مگر تندرستی کے اصولوں کا جاننا بھی بے حد ضروری ہے۔ امتحان کے ڈر سے طلبار مضامین سکول کی طرف کافی سے بھی زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ مگر انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ انہیں تندرستی کا امتحان بھی دینا پڑے گا۔ تاریخ۔ جغرافیہ۔ حساب اور انگریزی کا امتحان تو کبھی کبھی دینا پڑتا ہے۔ مگر تندرستی کا امتحان روزانہ دینا ہوگا ؀

ہدایات دربارہ خوراک

(نوٹ) یہ صرف نمونہ کے چارٹ ہیں۔ اسی طرح سے مدرّس صاحب عام اصولِ صحت۔ صفائی۔ آنکھوں۔ ورزش کے متعلق چارٹز تیار کر سکتے ہیں۔

(۱) عمدہ۔ سادہ۔ تازہ اور مقوی غذا کھاؤ۔ اور خوب چبا چبا کر۔ کیونکہ ایسا کرنے سے لعابِ دہن جو غذا کے ہضم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ بہت مقدار میں پیدا ہوگا۔ اگر بغیر چبائے غذا جلدی جلدی نگل جاؤ گے۔ تو دانتوں کا کام معدے کو کرنا پڑے گا۔ اور معدہ کمزور ہو جائے گا۔

(۲) صبح اور شام کے کھانے کے درمیان کم از کم چھ گھنٹہ کا وقفہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ غذا تین گھنٹہ سے پانچ گھنٹہ تک کے اندر ہضم ہوتی ہے ؀

(۳) کھانے وقت اتنا پانی مت پیو۔ جو معدے سے خارج شدہ رس کو تحلیل کرکے اس کی طاقت میں کمی پیدا کر دے اور خوراک کو پتلا اور ناقابلِ ہضم کر دے۔ غذا کے درمیان آدھ گلاس پانی کافی ہوگا۔

(۴) کھانے میں پابندئ وقت کا خیال رکھو۔ بغیر بھوک اور بھوک سے زیادہ مت کھاؤ۔ ورنہ بدہضمی کا شکار ہو جاؤ گے ؀

(۵) کھانے کا کمرہ صاف۔ ہوادار اور روشن ہو اور ہر قسم کی گندگی سے دور ہو۔ بہتر ہوگا اگر اس کمرے کے دروازے

اور کھڑکیاں جالی دار ہوں۔ تاکہ مکھیاں اندر نہ داخل ہو سکیں۔

(۶) پکے ہوئے پھلوں کے رس جسم کے زہر کو خارج کرتے ہیں۔ دماغ اور معدہ کو تقویت دیتے ہیں۔ اور دل کو فرحت بخشتے ہیں۔ آم۔ انگور اور گنا خون کو بڑھاتے ہیں۔ سنگترہ اور انجیر خون کو صاف کرتے ہیں۔ مُولی تلی کے لئے۔ تربوز اور انار یرقان ۔ ۔ ۔ کے لئے مفید ہیں۔ لہذا سبزیات اور پکے ہوئے پھلوں کا استعمال صحت کے لئے مفید ہے۔

(۷) کچے یا گلے سڑے پھلوں۔ لال مرچ۔ کھٹائی۔ تیل والی ۔ باسی اور گرد آلودہ اشیاء سے پرہیز کرو۔

(۸) کھاتے وقت غم و غصہ اور تفکرات کو پاس مت پھٹکنے دو۔

(۹) ڈاکٹر ڈیولی کی رائے میں ایک معمولی آدمی کے لئے غذا کی حسب ذیل مقدار ضروری ہے:-

(۱) پروٹیڈ یا پروٹین ۔ ۲ چھٹانک
(۲) چکناہٹ و چربی ۔ ۱½ چھٹانک
(۳) نمک ۔ ایضاً
(۴) چینی و میدہ ۔ ۷ چھٹانک
} کل ۱۲ چھٹانک

(۱۰) کھانے سے پہلے ہاتھ دھوؤ۔ اور کھانے کے بعد نمکین یا صاف پانی سے کلی کرو۔

اشیاء خوردنی میں غذائیت کی مقدار

(نوٹ) تمام اقسام کی اشیاء کی غذائیت کی مقدار دینا مشکل ہے۔ صرف طلباء کے لئے مفید خوراک کی غذائیت کی مقدار دی جاتی ہے۔

نام غذا	پروٹین کی مقدار	چربی اور روغن کی مقدار	چینی اور میدہ کی مقدار	نمک کی مقدار	پانی کی مقدار	مقدار حرارت پیدا کنندہ اجزا	
دودھ گائے	۴٫۱	۳٫۹	۵٫۲	۰٫۸	۸۶٫۰	۱۴٫۰	(۱) پروٹین غذا کا وہ حصہ ہے
بالائی	۴٫۰	۶۵٫۰	-	۰٫۴	۲۸٫۶	۶۹٫۴	جو جسم کی اس قوت کو بحال کرتا ہے
پنیر	۲۸٫۴	۳۱٫۱	-	۴٫۵	۳۶٫۰	۶۴٫۰	جو بوجہ کاروبار زائل ہو جاتی ہے
مکھن	-	۸۶٫۴	-	۰٫۸	۱۲٫۶	۸۷٫۲	اسکے بغیر زندگی محال ہے۔
دالیں	۲۵٫۱	۲٫۳	۵۵٫۸	۲٫۸	۱۰٫۲	۸۶٫۰	(۲) چربی اور روغن کا تعلق جسم سے
سبزی ترکاری	۱٫۴	۰٫۳	۸٫۶	۰٫۸	۸۷٫۷	۱۱٫۱	ویسا ہی ہے جیسا تیل کا کسی مشین سے
تازہ پھل	۱٫۰۱	۰٫۹	۱۶٫۰	۰٫۶	۸۱٫۴	۱۸٫۵	بغیر تیل مشین کے پرزے جلد گھس
اناج غلہ	۱۰٫۶	۲٫۳	۷۲٫۵	۲٫۱	۱۲٫۰	۸۷٫۵	جاتے ہیں۔

صحت اور دولت کا مقابلہ

(۱) صحت ہو تو دولت کمائی جا سکتی ہے مگر دولت سے صحت خریدی نہیں جا سکتی۔
(۲) دولت سے عینک خرید سکتے ہیں۔ بینائی نہیں۔
(۳) دولت سے نرم نرم توشکیں اور گدیلے خرید کر سکتے ہیں۔ نیند نہیں۔
(۴) دولت سے لذیذ اور مزے دار غذا حاصل کر سکتے ہیں۔ بھوک نہیں۔
(۵) دولت سے زیورات خرید سکتے ہیں۔ خوبصورتی نہیں۔
(۶) دولت سے پیانو۔ ہارمونیم اور ستار خرید سکتے ہیں۔ طاقت شنوائی نہیں۔
(۷) دولت سے مغزیات اور مقویات خرید سکتے ہیں۔ جسمانی طاقت نہیں +

ھدایات درباره حفاظتِ دندان

(۱) دن رات میں دو دفعہ مسواک ضرور کرو۔ ایکبار سونے سے پہلے۔ دوسری بار سونے کے بعد یعنی صبح سویرے۔ سونے سے پہلے مسواک کرنا زیادہ ضروری ہے۔ تاکہ کھانے کے ریزے دانتوں میں اڑے نہ رہ جائیں۔ ورنہ وہ تمام رات سڑ کر دانتوں کو خراب کر دیں گے۔
(۲) گاہے گاہے کڑوے تیل اور نمک کا منجن ملو۔ یا پھٹکری کو پانی میں حل کر کے غرارے کرو۔ یا کوئلہ و نمک (برابر حصہ) کپڑ چھن کر کے ملو۔ یا کھانے کا سوڈا اور نمک کا منجن استعمال کرو۔
(۳) روٹی موٹے آٹے کی بنی ہوئی گاجر۔ شلغم۔ مولی وغیرہ وغیرہ خوب چبا چبا کر کھاؤ۔ تاکہ دانتوں اور جبڑوں کی ورزش ہو +
(۴) دودھ اور میوہ جات کا خوب استعمال کرو۔ کیونکہ ان میں غذا کے وہ اجزا شامل ہیں جو دانتوں کو مضبوط کرتے ہیں +
(۵) پان اور میدے سے پرہیز کرو۔ یہ دانتوں کیلئے مضر ہیں +
(۶) صرف مائعات پر زندگی بسر کرنا نہ سیکھو۔ ورنہ دانتوں کی ورزش نہ ہو گی +
(۷) یاد رکھو۔ دانتوں سے اپنی قبر نہ کھود دیئے۔ خراب دانتوں کی وجہ سے کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ جس کا نتیجہ دردِ شکم بدہضمی۔ پیچش۔ کمزوری اور آخر کار موت ہوتا ہے +

چاء اور برف

(جناب شیاما چرن صاحب ورما میڈیکل آفیسر)

مندرجہ عنوان دو چیزیں ایسی ہیں کہ ان کا رواج ہمارے ملک ہندوستان میں عام اور مضبوط ہو گیا ہے۔ جبکہ ان ممالک کے باشندگان کہ جن کو ان کی ضرورت ہے اور جن سے ہم نے ان کا استعمال نقل کیا ہے۔ خود یا اُن کے اطبّا ء یکزبان ہو کر کہہ رہے ہیں۔ کہ یہ اشیاء مضر صحت ہیں۔

نہ صرف چاء بلکہ قہوہ (کافی) اور کوکو کا استعمال بھی نقصان دہ ہے۔ "اگر تکان ہو جائے۔ تو ان کو پی لیا جائے تکان دور ہو جائے گی۔ نیند آتی ہو تو ان کے استعمال سے وہ رفع ہو جائے گی۔ اور شبانہ روز جاگے جائیے۔ کھانا کھانے کا موقعہ نہ ہو۔ ان میں سے ایک پی لیجئے۔ اور دو تین یوم مبلک غذا نہ کھائیے۔ نہ نڈھال پن ہوگا۔ نہ کمزوری محسوس ہوگی۔ بلکہ ان کے پینے سے چستی اور پھرتی آجائے گی" بظاہر تو بڑے ہی فائدے ہیں۔

لیکن تکان کا باعث ہے جسم میں غذا کی ضرورت۔ اور اس کا حقیقی دفعیہ یہ ہے کہ غذا کھائی جائے۔ مگر چاء اور قہوہ غذا نہیں۔ جسم کا بادشاہ دماغ ہے۔ مادی اشیاء تک کو آرام کی ضرورت ہے۔ نہ کہ اشرف المخلوقات کے سب سے زیادہ ضروری عضو دماغ کو اُسکے آرام (نیند) سے محروم کیا جائے۔ اسی طرح غذا نہ کھانا اور وقت گزارے جانا کیونکر مفید ہو سکتا ہے۔ نیند کا نہ آنا اور بھوک کا نہ لگنا مرض ہیں۔ اور ان کی دوا کرنا پڑتی ہے۔ جب کہ ایسی ادویہ یا اشیاء استعمال کی جائیں کہ یہ امراض پیدا ہو جائیں۔ اور ہم اس طرف متوجہ نہوں؟

البتہ یہ ضرور ہے کہ چاء کی نسبت قہوہ اور قہوہ کی نسبت کوکو کم مضر ہیں۔ مگر مضر سب ہی ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہ نباتی قسم کی ادویہ ہیں۔ نہ کہ اغذیہ۔ اور دوا اور غذا میں فرق یہ ہے کہ غذا تو جزوِ بدن بنتی ہے اور ہر روز کھائی جاتی ہے۔ مگر دوا جزوِ بدن نہیں بنتی۔ اور کسی جسمانی تکلیف (یعنی بیماری) کے رفع کرنیکے لئے کسی معالج کی ہدایت کے مطابق استعمال کی جاتی ہے۔ اسی طرح بہت سی اشیاء ہیں کہ موقع و محل پر ان کا استعمال موت یا مرض سے بچاتا ہے اور بلا موقع اندھا دھند تقلید میں استعمال کرنا صحت کو کھو دیتا ہے۔ ہم انسان اشرف المخلوقات ہیں۔ اسلئے ہمیں لازم ہے کہ عقل سے کام لیں اور بغیر سوچے سمجھے کسی کام کو نہ کریں۔

سرد ممالک کے علاوہ ہندوستان کے سرد حصوں مثلاً پہاڑوں وغیرہ پر اگر کبھی کبھار چاء وغیرہ استعمال کریں۔ اور وہ بھی کسی طبیب کے بتلانے پر تو کوئی حرج نہیں۔ یا موسم سرما میں گاہے ماہے سردی رفع کرنیکی غرض سے۔ یہ بھی جائز ہے لیکن ملک کے دیگر گرم حصوں میں اور خصوصاً موسم گرما میں چاء وغیرہ کا استعمال سخت مضر ہے اور ہر شخص اگر غور کرے گا۔ تو

تجربہ اس کو ضرور ظاہر کردے گا۔ کہ یہ مثل بالکل لغو ہے کہ "گرمیوں میں گرم چاء نہایت ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔
اب رہا برف کا استعمال۔ جسے گرمیوں کے موسم میں تشنگی رفع کرنے کی غرض سے برتا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے خواندہ بھائی اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ برف کی تاثیر گرم ہے۔ گو براہ راست (یا بالفعل) اس کا اثر سرد ہے۔ اس بنا پر موسم گرما میں گرم شے کا استعمال ہرگز مفید نہیں ہوسکتا۔
میرے ایک دوست کھانا کھاتے وقت زیادتی کے ساتھ برف ڈال کر پیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ان کو معہ اہل وعیال کے سوء ہضمی کی شکایت ہوگئی۔ اور جب میری ہدایت کے مطابق انہوں نے برف کا استعمال (خاص کر کھانے کے وقت) ترک کر دیا۔ تب جاکر وہ شکایت رفع ہوئی۔
فی زمانہ دانتوں اور مسوڑوں کے امراض بہت دیکھے جاتے ہیں۔ خاصکر دانتوں پر زیادہ گرم اور زیادہ سرد اشیاء چھونے سے اسی قسم کا بد اثر ہوتا ہے۔ جیسا کہ تیز روشنی کے آنکھوں پر پڑنے سے بصارت کو ہوتا ہے۔ اب واضح ہو کہ چاء بہت ہی گرم۔ اور برف اگر پانی میں ملائی جائے۔ تو نہایت سرد بن جاتی ہے۔ بعض صاحبان خاص کر بچے برف کی ڈلیاں چبایا کرتے ہیں۔ یہ بہت ہی مضر ہے۔ اور اس کا انسداد کیا جانا نہایت ضروری ہے۔
چاء۔ قہوہ۔ کوکو کی طرح برف بھی ایک دوا ہے۔ اور دماغی امراض اور تیز بخاروں میں حرارت کم کرنے اور سکون پیدا کرنے یا جریان خون بند کرنے کیلئے برف نہایت عمدہ شے ہے۔ دوا ہے کونسی چیز؟ صرف وہ چیز کہ جس کے خواص وفوائد سے ہم لوگ واقف ہیں۔ چنانچہ قدرت نے ہر شے حتیٰ کہ مٹی۔ راکھ۔ کوئلہ اور چھوٹی سے چھوٹی حقیر سے حقیر چیز میں انسانی امراض کو دور کرنیکی خاصیت عطا کی ہے +

(بقیہ صفحہ ۴۸۶)

کی کوشش کے ساتھ تعلیم نسواں کے پوتر کام پر ہمدردانہ تبصرہ کیا جاتا ہے۔
ایجوکیشنل گزٹ ۔ یہ ماہوار تعلیمی جریدہ جالندھر سے سردار سردار سنگھ کے اہتمام سے شائع ہوتا ہے۔ پالیسی عام ہے۔ اپنی کوششوں میں رہنمائے تعلیم کا مدمقابل ہے۔
تعلیم وتربیت ۔ مولوی فیروزالدین اینڈ سنز مالکان فیروز پرنٹنگ پریس سرکلر روڈ۔ لاہور کا ماہوار ادبی رسالہ ہے۔
پریم ۔ بچوں کا باتصویر ہفتہ وار اخبار مولانا تاجور اور لالہ چرنجیو لال صاحب ماتھر کی ادارت میں میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز تاجران کتب انارکلی لاہور کی طرف سے ملک کے نونہالوں کی تعلیمی دلچسپیوں کا موجب بنا ہوا ہے۔

ہمارے تعلیمی معاصر

"رہنمائے تعلیم" کی جوبلی کے مبارک موقع پر بمصداق ؎ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے، ہم نے اپنے تمام تعلیمی ہمعصر اہلِ قلم و جرائد کے نام دعوتی خطوط ارسال کئے تھے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے۔ کہ بعض اصحاب کثرتِ مصروفیت کی وجہ سے اس علمی خوانِ یغما کے لطف سے بہرہ اندوز نہ ہو سکے۔ لیکن اس نمبر کی ہمہ گیری اس بات کی متقاضی ہے۔ کہ ہم پنجاب کی تعلیمی صحافت کے متعلق حسب گنجائش روشنی ڈالنے کا فرض ادا کریں۔

پنجاب کے تعلیمی رسائل میں سب سے قدیم رسالہ آپ کا رہنمائے تعلیم ہے۔ جس کا جوبلی نمبر آپ کے ہاتھوں میں اُسکی تمام سرگزشت کا مرقع ہے۔

روشنی۔ جو نصابی سائنس کا ماہوار جریدہ ہے۔ یہ اغلباً تعلیمی صحافت کی سرگرمیوں کا دوسرا نقشِ ثانی ہے۔ اسکی باگ ڈور الیس۔ پی۔ الیس۔ کے سوسائٹی لاہور کے ہاتھ میں ہے۔

رفیق التعلیم اور **گلدستہ** رائیصاحب لالہ رگھوناتھ سہائے صاحب بی اے ہیڈ ماسٹر دیال سنگھ ہائی سکول لاہور کے مرہونِ احسان ہیں۔ اغلباً رفیق التعلیم ہی پہلا رسالہ ہے۔ جس میں تعلیمی مشاہیر پنجاب کے فوٹو اور سوانح حیات شائع ہونے شروع ہوئے۔ گلدستہ بچوں کا ہفتہ وار اخبار ہے۔ جس میں مغربی زبانوں کے تراجم کو شائع کیا جاتا ہے۔

پھول۔ بچوں کا سب سے پہلا ہفتہ وار اخبار ہے۔ جو مولوی سید ممتاز علی صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ اس میں قدیم الف لیلہ کے خلاف از عقل قصوں کو خوب نکھارا جاتا ہے۔ جس سے سلف کی تہذیب۔ مبالغہ آمیز قصے کہانیوں کا لباس اتار کر واقعیت اور حقیقت کا جامہ پہن کر مرغوب طبع ہو رہی ہے۔

نونہال۔ یہ پیارے نام کا ہفتہ وار بچوں کا اخبار "ہزار داستان" کا توام بھائی تھا۔ ہزار داستان کی تو اب صرف داستان ہی باقی رہ گئی ہے۔ لیکن نونہال اب بہت سی سرپرستیوں کے بعد منشی نور محمد صاحب خوشنویس کے زیر اہتمام چل رہا ہے۔

تعلیم۔ زیر ادارت منشی طالب علی صاحب پابند سابق اڈیٹر رہنمائے تعلیم لاہور سے ہفتہ وار شائع ہوتا ہے۔ جو اپنی یگانہ حیثیت میں ایک کامیاب اخبار ہے۔

اتالیق۔ یہ ہفتہ وار تعلیمی اخبار زیر اڈیٹری منشی فضل محمد خاں لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ جس میں یونیورسٹی کی تعلیمی کوششوں کی اشاعت کے علاوہ آزاد تعلیمی کوششوں کو بھی شائع کیا جاتا ہے اور استادوں اور والدین کو پاس پاس لانے
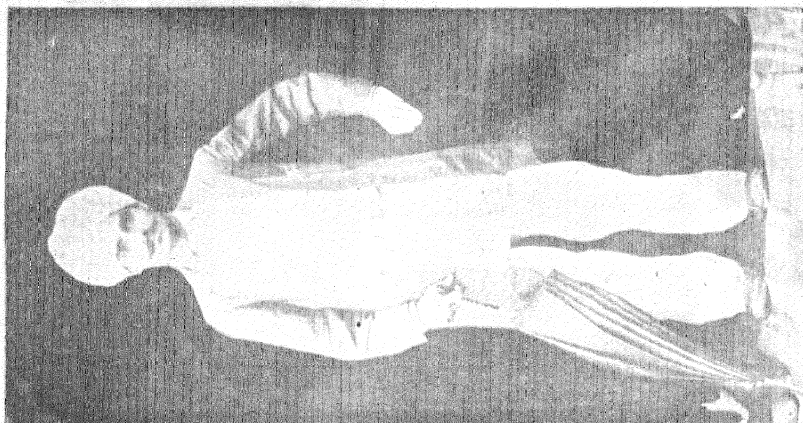
مولوی فضل الدین صاحب فیاض ہریانوی بی۔ اے۔

لالہ رام کشن صاحب کھنّہ بی۔ اے۔ (آنرز) بی۔ ٹی۔
اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس انبالہ۔
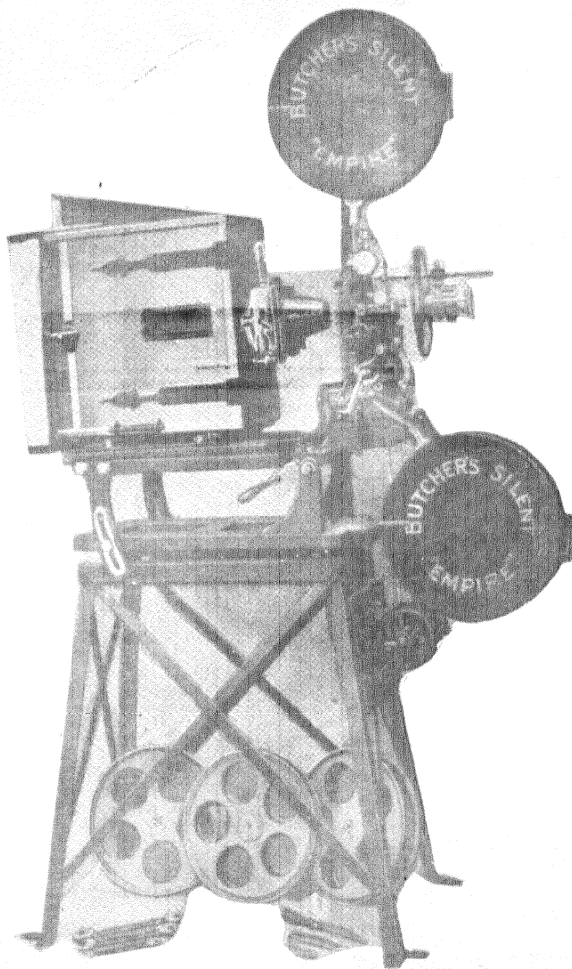
موجودہ سنیما مشین

فہرست مضامین

متحرک تصاویر

(لالہ بہاری لال صاحب بی اے بی ٹی سنٹرل ماڈل سکول لاہور)

متحرک تصاویر کا اصول

اگرچہ بارش زمین پر قطروں کی صورت میں ہوتی ہے۔ لیکن آسمان سے آتے ہوئے وہ اس طرح دکھائی دیتی ہے گویا پانی کی دھاریں بہ رہی ہیں سلگتی ہوئی دیاسلائی کو جب گھمایا جائے یا تیزی سے ہلایا جائے تو آگ کا ایک گھیرا یا لکیر سی نظر آتی ہے۔ عام فہم والا انسان سمجھ سکتا ہے۔ کہ بارش کا قطرہ یا دیاسلائی کا سلگتا ہوا سرا ایک ہی وقت میں دو جگہ پر نہیں ٹھہر سکتا۔ لیکن ظاہرا طور پر ہم دیکھتے ہیں۔ کہ بارش کے قطرے پانی کی دھاروں کی شکل میں اور دیاسلائی کا سلگتا ہوا سرا آگ کی ایک لکیر سی نظر آتی ہے۔ بہت کم اشخاص نے کبھی اس بات پر غور کیا ہوگا۔ کہ یہ ایسا کیوں ہوتا ہے لیکن یہ تو شاید ہی کسی کو سوجھتا ہو۔ کہ جس قدرتی اصول پر یہ ایسا دکھائی دیتا ہے۔ اسی اصول پر آج کل کے بڑے بڑے سینما کام کر رہے ہیں۔

اس عجوبے کی وجہ قائمی نقش ہے۔ آنکھ روشنی کے لئے نہایت سریع الحس ہے۔ وہ ہر ایک چیز کو نہایت سرعت سے دیکھ سکتی ہے۔ یہاں تک کہ بجلی کا شرارہ جو سیکنڈ کے $\frac{1}{1000000}$ حصہ سے زیادہ نہیں ٹھہرتا۔ وہ بھی آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ اور اس کا تصور اتنی ہی تیزی سے زائل نہیں ہوتا۔ تجربات سے معلوم کیا گیا ہے۔ کہ کسی چیز کا تصور آنکھ پر $\frac{1}{10}$ سے $\frac{1}{20}$ سیکنڈ تک رہ سکتا ہے۔ اسلئے جب ہم بارش کو دیکھتے ہیں۔ تو اس سے پہلے کہ ایک قطرے کا تصور آنکھ سے زائل ہو دوسرا قطرہ سامنے آجاتا ہے۔ اور وہ سب قطرے پانی کی ایک دھار سی دکھائی دیتے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر ایک ہی چیز یا مختلف چیزوں کی کچھ حالتیں یکے بعد دیگرے آنکھ کے سامنے آتی جائیں اور ان کی رفتار ان کے تصور زائل ہونے کی رفتار سے بہت زیادہ ہو۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ اگر وہ ایک ہی چیز کی مختلف حالتیں ہیں۔ تو اس چیز کی ایک تصویر بہت دیر تک آنکھ کے سامنے رہیگی۔ اور وہ حرکت کرتی نظر آئیگی۔ اور اگر مختلف چیزوں کی شکلیں ہوں۔ اور وہ بھی ایک خاص ترتیب اور رفتار سے آنکھ کے سامنے سے گزریں۔ تو سب کی سب چلتی پھرتی مختلف حرکات کرتی نظر آئینگی۔

مثلاً ایک آدمی بازار میں دوڑ رہا ہو۔ اور اس بات کی فلم تیار کی گئی ہو اور تیار ہو چکنے کے بعد ہم تماشا گاہ میں بیٹھے اُس کو دیکھ رہے ہیں۔ تو پہلے ہم دیکھینگے کہ آدمی نے ایک خاص جگہ سے دوڑنا شروع کیا ہے۔ دوسری تصویر میں بازار تو ویسے کا ویسا ہی نظر آئیگا۔ البتہ آدمی پہلے سے ذرا آگے ہوگا۔ اگلی تصویر میں بھی بازار ویسا ہی ہوگا۔ لیکن آدمی ذرا اور آگے پہنچ گیا ہوگا۔ اور ابھی یہ تصویر ہماری نظروں سے مٹنے نہ پائیگی کہ چوتھی تصویر میں بازار بدستور سابق اور آدمی ذرا اور آگے دکھائی دیگا۔ چونکہ تصاویر میں وقفہ بہت ہی کم ہے۔ اور وہ بہت جلد ایک دوسرے کے بعد ہماری نظروں سے گذر جاتی ہیں۔ اس لئے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بازار کی تو وہی پہلی تصویر قایم ہے لیکن اس میں جو آدمی دوڑ رہا ہے۔ وہ بازار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گیا ہے۔

پس زندہ تصاویر کا یہی اصول ہے کہ ابھی ایک تصویر کا نقش آنکھوں سے محو نہیں ہونے پاتا۔ کہ دوسری تصویر سامنے آجاتی ہے۔

متحرک تصاویر سازی پر سرسری نظر

اس میں کچھ شک نہیں کہ آجکل کی متحرک تصاویر کا وجود ۱۸۷۲ء اور اس کے بعد کی کوششوں اور تجربات کا نتیجہ ہے۔ لیکن ۱۸۷۲ء سے پہلے پہلے بھی کئی ایک کھلونے اسی اصول پر کام کرتے تھے۔ جس پر آج کل کی متحرک تصاویر کام کرتی ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک آدمی نے ایک گتے کے گول ٹکڑے کی ایک طرف ایک پرندے کی شکل اور دوسری طرف پنجرے کی شکل بنائی۔ اور اُس کے دونو سروں پر دھاگا باندھکر زور سے گھمانے سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا پرندہ پنجرے کے اندر بند ہے۔ ۱۸۳۳ء میں پلیٹو نامی ایک آدمی نے ایک کھلونا تیار کیا۔ جس کا نام "فیناکسٹوسکوپ" یعنی "اصل کو نقل ظاہر کرنے والا" رکھا۔ یہ ایک گتے یا دھات کا گول قرص تھا۔ اسکے کنارے کے ساتھ کسی جانور کی مختلف حالتوں کی کچھ شکلیں کھچی ہوئی تھیں۔ دونو تصویروں کے درمیان چھوٹی سی جھری تھی۔ قرص کے مرکز میں ایک دُھرا گذار کر اُسے ایک شیشے کے سامنے گھمایا جاتا تھا۔ جھریوں میں دیکھنے سے شیشے میں اُس چیز کی مختلف حالتوں کی تصویریں یکے بعد دیگرے نظر آتی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ حرکت کر رہی ہیں۔

۱۸۶۰ء میں اسی اصول پر ایک اور آلہ ڈبلیو۔ جی۔ ہارنر نے تیار کیا اس کا نام اس نے یا "زندگی کا پہیہ" رکھا۔ یہ آلہ ایک سلنڈر کی شکل کا تھا۔ جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چند سوراخ بنائے گئے تھے۔ اور سلنڈر کی اندرونی سطح پر اُن سوراخوں کی درمیانی جگہوں پر کسی جانور کی چند تصویریں بنا دی

گئی تھیں۔ جب اس آلے کو زور سے گھمایا جاتا تو سوراخوں میں سے اندرونی سطح پر بنی ہوئی تصویریں حرکت کرتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ کچھ عرصے کے بعد سلنڈر کے اندر ہر ایک تصویر کے سامنے ایک ایک شیشہ لگایا گیا۔ اور سوراخوں میں دیکھنے سے تصویریں بعینہٖ نظر آنے کی بجائے اُن کا عکس شیشوں میں نظر آتا تھا۔

اس قسم کی اور بھی کئی ایک ایجادیں تھیں۔ لیکن وہ سب کی سب کسی جانور کی چند ایک حرکتیں یا حالتیں ظاہر کر سکتی تھیں اور بار بار وہی تصویریں دیکھنے میں آتی تھیں اس لئے یہ محض کھلونے تھے۔

ہم اُوپر لکھ چکے ہیں۔ کہ موجودہ متحرک تصویر کے وجود کا آغاز ۱۸۷۲ء سے ہوا۔ اس سال کیلیفورنیا کے رہنے والے ایک شخص مسمی ایڈ وڈ موئے برج نے ایک دوڑتے ہوئے گھوڑے کی یکے بعد دیگرے چوبیس ۲۴ تصویریں اتاریں۔ اس نے چوبیس فوٹو گرافک کیمرے خریدے۔ اور اُن سب کو ایک سفید پردے کے مقابل ایک قطار میں ترتیب دیکر اُن کے شٹروں کے ساتھ مضبوط تاگے باندھے۔ دوسری طرف تاگے سفید پردے سے بندھے تھے۔ اس کے بعد گھوڑے کو دوڑا کر کیمروں کے سامنے سے گذارا گیا۔ جب گھوڑا دوڑتا ہوا آیا۔ تو تاگے اس کے پاؤں کے ساتھ اٹک اٹک کر ٹوٹتے جاتے تھے۔ تاگوں کے ٹوٹنے سے کیمروں کے شٹر خود بخود کھلتے اور بند ہوتے جاتے تھے۔ اور اس طرح گھوڑے کی تصویر کیمرے کی پلیٹ پر اُتر آتی تھی۔ موئے برج کو اس کام میں کافی کامیابی ہوئی۔ اور وہ ایک مدت تک انہیں چوبیس کیمروں کے مختلف قسم کی تصویریں بنا بنا کر فوٹو گرافی کی محدود سائنس میں اضافہ کرتا رہا۔

اس کے بعد ۱۸۸۲ء میں پیرس کے رہنے والے ڈاکٹر میری نے ایک نہایت عجیب آلہ تیار کیا جس کا نام "میری صاحب کا پستول" تھا کیونکہ اسکی شکل ایک بہت بڑے پستول کی سی تھی لیکن جہاں پستول میں گولی ہوتی ہے اس آلے میں گولی کی بجائے فوٹو گرافی کا مصالحہ دار شیشے کا گول ٹکڑا تھا۔ اسے کسی طرف سے روشنی نہیں پہنچ سکتی تھی جب اس پستول کا رُخ کسی چیز کی جانب کر کے گھوڑا دبایا جاتا تو مصالحہ دار شیشے کا ٹکڑا اپنے مرکز کے گرد گھومنا شروع کر دیتا تھا۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ایک لمحہ کے لئے ٹھہر جاتا تھا۔ اس طرح سے اس شیشے پر تصویر اتر جاتی تھی۔

ڈاکٹر میری کے پستول میں شیشے کی پلیٹ استعمال کی جاتی تھی۔ مگر چونکہ یہ پلیٹ بھاری ہوتی تھی۔ اس لئے اس دقت کو حل کرنے کیلئے ڈاکٹر میری اور کئی دیگر اشخاص نے کوششیں کیں اور آخر کار ۱۸۸۸ء میں جارج ایسٹ مین نے سلولائیڈ کا فلم ایجاد کیا۔ اور یہ فلم شیشے کی پلیٹ کی جگہ کیمروں میں کام آنے لگا۔ فلم کے ایجاد نے متحرک تصویر کی دنیا میں ایک نئی جان ڈال دی۔ کیونکہ اس پر ایک ہی وقت میں بہت تصویریں اتاری جا سکتی تھیں۔

سب سے پہلے جس شخص نے فلم کے ایجاد کا فوری فائدہ اٹھایا۔ وہ امریکہ کا رہنے والا ٹامس ایڈیسن تھا۔ اس نے ۱۸۸۹ء میں سلولائڈ فلم کو ایک سلنڈر کے گرد لپیٹ کر اس پر کئی ایک تصویریں اتاریں۔ ۱۸۹۴ء میں اُس نے ایک مشین تیار کی۔ جس کا نام "کائینٹوسکوپ" رکھا۔ یہ ایک چھوٹا سا آلہ تھا۔ اس میں ایک فلم پر

نہایت چھوٹی چھوٹی تصویریں کھچی ہوئی تھیں۔ فلم کو بجلی کی روشنی پہنچتی تھی اور تصویریں دیکھنے والے کے سامنے سے ۴۶ فی سیکنڈ کی رفتار سے گذرتی تھیں۔ فلم کے ہر دو سروں پر سوراخ تھے۔ اور ایک دندانہ دار پہیہ کی مدد سے جس پر فلم چلتی تھی۔ تصویروں کی رفتار قایم رہتی تھی۔ آجکل کی فلمیں بہت کچھ اسی اصول پر کام کرتی ہیں۔ لیکن ایڈلیسن کی مشین کے ساتھ ایک وقت میں صرف ایک ہی آدمی متحرک تصویر کا تماشہ دیکھ سکتا تھا۔

ایڈلیسن کے بعد کئی ایک اور اس قسم کے آلے مختلف ناموں سے نکلے۔

پس اس سے ظاہر ہے۔ کہ ابتدا میں لوگوں کو حرکت کرتی ہوئی چیزوں کی تصویریں بنانے کا شوق تو ضرور پیدا ہوا۔ لیکن انہیں ان تصویروں کو ایک جگہ پر بہت سے لوگوں کو یکجا دکھانے کا خیال بالکل نہ آیا۔ بلکہ اُس زمانے میں صرف ایسے آلے بنانے کی کوششیں ہوتی رہیں۔ جن سے ایک ہی وقت میں ایک یا دو آدمی ان تصویروں کو دیکھ سکیں۔

ایک ہی وقت میں لوگوں کو یکجا سینما دکھانے کا خیال غالباً سب سے پہلے ۱۸۹۴ء میں ایک شخص مسمی فرانسس جنکنس کے دل میں پیدا ہوا۔ یہ شخص ان دنوں واشنگٹن کے کسی دفتر میں ملازم تھا۔ اور فرصت کے وقت متحرک تصویروں کے تجربے کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اُسے متحرک تصاویر کو پردے پر دکھانے میں کافی کامیابی ہوئی۔ شومیٔ قسمت سے جس ہال میں وہ کام کیا کرتا تھا۔ اُس کو آگ لگ گئی۔ اس کے بعد جنکنس نے ایک اور شخص مسمی آرمیٹ کے ساتھ ملکر کام کرنا شروع کیا۔ اور کچھ عرصے کے بعد دونوں نے تصاویر کو پردے پر دکھانے کی علٰیحدہ علٰیحدہ ایک مشین بنائی گو ان دنوں ایڈلیسن کی مشین "کائینٹو سکوپ" جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں بہت مقبول ہو رہی تھی۔ لیکن چونکہ جنکنس اور آرمیٹ کی مشین سے بہت لوگ یکجا سینما دیکھ سکتے تھے۔ اس سے لوگوں نے ان کی مشین کو ایڈلیسن کی مشین پر ترجیح دی۔ یہ دیکھ کر ایڈلیسن آرمیٹ کو کچھ دے دلاکر اس بات پر رضامند کر لیا۔ کہ اس کی مشین جسے "پروجیکٹر" بھی کہا جاتا تھا۔ ایڈلیسن کے اپنے کارخانے میں تیار ہوا کرے۔ اس طرح سے آمیٹ کا پروجیکٹر جو دراصل جنکنس کی مشین کی...... نقل تھا۔ ایڈلیسن کے کارخانے میں بن بن کر "ایڈلیسن وائٹا سکوپ" کے نام سے مشہور ہو کر بازار میں فروخت ہونا شروع ہو گیا۔

۱۸۹۵ء میں لندن کے رہنے والے آر۔ ڈبلیو پال نے بھی ایک مشین تیار کی۔ اور اُس کے ذریعے ہٹن ہال میں چلتی پھرتی تصویریں پردے پر دکھائیں۔ چونکہ ہال میں بہت شور وغل مچ رہا تھا۔ جسے سنکر پولیس اس خیال سے کہ مبادا کوئی حادثہ ہو گیا ہو۔ اندر گئی۔ لیکن وہاں پہنچ کر انہوں نے دیکھا۔ کہ لوگ متحرک تصویریں دیکھکر خوشی کے مارے شور کر رہے تھے۔

۱۸۹۵ء میں ہی مسٹر لوئے مری کی کمپنی نے ایک مشین تیار کی۔ جس کا نام انہوں نے "رسنمیٹوگراف"

رکھا۔ اسکے ذریعہ انہوں نے پیرس اور مارسلز میں متحرک تصاویر کے پُرلطف نظارے کپڑے کی سفید چادر پر دکھلائے۔ سینٹوگراف کے ایجاد نے تجارتی دنیا میں ایک نئی ہل چل مچادی۔ ۱۸۹۵ء میں متحرک تصاویر دکھانے کی مشینوں کے جتنے پیٹنٹ لئے گئے اُن سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ سینما نے لوگوں کیلئے تجارت کا ایک نیا ذریعہ پیدا کر دیا۔

آہستہ آہستہ یہ سب مشینیں ترقی کر گئیں۔ اور ان میں اور بھی تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ موجودہ سینما مشین میں ایک لمپ کے ساتھ ایک آلہ لگا ہوا ہوتا ہے۔ جس کی مدد سے فلم چلتی ہے۔ فلم کے دونو سروں پر سوراخ ہوتے ہیں۔ جو کہ ولو دندانہ دار پہیوں میں لگے ہوتے ہیں۔ جب پہیے چلتے ہیں۔ تو اُن کے دندانوں کی مدد سے فلم جھٹکے کھاتی ہوئی چلتی ہے۔ جھٹکے کھانے سے یہ مطلب ہے۔ کہ ہر دو تصاویر کے درمیان ایک برائے نام وقفہ ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ نہایت تیزی سے چلتی ہے۔ اسلئے ظاہرا طور پر وہ ایسا کرتی دکھائی نہیں دیتی۔ لیمپ کے مُنہ کے سامنے ایک قرص ہوتا ہے۔ جس میں سوراخ ہوتے ہیں اور وہ نہایت تیزی سے گھومتا ہے۔ اب اس کی رفتار اور پہیوں کی رفتار میں اس طرح تعلق ہوتا ہے کہ جس وقت فلم کی تصویر لیمپ کے مُنہ کے سامنے آتی ہے۔ قرص کا ایک سوراخ بھی عین اُسی وقت لیمپ کے مُنہہ کے سامنے آجاتا ہے اور اس طرح سے لیمپ کی روشنی تصویر پر ٹھہرنے دیتا ہے۔ اور تصویر ہو بہو نظر آتی ہے۔ جونہی کہ فلم کا تصویر والا حصہ لیمپ کے مُنہ کے آگے سے ہٹتا ہے۔ قرص کا سوراخ بھی آگے ہو جاتا ہے۔ اور لیمپ کی روشنی فلم پر اُسوقت نہیں پڑتی لیکن یہ سب کچھ آناً فاناً ہوتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ حرکت کا سلسلہ قائم رکھنے کیلئے ان تصاویر کا فیتہ اس قدر جلد چلایا جاتا ہے۔ اور تصاویر ایسی جلدی جلدی ایک دوسرے کے بعد سفید چادر پر آتی جاتی ہیں۔ کہ بنیل منٹ سے کم عرصہ میں سولہ ہزار کے قریب تصاویر ہماری نظروں سے گذر جاتی ہیں

متحرک تصاویر کے چند شعبدے

متحرک تصاویر میں بسا اوقات ایسے حیرت انگیز واقعات اور کرتب دیکھنے میں آتے ہیں۔ کہ جب تک انسان ان کی اصل حقیقت سے آگاہ نہ ہو۔ یہ اندازہ لگانا بہت ہی مشکل ہوتا ہے کہ فلم بنانے والوں نے اس کا کیا انتظام کیا ہوگا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ بعض مناظر دکھانے کیلئے کمپنیوں کو بے انتہا روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اور بعض کرتب دکھانے کیلئے ایکٹروں کی باقاعدہ مشق بہم پہنچانی پڑتی ہے۔ لیکن اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے۔ کہ نہایت شاندار عمارتوں اور بظاہر بہت ہی مشکل کرتبوں کی تصاویر نہایت ہی معمولی طریقے سے حاصل کی جاتی ہیں۔

مثلاً بہت سے خطرناک مناظر کی تصویریں محض اُن کی سینری پردے پر پینٹ کرکے اتاری جاتی ہیں بڑے بڑے جہازوں کی تصویریں محض جہازوں کے چھوٹے چھوٹے کھلونوں کو پانی میں تیراکر اور پانی میں بجلی کی مدد سے لہریں پیدا کرکے کھینچی جاتی ہیں۔ کھلونا ڈگمگانے لگتا ہے۔ اس کی تصویر قریب سے لیکر دکھائی جاتی ہے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ بہت بڑا جہاز بڑے طوفانی سمندر میں موجوں کے تھپیڑے کھا رہا ہے۔ موٹروں کی دوڑ دکھانے کیلئے موٹروں کو محض کھڑا کیا جاتا ہے۔ اُن کے پیچھے سڑک کی سینری پینٹ کرکے پردے کو بہت تیزی سے کھینچا جاتا ہے جس سے وہ دونو متحرک معلوم ہوتی ہیں۔ پردا بہت لمبا ہوتا ہے۔ اور جس رفتار سے کھینچا جائے۔ اُسی رفتار سے موٹریں دوڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ سمندر کی تہ کے نیچے جو مناظر دکھائے جاتے ہیں۔ اُن کی تصویریں فی الواقع سمندر میں نہیں لی جاتیں۔ پانی کا استعمال ضرور کیا جاتا ہے۔ لیکن کیمرہ تو بذات خود پانی کے باہر ہوتا ہے۔ اس کی ترکیب یہ ہے۔ کہ ایک بہت بڑا کمرہ تعمیر کیا جاتا ہے جس کی دیواریں تمام تر شیشے کی ہوتی ہیں۔ اس کمرے کو پانی سے بھرکر۔ فرش پر مٹی اور ریت بچھاکر۔ بحری پودے کھڑے کرکے اس کو بالکل سمندر کی تہ کے مشابہ کیا جاتا ہے۔ کمرے کی دیواروں پر بہت سی تیز لیمپوں کی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اور پھر اس کمرے میں ایکٹر کام کرتے ہیں اور اُن کی تصویریں اتاری جاتی ہیں۔ کشتیوں کا چلنا۔ آبدوز کشتیوں کا ڈوبنا سب کچھ اس کمرے میں دکھایا جا سکتا ہے۔ کمرے کے حجم کے مطابق کشتیاں بنائی جاتی ہیں۔ اور فوٹوگرافک کیمرے کی رفتار اور فاصلے کو کم وبیش کرکے چیزوں کی رفتار اور حجم کی ایسی تصویریں لی جاتی ہیں۔ کہ وہ اصلی نظر آئیں۔ اس طرح اور بھی کئی قسم کے حادثوں میں ایکٹروں کی بجائے چھوٹی چھوٹی پتلیاں بناکر اور اُن کو ایکٹروں سا لباس پہناکر تصویریں اتاری جاتی ہیں۔

متحرک تصاویر کے تعلیمی فوائد

متحرک تصاویر یعنی سینما بحیثیت مجموعی انسانی زندگی پر بہت خوشگوار اثر ڈالتا ہے۔ دل و دماغ کی تربیت۔ اخلاق کی بلندی۔ معلومات کی وسعت اور تفریح طبع کے لحاظ سے زمانہ حاضرہ کی یہ ایجاد بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ تعلیم کے لئے سینما بے انتہا فائدہ مند ثابت ہوا ہے۔ سکولوں اور کالجوں میں سینما بہت کامیابی سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ بعض صنعتی اور سائنٹیفک تجربے یا طریقے تصاویر متحرک کے ذریعے دکھائے جاتے ہیں۔ طلبا انہی طریقوں یا تجربوں کو کتابوں میں پڑھکر کماحقہٗ نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن جب سارا عمل ان کی نظروں کے سامنے دکھایا جاتا ہے۔ تو اس کی تمام تفصیلات بہت آسانی سے ذہن نشین ہو جاتی ہیں۔ مختلف سکولوں اور کالجوں کی بہت سی سرگرمیاں بذریعہ فلم دوسروں کو دکھائی جاتی

ہیں۔ جس سے اُن کے دل میں بھی ویسے شوق پیدا ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ عوام میں خصوصاً دیہات کی جاہل آبادی کے سامنے مفید خیالات اور معلومات کے پھیلانے میں سینما بڑا کام دیتا ہے۔ مثلاً حفظانِ صحت کے طریقے۔ صفائی کے وسائل۔ نئے نئے زراعت کے طریقے سب بذریعہ سینما گاؤں کے لوگوں کو دکھا کر جو کام بڑے بڑے لکچروں سے نہیں نکلتا۔ وُہ ایک فلم کی مدد سے بآسانی انجام پا جاتا ہے۔

تصاویر متحرکہ تاریخ اور جیوگرافی کے مطالعہ میں کافی مدد دیتی ہیں۔ دنیا کی جو قدیم تہذیبیں اب بالکل فنا ہو چکی ہیں۔ فلموں کے ذریعہ اُن کا نقشہ پردۂ تصویر پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس طرح اور بھی سبق آموز تاریخی افسانے بذریعہ سینما دکھائے جا سکتے ہیں۔ تصاویر متحرکہ میں مختلف ملکوں کی خبریں بذریعہ فلم دکھائی جاتی ہیں۔ مختلف ملکوں کے رہنے والوں کے لباس۔ اوضاع و اطوار۔ رسوم و عادات کے دیکھنے کا موقع ملتا ہے دنیا کے مشہور اور قابلِ دید مقامات جنہیں بہت سے لوگ عمر بھر نہیں دیکھ سکتے۔ پردۂ تصویر پر گھر بیٹھے نظر آجاتے ہیں۔ اس طرح جیوگرافی کا مطالعہ وسیع ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ تصاویر متحرکہ اخلاقی تعلیم کیلئے بھی کسی طرح سے نقصان دہ نہیں ہیں۔ بشرطیکہ اُن تصویروں میں ایسے مناظر نہ ہوں۔ جو ہندوستانی طبائع میں آوارگی پیدا کرنے کا موجب ہو سکیں۔ کیونکہ عام طور پر جتنے بھی ڈرامے یا افسانے لکھے جاتے ہیں۔ اور انکی جتنی فلمیں تیار کی جاتی ہیں۔ اُن سب میں یہ اصول مدِنظر رکھا جاتا ہے۔ کہ نیکی کا بدلہ نیکی اور بدی کا عوض بُرا ہی دکھایا جائے۔ کمزور پر ظلم کرنے والا تباہ اور مظلوم کا ہمیشہ بول بالا ہوتا ہے۔ محنت اور جفاکشی ہمیشہ انسان کو بلند مرتبہ بناتی ہے۔ سستی اور کاہلی انسانی زندگی کو تباہ کرتی ہے۔ سادہ زندگی بسر کرنے والا انسان عیاش اور بدمعاش انسانوں پر فضیلت لے جاتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ چند مستثنیات کے علاوہ سینما دیکھنے سے اخلاق پر خراب اثر نہیں پڑتا۔

سینما کی مقبولیّت

آج سے پچیس تیس سال پہلے جب سینما کا آغاز ہوا بہت سے لوگوں کی یہ رائے تھی۔ کہ عوام اس کو زیادہ مدت پسند نہیں کریں گے۔ اور بہت جلد اس سے تھک جائیں گے۔ لیکن آج سینما سب سے زیادہ ہر دل عزیز تفریحِ طبع ہے۔ امیر غریب۔ جاہل تعلیم یافتہ سب سے محظوظ ہوتے ہیں۔ یہ تفریح روز بروز عام ہو رہی ہے۔ آج سے دس سال پہلے لنڈن میں صرف بیس بائیس تھیٹر تھے۔ جو متحرک تصاویر دکھاتے تھے۔ لیکن آج چھ سات سو سے بھی زیادہ ہیں۔ صرف ریاستہائے متحدہ امریکہ میں پچاس لاکھ کے

قریب روزانہ اشخاص سینما دیکھتے ہیں۔ ہندوستان میں ان کا نام ونشان تک نہ تھا۔ لیکن آج ہر بڑے شہر میں متعدد سینما تھیٹر موجود ہیں۔ غرض متحرک تصاویر کے ایجاد نے دنیا کی راحت وتفریح اور تعلیم وتربیت میں بہت بڑا کام کیا ہے۔ اور جو مقبولیت کہ انہیں عوام میں حاصل ہے۔ وہ گفتگو شامل ہو جانیکی وجہ سے اور بھی زیادہ بڑھ جانے کی امید ہے۔ اور اس فن میں ترقی کے عظیم الشان امکانات موجود ہیں۔

"مسٹر کاپر کی کہانی

اس کی اپنی زبانی"

مَیں جزیرہ سائپرس کا باشندہ ہوں اور اسی وجہ سے مجھے محبت آمیز لہجے میں کیوپرم بھی کہدیتے ہیں مجھے وینس دیوتا اپنی خدمت میں ہر وقت آئینے کی مانند رکھتے تھے۔ اس لئے میرے کوٹ پر یہ نشان ♀ ہر وقت ثبت ہوتا تھا۔ میری قوم ملک میچیگن میں بھی آباد ہے۔ اکثر میری قوم کے لوگ اکیلے ہی رہتے ہیں۔ مگر بعض دفعہ دیگر اقوام مثلاً گندھک۔ لوہا وغیرہ میں بھی ملکر رہنا پسند کرتے ہیں۔ حالانکہ باہمی محبت و پیار کی جگہ یہ اقوام میرے ساتھ ہمیشہ غداری کرتی ہیں۔ اور مجھے اپنی محنتوں میں ناکامیابی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

ناظرین مَیں کافی عرصہ سُکھ کی نیند سویا۔ لیکن میری ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ میں ایک سکاؤٹ کی مانند ہر وقت تیار اور کار آمد ہو کر خلق خدا کی مدد کروں۔ چنانچہ میرا دل ہر وقت تڑپتا رہتا تھا۔ لیکن نامعلوم کونسی مخالف طاقت مجھے اُٹھنے سے روکتی تھی۔ ہر ایک ملک ہر ایک جگہ یعنی انگلینڈ روس۔ چین و جاپان ـ ہندوستان وکوہستان۔ میدان وادی وڈھلوان غرضیکہ ہر جگہ سویا۔ بلکہ یہاں تک کہ پرندوں کے پیروں میں بھی سویا۔ لیکن کہیں بھی آرام وتسکین نہ پایا۔ آخر پیاسا تمانے میری کشش اور میری امداد کی اور حضرت انسان کے دل ودماغ میں وہ طاقت پیدا کی کہ میری امداد کو کمربستہ ہو گیا۔ اور اس نے مجھے پتھروں کی قید سے کوٹ پیٹ کر چھڑایا اور نیند سے جگایا۔ لیکن جہاں کہیں میری قوم کے خیرخواہ میری جدائی کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے میرا ساتھ دیا۔ لیکن حضرت انسان نے میرا امتحان کرنے

۱؎ کاپر (Copper) تانبا۔

کے لئے کہ میں تا ابد ساتھ دینے کے قابل ہوں یا نہیں مجھے مختلف قسم کے امتحانات میں سے گزارا۔ بقول بائبل گو میں نے امتحان سے توبہ کی۔ لیکن میری پوری پوری چھان بین کیگئی۔ اور مجھے میرے ساتھیوں سمیت آگ میں ڈالا گیا۔ میں نے بہتیری ہائے واویلا مچائی۔ مگر کسی نے میری نہ سُنی۔ بالآخر میں اپنے امتحان میں کامیاب ہوا۔ اور میرے ساتھی ہوائی گھوڑوں پر سوار ہو کر بھاگ گئے۔ اُن کے بھاگ جانے پر جب مجھے نکالا گیا۔ اور کچھ آرام دیا گیا۔ تو میں نے اپنے آپ کو گرمیوں میں گرم پانی سے غسل کئے ہوئے کی مانند صاف اور ستھرا پایا میری طبیعت میں جولانی تھی۔ اور چہرہ اُس راجپوت کی مانند سرخ اور سیاہی مائل تھا۔ جس نے اپنی آن بان اور شان کے لئے ساری جوانی گرم راجپوتانہ کے صحراؤں میں گذاری ہو۔ سچ ہے۔ ع ”سرخ رو ہوتا ہے انسان سختیاں سہنے کے بعد“۔ اب مجھ میں اسقدر ہمت ہے۔ کہ اگر آگ کے نزدیک جاؤں تو آگ کا رنگ سبز کر دیتا ہوں۔ اور یہ طاقت میں نے پرماتما سے خاص طور پر حاصل کی ہے۔ میری دلیری اور بہادری نے حضرتِ انسان پر اسقدر اثر کیا کہ اُس نے مجھے اپنا ہمدم بنا لیا۔ اپنے ہر ایک کام میں لایا۔ یہاں تک کہ کھانا میں پکاؤں۔ برتن میں بناؤں۔ آرائش کا سامان میں کروں۔ جنگ ہو تو میں لڑوں غرضیکہ ہر ایک کام کی انجام دہی میں شامل ہوں۔ میرے بعد میرا بھائی پیدا ہوا۔ رنگ تو اُس کا کالا تھا۔ اور ہوا اور پانی کی موجودگی میں میری طرح گھنٹوں مہینوں اور برسوں زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن بوجہ افریقن (حبشی الاصل) ہونے کے زیادہ محنتی اور جفاکش تھا حضرتِ انسان میری دوستی تو ترک نہ کی۔ لیکن اُس کی ملاحت پر عاشق ہو کر اُس کو زیادہ منہ لگا لیا۔ میری شکایت پر جواب ملا۔ ع۔ ”سیرت کے ہم غلام ہیں۔ صورت ہوئی تو کیا“۔ اس کی فوقیت دیکھ کر میں جلا تو بہت لیکن کچھ پیش نہ جا سکتی تھی۔ آخر بے وقوفانہ حسد کی جگہ میں نے رشک سے کام لیا۔ اور اپنے اوصاف بڑھانے شروع کئے اور اتنی ترقی کی کہ میں اپنے بھائی پر سبقت لے گیا۔ یہاں تک کہ آج کل حضرتِ انسان کی ترقی کے ساتھ ساتھ میرا ہونا لازمی ہو گیا ہے۔

حضرتِ انسان نے قوتِ برقی سے وہ کام لئے ہیں۔ جن کو جنات اور جادو کی قوت نادرہ خیال کیا جا سکتا ہے۔ ہزار ہا میلوں پر ایک جیتی جاگتی مورتی اپنا راگ اور ناچ دکھا کر غیر ممالک کے لوگوں کے دلوں میں اپنے ملک کے رسم و رواج کا اثر ڈال سکتی ہے۔ آگ کا کام۔ روشنی کا کام۔ دھوپ کا کام۔ گھوڑے۔ ٹٹو۔ بیل۔ گاڑی۔ گائے اور گدھے کا کام غرضیکہ ہر ایک جانور کا کام اس برقی قوت سے انسان نے لے لیا ہے۔ بجلی کی گائیں اور بجلی کے سپاہی اپنا کام دکھا رہے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ میرے ہی دم کی برکت ہے۔ اگر میں اپنی ٹانگ توڑ دوں۔ بازو اکھاڑ دوں۔ گردن مروڑ دوں یعنی میرے جسم کا کوئی بھی حصہ ٹوٹ جائے تو فوراً یہ سارے کام جو حضرتِ انسان اپنے لئے کر رہا ہے۔ بند ہو جائیں۔ مگر میرے ٹوٹے ہوئے اعضا کی مرہم پٹی ہوتے ہی کام فوراً

چل پڑتا ہے۔

بجلی کی رَو میرے جسم کو اپنے لئے ایک نالی سمجھتی ہے اور نالی بھی ایسی ڈھلوان کہ جس میں گری اور پھسلی۔ چھوٹی اور پار پہنچی۔ میری قوم نے تمام دنیا پر ایسا جال پھیلایا ہے کہ چوبیس گھنٹے اور بارہ ماہ سورج اپنی روشنی اُس پر ڈالتا رہتا ہے۔ اور اس وصف سے میں سلطنت برطانیہ کا حریف ہوں۔

شریمتی کاربن ڈائی اکسائڈ اپنے سرتاج جل بھگوان پانی کو ساتھ لیکر میرے اُوپر ایسا زہر اگلتی ہے۔ اور مجھے سانپ کی طرح ڈس کر اسطرح نیلا پیلا کر دیتی ہے۔ گویا میں نے اُس کی جاگیر چھین لی ہے۔ مگر شکر ہے کہ میرا دوست انسان اپنی دوستی کا حق ادا کرکے اس ظالم کے رستے میں تارکول وغیرہ ڈال کر مجھے بچا لیتا ہے۔

میرے ایک دشمن مسٹر این۔ ایچ۔ تھری (امونیا) کو حضرت انسان نے ایسا قید کیا ہے۔ کہ بس قید کی کوٹھڑی ہیں ہی گرم اور سرد ہوتا رہتا ہے۔ سکڑتا اور پھیلتا رہتا ہے برف بنانے کی مشقت میں ہر وقت مصروف رہتا ہے۔ لیکن جب ذرا سی چھٹی پاتا ہے۔ تو اپنی بہن ہوا کو ساتھ لیکر میرا منہ نیلا کر جاتا ہے۔ لیکن شکر ہے۔ کہ اس موذی کو رہائی ہی نہیں ملتی۔

مَیں سونے کے ساتھ ملکر اُس کی طاقت کو بڑھا دیتا ہوں۔ چاندی سے مِلکر اُس کو جفاکش بنا دیتا ہوں۔ ہنیل۔ جرمن سلور۔ کانسی وغیرہ میری ہی ذات سے منوّر ہو رہے ہیں۔ کہتے ہیں رستم ہند نے اپنے داؤ پیچ سب کو سکھا دیئے۔ لیکن بلّی کی میاؤں کسی کو نہ سکھائی۔ بعینہٖ حضرت انسان نے مجھے دوست اور ہمدم بنایا۔ لیکن بلّی کی میاؤں سے ہمیشہ ڈرایا۔ ایسے شخص کی دوستی سے توبہ ہی بھلی جو اپنے بھائیوں کی ہڈیوں تک سے فاسفورس نکال لیتا ہے۔ اس کے پاس نائیٹرک ایسڈ ایک ایسا ہتھیار ہے۔ جس سے مجھے فوراً تباہ برباد کرکے کاپر نائیٹریٹ بنا لیتا ہے اور اپنے کاموں میں لے آتا ہے۔ اسی طرح جب مجھے سلفیورک ایسڈ کے گرم تالاب میں ڈبوتا ہے۔ تو میں بہت تنگ ہو کر غصہ سے سلفر ڈائی آکسائڈ کے تفنگ سے اُس پر مجبوراً وار کرتا ہوں۔ میرا غصہ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ خود میری حیثیت مفقود ہو جاتی ہے۔ اور کاپر سلفیٹ بنکر بھی حضرت انسان کی وفا کا پھر دم بھرتا ہوں۔ اس سے حضرت انسان ہزارہا کام لیتا ہے۔ آنکھوں میں اُسے ڈالتا ہے۔ زخموں پر اسے لگاتا ہے۔ خوبصورت بننے کے لئے اپنے جامہ عمامہ کو رنگتا ہے۔ لکڑی خراب ہونے سے بچاتا ہے۔ گندا پانی صاف کرتا ہے۔ موذی جانوروں کو مارتا ہے۔ دوائی بناتا ہے۔ بجلی تیار کرتا ہے۔ اور اس سے ہزارہا کام لیتا ہے غرضیکہ میری لاش کو بھی اس طرح کام میں لاتا ہے۔ کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اور وہ کہاوت سچ ہو جاتی ہے۔ کہ جیتے ہاتھی کا لاکھ اور مرے کا سوا لاکھ۔ "اس حالت میں بھی جب میرا کالا کلوٹا افریقی بھائی میری قبر پر فاتحہ پڑھنے آتا ہے تو مَیں چالاکی سے اس کو قبر میں ڈالکر رہتی دنیا تک انسانی خدمت کی ہوس کیلئے ناظرین کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں۔ کیونکہ مَیں نے سُنا ہے۔ کہ ؎

مرنا بھلا ہے اس کا جو اپنے لئے جئے + جیتا ہے وہ جو مر گیا ہو قوم کے لئے

خوف

(ایک نفسیاتی بحث)

(حضرت یمینی ایڈیٹر نخلستان کے قلم سے)

خوف ایک رنجیدہ جذبہ ہے۔ جو کسی آنے والے خطرے یا آفت کے علم سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ جذبہ فطرت انسانی میں قدیم الایام سے موجود ہے۔ خوف اور تعجب دونو جذبے ابتدائے آفرینش سے دوش بدوش چلے آتے ہیں۔

خوف کا بھاگ جانے کے خیال سے خاص تعلق ہے۔ چوہا جب بلی کو دیکھتا ہے۔ تو خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ اور بغیر سوچے سمجھے بھاگ جاتا ہے۔ اس کا بل کے اندر گھس جانا اس امر کی بین دلیل ہے۔ کہ اُسے اپنے دشمن کی موجودگی کا احساس ہو گیا ہے۔ کسی جنس (نسل) کے قیام کے لئے نہایت ضروری ہے۔ کہ اس کے افراد دشمنوں سے اپنی حفاظت کریں۔ اگر چوہا کسی بلی یا کتے کو دیکھ کر بھاگ نہ جائے۔ تو اس کی موت یقینی ہے۔ اور پھر اس کے لئے افزائش نسل کا کوئی موقعہ نہیں۔

خوف کے جسمانی اثرات عام طور پر ایسے ہوتے ہیں۔ جو خوفزدہ جاندار کو بھاگ جانے میں امداد دیتے ہیں مثلاً دل کی حرکت تیز ہو جاتی ہے۔ شریانیں اور وریدیں سکڑ جاتی ہیں۔ جسم کا درجۂ حرارت کم ہو جاتا ہے۔ سانس جلدی جلدی آنے لگتا ہے۔ اور بعض اوقات تنفس کی آسانی کے لئے مُنہ کُھل جاتا ہے۔ ہونٹ خشک ہو جاتے ہیں۔ ٹھنڈا پسینہ آتا ہے۔ آواز بھرّا جاتی ہے۔ ہاضمہ کی قوت کمزور ہو جاتی ہے۔ جِلد کانپنے لگتی ہے۔ آنکھیں بھیانک کُھل جاتی ہیں۔ پیشانی پر شکن پڑ جاتے ہیں۔ نچلا جبڑا ڈھلک جاتا ہے۔ بعض اوقات معدے میں درد ہونے لگتا ہے۔ اور آواز بالکل بند ہو جاتی ہے۔

مہذب انسان خوف کے اکثر جسمانی تاثرات پر قابو پا لیتے ہیں۔ لیکن بچوں اور وحشی لوگوں میں یہ اثرات زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔ ایک چھوٹے پرندے کے شکاری پرندے سے ڈر جانے اور ایک طالب علم کے سکول ماسٹر سے خوف کھانے میں لازمی طور پر بہت تھوڑا فرق ہوتا ہے۔ اور وہ بھی درجے کا۔ ورنہ جذبہ دونوں صورتوں میں برابر ہوتا ہے۔

خوف کے جسمانی اثرات جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ خوفزدہ جاندار کو بھاگنے میں مدد دیتے ہیں۔ لیکن بعض صورتوں میں خوف اسقدر غالب آتا ہے کہ جاندار کے مرجانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

بھاگ جانے کے بعد چھپنے اور پناہ لینے کی صورت پیش آتی ہے۔ جس میں بالکل خاموشی کی ضرورت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ حالات بالکل بدل جاتے ہیں۔ قلب کی حرکت بند ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ سانس رُک جاتا ہے۔ اعضا ساکت ہوجاتے ہیں۔ بھاگنے یا بھاگنے کی تیاری میں تمام اعضا اکڑ جاتے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ ڈھیلے ہوجاتے ہیں۔ مرعُوب جاندار بھاگے یا نہ۔ اعضا کی قوتیں کمزور ہوجاتی ہیں۔ تھکاوٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔

انسان خوفزدہ ہوکر شاذ و نادر ہی بھاگتا ہے اس تہذیب کے زمانے میں ہمیں جن خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہم جسمانی طاقت کی مدد سے ان سے نہیں بچ سکتے۔ شہروں میں کبھی درندے ہمارا تعاقب نہیں کرتے۔ جو شخص جنگل میں شکار کھیلنے جاتا ہے۔ وہ بھی ٹانگوں کی نسبت اپنے ہتھیاروں پر زیادہ بھروسہ کرتا ہے۔ ہمیں بعض اوقات ٹرین یا موٹر کے راستے سے ہٹنا پڑتا ہے۔ کئی دفعہ دیوانے کتّے سے ڈر کر بھاگنا پڑتا ہے۔ لیکن خوف کا مسئلہ ٹانگوں کے زور سے حل ہونے والا نہیں۔

تاہم خوف زدہ ہونے کی حالت میں ہماری جسمانی طاقتیں ہی کام کرتی ہیں۔ فرض کرو ایک شخص بنک سے کچھ روپیہ اس خیال سے چرا لیتا ہے۔ کہ وہ اپنا کاروبار چلاکر روپیہ واپس کر دیگا۔ ایک دن اخبار کے مطالعہ سے اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تمام سرمایہ تباہ ہوگیا ہے۔ غالباً اس موقعہ پر بھاگ جانا ہی اس کے حق میں مفید ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ فوراً سر پر پاؤں رکھکر بھاگ جائے۔ تاہم اس کے اعضا اس طرح کام کرنے لگتے ہیں۔ گویا وہ ایک شیر سے ڈر کر بھاگنے والا ہے۔ خوف کے یہ تمام مظاہرے خطرناک ہیں۔ کیونکہ اس کا دماغ مختل ہوجائیگا۔ اور دیکھنے والے تاڑ جائینگے۔ کہ دال میں کالا ضرور ہے۔

خائن کو اس بات کا احساس ضروری ہے کہ وہ خطرے میں ہے۔ اور یہی خبرداری اس کے حق میں مفید ہے۔ مُٹھیاں بند کرنا۔ اور زور زور سے سانس لینا اور پسینہ کا آنا اس کے حق میں مفید نہیں ہوسکتے۔ بجائے اس کے اُسے چاہیئے کہ آرام سے بیٹھے اور ٹھنڈے دل سے صورتِ حالات پر غور کرے۔ ممکن ہے وہ روپیہ اِدھر اُدھر سے اُدھار لے سکتا ہو۔ ممکن ہے وہ ڈایرکٹروں کو یقین دلا سکے کہ کسی اور ملازم نے خیانت کی ہے۔ شاید کسی غیر ملک کو بھاگ جانا ضروری ہو۔ یا اپنے جرم کا اقبال کرلینا۔

ایسی صورتِ حالات پر صرف وہی شخص قابو پا سکتا ہے۔ جس کے دل میں خوف بہت کم ہو۔ حیوانات بھی مختلف خطرات کا مختلف طریقوں سے مقابلہ کرتے ہیں۔ ایک چھوٹی مچھلی بڑی مچھلی سے بچنے کے لئے اور طریقہ

اختیار کرتی ہے۔ اور کانٹے سے بچنے کے لئے اور طریقہ۔ اور جب خطرہ سے بچ کر نکل جاتی ہے۔ تو پھر مطلق اس کا خیال نہیں کرتی۔ یہ صرف انسان ہی کا خاصہ ہے کہ وہ گذرے ہوئے خطرات کے متعلق بھی سوچتا رہتا ہے اور اس کے نتائج کا خیال کر کے اپنی طبیعت کو پریشان رکھتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ ہر مہذب شخص کو مستقبل کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ اور پیش آنیوالی مشکلات سے خبردار۔ مثلاً یہ کہ جاڑا آنیوالا ہے۔ بڑھاپا آجائیگا۔ اعضا کمزور ہو جائینگے وغیرہ وغیرہ لیکن اس قسم کے خوف اس کے لئے باعث پریشانی نہیں ہونے چاہئیں۔

میرے ایک دوست کو بنک سے روپیہ قرض لینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کی ساکھ اچھی تھی اور وہ بغیر تکلیف کے جسقدر روپیہ چاہتا لے سکتا تھا۔ مگر اس کی جسمانی اور دماغی حالت کمزور تھی۔ ایجنٹ کے پاس جانے سے پہلے وہ دیر تک سوچتا رہا۔ اُسے ڈر تھا کہ ایجنٹ روپیہ دینے سے انکار کر دیگا۔ جب وہ بنک کے دفتر میں گیا۔ تو اس خوف کے آثار اس کے چہرے پر نمایاں تھے۔ یہ امر تعجب انگیز نہیں کہ اس کی درخواست مسترد کر دی گئی۔ اور اس کا دیوالہ نکل گیا۔

بعض اوقات ہم اپنے آپ کو بھی اس امر کا احساس دلانا نہیں چاہتے کہ ہم خوف زدہ ہیں۔ ہم سیٹی بجاتے ہیں۔ گراموفون کا ریکارڈ سننے لگ جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر انسان خوف سے آزاد ہوتا۔ لیکن کوئی سمجھدار انسان خوف سے آزاد نہیں۔ احمق اور دیوانے بے خوف ہوں تو ہوں لیکن بہادر سے بہادر اور دلیر سے دلیر آدمی پر بھی کبھی نہ کبھی خوف غالب آجاتا ہے۔ مگر وہ بجائے سوچنے کے اس امر کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ بہادر سپاہی اچھی طرح جانتے ہیں۔ کہ میدان جنگ میں جاتے ہی کلیجہ گھٹنے لگتا ہے۔ جی بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ خوف طبیعت کے ساتھ رل جاتا ہے۔

اکثر خوف دلانے والی چیزیں ایسی ہیں۔ جو درحقیقت خطرناک نہیں ہوتیں۔ ایک دوست مذاق کے طور پر ہمیں پیچھے سے پکڑ لے۔ اچانک شور کی آواز۔ بادل کی گرج۔ بجلی کی کڑک۔ اندھیرا اور تنہائی جو بچپن میں ہمیں ڈرایا کرتے تھے۔ جوانی میں بھی وہی اثر دکھاتے ہیں۔ تعجب بعض اوقات خوف پیدا کرنے کیلئے کافی ہوتا ہے۔ بچے عام طور پر عجیب ہیئت کے انسان یا حیوان کو دیکھ کر ڈر جاتے ہیں۔ اکثر خوف مائیں بچوں کو سکھاتی ہیں۔ ان کی شوخی اور شرارت کم کرنے کیلئے بچوں کو مختلف قسم کی دھمکیاں دیجاتی ہیں۔ دیو آیا۔ چڑیل آئی۔ سپاہی آیا۔ کوکو آئی معمولی دھمکیاں ہیں۔

بچہ جب پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ کسی چیز سے نہیں ڈرتا۔ جب وہ تین چار مہینے کا ہو جاتا ہے۔ تو غیر مانوس آوازیں سُنکر گھبراتا ہے۔ اگر اس کو ہوا میں معلق رکھیں۔ تو ڈرتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ دوسرے خوف شروع ہو جاتے ہیں۔ اجنبی لوگ۔ تنہائی۔ اندھیرا۔ آندھی۔ آگ۔ پانی وغیرہ وغیرہ خوف کا باعث ہوتے ہیں۔ گو یہ

تمام خوف اچھا اثر پیدا نہیں کرتے۔ تاہم بعض ایسے خطرے ہیں جن سے خوف دلانا بچے کے لئے ضروری ہے۔ اگر بچے کو نہ ڈرایا جائے۔ تو اس کا پانی میں کودنے یا کوٹھے سے گر جانے کا احتمال ہے۔ تجربہ بہترین معلم ہے جب بچے کو اس بات کا علم ہو جاتا ہے۔ کہ ایک خاص طرز عمل تکلیف دِہ نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ تو وہ فوراً باز آجاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ ہر ایک بچے کو خطرناک چیزوں کے متعلق واقفیت ہونی چاہیئے۔ مگر انہیں اس طرح خوف زدہ نہیں بنا دینا چاہیئے۔ کہ وہ بڑے ہو کر بھی ان پر قابو پانے سے گریز کریں۔ بچے کو پانی سے ڈرانا چاہیئے۔ مگر نہ اسقدر کہ وہ بڑا ہو کر تیرنا سیکھنے سے بھی احتراز کرے۔ چھوٹے بچوں کو بازاروں کی بھیڑ میں گذرنے سے منع کر دینا چاہیئے۔ مگر اس کا نتیجہ یہ نہ ہو۔ کہ وہ جوان ہو کر سڑک پر چلتا ہوا گاڑی سے ڈر جائے۔

معقول اور غیر معقول خوف میں تمیز پیدا کرنا مشکل ہے۔ اگر ایک شخص ایک مضبوط جہاز میں یورپ کو جاتا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ اُس کے دوست چند راتیں اضطراب اور پریشانی میں گذاریں۔ کہ کہیں ایسا نہ ہو۔ کہ کوئی حادثہ ہو جائے۔ لیکن فرض کرو۔ جہاز تاریخ مقررہ پر نہیں پہنچا۔ اور نہ ہی کوئی اطلاع بندرگاہ پر آئی۔ اس صورت میں پریشانی قدرتی ہے۔ اگر جہاز تاریخ مقررہ سے دو ہفتہ بعد تک بھی نہ پہنچے۔ اور یہ بھی معلوم نہ ہو۔ کہ کہاں ہے۔ تو ہم صحیح طور پر فرض کر لیں گے۔ کہ کوئی مصیبت نازل ہوئی ہوگی۔ لیکن ہمارا خوف اور پریشانی ہمارے دوست کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

بعض پُلوں کے سروں پر آپ نے نوٹس بورڈ دیکھے ہوں گے۔ جن پر یہ ہدایت ہوتی ہے کہ اتنے مَن سے زیادہ وزن کی لاریاں اور چھکڑے پُل پر سے نہ گذریں۔ گویا افسران متعلقہ کو یہ ڈر ہے۔ کہ اگر زیادہ وزن کی گاڑیاں گذرینگی تو پُل کے ٹوٹ جانے کا خطرہ ہے۔ ایک صحیح الدماغ شخص جب کسی پل کے پاس آتا ہے۔ تو وہ بے خوف اوپر سے گذر جاتا ہے۔ مگر بعض ایسے وہمی لوگ بھی ہیں۔ جو کبھی پُل کے پار نہیں جاتے۔ اور اگر جاتے بھی ہیں۔ تو اوپر سے گذرتے ہوئے کانپتے ہیں۔ انہیں ہر وقت یہ خطرہ ہوتا ہے۔ کہ کہیں پُل ٹوٹا ہوا نہ ہو۔ کوئی تختہ اکھڑا ہوا نہ ہو۔ کہیں وہ گر نہ جائیں وغیرہ وغیرہ۔ بعض لوگ ریلوے ٹرین میں سوار ہوتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ہوائی جہاز میں چڑھنے سے گھبراتے ہیں لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو خطرہ کو ایک خوشگوار چیز تصور کرتے ہیں۔ اور اپنی جان مصیبت میں ڈالنے سے نہیں گھبراتے۔

صحیح الدماغ اشخاص بڑے بڑے خطرات سے بچتے ہیں۔ مگر معمولی خطروں کی پرواہ نہیں کرتے۔ اگر ایک وہمی شخص محض اسلئے لوگوں سے قطع تعلق کر کے گھر میں بیٹھ جائے۔ کہ اکثر بیماریاں وبائی ہوتی ہیں۔ جو ایک دوسرے سے لاحق ہو جاتی ہیں — تو ضروری نہیں کہ وہ محفوظ رہ سکے۔ ممکن ہے۔ نلوں کے پانی میں جراثیم ہوں۔ اگر وہ اپنے فلسفہ پر کاربند ہو۔ تو اپنے لئے علیحدہ کنواں کھودے۔ لیکن ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ اس پانی میں بھی جراثیم

موجود ہوں۔کیا وہ پانی پینا چھوڑ دیگا ؟ ۔شاید فلٹر کام دے سکے زیادہ بہتر ہے کہ پانی ابال کر استعمال کرے۔ صحیح الدماغ شخص بھی بعض اوقات فلٹر کیا ہوا۔یا اُبلا ہوا پانی استعمال کرتے ہیں۔لیکن اسی صورت میں جب ہیلتھ افسر صاحب ہدایت کریں۔کہ عام پانی استعمال نہ کیا جائے۔

پہلے زمانے میں سیاح لوگ سفر کرنے سے پہلے دیوی دیوتاؤں کی منتیں مانا کرتے تھے۔اور ان کا خیال تھا کہ اس طرح وہ خطرے سے محفوظ رہیں گے۔فرض کیا ایک شخص سمندر میں سفر کرنا چاہتا ہے۔اگر وہ بندرگاہ پر ٹھہر کر یہ دیکھ لے۔کہ کس جہاز کی بناوٹ مضبوط اور انتظام اچھا ہے۔تو اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔لیکن یورپ کے بعض ممالک میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں۔جو اگر امریکہ جائیں۔تو ان کے پاؤں پوجیں۔ مگر وہ محض اس خیال سے جہاز میں سوار نہیں ہوتے کہ مبادا وہ بیمار ہو جائیں یا کوئی اور حادثہ پیش آجائے۔

اب ہم چند ایسے خوفوں کا ذکر کرتے ہیں۔جو محض توہمات پر مبنی ہیں۔

یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ کوئی مرد ایسی عورت سے شادی نہ کرے۔جس کا نام اس کی ماں کے نام پر ہو۔ اور نہ ہی کوئی عورت ایسے مرد سے شادی کرے۔جس کا نام اس کے باپ کے نام پر ہو۔ورنہ ماں یا باپ کی موت یقینی ہے۔

زلزلے اور گرہن ہمیشہ موجب عذاب سمجھے گئے ہیں۔کیونکہ ان کا تعلق اندھیرے سے ہے۔اور اندھیرے میں ہر قسم کی مصیبت نازل ہوسکتی ہے۔

آگ قدیم الایام سے خطرہ کا باعث سمجھی گئی ہے۔افریقہ کے لوگ لوہار سے اس لئے ڈرتے ہیں۔کہ وہ لوہا پگھلا سکتا ہے۔

امریکہ کے اصلی باشندے (ریڈ انڈین) گورے لوگوں کو دیوتا سمجھتے تھے۔جب انہوں نے اہل یورپ کے سامان حرب کو دیکھا تو وہ سمجھے کہ جن اور پریاں ان کے قبضے میں ہیں۔

ازمنۂ وسطیٰ میں بڑے بڑے عالم و حکیم جادوگر سمجھے جاتے تھے۔

ممالک متحدہ امریکہ میں آج بھی سیڑھی کے نیچے ٹھیرنا۔آئینہ توڑنا۔تیرہ مہمانوں کو کھانے پر بلانا۔ہوٹل کے تیرہ نمبر کے کمرے میں ٹھہرنا۔تیرہ تاریخ کو سفر کرنا اور جمعہ کے دن کوئی نیا کام شروع کرنا خطرناک سمجھے جاتے ہیں کیسی عجیب بات ہے۔کہ اسقدر سمجھدار اور عقلمند لوگ بھی اپنا وقت۔روپیہ اور طاقت توہمات کی نذر کر رہے ہیں۔

اہل انگلستان کا عقیدہ ہے۔کہ کوّے کا کائیں کائیں کرنا مصیبت لانا ہے۔اگر سانپ کسی کے سامنے سے گذر جائے تو اس کا کوئی نہ کوئی رشتہ دار ضرور مر جائیگا۔کئی مہمیں محض اسلئے ترک کر دی گئیں۔کہ شگون اچھے

نہ تھے۔ چاند یا سورج کو گرہن لگ گیا۔ یا کوئی زلزلہ آ گیا۔

پُرانے لوگوں کا خیال تھا۔ کہ بجلی درحقیقت عذاب ہے جو گنہگار مردوں پہ نازل ہوتا ہے۔ بادل کی گرج شیطان کی آواز ہے۔

اہل یونان کا خیال تھا۔ کہ اگر بادل کی گرج دائیں طرف سے سُنائی دے۔ تو نیک شگون ہے۔ لیکن اہل روما بائیں طرف کی گرج کو اچھا سمجھتے تھے۔ پرندوں کے اُڑنے سے فالیں لی جاتی تھیں۔

موت سے تمام لوگ عام طور پر خائف ہوتے ہیں۔ اکثر لوگ قبرستان کے پاس سے نہیں گذرتے۔ کہیں موت کا ذکر ہو تو وہاں نہیں ٹھہرتے۔ کسی کے جنازے کے ساتھ نہیں جاتے۔

کہا جاتا ہے۔ کہ خوف پر فتح حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے۔ کہ خدا پر پورا پورا بھروسہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ جو لوگ خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور اس کی قدرت کے قایل ہیں۔ وہ دوسروں کی نسبت بہت کم خائف ہوتے ہیں۔ انہیں یقین ہوتا ہے کہ خدا ہر حالت میں ان کا مددگار رہے۔ لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ خدا صرف انہی کی مدد کرتا ہے۔ جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ فقط

کار آمد باتیں

(۱) حلیم الطبع اور محنتی انسان کے لئے فتح و نصرت ہر وقت حاضر رہتی ہے۔

(۲) وعدے کا پورا کرنا انسان کے اعتبار کو بڑھاتا ہے۔

(۳) چھوٹے چھوٹے بُرے کاموں کو کبھی حقیر مت سمجھو۔ کیونکہ ان سے بڑے بڑے نتایج پیدا ہوتے ہیں۔

(۴) بے اعتدالی اور بد پرہیزی سے بچنا چاہیئے۔

(۵) بے وقوف کی زبان اپنے اختیار میں نہیں ہوتی۔

(۶) بہت سونے والا سست ہو جاتا ہے۔

(۷) دنیا میں بے وقوف زیادہ ہیں اور عقلمند کم۔

(۸) چغلی سے بڑھ کر کوئی بُرا کام نہیں۔

(۸) نیکی وہ ہے جو ایک ہاتھ سے ہو اور دوسرے کو خبر بھی نہ ہو۔ نیکی کر دریا میں ڈال۔

(۹) اعتبار اسی کا اچھا ہے۔ جس کا تم کو تجربہ ہو جائے۔

(۱۰) اگر خرچ تمہاری آمدنی کے اندر نہیں تو یقیناً جلد تباہ ہو جاؤ گے۔

"معلومات" کا ایک ابتدائی ورق

(حضرت عشرت رحمانی مدیر رسالہ "نیرنگ" دہلی)

موقر رسالہ "رہنمائے تعلیم" لاہور کے "جوبلی نمبر" کا عظیم الشان اعلان "وارنٹ" کی طرح میرے سامنے ہے۔ گویا مکرمی سردار صاحب کا اصرار "مضمون" کی طلبی کا "وارنٹ" ہے جو نہایت سختی سے مضمون لکھنے کے لئے مجبور کر رہا ہے۔ اور میں علالت کے باعث معذور۔ تاہم مخلص احباب کی فرمائشیں جو گوارا "احکام" کی صورت میں صادر ہوتی ہیں۔ اُن کی تعمیل نہ کرنا بھی ایک ناقابلِ معافی "اخلاقی جرم" ہے۔ جس کے ارتکاب سے میرا دل تو احتراز ہی کرتا ہے۔ علاوہ ازیں میں یہ بھی اندازہ کر رہا ہوں کہ "جوبلی نمبر" کی تیاری غیر معمولی طور پر کیجا رہی ہے۔ سردار جگت سنگھ صاحب کا غیر معمولی شغف و انہماک بھی مجبور کرتا ہے کہ جس حد تک ہو سکے اس مبارک ترتیب میں اُن کا ہاتھ بٹایا جائے۔ کیونکہ "تعلیمی دنیا" پر سردار صاحب کے بہت کچھ احسانات ہیں اور اس سلسلہ میں "رہنمائے تعلیم" کے ذریعہ جو کامیاب "جدوجہد" انہوں نے جاری رکھی ہے۔ اُس کا صلہ آج انہیں "جوبلی نمبر" کی صورت میں دیکھنے کو مل رہا ہے۔ موجودہ دور میں اُردو رسالہ کے لئے اس "منزل" پر پہنچنا آسان نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ "بارِ ادارات" اُٹھاتے اُٹھاتے دل خون ہو جاتا ہے؟ جب کہیں یہ کٹھن مدارج طے کر کے اس "منزل" میں رسائی ہوتی ہے۔

مبارک ہے "رہنمائے تعلیم" کہ دیانتداری اور کامیابی سے اپنے فرائض ادا کر کے آج "جوبلی نمبر" شایع کرنے کے قابل ہو سکا۔ ان حالات میں سردار صاحب کی "تعمیل" میں اپنا فرض سمجھتا ہوں لیکن حیران ہوں کہ "ادائیگی" کی کیا شکل نکالوں۔ ایک علیل دماغ اس عظیم الشان "جوبلی نمبر" میں شرکت کا کیا سامان کرے۔ بہرحال کچھ نہ کچھ پیش کرنا ضروری ہے۔ اپنی ایک نہایت ضروری اور مفید تالیف "معلومات" کے (جو زیر ترتیب تھی میری علالت سے پہلے) ابتدائی حصّہ سے مختصر مضمون "نذر" کرتا ہوں۔ یہ کتاب نوعمر لڑکوں لڑکیوں اور بچوں کیلئے مفید اور دلچسپ معلومات کا مجموعہ ہوگی۔ اس کے ہر باب کو عام فہم بنانے کی انتہائی کوشش کیگئی ہے۔ ذیل کے مضمون سے اس امر کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ مختصر اقتباس "جوبلی نمبر" میں پیش کرنیکے قابل ثابت ہوگا۔ اور "تعلیمی دنیا" میں خصوصاً پسند کیاجائیگا۔ عشرت رحمانی

مختلف قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ اور اُن کے مختلف قسم کے دماغ۔ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ اُن میں سوچنے اور غور کرنے کا مادہ بچپن ہی سے ہوتا ہے۔ جبقدر عمر بڑھتی جاتی ہے۔ اُس میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ اور وہ اپنے زمانہ کے "عالی دماغ" بن جاتے ہیں۔

بعض انسان ابتدا سے سوچنے کے عادی نہیں ہوتے۔ اور ایسے کاموں سے جن میں غور کرنا اور دماغ پر زور دینا پڑے شروع ہی سے جی چراتے ہیں۔ یہ ایک ایسا عیب ہوتا ہے کہ اگر بے پروائی سے اس عادت کو چھوڑنے کی کوشش نہیں کی تو ہمیشہ کے لئے "بیکار" اور سُست بنا دیتی ہے۔ اور اس قسم کے لوگ دنیا میں کوئی کام ایسا نہیں کر سکتے۔ جس سے وہ خود بڑائی اور بہتری حاصل کر سکیں۔ اور عزت دار اور مشہور بن سکیں۔ نہ تو اُن کی زندگی میں کوئی خاص طور پر اُن کی طرف توجہ کرتا ہے۔ اور نہ اُن کے بعد اُنکی یاد باقی رہتی ہے ایسے لوگوں کو جن کے دماغ میں ابتدا سے سستی اور کاہلی ہو اور سوچنے کو جی نہ چاہے۔ انہیں چاہیئے۔ کہ زمانہ کی معمولی معمولی باتوں پر دماغ کو زور دیں۔ اور تھوڑی دیر ہر ایک چیز پر جو اُن کے سامنے آئے ضرور غور کر لیا کریں کہ یہ کہاں سے آئی ہے "کیا ہے"! "کسطرح بنی ہے"! کس کام کی ہے! وغیرہ۔

اس تھوڑے تھوڑے غور کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ سوچنے کی عادت ہوتی رہتی ہے۔ اور دماغ سے سستی دُور ہو جاتی ہے۔

بعض کند ذہن اور سُستی پسند لوگوں کا خیال ہے کہ دماغ زیادہ سوچنے اور غور کرنے سے کمزور ہو جاتا ہے۔ یہ خیال اصلیت سے بالکل دور ہے۔ انسان کے جسم کا ہر حصہ چُپ چاپ بغیر کام کئے بیٹھے رہنے سے سُست اور معطل ہو جاتا ہے۔ اور اس سُستی سے کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ محنت اور کام سے تمام بدن میں پھرتی اور چستی آتی ہے۔

محنتی مزدور بہت کم کمزور ہوتے ہیں۔ اکثر تندرست اور ہٹے کٹے ہی دیکھے جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ محنت سے کمزور نہیں ہوتے۔ اُن کے ہاتھ پاؤں اور تمام بدن مزدوری اور کام سے مضبوط اور تندرست رہتا ہے۔ اسی طرح دماغ کی حالت بھی ہے۔ کہ غور کرنے سے قوت دار ہوتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ بہت زیادہ کام اور محنت کمزور کرتی ہے۔ لیکن یہ صورت ہر زیادتی میں ہے۔ کہ کثرت اور زیادتی ہر جگہ ہر کام کے لئے مُضِر ہوتی ہے۔

اگر ہم دن رات محنت کرتے رہیں یا سوچتے رہیں تو ضرور کمزور اور بیمار ہو جائیں گے۔ مگر بالکل اسی طرح اگر ہم دن رات سُست پڑے رہیں اور کوئی کام نہ کریں تب بھی کمزور ہونگے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حد سے زیادہ ہر کام اور ہر بات نقصان پہنچاتی ہے۔

ہمیں چاہیئے کہ بچپن سے تھوڑا تھوڑا غور کرنیکی عادت ڈالیں۔ اور دماغ پر شروع سے ہی ہلکا ہلکا بوجھ دیں کہ جتنی عمر بڑھتی جائے اسی قدر دماغ کی قوت بھی بڑھتی جائے۔

بچوں کیلئے اس کی بڑی ضرورت ہے کہ ہر چیز پر ابتدا سے ہی غور کرنے اور سوچنے کے عادی ہوں کہ اُن کے ذہن میں اس سے قوت آتی رہے۔

سوچنے کا طریقہ

کسی چیز کو سوچتے وقت سب سے پہلا خیال یہ ہونا چاہیئے کہ ہمارے دماغ میں ایک وقت میں صرف ایک ہی بات رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم کچھ سوچتے ہوں تو فقط ایک ہی بات سوچیں کسی دوسری طرف دھیان نہ دیں۔ اس سے دماغ پر بھی زیادہ بوجھ نہیں پڑیگا۔ اور بہت جلد وہ بات سمجھ میں آجائیگی۔ اور مشکل سے مشکل مسئلہ آسانی سے حل ہو جائیگا۔ اگر ایسا نہیں کیا جائیگا۔ اور ایک ہی وقت میں دو تین باتوں کا خیال کریں تو دماغ بھی تھک جائیگا۔ اچھی طرح کوئی ایک بات بھی سمجھ میں نہ آئیگی۔ اور بہت جلد سوچنے کی طاقت بھی ختم ہو جائیگی۔ اور اس کے علاوہ طبیعت پر ایک پریشانی اور بوجھ سا ہو جائیگا۔

سوچنے کا وقت

دماغ بہت نازک چیز ہے۔ وقت بے وقت اس پر بوجھ ڈالنا کبھی اچھا نہیں ہے۔ کھانا کھاتے ہی کسی بات پر غور کرنا اور سوچنا نہ چاہیے۔ کیونکہ کھانے کا بوجھ معدے۔ دل اور دماغ پر ہوتا ہے۔ اس وقت دماغ کو آرام دینا ضروری ہے۔ اسی طرح ناشتہ سے پہلے بھی دماغ کو آرام دینا چاہیئے۔ کہ معدہ جب بالکل خالی ہوتا ہے تو دماغ بھی اطمینان سے نہیں ہوتا۔ سب سے اچھا وقت دماغ سے کام لینے کا "ناشتہ کے بعد" ہے کہ معدہ دل اور دماغ اطمینان اور آرام سے ہوتے ہیں۔ نہ زیادہ بوجھ ہوتا ہے اور نہ خلو۔ اس وقت تازہ تازہ دماغ میں قوت ہوتی ہے۔ کہ وہ اچھی طرح غور اور فکر کا بار برداشت کر سکے

غور و فکر کی ابتدا

بچوں کو چاہیئے کہ چھوٹی چھوٹی سی باتوں سے سوچنا شروع کریں اور زیادہ زور نہ شروع سے دماغ پر نہ ڈالیں ہوتے ہوتے عادت بھی ہو جائیگی اور اسی طرح بڑے ہو کر بڑی بڑی باتیں اُن کی سمجھ میں آنے لگیں گی۔

(مقتبس)

لاسلکی کے معجزے

(جناب لالہ گھنی شا مداس صاحب بی۔اے۔بی ٹی لکچرار سائینس ٹرینینگ کالج لاہور)

تار کے ذریعے پیغام رسانی کے ایجاد نے جو فائدے خلق خدا کو بخشے ہیں وہ بچہ بچہ جانتا ہے۔ سچ پوچھو تو کسی ملک میں تار کے ستونوں کا نظر آنا اس ملک کی تمدنی ترقی کی ایک نشانی ہے۔ ہر ایک مہذب ملک میں مسلح قومیں سپاہیوں کے دستے کی مانند یہ ستون جگہ جگہ ریل کی سڑک کے ساتھ ساتھ۔ دشوار گذار گھاٹیوں گھنے جنگلوں اور اونچے پہاڑوں پر برائے تحفظ امن و امان خبر رسانی استادہ نظر آئینگے۔ لیکن اکثر طوفان اور سخت آندھی جیسے ناگہانی آفتوں سے ان کے پاؤں اکھڑ بھی جاتے ہیں اور ایسی حالت میں ان کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو لڑائی میں ایک مردہ سپاہی کی۔ بحر اوقیانوس میں برقی کیبل لگانے میں جن مشکلات کا سامنا ہوا اور بالآخر جس قوت اور جفاکشی سے یہ کام اختتام کو پہنچا وہ بہتوں کو معلوم ہوگا۔ لیکن باوجود اتنی محنت و جانفشانی و زر کثیر خرچ کرنیکے بحر اوقیانوسی کیبل چٹانوں کے ٹکروں یا سمندری جانوروں کے حملوں سے اتنا ہی محفوظ سمجھا جا سکتا ہے۔ جتنا کہ تار کا ستون طوفان اور آندھی سے اور نہ معلوم کس وقت کیبل کے کٹ جانے سے تمام محنت دم کے دم میں رائیگاں ہو جائے۔

یہ ہیں وہ حالات جن کے ماتحت یہ امن و امان و خبر رسانی کے ٹھیکہ دار مدت مدید سے اپنا کام سرانجام دے رہے ہیں لیکن عالمان سائینس کی ایسے ناقابل اعتماد ٹھیکہ داروں پر جو نہ جانے کب اپنا کام چھوڑ بیٹھیں۔ بھلا کب تسلی ہو سکتی تھی۔ وہ سوچنے لگے کہ جب ہم اپنے دوستوں۔ رشتہ داروں سے بات چیت کرتے ہیں۔ تو ہم تاروں کا استعمال نہیں کرتے پھر کیا وجہ ہے کہ دور دراز بیٹھے ہوئے شخص سے گفتگو کرنے میں ہمیں تاروں کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ کیا کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے بغیر تار کے ہی خبر رسانی ہو سکے۔ چنانچہ اس کے متعلق بڑی سرگرمی سے تحقیقاتیں شروع ہوئیں۔ اور اکثر نے محنت اور جانفشانی کی کہ دن رات ایک کر دیئے۔ اور بعض بعض نے بہت زحمتیں اٹھائیں۔ یہاں تک کہ کھانے پینے میں کمی کر کے جو روپیہ بچا وہ اسی تلاش میں صرف کر دیا۔ یہ تمام محنت آخر پھل لائی۔ اور اس سے اس درمیانی تار کو اڑا کر ہی چھوڑا۔

وائرلیس یا لاسلکی سائینس کے عجائبات طلسم میں سے ایک خاص عجوبہ ہے۔ اگرچہ اس کے ایجاد کا سہرا مارکونی صاحب کے سر باندھا جاتا ہے لیکن دراصل اس ایجاد میں یورپ کے بہت سے بانی سائینس دانوں کا ہاتھ ہے۔ گو مارکونی صاحب نے اس کو پہلے پہل عملی جامہ پہنایا۔ انگلستان کی کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور ریاضی دان پروفیسر کلارک میکسول صاحب نے پہلے پہل یہ خیال ظاہر کیا کہ روشنی۔ قوت مقناطیسی اور قوت برقی اس میں بہت کچھ مشابہ ہیں۔ اور جس طرح روشنی ایتھر میں تموج پیدا ہونے سے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتی ہے۔ اسی طرح قوت مقناطیسی اور قوت برقی بھی ایتھر میں ارتعاش پیدا کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ

سکتی ہے۔ جرمنی کے پروفیسر ہرک ہرٹز صاحب پہلے شخص تھے جنہوں نے میکسول صاحب کے خیالات کو عملی جامہ پہنایا۔ انہوں نے ۱۸۸۸ء میں دنیا کو بجلی کی لہروں کی ہستی و موجودگی تجربتہً دکھلا دی۔ یہی نہیں بلکہ ان لہروں کی بہت سی خاصیتیں بھی معلوم کیں۔ اور یہ بھی دکھلایا کہ یہ لہریں روشنی کی لہروں سے بہت باتوں میں مشابہ ہیں۔ مثلاً ان کی رفتار وہی ہے جو روشنی کی ہے۔ یعنی ۱۸۶۰۰۰ میل فی ثانیہ۔ ان میں اور روشنی کی لہروں میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ جہاں روشنی کی لہروں کی لمبائی (ایک چوٹی سے دوسری چوٹی تک کا فاصلہ) انچ کے دس ہزارویں حصہ کے قریب ہوتی ہے۔ وہاں بجلی کی لہر کی ایک چوٹی سے دوسری چوٹی تک کی لمبائی ایک میل کے دسویں حصہ سے لیکر دس میل تک ہوسکتی ہے۔

بجلی کی لہریں پیدا کرنے کے لئے ہرٹز صاحب نے ایک انڈکشن کوائل استعمال کیا تھا جس کے دونوں قطب دو پیتل کے لٹوؤں سے ملے ہوئے تھے۔ جب لٹوؤں کے درمیان برقی شرارہ پیدا ہوتا تھا۔ تو بجلی کی لہریں پیدا ہوکر ہر چہار اطراف میں دورہ لگانا شروع کر دیتی تھیں۔ لیکن ان لہروں کی موجودگی ثابت کرنے کے لئے ابھی کوئی آلہ تیار نہیں ہو سکا تھا۔ ہرٹز صاحب کو ایسا آلہ اتفاقاً ہی معلوم ہوگیا۔ صاحب موصوف ایک دفعہ انڈکشن کوائل سے کچھ تجربات کرنے میں مشغول تھے۔ کہ ان کو کسی ضروری کام کے لئے باہر جانا پڑا۔ کوائل کو شرارے پیدا کرتا چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ واپسی پر ان کی نظر تار کے ایک حلقے پر پڑی۔ جو دروازے میں لٹک رہا تھا۔ اس حلقے کے دونو سروں پر گولیاں لگی ہوئی تھیں اور یہ دونو ایک دوسری سے کچھ فاصلے پر تھیں۔ انہوں نے دیکھا کہ جونہی انڈکشن کوائل سے شرارہ نکلتا ہے۔ اس حلقے میں بھی گولیوں کے درمیان شرارہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ وہ دریافت تھی جس کے پیچھے سائینس دان مدت سے پڑے ہوئے تھے۔ اس آلے کے ایجاد سے وائرلیس ٹیلیگرافی کا ایجاد شروع ہوا۔ اس آلہ کا نام ہرٹز صاحب کا ڈی ٹیکٹر ہے۔ یہ جلد ہی معلوم ہوگیا۔ کہ یہ آلہ اتنا نازک نہیں کہ بجلی کی لہروں کو کوائل سے بہت دور فاصلہ پہ جانچنے کے قابل ہو۔ چنانچہ جلد ہی کئی نازک آلے اس مطلب کے لئے ایجاد ہوئے۔ ان سب میں قابل ذکر وہ آلہ ہے جو مارکونی صاحب نے بنایا۔ اس کو مارکونی کا ہیرا کہتے ہیں۔ اس آلہ کی مدد سے مارکونی صاحب وائرلیس پیغام دور کے فاصلے پر سننے میں کامیاب ہوئے۔ انہوں نے ہرٹز صاحب کے لہریں پہنچانے والے آلہ میں بھی ایک ایزادی کی یعنی اس آلے کے دونو لٹوؤں کو دو بہت بڑے ننگے تاروں سے ملا دیا۔ ایک تار کو بہت اونچا ہوا میں قایم کر دیا اور دوسرا ایک تانبے کے پترے کے ساتھ ملاکر زمین میں گاڑ دیا۔ اس طریقہ سے بجلی کی لہریں بہت دور کے فاصلے پر پہنچائی جانے لگیں۔ اسی قسم کے دو تار خبر حاصل کرنے والے مقام پر بھی لگا دیئے گئے اور کوہیرر کے ساتھ مربوط کر دیئے گئے۔ ان تاروں کی لمبائی بعض وقت تین تین سو فٹ کے قریب ہوتی ہے۔ ان کو انگریزی میں ان ٹینا کہتے ہیں۔ اس ایجاد نے بہت دور کے فاصلے سے بے تار پیام رسانی کو ممکن بنا دیا چنانچہ ۱۸۹۶ء میں مارکونی صاحب نے بے تار کے ذریعہ پیام رسانی کے ایک آلہ کا سب سے پہلا پیٹنٹ لیا اور ۱۸۹۸ء میں رودبار انگلستان کے اُس پار ساحل فرانس تک بے تار کا سلسلہ پیام رسانی قایم ہوگیا۔

ممکن ہے وائرلیس میں اس قدر حیرت انگیز ترقی نہ ہوتی اگر پروفیسر فلیمنگ صاحب ایک انوکھا ایجاد نہ کرتے۔ انہوں نے

۱۹۰۶ء میں ایک آلہ بنایا جس نے وائرلیس ٹیلیفون یعنی بے تار دور دراز فاصلہ پر گفتگو کرنا ممکن بنا دیا۔ پرانے شرارے سے لہریں پیدا کرنے کے طریقہ میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ یہ لہریں مسلسل نہ ہوتی تھیں۔ جونہی شرارہ پیدا ہوتا یہ لہریں جاری ہو جاتیں لیکن آناً فاناً شرارے کے غائب ہو جانے سے لہروں کا سلسلہ بھی منقطع ہو جاتا اور دوسرا شرارہ پیدا ہونے پر پھر لہریں پیدا ہو جاتیں۔ فلیمنگ صاحب کا آلہ نہ صرف برقی لہروں کی ہستی کو بہت دور کے فاصلے پر محسوس کرنے میں مدد دینے لگا بلکہ مسلسل لہریں پیدا کرنے کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ اس آلے کا نام تھرمیانک ویلو ہے۔ یہ آلہ بجلی کے لیمپ کی مانند نظر آتا ہے۔ اور بجلی کے لیمپ کی مانند اس کے اندر ایک باریک فلزی تار ہوتا ہے۔ جس کو بجلی کی بیٹری سے بجلی کے لیمپ کے تار کی مانند روشن کیا جاتا ہے۔ اس آلہ کی مدد سے ۱۹۱۵ء میں تقریباً ۱۹۱۵ء میں تقریباً ۵۰۰۰ میل کے فاصلہ پر بغیر تار گفتگو میں کامیابی ہوئی۔ لیکن اب تو اس طریقہ نے اسقدر ترقی کی ہے کہ دنیا کے ہر گوشے میں بغیر تار گفتگو کی جا سکتی ہے۔

۱۹۲۰ء میں امریکہ کی ایک بجلی کمپنی نے بے تار کے ٹیلیفون سے ایک اور کام لینا شروع کیا۔ انہوں نے اپنے بے تار کے پیام رسانی کے آلہ کے سامنے گانے کی مشین پر مختلف قسم کے ریکارڈ لگانے شروع کئے۔ زاں بعد انہوں نے بینڈ باجہ اور راگ سنانے شروع کئے۔ جس جس نے اُن کو سنا۔ وہ بہت محظوظ ہوا۔ اتوار کے دن گرجا گھر میں لوگوں کو بائیبل سنائی جانے لگی۔ ایک موقع پر ایک پادری نے ایک ہی وقت دو گرجا گھروں میں اپدیش کیا۔ وہ ایک گرجے میں مائکروفون کے سامنے بولنے لگا اور اس کی آواز آلہ مکبر الصوت کی مدد سے لوگوں نے دوسرے گرجے میں سنی۔ انگلینڈ میں بھی مارکونی کمپنی نے اسی طرح لوگوں کو راگ وغیرہ سنانے شروع کئے اور اس کمپنی کے پروگرام ڈیڑھ ہزار میل کے فاصلے پر ناروے سپین۔ اٹلی میں سنے گئے ۱۹۲۲ء میں انگلستان میں اس کام کے لئے ایک کمپنی بنگئی۔ اور اب تو انگلستان کے بڑے بڑے شہروں لنڈن۔ برمنگھم۔ مانچسٹر۔ رگبی وغیرہ میں اور دیگر ممالک میں بھی ایسی کمپنیاں بن گئی ہیں۔ جو مشہور مشہور گویوں کے راگ۔ بینڈ باجے۔ بڑے بڑے لکچرار کے لکچر ڈرامے اور لطائف وغیرہ بذریعہ آلات بے تار ٹیلیفون ایک مرکزی مقام سے دوسرے مقامات پر بھیجتی رہتی ہیں۔ ہر شخص جو اس مرکزی مقام سے بہت دور نہ ہو ایک بہت معمولی کم قیمت آلہ استعمال کرکے گھر بیٹھا ان راگوں اور تقریروں کا حظ اُٹھا سکتا ہے۔ چنانچہ یا تو ہر روز صبح کے اخبار میں یا ہفتہ واری رسالے کی صورت میں یہ کمپنیاں اپنا پروگرام شایع کر دیتی ہیں۔ اور ہر زن و مرد بچہ بوڑھا اپنے کان سے ٹیلیفون لگا کر بیٹھ جاتا ہے۔ یا اونچا سننے والے ٹیلیفون کے سامنے آ موجود ہوتا ہے۔ اور وقت مقررہ پر راگ۔ تقریر۔ بینڈ باجہ وغیرہ سنتا رہتا ہے۔ اس طریقہ کو براڈکاسٹنگ اور ان کمپنیوں کو براڈکاسٹنگ کمپنیاں کہتے ہیں۔

راگ بینڈ باجے۔ لیکچر سنانے کے علاوہ براڈکاسٹنگ انسان کی بہبودی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک نوجوان لنڈن کے ہسپتال میں سخت بیمار ہو گیا۔ اس نے اپنی والدہ سے جو لنڈن سے دور کسی گاؤں میں رہتی تھی ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن وہ ٹیلیفون پر اس کے ساتھ بات چیت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کی والدہ کے گھر میں یا آس پاس کوئی ٹیلیفون

نہیں تھا۔ تارگھر اس وقت تمام بند ہو چکے تھے۔ براڈ کاسٹنگ کمپنی نے کمال ہمدردی سے اپنا پروگرام بند کر کے اس کی ماں کو پیغام بھیجا۔ انہوں نے اُس شخص کی ماں کا پورا پتہ پروگرام سننے والوں کو سنایا اور ان سے درخواست کی۔ کہ جو کوئی اس شخص کی ماں کے گاؤں یا گھر کے آس پاس ہو فوراً اس کو اطلاع کر دے کہ وہ ہسپتال میں آ کر اپنے لڑکے کو ملے سینکڑوں سننے والوں کو یہ پیغام پہنچا جنہوں نے اس عورت کو اس کی اطلاع دی اسطرح عورت مذکور کو تین منٹ کے اندر اندر خبر مل گئی تین شخصوں نے اس عورت کو ہسپتال پہنچانے کیلئے اپنی موٹر کار پیش کیں۔ لیکن ایک شخص نے جونہی یہ پیغام پایا فوراً موٹر لے کر اس عورت کو چڑھا کر نزدیک ریلوے اسٹیشن پر چھوڑ آیا۔ اور وہ وہاں سے ڈاک گاڑی سے روانہ ہو کر رات کے بارہ بجے ہسپتال پہنچ گئی۔ اسی طرح کئی پیغام اُن اشخاص کو جن کا پتہ کسی کو معلوم نہ ہو صرف ہوٹلوں کی معرفت جن میں لوگ عموماً بڑے شہروں میں ٹھہرتے ہیں پہنچائے جاتے ہیں۔

بے تار کے ٹیلیفون سے بحر شمالی کے سیاح لوگوں کی دلچسپی کے لئے بھی سامان مہیا کیا جاتا ہے خیال کرو اس سیاح کی خوشی کس قدر ہو گی۔ جو خشکی سے اور انسان کی بستی سے ہزاروں میل دور سمندر میں ٹیلیفون کان سے لگا کر روزانہ نہ صرف اپنے ملک کی خبریں۔ بلکہ راگ۔ بینڈ باجہ۔ اور مشہور لکچراروں کے لیکچر تک سن سکتا ہے۔ براڈ کاسٹنگ کمپنیاں سننے والوں کو صحیح وقت کی بھی اطلاع پہنچاتی ہیں۔ اور سب سننے والے اپنی اپنی گھڑیاں درست کر لیتے ہیں۔ اور سمندر میں چلتے ہوئے جہاز کے افسر کو بھی ٹھیک وقت کا پتہ لگ جاتا ہے۔ جس سے وہ طول بلد معلوم کر کے یہ معلوم کر لیتا ہے کہ وہ کون سے سمندر میں سفر کر رہا ہے۔ علاوہ ازیں موسمی حالت کی رپورٹیں مثلاً ہوا کا رخ اور رفتار۔ بیرومیٹر کی بلندی۔ طوفان۔ آئس برگ کی حرکات وغیرہ کی اطلاع بھی بے تار کے سلسلہ پیغام رسانی سے جہازوں کو پہنچ جاتی ہیں۔ آجکل کوئی جہاز ساحل نہیں چھوڑ سکتا جبتک اس کے اندر وائرلیس کا آلہ نہ ہو۔ اس آلہ نے جہازوں کی بے وقت مدد کرنے اور انہیں آفتوں سے بچانے کے لئے نہایت اہم خدمات سرانجام دی ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک جہاز جس میں پانچ سو مسافر سوار تھے۔ وسط سمندر میں طوفان کے نرغے میں پھنس گیا۔ اور اتفاقاً اسکو آگ بھی لگ گئی۔ اس نے فوراً بلا تار کا خطرے کا پیغام ہر چہار اطراف میں بھیجنا شروع کیا۔ بارہ بڑے بڑے جہازوں نے پیغام وصول کیا۔ اور فوراً ہی اس کی مدد کو دوڑے۔ لیکن طوفان کی وجہ سے اس کی کچھ امداد نہ کر سکے۔ فوراً ہی ایک بڑا جہاز جس پر تیل کا ذخیرہ تھا۔ آ پہنچا۔ تیل سمندر میں ڈال دیا گیا۔ اور طوفان اور لہروں کی تیزی کم کر کے مسافروں کی جانیں بچا لی گئیں۔

اب تو ہوائی جہازوں میں بھی یہ آلات لگا دیئے گئے ہیں۔ اس طرح زمین پر کے لوگ نہ صرف مسافروں کے ساتھ بات چیت کر سکتے ہیں۔ بلکہ مسافروں کو موسمی حالات اور راستہ سے آگاہ کیا جا سکتا ہے۔ بعض وقت ہوائی جہاز گہری دھند میں پھنس کر راستہ کھو بیٹھتے ہیں۔ زمین سے لاسلکی کے ذریعے ان کی رہنمائی کی جاتی ہے۔ امریکہ میں تو ایک دفعہ ہوائی جہاز میں بیٹھے ہوئے ایک شخص نے زمین پر ایک عورت کو شادی کا پیغام بذریعہ لاسلکی بھیجا تھا۔

ہندوستان میں وائرلیس ٹیلیگرافی کے بہت سے سٹیشن لاہور۔ دہلی۔ الہ آباد۔ کلکتہ۔ پشاور۔ بمبئی۔ شملہ وغیرہ شہروں میں

بنے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ گورنمنٹ نے براڈ کاسٹنگ بھی جاری کر رکھا ہے۔ پہلے یہ کام ایک کمپنی کرتی تھی لیکن اب گورنمنٹ نے اپنے ہاتھ میں لیلیا ہے۔ فی الحال دو سٹیشن بمبئی اور کلکتہ براڈ کاسٹ کرتے ہیں۔ ہر دو سٹیشنوں سے ہر روز مشہور مشہور گویوں کے راگ۔ بینڈ باجے۔ ڈرامے اور تجارتی اشتہار کے علاوہ سنائے جاتے ہیں۔ بمبئی اور کلکتہ کے رہنے والے بڑے خوش قسمت ہیں کہ ایک سترہ اٹھارہ روپے کے آلہ سے ان تمام راگوں کا حظ اٹھا سکتے ہیں۔ جو مقامات ان مرکزی مقامات سے دور ہیں۔ مثلاً دہلی لاہور وغیرہ وہاں بھی لوگ بمبئی کلکتہ میں ہوتے ہوئے راگ بخوبی سنتے ہیں گو جس آلہ کی مدد سے اتنے دور پر سننا ممکن ہے۔ اس کی قیمت زیادہ ہے۔ بمبئی اور کلکتہ کے پروگرام پر ہی کیا منحصر ہے۔ اب تو لاہور میں بیٹھے ہوئے۔ ولایت کی خبریں۔ اٹلی کا بینڈ باجہ۔ امریکہ کے اندر ہوتے ہوئے ڈرامے۔ جاوا اور ہالینڈ کے درمیان ہوتی ہوئی گفتگو سنی جا سکتی ہے۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۳۱ء کو ملک معظم شہنشاہ جارج پنجم نے ہندوستانی گول میز کانفرنس کے افتتاح کی رسم مبارک پر جو تقریر فرمائی تھی وہ بھی ہندوستان کے بہت حصوں میں صاف سنی گئی۔

امریکہ میں تو بعض ریلوے کمپنیوں نے اپنی اول درجے کی گاڑیوں میں بھی یہ آلے لگا دیئے ہیں۔ اور مسافر چلتی ریل گاڑی میں کسی مرکزی مقام پر ہوتے ہوئے گانے یا ڈرامے کا حظ اٹھا سکتے ہیں۔ کسی کسی ٹریم کار کمپنی نے بھی ٹریم گاڑیوں میں یہ آلے لگا دیئے ہیں۔ پولیس اور فوجی جاسوسوں کے لئے ایسے آلے بن گئے ہیں جو آسانی سے ایک چھوٹے بکس میں بند کر کے لے جائے جا سکتے ہیں اور ان کے کام میں از حد مفید ثابت ہوئے ہیں۔ زمانہ آرہا ہے کہ ہم اپنے دوستوں کے ساتھ جو ہوائی جہاز میں بیٹھے ہوں۔ ایک جیبی وائرلیس کے آلہ کے ساتھ بات چیت کر سکیں گے۔

ہم میں سے بہتوں کو شاید یہ خیال ہو کہ جب دنیا کے اتنے شہروں میں براڈ کاسٹنگ کمپنیاں بنی ہوئی ہیں۔ تو ایک سننے والے کے آلہ میں شاید گڑبڑ مچ جاتی ہوگی۔ یہ بات نہیں۔ ہر ایک کمپنی کے آلے سے جو لہریں نکلتی ہیں ان کی لمبائی مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً لندن کی کمپنی کے آلہ سے نکلنے والی لہروں کی لمبائی ۳۶۹ میٹر ہے۔ اور ہندوستان میں بمبئی کی ۳۷۰ اور کلکتہ کی ۳۵۷ میٹر ہے۔ جس جگہ کا پروگرام سننا ہو۔ سننے والا اپنے آلے کو اس جگہ کے آلے کی لہروں کی لمبائی کے مطابق سُر میں کر لیتا ہے۔ یہ بات ایک دو پرزے جو آلہ مذکور میں لگے ہوتے ہیں گھمانے اور بدلنے سے کی جاتی ہے۔ ایسا کرنے سے صرف اس جگہ کا پروگرام سنائی دیگا۔ جہاں کے بھیجنے والے آلے کے ساتھ سننے والے کا آلہ ایک سُر میں ہے۔

اس چھوٹے سے مضمون میں وائرلیس کے حیران کن عجائبات کا مکمل اور مفصل بیان کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ وائرلیس کی سائنس دن بدن ترقی کر رہی ہے۔ اور وقت آرہا ہے جب وہ شعبدے دکھائیگی کہ الہ دین کے لیمپ کو مات کر دیگی۔ اس کا ایک بڑا معجزہ جو تقریباً پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے عکسی تصاویر کو دور و دراز مقامات پر بغیر تار بھیجنا ہے۔ اب تک اخبارات کے نمائندے تصاویر کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر ہوائی جہازوں یا ڈاک گاڑیوں کے ذریعے بھیجا کرتے تھے لیکن اب اگر لندن میں کوئی بڑا کھیل ہو رہا ہو تو اس کی تصویر کھیل کے دوران ہی میں لیکر لنڈن سے نیویارک وائرلیس کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہے اور وہاں کے

اخبارات میں اُسی دن چھپ سکتی ہے۔ اسی طرح مغربی ممالک میں جہاں عورتوں کی پوشاک کے فیشن دن بدن بدلتے رہتے ہیں اُن کی تصاویر فوراً ایک ملک سے دوسرے ملک میں بذریعہ بے تار کے سلسلۂ تصاویر رسانی بھیج دی جاتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہاں فرانس میں ایک فیشن معرض وجود میں آکر پُرانا بھی ہو جاتا۔ امریکہ میں اس کی خبر بھی نہ پہنچتی۔ اب اس طریق پر مشینوں کے پرزوں کی شکلیں موسمی حالات کے نقشے ایک مقام سے دوسرے مقام پر بھیجے جاتے ہیں۔ تصویر رسانی کا یہ طریق پولیس کا بڑا امدادگار ثابت ہوا ہے۔ مجرموں کے چہروں کا حلیہ۔ انگوٹھے اور انگلیوں کے نشانات فوراً ایک مقام سے دوسرے مقام کو بھیجے جا سکتے ہیں۔ اور مجرم کی گرفتاری آسان ہو جاتی ہے۔ قانونی کاغذات۔ ضروری دستاویز۔ دستخط وغیرہ کی نقل بھیجنے میں یہ طریق بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ بعض ملکوں مثلاً چین جاپان کی زبان ایسی ہے کہ مورس کوڈ کے ذریعے اُس زبان میں پیغام بھیجنے ناممکن ہیں۔ پہلے ایسے پیغامات کا انگریزی ترجمہ کرنا پڑتا ہے۔ ترجمہ میں غلطی ہونے کا احتمال ہے۔ بلا تار کی تصویر رسانی کے طریق سے ضروری پیغامات کی ہو بہو نقل ان ممالک کو بھیجی جا سکتی ہے۔

حال ہی میں سائنس والوں نے وائرلیس میں وہ ترقی کی ہے کہ دنیا کو انگشت بدندان کر دیا ہے۔ یعنی اب دور و دراز مقام سے بغیر تار بات چیت کرنے والے یا گانے والے شخص کی تصویر چادر پر دیکھنا بھی ممکن ہو رہا ہے۔ اس طریق کو ٹیلی وژن کہتے ہیں پہلے پہل جنوری ۱۹۲۶ء میں لنڈن کے ایک سائنس دان بیرڈ نے رائل انسٹی ٹیوشن کے ممبروں کے سامنے ایک عملی طریقہ کی ایک عام نمائش کی۔ ۱۹۲۶ء میں امریکہ میں بھی ٹیلی وژن کا ایک عملی طریقہ ایجاد ہوا۔ اور اپریل ۱۹۲۷ء میں نیویارک میں لوگوں کو اس طریق سے ۲۵۰ میل واشنگٹن میں بیٹھے ہوئے مسٹر ہوور اپنے کاغذات الٹتے ہوئے دکھائی دیئے۔ فروری ۱۹۲۸ء میں لنڈن سے نیویارک میں انسانی شبیہ بغیر تار پردے پر ڈالی گئی۔ امریکہ میں اس طریق میں ایک نئی ایزادی یہ ہوئی کہ جو شخص اس آلے سے شبیہ بھیج رہا ہو وہ یہ دیکھ سکتا ہے کہ دور کے تصویر لینے والے مقام پر کیسی تصویر کھنچ رہی ہے۔ اب تو بیرڈ صاحب کو یہاں تک کامیابی ہوئی ہے کہ ایک شخص کی شبیہ جو اندھیرے میں بیٹھا ہو دور کے مقام پر اتر سکتی ہے جب بیرڈ صاحب نے اس طریق کی نمائش کی تو ایک شخص کی جو اندھیرے میں بیٹھا تھا ہو بہو تصویر دوسرے مقام کے پردے پر آ گئی اور نہ صرف اس کے ہونٹ ہلتے ہوئے نظر آئے۔ بلکہ جب اس نے سگرٹ جلایا۔ تو وہ بھی صاف دکھائی دیا۔ یہ طریق دوران جنگ میں فوج کو بہت مفید ثابت ہوگا۔ کیونکہ اس کی مدد سے یہ ممکن ہو جائیگا کہ رات کے وقت دشمن کی حرکات کا دشمن کو پتہ لگے بغیر بخوبی مشاہدہ کیا جا سکے۔ اسی طرح سمندری جہاز رانی اور ہوائی جہاز رانی میں بھی مفید ثابت ہوگا۔ لیکن تاحال ابھی احاطہ تجربہ کے اندر ہی ہے۔

جہاں ۱۸۱۵ء میں ولنگٹن کی نپولین پر جیت کی خبر کو ولایت پہنچنے میں گھنٹے۔ ولایت میں گھوڑوں کی ڈاک کے ذریعے دن اور آسٹریلیا پہنچنے میں مہینے لگے تھے۔ اب ولایت یا فرانس میں ہوتے ہوئے میچ کی خبر بلکہ تصویر کو آسٹریلیا میں پہنچنے کے لئے صرف اتنا وقت درکار ہے جتنا ایک شخص کو گھوڑے پر سوار ہونے میں لگتا ہے۔ یہی نہیں شاید وہ دن بھی آ جائے جب یہ ممکن ہو جائیگا کہ ولایت میں ہونے ہوئے تھیٹر میں کام کرنے والوں کی نہ صرف آواز بلکہ اُن کی تصویر بمعہ اُن کے گوناگوں رنگوں کے لباسوں کے دور کے مقام پر بغیر تار دیکھی جا سکے اور نیاگرا کے مقام پر تیار ہوتی ہوئی بجلی بغیر تار دور کے مقامات پر بھیجی جا سکے۔ ہوائی جہاز سے بغیر تار ریڈیو چلانا اس کی حرکات کو قابو میں۔

"مَیں کون ہُوں"؟

مَیں عالم کے کاروبار کی بنیاد ہوں۔
مَیں تمام خوشحالیوں کا سرچشمہ ہوں۔
مَیں ذہین وطباع ہستیوں کا خلّاق ہوں۔
مَیں وہ نمک ہوں۔ جو خوان زندگی کو بامزہ بناتا ہے۔
مَیں مفلسوں کا سہارا اور ناداروں کی پشت وپناہ ہوں۔
دولت مند جو مجھ سے روگردانی کرتے ہیں۔ زوال پاتے۔ کمزور ہوتے اور قبل از وقت زندگی کو خیرباد کہتے ہیں۔
میں ایک قدیمی لعنت ہوں مگر ایک ایسی رحمت بھی کہ جس کے بغیر کوئی تندرست مرد یا عورت خوش وخرم نہیں رہ سکتا۔

جو قومیں مجھ سے رشتہ جوڑتی ہیں۔ وُہ ترقی کے میدان میں سرعت سے قدم بڑھاتی ہیں۔ اور جو مجھ سے منہ موڑتی ہیں وہ جلدی فنا ہو جاتی ہیں۔

مَیں نے ہی آدمیوں کو ادنیٰ حالتوں سے اُٹھا کر عروج وارتقا کی بلندیوں تک پہنچایا ہے۔

مَیں ہر قابل نوجوان کا رفیق ورہبر ہوں۔ اگر وہ میری قدر کرے تو کوئی انعام یا مرتبہ اس کی دسترس سے باہر نہ ہوگا۔ اگر وہ میری ہتک کرے تو اس کا انجام قابل رشک نہ ہوگا۔

مَیں وہ زینہ ہوں جو کامیابیوں کی بلندی پر لیجاتا ہے۔ بعض اوقات لوگ مجھے اپنا بدخواہ سمجھ کر مجھ پر لعنت بھیجتے ہیں۔ لیکن وہ نہیں جانتے کہ میرے بغیر زندگی تلخ۔ دشوار اور بے مقصد ہو جائیگی۔

قبل اس کے کہ مَیں کسی کو اپنی برکتوں سے مالامال کروں یا اپنے انعامات سے بہرہ ور بناؤں۔ ضروری ہے کہ مجھ سے محبّت کی جائے۔ بیوقوف مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن عقلمند مجھ سے محبّت رکھتے ہیں۔ یہ سب سربرآوردہ لوگ جو ہر محکمہ میں صدارت کی کرسیوں پر رونق افروز ہیں۔ میرے ہی رہین منّت ہیں۔

دولت مند سے دولتمند والدین بھی اپنے نوجوان لڑکے کو وہ ترقی نہیں دلا سکتے۔ جو اُسے میری بدولت حاصل ہو سکتی ہے۔ کروڑوں کی زندگی بلاواسطہ مجھ پر منحصر ہے اور بالواسطہ تمام لوگ میرے سہارے پر جیتے ہیں۔

مَیں تمام سرمایہ کا خلّاق ہوں۔
دولت کیا ہے۔ مگر میری مجتمع صورت۔

روٹی کے ہر ٹکڑے میں جو تنور سے گرم گرم نکلتا ہے۔ ریل کی ہر گاڑی میں جو زمین کے سینہ پر گرم خرام ہے جہاز کے ہر حصہ میں جو سمندر کی موجوں سے بے نیاز قطع منازل کر رہا ہے اور اخبار کے ہر پرچے میں جو مطبع سے نکلتا ہے۔ میری جلوہ گری ہے۔

بعض اوقات بلند ہمت جوانمرد اپنی خواہش سے اور زبردست مظلوم اپنی مرضی کے خلاف مجھے زیادہ برتتے ہیں۔ لیکن اعتدال کے ساتھ اگر مجھ سے کام لیا جائے۔ تو خدمت انسان کیلئے مَیں سراسر اکسیر ہوں۔ طبقہ عوام میں جو میرے پیرو ہیں۔ روز بروز زیادہ طاقت حاصل کر رہے ہیں۔ اب وہ حکومتوں میں اقتدار پانے لگے ہیں۔ اور قدیم حکمران خاندانوں کو معزول کرنے کے در پے ہیں۔

مَیں جمہوریت کی ماں ہوں۔

تمام ترقیوں کا منبع ہوں۔

جو شخص میرا دشمن ہے کبھی ترقی کے میدان میں دور نہ جا سکے گا۔

جو میرا دوست ہے۔ اور مجھ سے خوف نہیں کھاتا۔ اس کی ترقیوں کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔

ــــــ ✕ ــــــ

بتاؤ۔ میں کون ہوں؟ میں کیا ہوں؟

میں کام ہوں؟

حکیم محمد یوسف حسن ایڈیٹر "نیرنگ خیال" لاہور

کارآمد باتیں

(۱) جو سمجھتا ہے مَیں عقلمند ہوں۔ وہ بیوقوف ہے۔

(۲) روپے کو عزیز نہ رکھو گے۔ تو عزت کس طرح بڑھے گی؟

(۳) قسم کھانے کی عادت نہ ڈالو۔

(۴) حوصلے کا امتحان مصیبت میں ہوا کرتا ہے۔

(۵) غصہ بڑی تکلیف سے فتح ہونے والا دشمن ہے۔ اور اس کا بہتر علاج خاموشی ہے۔

(۶) اتفاق باہمی کلید کامیابی ہے۔

(۷) کام چور اور کاہل آدمی ہمیشہ دُکھی رہتا ہے۔

رامائن کے تیس پردے

تیسواں پردہ

چیتا

(از حضرت طالب الہ آبادی)

بیٹھے گدی پہ جب وبھیشن — خوش ہو گئے سارے دوست دشمن

لچھمن سیتا کے پاس آئے — احوال پتی کے سب سنائے

سیتا بے تاب ہو رہی تھیں — چپکے چپکے وہ رو رہی تھیں

من میں کہتی تھیں کیا ہے کارن — پربھو نے نہیں دئیے جو درشن

لچھمن نے کہا یہ مسکرا کر — آئے جو نہیں یہاں برادر

بابا کو بچن وہ دے چکے تھے — دشرتھ کو ورن وہ دے چکے تھے

بیتیں گے نہ چودہ سال جب تک — بستی میں نہ جائیں گے وہ تب تک

چلئے ہے آپ کو بلایا — بیٹھے ہیں بنے ہوئے تمنا

سیتا نے کیا یہ سن کے اشنان — لاکھا بھی جمایا کھا کے اک پان

جوڑا بدلا انھوں نے بھاری | پہنی منقّش دار ساری
افشاں ماتھے پہ خوب چُن لی | چوٹی ناگن کی شکل بُن لی
خوشبو سے بس گئیں سراپا | بدّھی سے کس گئیں سراپا
پہنے جو طرح طرح کے زیور | چوتھی کی دلہن بنیں نکھر کر
برسوں سے چھٹی تھیں رام جی سے | ملنے کو چلی تھیں وہ پتی سے
دل میں تصویر تھی پتی کی | مَن میں تنویر تھی پتی کی
تھی ساتھ میں ایک پالکی بھی | پہلو میں کھڑی تھی نالکی بھی
پیدل ہی وہ آئیں بے خطر پاس | تھا شوق و ادب کا اس قدر پاس
جب رام کی پڑ گئیں نگاہیں | سیتا سے لڑ گئیں نگاہیں
بجلی سی چمک گئی فضا میں | خوشبو سی مہک گئی ہوا میں
دونوں تصویرِ آرزو تھے | دو آئینے تھے جو روبرو تھے
آنکھوں آنکھوں میں گفتگو تھی | نظروں نظروں میں جستجو تھی
دونوں کے دماغ تھے معطّر | دونوں کو سکون تھا میسّر
دونوں مدہوش ہو رہے تھے | دونوں بے ہوش ہو رہے تھے
سیتا نے کیا جو جھک کے پرنام | بے ساختہ مسکرا اُٹھے رام
بولے مری جان تم ہو سیتا | دل کا ارمان تم ہو سیتا

عیبوں سے بری ہو باوفا ہو ہرگن سے بھری ہو پارسا ہو

عصمت کی دلیل لائیں گے لوگ قسمیں عفت کی کھائیں گے لوگ

لیکن دنیا کو چپ کرا دو تم آگ میں کود کر دکھا دو

ورنہ موقع جو پائیں گے لوگ جھوٹی سچی اُڑائیں گے لوگ

شک میں کمبخت جب پڑیں گے تہمت وہ آئے دن جڑیں گے

کر لوگی اگر اگن پرچھا ہو جائے گا بند منہ عدو کا

دیوی کو ہوا نہ کچھ بھی انکار سیتا ہوئیں مُسکرا کے تیار

لچھمن نے منگائیں لکڑیاں خوب گھیرے میں سجائیں لکڑیاں خوب

لانبی چوڑی چِتا بنائی پھر آگ جو ڈھیر میں لگائی

پیدا ہوئے جستہ جستہ شعلے اُٹھنے لگے رفتہ رفتہ شعلے

تیار ہوئی چِتا جو جل کر سیتا نہ ہوئیں ذرا بھی مضطر

کچھ اور بھی ہو گئیں وہ مسرور الفت میں پتی کی تھیں وہ مخمور

نل نیل ڈرے تو کانپے سگریو دیوی نے کہا کہ ہے اگن دیو

بھولی ہوں کبھی جو رام جی کو بسری ہوں اگر کبھی پتی کو

کی ہو گر غیر سے محبت یا ہو گئی ہو کسی سے الفت

آئی ہو اگر وفا میں لغزش عصمت میں اگر ہوئی ہو لرزش

یہ آگ مجھے ہلاک کر دے ‏ پاپن کو جلا کے خاک کر دے

جیتے جی لوٹ کر نہ آؤں ‏ دھرتی پھٹ جائے میں سماؤں

یہ کہہ کے ہوئیں چِتا میں داخل ‏ جتنے تھے سب کے ہل گئے دل

غائب شعلوں میں ہو گئیں وہ ‏ سب کی نظروں سے کھو گئیں وہ

اتنے میں ہوئی چِتا وہ گلشن ‏ گلزار بنا وہ ڈھاک کا بن

شعلے جتنے تھے سرد تھے سب ‏ گیندے کی شکل زرد تھے سب

تھی اس کی بہار پیاری پیاری ‏ کلیوں سے بھری تھی کیاری کیاری

تھیں بیچ میں اس چمن کے سیتا ‏ تھا نام لبوں پہ رام جی کا

کندن کی طرح دمک رہی تھیں

سونے کی طرح چمک رہی تھیں

صندل کی طرح مہک رہی تھیں

طوطی کی طرح چہک رہی تھیں

موتی کی طرح جھلک رہی تھیں

نیساں کی طرح چھلک رہی تھیں

ہنستی ہوئی باہر آئیں دیوی ‏ بیٹھیں جو بغل میں رام جی کی

آکاش پر آئے سارے دیوتا ‏ دونوں پہ ہوئی گلوں کی برشا

صنعت و حرفت اور زراعت

فہرست مضامین

S. INAYAT.

نصاب تعلیم اور اس میں ترقی

(از جناب رائے صاحب لالہ مدن گوپال صاحب بی اے، بی، ای، ایس)

ہمارے ملک کے کالج اور یونیورسٹیاں عام طور پر سرکاری دفاتر کے لئے کلرک تیار کرنے کی مشینیں ہیں۔ یونیورسٹی کے نصاب پر اگر غور کیا جائے۔ تو واضح ہوگا کہ قریب قریب وہی مضامین پڑھائے جاتے ہیں جو ممالکِ غیر میں۔ حالانکہ ہر ملک کی تعلیم، اسکی طرزِ معاشرت، اسکی پیداوار اور آب و ہوا وغیرہ کے لحاظ سے ہونی چاہیئے۔ اور ان اصولوں کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔ جو اس کے لئے مفید ہوں۔ بدقسمتی سے ہماری یونیورسٹیاں ان اصولوں سے کسی حد تک گری ہوئی ہیں۔ اسی لئے آئے دن نصاب پر نکتہ چینی کی جاتی ہے۔

چونکہ تعلیم دفتری کاروائی چلانے کی غرض سے دی جاتی ہے۔ اس لئے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اکثر نوجوان تلاش روزگار میں مارے مارے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اخباروں میں ضرورت کے کالموں کا خاص طور پر مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اگر کہیں خالی اسامی کا نوٹس دیکھ پاتے ہیں۔ تو جھٹ ٹکٹ خرید عرضی روانہ کر دی۔ غرضکہ ہر اسامی پر سینکڑوں درخواستیں پہنچ گئیں۔ ان میں سے ایک شخص کا انتخاب ہوا۔ اور باقی کو جواب ملا۔ اسی طرح اکثر حصہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ٹھوکریں اور دھکے کھاتا ہوا ملازمت سرکار سے مایوس ہو کر بنج و بیوپار کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ مگر تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے اکثر حالتوں میں ماں باپ کا اندوختہ ضائع کر بیٹھتا ہے۔

والدین جب اپنے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے مدرسوں میں بھیجتے ہیں۔ تو ان کے دل میں بھی یہی خیال ہوتا ہے۔ کہ ہم اپنی اولاد کو کسی بڑے عہدے پر سرافراز دیکھیں گے۔ انہوں نے تعلیم کا مقصد صرف حصول ملازمت ہی سمجھا ہے۔ یہ کبھی نہیں سوچا۔ کہ تعلیم لامحدود ہے اور ملازمتیں محدود۔ پھر لامحدود کا محدود کے اندر کیسے گذر ہو سکتا ہے۔ فی زمانہ دیکھا جاتا ہے۔ کہ موجودہ تعلیم عام طور پر نہ تو روزگار ہی مہیا کر سکتی ہے۔ نہ اس کے ذریعہ اعلیٰ ملازمت مل سکتی ہے۔ نہ کھیتی باڑی میں مدد ملتی ہے۔ اور نہ ہی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بچہ اس قابل رہتا ہے۔ کہ

صنعت و حرفت کی طرف متوجہ ہو۔ ایک سائنس کا گریجویٹ جس نے فزیکل کیمسٹری باٹنی وغیرہ کی بڑی بڑی کتابیں پڑھی ہوں۔ کالج کی لیبارٹری میں تجربے کئے ہوں۔ اپنی زمین کی کاشت میں اپنے تعلیمی کورس کی بدولت کسی قسم کی ترقی نہیں کرسکتا۔ نہ ہی پیداوار کو بڑھا سکتا ہے۔ ہل چلانا تو درکنار ہل کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی شرم محسوس کرتا ہے لوگوں کا میلان صرف کتابیں رٹ کر امتحان پاس کرنا ہے اور کسی حد تک ہونا بھی چاہئے۔ مگر یہ خیال ضرور ہے۔ کہ ہر بچہ کالج کی تعلیم کے لائق نہیں ہوسکتا۔ قابلیت کے لحاظ سے افراد الگ الگ ہیں۔ اُن میں خوبیاں اور نقائص جُدا جُدا اس لئے اعلیٰ تعلیم کے لئے صرف وہی بچے جائیں جو اُس کے اہل ہوں۔ اور اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اندھا دھند ہر بچے کو کالج میں ٹھونسنا نہ صرف غلطی ہے۔ بلکہ سوسائٹی کا نقصان۔ عزیز عمر کا زیان۔ مال وزر کا ضائع کرنا اور دردسر خریدنا۔

گورنمنٹ عالیہ نے بیکاری کے دریا کو امنڈتا ہؤا دیکھ کر ایک کمیٹی مقرر کی۔ کہ وہ اس کی وجوہات دریافت کر کے رپورٹ کرے۔ کہ بیکاری کیونکر دور ہوسکتی ہے۔ کمیٹی نے خیال ظاہر کیا۔ کہ دستکاری کو فروغ دیا جانا ضروری ہے تاکہ تعلیم یافتہ طبقہ اس سے دلچسپی لے۔ اور کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کرے۔ اگرچہ صوبہ میں کئی دستکاری مدارس موجود ہیں۔ مگر اعلیٰ قسم کی درسگاہ نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم یافتہ لوگ ابھی اس طرف متوجہ نہیں ہوئے سوسائٹی کے بندھن بھی اس کی ترقی میں سدّراہ ہیں۔ یہ کسی حد تک غلط تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اگر غور کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص کے لئے کوئی نہ کوئی دستکاری جاننا ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر تربیت مکمل نہیں ہوتی مشہور مصنف رسکن لکھتا ہے۔ کہ صنعت و حرفت قوت متخیلہ اور قوت فیصلہ کو ترقی دینے کا قدرتی اور عمدہ ذریعہ ہے صرف اس کی بدولت ہی دماغی کام کرنے والوں اور کاریگروں میں تمیز ہوسکتی ہے۔ اگر سب آدمی صنعت و حرفت کی طرف متوجہ ہوں۔ تو بے عزتی کا خیال دلوں سے نابود ہو جائے گا۔ لوک نصیحت کرتا ہے۔ کہ ہر شخص کو کوئی نہ کوئی دستکاری ضرور سیکھنی چاہئے۔ ولایت کے ہر مدرسہ میں کوئی نہ کوئی ہنر سکھایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز بچے موسمی رخصتوں میں معمولی کاریگروں کے ساتھ شہر میں کام کرتے نظر آتے ہیں۔ بعض تو ایسی محنت سے کام کرتے ہیں۔ کہ اپنے سال بھر کا خرچ کما کر کالج یا سکول میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اور ہمارے بچے گرمی گرمی پکارتے ہوئے بیکار بیٹھے نظر آتے ہیں۔

تعلیم کے نقائص کو دور کرنے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نصاب کی کتابیں ہندوستانی واقعات سے پُر ہوں۔ جن میں بڑے بڑے بزرگوں اور ادیبوں کے حالات نمایاں ہوں تعلیم انٹرنس تک مادری زبان میں ہو تاکہ عام فہم ہونے کے سبب کافی ترقی ہوسکے۔ علم الاشیاء میں ملکی پیداوار کو خاص درجہ دیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ اعلیٰ جماعتوں میں بوٹنی کے کورس میں امریکہ کے درختوں اور پھولوں کا حال تو پڑھایا جائے اور ہندوستان میں پیدا ہونے والے سیب ناشپاتی۔ آڑو۔ امرود اور دوسرے پھلوں پھولوں سے واقفیت حاصل نہ ہوسکے

سائنس میں کارک کا وزن مخصوص نکال لینے۔ ترازو پکڑنا سکھانے کے بعد کوئی مفید اور پریکٹیکل کام بھی سکھایا جائے۔ جو طلبا کو روزمرہ کی ضروریات کے پورا کرنے میں مدد دے سکے۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ ایم اے پاس کرنے کے بعد اتنی واقفیت بھی نہیں ہوتی۔ کہ سائیکل کا سپوک بازار سے خرید کر پہیہ میں لگایا جاسکے۔ میز کرسی کی مرمت تو درکنار دیوار میں کھونٹی لگانے کے لئے کاریگر کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔

پریکٹیکل کام میں مہارت حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ جماعتوں میں ڈیزائن پر زور دیا جائے۔ ہائی کلاسز میں طلبا کو اس قابل ہونا چاہئے کہ اپنی روزمرہ کی استعمال کی چیزیں مثلاً سائیکل۔ موٹر سائیکل۔ سنگر مشین وغیرہ میں معمولی مرمت کرسکیں۔ ایسا نہ ہو کہ معمولی معمولی کاموں کے لئے ناخواندہ لوہاروں کا دست نگر ہونا پڑے۔ ڈیزائن کی تعلیم عموماً دی ہی نہیں جاتی۔ یورپ سے آئے دن آواز آتی ہے کہ جرمنی نے فلاں قسم کا طیارہ بنایا ہے۔ انگلینڈ نے موٹر کار میں فلاں فلاں اصلاح کی ہے۔ موٹر ریل، زیلپین۔ ٹرانس پورٹ کے کئی قسم کے سامان جاری کئے ہیں۔ مگر کوئی ہندوستانی نظر نہیں آیا۔ جس نے باپ دادا کے زمانے کے پرانے چھکڑے میں ایسی ترقی کر دکھائی ہو کہ اس میں دو بیل کی جگہ ایک بیل کام دے سکے۔ یا اس کا بوجھ کم ہو جائے۔ یہ صرف دستکاری سے گریز کرنے کا نتیجہ ہے۔ یورپ میں اول سے آخر تک دستکاری اور تعلیم کو ملایا گیا ہے۔ پہلی جماعت سے نہیں بلکہ دو تین برس کے بچے کو بھی فروبل کے کھلونے کھیلنے کے لئے دیئے جاتے ہیں۔ اور گھر کی تعلیم کے علاوہ مدرسہ کی تعلیم شروع سے ہی بچوں کے دلوں میں دستکاری کی روح پھونکنا شروع کرتی ہے۔ کھیلوں کھیلوں میں ہی کاغذ مٹی، تیلیاں، گتے وغیرہ سے دستکاری کی سڑک پر ڈالا جاتا ہے۔ مدرسوں کو لائق۔ فرض شناس اور دل وجان سے کام کرنے کے عادی ہو جانے کی وجہ سے اد نے تعلیم ختم کرنے کے بعد ہی۔ ۔ معلوم ہو جاتا ہے کہ بچے کا رجحان کس طرف ہے۔ اور اسی طرف آسانی سے اسکو ڈالا جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ بیکاری کی جڑ تعلیمی نصاب کی غیر موزونیت اور دستکاری سے گریز ہے۔ اسلئے ضروری ہے کہ ادنےٰ جماعتوں سے لے کر ہائی کلاسز تک ہر مدرسہ میں دستکاری لازمی ہو۔ یعنی درجہ بدرجہ کنڈر گارٹن۔ ایجوکیشنل ہینڈ ورک اور دستکاری تک پہنچے دستکاری کے خاص مدارس کھولنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ملی جلی تعلیم بہترین تجویز ہے۔ مدرسہ چھوڑنے کے بعد حسب رجحان لڑکا کالج میں وقت کا زیادہ تر حصہ معمولی مضامین کے مطالعہ میں گزارے۔ یا دستکاری میں ترقی کرے۔ کالج میں معمولی مضامین کے ساتھ ساتھ زراعت۔ انجنیئرنگ۔ ڈاکٹری۔ ڈیزائن وغیرہ وغیرہ حسب رجحان وضرورت سکھائے جائیں۔ گویا تعلیم اور دستکاری شروع سے اخیر تک ملے ہوئے ہوں۔ علیحدہ علیحدہ ٹریننگ کالج میڈیکل کالج۔ لا کالج۔ انجنیئرنگ کالج بنانے کی ضرورت نہیں۔ ابتدائی تعلیم میں عام طور پر مشینوں کے استعمال کی ضرورت نہیں۔ صرف معمولی اوزاروں سے کام سکھایا جاسکتا ہے۔ اعلیٰ درسگاہوں میں مشینوں کا ہونا نہایت

ضروری ہے۔
اس طریقہ سے ہر شہری باعزت زندگی بسر کر کے ملک اور قوم کا خیر اندیش فرزند بن سکتا ہے۔

مُلک سے بیروزگاری

دُور کرنے کا حل

(از جناب لالہ ہریرام صاحب ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ انڈسٹریل سکول فیروزپور شہر)

تعلیم کے فوائد کسی تشریح کے محتاج نہیں۔ تعلیم کے بغیر قومیت کی تاسیس اور ترقی محال ہے۔ دنیا میں صرف وہی اقوام بامِ ترقی پر جلوہ افروز ہوئیں۔ جنہوں نے علم حاصل کرنے میں پوری سعی و کوشش سے کام لیا۔ اور آئندہ بھی انہیں لوگوں کی اولاد گوئے سبقت لیجائیگی۔ جو اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر علم و عقل کے میدان میں اپنے حریفوں سے بازی لے جانا اپنا فرض جانے گی۔ ان نظائر کے خیال پر تمام اقوام عالم کو تعلیم حاصل کرنے کا شوق بلکہ جنون پیدا ہوگیا۔ ہمارے ملک میں بھی محکمہ تعلیم ہندوستان کے ارباب بست و کشاد نے اشاعت تعلیم کی طرف اپنی خاص توجہ مبذول کی۔ اور بہترین اہلِ دماغ کو اس قسم کا لائحہ عمل و سکیم مرتب کرنے پر مامور کیا۔ جس سے تعلیم کے نشر و اشاعت میں سہولت و کامیابی ہو۔ اور ہر خاص و عام فوائد تعلیم سے بہرہ اندوز ہو سکے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ان تمام مساعی جمیلہ کے باوجود اہلِ ہند تعلیم سے وہ فوائد حاصل نہ کر سکے۔ جن سے دیگر متمدن اقوام بہرہ ور ہوئی تھیں۔ دیگر ممالک میں تعلیم کے بعد راحت و آرام کا دَور شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن اس بدقسمت اور بدنصیب ملک میں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ناکام۔ تلخ اور دردناک زندگی کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہندوستانی یونیورسٹیوں سے ہر سال بے شمار نوجوان انٹرینس۔ ایف اے۔ بی اے اور ایم اے پاس کر کے نکلتے ہیں۔ مگر ان تعلیم یافتہ نوجوانوں سے ملک کی مفید شخصیتوں اور کارکن ہستیوں کی تعداد میں اضافہ ہونا تو درکنار اُلٹا ملک کے بیکاروں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس ملک کا تعلیم یافتہ اور شائستہ طبقہ حصولِ ملازمت کو مقصدِ اولیٰ سمجھتا ہے۔ اس کے سوا اور کسی کام کی طرف اُن کا میلان نہیں۔ بقول مولانا حالی ؒ

کرتے ہیں قصدِ تجارت تو گرہ میں نہیں دام ۔۔۔ دستکاری کو سمجھتے ہیں کہ ہے کارِ عوام

نہیں ہل جوتنے میں راحت و آرام کا نام * بنتے پھرتے ہیں اسی واسطے اک اک کے غلام

اگر ہر ایک آدمی تعلیم اس غرض سے حاصل کرے۔ کہ وہ اِسے حاصل کرنے کے بعد اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکے۔ تو پھر مسئلہ بے روزگاری قطعاً حل ہو جائے۔ دیکھئے جیمز ایک غریب گھرانے میں تولد ہو کر اپنی محنت، سرگرمی اور کیرکٹر کی مضبوطی کے باعث ریاستہائے متحدہ امریکہ کا پریزیڈنٹ بنا۔ جیمز صرف اٹھارہ ماہ کی عمر کا ہی تھا۔ کہ اس کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور ایسا کوئی سرپرست اور مربّی نہ تھا۔ جو اس کے تعلیمی اخراجات کا متحمّل ہوتا۔ تعلیم کے ابتدائی مدارج میں اُسے سخت مشکلات کا سامنا ہوا۔ اس نے محسوس کیا۔ کہ گزارہ بمشکل چلتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس لئے اُس نے نصف یوم کی رخصت اور تعطیلات کے ایّام میں کچھ کام کرکے روپیہ کمانے کی تجویز سوچی۔ ایک دن وُہ "وڈ ورتھ" بڑھئی کی دکان پر کام کی تلاش میں گیا۔ بڑھئی نے کہا میں تمہاری مدد کروں گا۔ مگر جیمز نے جواب دیا میں آپ سے خیرات نہیں مانگتا جس قدر کام کروں۔ آپ اس کام سے مجھ کو کم اجرت دے دینا۔ لڑکے کی اس قدر دلیری کو دیکھ کر بڑھئی نے اس کو تختے صاف کرنے کے لئے اجرت پر دیئے۔ جن کو وہ ایّام رخصت میں صاف کرتا تھا۔ اس طریق سے اس کی آمدنی اس قدر ہونے لگی کہ وہ کالج کی تعلیم کسی کا مرہونِ منت ہونیکے بغیر حاصل کر سکا۔

کیا یہ افسوس کا مقام نہیں ہے کہ ہندوستان میں غریب گھر کے گریجوئیٹ بھی اپنے ہاتھ سے کام کرنا کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ اور روٹی کمانے کی رسائن کے نسخہ کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کیونکہ جس شے پر کچھ رقم خرچ نہ ہو اور مفت دستیاب ہو جائے۔ اس چیز کی قدر نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک مرتبہ کسی فقیر نے اپنے ایک مرید کو پارس پتھر ایک لوہے کی ڈبیہ میں بند کرکے دیا۔ اور کہا، جاؤ جس شے کو سونا بنانا ہو۔ اس پر پارس رگڑ دینا۔ وہ سونا بن جائے گی۔ مگر چونکہ مرید کو دستکاری کی کوئی قدر نہ تھی۔ نیز اسے پتھر حاصل کرنے پر بھی کسی خرچ کا زیر بار ہونا نہ پڑا تھا۔ اِس لئے اُس نے پارس پتھر کو ایک معمولی شے خیال کرکے مکان کے ایک طاقچے میں رکھ دیا۔ جب دو تین سال کے بعد پھر فقیر کا اس جگہ سے گزر ہوا۔ تو اُن کو خیال آیا کہ ہمارا مرید بڑا امیر بن گیا ہوگا۔ چلو اس سے ملاقات کر چلیں۔ جب اس کے مکان پر پہنچے تو اس کو سابقہ حالت میں ہی پایا۔ فقیر صاحب نے پوچھا کہ ہم نے تمہیں پارس دیا تھا مگر تم ابھی اسی غریبانہ حالت میں ہو۔ اس نے جواب دیا۔ مجھ کو آپ کی بات کا اعتبار نہیں تھا۔ کیونکہ جب یہ لوہے کی ڈبیہ ہی جس میں پارس بند ہے۔ سونے کی نہیں ہوئی۔ تو اور کسی لوہے کی شے پر رگڑنے سے وہ کس طرح ہو سکتی ہے۔ فقیر صاحب نے وہ ڈبیہ ناراض ہو کر واپس لے لی۔ اور کہا چونکہ تمہیں یہ مفت ملی تھی۔ اس لئے تم نے اس کی قدر نہیں کی۔ جب فقیر نے ڈبیہ واپس لے کر پارس پتھر کو جو کہ کاغذ میں لپٹا ہوا تھا۔ نکال کر لوہے کی ڈبیہ پر رگڑا اور وہ فوراً سونے کی ہو گئی۔ تو مرید صاحب

کی آنکھیں کھلیں۔ اور اُس نے بہت کوشش کی۔ کہ پارس کا پتھر مل جائے۔ مگر فقیر نے ایک نہ سنی اور وہاں سے پارس لیکر یہ کہتے ہوئے غائب ہو گئے کہ اب یہ کسی طرح بھی نہ مل سکے گا۔

مذکورہ بالا مثال سے صاف روشن ہے کہ جو شے مفت دستیاب ہو جائے اس کی قدر نہیں ہوا کرتی۔ نیز ہر ایک صاحب کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ بعض وقت معمولی بات کے معلوم نہ ہونے سے تمام کام نکما پڑا رہتا ہے۔

آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ گراموفون کے ریکارڈ بنانے والے نے جب ریکارڈ ایجاد کیا۔ اور بے حد کوشش کے بعد بھی آواز پیدا نہ ہوئی۔ تو موجد نے اخبارات میں اشتہار شائع کیا کہ میں نے گراموفون کا ریکارڈ ایجاد کر لیا ہے۔ اگر کوئی صاحب میرے ریکارڈ میں آواز پیدا کر دیگا۔ تو اس کو پچاس ہزار روپے انعام دیئے جائیں گے۔ ایک عمر رسیدہ شخص نے جو تقریباً نوّے سال کا ہوگا۔ اپنے بچپن کے زمانہ میں ایک تعلیمی ماہوار رسالہ میں ایک دستکاری کا مضمون اس امر پر پڑھا تھا۔ کہ سریش کس طرح آواز پیدا کرتی ہے۔ جب اس کی نظر گراموفون کے ریکارڈ کے موجد کے اس اشتہار پر پڑی۔ وہ فوراً اس کے پاس شیشی میں حل شدہ سریش لیکر پہنچا۔ اور فرمایا کہ میرے اس حل شدہ مصالح کو استعمال کر کے دیکھیں۔ امید ہے اس سے آپ کے ریکارڈ میں آواز پیدا ہو جائے گی۔ جب اس کو ریکارڈ پر برش سے لگایا گیا۔ اور خشک ہو جلنے پر ریکارڈ کو مشین پر چڑھا کر استعمال کیا گیا۔ اس نے فوراً آواز دیدی۔ اسی وقت ریکارڈ کے موجد نے اس ضعیف العمر کو دس ہزار روپے دیئے وہ اس کثیر رقم کی خوشی میں پھولے نہ سمایا۔ اور کہہ اُٹھا یہ تو بالکل معمولی شے یعنی سریش ہے اور آپ نے مجھ کو دس ہزار روپے دیدیئے۔

ناظرین کرام! ذرا غور فرمایئے، کہ قدردان نے معمولی شے کے معلوم کرنے پر دس ہزار روپے خرچ کر کے اس آدمی کو بھی خوش کر دیا۔ جس نے ایسے رسالہ کے مضمون کو معمولی شے کی قدر کر کے اپنے ذہن میں جگہ دی تھی۔ اور اپنی عقلمندی سے خود بھی چالیس ہزار روپے بچا لیئے اور پھر ریکارڈ کو مکمل کر کے لاکھوں روپے دیگر ممالک سے بھی وصول کر لیئے۔ یہ ہے معمولی چیز کی قدر۔

مؤدبانہ گزارش ہے کہ اگر آپ بزرگوار بھی ان معمولی نسخوں کی جو راقم الحروف اور دیگر اصحاب کی طرف سے گاہے ماہے رسالہ رہنمائے تعلیم میں نکلتے رہتے ہیں۔ قدر کریں تو تیس چالیس روپے ماہوار کما لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ جس کی خاطر بی۔ اے پاس کر کے محض دستکاری سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ملازمت کی خاطر دربدر دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔

معمولی ۸ × ۱۰ انچ کا شیشہ صرف پانچ پیسے میں ملتا ہے اگر اسپر معمولی لاگت سے سلور نائیٹریٹ۔ ٹائیٹریٹ

آف سوڈا اور ایمونیا کا سیلوشن تیار کر کے چاندی کا پانی چڑھا لیا جائے۔ تو یہ منہ دیکھنے والا سیشہ بن جاتا ہے جس کی قیمت ایک روپیہ ہوتی ہے۔ اس طرح سے تھوڑی سی لاگت سے منہ اور کپڑے دھونے کا صابن تیار ہو سکتا ہے۔ چاندی سونے وغیرہ کے گلٹ کرنے کا سامان صرف ایک دو روپے کے خرچ میں تیار ہو سکتا ہے ڈرائی اور دیگر ہر قسم کی بیٹریوں کا تیار کرنا۔ شہتوت کی شاخوں اور بید کے چھلکوں سے مختلف قسم کی ٹوکریاں بنانا۔ گندم کی ناڑ سے ٹوکریاں بننا۔ دریاں اور نوار وغیرہ تیار کرنا۔ السی کے تیل۔ رال اور سندرس وغیرہ سے لکڑی پر رنگنے والا روغن۔ سپرٹ اور لاکھ وغیرہ سے پالش بنانا۔ ہائیڈر وکلورک ایسڈ اور نیلے تھوتھے وغیرہ سے شیشوں پر نام اور لوہے پیتل پر انگریور کرنے کا کام۔ برتنوں پر قلعی اور گلٹ کرنا معمولی کھڑیا مٹی اور سریش سے چھاپہ تیار کرنا معمولی مشین کے ذریعہ بٹن اور جراب وغیرہ بنانا۔ سنہری لیس تیار کرنا۔ کپڑوں پر پھول کاڑھنے اور چھاپنے کا کام۔ غرض اسی طرح کی کوئی دستکاری کا کام کر کے روٹی کے سوال کو حل کیا جا سکتا ہے۔ مذکورہ بالا دستکاریوں کے متعلق بہت سے نسخے بالتفصیل رہنمائے تعلیم کے گزشتہ رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

اب معمولی شیشے پر پانی چڑھانے کا نسخہ درج کیا جاتا ہے۔ اگر آپ اس کی قدر اس انگریز کی طرح کریں۔ جس نے صرف اس بات کے معلوم کرنے پر کہ لاکھ کا اعلیٰ رنگ کرنے کے لیئے کونسی لاکھ استعمال کرنی چاہیئے دو صد روپے خرچ کر کے صرف یہ معلوم کیا کہ صرف وہ لاکھ اعلیٰ رنگ تیار کرنے کے لئے استعمال کرنی چاہیئے جو بھادوں کے مہینے میں اکٹھی کرائی جائے۔ تو آپ حضرات بھی رسالہ رہنمائے تعلیم کے مطالعہ سے ذیل کے نسخہ پر عمل کر کے روٹی کے سوال کو حل کر سکتے ہیں۔

معمولی شیشے پر پانی چڑھانے کا نسخہ

احتیاط۔ جس شیشے پر پانی چڑھانا ہو۔ اس کو پہلے پانی سے بہت اچھی طرح صاف کرنے کے بعد نائٹرک ایسڈ سے صاف کر کے پھر پانی سے دھولیں۔ بعد ازاں ٹن کلورائڈ کو روئی کے گالے کے ساتھ لگا کر صاف شدہ شیشے پر خوب ملیں۔ تاکہ شیشے کی سطح بالکل صاف ہو جائے۔ مگر اس بات کا خاص خیال رکھیں۔ کہ شیشے کی صاف سطح سے انگلی وغیرہ نہ چھونے پائے۔ بعد ازاں شیشے کو دھوپ میں آدھ گھنٹہ کے لیئے ہموار جگہ پر رکھا رہنے دیں۔

سالیوشن نمبر ۱۔ ۱۰ گرین سلور نائٹریٹ کو ایک اونس مقطر پانی میں کسی چینی کی پیالی میں حل کریں۔ اس میں قطرہ قطرہ کر کے ایمونیا ملاتے جائیں۔ جبتک کہ در درے مادے حل نہ ہو جائیں۔

سالیوشن نمبر ۲۔ ۱۰ گرین سلور نائٹریٹ کو ایک اونس مقطر پانی میں حل کر کے پھر اس سالیوشن کو جلدی سے ابلتے ہوئے ۵ گرین پوٹاش نائٹریٹ آف سوڈا اور ۴ اونس مقطر پانی میں ڈال دیا جائے اور ٹھنڈا

ہونے پر فلٹر کرلیں۔

ترکیب۔ جب دھوپ میں صاف کردہ شیشے کو جس پر چاندی کا پانی چڑھانا مقصود ہے۔ ہموار جگہ رکھے نصف گھنٹہ گزر جائے۔ تو تیار کردہ سالیوشن نمبر ۱، ۲ کو کسی اور صاف شیشی میں حسب ضرورت شیشے کی لمبائی وچوڑائی کے مطابق یکساں مقداریں ملاکر خوب حل کرکے فوراً اسی وقت قطرہ قطرہ کرکے شیشے کے عین درمیان اسطرح سے گرائیں کہ چاندی کا پانی شیشے کی تمام سطح پر خوب پھیل جائے مگر نیچے نہ گرنے پائے۔ بعدازاں نصف گھنٹہ تک شیشے کو اسی جگہ بغیر ہلائے جلائے دھوپ میں رہنے دیں۔ تاکہ پانی خشک ہوکر شیشے پر چاندی چڑھ جائے۔ پھر شیشے کو پانی کے بہاؤ سے دھودیا جائے۔ مگر ہاتھ سے ہرگز نہ ملیں۔ بعدازاں اندھیرے میں خشک کرکے شنگرف اور روغن ملاکر برش سے لگاکر دھوپ میں رکھدیں۔ تاکہ روغن خشک ہوجائے۔

نوٹ خاص۔ ہر ایک عمل کو احتیاط اور استقلال کے ساتھ کریں۔ تاکہ مفید اور اعلیٰ نتائج حاصل ہونے پر آپ کو اپنی کامیابی پر مسرت حاصل ہو۔ یاد رہے "مشق انسان کو مکمل بناتی ہے"۔

محبّت

اے بدنصیب آدم کے بیٹے! تو کیوں رو رہا ہے؟ تجھے بتایا گیا ہے کہ "تو وحشی ہے، ظالم ہے، خونخوار ہے۔ تو نے اپنے بھائی کا گلا کاٹ ڈالا اور اس کے گھر میں آگ لگادی! تو گمراہ ہے۔ تجھے تیرے ازلی دشمن شیطان نے ورغلایا ہے"!

تجھے سکھایا گیا ہے کہ "تو عشق کے لئے پیدا ہوا تیری زندگی اُنس ہے۔ تیرا مقصود محبت ہے۔ تیرا رہنما خدا ہے"۔ یہ تیرا استاد کوئی افیمی تھا۔ یا اسکی ماں ہی ماں تھی باپ کوئی تھا ہی نہیں۔

تجھے شیطان نے ورغلایا؟ خواب! اُس تیز داڑھنے والے شیر کو کس نے ورغلایا کہ سیاہ آنکھوں والی ہرنی کے بچے کا گلا گھونٹے۔ اس تیز پنجوں والے شاہین کو کس نے ورغلایا کہ کبوتر کا سینہ چیرے۔

تو عشق کے لئے پیدا ہوا؟ تیری زندگی اُنس ہے۔ تیرا مقصود محبت ہے۔ تیری رہنما محبت ہے۔ جھوٹ، محبت صرف اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ تو اپنے بھائی کا گلا کاٹ سکے۔ محبت صرف اس لئے کی گئی ہے کہ شیر ہرنی کے بچے کو پھاڑ سکے۔ محبت صرف اسلئے پیدا کی گئی ہے۔ کہ شاہین کبوتر کو چیر سکے۔

تیری ماں کو تیرے بھائی سے محبت تھی۔ اسکا کیا حشر ہوا؟ ہرنی کو اپنے بچے سے محبت تھی اسکا انجام کیا ہے؟ کبوتری کو اپنے بچے سے محبت تھی۔ اسکا کیا حال ہے؟

محبت، محبّت وحشت ہے۔ محبت ظلم ہے۔ محبت خونخواری ہے۔ (ماخوذ)

پنجاب کے ورنیکلر مڈل مدارس

میں

زراعت کی تعلیم

(جناب لالہ لچھمنداس صاحب بی۔ اے، پی۔ اے، ایس اسسٹنٹ انسپکٹر زراعت پنجاب)

تعلیم اگر صحیح طور پر دی جائے۔ تو اس کا اثر طلبا کی ذہنی اور اخلاقی ترقی تک ہی محدود نہیں رہنا چاہئے۔ بلکہ اس سے ان کی اقتصادی اور تمدنی ترقی بھی ہونی چاہئے۔ پنجاب میں جو طریقہ تعلیم اس وقت تک رائج رہا ہے اس نے اس مقصد کو صرف محدود حد تک ہی پورا کیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ طلبہ کی ذہنی ترقی کو وسعت دینے میں بہت کچھ کوشش کی گئی ہے۔ اور وہ کامیاب بھی ہوئی ہے۔ مگر زندگی کے اقتصادی پہلو کو دوران تعلیم میں بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ آج کل تعلیمیافتہ گروہ میں جو تمدنی اور اقتصادی تفاوت اور اس سے پیدا شدہ خرابیاں نظر آرہی ہیں۔ اس کی ذمہ داری زیادہ تر اسی پرانے طریقہ تعلیم پر ہے۔ اس طریقہ نے ہمارے صوبہ کی دولت کی ایزادی میں چنداں مدد نہیں دی۔ البتہ اس کا اثر یہ ضرور ہؤا ہے کہ موجودہ دولت بہت سے ہاتھوں کی بجائے چند ہاتھوں میں چلی گئی ہے۔ یعنی شہروں اور قصبوں میں جو چند امیر تھے۔ وہ امارت میں بڑھ گئے۔ اور عام لوگ بالخصوص کاشتکار طبقہ افلاس میں ترقی کرتا گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہؤا ہے کہ ہمارا صوبہ اس وقت اقتصادی نقطۂ نگاہ سے مصیبت میں گرفتار ہے۔

درسی تعلیم صرف کتابوں تک ہی محدود رہی ہے۔ اور ایسے عملی مضامین جن کا تعلق عام پیشوں سے ہے۔ نظر انداز کر دیئے گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ ملک میں بے شمار کلرک۔ چند وکلاء اور گنتی کے مدبر پیدا ہو گئے ہیں۔ مگر ایسے لوگوں کی تعداد جنہوں نے اپنی ہمت سے لکیر کے فقیر نہ ہو کر ملک میں نام پایا ہو۔ نہائیت قلیل ہے۔ آج کل ہزاروں انٹرینس اور ایف۔ اے پاس اور سینکڑوں گریجوایٹ بے کاروں کی فہرست میں شامل ہیں۔ جو اپنی تعلیم سے کسی قسم کا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اور اپنے والدین کی گاڑھے پسینہ کی کمائی کے ضائع ہو جانے پر گریہ کناں ہیں جس سے انہوں نے یہ تعلیم حاصل کی۔ بے شک آبائی پیشے موجود ہیں جنہیں یہ لوگ اختیار کر سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے سکولوں کی تعلیم نے طلبا کے جسم اور طبائع ان پیشوں کے بالکل ناقابل بنا دیئے ہیں۔ سکول کی تمام فضا طلباء میں

اپنے ہاتھ سے کام کرنے کا شوق پیدا کرنے کے لئے ناموافق ہے۔ احاطۂ سکول میں طالب علموں کا ان حالات میں نسبتاً زیادہ وقت گزارنا جوان کے خانگی حالات سے بالکل مختلف ہوں۔ انہیں اپنے آبائی پیشے سے بے اعتنا کرنے کے لئے کافی ہے۔ بجائے اس کے کہ لڑکا اپنی تعلیم سے فائدہ اٹھا کر اپنے آبائی پیشہ کو ترقی دے ہیں اکثر یہ اندوہناک نظارہ دیکھنے میں آتا ہے۔ کہ لڑکے اپنے آبائی پیشے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور اگر والدین مجبور کریں۔ تو وہ ان کی اطاعت سے سر پھیر لیتے ہیں۔

اگر یہ حالات بدستور قائم رہنے دیئے جاتے۔ تو اس کا لازمی نتیجہ ملک کی تباہی اور گورنمنٹ کے لئے باعث تشویش ہوتا۔ اس لئے موجودہ طریقہ تعلیم میں تبدیلی لازمی ٹھہری۔ بنا بریں گورنمنٹ نے نہایت دانائی سے جنگ عظیم کے بعد جس قدر جلد ہو سکا۔ ہائی سکولوں اور ورنیکلر مڈل سکولوں میں زراعت کی عملی تعلیم کا انتظام کیا اور اسی طرح پرائمری اور نورمل سکولوں میں باغبانی اور مطالعہ قدرت کو جاری کیا۔ ممکن ہے کہ اور تبدیلیاں بھی بہیں ضروری سمجھا جائے۔ عمل میں لائی جائیں۔ مگر زراعت کا حق فائق تھا۔ کہ گورنمنٹ اس کی طرف توجہ مبذول کرتی۔ کیونکہ زراعت ہی ہمارے صوبہ کی سب سے بڑی حرفت اور قریباً ۹۰ فی صدی لوگ اسی طرح پر گزارہ کرتے ہیں۔

گورنمنٹ آف انڈیا کی کوشش

اس اصلاح کی طرف پہلے پہل توجہ گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے ہوئی۔ جس نے کہ ۱۹۰۷ء میں شملے میں اس سوال پر غور کرنے کے لئے ایک کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس نے یہ تجویز منظور کی۔ کہ ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہر ضلع میں ایک یا ایک سے زیادہ زراعتی مڈل سکول ہوں۔ جن میں زراعت کی تعلیم کا پورا پورا انتظام ہو۔ اور عملی پہلو کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائے۔ ان سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے گورنمنٹ آف انڈیا نے ۱۹۱۸-۱۹ء میں تیس لاکھ روپیہ کی منظوری زراعتی اور صنعتی تعلیم کے لئے دی۔ اور اس میں سے ۲۵ لاکھ روپیہ صرف زراعتی تعلیم کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔

پنجاب گورنمنٹ کی کوشش

پنجاب گورنمنٹ نے شملے کی کانفرنس کی سفارشات پر غور کرنے کیلئے دو دفعہ کانفرنس منعقد کی۔ اور یہ طے پایا کہ چونکہ اس قسم کے زراعتی اور صنعتی مڈل سکول جن کی گورنمنٹ آف انڈیا نے سفارش کی ہے۔ پنجاب کیلئے موزوں

نہیں - اس لئے مڈل سکولوں سے ہی زراعتی تعلیم کے پھیلانے کا کام لیا جائے - اور یہ قرار پایا کہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے ہر سکول میں ٹرینڈ استاد اور ایک قطعہ زمین جو کم سے کم تین ایکڑ ہو - بیل - آلات اور دیگر ضروری سامان مہیا کیا جائے - اور ساتھ ہی یہ بھی فیصلہ ہوا - کہ پرائمری سکولوں میں زراعتی تعلیم کی بجائے مطالعہ قدرت جاری کیا جائے - اور نارمل سکولوں میں مطالعہ قدرت اور باغبانی کی تعلیم دی جائے -

ہائی سکولوں کے متعلق یہ سفارش کی گئی - کہ زراعتی تعلیم کا بندوبست ایسے شہری سکولوں میں کیا جائے - جہاں کہ دو یا دو سے زیادہ ہائی سکول ہوں - تاکہ طلبا ر دیگر مضامین اپنے اپنے سکولوں میں پڑھیں - اور زراعت کیلئے ایک جگہ اکٹھے ہو کر ایک ہی استاد کے ماتحت تعلیم حاصل کریں - اور اس زراعتی درسگاہ کا تمام خرچ گورنمنٹ کے ذمے ہو -

محکمہ تعلیم پنجاب کی کاروائی

ان فیصلہ جات کو عمل میں لانے کیلئے پہلا کام جو محکمہ تعلیم پنجاب نے کیا وہ یہ تھا کہ ۱۹۱۸ء میں زراعتی کالج لائل پور میں ایک کلاس چند منتخب ایس - وی ٹرینڈ اساتذہ کے لئے کھولی گئی - جو اس وقت تک برابر جاری ہے - اور ہر سال بیس سے زیادہ طلبا تیار کر کے باہر بھیجتی ہے -

ورنیکلر مڈل سکول کی چار جماعتوں کے لئے زراعت کا نصاب تیار کیا گیا - اور بعد ازاں پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے زراعتی تعلیم کے لئے چار درسی کتب بھی تیار کروالیں -

کاشت کی عملی تعلیم کے لئے ہر سکول میں مندرجہ ذیل سامان کی فہرست لازمی سمجھی گئی -

(۱) سکول کے نزدیک قابل کاشت زمین کا ٹکڑا جو کم سے کم تین ایکڑ رقبہ میں ہو -

(۲) ایک یا دو جوڑی بیل

(۳) آلات کشاورزی - دیسی اور اصلاح شدہ

(۴) ایک عمارت ہو جس میں بیل، آلات کشاورزی اور دیگر ضروری سامان کے علاوہ فارم کے چوکیدار کی رہائش کی بھی گنجائش ہو -

گورنمنٹ نے بحساب ۲۵۰۰ روپیہ فی سکول ابتدائی اخراجات کے لئے منظور کیا - اور یہ سمجھ لیا گیا کہ بعد کے اخراجات جن میں استاد کا دس روپیہ ماہوار الاؤنس بھی شامل ہوگا - وہ مقامی بورڈ ادا کرے گا - جن کے ماتحت وہ سکول ہوں -

مالی مشکلات کا اثر

اس سکیم کے جاری ہونے کے تھوڑا عرصہ بعد صوبے کو مالی مشکلات کا سامنا ہُوا۔ جن کی وجہ سے اکثر ڈسٹرکٹ بورڈوں نے اساتذہ کے الاؤنس اور فارم کے دیگر اخراجات کا برداشت کرنا اپنی طاقت سے باہر خیال کیا اور انہوں نے فوراً اس سکیم کے خلاف اپنی آراء کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ اور بھی کئی دقتیں تجربہ میں آئیں جن میں بڑی یہ تھی۔ کہ منظور شدہ نرخ میں یعنی ۲۵۰ روپیہ فی ایکڑ کے حساب سے زمین کا میسر آنا بہت مشکل ہو گیا۔ اور اسی طرح آبپاشی کے لئے پانی حاصل کرنے کی دقتیں بھی پیش آئیں۔ لیکن باوجود ان تمام مشکلات کے پہلے چار سالوں میں تسلی بخش ترقی ہوئی۔ اگرچہ ترقی کی رفتار سست تھی۔ یعنی ۲۴-۱۹۲۳ء کے آخر میں ۴۴ ورنیکلر مڈل سکول ٹرینڈ اساتذہ کی نگرانی میں زراعت کی تعلیم دے رہے تھے۔

ایک نیا سرکلر

ستمبر ۱۹۲۳ء میں ڈیپارٹمنٹ نے ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے جو مالی مشکلات کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ اپنی پالیسی میں تبدیلی کا اعلان کیا۔ ایک نیا سرکلر جاری کیا گیا جس کی بڑی بڑی دفعات مندرجہ ذیل ہیں:۔

(ا) چونکہ تین ایکڑ زمین والے فارموں کیلئے زیادہ روپیہ کی ضرورت ہے۔ اس لئے ان کی تعداد محدود ہونی چاہئے۔

(ب) گورنمنٹ ایک باقاعدہ کامیاب فارم کے مالی نقصان کے پورا کرنے کے لئے تاریخ اجرا سے ۵ سال تک ۱۰۰ سو روپیہ سالانہ تک امداد دے گی۔

(ج) چونکہ بڑے فارم زیادہ تعداد میں جاری کرنے مشکل ہیں۔ اس لئے ان کی بجائے سکولوں میں چھوٹے چھوٹے باغیچے جن کا رقبہ نصف ایکڑ سے زیادہ نہ ہو۔ جاری کئے جائیں۔

(د) گورنمنٹ ایسے باغیچوں کے ابتدائی اخراجات کے لئے ۲۰۰ روپیہ فی قطعہ بطور امداد دے گی۔ اور مالی نقصان کی صورت میں ہر قطعہ کے لئے کام شروع ہونے کی تاریخ سے پانچ سال تک تیس روپے سالانہ تک امداد دے گی۔

(س) گورنمنٹ زراعتی استاد کا ۱۰ روپیہ ماہوار الاؤنس برداشت کرنے کے لئے تیار ہے۔ خواہ وہ استاد فارم کا انتظام کر رہا ہو یا سکول کے باغیچے کا۔

موجودہ حالت

اس سرکلر کا خوشگوار اثر یہ ہُوا۔ کہ سکولوں میں زراعتی تعلیم کی ترقی ہونے لگی ۲۴-۱۹۲۳ء کے تعلیمی سال کے

اختتام پر زراعت کی تعلیم دینے والے سکولوں کی تعداد ۴۴ سے ۶۰ ہوگئی۔ اور اس وقت ایسے سکولوں کی تعداد ۱۴۴ ہے۔ جن میں سے ۲۷ ایسے ہیں۔ جن کے ساتھ ۳ ایکڑ یا اس سے زیادہ کے فارم ہیں۔ اور اسی قدر سکول ایسے ہیں۔ جن کے ساتھ باغیچے ہیں۔

فارم یا باغیچے

ڈسٹرکٹ بورڈ اور اس سکیم کے نکتہ چینوں کی خواہشات کو پورا کرنے کی خاطر کچھ عرصہ سے کامیابی کے ساتھ یہ کوشش کی گئی ہے۔ کہ سکول فارم اپنے خرچ کو جہاں تک ممکن ہو۔ خود پورا کریں۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ یہ کام آسان نہیں ہے۔ ایک تو یہ دقت ہے کہ تین ایکڑ کا فارم اقتصادی نکتہ نگاہ سے کچھ وقیع نہیں۔ اور دوسرے یہ تجربہ میں آیا ہے۔ کہ اگر اس مقصد کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے۔ تو اس کا اثر دیگر تعلیمی مقاصد کے حصول پر بُرا پڑتا ہے۔

زراعتی فارم زراعت کی عملی تعلیم کے لئے واقعی بہت مفید ہیں۔ ایک تو ان سے زمینداروں کے بچے یہ سیکھ لیتے ہیں۔ کہ کاشتکاری میں سائنس کے اصولوں پر عمل پیرا ہو کر ملک کو کس قدر فائدہ کی امید ہو سکتی ہے۔ اور دوسرے زمینداروں کے اس غلط عقیدے کی کہ "زراعت میں کوئی نئی بات سیکھنے کے قابل نہیں" اصلاح ہو رہی ہے۔

سکول فارموں سے یہ توقع نہ رکھی جائے کہ وہ مقامی یا گرد و نواح کے زمینداروں کو کاشتکاری کے جملہ اصول واضح طور پر پیش کر سکیں۔ اور نہ ہی ان درسگاہوں کا یہ مقصد ہے۔ مگر پھر بھی یہ امر موجب مسرت ہے۔ کہ بعض کامیاب سکول فارم مقامی زمینداروں کے لئے نہایت اعلیٰ نمونہ پیش کر رہے ہیں۔ اور یہ خیال زور پکڑ رہا ہے کہ اگر ان سکول فارموں کی عمدہ طریق پر غور و پرداخت کی جائے اور ضروری سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ تو یہ صرف طلبائے سکول کے لئے ہی نہیں بلکہ گرد و نواح کے کسانوں کے لئے بھی بہت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

پنجاب کی سکیم

گذشتہ ۱۱ سال میں ہمارے صوبے نے زراعتی تعلیم کی خاطر ورنیکلر مڈل سکولوں میں جو انتظام کیا گیا ہے اسکی مختصر سی تفصیل مندرجہ بالا سطور میں دی گئی ہے۔ ہمارے صوبہ میں یہ سکیم غیر معمولی طور پر کامیاب ہوئی ہے۔ اور یہ کامیابی دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں بہت نمایاں ہے۔ دوسرے صوبہ جات نے گورنمنٹ آف انڈیا کی سفارشات کو عمل میں لانے کے لئے جو زراعتی مڈل سکول کھولے تھے۔ وہ اتنے مفید ثابت نہیں ہوئے۔ ہندوستان کی بورڈ آف ایگریکلچر نے عرصہ ہوا یہ رائے "پوسا" (Pusa) کے مقام پر ظاہر کی تھی

کہ پنجاب میں جو سکیم رائج ہے۔ وہ ورنیکلر مڈل سکولوں کے لئے نہایت موزوں ہے۔ اور اس رائے کی پختگی کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے۔ کہ یہی سکیم بنگال میں بھی اس خاص وفد کی سفارش سے جو کہ ۱۹۲۶ء میں اس سکیم کے مطالبہ کی غرض سے پنجاب آیا تھا۔ جاری کر دی گئی ہے۔ اور "رائل کمیشن آف ایگریکلچر" نے بھی اپنی ۱۹۲۸ء کی رپورٹ میں اس سکیم کو پسند فرمایا۔ اور دیگر صوبجات میں زراعتی مڈل سکولوں کی جگہ اس سکیم کو جاری کرنے کی سفارش کی۔ پھر بھی جو شبہات اس سکیم کے متعلق بعض لوگوں کے دلوں میں رہ گئے تھے۔ وہ سال گزشتہ میں اس کمیٹی نے جو زراعتی تعلیم کے متعلق وزیر تعلیم پنجاب نے مقرر کی تھی۔ بالکل دور کر دیئے۔ کیونکہ کمیٹی کے ممبروں نے اس کے متعلق اپنی رپورٹ میں پوری تسلی کا اظہار کیا ہے۔

نتیجہ

جہاں تک کہ سکیم کا تعلق ہے۔ ہمیں ان بڑی بڑی ہستیوں کی رائے صائب کے اظہار کے بعد جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس کے مفید ہونے میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اس سکیم کو حسب دلخواہ سرعت سے سکولوں میں رائج کرنے میں روپیہ کا سوال مانع ہے۔ ہاں یہ امر موجب مسرت ہے کہ بعض آسودہ حال و ترقی یافتہ ڈسٹرکٹ بورڈوں نے صوبے کی گورنمنٹ کی طرف سے امداد کا انتظار کئے بغیر اپنے اپنے علاقوں میں سکول فارم اور باغیچوں کا کام شروع کر دیا ہے۔ اس سے بہت بڑی حد تک اس سکیم کی ہر دلعزیزی اور اس کے مفید ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ ان فارموں کے کام میں زمینداروں کی دلچسپی میں جو اضافہ ہو رہا ہے وہ بھی بہت دل خوش کن ہے۔ کیونکہ اس سے ان فارموں کا عملی طور پر مفید ہونا ثابت ہوتا ہے۔ سکول کے طلبا نے بھی کھیتی باڑی کے کام میں دلچسپی کا اظہار شروع کر دیا ہے۔ اور اساتذہ نے بھی ہر جگہ زراعت کے عملی کام میں دوستانہ ہمدردی دکھانی شروع کر دی ہے۔

نارمل سکولوں میں عملی باغبانی نے بہت ترقی کی ہے۔ اور امید ہے کہ دیہات میں زراعت پر اس کا بہت اچھا اثر پڑے گا۔ اسی طرح لوئر مڈل اور پرائمری سکولوں میں جو باغبانی کی طرف بتدریج توجہ کی جا رہی ہے۔ یہ بھی بہت امید افزا ہے۔ اور ہر عقلمند آدمی کا فرض ہے کہ اس کی حمایت کرے۔ مڈل اور نارمل سکولوں میں باغبانی اور زراعت کی تعلیم کا ایک عمدہ اثر تمام سکولوں پر یہ بھی ہوا ہے کہ طلبہ اپنے اپنے سکولوں کی سجاوٹ اور احاطہ سکول کے آراستہ کرنے میں زیادہ دلچسپی لینے لگے ہیں۔ اور اس بارے میں گزشتہ پانچ سال میں جو نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ ان تمام باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر زراعت کے کام کو سکولوں میں ترقی دی جائے۔ تو اس سے نہایت اہم نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے یہ امر گورنمنٹ اور عوام کی حوصلہ افزائی کا مستحق ہے۔

موجودہ حالت میں یہ بتانا کہ سکولوں میں زراعت کی تعلیم نے طلبا میں کس حد تک زراعت کا پیشہ اختیار کرنے کی خواہش پیدا کر دی ہے۔ دشوار ہے۔ کیونکہ ایک تو صحیح اور قابل اعتبار اعداد و شمار مہیا نہیں ہو سکتے جن سے یہ معلوم ہو سکے۔ کہ طلبا سکول چھوڑنے کے بعد کون کون سے مشاغل اختیار کرتے ہیں۔ دوسرے زراعت کا کام سکولوں میں ابھی کافی عرصہ تک جاری نہیں رہا ہے۔ جس سے طلبا کے اندر اس پیشہ کو اختیار کرنے کا رجحان پیدا ہو سکے۔ تیسرے یہ کہ ہمارے ملک میں اس وقت تک لوگوں میں پیشہ کا انتخاب غور و فکر کے بعد نہیں کیا جاتا بلکہ ایک بڑی حد تک اتفاقیہ امر ہے۔ تاہم یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے۔ کہ اگر سکولوں میں زراعت کی تعلیم صحیح طریق پر جاری رکھی جائے۔ تو دیہاتی طلبا کے دلوں پر ضرور اس کا اثر ہوگا۔ بلکہ موجودہ حالات میں بھی اس امر کی کافی شہادت موجود ہے کہ کہیں کہیں بعض طلبہ نے سکول کی تعلیم چھوڑنے پر سکول فارم کے زیر اثر ہو کر اپنے اپنے گھروں میں سبزیات کاشت کرنے کا کام شروع کیا ہے۔ جس سے انہوں نے کافی مالی فائدہ اٹھایا ہے۔

غرضیکہ اس مضمون کی کامیابی سکولوں میں نہایت یقینی ہے۔ کیونکہ گورنمنٹ اس بارے میں کافی سے زیادہ دلچسپی لے رہی ہے۔ صرف ایسے بہی خواہوں کی ضرورت ہے۔ جو کاشتکاروں کے دلی ہمدرد ہوں۔
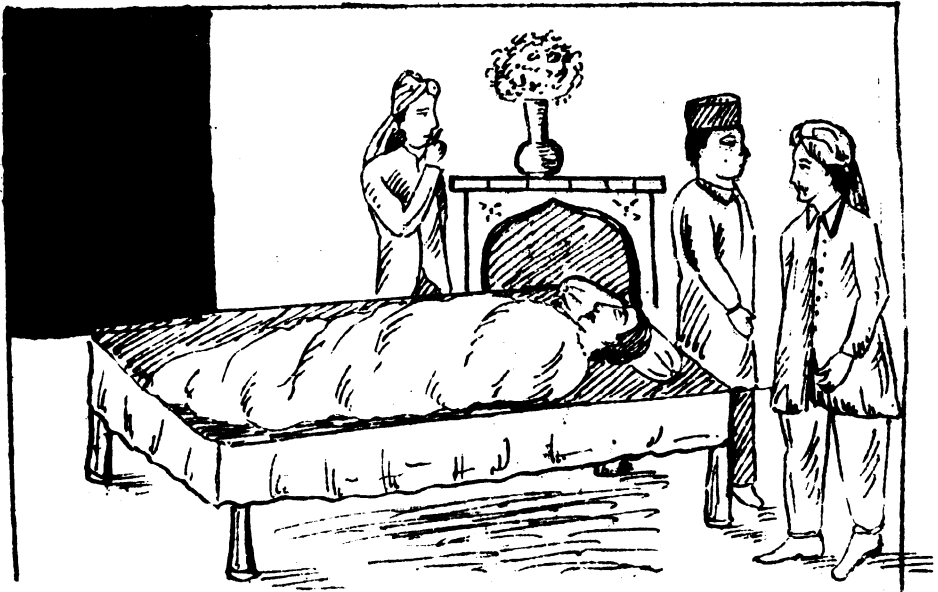
سرہانے میر کے آہستہ بولو ٭ ابھی ٹُک روتے روتے سو گیا ہے

ہنری فورڈ

(پنڈت بال مکند عرش ملسیانی سیکنڈ ماسٹر گورنمنٹ انڈسٹریل سکول لدھیانہ)

مسٹر ہنری فورڈ دنیا کی ان ممتاز ہستیوں میں ایک برگزیدہ ہستی ہیں۔ جنہوں نے ایک غیر معروف گھرانے میں پیدا ہو کر حیرت انگیز ترقی کی۔ آپ ۳۰ جولائی ۱۸۶۳ء کو ڈابرن (امریکہ) کی ایک فارم میں پیدا ہوئے۔ عام طور پر یہ روایت ہے۔ کہ آپ کے والدین بہت مفلس تھے۔ اور آپ کے بچپن کا زمانہ بہت ناداری اور تنگدستی کی حالت میں گذرا۔ لیکن مسٹر فورڈ خود اپنی کتاب "میری زندگی اور میرا کام" میں لکھتے ہیں کہ واقعی آپ کے والدین بہت دولتمند نہیں تھے۔ لیکن زیادہ مفلس بھی نہیں تھے۔ وہ قابل فخر گھر جس میں مسٹر فورڈ پیدا ہوئے۔ آج تک کھڑا ہے۔ اور وہ گھر اور فارم ان کی موجودہ جائداد کا ایک حصہ ہے۔

ابھی ان کی عمر صرف بارہ سال ہی کی تھی۔ کہ انہوں نے ایک دن روڈ انجن دیکھا جو سڑک پر بھاری مشینوں کے کھینچنے کا کام دیتا تھا۔ اس انجن کو دیکھ کر ان کے دماغ میں ایک امنگ پیدا ہوئی۔ اور وہ اس کے چھوٹے چھوٹے نمونے بنانے میں منہمک ہو گئے۔ اس وقت سے آج تک ان کی تمام ترقوتیں محض اسی شعبہ ایجادات میں صرف ہو رہی ہیں کہ سڑک پر چلنے والا انجن بنایا جائے۔ دوسری عجیب چیز جو انہوں نے اسی سال دیکھی۔ وہ ایک گھڑی تھی۔ اسے دیکھنے کے بعد آپ بالعموم ٹوٹی ہوئی گھڑیوں کو جوڑنے کی کوشش اور مشق کرتے۔ تیرہ سال کی عمر میں آپ نے پہلی دفعہ یہ کامیابی حاصل کی۔ کہ ایک ٹوٹی ہوئی گھڑی کو باقاعدہ وقت دینے والی گھڑی بنا لیا۔ پندرہ سال کی عمر میں آپ گھڑیوں کے متعلق ہر قسم کی مرمت کر سکتے تھے۔ باوجود اس کے کہ انہیں اعلیٰ قسم کے اوزار میسر نہ تھے۔ اتنی کامیابی حاصل کر لینا معمولی بات نہیں ہے۔ ان کا عقیدہ ہے۔ کہ مختلف چیزوں کو لیکر دماغی تحقیق کرنے میں ایک عدیم المثال کامیابی پنہاں ہے۔ اور ایک کاریگر کے لئے کوئی ضرورت نہیں کہ وہ کتابوں سے کسی چیز کو حاصل کرے مشین ہی اس کی کتابیں ہیں۔ ان کے والدان کے اس شوق کے حق میں نہ تھے۔ لیکن پھر بھی یہ شوق بڑھتا ہی گیا۔ اور انہیں وئی اس سے روک نہیں سکا۔ سترہ سال کی عمر میں سکول سے فارغ التحصیل ہوتے ہی آپ ڈرائڈک انجن ورکس میں بطور اپرینٹس کام کرنے لگے۔ تین سال کی مقررہ میعاد سے پہلے ہی آپ نے اپرنٹس کا کام ختم کر لیا۔ انہیں دنوں میں آپ نے گھڑیوں کی ایک دوکان میں مرمت کا کام شروع کر دیا۔ اور دن رات اس قدر محنت سے کام کیا۔ کہ بعض اوقات ایک دن رات میں تین تین سو کے قریب گھڑیاں ان کے پاس مرمت کیلئے آجاتیں اس کام میں شبانہ روز کام کرکے یکایک انہیں خیال پیدا ہوا۔ کہ اس کام سے میں بنی نوع انسان کی کوئی خاص خدمت ادا نہیں

کر سکتا۔ خدمتِ خلق کا خیال ہے کہ انہوں نے اپنے پہلے شوق کو کہ گھوڑوں کے بغیر چلنے والی گاڑی بنائی جائے۔ نشوونما دینی شروع کی۔ کافی غور و خوض اور تجربات کے بعد آپ ایک سٹیم کار بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن یہ خیال کہ ہلکی گاڑیوں کے لئے سٹیم کی طاقت کا استعمال مناسب نہیں۔ انہیں مزید غور و خوض کے لئے اکسا تا رہا۔ ویسٹنگ ہوس کمپنی جس کے ساتھ مل کر آپ نے یہ کام شروع کیا تھا۔ اسی وجہ سے چھوڑ دی۔ اپرینٹس کے زمانے کی یاد اور تازہ لٹریچر کے پڑھنے سے گیس انجن کے متعلق خیالات پیدا ہونے شروع ہوئے۔ ۱۸۸۵ء کے قریب انہوں نے ایک آٹو انجن کی مرمت کی۔ حالانکہ یہ کام انہوں نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ لیکن شوق اور سوچنے کی قوت نے مل کر انہیں اس میں بھی کامیاب کر دیا۔ اس سے اس انجن کے متعلق انہیں واقفیت ہو گئی۔ اسی طرح مختلف تجربات کرتے کرتے ۱۸۹۲ء میں آپ اس قابل ہوئے کہ اپنا پہلا موٹر بنانے کا فخر حاصل کر سکیں۔ یہ موٹر ڈبل سلنڈر تھا۔ اور اس میں صرف دو آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ دراصل ۱۸۹۳ء کے موسمِ بہار میں یہ موٹر ان کی حسبِ خواہش چلنے لگا۔ اس موٹر کی ساخت موجودہ موٹروں سے بہت مختلف تھی۔ اور اس میں چند خامیاں بھی تھیں۔ ۱۸۹۵ء اور ۱۸۹۶ء کے درمیان انہوں نے اس موٹر سے تقریباً ایک ہزار میل سفر طے کیا۔ لوگ بالعموم اس موٹر کو دیکھ کر ششدر رہ جاتے تھے۔ انہوں نے لکھا ہے۔ کہ جہاں کہیں میں یہ موٹر لے کر ٹھہرتا۔ لوگوں کا ہجوم اور ان کے عجیب عجیب سوالات مجھے بہت تنگ کرتے۔ اور اگر کہیں میں نیچے اتر آتا۔ تو ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی کہ میری جگہ بیٹھ کر اسے چلانے کی کوشش کرے۔ ان کی ایسی خواہش سے مجھے بے اختیار ہنسی آتی تھی۔ چونکہ اب انہوں نے کافی تجربہ حاصل کر لیا تھا اسلئے

اس موٹر کو ایک شخص کے ہاتھ جو اُسے خریدنے کا بہت خواہش مند تھا۔ ۲۰۰ ڈالر میں فروخت کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اور تجربات شروع کئے۔ اور موٹر کار میں مزید اصلاحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپ نے مختلف قسم کے ڈھانچے تیار کئے۔ جن کے نام موٹر اے۔ بی۔ کے۔ این۔ آر۔ ٹی وغیرہ ہیں۔ موڈل K موٹر سب سے زیادہ طاقتور تھا۔ اور یہ چھ سلنڈر رکھتا تھا۔ این اور آر میں سب سے کم طاقت تھی۔ موڈل بی کا وزن ۱۲۵۰ پونڈ تھا۔ این۔ اور آر سب سے ہلکی تھیں۔ ان کا وزن ۱۰۵۰ پونڈ تھا۔ ۱۹۲۱ء میں فورڈ موٹر کار کا وزن ۱۲۰۰ پونڈ تھا۔

آخر فورڈ موٹر کمپنی بنائی گئی۔ اس کمپنی کی عمر ابھی پانچ ہی سال کی تھی۔ کہ ان کی فیکٹری ۶۵۔۲۲ ایکڑ زمین میں پھیل گئی۔ کام کرنے والوں کی اوسط تعداد ۱۹۰۸ تھی۔ اور انہوں نے ۶۱۸۱ موٹر بنائے۔ ۱۹۰۸ء میں انہوں نے ۱۰۶۰۷ موٹر بنائے۔ سفری موٹر کار کی قیمت ۸۵۰ ڈالر تھی۔ ہر سال قیمت گھٹتی گئی۔ اور موٹر کار کی اصلاح بھی ہوتی گئی۔

ذیل کے اعداد و شمار ان کے کام کی حیرت انگیز ترقی کو ظاہر کرتے ہیں۔

سال	قیمت فی موٹر کار	بنائے گئے موٹروں کی تعداد
۱۹۰۹-۱۰	۸۵۰ ڈالر	۱۸۶۶۴

۱۹۱۰-۱۱	۷۵۰ ڈالر	۳۴۵۲۸
۱۹۱۱-۱۲	۶۹۰ "	۷۸۴۴۰
۱۹۱۲-۱۳	۶۰۰ "	۱۶۸۲۲۰
۱۹۱۳-۱۴	۵۵۰ "	۲۴۸۳۰۷
۱۹۱۴-۱۵	۴۹۰ "	۳۰۸۲۱۳
۱۹۱۵-۱۶	۴۴۰ "	۵۳۳۹۲۱
۱۹۱۶-۱۷	۳۶۰ "	۷۸۵۴۳۲
۱۹۱۷-۱۸	۴۵۰ "	۷۰۶۵۸۴ } ایام جنگ عظیم
۱۹۱۸-۱۹	۵۲۵ "	۵۳۳۷۰۶ }
۱۹۱۹-۲۰	۵۷۵ سے ۴۴۰ تک	۹۹۶۶۶۰
۱۹۲۰-۲۱	۴۴۰ سے ۳۵۵ تک	۱۲۵۰۰۰۰

۱۹۰۸ء اور ۱۹۱۱ء کا مقابلہ کریں۔ تو فیکٹری ۵۶۵ء۲ ایکڑ کی بجائے ۳۲ ایکڑ تک پھیل چکی تھی۔ مگر کام کرنیوالوں کی تعداد ۱۹۱۰ سے ۴۱۱۰ ہوئی۔ موٹریں بھی تقریباً ۶۰۰۰ کی بجائے ۰۰۰۵۷ بنائے گئے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کام کرنے والوں کی تعداد میں کام کے تناسب سے بہت تھوڑی زیادتی کرنی پڑی۔ یہ بات محض کام کی مکمل اور باقاعدہ نگہداشت۔ آسان سے آسان طریقوں سے کام کرنے کی کوشش اور مکمل ضبط و نظام پر منحصر ہے۔ ایک دفعہ ان کا یہ اشتہار نکلا جس میں انہوں نے اول اول ہی میں یہ خواہش ظاہر کی تھی۔ کہ وہ ایک ایسا موٹر بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں جسے عام لوگ استعمال کر سکیں گے اور وہ قابل ترین کاریگروں کی زیر نگرانی بنیگا۔ جس پر اچھے سے اچھا سامان صرف کیا جائیگا۔ اور جس کی قیمت بھی کم سے کم ہوگی۔ تو لوگوں نے عام طور پر اسے خام خیالی ٹھہرایا۔ باخبر حلقوں میں ہر روز یہ سوال پیدا ہوتا کہ فورڈ کمپنی کب دیوالیہ ہوگی۔ لیکن مسٹر فورڈ لکھتے ہیں کہ ان باتونیوں کو یہ خبر نہ تھی۔ کہ اس کمپنی میں ایک آدمی کا دماغ کام نہیں کر رہا۔ بلکہ ایک فطرتی اصول کام کر رہا ہے۔ جس کا نام ضبط اور نظام ہے۔ ان کے کام کرنے والوں کو پہلی ہدایت یہ ہے۔ کہ وہ صرف وہی کام کریں۔ جو انہیں کہا جائے۔ ہر ایک پرزہ اور ہر ایک حصہ ایک دوسرے پر اسقدر انحصار رکھتا ہے۔ کہ کام کرنے والوں کو اگر ان کی مرضی کے مطابق کام کرنے کی اجازت دیجائے تو سارا کھیل بگڑ جائے۔ اسی ضبط اور نظام کے نہ ہونے سے خود کام کرنے والوں کا نقصان ہے۔ جب کام بگڑ جائیگا اور نقصان کے آثار پیدا ہونگے۔ تو قدرتاً اس کا اثر ان کی تنخواہوں پر بھی پڑے گا۔

مسٹر فورڈ کا ایک بڑا اصول یہ ہے۔ کہ کوئی کام اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس کا تجزیہ

کنندہ - کارندہ اور خریدار مینوں اس سے فائدہ نہ اٹھائیں

اسقدر ایجاد و اختراع کر چکنے کے بعد آج تک مسٹر فورڈ کا یہ خیال ہے - کہ دنیا میں ابھی ترقی کا بہت وسیع میدان ہے۔ جب وہ دیکھتے ہیں - کہ ایک کسان جسقدر طاقت صرف کرتا ہے - اس کا محض پانچ فیصدی حصہ اس کے فائدے کے لئے استعمال ہوتا ہے - اور باقی طاقت ضایع جاتی ہے - تو وہ سوچتے ہیں - کہ ابھی بہت کچھ ترقی کی گنجایش ہے - ایک کسان پانی کا ایک گھڑا لیکر ہر روز زینہ چڑھتا ہے - لیکن وہ اس روزانہ ضایع ہونے والی طاقت کا تدارک ایک نلکا لگا کر نہیں کرتا - اسے یہ معلوم نہیں کہ نلکے کی قیمت اس مجموعی طاقت کے سامنے کچھ بھی نہیں - طاقت اور حرکت دونوں اپنی قیمت دیئے بغیر ضایع ہو رہی ہیں - دنیا بھر کے انجنوں اور مشینوں میں آج بھی اتنی طاقت کام نہیں کر رہی - جتنی صرف زمین میں ہل چلانے میں صرف ہو جاتی ہے - یہ باتیں محسوس کر کے مسٹر فورڈ کہتے ہیں - کہ ابھی میدان بہت وسیع ہے - بشرطیکہ خدمت خلق کا جذبہ دل میں ہو -

ان کے زرین اصول جن کو یہ خواجی کامیابی کی بنیاد قرار دیتے ہیں - مفصلہ ذیل ہیں -

۱ - مستقبل کے خطرات سے بے پروائی اور ماضی پر فخر کرنا چاہیئے - جو شخص مستقبل اور اس کی ناکامیوں سے ڈرتا ہے - وہ اپنی سرگرمیوں کو محدود کر دیتا ہے - ناکامیابی نئے سرے سے سوچ سمجھکر کام کرنے کا ایک موقع ہے - دیانتدارانہ ناکامی میں کوئی شرم نہیں - بلکہ ناکام ہونے سے ڈرنے میں شرم ہے - ماضی اس وجہ سے فائدہ بخش ہے کہ وہ ترقی کے لئے راستے اور ذرایع تجویز کرتا ہے -

۲ - دوسروں سے مقابلہ کرنے کی خواہش سے بے نیاز رہنا چاہیئے - ہر شخص اپنے اپنے کام کے لئے موزوں ترین شخص ہے یہ ایک مجرمانہ فعل ہے - کہ کسی کے ہاتھوں سے کسی کا کام چھین لیا جائے - یا چھیننے کی کوشش کی جائے - مجرمانہ اسلئے کہ ذاتی نفع کی غرض سے ہوتا ہے - ایک ہم جنس کو نقصان پہنچانے اور عقلمندی کی بجائے طاقت سے حکومت کرنے کے مترادف ہے -

۳ - منافع سے پہلے خدمت گذاری کا خیال رکھنا چاہیئے - اگرچہ منافع کے بغیر کام نہیں چل سکتا - اسلئے منافع کی خواہش رکھنا کوئی غلطی نہیں - اچھی طرح چلایا ہوا کام خود بخود منافع دیگا - منافع خدمت خلق کا صلہ ہونا چاہیئے -

۴ - کم قیمت پر خریدنا اور زیادہ پر بیچنا یہ ایک غلط اصول ہے - واجب سے واجب قیمت پر سامان خرید کر اس پر تھوڑی سے تھوڑی قیمت کا اضافہ کرنا اور اسے کار آمد بنا کر بیچنا حکمت ہے - روپیہ بٹورنے کے باقی تمام طریقے کام کو گرا دیتے ہیں -

ان اصولوں پر کاربند رہ کر مسٹر فورڈ نے اپنی تجارت کو کس طرح فروغ دیا - یہ کسی آیندہ اشاعت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں -

عالم با عمل و فاضل اجل بھائی صاحب بھائی ویر سنگھ آف امرتسر کی شہرۂ آفاق کتاب گورونانک چمتکار سے یہ بلاک صاحب موصوف نے براۓ عنایت ایک دفعہ چھاپنے کے لئے دیا ہے جسے ہم ناظرین رسالہ کی ضیافت طبع کے لئے شائع کرتے ہیں اور محترم بھائی صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں

(سید دل محمد صاحب فضاؔ منشی فاضل جالندھری)

یوں رنگ لائیں داغِ جگر بن کے اپنے پھول   یارب بہارِ تازہ میں جیسے چمن کے پھول

شرمندہ رشک سے ہیں بہت یاسمن کے پھول   دامن میں آج کس نے چنے نارون کے پھول

یہ آہِ سرد ہے کہ نسیمِ بہار ہے   یہ داغ ہیں کہ باغِ دلِ پُر محن کے پھول

دیکھیں وہ آکے سیرِ دلِ داغدار کی   کیا کیا بہار پر ہیں ہمارے چمن کے پھول

نسبت نہیں انہیں رخِ رنگینِ یار سے   دل کیا مرا نہال ہوئے گر چمن کے پھول

تارے کھلے ہیں عارضِ رنگیں کے شوق میں   پھولے نہیں سماتے ہیں چرخِ کہن کے پھول

پونچھے جو اُس نے دستِ حنائی سے میرے اشک   لالے کے پھول بن گئے سب نسترن کے پھول

بے چین کر گئی ہمیں رنگینیٔ خیال!!!   یاد آگئے سفر میں یکایک وطن کے پھول

گلگشت میں ہوا سے ادھر اُٹھ گئی نقاب   شرما گئے چمن میں ادھر یاسمن کے پھول

دنیا کی ہے فضا گلِ رخسارِ یار سے   ہونگے نہ باغِ خلد میں بھی اس پھبن کے پھول

آیا ہے سیرِ باغ کو یہ کون رشکِ گل   کیوں فرشِ راہ بن گئے بچھ کر چمن کے پھول

ہے بلبلوں میں شور بہار آگئی **فضاؔ**
پھولے سمائیں گے نہ چمن میں چمن کے پھول

کلامِ باسط

(ماسٹر باسط صاحب سیوانی)

رہِ الفت میں مٹ جائے اگر نام ونشاں اپنا ۔۔۔ گزر ہو منزلِ جاں تک مکاں ہو لامکاں اپنا

عروج اتنا تو ہو بعدِ فنا اے آسماں اپنا ۔۔۔ کہ لپٹے تیرے دامن سے غبارِ ناتواں اپنا

دکھا سکتی نہیں منہ باغ میں فصلِ خزاں اپنا ۔۔۔ جمائے ہے کچھ ایسا رنگ اب کے باغباں اپنا

اگر پردہ دوئی ڈالے نہ رہتی درمیاں اپنا ۔۔۔ تو میرے امتحاں کو وہ سمجھتے امتحاں اپنا

اُدھر بیتاب وہ ہوتے، تڑپتا دل یہاں اپنا ۔۔۔ مگر ایسی کہاں قسمت نصیب ایسا کہاں اپنا

کیا یوں رازِ دل ہم نے اشاروں میں بیاں اپنا ۔۔۔ کہ جیسے حال کہتا ہے بمشکل بے زباں اپنا

یہی اب دیکھنا باقی رہا ہم ناتوانوں کو ۔۔۔ کہ پیچھے ساتھ دے آکر غبارِ کارواں اپنا

زبانِ حال سے محفل میں سب کچھ کہہ دیا آخر ۔۔۔ چھپاتی شمعِ محفل کس طرح سوزِ نہاں اپنا

وہی اک داستانِ عشق ہم دہراتے رہتے ہیں ۔۔۔ بدلتا رہتا ہے کچھ کچھ مگر رنگِ بیاں اپنا

قدم رکھے جو کوئی منزلِ دشوارِ الفت میں ۔۔۔ تو دل کے امتحاں کے ساتھ کرلے امتحاں اپنا

چھری گردن پہ رکھے رو رہے ہیں آج مقتل میں
وہی جو کل ہنسی سمجھے تھے **باسط** امتحاں اپنا

افسانے
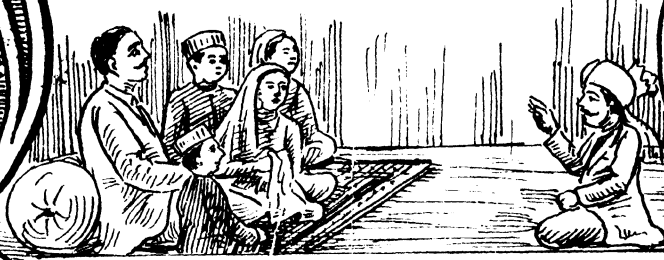
فہرستِ مضامین

(۱)

میری کلاس میں سورج پرکاش سے زیادہ شریر لڑکا نہ تھا۔ بلکہ یوں کہو کہ اپنی ملازمت کے دس سالوں میں مجھے ایسے ناہموار طالب علم سے سابقہ نہ پڑا تھا۔ فتنہ انگیزی میں اسکی جان بستی تھی۔ مدرسوں کو بنانے اور چڑھانے، سرگرم طلبا کو ذلیل کرنے اور رُلانے میں اُسے مزا آتا تھا۔ ایسی ایسی سازشیں کرتا۔ ایسے ایسے پھندے ڈالتا۔ ایسی ایسی بندشیں کرتا کہ عقل دنگ ہو جاتی تھی۔ گروہ بندی میں اُسے خداداد ملکہ تھا۔ خدائی فوجداروں کی ایک فوج بنا لی تھی اور اس کے زور سے سکول پر حکومت کرتا تھا۔ پرنسپل کا حکم ٹل جائے، مگر کیا مجال کہ کوئی اس کے حکم سے سرمو انحراف کر سکے۔ جینا محال کر دیتا تھا۔ سکول کے چپڑاسی اور اردلی اس سے تھرتھر کانپتے تھے۔ انسپکٹر کا معائنہ ہونیوالا تھا۔ پرنسپل صاحب نے حکم دیا کہ لڑکے معین وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے آجائیں۔ منشا یہ تھا کہ لڑکوں کو معائنہ کے متعلق کچھ ضروری ہدائتیں کر دیں۔ مگر دس بج گئے۔ انسپکٹر صاحب آکر بیٹھ گئے اور مدرسہ میں ایک لڑکا بھی نہیں! گیارہ بجے خود بخود سب لڑکے اسطرح نکل پڑے۔ جیسے کوئی پنجرہ کھول دیا گیا ہو۔ انسپکٹر صاحب نے کیفیت میں لکھا۔ "ڈسپلن بہت خراب ہے"۔ پرنسپل صاحب کی کرکری ہوئی۔ مدرسین بدنام ہوئے۔ اور یہ ساری شرارت سورج پرکاش کی تھی۔ مگر ہر چند تحقیقات کی گئی۔ سورج پرکاش کا کسی نے نام تک نہ لیا۔ مجھے اپنی تنظیم پر غرہ تھا ٹریننگ کالج میں اس صیغہ میں مَیں نے امتیاز حاصل کیا تھا۔ مگر یہاں میری ساری تنظیمی قابلیت میں زنگ سا لگ گیا تھا۔ کچھ عقل ہی نہ کام کرتی کہ اس شیطان کو کیسے راہِ راست پر لاؤں۔ کئی بار مدرسوں کی میٹنگ ہوئی۔ پر یہ عقدہ نہ حل ہوا۔ نئے اصول تعلیم کے مطابق میں جورِ استاد کا قائل نہ تھا۔ پر یہاں ہم اس طرز عمل سے محض اسلئے محترز تھے کہ کہیں علاج مرض سے بدتر نہ ہو جائے۔ سورج پرکاش کو سکول سے نکالدینے کی تجویز بھی کی گئی۔ پر اسے شکست کا اعتراف سمجھ کر ہم اس پر عمل کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ بیس بائیس سند یافتہ آزمودہ کار مدرس ایک بدمعاش بارہ تیرہ سال کے لڑکے کی اصلاح نہ کر سکیں۔ یہ خیال حد درجہ شرمناک تھا۔ یوں تو سارا اسکول اس سے بیزار تھا۔ مگر سب سے زیادہ پریشان میں تھا۔ کیونکہ وہ میرے درجہ کا طالب علم تھا۔ اور اسکی شرارتوں کا خمیازہ زیادہ تر مجھے اٹھانا پڑتا تھا۔ اسکول آتا تو یہ اندیشہ لگا رہتا کہ دیکھیں آج کیا شگوفہ کھلتا ہے۔ ایک دن اپنی میز کی دراز کھولی۔ تو اس میں سے ایک بڑا سا مینڈک نکل پڑا۔ میں چونک کر پیچھے ہٹا۔ تو گرتے گرتے بچا۔ کلاس میں ایک شور برپا ہو گیا۔ "گر قہرِ درویش بر جانِ درویش" سورج پرکاش کی طرف غضبناک معذوری کی نگاہ ڈال کر رہ گیا۔ سارا گھنٹہ پند و نصیحت میں گزر گیا۔ اور وہ بدمعاش

سر جھکائے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ وہ نیچے کی جماعتوں سے پاس ہوکر کیونکر میرے درجہ تک آیا تھا اس میں ابتدائی درجوں کی لیاقت بھی نہ تھی۔ آٹھویں درجہ تک آپہنچا تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ ہر سال پاس ہوتا چلا آتا ہے پاس کیونکر ہوتا تھا۔ خدا ہی جانے۔

ایک دن میں نے غصہ سے کہا "تم اس درجہ سے عمر بھر پاس نہیں ہو سکتے۔"

سورج پرکاش نے پراطمینان اور لاپرواہی سے کہا "آپ میرے پاس ہونے کی فکر نہ کریں۔ میں ہمیشہ پاس ہوتا رہا ہوں اور اب کے بھی پاس ہونگا۔"

'غیر ممکن!'

'غیر ممکن، ممکن ہو جائیگا'

میں استعجاب سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔ ذہین سے ذہین لڑکا بھی اپنی کامیابی کا دعوےٰ اتنے استحکام کے ساتھ نہ کرسکتا تھا۔ معاً خیال آیا۔ یہ امتحانی پرچے اڑا لیتا ہوگا۔ ممتحنوں کے نوکروں یا لڑکوں سے ملکر کچھ لالچ دے کر پرچے نقل کرلیتا ہوگا۔ میں نے عہد کیا۔ اب کے میں اسکی ایک بھی چال نہ چلنے دونگا۔ دیکھوں کتنے دن اس درجہ میں پڑا رہتا ہے آپ گھبرا کر نکل بھاگیگا۔

سالانہ امتحان کے موقعہ پر میں نے غیر معمولی احتیاط سے کام لیا۔ مگر جب سورج پرکاش کی کاپی دیکھی۔ تو حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میرے دو پرچے تھے۔ دونوں ہی میں اس کے نمبر درجہ میں سب سے زیادہ تھے۔ اور ممتحنوں کے پرچے شاید اتنے اچھے نہ کئے تھے۔ مگر پاس سب پرچوں میں تھا۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ وہ میرے کسی پرچے کا کوئی سوال بھی حل نہیں کرسکتا۔ میں اسے ثابت کرسکتا تھا۔ مگر اس کے جوابی پرچوں کو کیا کرتا۔ تحریر میں اتنا فرق نہ تھا۔ جو کوئی شبہ پیدا کرسکتا۔ امتحان میں اکثر لڑکوں کی تحریر عجلت کے باعث کچھ نہ کچھ مختلف ہو ہی جاتی ہے۔ میں نے پرنسپل صاحب سے کہا۔ وہ بھی چکرا گئے۔ مگر انہیں بھی دیدہ و دانستہ مکھی نگلنی پڑی۔ میں شاید معمول سے زیادہ مایوس طبیعت ہوں۔ اور مدرسوں کو میں سورج پرکاش کے بارے میں ذرا بھی متردّد نہ پاتا تھا۔ گویا ایسے لڑکوں کا سکول میں آنا کوئی غیر معمولی بات نہیں مگر میرے لئے وہ ایک ہیجان انگیز معمہ تھا۔ اگر اسکے اطوار یہی رہے تو ایک دن یا تو یہ جیل میں ہوگا۔ یا جیل کے سائے میں

(۲)

اُسی سال میرا تبادلہ ہوگیا۔ حالانکہ یہاں کی آب و ہوا مجھے موافق تھی۔ پرنسپل اور دوسرے ماسٹروں سے یارانہ ہوگیا تھا۔ اور ہر ایک قسم کی چیز ارزاں تھی۔ مگر میں اپنے تبادلہ سے خوش ہوا۔ کیونکہ سورج پرکاش سے میری گلوخلاصی ہوجائے گی۔ لڑکے مجھ سے مانوس ہوگئے تھے۔ ان کی طرف سے مجھے رخصتی دعوت دی گئی۔ اور سب کے سب مجھے اسٹیشن تک پہنچانے آئے اسوقت سبھی لڑکوں کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ میں بھی اپنے آنسوؤں کو

نہ روک سکا۔ اتفاق سے اُسی وقت میری نگاہ سورج پرکاش پر پڑی۔ جو سب سے پیچھے کچھ نادم کھڑا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کہ اُسکی آنکھوں میں بھی آنسو بھرا ہوا تھا۔ میرا جی بار بار چاہتا تھا کہ اس سے چلتے چلاتے دو چار باتیں کرلوں۔ شاید وہ بھی مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر نہ میں نے پیش قدمی کی۔ اور نہ اُس نے۔ حالانکہ مجھے بہت دنوں تک اس کا افسوس رہا۔ اس کا حجاب قابل معافی تھا۔ اس نے مجھے ناراضگی کے بے شمار موقع دیئے تھے۔ میرا احتراز ناقابل عفو تھا۔ ممکن تھا اس وقت اور ندامت کے عالم میں میری دو چار خلوص کی باتیں اسکے دل پر اثر کرجاتیں۔ مگر انہی کھوئے ہوئے موقعوں کا نام تو زندگی ہے۔ گاڑی آہستہ آہستہ چلی۔ لڑکے کئی قدم اس کے ساتھ دوڑے۔ میں کھڑکی کے باہر سر نکالے کھڑا تھا۔ کچھ دیر تک مجھے اُنکے ہلتے ہوئے رومال نظر آئے۔ پھر وہ صورتیں حباب کی طرح مٹ گئیں۔ مگر ایک ننھی سی صورت اب بھی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ میں نے قیاس کیا وہ سورج پرکاش ہے۔ اس وقت میرا دل کسی بیتاب قیدی کی طرح نفرت، کدورت اور مغائرت کی بندشوں کو توڑ توڑ کر اس سے گلے ملنے کے لئے تڑپ اُٹھا۔

نئے مقام کی نئی دلچسپیوں اور نئی مصروفیتوں نے مجھے بہت جلد اپنی جانب مائل کرلیا۔ تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہوا۔ پچھلے دنوں کی یاد ایک حسرت بن کر رہ گئی۔ جس میں درد اور لذت تو تھی۔ مگر تحریک عمل نہیں۔ نہ کسی کا کوئی خط آیا۔ نہ میں نے کوئی خط لکھا۔ شاید دُنیا کا یہی دستور ہے۔ برسات کے بعد برسات کی ہریالی کتنے دنوں قائم رہتی ہے عارضی صحبتوں کا یہی انجام ہے۔ خیر۔ اتفاق سے مجھے انگلینڈ میں تکمیل تعلیم کا ایک موقعہ ہاتھ آگیا۔ وظیفہ ملا۔ انگلینڈ پہنچگیا۔ وہاں تین سال لگ گئے۔ وہاں سے لوٹا تو اپنے وطن سے بہت دُور ایک کالج کا پرنسپل مقرر ہوا۔ یہ فروغ میرے لئے بالکل غیر متوقع تھا۔ خواب میں بھی میرے تخیل نے اتنی بلند پروازی نہ کی تھی۔ مگر حرص رفعت اب کسی بلند تر شاخ پر اپنا آشیانہ بنانا چاہتا تھا۔ وزیر تعلیم سے ربط ضبط پیدا کی۔ یارانہ بڑھا۔ میں نے بھی ان کے بنگلہ سے متصل بنگلہ لیا۔ منسٹر صاحب میرے کرمفرما ہیں۔ ان کی شان میں کوئی بے ادبی نہیں کرنا چاہتا۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ وزیر تعلیم ہو کر تعلیم کے اصولی امور سے واقف نہ تھے۔ گھوڑے پر سوار وہ تھے پر عنان میرے ہاتھ میں تھی۔ اور یہ کھلا ہوا راز تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے سیاسی مخالفین سے میری مخالفت ہوگئی۔ مجھ پر جا و بے جا حملے کئے جانے لگے۔ میں خلوص کے ساتھ اصلاح و فلاح کی جو تجویز پیش کرتا۔ اُسکی مخالفت کی جاتی۔ میں اصولاً جبری اصلاح کا مخالف ہوں۔ میرا خیال ہے۔ کہ ہر ایک انسان کو ان معاملات میں زیادہ سے زیادہ آزادی ہونی چاہیئے۔ جن کا تعلق اسکی ذات سے ہے۔ بہت ممکن ہے میں غلطی پر ہوں لیکن میں جبری تعلیم کا قائل نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یورپ میں اس کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں نہیں۔ مادیت مغربی تہذیب کی روح ہے۔ وہاں کسی کام کی تحریک مالی فائدہ کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ ضروریات زندگی زیادہ ہیں اسلئے کشمکش حیات بھی زیادہ دل شکن۔ والدین ضرورتوں کے غلام ہو کر بچوں کو جلد سے جلد کسب معاش پر مجبور کرتے ہیں بجائے اس کے کہ وہ شراب ترک کر کے ایک شلنگ روز کی بچت کرلیں۔ وہ اپنے کمسن بچے کو ایک شلنگ کی مزدوری

کرنے کے لئے مجبور کریں گے۔ ہندوستان میں زندگی فقیرانہ سادگی کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ ہم اسوقت تک اپنے بچوں سے مزدوری نہیں کراتے۔ جب تک کہ حالات ہمیں مجبور کردیں۔ ہم بھوکے رہیں گے، ننگے رہیں گے۔ مگر لڑکوں سے مزدوری نہ کرائیں گے تاوقتیکہ فاقہ کشی کی نوبت نہ پہنچے۔ غریب سے غریب اور بینوا سے بینوا ہندوستانی مزدور بھی تعلیم کی برکات کا قائل ہے اس کے دل میں یہی تمنا ہے کہ میرا بچہ چار حرف پڑھ جائے۔ اسلئے نہیں کہ اُسے کوئی رتبہ حاصل ہوگا۔ بلکہ محض اس لئے کہ علم انسانی خصلت کا ایک زیور ہے۔ تعلیم کے فوائد اُسے سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ یہ علم ہونے پر بھی اپنے بچے کو مدرسے نہیں بھیجتا۔ تو سمجھ لینا چاہئے کہ کوئی مجبوری حائل ہے' ایسی حالت میں قانوناً اُسے مجبور کرنا میری نگاہ میں قرینِ انصاف نہیں۔ اتنا ہی کافی ہے کہ آپ اُس کے فرائضِ پدری کو تشویق سے بیدار کردیں۔ اس کے علاوہ میرے خیال میں ابھی تعلیم کے وہ عناصر ملک میں ناکافی ہیں۔ جن سے تعلیم کی فضیلت ہے۔ نیم تعلیمیافتہ فاقہ کش مدرسوں سے آپ یہ امید نہیں کرسکتے۔ کہ وہ کوئی اونچا معیار پیش نظر رکھ سکیں۔ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی ہوگا۔ کہ چار پانچ سال میں لڑکا حرف شناس ہو جائیگا۔ میں اِسے "کوہ کندن وکاہ برآوردن" کے مصداق سمجھتا ہوں۔ سن شعور میں یہ مرحلہ ایک مہینہ میں آسانی سے طے کیا جاسکتا ہے۔ میں تجربہ سے کہہ سکتا ہوں کہ اٹھارہ بیس سال کی عمر میں ہم جتنا ایک مہینہ میں پڑھ سکتے ہیں۔ اتنا چھ سات سال کی عمر میں تین سال میں بھی نہیں پڑھ سکتے۔ پھر خواہ مخواہ بچوں کو مدرسے میں قید کرنے سے فائدہ؟ یوں چاہے اُسے روٹیاں نہ ملتیں مگر تازہ ہوا تو ملتی۔ فطرت سے تجربات تو حاصل کرتا۔ مدرسہ میں بند کرکے تو آپ اُسے ذہنی اور جسمانی دونوں ترقیوں سے ہی محروم کردیتے ہیں۔ اس لئے جب صوبہ کی کونسل میں جبری تعلیم کی تجویز پیش ہوئی۔ تو میری تحریک سے منسٹر صاحب نے اُسکی مخالفت کی۔ گورنمنٹ تو مخالفت پر پہلے ہی سے آمادہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ بل مسترد ہوگیا۔ پھر کیا تھا۔ منسٹر صاحب کی اور میری وہ لے دے شروع ہوئی کہ الاماں! ایک طوفان برپا ہوگیا۔ ذاتیات پر حملے کئے جانے لگے۔ میں "عضوِ ضعیف" تھا۔ اس لئے نزلہ مجھی پر گرا۔ مجھے ملک کا بدخواہ۔ ترقی کا دشمن۔ قومی غدار اور گورنمنٹ کا گداگر بنایا گیا۔ کئی اخباروں میں آبرو ریز کارٹون بھی نکلے۔ میرے کالج میں ذرا سی بھی کوئی بات ہوتی تو کونسل میں اُس پر سوالوں کی بارش شروع ہو جاتی۔ میں نے ایک چپڑاسی کو برخاست کیا۔ ممبر اصحاب پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئے۔ اعتراضات کا تانتا بندھ گیا۔ یہاں تک کہ منسٹر کو مجبور ہو کر اُس چپڑاسی کو بحال کرنا پڑا۔ میں یہ توہین برداشت نہ کرسکا۔ شاید کوئی بھی نہ کرسکتا۔ منسٹر صاحب سے مجھے شکایت نہیں۔ وہ مجبور تھے۔ ان حالات میں کام کرنا میرے لئے مشکل ہوگیا۔ تحمل اور ضبط کی بھی کوئی انتہا ہے۔ مجھے اپنے کالج کی اندرونی تنظیم کا بھی اختیار نہیں! فلاں کیوں امتحان میں نہیں بھیجا گیا؟ فلاں کے عوض فلاں کو کیوں وظیفہ نہیں دیا گیا؟ فلاں پروفیسر کو فلاں کلاس کیوں نہیں دیجاتی؟ اسطرح کے بیہودہ، مہمل اور لچر اعتراضات نے میرا ناک میں دم کردیا تھا اس نئی چوٹ نے تسمہ بھی الگ کردیا۔ میں نے استعفا دیدیا۔ مخالفین کو یہ صبر کہاں کہ وہ مجھے عزت کے ساتھ چلا جانے دیتے۔ میری برطرفی کا فیصلہ کیا گیا۔

مجھے منسٹر صاحب سے اتنی امید ضرور تھی کہ وہ کم سے کم اس معاملہ میں انصاف اور حق سے کام لیں گے۔ مگر انہوں نے حق کی بجائے مصلحت کو مقدم سمجھا اور مجھے کئی سال کی مخلصانہ رفاقت کا صلہ یہ ملا کہ میری برطرفی کا نوٹس آ پہنچا! دُنیا کا ایسا تلخ تجربہ اب تک مجھے، نہ ہؤا تھا۔ تقدیر بھی کچھ برگشتہ تھی۔ اُسی دوران میں بیوی کا انتقال ہوگیا۔ آخری دیدار بھی نہ کرسکا۔ شام کو دریا کنارے سیر کرنے گیا ہؤا تھا۔ ان کی طبیعت کچھ کسلمند تھی۔ لوٹا تو اُن کی لاش ملی۔ شائد قلب کی حرکت بند ہوگئی تھی۔ اس سانحہ نے کمر توڑ دی۔ ماں کے فیض اور اثر سے بڑے بڑے انسان سرفراز ہوئے ہیں۔ میں جو کچھ ہوا بیوی کے فیض اور اثر سے ہؤا۔ وہ میری تقدیر کا معمار تھی۔ کتنی بلند حوصلہ تھی! کتنی آہنی ہمت! کتنا ملکوتی ایثار! اُس شیرینی میں تلخی کا نام بھی نہ تھا۔ مجھے یاد نہیں آتا۔ کہ میں نے اُسے کبھی چین بجبیں دیکھا ہو۔ ہمیشہ ہر حالت میں صابر اور خوش تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی ترقی کی ایک تحریک باطن اسکے ایک ایک قطرۂ خون میں بھری ہوئی تھی۔ مایوس ہونا تو جانتی ہی نہ تھی۔ میں کئی بار سخت بیمار پڑا ہوں۔ معالجوں پر بھی مایوسی کا غلبہ ہوگیا پر اس کے سکون و اطمینان میں سمتہ بھر بھی تزلزل نہ ہؤا۔ اُسے اعتقاد تھا میں اپنے شوہر کی حیات میں مرونگی۔ اور وُہی ہؤا۔ میں زندگی میں اُسی کے سہارے اب تک کھڑا تھا۔ جب وہ سہارا ہی نہ رہا۔ تو زندگی کہاں رہتی۔ کھانے اور سونے کا نام زندگی نہیں ہے۔ زندگی نام ہے ہمیشہ آگے بڑھتے رہنے کی لگن کا۔ وہ لگن غائب ہوگئی۔ میں نے دُنیا سے منہ موڑ لیا۔ اور گوشۂ گمنامی میں زندگی کے دن پورے کرنے کا ارادہ کرکے ایک چھوٹے سے گاؤں میں مقیم ہوگیا۔ چاروں طرف اُونچے اُونچے ٹیلے تھے۔ ایک طرف گنگا بہتی تھی۔ میں نے دریا کے کنارے ایک چھوٹا سا مکان بنا لیا۔ اور اس میں رہنے لگا۔

(۳)

مگر اہلِ دُنیا یہاں بھی مجھے دق کرنے کے لئے کبھی کبھی پہنچ جاتے تھے۔ کسی کو کوئی میموریل لکھانا ہوتا۔ تو میرے پاس آتا کبھی کبھی اخباروں کے نامہ نگار اور پبلشروں کے ایجنٹ بھی سر پر سوار ہو جاتے تھے۔ اُن کے پاسِ خاطر سے کچھ نہ کچھ لکھنا ہی پڑتا تھا دلبستگی کے لئے میں نے ایک چھوٹا سا مدرسہ کھول لیا تھا۔ ایک درخت کے نیچے گاؤں کے لڑکوں کو جمع کرکے کچھ پڑھایا کرتا تھا۔ اُس کا یہاں اِتنا شہرہ ہؤا کہ آس پاس کے مواضعات کے نوجوان بھی آنے لگے ایک روز میں اپنی کلاس کو پڑھا رہا تھا۔ کہ موٹر آکر رُکی۔ حلقہ کا سب انسپکٹر۔ تحصیلدار گھوڑوں پر سوار پیچھے دوڑے چلے آتے تھے۔ معلوم ہؤا کہ یہ اس ضلع کے ڈپٹی کمشنر ہیں۔ میں اس وقت محض ایک کُرتہ اور دھوتی پہنے ہوئے تھا۔ اس ہئیت میں ایک حاکم سے ملتے ہوئے شرم آرہی تھی۔ مگر کپڑے منگانے کا موقع نہ تھا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب اپنی موٹر سے اتر پڑے۔ اور میری طرف بڑھے۔ میں نے جھینپتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔ مگر وہ مجھ سے ہاتھ ملانے کے بدلے میرے پیروں کی طرف جُھکے۔ اور اُن پر سر رکھ دیا۔ میں کچھ ایسا سٹ پٹا گیا۔ کہ میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ میں انگریزی اچھی لکھتا ہوں۔ ولایت ہو آیا ہوں۔ فلسفہ میں بھی مجھے اچھا دخل ہے۔ تقریر

بھی خوب کرلیتا ہوں۔ مگر ان میں سے کوئی بات بھی تقدیس کے قابل نہیں۔ وہ درجہ تو عارف اور کامل کو ہی حاصل ہے اگر میں برہمن ہوتا تو بھی ایک بات تھی۔ حالانکہ ایک سویلین کا کسی برہمن کے پیروں پر سر رکھنا خیال میں بھی نہیں آتا۔ میں ابھی اسی حیرت میں پڑا ہُوا تھا کہ اس نے سر اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر بولا "آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں"؟

اب میں نے اس کے چہرہ کی طرف غور سے دیکھا۔ صورت مانوس معلوم ہوئی۔ اسے ضرور کہیں دیکھا ہے۔

دفعتہً حافظہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ بولا "آپ کا نام سورج پرکاش تو نہیں ہے"!

"جی ہاں! میں آپ کا وہی نالائق شاگرد ہوں، مگر آپ نے خوب پہچانا! مجھے امید نہ تھی"۔

"میں سنہ ۱۹ء میں اس اسکول میں تھا۔ بارہ تیرہ سال ہو گئے"!

سورج پرکاش نے مسکرا کر کہا "ماسٹر لڑکوں کو بھول جاتے ہیں۔ لڑکے انہیں ہمیشہ یاد رکھتے ہیں"

میں نے اُسی مذاق کے انداز سے جواب دیا۔ "تم ایسے لڑکوں کو بھولنا مشکل ہے"۔

سورج پرکاش "انہیں خطاؤں کی معافی مانگنے حاضر ہوا ہوں۔ میں ہمیشہ آپ کا سراغ لگاتا رہتا تھا۔ جب آپ انگلینڈ گئے تب میں نے آپ کے لئے مبارکباد لکھی۔ مگر اسے بھیجنے کی ہمت نہ پڑی۔ جب آپ پرنسپل ہوئے۔ اُس وقت میں انگلینڈ جانے کو تیار تھا۔ ورنہ ضرور حاضر ہوتا۔ وہاں میں آپ کے مضامین اخباروں میں پڑھتا رہتا تھا۔ جب لوٹا تو معلوم ہُوا کہ آپ نے استعفا دیدیا اور کہیں دیہات میں چلے گئے ہیں۔ اس ضلع میں آئے مجھے ایک سال سے زیادہ ہُوا مگر اس کا مطلق گمان نہ تھا کہ آپ اس ویرانے میں پڑے ہوئے ہیں۔ آج باتوں ہی باتوں میں کسی مینڈا نے آپ کا ذکر کیا۔ آپ کا نام تو اُسے معلوم نہ تھا۔ مگر اس نے جو حلیہ بیان کیا اس سے مجھے معاً آپ کا خیال آیا۔ ڈاکخانہ میں دریافت کیا تو آپ کے نام کی بھی تحقیق ہو گئی۔ دوڑا چلا آ رہا ہوں۔ آپ تو بالکل تارک الدنیا ہو گئے۔ اس کٹیہ میں آپ کی طبیعت کیسے لگتی ہے۔ ابھی تو آپ کی عمر ۴۶ سال سے زیادہ نہ ہو گی۔ بان پرست کا زمانہ تو ۶۰ کے بعد آتا ہے"۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ سورج پرکاش کا عروج دیکھ کر مجھے کتنی استعجاب آمیز مسرت حاصل ہوئی۔ اگر وہ میرا بیٹا ہوتا۔ تو بھی مجھے اس سے زیادہ خوشی نہ ہوتی۔ میں اُسے اپنے جھونپڑے میں لایا۔ اور اس سے چند لفظوں میں اپنی رام کہانی کہہ سنائی۔

سورج پرکاش نے کہا "تو یہ کہئے کہ آپ اپنے ہی ایک بھائی کی بیوفائی کا شکار ہوئے۔ میرا تجربہ تو ابھی بہت ہی مختصر ہے۔ مگر اتنے ہی دنوں میں مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ ہم لوگ ابھی اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا اور اپنے قول کو نبھانا نہیں جانتے۔ جہاں دیکھئے وہاں خود غرضی۔ منسٹر صاحب سے ملاقات ہوئی تو پوچھوں گا یہی انسانیت اور ہمدردی کا تقاضا تھا"؟

میں نے جواب دیا "بھئی ان کی کوئی خطا نہیں۔ ممکن ہے اس حالت میں میں بھی وہی کرتا جو انہوں نے کیا۔ مجھے اپنی ہوس پروری کی سزا ملگئی۔ اور اس کے لئے میں اُنکا مشکور ہوں۔ تصنّع نہیں میں دل سے کہتا ہوں۔ کہ یہاں مجھے جتنا سکون اور اطمینان ہے۔ اتنا کبھی نہ تھا۔ اس گوشۂ قناعت میں مجھے حقایق زندگی کا وہ علم ہُوا۔ جو ثروت اور جاہ کی دوڑ میں کسی طرح ممکن نہ تھا۔ فلسفہ اور تاریخ کے دفتر چاٹ کر اور یورپ کی یونیورسٹیوں کی خوشہ چینی کر کے بھی میں اپنی خود پروری کا ازالہ نہ کرسکا بلکہ یہ مرض روز بروز زیادہ سنگین ہوتا جاتا تھا۔ آپ زینوں پر پاؤں رکھے بغیر سقف کی بلندی تک نہیں پہنچ سکتے۔ ثروت کی دوڑ میں دوسرے انسانوں کی زندگیاں ہی زینوں کا کام دیتی ہیں۔ آپ انہیں کچلے بغیر منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ وہاں انسانیت۔ شرافت اور ہمدردی کا ذکر ہی کیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس وقت میں درندوں کے بیچ میں تھا۔ اور میری ساری قوتیں اپنی حفاظت کرنے میں صرف ہو جاتی تھیں۔ یہاں میں اپنے چار وںطرف خلوص اور سادگی دیکھتا ہوں۔ میرے پاس جو لوگ آتے ہیں۔ کوئی کمینہ غرض لیکر نہیں آتے اور نہ میری خدمات میں صلہ یا ستائش کی تمنا ہے۔ میں بھی کسی کے پاس جاتا ہوں۔ تو کوئی غرض لے کر نہیں جاتا۔ مجھے یہاں کے در و دیوار اور برگ و باد میں بھی خلوص کی جھلک نظر آتی ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے سورج پرکاش کے چہرہ کی طرف غور سے دیکھا۔ مگر شرارت آمیز تبسم کی جگہ پشیمانی کا رنگ تھا۔ مجھ سے قناعت کا سبق لینے وہ میرے پاس نہ آیا تھا۔ شاید یہ دکھانے آیا تھا کہ آپ نے جسے اتنا حقیر سمجھا تھا وہ اب اس درجہ پر ہے۔ وہ مجھ سے اپنے سعئ جمیل کی داد چاہتا تھا مجھے بھی اپنی غلطی کا احساس ہُوا۔ ایک صاحب ثروت کے روبرو ثروت و جاہ کی مذمت زیبا نہیں۔ میں نے فوراً سلسلۂ تقریر بدل کر کہا "مگر تم اپنا حال تو کہو۔ تمہاری یہ کایا پلٹ کیونکر ہوئی۔ تمہاری شرارتوں کو یاد کرتا ہوں۔ تو اب بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یکایک یہ انقلاب کیسے ہُوا؟ کسی فقیر کی دعا کے سوا اور تو کوئی طاقت یہ معجزہ نہ دکھا سکتی تھی۔"

سورج پرکاش نے مسکرا کر کہا "آپ کی دعا تھی"

"دُعا تو نہیں، بددُعا ہو سکتی تھی"

"ابھی اس حد تک دُنیا سے بیزار نہیں ہُوا ہوں"

آخر میرے بار بار اصرار کرنے پر سورج پرکاش نے اپنا قصہ کہنا شروع کیا:۔

"آپ کے چلے آنے کے کئی روز بعد میرا ماموں زاد بھائی سکول میں داخل ہُوا۔ اسکی عمر آٹھ نو سال سے زائد نہ تھی۔ پرنسپل صاحب اُسے ہوسٹل میں نہ لیتے تھے۔ اور نہ ماموں صاحب اسکے رہنے کا کوئی دوسرا انتظام کر سکتے تھے۔ اُنہیں اس پریشانی میں دیکھ کر میں نے پرنسپل صاحب سے کہا۔ اسے میرے کمرے میں ٹھہرا دیجئے۔ پرنسپل اسپر راضی نہ ہوئے کہنے لگے یہ قاعدہ کے خلاف ہے۔ میں بھلا ان کی حکومت کب برداشت کر سکتا تھا

میں نے اُسی دن ہوسٹل چھوڑ دیا۔ اور اپنے ماموں زاد بھائی کو لیکر ایک دوسرے مکان میں رہنے لگا۔ زائد خرچ کا بار۔۔ ماموں صاحب نے لیا۔ لڑکے کا نام موہن تھا۔ اسکی ماں کئی سال پہلے ہی مر چکی تھی۔ اتنا دُبلا پتلا کمزور اور غریب لڑکا تھا کہ پہلے ہی دن سے مجھے اُسپر رحم آنے لگا۔ کبھی اسکے سر میں درد ہوتا کبھی بخار آتا۔ آٹھے دن کوئی نہ کوئی شکائیت ہوتی رہتی تھی۔ سرِ شام سو جاتا اور اُسے کھانا کھلانے کیلئے مجھے اسکی منتیں کرنی پڑتیں۔ دن چڑھے تک سویا کرتا۔ اور جب تک مَیں گود میں اٹھا کر بٹھا نہ دیتا اٹھنے کا نام نہ لیتا۔ رات کو چونک پڑتا۔ اپنی چارپائی سے اُٹھ کر میری چارپائی پر آجاتا۔ اور میرے گلے سے لپٹ کر سوتا۔ مجھے اُس پر کبھی غصہ نہ آتا۔ کہہ نہیں سکتا۔ کیوں مجھے اُس سے اتنا اُنس ہو گیا۔ میں جو نو بجے سو کر اٹھا کرتا تھا۔ تڑکے اٹھ بیٹھتا۔ اور اُسکے لئے دودھ گرم کرتا۔ پھر اُسے اُٹھا کر ہاتھ مُنہ دھلاتا۔ اور اُسکی صحت کا خیال کر کے ساتھ سیر کرانے لیجاتا۔ میں جو کبھی کتاب لیکر نہ بیٹھتا تھا اُسے گھنٹوں پڑھایا کرتا۔ مجھے اپنی ذمہ داری کا اتنا احساس کیونکر ہو گیا۔ اس کا اب تک مجھے تعجب ہے۔ اُسے کوئی شکائیت پیدا ہو جاتی تو میری جان ناخن میں سما جاتی تھی ڈاکٹر کے پاس دوڑتا۔ دوائیں لاتا۔ اور موہن کی خوشامدیں کر کے اُسے دوا پلاتا۔ ہمیشہ یہ فکر لگی رہتی تھی۔ کہ کوئی بات اسکی مرضی کے خلاف نہ ہو جائے۔ اس غریب کا یہاں میرے سوا دوسرا کون ہے؟ ماموں صاحب اسے میرے بھروسے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ بیچارا بے ماں کا لڑکا ہے۔ میرے بدمعاش دوستوں میں کوئی اُسے چڑاتا یا چھیڑتا۔ تو میری تیوریاں بدل جاتی تھیں۔ کئی لڑکے تو مجھے بوڑھی دایہ کہکر چڑاتے تھے۔ پر میں ہنسکر ٹال دیتا تھا۔ میں اسکے سامنے کوئی بیہودہ حرکت نہ کرتا۔ ایک بھی ناشائستہ لفظ منہ سے نہ نکالتا۔ یہ خیال ہوتا تھا کہ میری دیکھا دیکھی یہ بھی خراب ہو جائیگا۔ میں اُسکے سامنے اسطرح رہنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے اپنا نمونہ سمجھے۔ اور اس کے لئے لازمی تھا۔ کہ پہلے میں اپنی اصلاح کر دوں۔ وہ نو بجے سو کر اُٹھتا۔ وُہ بارہ بارہ بجے تک سیر گشت کرتا۔ وہ نئی نئی شرارتوں کے منصوبے باندھتا۔ وہ ماسٹروں کی آنکھ بچا کر سکول سے اُڑ جانا آپ ہی آپ جاتا رہا۔ صحت اور اخلاق کے آئین کا میں دُشمن تھا۔ پر اب مجھ سے بڑھکر اُن کا پابند دوسرا نہ تھا۔ میں ایشور کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ مگر اب پکا خدا پرست ہو گیا تھا۔ وہ بڑی سادگی سے پوچھتا "پرماتما سب جگہ رہتے ہیں تو میرے پاس بھی رہتے ہوں گے"۔ اس سوال کا مذاق اڑانا میرے لئے غیر ممکن تھا۔ میں کہتا "ہاں! پرماتما تمہارے ہمارے سب کے پاس رہتے ہیں۔ اور ہماری حفاظت کرتے ہیں"۔ اس کا چہرہ نورانی مسرت سے چمک اُٹھتا تھا۔ شاید وُہ پرماتما کے وجود کو محسوس کرنے لگتا تھا۔ ماسٹر صاحب! یقین مانیئے، سال بھر میں ہی موہن کچھ سے کچھ ہو گیا۔ وہ مخنی غریب صورت، کاہل، بیخبر لڑکا اب توانا، شگفتہ رُو، چالاک وچست اور بشاش ہو گیا۔ ماموں صاحب دوبارہ آئے تو اسے دیکھکر حیرت میں آگئے۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے "بیٹا تم نے اِسے جلا لیا۔ ورنہ میں تو مایوس ہو چکا تھا۔ اس کا صلہ تمہیں ایشور دیں گے۔ اُسکی ماں جنت میں بیٹھی ہوئی تمہیں دعائیں دے رہی ہے"!

سورج پرکاش کی آنکھیں اس وقت بھی آبگوں ہو گئی تھیں۔

میں نے پوچھا "موہن بھی تمہیں بہت پیار کرتا ہو گا؟"

سورج پرکاش کی آبگوں آنکھوں میں ایک حسرتناک مسرت جلوہ افروز ہوئی۔ بولا "جناب وہ مجھے ایک منٹ کے لئے بھی نہ چھوڑتا تھا۔ میرے ساتھ کھاتا، میرے ساتھ بیٹھتا میرے ساتھ سوتا، میں ہی اُس کا سب کچھ تھا۔ افسوس آج وُہ اس دُنیا میں نہیں ہے۔ مگر میں اسے ہمیشہ زندہ محسوس کرتا ہوں۔ میں جو کچھ ہوں اسی کا بنایا ہؤا ہوں۔ اگر وہ فرشتۂ غیب کی طرح میرا رہنما نہ ہو جاتا تو شاید آج میں کسی جیل میں پڑا ہوتا۔ ایک دن میں نے کہدیا تھا "اگر تم روز نہانا نہ لیا کرد گے تو میں تم سے نہ بولونگا" نہانے سے وہ نہ جانے کیوں جی چراتا تھا۔ میری اس دھمکی کا یہ اثر ہؤا کہ وُہ روزانہ علی الصباح نہانے لگا کتنی ہی سردی کیوں نہ ہو۔ کتنی ہی ٹھنڈی ہوا چلے۔ لیکن وہ نہانے میں غفلت نہ کرتا۔ دیکھتا رہتا تھا۔ کہ میں کس بات سے خوش ہوتا ہوں۔ ایک روز میں چند احباب کے ساتھ تھیئٹر دیکھنے چلا گیا۔ تاکید کر گیا تھا کہ تم کھانا کھا کر سو رہنا۔ تین بجے رات کو لوٹا تو دیکھا وہ بیٹھا ہؤا ہے۔ میں نے پوچھا "تم سوئے نہیں؟" بولا "نیند نہیں آئی"۔ اُسدن سے میں نے تھیئٹر جانے کا نام نہ لیا۔ بچوں میں پیار کی جو ایک بھوک ہوتی ہے' دودھ اور مٹھائی اور کھلونوں سے بھی زیادہ مرغوب۔ جو ماں کی گود کے سامنے دنیا کی کسی چیز کی ہستی کو خیال میں نہیں لاتی۔ موہن میں اس بھوک نے کبھی سیری کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ پہاڑوں سے ٹکرانے والی سارس کی صدا کی طرح وہ ہمیشہ اسکی ایک ایک رگ میں گونجا کرتی تھی۔ جیسے زمین پر پھیلی ہوئی لتا کوئی سہارا پاتے ہی ... اس سے جمٹ جاتی ہے۔ وہی حال موہن کا ...... تھا۔ وہ مجھ سے ایسا چمٹ گیا تھا۔ کہ اُس کی نازک بیلوں نے مجھ پر بندشوں کا کام کیا۔ اور مجھے استوار کر دیا۔ اُسکی وفات کا قصہ نہایت دردناک ہے۔ میرے دل پر اُس کا غم اِسوقت بھی تازہ ہے۔ اور مجھ میں اتنا ضبط نہیں کہ میں اس کا ذکر کروں۔ وہ میرے ساتھ تین سال رہا۔ شاید غیب سے میری ہدایت کے لئے جو مشعل عطا ہؤا تھا۔ وہ مقصد پورا ہو جانے کے بعد مجھ سے چھین لیا گیا۔ اُس ننھے سے دِل میں کیا کیا ارمان بھرے ہوئے تھے۔ بی اے پاس کرنا۔ ایم اے پاس کرنا۔ وظیفہ پانا، ولایت جانا۔ وہاں سے سول سروس کا امتحان پاس کر کے لوٹنا۔ یہی اُسکی زندگی کے خواب تھے۔ جو مرگِ بےہنگام نے پریشان کر دیئے۔

گرمیوں کی تعطیل تھی۔ دو تعطیلوں میں موہن میرے ساتھ رہا تھا۔ ماموں صاحب کے اصرار کرنے پر بھی گھر نہ گیا۔ تیسری تعطیل میں میری کالج پارٹی نے کشمیر کی سیاحت کا فیصلہ کیا۔ اور مجھے اس کا کپتان بنایا۔ کشمیر کی سیر کی تمنا مدت سے تھی۔ اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ موہن کو ماموں صاحب کے پاس بھیجکر میں کشمیر چلا گیا۔ دو مہینے کے بعد لوٹا تو معلوم ہؤا موہن بیمار ہے۔ کشمیر میں مجھے بار بار موہن کی یاد آتی تھی۔ اور جی چاہتا تھا لوٹ

جاؤں ۔ مجھے اس سے اتنی محبت ہے ۔ اس کا اندازہ مجھے کشمیر جاکر ہوا ۔ مگر احباب سے پیچھا چھڑانا مشکل تھا اس بیماری کی خبر پاتے ہی میں اس کے پاس گیا ۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے زرد اور چہرے پر مسرت کی تازگی کی جھلک پڑی ۔ میں دوڑ کر اسکے گلے سے لپٹ گیا ۔ اُسکی آنکھوں میں کچھ دور نظری اور چہرے پر روحانیت تھی ۔ جو منڈلاتی ہوئی موت کی خبر دیتی تھی ۔ میں نے لڑکھڑائی ہوئی آواز سے پوچھا " یہ تمہاری کیا حالت ہے موہن ! دو ہی مہینہ میں یہ نوبت پہنچ گئی ! "

موہن نے معصوم تبسم کے ساتھ کہا " آپ کشمیر کی سیر کرنے گئے تھے ، میں آسمان کی سیر کرنے جا رہا ہوں "

مگر اس قصۂ غم کو بیان کر کے میں رونا اور رُلانا نہیں چاہتا ۔ میرے چلے جانے کے بعد موہن اسطرح پڑھنے لگا جیسے تپسیا کر رہا ہو ۔ اسے یہ ضبط پیدا ہو گیا کہ سال بھر کا کورس دو مہینہ میں ختم کر لے ۔ اور جب مجھ سے ملاقات ہو ۔ تو اپنی کارگزاری کی داد وصول کرے ۔ اس اشتیاق نے محویت کی صورت اختیار کر لی ۔ میں کس طرح اسکی پیٹھ ٹھونکونگا ۔ شاباشی دونگا ۔ اپنے دوستوں سے اسکی تعریف کروں گا ۔ یہ خیالات اپنی ساری طفلانہ سرگرمی اور انہماک کے ساتھ اس پر غالب آ گئے ۔ ماموں صاحب کو دفتر کے کام سے اتنی فرصت کہاں کہ اسکی تفریح کی فکر کریں ۔ شاید اُسے ہر وقت کچھ نہ کچھ پڑھتے دیکھ کر دل میں وہ خوش ہوتے تھے ۔ ایسا کون باپ ہے جو لڑکے کے شوق طلب میں مخل ہو ؟ موہن کو کھیلتے دیکھ کر وہ ضرور ڈانٹتے " کتاب لیکر کیوں نہیں بیٹھتے " پڑھتے دیکھ کر بھلا کیا کہتے ۔ کسی باپ نے کبھی لڑکے کو پڑھنے کیلئے نہیں ڈانٹا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ موہن کی نازک صحت یہ ریاضت شاقہ برداشت نہ کر سکی ۔ اُسے ہلکا بخار آنے لگا ۔ مگر اس حالت میں بھی اس نے پڑھنا نہ چھوڑا ۔ یہاں تک کہ اور کئی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں ۔ مگر اس وقت بھی جب بخار کچھ ہلکا ہو جاتا ۔ تو وہ کتابیں دیکھنے لگتا تھا ۔ اکثر بخار کے عالم میں بھی نوکروں سے پوچھتا " بھیا کا خط آیا ؟ " " وہ کب آئیں گے ؟ " اس وقت اس کے سوا اُسے کوئی اور دوسری تمنا نہ تھی ۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری سیر کشمیر اتنی مہنگی پڑے گی ۔ تو اس کا نام بھی نہ لیتا ۔ میں نے اسے سنبھالنے کی حتی الامکان بڑی کوشش کی ۔ مگر بخار ٹائیفائڈ تھا ۔ اسکی جان لیکر ہی اُترا ۔ پہلی بار میں نے موت کی صورت دیکھی اور ہمیشہ یاد رہے گی ۔ اسکی زندگی کے خواب ایک جان سے پیارے عزیز کی وصیت بنکر مجھے تحریک عمل کرنے لگے ۔ اور یہ اُسی کا اثر ہے ۔ کہ آج آپ مجھے اس حالت میں دیکھ رہے ہیں ۔ موہن نے زندگی کا جو خیالی معیار قائم کیا تھا اس پر عمل کر کے مجھے یہ مسرت ہوتی ہے کہ شاید اسکی معصوم روح مجھے دیکھکر خوش ہوتی ہو ۔ یہی تحریک تھی جس نے ایم اے اور سول سروس کی آزمائشوں میں مجھے کامیاب بنایا ۔ ورنہ میں آج بھی وہی نالائق ، گستاخ اور غبی سورج پرکاش ہوں جسکی صورت سے بھی آپ بیزار تھے !! "

اُس دن سے میں کئی بار سورج پرکاش سے مل چکا ہوں ۔ وہ جب اس گرد و نواح میں آ جاتا ہے تو مجھ سے ملے بغیر نہیں جاتا ۔ موہن اب بھی اسکے دل و دماغ میں بسا ہوا ہے ۔ انسانی فطرت کا یہ ایک ایسا معمہ ہے ۔ جسے میں آج تک نہیں سمجھ سکا ۔

(پریم چند)

بھروسہ

جناب مدن شرما صاحب

شام کا وقت تھا۔ بِٹھّو لوہار کھانا پکانے میں مصروف تھا۔ چولھے میں آگ جل رہی تھی۔ اور وہ سر نیچا کئے چاولوں کو دھو رہا تھا۔ بیٹا درد سے کراہ رہا تھا۔ بخار اور کھانسی کے پیہم حملوں نے چہرے کی رنگت آنکھوں کی چمک اور اس کی روح پرور اداؤں کو نگل لیا تھا۔ ناتوان کل جو صرف ہڈیوں کا مجموعہ تھی۔ وہاں اس کا ننھا دل تڑپ رہا تھا۔ مگر بِٹھّو کو اس کا کوئی خیال کوئی خوف نہ تھا۔ بلکہ وہ اپنے کام میں ہمہ تن محو تھا۔ کہ یکا یک ایک نوجوان اندر داخل ہؤا۔ بِٹھّو کی آنکھیں فرط مسرت سے چمکنے لگیں۔ جیسے کوئی گم شدہ چیز مل گئی ہو۔ مسکرا کر بولا۔ آیئے مسٹر حیدر! کلکتہ سے کب آئے؟

"کوئی ایک گھنٹہ ہؤا ہوگا۔"

"وہاں دن کیسے گزرتے تھے؟"

کچھ نہ پوچھو مسٹر حیدر نے ایک آہ کھینچ کر کہا۔ آپ کی محبت کے آگے وہاں کی سب دلچسپیاں ماند تھیں۔ جب بچپن کے وہ نشاط انگیز دن مجھے اپنی پُر زور کشش سے اپنی طرف کھینچتے تھے۔ تو میں دنیائے تصور میں تمہارے گلے میں باہیں ڈال کر رہ جاتا تھا۔"

کیسا پاکیزہ خیال ہے۔ محبت کے رس میں شرابور۔ بِٹھّو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تو یہاں بھی حالت دگرگوں تھی۔ تمہاری مفارقت میں راتوں کی نیند حرام ہوگئی۔ اگر عالم رویا میں تمہارا خوبصورت جسم اور عالم بیداری میں تمہارا فوٹو مجھے نہ ملتا۔ تو یقیناً تمہیں یہاں اُلّو بولتے سنائی دیتے۔ میرے اس خیال میں تصنع نہیں۔ بناوٹ نہیں۔ بلکہ اس میں حقیقت ہے۔ عقیدت ہے اور اس کے لوازمات ہیں۔

مسٹر حیدر کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔ دل میں آگ تھی۔ اور بھر دل سے پریم چھلکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاہم اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر آہستہ سے کہا۔ یہ سچ ہے۔ مگر وہ چارپائی پر کون ہے؟

بِٹھّو نے معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ میرا لڑکا۔"

"اسے کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں صرف بخار ہے۔"

"اور اس کی والدہ؟"

"وہ مر چکی ہے۔"

بیٹا بیمار ہے۔ اور تمہیں لذیذ کھانوں کی پڑی ہوئی ہے۔ جیسے وہ تمہارا کچھ بھی نہیں۔ پٹھو! اس نعمت کے مقابلہ میں تو ہم دنیا کی تمام دولت ہیچ سمجھتے ہیں۔ مگر میں حیران ہوں۔ کہ تمہارے دل و دماغ میں یہ تبدیلی جس میں مہر و الفت کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔ آ کہاں سے گئی؟

پٹھو نے آٹے میں گھی ڈالتے ہوئے جواب دیا "تم اس خیال کو جانے ہی دو۔"

مسٹر حیدر نے اپنے چاروں طرف اس طرح دیکھا۔ جیسے کسی نے پریم کی چوٹی سے گرا دینے کی کوشش کی ہو تاہم دزدیدہ نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے بولے۔ کیوں؟

"اس لئے کہ تم اسے سن نہ سکو گے۔"

"میں اس کی شنوائی کے لئے روح کی تمام قوتیں صرف کر دونگا۔"

مسٹر حیدر! میں پھر کہتا ہوں کہ یہ کہانی بڑی پُر درد۔ الم ناک اور ڈراؤنی ہے۔ دنیا اسے سن کر اس کی حقیقت سے منحرف ہو سکتی ہے۔ اور ہو سکتا ہے۔ کہ تم بھی اسے غلط قرار دیدو۔ مگر میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ جو واقعات مجھے پیش آئے۔ وہ سرتا پا درست ہیں۔ ان میں لفاظی اور دروغ کو دخل نہیں۔

یہ ٹھیک ہے۔ مگر آپ کو اسے بہت جلد شروع کر دینا چاہئے۔ حیدر نے اس انداز سے کہا جیسے معمولی سی تاخیر سے اس کی آرزوؤں کا خون ہو جائے گا۔"

تو سنو پٹھو نے کہنا شروع کیا۔

(۲)

تم کلکتہ پہنچے۔ تو میری نگاہوں میں دنیا تاریک ہو گئی۔ جیسے کوئی عزیز مر گیا ہو۔ میں چاروں طرف دوڑ رہا تھا۔ دل میں امید تھی۔ باہر یاس اور مایوسی۔ اس وقت میں اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں کس کر رہ جاتا تھا۔ بے بسی اور حسرت کی زندہ تصویر بن کر۔ جس کی مجھے تلاش تھی۔ وہ عنقا تھا۔ میں چاہتا تھا۔ کہ اُڑ کر وہاں پہنچ جاؤں۔ مگر اپنے جھونپڑے اور تمہارے والدین کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میرے حوصلے پست ہو جاتے تھے۔ وہ مجھ سے محبت کرتے تھے۔ اور سمجھتے تھے۔

یہ ہمارے نخلِ آرزو کا پھل ہے ۔اس پر اپنی جان تک قربان کر دینے والا۔ یہ سن کر میری عقیدت اور بھی گہری ہو جاتی تھی ۔یکایک میرے دل میں ایک خیال نے چٹکی لی "اپنا کام شروع کر دو" غم غلط کرنے کا یہ ایک واحد ذریعہ تھا۔مگر اس کی ابتدا میں روپے کی ضرورت تھی ۔اور میرے پاس ایک کوڑی تک نہ تھی ۔میں سرینچا کئے اپنے تاریک مستقبل اور افلاس کی بھیانک تصاویر کو دیکھتا تھا اور سوچتا تھا ۔کہ اب کیا ہو گا ؟ کہ سرزمین یاس میں امید نے یکایک سر اٹھایا۔ تمہارے والد روپوں کی ایک تھیلی لئے ہوئے اندر داخل ہوئے ۔انہیں دیکھ کر میرا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔ جس طرح دشمن کے دام فریب میں پھنسے ہوئے انسان کا دل اپنے معاون کو دیکھ کر مسرت سے کانپنے لگتا ہے ۔اور اس کی گئی ہوئی طاقت واپس آ جاتی ہے ۔اسی طرح میں بھی خوشی سے اچھل پڑا ۔ انہوں نے تھیلی میرے ہاتھوں میں دے کر کہا " بیٹا گھبراؤ نہیں ۔خدا کا نام لے کر اپنا کام شروع کر دو ۔اس فقرہ میں کتنا اخلاص ۔کتنا پریم اور کتنی عقیدت تھی ۔آج اس کے خیال سے ہی دل و دماغ پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا ہے ۔آخر میں نے ان روپوں سے اپنا کام شروع کر دیا ۔سوچتا تھا کہ کامیابی کس طرح نصیب ہو گی ۔مگر تمہارے والدین کی انتہائی کوششوں نے یہ مشکل بھی آسان کر دی ۔کام چل نکلا ۔اور وسیع پیمانے پر۔اب میں روپوں میں کھیلتا تھا۔ اس طرح دامن حرص دراز ہو گیا ہو یہ بات نہ تھی ۔ خیرات اور دان سے مجھے ازلی مناسبت ہے ۔ جس وقت اکرم میری ان حرکتوں کو دیکھتے ۔تو خوش ہو کر کہتے ۔بیٹا انسان کا یہی فرض مقدم ہے ۔ جس میں یہ جذبہ موجود نہیں ۔وہ حیوان سے بھی بدتر ہے ۔اسی جذبہ کو دیکھ کر خدا کا ابر کرم جوش میں آتا ہے ۔بیٹا! عنقریب تم اس کے فیض سے مالا مال ہو جاؤ گے ۔اور تمہارا شمار دنیا کی برگزیدہ ہستیوں میں ہونے لگیگا۔تو میرے دل کی لگی ہوئی آگ اور بھی مشتعل ہو جاتی تھی۔جس طرح جلتی آگ میں ایندھن ڈالا جائے ۔تو وہ اور بھی تیز ہو جاتی ہے +

(۳)

چھ بجنے میں دس منٹ باقی تھے ۔کہ ایک اجنبی میرے کمرہ میں داخل ہوا۔میں اچھل پڑا۔اس کی متجسس نگاہیں بڑی بے صبری سے چاروں طرف گھوم رہی تھیں ۔میرے دل میں ایک خیال پیدا ہوا ۔یہ خیال کتنا پاکیزہ اور پُر مسرت تھا۔ اور کس قدر جلد بحر دل میں تلاطم برپا کر دینے والا ۔ مسٹر حیدر! اسے میں ہی جانتا ہوں " خیر میں نے جلدی سے لوہے کا ایک گرم اور لال ٹکڑا اٹھایا۔ اور آہرن پر رکھ کر ہتھوڑے کی ایک ضرب اپنی پوری قوت سے اس پر لگائی۔لوہا لوہے کی خبر لے

رہا تھا۔ کہ اتنے میں اجنبی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "السلام علیکم"
میں نے اپنے سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب میں کہا۔ "وعلیکم السلام"
"کہئے خیریت تو ہے"
میں نے استقلال آمیز لہجہ میں جواب دیا "خدا کا شکر ہے"
کام تو اچھا رہا ہے نہ؟ اس نے پھر سوال کیا۔
جی ہاں - یہ اس کی مہربانی ہے۔
خوب جی لگا کر کام کرو - یہ کہتے کہتے اس نے ایک کاغذ میں لپٹی ہوئی چیز میرے ہاتھ پر رکھ دی۔
میں نے حیران ہو کر کہا - یہ کیا ہے"؟
"کچھ نہیں صرف اپنی فرزندی میں لینے کا سرٹیفکیٹ"
مسٹر حیدر میں اس وقت اس قدر خوش تھا - جیسے کسی کو دولت کونین مل گئی ہو - اور اس کے ایک ماہ بعد میرے گوشۂ تنہائی میں میرا رفیق زندگی داخل ہوا - اور ہم دونو شباب کی ہولی کھیلنے لگے +

(۴)

ہاں شباب کی ہولی - لوگ مرکر بہشت دیکھتے ہیں - میں وہاں زندہ پہنچ چکا تھا - گرہست بہشت سے کم نہیں - اگر بیوی کو خاوند اور خاوند کو بیوی مل جائے - میرا دامن اس نعمت سے معمور تھا - وہ حسین تھی - اس کی موٹی موٹی آنکھیں چشم آہو کو شرماتی تھیں - اور یہاں تک ہی نہیں - اس کے چہرے پر چاند کی چاندنی پھولوں کی رنگت اور صبح کی تازگی تھی مسٹر حیدر اگر آج وہ زندہ ہوتی - تو تم دیکھتے کہ وہ کیسی حسین اور کس قدر باحیا تھی - آہ ...... اب وہ شمع حُسن گل ہو چکی ہے - اور پروانہ اس کی مفارقت پر بے طرح تڑپ رہا ہے۔
محفل شباب میں رقص کرتے ہوئے چھ ماہ گذر گئے - اور ہمیں معلوم تک نہ ہوا - خوشی کی گھڑیاں آتی ہیں - اور فی الفور گذر جاتی ہیں - کہ یکایک عائشہ نے منہ بنا کر کہا "مجھے میکے بھیج دو" الفاظ معمولی تھے - میں انہیں سن کر تڑپنے لگا - جیسے کسی نے بلندی سے گرا دیا ہو - اس کی مفارقت پر میری دنیائے مسرت تاریک ہو جائیگی - اس خیال سے میں اور بھی تڑپنے لگا - حیدر! میں نے آج تک اس کے کسی ایما کی خلاف ورزی نہیں کی تھی - مگر آج اسے ٹالنے کی تدابیر

سوچ رہا تھا۔ سرزمین یاس میں کامیابی کی جھلک دکھائی ہی نہ دیتی تھی۔ جیسے شجر امید یاس کی گرجتی ہوئی لہروں میں سما گیا ہو۔ تاہم میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ کب؟ "ابھی"۔

ابھی تو بارہ بجے ہیں۔ زمین آگ بن رہی ہے۔ ہوا کے تیز اور تباہی آور جھونکے اپنے پورے جوبن پر۔ لوگ خوف سے گھروں میں بیٹھے ہوئے تڑپ رہے ہیں۔ گرمی خون کو پسینہ کی شکل میں تبدیل کر رہی ہے۔ اور تم اسی وقت باہر جانا چاہتی ہو۔ فاصلہ دور نہیں۔ شام تک تمہیں وہاں پہنچا دیا جائیگا۔

میرا منتر چل گیا۔ وہ اب رضامند تھی۔ اور میں .... مسکراتے ہوئے کسی دوسری دنیا کی طرف بھاگ رہا تھا۔

(۵)

ظلمت شب آفاق پر چھا گئی۔ اور شام کے خوبصورت ستارے ملکۂ شب کے تاج پر ایک بڑے ہیرے کی طرح چمکنے لگے۔ معاً چاند نے افق سے سر نکال کر دنیا کی طرف دیکھا رات کی اتھاہ تاریکی اپنے لشکر جرار کو لئے ہوئے بڑی تیزی سے بھاگنے لگی۔ پتہ نہیں کس دیس کو کس مقام کو ہم دونو چل رہے تھے۔ اوپر آسمان تھا۔ نیچے زمین۔ مسٹر حیدر! وہ سماں بڑا دلکش اور بڑا خوبصورت تھا۔ میں قدرت کے روح پرور اور انبساط انگیز مناظر کو دیکھتے ہوئے چل رہا تھا۔ اور وہ میرے پیچھے آرہی تھی۔ یکایک میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ عائشہ غائب تھی۔ میری روح فنا ہو گئی۔ اور پیشانی پر پسینے کے قطرے آگئے۔ طائر دل اس طرح تڑپنے لگا۔ جیسے کسی نے سینے میں نشتر چبھو دیا ہو۔ میں نے اپنے روح کی پوری قوت سے گھبراہٹ اور خوف سے لرزتی ہوئی زبان سے گرج کر کہا "عائشہ!"

آواز فضائے صحرا میں گونجنے لگی۔ اور ایک لمحہ بعد اپنے ساتھ جواب لائی۔ "آرہی ہوں پریتم"۔

میں نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔ جیسے سر سے بوجھ اتر گیا ہو۔ اب وہ میرے پاس تھی۔ اور میں اس کے منہ کی طرف جھکے ہوئے آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ اگر کوئی تکلیف ہے تو تمہیں اٹھا لوں۔

اس نے انتہائے درد سے پیشانی پر بل ڈال کر جواب دیا۔ تکلیف تو کوئی نہیں۔ ذرا پیٹ میں درد ہے۔ یہ کہتے کہتے وہ پھر چلنے لگی۔ اور میں .... دل میں ایک اٹھتے ہوئے خیال کو دیکھتے دیکھتے رہ گیا۔ ہم پھر چلنے لگے۔ حیدر! دو مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ میں کوشش کرتا تھا۔ کہ

آہستہ چلوں۔ مگر رفتار ہر لمحہ بڑھتی ہی گئی۔ لوگ کاہلی سے بھاگتے ہیں۔ میں اسے تلاش کر رہا تھا۔ ناچار میں ریت کے بلند تودوں کے درمیان بیٹھ کر عائشہ کا انتظار کرنے لگا۔

(۶)

وہ آرہی تھی۔ کس قدر آہستہ۔ میں حیران رہ گیا۔ یہ تبدیلی میرے لئے سوہان روح تھی۔ بلبل کی طرح چہکنے والی اور اپنے قہقہوں سے سارا مکان سر پر اٹھا لینے والی عائشہ کی حالت اس قدر تبدیل ہو جائیگی۔ اس کا مجھے خیال نہ تھا۔ خدا خدا کرکے وہ میرے پاس پہنچی۔ اور دھڑام سے زمین پر گر گئی۔ مسٹر حیدر! میں تڑپنے لگا۔ میرے پُر بہار چمن پر خزاں نے دھاوا بول دیا۔ وہ چاروں شانے چت لیٹی ہوئی تھی۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ اور میں اسے ہوش میں لانے کے لئے اپنی انتہائی کوششیں صرف کر رہا تھا۔ مگر بے سود۔ طائر روح قفس عنصری سے آزاد ہو چکا تھا۔ میں نے مایوس ہو کر ایک چیخ ماری۔ اور رونے لگا۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ میں اپنے چاروں طرف شب تار کی اتھاہ تاریکی اور اس کی خوفناک اور ڈراؤنی آوازیں سن کر اور بھی رونے لگا۔ کدھر جاؤں۔ کوئی مُحِبّ کوئی مہربان نظر نہیں آتا۔ مسٹر حیدر! میں نے پاگلوں کی مانند دنیائے تصور میں تمہیں آواز دی۔ مگر تم وہاں نہیں تھے۔ جسم تھا۔ مگر بولنے والی اور میری خاطر اپنی ایک ایک آن قربان کر دینے والی چیز عنقا تھی۔ پھر کہتا۔ جس کے ساتھ میں نے شباب کی بہاریں لوٹیں۔ جس نے میرے لئے اپنے عزیز تریں وقت کا ایک ایک لمحہ قربان کر دیا۔ اسے تنہا چھوڑ کر گاؤں چلا جاؤں "یہ ہو نہیں سکتا"۔

یکایک یاس اور خوف کی سرزمین میں امید کا ایک منور خیال دکھائی دیا۔ خدا کا نام لو۔ اور اسے حضیض مرقد کی نذر کر دو۔ تمہیں تکلیف نہ ہوگی۔ اور نہ ہی کسی سامان کی ضرورت۔ بادامی رنگ کی ریت کے ذرات خود ہی جگہ چھوڑ دینگے۔

میں نے خدا کا نام لیکر اپنا کام شروع کر دیا۔ اور اپنے محبوب .... رقت کے جوش نے پھلو کی قوت گویائی کو سلب کر دیا۔ اور مسٹر حیدر نے روتے ہوئے اپنی باہیں اس کی گردن میں ڈالدیں۔

(۷)

ہاں مسٹر حیدر! پھلو نے اپنی اشک آلود آنکھوں کو خشک کرتے ہوئے کہا۔ میں عائشہ کے گھر پہنچا۔ تو وہ مجھے تنہا دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ چہرہ انسان کے دل کا آئینہ ہے۔ اس وسیع سمندر میں جس قدر لہریں اٹھتی ہیں۔ ان کی عکسی تصویر وہاں فی الفور دکھائی دے جاتی ہے۔ انہوں نے

میرے مرجھائے ہوئے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا "تم تو اوداس معلوم ہوتے ہو"

مصیبت کے وقت ہمدردی کا ایک لفظ سن کر انسان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ میں بھی رونے لگا۔ یہ مصیبت تو دنیا کی جملہ مصائب کا سرتاج تھی۔ وہ بھی رونے لگے۔ انہیں مجھ سے بڑھ کر کون عزیز تھا۔ تاہم انہوں نے مستقل مزاجی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ تم تو رونے لگے۔ بات کیا ہے؟ کھول کر بیان کیوں نہیں کر دیتے" میں نے انتہائے اضطراب سے رک رک کر کہا۔ عائشہ .... مر .... گئی .... ہے۔

کہاں؟

"راستے میں"

کیا کوئی بیمار تھی۔ اصغر نے متحیرانہ انداز سے کہا"

میں نے جواب دیا۔ نہیں۔ دوران سفر میں اس نے مجھ سے کہا۔ کہ پریتم! میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ تو آؤ تمہیں اٹھا لوں۔ مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ گویا اس طرح اس کی عقیدت کو ایک زبردست ٹھیس لگ جائیگی۔ پھر میں نے یہ سمجھ کر کہ آنے والے وقت میں تو ابھی دو ماہ اور درکار رہیں۔ اس کا کوئی خیال نہ کیا۔ آخر وہ میرے پاس پہنچتے ہی .... گر گئی۔

مسٹر حیدر! یہ سن کر وہ مسکرانے لگے۔ اور میں ان کی طرف حیرانی سے دیکھنے لگا۔ یہ تبدیلی خلاف توقع تھی۔ پیارا بچہ مر جائے۔ اور انہیں احساس تک نہ ہو۔ اس وقت مجھے ان کے سنگدل ہونے کا شبہ ہوا۔ کہ اتنے میں بوڑھے اصغر آنکھوں سے چشمہ اتار کر بولے۔ بیٹا قدرت کو یہی منظور تھا۔ فکر کرنا لاحاصل ہے۔ اب ہم ایک ماہ کے بعد اس کی ہمشیرہ کے ساتھ تمہاری شادی کرینگے۔

میں ان کے اس حوصلہ۔ ایثار اور آہنی استقلال کو دیکھ کر خوشی سے جھومنے لگا۔ جیسے بچے کو کوئی خوش رنگ چیز ہاتھ آ جائے۔ ان کے توکل نے میری آنکھیں کھول دی تھیں۔ اور میرا دل فرط مسرت سے کانپ رہا تھا۔ جیسے کیلے کا خوش رنگ پتا ہوا کی لہروں میں تھرتھرانے لگتا ہے +

(۸)

شادی ہو گئی۔ اور میری آمد و رفت پھر اسی راستہ سے ہونے لگی۔ مگر جب میں اسی مقام پر پہنچتا تھا۔ تو میرا دل حیرت اور خوف سے کانپنے لگتا تھا۔ اور میرے حوصلے پست ہو جاتے

تھے۔ جیسے سامنے فرشتۂ اجل نظر آ رہا ہو۔ رات کا وقت تھا۔ اور میں عائشہ کی قبر کے پاس سے گزر رہا تھا۔ کہ دفعتہً مجھے اس کے گرد کوئی چیز اپنی پوری قوت سے گھومتی ہوئی نظر آئی۔ انتہائے خوف سے مجھے زمین اور آسمان گھومتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اور گھبرا کر اُلٹے پاؤں چلنے لگا۔ جیسے آدمی کسی خطرناک جانور کو سامنے دیکھ کر آگے نہیں جا سکتا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ تو مجھے ایسا معلوم ہؤا۔ کہ وہ کسی جانور کا بچہ ہے۔ اور اس کا جسم چھوٹے چھوٹے سیاہ بالوں سے محفوظ۔ میں واپس گھر چلا آیا۔ اور دوسرے دن آفتاب کی پہلی شعاع کیساتھ میں وہاں پہنچا۔ اور قبر کے نزدیک اپنے لئے ایک محفوظ جگہ بنانے لگا۔ یہاں بیٹھ کر میں بڑے اطمینان سے اُسے گرفتار کر سکوں گا۔ اس خیال سے میں دیوانہ وار جھوم رہا تھا۔

وہی وقت تھا۔ وہی چاندنی رات تھی۔ جو ایک نغمۂ خاموش کی طرح کل کائنات پر چھائی ہوئی تھی۔ اور میں اس جانور کی راہ دیکھ رہا تھا۔ کہ دفعتہً وہ جانور قبر سے باہر نکل کر بڑی سرعت سے اس کے گرد گھومنے لگا۔ گویا طواف کر رہا ہے۔ مجھے اس وقت اس کی آواز اس قدر خوفناک اور ڈراؤنی معلوم ہوئی۔ کہ میں اپنے تئیں محفوظ سمجھتا ہؤا بھی خوف سے کانپ رہا تھا۔ یکایک میں نے اچھل کر اسے پکڑ لیا۔ پتہ نہیں اس وقت میرے دل و دماغ میں حوصلہ اور توانائی کے جذبات کہاں سے آ گئے۔

مسٹر حیدر! سچ جاننا اس چھوٹے سے جانور نے مجھ جیسے توانا اور قوی ہیکل انسان کو اپنی پوری قوت سے کھینچنا شروع کیا۔ اور جلدی جلدی قبر کے منہ کی طرف لے جانے لگا۔ اگر میں اپنی گرفت کو ڈھیلا کرتا ہوں۔ تو اسے حملہ کرنے کا موقعہ مل سکتا ہے۔ اور برعکس صورت میں مجھے ہڑپ کر جائیگا۔ میں گھبرا گیا۔ اور میرے استقلال کی مضبوط دیواریں کانپنے لگیں۔ کہ معاً فضائے ہوا میں کسی چیز کے گونجنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے اس آواز کی طرف منہ کر کے گرج کر کہا۔ اگر کوئی ہے تو مجھے آ کر بچائے۔ ایک خوفناک اور خطرناک جانور مجھے قبر میں کشاں کشاں ۔ ۔ ۔ لئے جا رہا ہے۔ مسٹر حیدر! غالباً یہ آواز بیلوں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیوں سے نکل رہی تھی۔ اور اس وقت چند قدم کے فاصلے پر سنائی دے رہی تھی۔ میری اس فریاد کو سن کر دہقان نے اپنی بھدی اور مکروہ آواز سے گرج کر کہا۔ گھبراؤ نہیں۔ میں آ رہا ہوں۔

چند ہی لمحوں کے بعد اس نے میرے نزدیک پہنچ کر ہمدردانہ لہجہ میں کہا "کیا ہے؟" "یہ بعد میں معلوم ہو جائیگا۔ پہلے اسے باہر کھینچ لو" ہم دونو اپنی پوری قوت سے کھینچنے لگے +

(۹)

صبح صادق کا وقت تھا۔ اور ہم دونو قبر سے مٹی نکال رہے تھے۔ کہ یکایک مجھے عائشہ کے پاؤں دکھائی دیئے۔ نوجوان نے تحیّر سے کہا۔

اوہ .... یہ تو قبر ہے۔ جس کا کھودنا آئینِ شرع کے خلاف ہے۔

"ہوگا۔ مگر میں اپنے بچہ کو پھر موت کے منہ میں نہیں دھکیل سکتا"

"کس طرح؟ اس نے حیران ہوکر کہا"

"میں نے ساری کہانی بیان کر دی" مسٹر حیدر! جسے دیکھ کر میں خوف سے کانپ رہا تھا۔ اور جس کے زبردست حملے کے خیال نے مجھے دوسروں کی مدد کا محتاج کر دیا تھا۔ وہ میرا لختِ جگر نورِ چشم تھا۔ معاً عائشہ میرے سامنے کھڑی ہوکر مجھے گھورنے لگی۔ میں نے مضبوط رسی سے بندھے ہوئے عزیز کو فوراً آزاد کر دیا۔ یہ میرے گناہ کا کفارہ تھا۔ اور میں نے نوجوان سے التجا آمیز انداز سے کہا۔ نوجوان!" ابھی ایک کام باقی ہے" کیا؟" قبر کو پھر کھودنا شروع کرو"

مسٹر حیدر! یقین جاننا۔ ہم نے وہ دیکھا۔ جس کا خیال دنیا والوں کو خواب میں بھی نہیں آسکتا عائشہ کی دائیں طرف بالکل مُردہ تھی اور بائیں طرف بالکل تندرست۔ اس نے اپنی بائیں آنکھ سے میری طرف دیکھا۔ اس وقت انتہائے پریم سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور میں نے ضبط کر کے کہا۔ عائشہ! اس نے جواب میں اپنی آنکھ بند کرلی۔ اور میں نے جلدی سے اس کے سینہ پر ہاتھ رکھدیا۔ وہ گرم تھا۔ چند لمحوں کے بعد میری محبوبہ ...... میری آرزوں کا مرکز عائشہ بچے کو سپرد کرتے ہوئے پھر بڑے اطمینان سے سوگئی۔ میں بچے کو لئے ہوئے گھر پہنچا۔ لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ بھلا مسٹر حیدر!

جس نے اس کی قبر میں رکھشا کی۔ دودھ دیا۔ اور اس کی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے مُردہ عائشہ کے جسم میں زندگی کی روح پھونک دی۔ کیا وہ اسے تندرست نہ کریگا؟ اس کے مقابلہ میں تو دنیا کے تمام علاج اور تمام دوائیاں ہیچ ہیں۔ مسٹر حیدر کو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ اس نے اپنی لمبی انگلی دانتوں تلے دبائی۔ اور زور سے گرج کر کہا۔

"عالمِ امکان میں ہر شے کا امکان ہے"

اس کے چندہی دن بعد وہ بچہ پھر اپنے ہمجولیوں سے کھیل رہا تھا۔ اور بٹھو اور حیدر جوشِ مسرت سے دیوانہ وار جھوم رہے تھے +

نیرنگِ حیات

(از جناب شیخ عبداللطیف صاحب تپش ایم اے ایم او ایل لکچرار گورنمنٹ کالج پسرور)

بے خلش کب گلشنِ عالم بنا مسکن مرا — خار سے گل کی طرح الجھا رہا دامن مرا

لے گئی حاصل کو میرے موجِ سیلابِ فنا — برق کی صورت کو تکتا رہ گیا خرمن مرا

جوش پر ہیں شوخیاں بازیچۂ اطفال کی — کھیلتا پھرتا ہے لڑکوں میں ابھی بچپن مرا

عہد کیا ٹوٹا وفا کا کھل گئے دستِ جنوں — کر دیا چاکِ جگر نے چاک پیراہن مرا

بزمِ دشمن میں نہ کیوں اب روز تازہ گل کھلیں — بھر لئے دامن کسی نے لوٹ کر گلشن مرا

بختِ خفتہ کو جگاتا تھا مگر فتنے اٹھے — شورِ محشر بن گیا میرے لئے شیون مرا

پھر رہا ہوں ہر نگاہِ پردہ در کے ساتھ ساتھ — گردشِ چشمِ تماشائی میں ہے مسکن مرا

خون کا دعویٰ کریں گی حسرتیں روزِ جزا

کیا ہو گر رنگیں نکل آئے تپش دامن مرا

افکارِ عالیہ

(از خسروِ سخن عالی جناب ہارون صاحب انصاف رئیس رنگون شاگرد قدیم تاج الشعراء حضرت نوح ناروی مد ظلہ جانشین حضرت داغ دہلوی)

کیوں رہیں رسم وفا و عشق سے بیگانہ ہم
پھول تم ہو، ہم ہیں بلبل، شمع تم، پروانہ ہم

زندگی اپنی بسر کرتے رہے شاہانہ ہم
زینت کاشانہ وہ تھے مالکِ کاشانہ ہم

آپ ہیں ممتازِ عالم آپ ہیں جانِ جہاں
آپ کے در پر کریں گے سجدۂ شکرانہ ہم

ایسے گھر کے واسطے حسنِ ادب بھی شرط ہے
پڑھ کے بسم اللہ ہونگے داخلِ بُت خانہ ہم

ہے زیادہ تر قناعت سے طبیعت کو لگاؤ
زندگی اپنی بسر کرتے ہیں درویشانہ ہم

پڑ رہی ہے اُس کے دم سے زندگی پر روشنی
روح کو اپنی سمجھتے ہیں چراغِ خانہ ہم

امتحاں گاہِ وفا میں سر گیا دل بھی گیا
تیرے قائل ہو گئے اے ہمتِ مردانہ ہم

لب پہ نام اللہ کا ہے دل میں ہے تصویرِ یار
ہر گھڑی کرتے ہیں سیرِ کعبہ و بُت خانہ ہم

ہو رہی ہے دیر کیوں اے ساقیٔ مے کش نواز
کر رہے ہیں انتظارِ گردشِ پیمانہ ہم

جُرم ہائے عشق کو تسلیم کرتے ہیں مگر
حیثیت رکھتے نہیں جو دے سکیں جُرمانہ ہم

حسرتوں کو نوحہ و زاری سے ہر دم کام ہے
اپنے دل کو کیوں نہ سمجھیں مثلِ ماتم خانہ ہم

اُس کی قدرت اُسکی رحمت کی ہے یہ ادنیٰ دلیل
روز اپنے بخت کا پاتے ہیں آب و دانہ ہم

کیوں نہ ہو **انصاف** اپنی صاف ستھری ہر غزل
دیکھتے ہیں نوح کے دیوان کو روزانہ ہم

تمنّا

(از جناب سردار رام سنگھ صاحب بی۔اے۔"آنرز" بی ٹی)

آپ کا نام ؟ محمد منیر ۔
ولد ؟ سرین سنگھ ۔
ہیں ؟ ہاں !
یہ کیونکر ؟ اسی طرح ۔
تو آپ پہلے سکھ تھے ؟ نہیں ۔
یا آپ کے والد اسلام کو چھوڑ کر سکھ مذہب کے ہم آغوش ہوئے ۔
ہرگز نہیں ۔
یہ تو عجیب معمہ ہے !
نہیں ۔یہ حقیقت ہے ۔
لیکن اس اُلجھن کا حل تو میری عقل سے بعید ہے ۔کیا اس میں کوئی راز مضمر ہے ؟
نہیں باطن روزِ روشن کی طرح صاف ہے ۔ صرف آپ کا نقطۂ خیال محدود ہے ۔
بیٹا مسلمان ! والد سکھ ! یہ عجیب نوعیت کا رشتہ ہے ۔میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنا۔
تو آج آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ۔ اور کانوں سے سنا ۔
لیکن یقین کرنا محال ہے ۔کیا آپ کو اپنی والدہ محترمہ کے اسم شریف کے بتانے میں تو کوئی عذر نہیں ہے ؟
نہیں ان کا نام چمپا دتی ہے ۔
اور تعجب خیز ہے !
آپ کے بھائی ؟ چار ۔
ان کے نام ؟
ہردیال سنگھ ۔گوپال سنگھ ۔مدن پال سنگھ ۔

چوتھا؟ میں آپ۔

کوئی بہن ؟

دو۔ ستونت کور اور منیر بیگم۔

یعنی ایک بہن اور ایک بھائی مسلمان۔ اور باقی سکھ۔

ہاں۔

ماں باپ بھی سکھ ؟

ٹھیک۔

تو پھر یہ کسی بیسویں صدی کے غیر معمولی مہذب گھرانے کا دستور العمل ہوگا ؟

مسٹر منیر اور مرزا سعید گاڑی میں بیٹھے یہ باتیں کر رہے تھے کہ گاڑی نے وسل دیا۔ منیر نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ تو سٹیشن نزدیک تھا۔ سلسلۂ کلام کو منقطع کرتے ہوئے دونو اپنے اسباب کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے۔ اتنے میں اسٹیشن آگیا۔ منیر اور سعید دونو شوق سے مصافحہ کرنے لگے۔ سعید نے اپنا تعارفی کارڈ پیش کرتے ہوئے مودبانہ انداز میں کہا۔ آپ سے مل کر نہایت مسرت ہوئی ہے۔ امید ہے کہ جب کبھی ڈلہوزی آنے کا آپ کو اتفاق ہو۔ تو احقر کو میزبانی کا شرف حاصل کرنے کا موقع دیجیگا۔ اور بہ تفصیل اس معمہ کا بھی حل کیجیئے گا۔

منیر نے مسکراتے ہوئے سعید کا شکریہ ادا کیا۔ اور پُر اخلاق طریقہ سے اپنا تعارفی ٹکٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔ گاڑی کا تعارف کوئی دیرپا نہیں ہوتا۔ لیکن کم از کم آپ کے اور میرے مابین یہ خیال باطل ثابت ہؤا ہے۔ اس کی وجہ کچھ حد تک میری پُر اسرار ہستی ہے۔ جو آپ کے نزدیک معمہ ہے۔ لیکن اس کا بالتشریح ذکر اب بے محل ہے۔ ہاں! اگر زندگی نے وفا کی۔ تو عرض کرونگا۔ "تو خدا حافظ" یہ کہتے ہوئے دونو دوست جدا ہو گئے۔ اور منیر نے ہوٹل کی راہ لی +

(۲)

شام کا وقت تھا۔ آسمان پر مکمل تاریکی نے ابھی سکہ نہیں جمایا تھا۔ مندروں سے ناقوس اور گھنٹوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بازار میں چہل پہل تھی۔ دن بھر کے تھکے ماندے لوگ گھروں کو جا رہے تھے۔ گاہے گاہے کسی پرندے کی پُر درد بلند آواز کانوں تک پہنچتی تھی۔ شائد وہ رستہ بھول گیا تھا۔ یا اپنے ہمجولیوں سے الگ رہنے کے سبب روزگار سے اپنی بے بسی کی شکایت کر رہا تھا۔ یہ کوئی بڑا شہر نہ تھا۔ کہ رات کو ہوٹل میں رونق ہو۔ منیر چپکے سے ہی اپنے کمرے

سے باہر نکل کر پاس کی سڑک پر کھڑا ہو گیا - کہ اتنے میں اس کے بالمقابل ایک فقیر سوٹے کے سرے کو دونو ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی تمام قوت سے اس پر جُھک گیا - جیسے کسی کو اپنے تھکے ہوئے جسم کو آرام دینے کے لئے موقعہ ہاتھ لگ گیا - بغیر کسی رسمی تعارف کے اپنی موٹی موٹی سیاہ آنکھوں کو منیر کی آنکھوں میں گاڑ کر کہنے لگا " بیٹا آپ کا نام ؟"

منیر نے غور سے فقیر کو دیکھا - سر سے پاؤں تک اس کا حلیہ آنکھوں میں بٹھاتے ہوئے لکنت کے انداز میں کہا - میرا نام !

منیر کے دل میں کچھ خوف طاری ہو گیا - ایک اجنبی فقیر سے ناگہاں دو چار ہونا اور پھر بغیر کسی تعارف کے اس کا نام پوچھنا منیر کے نزدیک تعجب خیز تھا - وہ کوئی لالچی گنوار فقیر نہ تھا - کہ دیکھتے ہی بھیک مانگنے لگے - یہ عمر رسیدہ درویش تھا - برف ایسے سفید سر کے بال شانوں پر ہوا میں اس طرح خم کھا رہے تھے - کہ گویا دو بڑے سانپ پرواز کر رہے ہیں - لمبی ڈاڑھی - سیاہ آہو کی مانند موٹی آنکھیں - کھردری آواز - دراز قد - یہ تمام ایسی باتیں تھیں جو اسے بارعب و موقر بنانے میں مدد دے رہی تھیں - اس کے بشرہ سے متانت اور چہرے سے سنجیدگی ٹپک رہی تھی - کوئی بشر اسے دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا - کہ یہ کوئی معمولی فقیر ہے -

ہاں - اتنے میں منیر کو اپنے متزلزل جذبات پر قابو پانے کا موقعہ مل گیا - اور چونک کر بولا - میرا نام ؟ میرا نام محمد منیر -

فقیر - محمد منیر ! محمد - منیر ! !

فقیر نے دو بار اس کے نام کا اعادہ کرتے ہوئے پیٹھ موڑ لی - اور آنکھ کی جھپک میں وہاں سے اوجھل ہو گیا - اور منیر مبہوت اس کی جانب دیکھتا رہ گیا - جس طرح کوئی ناتواں شخص یکایک کسی راہزن کے مال و متاع لوٹ لینے پر بے بسی کی حالت میں خاموش کھڑا دیکھتا رہ جاتا ہے ۔

(۳)

شومئے طالع نے منیر اور اس کی بہن منیر بیگم سے ماں کا شفقت آگین ہاتھ عالم طفلی میں ہی اٹھا لیا تھا - اور یہ دونو بلکتے رہ گئے تھے - منیر کے باپ کو ان کی ماں سے بیحد محبت تھی - بیوی کی ناگہانی اور بیوقت موت نے خاوند کو دیوانہ بنا دیا - شب و روز گریہ و زاری میں بسر ہونے لگی - ایک روز صبح کا وقت تھا - آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے ٹھنڈی

ہوا چل رہی تھی۔ درخت وجد میں آکر جھوم رہے تھے۔کیسا سہاونا سماں تھا۔گاہے گاہے موروں کی آواز اس کے لطف کو دوبالا کر دیتی تھی۔گویا قدرت اپنے جوبن کی متوالی ہو رہی تھی۔ایسی حالت میں صرف منیر کا ایک والد تھا۔کہ کمرے میں خاموش اپنی بیوی کی یاد میں زار وقطار رو رہا تھا۔ قدرت کی نیرنگیاں اس کے سامنے ایک ہیبت ناک منظر پیش کر رہی تھیں۔ گویا تمام عالم ماتم کدہ بن رہا تھا۔منیر اور اس کی بہن کھیلنے کو چپکے سے باہر نکل گئے۔ ان کے ہاتھوں میں کھلونے تھے۔منیر بیگم کے پاس امی کی بنی ہوئی گڑیا تھی۔منیر کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ دونو کھیلتے کودتے سٹیشن پر جا نکلے۔ دیکھا تو گاڑی آنے کو تھی۔ہنستے اچھلتے کمرہ کے اندر جا پہنچے۔آنکھ چرا کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔سٹیشن چھوٹا تھا۔گاڑی نے لمحہ بھر ٹھیر کر وسل دیا۔ اور یہ دونو ننھے بہن بھائی شوق سے کھڑکی سے باہر سر نکال کر دیکھنے لگے۔لیکن ابھی تین چار سٹیشن گاڑی آگے نہیں گئی تھی۔کہ ان کو نیند نے اپنی آغوش میں لیلیا اور دونو بہن بھائی ایک دوسرے سے لپٹ کر یوں سو گئے۔کہ امی انہیں گویا بستر پر لٹا گئی ہے اور آپ کام دھندے کو باہر چلی گئی ہے۔آخر جنکشن کا سٹیشن آیا۔لوگوں نے ڈبہ کو یکے بعد دیگرے خالی کر دیا۔ ماؤں نے اپنے سوئے ہوئے بچوں کو پیار سے اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا۔مگر منیر اور اس کی بہن گہری نیند میں خراٹے لے رہے تھے۔کون تھا۔جو ان کا ماتھا چومتا۔آخر ایک سپاہی نے جو گاڑی کے ٹھیرنے پر ہر ایک ڈبہ کو حریص آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ دو بچوں کو لیٹے ہوئے دیکھا۔ایک بڑھیا بھاگی بھاگی سواریوں کے تعاقب میں جاتی ہوئی چلا رہی تھی۔کسی کے بچے رہ گئے۔مگر زن و مرد گاڑی کے بدلنے کی دھن میں اس قدر تیز جا رہے تھے۔کہ بڑھیا کی تھرائی ہوئی کمزور آواز کسی نے نہ سنی۔ پولیس مین نے بچوں کو جگایا۔بچے سپاہی کو دیکھ کر رونے لگے۔وہ اس قدر کم سن تھے۔کہ اپنا نام بھی صاف طور پر نہیں بتا سکتے تھے۔تمام سٹیشن پر ہجوم جمع ہو گیا۔پولیس نے بچوں کو اپنی حراست میں لیا۔حسن اتفاق سے سردار سرین سنگھ اور ان کی بیوی سٹیشن پر کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ وہ ایسے متاثر ہوئے۔کہ پولیس کے پاس جا کر بچوں کو اپنی تفویض میں لینے کی درخواست لکھ دی۔اور وعدہ کیا۔کہ ان کے ولی یا سرپرست ملنے پر ان کے حوالے کرنے میں انہیں کوئی عذر نہ ہوگا۔

سرین سنگھ کی عورت چمپاوتی نے انہیں بغل میں لیا۔اور پیار سے گود میں بٹھا کر ماتھا چوما اور شفقت کا ہاتھ سر پر پھیرا۔بچوں نے ہچکیاں لینی شروع کیں۔اور تعجب سے اس کے منہ کی

طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگے۔

سرین سنگھ نے اپنے وعدہ کو اس طرح نبھاہا۔ کہ دنیا دیکھ کر حیران ہے۔ بچوں کو حقیقی بچوں کی مانند پالا۔ تعلیم سے بہرہ اندوز کیا۔ منیر کو اسلامیہ مدرسہ میں داخل کیا۔ اور منیر بیگم کی تعلیم و تربیت کے لئے مسلمان استانی مقرر کی۔ منیر اور منیر بیگم انہوں نے ہی ان کے نام رکھے۔ دونو سرین سنگھ کے بچوں سے اس طرح کھیلتے کودتے۔ گویا ایک ہی ماں کے بچے ہیں۔ کوئی تفاوت نہ تھا۔ تمام کا لباس یکساں تھا۔ منیر بیگم منظور حسن انسپکٹر زراعت سے بیاہی گئی۔ منیر اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڈھ کالج میں داخل کرادیا گیا۔ منیر بیگم کے بیاہ پر ایسی خوشی کا اظہار ہؤا۔ جیسے سگی لڑکی کی شادی کی تقریب پر ہوتا ہے۔

(۴)

ادہر تو بیوی کی ناگہانی اور بے وقت موت نے محمد قاسم کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اور اب رہی سہی خوشی کی جھلک مکمل تاریکی میں بدل گئی۔ جس طرح بادلوں سے گھرا ہؤا مہتاب تھوڑی ہی دیر بعد تاریکی میں جا چھپتا ہے۔ اور زمین آسمان پر یکا یک تاریکی ہی تاریکی چھا جاتی ہے۔

ابھی ایک صدمہ جانکاہ سے محمد قاسم کی پیٹھ سیدھی نہ ہوئی تھی۔ کہ ایک اور صدمے نے اس کا کلیجہ شق کر دیا۔

قاسم نے پریشان ہو کر قرب وجوار کے دیہات میں بچوں کی تلاش میں خاک چھان ڈالی۔ مگر وہ نہ ملنے تھے۔ اور نہ ملے۔ اور پڑوسیوں نے بھی ازراہ ہمدردی جستجو میں مدد دی۔ مگر بے نیل مرام قاسم زندہ درگور ایسی زندگی کو موت سے ہزار درجہ بہتر سمجھتا تھا۔ چنانچہ ایک بار سنکھیا بھی کھائی۔ مگر لواحقین نے وقت پر پہنچ کر مدد کی۔ اسے زندہ رہنے میں مصیبت تھی۔ مر جانے میں نجات موت کی تاریک و بھیانک شکل اس کے لئے پُر لطف و مسرت اندوز تھی۔ جیسے اماوس کی سیاہ رات میں چاند کی کرنوں کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اسی طرح قاسم کی یاس انگیز زندگی میں خوشی کی جھلک کے نمودار ہونیکی کوئی امید نہ تھی۔ جینا دوبھر ہو گیا۔ آہ و بکا میں روز و شب بسر ہوتے آخر احباب کے سمجھانے بجھانے پر قرآن کی تلاوت پر راغب ہؤا۔ مگر زخمی دل کو سکوت کہاں؟ اضطراری و بیقراری بدستور۔ بیٹھے بیٹھے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ دکھی آدمی کا ایک ایک پل صدیوں کے برابر گذرتا ہے۔ قاسم کی قابل رحم حالت کو دیکھ کر کون ایسا فرد بشر ہوگا۔ جس نے آٹھ آٹھ آنسو نہ بہائے ہوں۔ آخر ایک بار قاسم کی طبیعت میں بھاری تبدیلی کا ظہور ہؤا۔

پہلے تو آنکھیں اشک سے پُرآشوب رہا کرتی تھیں۔ مگر اب پتھرا گئیں۔ گویا کبھی اشکبار ہی نہ ہوئی تھیں۔ زبان پر نہ گلہ تھا۔ نہ بین۔ خاموش۔ جیسے جنگل میں آزاد ہرنی یکایک کاری زخم لگنے سے خاموش گر پڑتی ہے۔ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وحشتناک انداز سے ہر سو دیکھتی ہے۔ کہ یہ کیا ہو گیا۔ اس جفا کے یکلخت ٹوٹ پڑنے پر قاسم کا کلیجہ دہل گیا۔ گویا کسی نے سلگتا ہوًا انگارا رکھ دیا۔ سکوت کا یہ عالم کہ کسی سے بات کرنا بھی دوبھر تھا۔ آخر ایک روز لوگوں نے قاسم کو نقیرانہ لباس میں اپنے وطن کو درد بھرے دل سے خیرباد کہتے ہوئے سنا۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں عصا تھا۔ گلے میں لمبا کرتا۔ اور زبان حال سے نہایت ہی رقت انگیز لہجہ میں کہہ رہا تھا۔

خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں ۔۔۔ در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں

گاؤں کے مرد و عورت سکتہ کے عالم میں تھے۔ آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ جیسے چشمہ سے پانی۔ قاسم کی وحشتناک شکل یاس کی مجسم تصویر تھی۔

دوسرے روز قاسم کو گاؤں سے دور کہیں جنگل میں "ایک تکیہ" کے قریب ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے دیکھا۔ وہ کسی سے نہیں بولتا تھا۔ ہاں ہر ایک راہرو سے اس کا نام پوچھ لیتا تھا۔ اس کے بعد ہزار کوشش کرنے پر بھی اپنی زبان نہ کھولتا تھا۔ کبھی کبھار شہروں بنوں اور جنگلوں میں پھرتا۔ لیکن جب کسی سے دوچار ہونے کا اتفاق ہوتا۔ تو بلا تعارف اس سے نام پوچھتا۔ کوئی کہتا "قاسم باؤلا ہے۔" کوئی کہتا "مرض جنوں اس پر سوار ہے" لیکن کسی نے اس کو دست نگر ہوتے نہیں دیکھا۔ اسے زر و سیم سے نفرت تھی۔ روپیہ پیسہ دینے پر بھی نہیں لیتا تھا۔ کھانا کوئی کھلا دے تو کھا لیتا۔ مگر وہ بھی اتنا کہ جس سے اس کی مشکل سے شکم پری ہو +

(۵)

ستمبر کے مہینے میں دیوانی عدالتیں ہفتہ عشرہ کے لئے بند ہوتی ہیں۔ محمد منیر نے اب کے بار ڈلہوزی جانے کی ٹھانی۔ اور سعید کو شرف میزبانی عطا کر کے وعدہ ایفا کیا۔ سعید منیر کو دیکھ کر پھولے نہ سمایا۔ گاڑی کا تعارف بڑھتے بڑھتے حقیقی دوستی میں بدل گیا۔ لیکن سعید کے گوشۂ دل میں منیر کی پُراسرار ہستی کا راز چٹکیاں لے رہا تھا۔ آخر منیر نے ایک رات دسترخوان پر اپنے میزبان کو اپنی رام کہانی سنائی۔ منیر کی آنکھوں میں شکرانہ کے آنسو چھلکتے تھے۔ سعید کا چہرہ سن کر سرخ ہو رہا تھا۔ آخر صلاح یہ ٹھیری۔ کہ منیر اپنے والد کی ڈھونڈ بھال کرے۔

اس سے قبل سرین سنگھ کی پدرانہ شفقت اور چمپاوتی کی حقیقی محبت نے بہن بھائی کے دل میں یہ خیال ہی پیدا نہ ہونے دیا تھا۔ کہ ان سے اپنی سرگذشت پوچھیں۔ اور نہ سرین سنگھ اور اس کی عورت نے انہیں اپنی اصلی داستان سنا کران کے دل کو ٹھیس پہنچانا مناسب خیال کیا۔ گویا ان کی ہستی بظاہر مینۂ اخفا میں تھی۔ مگر انہوں نے نوکروں سے اور شہر کے آدمیوں سے سنا تھا۔ کہ وہ سردار کو سٹیشن پر بلکتے ملے تھے۔ شائد یہ ان یتیموں کی دعا کا ہی نتیجہ ہے۔ کہ سردار کا ستارۂ اقبال روز افزوں ترقی پر ہے۔

منیر نے ڈلہوزی سے واپس آکر اپنے باپ کی تلاش کرنی شروع کردی۔ پہلے اس اسٹیشن کی کوتوالی کے کاغذات کو دیکھا۔ جہاں انہیں سردار نے اپنی تفویض میں لیا تھا۔ اور پھر وہاں سے قرب وجوار کے دیہات سے پتہ لگانا شروع کیا۔ کہ کسی کا لڑکا و لڑکی چھوٹی ہی عمر میں گھر سے نکل گئے ہیں۔ آخر پھرتے پھراتے ایک ضعیف العمر سے سامنا ہوا۔ وہ صرف یہ بتلا سکا۔ کہ عرصہ قریباً پچیس سال کا ہوا میں نے سنا تھا۔ کہ ایک آدمی کی بیوی کی وفات کے بعد اس کے دو نور نظر کہیں اوجھل ہو گئے۔ کوئی کہتا دشمن نے جائداد پر ہاتھ صاف کرنے کے لئے بچوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ کوئی کہتا کسی بے اولاد نے اولاد کی خاطر انہیں اٹھالیا ہے۔ لیکن پتہ نہ چلا۔ اور باوجود کوشش نہ چلا۔ منیر کو اپنی کوششوں کے بارآور ہونے کی امید بندھ گئی۔ اگلے دیہات میں ایک نیکمرد نے "چپ سائیں" سے اس کے متعلق برکت حاصل کرنے کی سفارش کی۔ شائد اس کی دعا بارگاہ عالی میں منظور ہو۔ اور کامیابی نصیب ہو۔

منیر جو اس سے پہلے درویشوں کی دعاؤں پر اعتقاد نہ رکھتا تھا۔ اس آدمی کے کہنے سننے پر سائیں کے دیدار کو روانہ ہوا۔ سائیں گاؤں سے باہر کافی فاصلے پر درخت کے جھنڈ میں گھاس پھوس کی جھونپڑی میں رہتا تھا۔ فرش خاک پر سوتا تھا۔ گرمی و سردی میں صرف کملی ہی اوڑھتا تھا۔ جھونپڑے کا کوئی دروازہ نہ تھا۔ اس میں ایک مٹی کا لوٹا جو اس قدر گرد آلود تھا۔ کہ خدا جانے کیوں اور کب لایا گیا تھا۔

منیر نے ایک بوڑھے آدمی کو جھونپڑی میں سائیں کے پاس بیٹھے دیکھا۔ سائیں لیٹا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اسے تکلیف ہے۔ اور وہ اضطراب کی شدت سے تڑپ رہا ہے۔ اور زور سے کہہ رہا ہے "میرا جینا صرف ایک مقصد کے حصول کے لئے مخصوص تھا۔ اور میں اپنی قوت ارادی کے زور سے خیال کرتا تھا۔ کہ میں خواہ کتنا ہی عمر رسیدہ کیوں نہ ہو جاؤں۔ اسے حاصل کر کے ہی بارگاہ عالی میں حاضر ہوں گا۔ مگر اب آب و دانہ ختم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ قلب میں درد ہے۔"

بوڑھے نے لرزتے ہوئے ہاتھ سائیں کے سینہ پر رکھ کر کہا "میں حکیم کو لاتا ہوں"۔ سائیں نے بے پروائی سے پیٹھ موڑ کر کہا۔

"لوگوں کو کیا معلوم میں کون ہوں۔ اور کونسی تمنا اس عرصۂ طویل میں میرے دل پر قابض رہی ہے۔ پچیس برس ہوئے میں نے اپنے وطن کو خیرباد کہا تھا۔ آج پردیس میں اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر رہا ہوں۔

سائیں نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے ذرا زوردار لہجہ میں کہا " میری بیوی مرگئی خدا اسے جنت نصیب کرے۔ پیچھے لڑکی ولڑکا چھوڑگئی۔ بچے کہیں گھر سے نکل گئے۔ اور پھر واپس نہ آئے۔ دنیا میرے لئے تاریک ہوگئی۔ گھر گھاٹ ترک کیا۔ اور خدا کی راہ لی۔ باوجود پیہم عبادت وریاضت کے بچوں کا خیال میرے سر سے نہ گیا۔ پر نہ گیا۔ خدا جانے وہ کس مصیبت میں ہیں۔ میری تمنا ....

یہ کہتے ہوئے سائیں نے ایک لمبی سانس لی۔ اور آنکھوں کو کھولا۔ منیر کا سر اس کے پاؤں پر تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ جیسے چشمہ سے پانی۔ پاؤں کو اشکوں سے دھو ڈالا۔ اور رقت انگیز لہجہ میں کہا۔

"وہ میں ہوں آپ کا بیٹا جو چھو..... ٹی ... عمر.... میں ...."

سائیں نے فوراً اٹھ کر کہا " تمہارا نام"

خدا جانے کیا نام تھا۔

سائیں نے غور سے اس کی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

تم ہو بشیر!

منیر نے روتے ہوئے سر نیچا کیا۔ اور کہا " ابّا"

سائیں نے جھپٹ کر منیر کو زور سے چھاتی سے لگا لیا۔ اور گود میں بٹھا کر کہا۔

بیٹا بشیر!

یہ کہتے ہوئے وہ سجدہ میں گرا۔ اور پھر اسی حالت میں خدا کی درگاہ میں داخل ہوا۔ ہرچند منیر نے اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ مگر نہ ہوا۔ اور اسی حالت میں دفن ہوا۔

غزل

(از جناب سید منظور حسن صاحب فوقؔ رامپوری)

اُس سے حسرت کہی نہیں جاتی
مفت میں جان دی نہیں جاتی

جس کے نالوں سے تم پریشاں تھے
آج بات اُس سے کی نہیں جاتی

جان سے بھی یہاں تو عذر نہیں
آپ کی دشمنی نہیں جاتی

کیا کیا اُن سے رازِ عشق کہا
ہائے دیوانگی نہیں جاتی

دیکھتے ہو ہمارے زخمِ جگر
کوئی تدبیر کی نہیں جاتی

کیا زمانے کو ہو گیا یا رب
ایک کروٹ بھی لی نہیں جاتی

فوقؔ کیا رعبِ حسنِ جاناں ہے
سامنے بات کی نہیں جاتی

نسیم صبح

(مسٹر کنول نین اختر ادیب فاضل)

جاں بخش کس قدر ہے تو اے موسم بہار　　آتے ہیں چار سمت نظر سبز کوہسار
لب ہائے جو پہ رقص نوازی شاخسار　　صحنِ چمن میں جلوہ طرازی لالہ زار
عیسےٰ نفس ہے جنبشِ بادِ بہار کیا!
پژمردہ گل کے واسطے ہے تازہ کار کیا!

شاخِ شجر پہ بیٹھ کے مدحت سرائے گل　　ہیں محوِ نغمہ سنجی نازو ادائے گل
الٹے نسیمِ صبح نے جب پردہ ہائے گل　　بے ساختہ زبان سے نکلا کہ ہائے گل
گلشن کمالِ صنعتِ پروردگار ہے
حسن و جمالِ دوست کا آئینہ دار ہے

پڑتی ہے جس شجر پہ نظر سبزہ پوش ہے　　بلبل نوا طراز ہے اور عیش کوش ہے
شوقِ نمو میں سنئی ساغر کا جوش ہے　　گل کیفِ انبساط سے مجرمِ ہوش ہے
مسرور اس کی دید سے قلبِ حزیں ہے آج
صحنِ چمن نمونۂ خلدِ بریں ہے آج

بادِ بہار اہلِ قفس تک اگر گئی　　برچھی سی عندلیب کے دل میں اتر گئی
بے موت ہجرِ لالہ و گل میں وہ مرگئی　　ننھی سی جان جس پہ یہ قیامت گذر گئی
جھونکا نسیم کا اُسے پیکِ قضا ہوا
صیاد پوچھتا ہے ہر اک سے یہ کیا ہوا

درسِ عبرت

(از جناب مصوّرِ جذبات "اشرف قریشی" صاحب لکھنوی)

"وہ بلدۂ لطافت و نزہت جس کو لکھنو کہتے ہیں - اگرچہ اپنی ساری شادابیاں امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں کھو چکا ہے - تاہم وہ ایک شے جس کا نام ذوقِ سلیم ہے آج بھی یہاں ارزاں ہے -

اسی زمین کی لطافت بار گود میں ہماری رشیدہ پلی - بڑھی اور اسی فضا میں جہاں نزاکتِ ذوق اور لطافتِ حسن کی نشو و نما ہوتی ہے - اس نے اپنی آخری سانسیں توڑیں -

لاریب کہ "درسِ عبرت" کے عنوان سے ایک ایسی پُر درد لیکن حقیقی داستان لکھی گئی ہے - جس سے ہر قلب متاثر ہو سکتا ہے - اور اس لئے اس داستان عبرت کو صرف قوتِ متخیلہ کی کارفرمائی نہ سمجھنا چاہیئے - بلکہ بُری صحبتوں کے نتائج و اثرات کا آئینہ خیال کرنا چاہیئے - کیونکہ جو کچھ ہو رہا ہے - جو کچھ آئندہ ہونے والا ہے اس کے لئے اس میں بہت کچھ سامانِ بصیرت پنہاں ہے - میں نے اس میں صنفِ مظلوم کے مصائب و آلام پر اپنا دل دکھا کر ایک ایسے منظرِ خونیں کی جھلک دکھلائی ہے - جس سے ہماری جمعیت کو درس لینے کی ضرورت ہے ————

اور یہی میرا مدعا ہے :" ———— "اشرف قریشی"

(۱)

رشیدہ - بوریہ پر بیٹھی ہوئی پھٹے پرانے کپڑوں کی مرمت میں مصروف ہے - اس کا سن زیادہ سے زیادہ بیس اکیس سال کا ہو گا - لیکن مصیبتوں کی بھرمار اور فاقہ کشی کی سختیوں نے اس کے حسین چہرہ کو پھول کی طرح مرجھا کر اس کے حسنِ ملائک فریب کو بالکل ماند کر دیا ہے - جس طرح صبح کا کھلا ہوا گلاب جلال کے وقت پژمردہ نظر آتا ہے - بعینہٖ اسی طرح اس کا خوبصورت چہرہ کثرتِ آلام سے کملایا ہوا

ہے ۔ اس کے سامنے ہی زمین پر دو ڈیڑھ برس کا بچہ کھیل رہا ہے ۔ رمضان کا مبارک مہینہ ختم ہو چکا ہے ۔ آج آخری روزہ ہے ۔ مسلمانوں کے گھروں میں عید کی تیاریاں ہو رہی ہیں ۔ سویاں خریدی جا رہی ہیں ۔ درزی کے یہاں سے جو نئے جوڑے سل کر آئے ہیں ۔ انہیں دیکھا جا رہا ہے ۔ ان کے عیب و ہنر پر نکتہ چینیاں ہو رہی ہیں ۔ جن غریبوں کو اتنی مقدرت نہیں کہ نئے کپڑے بنوا سکیں ۔ انہوں نے پرانے کپڑوں کی مرمت کر کے دھلوا لیا ہے ۔ غم نصیب رشیدہ بھی انہیں لوگوں میں ہے جنہیں نفیس پوشاک ۔ مرغن غذائیں تو ایک طرف ۔ ستر پوشی کو ایک چیتھڑا اور پیٹ کی دوزخ بھرنے کو ٹکڑا روٹی بھی نہیں جڑتا ۔

رشیدہ جہیز میں تو سب ہی کچھ لائی تھی ۔ برتن ۔ باسن ۔ کپڑے لتے ۔ گہنا زیور اس کی نانی نے دل کھول کر دیا تھا ۔ لیکن میاں جھمن کی عیاشیوں نے غریب کے پاس جھنجھی کوڑی بھی نہ چھوڑی ۔ پہلے ظروف مسی و چینی پر ہاتھ صاف ہوا ۔ پھر کپڑوں ۔ لتوں کی نوبت آئی ۔ رہا زیور جسے فروخت کر کے کچھ تو غریب رشیدہ نے گھر کا خرچ چلایا ۔ جو کچھ باقی رہا ۔ وہ جھمن نے قمار خانے میں ہار دیا ۔

رشیدہ بیگم ۔ شوہر پرست ۔ عفت مآب اور نیک خاتون تھی ۔ اس نے کبھی میاں کی بدعنوانیوں پر نکتہ چینی نہیں کی ۔ وہ نہایت صبر و خاموشی سے اپنے میکے کا اثاثہ تباہ و برباد ہوتے دیکھا کی ۔ اگر کبھی ڈرتے ڈرتے دبی زبان سے کچھ کہا بھی ۔ تو جھمن نے برافروختہ ہو کر سخت جواب دیا ۔ وہ بیچاری میاں کے کڑوے تیور دیکھ کر ڈر گئی ۔ اور پھر کوئی فقرہ منہ سے نہ نکالا ۔

رشیدہ کو خود اپنا تو کچھ خیال نہ تھا ۔ دو دو تین تین وقت بغیر کھائے ہوئے صرف پانی پی پی کر خدا کا شکر بجا لاتی ۔ لیکن مشکل تو یہ تھی کہ اس کی گود میں شیر خوار بچہ تھا ۔ جو دودھ نہ ہونے کی وجہ سے مچھلی کی طرح تڑپتا تھا ۔

رشیدہ نے معصوم کی حالت دیکھ کر ایک روز خاوند سے کہا ـــــــ "تم میری سب چیزیں لیگئے ۔ لیکن میں نے کبھی اُف نہ کی ۔ اب بیزبان بچہ کا پھڑکنا نہیں دیکھا جاتا ۔ میں تم سے اچھی اچھی غذائیں کھانے کو نہیں مانگتی ۔ ستر پوشی کے لئے نفیس پوشاکیں نہیں طلب کرتی ۔ بلکہ ایک پیسے کے چنے مانگتی ہوں ۔ اس بے زبان بچے پر ترس کھا کر ہر روز شام کو تھوڑے سے چنے لا دیا کرو ۔"

سخت دل جھمن نے اس کی عاجزی کی مطلق پروا نہ کی ۔ اور تیور بدل کر کہا ـــــــ

"میں تمہاری دو چار بالیاں زبردستی نہیں لیگیا ۔ تم نے اپنی خوشی و مرضی سے دی تھیں ۔ جس کا ذمہ دار میں نہیں ہو سکتا ۔ رہا روٹی کپڑا وہ میں اپنے ہی لئے فراہم نہیں کر سکتا ۔ تو تمہارے

واسطے کہاں سے لاؤں۔ خدا نے تم کو دو ہاتھ دیئے ہیں۔ دو پیر دیئے ہیں۔ ان سے کام لو۔ کماؤ کھاؤ!"
اس جواب سے رشیدہ کا دل بالکل ہی ٹوٹ گیا۔ اسے میاں کی طرف سے یاس ہو گئی۔ اتنی بے دردی پر بھی اس نے جھمن کی شکایت نہیں کی۔ بلکہ پاس پڑوس کی عورتوں سے یہ کہکر امداد کی خواہاں ہوئی۔ کہ "آج کل وہ بے روزگار ہو رہے ہیں۔ کہیں نوکری نہیں لگتی۔ اس لئے چاہتی ہوں کہ آپ لوگ اپنے اور بچوں کے جو کپڑے سلوائیں۔ وہ مجھ ہی کو عنایت کر دیں۔ کہ اس کی اجرت سے اپنے معصوم بچہ کی پرورش کر سکوں"

(۲)

اس دن سے آج کی گھڑی تک رشیدہ سلائی کے پیسوں پر بسر اوقات کرتی ہے۔ آٹھویں دسویں دن جھمن آتے ہیں۔ اور جو رقم رشیدہ پیٹ کاٹ کر جمع کرتی ہے لے جاتے ہیں۔ عید سر پر آ گئی۔ غم نصیب رشیدہ اپنے پیارے بچے کے لئے ایک کرتہ بھی نہ بنا سکی۔ اس نے رو رو کر ایک پرانے کرتے کی مرمت کی۔ پڑوس کی عورتوں نے اپنے بچوں کے لئے ریشمی ملبوس تیار کرائے تھے۔ ان کی کترین جو محض بیکار تھیں۔ اور اپنی خوشی سے رشیدہ کو بخش دی تھیں۔ ان کترنوں کو جوڑ جوڑ کر کرتے میں گوٹ لگا دی۔ ایک گرہ جالی کا ٹکڑا انگیچی سے نکال کر ٹوپی سی۔ اور یوں بچے کے واسطے عید کا جوڑا تیار کر لیا۔

عید کے دن رشیدہ منہ اندھیرے اٹھ کر نہائی۔ کپڑوں میں پیوند لگا کر رکھے تھے۔ انہیں نکال کر پہنا ایک بی بی نے اپنے شلوکہ میں بٹن ٹنکوائے تھے۔ اور اس کی اجرت میں دو پیسے دیئے تھے۔ رشیدہ نے انہیں پیسوں کا پڑوس کی ایک عورت سے تیل منگوایا۔ بالوں میں ڈالا۔ کنگھی کی۔ باقی جو بچا۔ وہ بچہ کے سر میں ڈال دیا۔ اور پرانے کپڑوں کو بڑی حسرت و آرزو سے جن کی مرمت کی تھی پہنا کر گویا دولھا بنا دیا۔

ان کاموں سے فارغ ہو کر چولھے میں آگ ڈالی۔ ہلائی کا جو روپیہ ملا تھا۔ اس کی جنس پہلے ہی منگوالی تھی۔ گویا عید کے واسطے خاص اہتمام کیا تھا۔ زلفن جو اس کے حال پر نہایت مہربان تھی۔ اس سے پاؤ بھر گوشت منگوایا تھا۔ جسے دھو کر چولھے پر چڑھا دیا۔ مٹی کے کونڈے میں آٹا نکال گوندھ رہی تھی۔ کہ دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی ———
"شائد وہ آ گئے" ———

جس طرح عید کا چاند دیکھ کر روزہ داروں کے سینے میں دل اچھلنے لگتا ہے۔ نیک نہاد رشیدہ

کا کلیجہ دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ زرد زرد زعفرانی رخساروں پر تازگی نمودار ہوگئی۔ اس لئے اسی طرح بھرے ہاتھوں سے جاکر کنڈی کھولی۔ اور بغیر بات کئے پچھلے پاؤں واپس آئی۔

ہنوز اپنی جگہ پر بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ میاں جھمن بغل میں کپڑوں کی انگیٹھی دبائے ہوئے ایک ہاتھ میں بیسن کا دونا دوسرے میں تیل کی شیشی لئے ہوئے داخل ہوئے۔ اور بیوی کی طرف دیکھکر بولے "مٹکے میں پانی ہے یا نہیں"

رشیدہ "تھا تو لیکن مجھے کیا معلوم تھا۔ کہ تم آؤ گے؟ ورنہ خرچ نہ کرتی"

جھمن "(تیور بدل کر) مجھے کیا معلوم تھا تم آؤ گے؟ کیا یہ میرا گھر نہیں ہے"

رشیدہ۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) نہیں، نہیں، میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ جو تم نے سمجھا۔ حقیقت میں یہ تمہارا گھر ہے۔ اور میں تمہاری کنیز ہوں۔ لیکن آج کل خدا جانے کیوں؟ تم ناراض رہتے ہو۔ جو ایک، ایک اٹھوارے صورت نہیں دکھائی دیتی"

جھمن "(کچھ سوچ کر) خیر ہوگا۔ مجھے گھڑا اٹھا دو۔ بمبے سے پانی بھر لاؤں"

جھمن نے نہاکر کپڑے بدلے۔ اور محلے کے چند لوگوں کے ساتھ عیدگاہ نماز کے واسطے چلے گئے۔

(۳)

جھمن کے والد ہمایوں میرزا لکھنؤ کے وثیقہ داروں میں سے تھے۔ ان کا شمار اعلیٰ طبقہ میں کیا جاتا تھا۔ اللہ کا دیا ہوا سب ہی کچھ موجود تھا۔ کسی بات کی کمی نہ تھی۔ زندگی نہایت آرام سے گزرتی تھی۔ جھمن اُن کا اکلوتا لڑکا تھا۔ رئیسوں کے بچوں کی جس طرح پرورش ہوتی ہے۔ اسی طرح جھمن نے بھی بسم اللہ کے گنبد میں پرورش پائی۔ جب کبھی اس کو معمولی شکایت بھی ہوتی۔ تو ہمایوں مرزا کا مکان اچھا خاصہ ماتم کدہ بن جاتا۔ سینکڑوں دعائیں مانگی جاتیں۔ مرادیں منتیں مانی جاتیں۔ فقیر کھلائے جاتے۔ غرضیکہ جب تک وہ اچھا نہ ہوتا۔ اس کے والدین کو کسی طرح چین نہ آتا۔ جب اس کو دایہ باہر لیجاتی۔ تو ماں امام ضامن باندھتیں۔ نظریں اتارتیں۔ اور جب وہ گھر واپس آتا۔ تو صدقہ دیا جاتا اور خیرات کی جاتی۔

جھمن جب پورے دس برس کے ہوئے تو ان کی بسم اللہ کی گئی۔ اور پاس ہی کے ایک مولوی کی سپردگی میں دیدیا گیا۔ خدا خدا کرکے ایک برس میں بغدادی قاعدہ ختم کیا۔ ہمایوں مرزا مغربی تعلیم کے بہت دلدادہ تھے۔ ان کو ارمان تھا۔ کہ "میرا جھمن بیرسٹر ہو" چنانچہ بارہویں برس انگریزی اسکول میں نام درج کرا دیا۔ اور میاں جھمن نے بجائے ابجد کے اے۔ بی۔ سی۔ ڈی

کی مشق شروع کر دی۔

ایک سال شہر میں سخت وبا پھیلی تھی۔ بیگم ہمایوں بھی اس میں مبتلا ہوگئیں یونانی اور ڈاکٹری علاج ہوئے۔ ہمایوں مرزا نے ہر امکانی کوشش کی۔ مگر ان کو کسی طرح صحت نہ ہوئی۔ اور صرف بارہ گھنٹے علیل رہ کر راہی ملک بقا ہوئیں۔

ہمایوں مرزا کے لئے یہ صدمہ بہت ہی جانکاہ تھا۔ ہر وقت غمزدہ رہتے تھے۔ لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ اور اکثر تنہائی میں ڈاڑھیں مار مار کر رویا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہؤا۔ کہ ان کو بھی دق کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ڈاکٹروں نے ان کی تفریح اور دلچسپی کے لئے بہت کچھ سامان تجویز کئے۔ لوگوں نے عقد ثانی کی ترغیب دی۔ لیکن مرزا نے کسی طرح منظور نہ کیا۔

مرزا نے اپنی زندگی سے مایوس ہوکر اپنے سامنے ہی جھمن کا عقد بہت ہی دھوم سے اس کے ننھالی رشتہ داروں میں رشیدہ کے ساتھ کر دیا۔ اس وقت جھمن انٹرنس پاس کر چکا تھا۔

شادی کے کچھ دنوں بعد ہمایوں مرزا نے بھی ایک روز قلب کی حرکت بند ہو جانے سے وفات پائی۔ اس وقت جھمن ایف اے میں تعلیم پا رہا تھا۔ مرزا کے بعد اس کا کوئی پرسان حال نہ رہا۔ اس وجہ سے تعلیم کا سلسلہ ترک کر کے گھر میں بیٹھ رہا۔

(۴)

لاڈ اور ناجائز محبت کو تربیت کے ساتھ وہی نسبت ہے۔ جو آگ کو پھونس سے یا طوفان کو کشتی سے۔ ماں باپ کبھی یہ نہیں چاہتے۔ کہ ان کی اولاد خدانخواستہ بد اطوار ہو۔ مگر حد سے زیادہ بڑھی ہوئی محبت جسے ناجائز ہی کہنا مناسب ہوگا۔ اولاد کی عادت اس زمانہ سے بگاڑنی شروع کرتی ہے۔ جس کو ناسمجھ والدین اس کی بُری سی حرکت کو بھی بچپن کی نادانی سمجھ کر ٹال دیتے ہیں۔ اور کچھ خیال نہیں کرتے۔ بزرگوں کا قول ہے کہ "پانچ برس کی عادت پچاس برس تک نہیں جاتی"۔ صحیح اور بالکل صحیح ہے۔ نامی گرامی فلاسفر ہربرٹ اسپنسر بھی اپنی تصنیف "ایجوکیشن" میں لکھتا ہے کہ "بچوں کی تربیت کا زمانہ بارہ سال کی عمر تک ہے"۔

جھمن مرزا صاحب کے اکلوتے صاحبزادے تھے۔ جس قدر بھی محبت ہوتی کم تھی۔ مرزا صاحب اور ان کی بیگم نے انہیں پالا۔ اور بڑی منتوں مرادوں سے پالا۔ جس کا نتیجہ یہ ہؤا۔ کہ لاڈلے جھمن باپ کے مرنے کے بعد ہی اتنی تعلیم پر اکتفا کر بیٹھے۔ اور کبھی ڈگری لینے کا خیال بھی پیدا نہ ہؤا۔ تعلیم کا سلسلہ چھوٹا۔ طبیعت اچاٹ ہوئی۔ کتب بینی بھی چھوڑ دی۔ اب سوائے فضولیات

بیکاری اور بیہودہ مشاغل کے دوسرا کام نہ رہا۔ جوانی کے دن۔ بیکاری اور آزادی۔ بُری صحبت اور شرمناک دلچسپیاں۔ خدا کے فضل سے دولت کی کمی نہ تھی۔ جو شوق لگا۔ دن دونا رات چوگنا ہی ہوتا گیا کوئی پوچھنے والا نہ رہا۔ جس کا ڈر ہوتا۔ اُدہر روپیہ موجود صلاح کار بھی پاک ہی تھے۔ اب میاں چھمن ایسے بیٹ بھر کر بگڑے کہ الامان والحفیظ! میلوں کی سیر۔ باغوں کی چہل قدمی۔ کوٹھوں کی تاک جھانک تھیئٹروں کی حاضر باشی اور لال پری کا شغل ——"

غرضیکہ کونسی جگہ تھی۔ جہاں وہ نہ گئے۔ اور کونسی حرکت تھی۔ جو انہوں نے نہ کی۔ شادی تو خیر باپ کی حیات ہی میں ہوئی تھی۔ اس وجہ سے کچھ دنوں بڑے چاؤ چونچلے رہے۔ پھر رفتہ رفتہ سب کچھ ندارد۔ اب تو میاں چھمن پوچھتے بھی نہیں۔ کہ رشیدہ مرتی ہے یا جیتی۔ آٹھ آٹھ دن گھر میں صورت نہیں دکھلائی دیتی +

(۵)

ان تمام عیاشیوں کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ چھمن نے ساری دولت تھوڑے ہی عرصہ میں تباہ کر ڈالی۔ اپنی تمام جائداد تلف کرنے کے بعد بھی اس کی آنکھیں نہیں کھلیں۔ آخر کار تمام رشیدہ کا اثاثہ بھی بیچ کھایا۔ اور وثیقہ بھی فروخت ہو گیا۔

اب رشیدہ کی بسر اوقات صرف سلائی پر رہ گئی۔ اور چھمن آٹھوں پہر ادھر ادھر مارا مارا پھرا کرتا جب کہیں سے کچھ ہاتھ لگ جاتا۔ تو قمار خانے میں جُوا کھیل ڈالتا۔ اگر کچھ جیت لیتا۔ تو دو چار روز عیاشی میں صرف کرتا ورنہ وہی کوچہ گردی۔ آٹھویں دسویں جب رشیدہ کے پاس آتا۔ تو پانوں کی پٹاری سے جو کچھ ہاتھ لگتا۔ لے کے چلتا بنتا۔

غریب رشیدہ ایک ہفتہ سے بخار میں مبتلا ہے۔ آج اس کی باری کا دن تھا۔ جاڑا دے کر چڑھتا تھا۔ ہڈی ہڈی میں درد۔ بخار میں تلملا رہی تھی۔ لیکن کوئی ایسا نہ تھا۔ جو بوند پانی بھی دیتا۔ چھمن غ[illegible] کے دن سے آج تک نہ دکھے۔ ان کا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ ان کی غیر محدود دلچسپیاں نہ ختم ہونی تھیں نہ ہوئیں۔

اتفاق سے آج ان کی بھی صورت دکھائی دی۔ گھر میں گھسے تو عجب شان سے۔ آنکھیں سرخ گریبان چاک۔ بٹن کھلے۔ ننگے سر۔ ٹوپی ہاتھ میں۔ جھٹکے کھاتے۔ لڑکھڑاتے سیدھے پلنگ پر گر پڑے۔ اور گرے تو ایسے گرے کہ تن بدن کا ہوش نہیں۔ ہاتھ پیر کی خبر نہیں۔ اچکن بھی نہ اتاری۔ بوٹ بھی نہ کھولا۔ پہنے ہی پہنے ڈھیر ہو گئے۔

رشیدہ بیمار اور قابل رحم رشیدہ دن بھر تکلیف اٹھاتے اٹھاتے گھنٹہ دو گھنٹہ سے غافل ہو گئی تھی - میاں جھمن کے آنے کی آہٹ پاتے ہی اٹھ بیٹھی - اور بخار میں جلتی - بھانپیں نکلتی دیوار کے سہارے ڈگمگاتی - ہچکولے کھاتی - پلنگ کے پاس پہنچی - اور پٹی کے نیچے دونو ہاتھوں سے سر کو پکڑ کر بیٹھ گئی - لائق جھمن غریب رشیدہ کو دیکھتے ہی بولے تو یہ بولے "بہت جلدی آئیں! مجھے آئے ہوئے دو گھنٹے ہو گئے - مگر بیگم صاحبہ کا مزاج ہی ٹھیک نہیں ہوتا - جب دیکھو بخار ہے - کسی طرح نخرے ہی نہیں جاتے - ہر وقت ہائے ہائے گھر کو ہسپتال بنا رکھا ہے"

رشیدہ نے سوائے خاموشی کے کچھ جواب نہ دیا - اپنے ہاتھوں کو سر پر سے ہٹا لیا - طبیعت کو سنبھالا - اور نہایت نرمی کے ساتھ پوچھنے لگی "تمہاری طبیعت کیسی ہے - آج تو چہرہ کچھ اوداس ہو رہا ہے"

جھمن "اوداس ہو رہا ہے - تو تمہاری بلا سے - اور جان پہ بن رہی ہے تو تمہاری بیزار سے تم تو اپنے بخار کو منائے پڑی رہو"

رشیدہ "جس وقت تم آئے ہو اسی وقت تو آ گئی ہوں - اکیلی تھی - ذرا لیٹ گئی - اگر تم ناراض ہوتے ہو - تو تمہارے پیچھے کبھی نہیں لیٹا کروں گی - تم بتاؤ تو سہی کہ تمہارا مزاج کیسا ہے؟"

جھمن "ہے کس طرح - تمہارے منہ پر آنکھیں ہوتیں - تو دیکھ لیتیں - سر ہے کہ پھٹا جا رہا ہے - بیٹھا تک نہیں جاتا"

رشیدہ - (بوٹ کھولتے ہوئے) میں ابھی سر دبائے دیتی ہوں - تم لیٹے رہو - میں خود ہی بوٹ اتار لوں گی"

رشیدہ کم سن نہ تھی - کہ وہ مصائب موجودہ دگزشتہ اور توقعات آئندہ کے فلسفہ کو نہ سمجھتی - اس نے سمجھا - کہ "اب اپنی حرکتوں سے شاید توبہ کر لی ہو اور میرے غمزدہ دل پر جو بیشمار صدمات کے نشان ہیں سب ان کا شمار ہو گا - اور گن گن کر تلافی مافات ہو گی" مگر ایسا نہ ہوا ———

ایک مدت کے بعد یہ دن نصیب ہوتا ہے - کہ رشیدہ مسرور ہے - پھولی نہیں سماتی - محبوب شوہر کے سر دبانے کی خدمت - - - - اُسکے سپرد ہوئی ہے - اور وہ یقین کئے ہوئے ہے - کہ "میرے جذبات محبت کو پڑھیں گے - میرے محسوسات روح کی تکمیل کرینگے - وہ سمجھیں گے - اور میرے شوق پنہاں کا جائزہ لیں گے -

میرے ارمانوں کو توجہ سے سنیں گے میری ادنیٰ سی ادنیٰ آرزو کو بھی دیکھیں گے اور پورا کرینگے -

اور وہ سمجھیں گے۔ کہ میرے اوراق زندگی۔ محبت۔ شوق اور وفا سے مملو ہیں۔ یعنی میری حیات پر سوائے چھمن اور محبت کے کچھ نہیں لکھا ہے" ——— مگر آہ! ایسا نہ ہوا ———"

رشیدہ۔ فرشتہ صفت۔ نیک خصلت۔ پاک طینت۔ رشیدہ۔ جسے اس وقت بھی خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ تو ۱۰۲ ڈگری کا بخار ہے۔ اور جس نے غذا کے نام صبح سے قسم بھی نہیں کھائی ہے۔ نہایت استقلال کے ساتھ بوٹ اور جرابیں اتار کر دحشی چھمن کا سر دبانے لگی۔ پاؤ گھنٹے کے بعد میاں چھمن تیوری پر بل ڈال کر بولے "رہنے دو۔ میرا سر نہ دباؤ۔ تمہارے ہاتھ تو دوزخ کا کندہ بن رہے ہیں آرام آنے کے بدلے میرا سارا سر جل اٹھا"۔

رشیدہ "(نہایت منت اور سماجت کے لہجے میں) اچھا تو میں اپنا ہاتھ ٹھنڈے پانی میں بھگو لوں"۔

چھمن "(غصہ سے) جی نہیں۔ معاف کیجئے! میرا پیچھا چھوڑ دو! بدتمیز ——— کہیں کی ———"!!

خدا جانے اس فقرے میں کیسے نشتر پوشیدہ تھے۔ کہ برسوں کا غم۔ مدتوں کا بخار آنکھوں کی راہ سے خون ہو کر بہنے لگا۔ وہ اب فرط گریہ سے بیتاب تھی۔ اس کی ہچکی دادخواہانہ انداز سے مضطرب تھی۔ اس کے آنسوؤں کی فراوانی اس کے گہرے غم و الم کا پتہ دے رہی تھی۔ اس کی مظلوم ادائے استرحام درد سے معمور تھی۔ اس کا معصوم قیافہ بیکسی اور محرومی کا آئینہ تھا۔ اس کے آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں جذبات کی خستگی کی دو تصویریں تھیں۔

(۶)

چھمن کی مغرور اور مجتنب اداؤں اور غم نصیب رشیدہ کی معصومیت بھری التجاؤں کا ایک دلخراش سین ہے۔ جو **درس عبرت** کے عنوان سے قلمبند کیا گیا ہے۔

آج بھی دنیا باوجود اپنے ادعائے تہذیب و مدنیت کے ہٹیک ٹھیک گذشتہ عہد وحشت اور بہیمیت کا نمونہ ہے۔ کسی زمانہ میں عورت اگر احترام کے قابل نہ تھی۔ اگر اسے اعتماد و محبت کا سزاوار نہ سمجھا جا سکتا تھا۔ اور اگر وہ دلبستگی کی کوئی چیز نہ تھی۔ وہ ایک خندۂ زہر آلود اور قہقہۂ استہزاء سے زیادہ قدر و قیمت نہ رکھتی تھی۔ تو آپ دیکھ لیں کہ آج بھی باوصف اس کے کہ دنیا دعوائے عزت نفس اور شرف مساوات پیش کر رہی ہے۔ اس جنس محترم کا معیار شخصیت کچھ زیادہ بلند نہیں ہوا۔ وہ تو پہلے بھی مظلوم تھی۔ اور اب بھی ہے۔ پہلے بھی تمہاری بہیمیت کا شکار تھی اور اب بھی تمہاری ہوس

کی اسیر ہے۔ اس کے جمال شرافت کو اگر پہلے مجروح کیا گیا تھا۔ تو آج بھی وہی سلوک اس کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کی الوہیت اور دیوبیت سے کل اگر تمسخر کیا جاتا تھا۔ تو آج فرمائیے۔ اس کی عفت و شعریت کی تضحیک سے کون چوکتا ہے۔ اگر پہلے اس کے ساتھ گستاخیاں روا رکھی جاتی تھیں۔ اگر زمانہ تاریک میں اس کی حقیقت سے بے ادبیاں کی جاتی تھیں۔ تو للہ بتائیے۔ کہ اس شرمناک برتاؤ سے آج کس کو شرم آتی ہے۔ تعجب ہے کہ دنیا جس قدر روشنی۔ تہذیب اور مدنیت کی علم بردار بنی۔ اس قدر اس کی روح تاریک۔ اس کی خصلت آوارہ اور اس کی شعریت گم ہوتی گئی؟ ——— شادی بیاہ کیا چیز ہے؟ دو ہستیوں کے اشتراک کا حل۔ دو روحوں کے اتحاد خالص کا نام نکاح ہے۔ اور یہ وہ مقدس عہد ہے۔ جس کو نوع انسان۔ دلی مسرت و شوق سے انجام دیتی ہے۔ کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ ہم اس کو کسی نام سے کیوں نہ تعبیر کریں۔ یہ محبوبانہ اشتراک اک روحی عہد و پیمان کی شکل سے ہو۔ یا عقد اور نکاح کے نام سے۔ اصل میں سچی شادی اور حقیقی نکاح تو روحوں کے ملاپ اور اتحاد کا نام ہے۔ ایسا اتحاد جس میں جھگڑے کا خیال بھی نہ پیدا ہو۔ اور ایسا ملاپ جس کی تفریق صرف موت کر سکے۔ یہ اتحاد ایک ایسا اتحاد ہوتا ہے۔ جس میں کل چیزیں واحد نظر آتی ہیں۔ سارے اغراض مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ تمام امتیاز اٹھ جاتے ہیں۔ اور زمانہ حال دائمی مسرتوں سے معمور نظر آتا ہے۔ اور ساری کائنات روشنی اور نکہت کا رنگین ملبوس پہن لیتی ہے۔

جب دو وجود اس طرح محبت کریں جب دو ہستیاں مل کر اس طرح آپس میں ایک ہو جائیں۔ تو فی الحقیقت ایسی دو روحوں کا یہی حقیقی اتحاد اور نکاح ہے۔ قاضی۔ پادری۔ مجسٹریٹ یا دوسرے گواہوں اور تقریب خواہوں کے سامنے گو اس اتحاد کا اعلان کسی وجہ سے ضروری ہو۔ مگر زیادہ ضرورت اس اتحاد کی ہے۔ جس میں روحیں مشترک اور محبتیں متحد۔ روحوں کا اشتراک! ہائے اس اتحاد کی خوشی نہ پوچھئے۔ وہ دو صبحیں ہیں۔ جو شام سے ایک ساتھ ملنے کی متوقع ہیں۔ وہ دو دنیائیں ہیں۔ جن کی صبح تمنا ایک ہی ہے۔

پھر حیف ہے اس اتحاد پر۔ جس کی بنا محبت پر نہ ہو۔ تاسف اس عہد پر جس کی بنیاد اخلاص پر قائم نہ ہو۔

کیا ایسا نکاح مذہبی فرض و ذمہ داری سے سبکدوش کر دیتا ہے۔ کیا اس قسم کا حقیقت سے دور اتحاد۔ اخلاق کی خوبیوں اور محاسن میں داخل ہے۔ ایسا بیاہ کیا نیکی کا کوئی بہترین طریق ہے۔ ایسا اشتراک جنسی کیا سوسائٹی کے امن و حفاظت کے لئے کوئی مفید نتیجہ پیدا کریگا۔

بہت کم لوگ ہیں - جنہیں - ماؤں - بہنوں اور بچیوں کی تکالیف کا حقیقی علم ہو - ایسی بیشمار بیبیاں ہیں - جو رشیدہ کی طرح اپنے خاوند کی بوسٹک شو کی چرچراہٹ سے خوف زدہ ہو جاتی ہیں - ایسی بہت سی معصوم روحیں ہیں - جو اشتراک جنسی کا ایک مہمل ترین نتیجہ ہیں - اور بہت سے ایسے بچے ہیں - جو اپنے باپ کو آتے ہوئے دیکھ کر ڈر کے مارے کونے ڈھونڈھنے لگتے ہیں -

بہت تھوڑے لوگ ہیں - جو ان طمانچوں کی تعداد و شدت سے واقف ہوں - جو ہر روز ان معصوم رخساروں - ان بوسہ گاہ شرافت گالوں پہ پڑتے ہیں - جن کی لطافت و رنگینی سے کائنات روح کا ذرہ ذرہ رنگین ہے - کتنے ہیں وہ لوگ جو ان خوفناک راتوں کا علم رکھتے ہوں - جن میں مسکین روحیں - رشیدہ کی طرح ذلت و حقارت کی ٹھوکریں کھایا کرتی ہیں -

سوسائٹی ایسے گھرانوں اور ایسے انسانوں سے کیا فائدہ اٹھا سکتی ہے - قوم کس طرح مہذب اور ترقی یافتہ ہو سکتی ہے - جہاں بے رحم اور خود غرض لوگ زندگیاں بسر کرتے ہیں - اور اپنے اندر اخلاق و انصاف کی کوئی روح موجود نہیں رکھتے -

سنو! اے خود غرض اور بے رحم انسانو!! تم بچوں کی فیاض ماؤں اور حلم و محبت کی تصویر بیبیوں سے لطف و انصاف سے پیش آؤ - عورت تمہارے سامنے اپنا تمام مال و متاع رکھ دیتی ہے - وہ تمہارے حضور اپنا انبساط روح - اپنی امنگیں اور اپنی شعریت - اپنی محبت اور اپنا جذبات سے معمور دل پیش کر دیتی ہے - تمہارا سلوک اس کے ساتھ - رحم - اخلاق - مساوات - محبت اور وفا کا ہی ہونا چاہیئے - محبت کا اشتراک روح کے لئے حقیقی اتحاد ہے - کیسی تہذیب - کہاں کی معاشرت کدھر کا ارتقا اور کیسا مغرب - تم اپنی راحت تلاش کرو - کہ راحت نام ہے - صرف عورتوں کی حقیقی عزت کرنے کا -

محبت والوں کے گھر - اچھے انتظام اور عمدہ سلیقہ کا بہترین نمونہ ہوتے ہیں - ایسے گھر کے چولھے کی ایک ایک اینٹ تہذیب و تمدن کی کامل نشانی اور مکمل بنیاد ہے - یہاں برکتوں کا نزول ہے - یہاں برکتوں کا سایہ ہے - یہاں محبتیں جھولا جھولتی ہیں - ایسے مکان - ایسے گھر - ایسے خوشگوار تعلقات ارتقاء قومیت کا زینہ ہیں - اگر یہ نہیں ہو سکتا - اگر تم ایسا نہیں کر سکتے - تو تم خدا کے خلاف جنگ کر رہے ہو - اور قومیت کو برباد - اس لئے جب تم دوسروں کی حفاظت اور سختی سے نگرانی کر رہے ہو - اور اپنے آپ کو احتساب سے بالاتر سمجھتے ہو - تو تم کچھ اچھے انسان نہیں ہو - اور صرف ایثار اور قربانی کا نام لیکر تم خدا کو خوش نہیں کر سکتے - جب

تک تمہارا عمل بھی قول کا مؤید نہ ہو۔ خوب سمجھ لو اور اچھی طرح سُن رکھو کہ انسانیت کا یہ نصف بہترین جمیل حصہ جس کو "عورت" کہتے ہیں ارتقائے انسانی کا منبع ہے، یہ انسانوں کی ماں ہے" اسی ایک لفظ کی عظمت پر دنیا بھر کے بنی نوع انسان کی رنج وخوشی، فراغت و راحت، علم و دولت، حریت اور صداقت کا انحصار ہے، یہ محبت کی قربان گاہ پر اپنی حیات رہن کرتی ہے تاکہ دوسروں میں اعتماد روح پیدا ہو، اس کی قدر اگر نہ کی، اس کی عزت سے اگر انحراف کیا تو خوب یاد رکھنا کہ ایک نہ ایک دن تم بھی تباہ و برباد ہو جاؤ گے +

سجدۂ شکر

(جناب شیخ محمد انعام الحق صاحب ہوشیار پوری)

(۱)

والدہ کے انتقال کے بعد چند روز کے اندر ہی میری زندگی میں ایک زبردست انقلاب آگیا۔ مستقبل کے متعلق دل خوش کن اور حوصلہ افزا ارادے حسرت و یاس سے بدل گئے۔ کل تک میں اپنے ہم جماعتوں اور دوستوں کے نزدیک ایک قابل رشک خوش قسمت نوجوان تھا۔ لیکن والدہ کی آنکھیں بند ہوتے ہی ایک بیکس و غم نصیب انسان رہ گیا۔ مجھے والدہ سے بے انتہا محبت تھی۔ ان کے انتقال کا صدمہ بھی بہت زیادہ ہوا لیکن اس انقلاب کی بڑی وجہ اس صدمہ کی بجائے قبلہ والد صاحب کے طرز عمل کی غیر متوقع تبدیلی تھی۔

میں انٹرنس کا امتحان مقامی اسلامیہ ہائی سکول سے پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف۔ ایس۔ سی میں داخل ہوگیا۔ قبلہ والد صاحب اور والدہ مرحومہ نے یہ طے کر لیا تھا کہ ایف۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کرنیکے بعد مجھے انجنیری کی تعلیم کیلئے ولایت بھیج دیا جائے۔ کالج کی دو سال کی تعلیم کے بعد میں نے امتحان دیا۔ اور مئی میں فارغ ہو کر گھر چلا گیا۔ پرچے بہت اچھے ہوگئے تھے۔ پروفیسروں۔ دوستوں اور خود قبلہ والد صاحب کو میری کامیابی کا پورا یقین تھا۔ اسلئے ولایت کی روانگی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ طامس کک اور دوسری جہاز راں کمپنیوں کے قواعد و شرائط منگوالئے گئے۔ ضروری اشیا جمع ہونے لگیں۔ اپنی برادری میں انگلستان کا عزم کرنیوالا میں پہلا نوجوان تھا۔ اسلئے سارے شہر میں خوب چرچا ہوگیا۔ رشتہ دار عورتوں نے مذاق سے کہنا شروع کر دیا "کہیں ولایت سے میم نہ لے آنا ورنہ ہم دونوں کو گھر میں نہ گھسنے دینگے"۔ محلہ کی مسجد کے مولوی صاحب جن سے میں نے بچپن میں قرآن شریف پڑھا تھا جب موقع ملتا ولایت میں مذہبی احکام پر کاربند رہنے کی تاکید کرتے۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ میں، میرے والدین، ہمشیرہ، رشتہ دار اور دوست خوش ہو رہے تھے۔ لیکن قسمت اس مسرت پر ہنس رہی تھی۔ مصائب میرا انتظار کر رہے تھے۔

(۲)

جون کا مہینہ تھا کہ یکایک شہر میں ہیضہ پھوٹ پڑا۔ ہمارے محلے میں بھی ایک دو کیس ہوگئے۔ ایک روز میں شام کے وقت ٹینس کھیل کر باہر سے آیا تو معلوم ہوا کہ اس موذی مرض نے میری پیاری والدہ پر بھی حملہ کر دیا ہے

اور حالت نازک ہے۔ ساری رات آنکھوں میں کٹی۔ سول سرجن قبلہ والد صاحب کے دوست تھے انہوں نے ہر چند کوشش کی رات کو وہ اور لیڈی ڈاکٹر دونوں ہمارے مکان پر ہی رہے۔ لیکن آہ موت کا کوئی علاج نہیں۔ صبح سویرے طلوع آفتاب کے ساتھ مرحومہ کی شمع حیات گل ہوگئی اور میرے اور میری بہن کے مستقبل پر دکھوں اور مصیبتوں کی بھیانک تاریکی چھاگئی۔ نزع سے تھوڑی دیر پہلے مرحومہ نے قبلہ والد صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اشکبار آنکھوں سے التجا کی "میرے بچوں کو اچھی طرح رکھنا۔ .... لڑکی کا رشتہ کسی اچھی جگہ کرنا" صرف اسقدر کہکر اُن کی آواز رقت اور ضعف سے دب گئی اس کے چند منٹ بعد وہ ہمیشہ کیلئے خاموش ہوگئیں۔ قبلہ والد صاحب نے والدہ مرحومہ کے سامنے مجھے اور میری بہن کو سینے سے لگا کر عہد کیا کہ ان دونوں کو ہمیشہ جان سے عزیز رکھوں گا اور کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دونگا۔ لیکن بعد کے واقعات نے بتایا کہ والد نے ہمیں قبلہ والد صاحب کو سونپنے کی بجائے حوادث چرخ کے حوالے کیا تھا۔

والدہ کے انتقال کے تیسرے چوتھے روز ہی قبلہ والد صاحب کی دوسری شادی کے متعلق پر اسرار طریق پر سلسلہ جنبانی شروع ہوگئی۔ چہلم کے ایک ہفتہ کے بعد انہوں نے نکاح کر لیا۔ اور ہماری سوتیلی والدہ آگئیں۔ اکثر رشتہ داروں۔ محلہ والوں اور قبلہ والد صاحب کے دوستوں نے بہت بُرا منایا۔ ہم دونوں بہن بھائی جوان تھے اُن کی عمر بھی پچاس سال کے قریب تھی اور پھر پہلی بیوی کے انتقال کے چند روز بعد ہی نکاح کر لینا اُن کے نزدیک ناقابل معافی عجلت تھی۔ مگر میرے خیال میں یہ کوئی زیادہ قابل اعتراض بات نہ تھی۔ پہلی بیوی کی اولاد کی موجودگی میں شادی کر لینا کوئی عیب نہیں لیکن شادی کے بعد مًا قبلہ والد صاحب کے طرز عمل میں جو تغیر ہوا وہ ضرور قابل افسوس اور موجب حیرت ہے۔

(۳)

میری دوسری والدہ کس خاندان سے تھیں؟ ان کے والدین نے شادی کے قبل قبلہ صاحب سے کونسی کونسی شرائط لکھوائیں؟ والدہ مرحومہ کے انتقال کے بعد اس قدر جلد شادی ہوجانے کی کیا وجہ تھی؟ مَیں ان خانگی امور کو بیان کرنا نہیں چاہتا۔ قصہ مختصر یہ کہ شادی ہوگئی اور قبلہ والد صاحب نے ہم دونوں بہن بھائیوں سے یکدم بے اعتنائی برتنی شروع کردی۔ چند روز میں انہوں نے مجھے تنہائی میں بُلا کر صاف کہہ دیا "اب تم جوان ہو میں تمہیں آیندہ تعلیم نہیں دلا سکتا اور کسی قسم کی امداد کی توقع بھی مجھ سے نہ رکھو۔ اب تم کھانے کمانیکے قابل ہو۔ کماؤ اور اپنی خوراک لباس اور رہائش کا خود انتظام کرو" ناظرین! قبلہ والد صاحب کے اس حکم کو پڑھکر حیران ہونگے جس وقت انہوں نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے مجھے بھی اپنے کانوں پر اعتبار نہ آتا تھا یہ سُنکر بڑی دیر تک سکتے کے عالم میں کھڑا رہا قبلہ والد صاحب یہ کہہ کر زنانہ میں تشریف لے گئے۔ وہاں میرا جانا سوتیلی والدہ کے آنے کے روز ہی بند ہوچکا تھا۔ ورنہ شاید وہاں جاکر

انکی خدمت میں کچھ عرض کرتا۔ ان کے تشریف لے جانے کے بعد میں دیر تک عالمِ تنہائی میں کھڑا روتا اور اپنی آئندہ زندگی کے متعلق غور کرتا رہا لیکن میرے انکار سے دبے ہوئے دماغ نے کسی نتیجہ پر پہنچنے سے انکار کر دیا۔

آہ میں تو ولایت جانیکی تیاریاں کر رہا تھا۔ میرے حالات سے بے خبر دوست خطوط کے ذریعہ روانگی کی تاریخ دریافت کر رہے تھے لیکن یہاں کچھ اور ہو رہا تھا۔ قبلہ والد صاحب کا یہ حکم سن کر میں دن رات متفکر رہنے لگا۔ میرے سامنے ایک تاریک اور پُرمصائب مستقبل تھا۔ کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟ آئندہ کے لئے میرا ذریعہ معاش کیا ہوگا؟ یہ سوالات ہر وقت میرے زیر غور رہنے لگے۔ اسی طرح دس گیارہ روز گذر گئے۔ اس عرصہ میں مجھے کئی بار اشارتاً اور صاف الفاظ میں چلے جانے کو کہا گیا۔ ان ایام میں میرے اور میری بہن کے ساتھ کیا سلوک ہوا؟ یہ بڑی ہی المناک داستان ہے۔ اس میں ناظرین کے مطلب کی صرف یہ بات ہے کہ آخر ہم دونوں نے یہ محسوس کیا کہ ہمارے لئے اس گھر میں آہ اس گھر میں جہاں پیدا ہوئے، پلے، بڑھے کوئی جگہ نہیں۔ لیکن آخر جائیں تو کہاں جائیں؟ ننہیال کے رشتوں میں صرف ایک دائم المریض بیوہ خالہ زندہ تھیں جن کی آمدنی پہلے ہی محدود تھی دوسرے قریبی رشتہ داروں میں البتہ اور زدتین صاحب حیثیت آدمی تھے لیکن وہ سب بسلسلۂ ملازمت دور دراز مقامات پر مقیم تھے۔ علاوہ ازیں قبلہ والد صاحب کے مراسم بھی اُن سے اچھے نہ تھے اسلئے اُن کو شروع سے ہی ہم سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ ایک روز ایک نہایت ہی رنجدہ ناقعہ ہوا جو ہم دونوں بہن بھائیوں کیلئے ناقابل برداشت تھا۔ ہم نے اللہ کا نام لیکر قبلہ والد صاحب کی قدمبوسی کی ان کو اور اپنے جدی مکان کو حسرت کی نگاہوں سے دیکھتے اشکبار آنکھوں سے صرف تن کے کپڑوں کو لیکر اسی بیوہ خالہ کے مکان میں اُٹھ آئے۔ قبلہ والد صاحب میری ناکتخدا ہمشیرہ کو بھیجنے کیلئے تیار نہ تھے۔ لیکن میری سوتیلی والدہ کی یہی خواہش تھی۔ آخر انہوں نے معمولی لیت و پیش کے بعد اجازت دیدی۔

دو روز رنج و غم میں غرق رہنے اور قسمت کو کوسنے کے بعد آخر میں نے فیصلہ کیا۔ کہ مجھے اس طوفانِ مصائب میں عورتوں کی طرح رونے کی بجائے مردوں کی طرح ثابت قدم رہ کر ان کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ میرے دوستوں نے مجھے طرح طرح کے مشورے دیئے۔ بعض محلے والوں نے قانونی چارہ جوئی کرنے کو کہا اس کے لئے ہر طرح کی امداد دینے کا بھی یقین دلایا لیکن میں نے اپنے لئے یہی پسند کیا کہ ایک سعادتمند بیٹے کی طرح تمام ہونے والے رنجدہ واقعات کو بھول جاؤں اور لاہور جا کر اپنے لئے کوئی ذریعہ معاش تلاش کروں۔ بعض دوستوں نے میری مالی مدد بھی کرنی چاہی لیکن میں نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔ ان میں سے دو تین نے مجھ سے کچھ روپے قرض لئے ہوئے تھے۔ البتہ وہ ضرور واپس لے لئے۔ اپنے ہاتھ میں سونے کی ایک انگشتری تھی اس کو فروخت کیا۔ اپنے اور ہمشیرہ کے معمولی کپڑے بنوائے۔ ضروری سامان سفر خرید کیا اور چند روپے ہمشیرہ کے خرچ کے لئے خالہ کو دیئے اور اللہ کا نام لے کر لاہور کو روانہ ہو گیا۔

(۴)

لاہور پہنچ کر میرے دل کی کیا کیفیت تھی یہ الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ یہاں مجھے احباب الوداع کہنے کی تیاریوں میں مصروف تھے لیکن انہیں کیا پتہ تھا کہ خوش قسمتی نے خود مجھے الوداع کہہ دیا ہے اب میں ایک کامیاب انجینیر بننے کی بجائے فاقہ کش بے روزگار تھا۔ لاہور پہنچ کر ایک بے تکلف دوست کے ہاں قیام کیا انہیں میرے کچھ حالات معلوم تھے۔ باقی خود بتائے۔ ایک ایف۔ ایس۔ سی پاس کرے تو کیا کرے لیکن میرے ادبی مذاق نے اس نازک وقت میں میری مدد کی۔ غور و فکر کے بعد یہ طے ہوا کہ کسی اخبار یا رسالے میں ملازمت تلاش کی جائے کیونکہ مضمون نگاری کا مجھے سکول کے زمانے کا شوق تھا۔ کالج کی میگزین کے علاوہ بعض بلند پایہ ادبی رسائل و اخبارات میں میرے مضامین بارہا شایع ہو چکے تھے۔ ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ اس دوست کے بھائی اور کالج کے دو پروفیسروں کی کوشش و سفارش سے جلد ہی ایک اردو روزنامہ میں مترجم کی جگہ مل گئی خدا کا شکر کرکے کام شروع کر دیا۔

ملازمت کے بعد میں نے دوست کے مکان پر قیام مناسب نہ سمجھا حالانکہ ان کا اور اُن کے بھائی کا اصرار یہی تھا۔ بھاٹی دروازہ کے باہر شہر سے ذرا دور ایک بلڈنگ میں چھوٹا سا کمرہ کرایہ پر لیلیا۔ کھانے کا انتظام بھی وہیں ہوگیا۔ بلڈنگ خاصی بڑی تھی چالیس کے قریب کمرے ہونگے۔ جن میں کچھ ملازم پیشہ باقی کالجوں کے طالب علم رہتے تھے۔ کافی رونق تھی۔ لیکن میں پریشان اور اداس ہی رہتا۔ اب میں طالب علموں کی بے فکر زندگی پر رشک کرتا تھا۔ حالانکہ کچھ روز پیشتر خود اُن کے لئے باعث رشک تھا۔ کل تک میں ایک امیرزادہ تھا لیکن آج ایک مصیبت زدہ مفلس۔ میں افلاس کو ایک جرم کی طرح چھپاتا تھا۔ سوائے ایک دو کے تمام دوستوں کے ہاں آنا جانا ترک کر دیا تھا۔ اپنے ٹھکانے کا پتہ بھی کسی کو حتی الامکان نہ دیتا پاس کی بلڈنگ میں میرے دو ہم جماعت رہتے تھے اُن سے بھی ذرا آنکھ بچا کر آتا جاتا۔ خوشحالی کے بعد افلاس ایک بہت بڑا عذاب ہے۔ البتہ بلڈنگ میں میری تھوڑی بہت بے تکلفی ایک بی۔ اے کے طالب علم ریاض سے ہوگئی تھی۔ یہ ضلع لدھیانہ کے ایک معزز متمول خاندان کا نہایت ہی صالح نوجوان تھا۔ ادبی مذاق بھی رکھتا تھا۔ رفتہ رفتہ میرے تمام حالات اس کو معلوم ہوگئے وہ اکثر میرے ساتھ اظہار ہمدردی کیا کرتا تھا۔ اس کی والدہ بھی سوتیلی تھی لیکن باوجود اس کے والد کا طرز عمل بہت قابل تعریف تھا۔ وہ اس کا ہر طرح سے خیال رکھتے۔ ایک بار ریاض معمولی طور پر علیل ہوگیا کسی طرح اُن کو بھی خبر ہوگئی فوراً لاہور آگئے۔ مجھے اکثر ریاض کے والد کے طرز کو دیکھ کر قبلہ والد صاحب کی بے اعتنائی کا خیال آجاتا۔ میں نے کئی بار ریاض کو اُس کی خوش قسمتی پر مبارکباد بھی دی۔ جس کے جواب میں وہ ہمیشہ مسکرا کر خاموش ہو جاتا۔

اگر لاہور پہنچکر ریاض سے واقفیت نہ ہوتی تو میری زندگی ناقابل برداشت طور پر غمناک ہو جاتی۔

(۵)

اسی طرح تین چار مہینے گذر گئے۔ مالک اخبار میرے کام سے بہت خوش تھا۔ تنخواہ میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ میں اپنے اخراجات کیلئے بیس پچیس روپیہ رکھ لیتا۔ باقی ہمشیرہ کے لئے خالہ کو بھیج دیتا وہ ان میں سے صرف چند روپے صرف کرتیں باقی رقم انہوں نے ہمشیرہ کے جہیز کیلئے جمع کرنی شروع کر دی تھی۔ کیونکہ ان کو قبلہ والد صاحب سے کسی قسم کی امید نہ تھی ملازمت کے علاوہ میں نے بی۔ اے کے امتحان کی تیاری بھی شروع کر دی تھی ریاض اور میں اکٹھے مطالعہ کرتے۔ مگر آہ قدرت کو میرا اطمینان منظور نہ تھا۔ ایک روز جب میں دفتر سے گھر آنے لگا تو خالہ کا تار ملا کہ تمہاری ہمشیرہ پرسوں سے ڈبل نمونیہ سے بیمار ہے حالت نازک ہے فوراً چلے آؤ۔ تار پڑھکر میرے ہوش و حواس جاتے رہے۔ جھٹ پٹ منیجر سے ملکر رخصت کا انتظام کیا۔ گاڑی کا وقت قریب تھا۔ بھاگا بھاگا گھر آیا۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ ریاض بھی اپنے وطن چلا گیا ہے اس کو ایک ضروری خط آیا تھا۔ میں نے کمبل اور کرایہ لے کر اسٹیشن کا رُخ کیا اور بہزار دقت گاڑی پر سوار ہو سکا۔

رات کے دس بجے کے قریب گاڑی منزل مقصود کو پہنچی۔ ابھی میں خالہ کے مکان کی گلی کی نکڑ پر تھا کہ نالہ و شیون کی آواز سُنی۔ مکان کے اندر جاکر دیکھا تو میری پیاری لیکن بدنصیب بہن میرا انتظار کرتے کرتے ہمیشہ کیلئے خاموش ہو چکی تھی۔ جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ صبح کو اُسے سپرد خاک کر دیا۔ مجھے اس کی موت کا رنج بے اندازہ تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ صدمہ قبلہ والد صاحب کے طرز عمل کا تھا۔ تین چار روز وہ بیمار رہی لیکن انہوں نے بار بار کی اطلاع کے باوجود خبر نہ لی۔ جب معلوم ہوا کہ حالت نازک ہے تو چپکے سے دہلی کو روانہ ہو گئے۔ اور وہ مرتے دم تک اُنہیں یاد کرتی رہی۔ ایسا کرنے کے لئے قبلہ والد صاحب کو کس نے مجبور کیا؟ میرے خیال میں یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں؟ والدہ صاحبہ بھی عیادت و تعزیت کیلئے تشریف نہ لائیں۔

اب میں ہر لحاظ سے لٹ چکا تھا۔ میرے لئے وطن ٹھہرنا ناممکن تھا۔ چھٹے روز ہی لاہور واپس آگیا۔ اس صدمہ نے مجھے کام کرنے کے ناقابل کر دیا۔ گھر سے ہی پندرہ روز کی درخواست رخصت لکھ کر دفتر بھیجدی اور دن رات دروازے بند کرکے اپنے کمرے میں لیٹا رہتا۔ اب میرے خیالات کچھ عجیب ہو گئے تھے۔ میں خدا کو ایک ایسی اندھی طاقت سمجھنے لگا تھا۔ جو کسی قاعدے اور اصول کی پابند نہیں۔ میرا خیال تھا کہ دنیا میں رحم، انصاف اور محبت کی ایسے الفاظ سے زیادہ وقعت نہیں جو کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہوتے۔ اور نظام کائنات پر خبیث روحیں اور ظالم طاقتیں قابض ہیں۔ میں نے ان ایام میں ایک زبردست مضمون بھی لکھا جس میں اس امر پر زور دیا گیا تھا کہ بیوی کے انتقال پر اولاد کی موجودگی میں دوسری شادی قانوناً بند کر دینی چاہئے یا کم از کم قانوناً پہلی بیوی کی اولاد کی پرورش اور حقوق کی حفاظت کا تسلی بخش انتظام ہونا چاہیئے۔ غرضیکہ میری حالت رنج و غم کی شدت کی وجہ سے

دیوانوں کی سی ہوگئی تھی۔

مجھے لاہور پہنچے کئی روز ہو چکے تھے۔ لیکن ریاض ابتک واپس نہ آیا تھا۔ آخر وہ کافی انتظار کے بعد چھٹے ساتویں دن شام کے وقت لاہور پہنچ گیا۔ میں نے ہمشیرہ کے انتقال کی اطلاع وطن سے ہی اس کے گھر کے پتہ پر دیدی تھی۔ اس لئے آتے ہی نہایت ہمدردانہ طریق پر اظہار افسوس کیا۔ تسلی دی۔ گرم پانی منگوا کر میرا ہاتھ منہہ دھلوایا۔ کپڑے تبدیل کرائے اور اصرار کر کے کھانا کھلایا۔ اور بہت دیر تک پاس بیٹھا رہا اس کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ریاض کو زکام ہو رہا تھا میں نے وجہ پوچھی تو اُس نے کہا "یونہی سردی سے ہوگیا ہے" اس کا چہرہ بھی بہت کچھ اترا ہوا تھا۔ میں نے زکام اور سفر اس کی وجہ سمجھی۔ جب میں نے سوال کیا کہ گھر کیوں گئے تھے اور اتنی دیر سے واپس کیوں آئے؟ تو اس نے صرف اتنا کہا کہ ایک ضروری کام تھا۔ میں نے اپنی پریشانی کی وجہ سے تفصیل نہ پوچھی۔

ریاض کے جانیکے بعد میں کمرہ بند کر کے چارپائی پر لیٹ گیا لیکن نیند کہاں۔ رات کے بارہ بجے کے قریب مجھے سخت پیاس محسوس ہوئی۔ صراحی خالی تھی۔ گلاس لے کر صحن میں نلکے سے پانی لینے گیا تو خلاف معمول ریاض کے کمرے میں روشنی دیکھی حالانکہ وہ ہمیشہ دس بجے کے بعد ضرور سو جایا کرتا تھا۔ پانی پی کر جب اُس کے کمرے کے قریب گیا تو معلوم ہوا کہ کواڑ بھی اچھی طرح بند نہیں۔ جب کمرے کے اندر داخل ہوا تو عجیب منظر دیکھا۔ ریاض کرسی پر بیٹھا زار و قطار رو رہا تھا۔ میز پر دو خط لکھکر رکھے ہوئے۔ ہاتھ میں ایک سفید سفوف کی پڑیا تھی میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بار بار دریافت کرنے پر اُس نے کہا "تم بہت بے وقت آئے اگر نہ آتے تو اچھا ہوتا" یہ کہہ کر دونو خط جو اُس نے ابھی لکھکر میز پر رکھے تھے۔ میرے ہاتھ میں دیدیئے۔ جن کو پڑھکر میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے فوراً سفید سفوف کی پڑیا ریاض کے ہاتھ سے چھین کر ضایع کر دی۔ اُسکو بمشکل چُپ کرایا۔ اس کے بعد اور بہت سی باتیں ہوئیں۔

میں ریاض کو ایک خوش قسمت اور زندہ دل نوجوان سمجھتا تھا کیونکہ باوجود دوسری شادی کر لینے کے اُس کے والد کا طرز عمل بہت ہی قابل تعریف تھا۔ ریاض بظاہر کبھی بھی افسردہ نظر نہ آیا اور اس کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر طرح سے خوش ہے۔ اپنی اور اس کی حالت کا موازنہ ہی میری پریشانی کی بڑی وجہ تھی۔ لیکن میں غلطی پر تھا آج مجھے حقیقت معلوم ہوگئی۔ ریاض نے بہت ہی دکھ بھرے لہجے میں اپنے گھر کے حالات بتائے جو انتہائی دردناک تھے۔ میں ان کو یہاں لکھنا مناسب نہیں سمجھتا۔ اس کی سوتیلی والدہ نے اُس کی بہن کو زہر دے کر مروا ڈالا تھا۔ ریاض کے گھر جانے کی یہی وجہ تھی۔ وہاں جا کر اُس کو جو حالات پیش آئے وہ بالکل ناگفتہ بہ ہیں۔ اب وہ خودکشی کیلئے تیار تھا۔ سفید سفوف پسا ہوا سنکھیا تھا۔ ان دو خطوں میں سے ایک میرے نام تھا اور دوسرا

ارشاداتِ عالیہ

(از حضرت کوکب شاہجہانپوری)

دامن میں تار ہے نہ گریباں میں تار ہے
سینے کے ایک تارِ نفس ہی وہ خار ہے

فرصت کہاں جو سعیِ تکمیلِ آرزو
ہر لمحۂ حیات ہوا پر سوار ہے

میری نوردِ عشق میں مٹی ہوئی خراب
اُن کو قدم بھی خاک پہ رکھنے سے عار ہے

اک گرد باد چاہئے مشتِ غبار کو
کیا اعتبارِ ہستیِ بے اعتبار ہے

تصویرِ اضطراب ہے اشکوں میں مرتعش
آئینہ سازِ گریۂ بے اختیار ہے

بھر دی ہیں میرے دل میں تمنا نے بجلیاں
ہر ذرہ حسنِ یار کا آئینہ دار ہے

دنیا میں حسنِ کارِ فطرت کہاں نہیں
ہر دل فریب خوردۂ رنگِ بہار ہے

پھر ہنس رہے ہیں زخمِ جگر پارہ پارہ
پھر اس چمن میں آمدِ فصلِ بہار ہے

نذرِ فریبِ وعدۂ فردا ہوئی حیات
کچھ حدِ آزمائشِ امیدوار ہے

پامالیِ مزار کا کیونکر ادا ہو شکر
ہر ذرۂ مزار چراغِ مزار ہے

کوکب نشاطِ خندۂ بیمار ہے شباب!
افسردہ کچھ خزاں سے بھی اپنی بہار ہے

مرجان خانم

اصحاب ڈراما

سلطان ہارون رشید	مرجان خانم ایک حسین پاکدامن مغنیہ
ابرار۔ ظالم ڈاکو	فہمید۔ اندھے کنوئیں کا محافظ
خدام	سہیلیاں

پہلا منظر

مرجان خانم کا حسین و دل آویز مکان اسے سبز باغ۔ چاروں کونوں پر سفید شفاف آبدار فوارے چھوٹے ہوئے ہیں۔ وسط میں مرمر کا مربع چبوترہ ہے۔ ہر طرف ہر قسم کے حسین و سبک پھول عنبر فروش ہیں۔ ہلکی ہلکی چاندنی فرشِ مرمریں پر لہرا رہی ہے۔ وسطِ فرش میں بہترین و بیش قیمت قالینوں پر سامانِ ساز و نغمہ آراستہ ہے۔ سبز مخملیں تکیوں کے سہارے حسین مرجان خانم نیم قد ہے۔ قریب ہی گنگا جمنی گلدان میں پھولوں کا ایک بڑا گلدستہ رکھا ہے۔ مرجان خانم کی باریک انگلیوں میں گلاب کا ایک ہلکا بادامی پھول ہے۔ جسے وہ لبصد نزاکت بار بار سونگھتی جاتی ہے۔

دو تین کنیزیں دست بستہ حاضر ہیں۔ تین چار سہیلیاں کچھ فاصلہ پر ساز سامنے رکھے بیٹھی ہیں۔

مرجان خانم (سہیلیوں سے) "شمع خانم! آخر اس نواب ابرار کا کیا علاج کیا جائے۔ یہ تو بری طرح سے پیچھے پڑا ہے"

شمع خانم۔ "بیگم! مجھے تو یہ شخص کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔"

مرجان خانم: بظاہر تو کوئی خاص برائی سوائے (اس قسم کے) اور نظر نہیں آتی۔ اچھا خاصا عزت دار، دربارِ شاہی کا ایک رکن ہے۔ شہر میں سب لوگ اس کی شان و شوکت و امارت سے متحیر ہیں۔ با ایں ہمہ میرا دل اسے قبول نہیں کرتا۔ اور بغیر عقد تو خدا نہ کرے کہ میں اس کے محل میں داخل ہوں۔"

(دو کنیزیں دوڑ کر آتی ہیں)

"ملکہ! دو مسافر آئے ہیں۔ کچھ دیر آرام کے خواستگار ہیں۔"

مرجان خانم۔ "ان کو یہاں لے آؤ۔"

[مسافر آتے ہیں۔ ایک خوش شکل نوجوان ہے۔ دوسرا کچھ سن رسیدہ۔ آداب و مزاج پرسی کے بعد مرجان بصد اعزاز جگہ دیتی ہے۔ کنیزیں نفیس کشتیوں میں کچھ سامان اکل و شرب لا کر پیش کرتی ہیں]

ایک کنیز (آ کر) "حضور! نواب ابرار تشریف لاتے ہیں"

(مسافر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں)

مرجان "بلاؤ"

(نواب ابرار بصد شان و شوکت و لباس فاخرہ مع چند احباب و ملازمین تشریف لاتے ہیں)

مرجان مسافروں سے ملاقات کراتی ہے۔ سب مل کر گانے کی فرمائش کرتے ہیں۔ مرجان گانا شروع کرتی ہے سب جھومنے لگتے ہیں۔

دوسرا منظر

رات کا خاموش وقت۔ سلطان ہارون رشید۔ مکلف خواب گاہ۔ کافوری شمعوں کی عطر فروش ہلکی ہلکی منور روشنی میں خلیفہ پر تکلف بستر پر دراز ہیں۔ وزیر جعفر ایک گنگا جمنی کرسی پر رونق افروز ہیں۔

جعفر "غلام صرف اس غرض سے حاضر ہوا ہے۔ کہ چند یوم سے حضور کی طبیعت کچھ مکدر نظر آتی ہے آخر کیا سبب ہے؟

خلیفہ "کیا بیان کروں! جس دن سے مرجان خانم کا گانا سنا ہے۔ طبیعت خود بخود اس کی جانب راغب ہے۔ صرف یہ خیال دامن گیر ہے کہ مرجان ایک گانے والی عورت ہے"

جعفر "نہیں خداوند نعمت! مرجان نواح بغداد کی پہلی پاکدامن مغنیہ ہے۔ میری ناقص رائے میں اگر حضور اس کا گانا سن لیا کریں تو کیا حرج ہے۔ اس کی آمد و رفت ہوگی۔ تو اس کے افعال سے واقفیت ہو جائیگی"

خلیفہ "بے شک یہ رائے صائب ہے۔ کل سے وہ دربار میں نظر آیا کرے"

(جعفر اجازت لیکر رخصت ہوتے ہیں)

تیسرا منظر

نواب ابرار کا مصفا محل۔ ایک وسیع مکلف کمرے میں نواب ابرار رونق افروز ہیں۔ جھلملاتی روشنی میں چاروں طرف کچھ احباب جلوہ گر ہیں۔

ابرار "افسوس کیا کہوں۔ روز دربار شاہی میں بیٹھا بیٹھا مرجان خانم کا بادشاہ کے حضور میں حاضر ہونا دیکھتا ہوں۔ نہ معلوم اس کی رسائی کس طرح دفعتہً ہو گئی۔ دن بدن اس کے اوصاف پسندیدہ کی جانب شاہی چشم کرم

بڑھتی جارہی ہے اور مہربان کے چشم و ابرو سے بھی نمایاں ہے کہ وہ خلیفہ کے عقد میں ایک دن آنے والی ہے۔ اب تو مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔"

قاسم (ایک دوست) "آپ کو صرف یہی معلوم ہے۔ میں کل ہی وزیر جعفر سے کل حال معلوم کرچکا ہوں۔ آخر کار بادشاہ نے اُسکی پاکدامنی اور شرافت پر صاد کرکے اس سے عقد کا ارادہ کرہی لیا۔ دونوں میں پیمان وفا مضبوط ہوگیا ہے بہت جلد مرجان شاہی عقد میں آنے والی ہے۔"

ابرار۔ (زانو پیٹ کر) "اُف! یہ کیا غضب ہوگیا!! اب کیا کیا جائے؟" (دوستوں سے) "تم دو لوگ کسی طرح مرجان خانم کو آج ہی گرفتار کرلاؤ۔ یہاں آکر دیکھوں گا۔ کہ کس طرح شاہی حرم کا نام لیگی۔"

دوست ایک زبان ہوکر "یہ بھی کوئی بات ہے۔ آج ہی لیجئے!"

(سب رخصت ہوتے ہیں)

چوتھا منظر

ایک آراستہ کمرہ۔

بصد شان و شوکت نواب ابرار ایک جگمگاتی مسہری پر لیٹے ہیں۔ مرجان خانم فرش پر سر جھکائے بیٹھی ہے اُسکے جسم سے خون کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ گل رخسار زخموں سے چور نظر آتے ہیں۔ لباس ٹکڑے ٹکڑے ہورہا ہے۔

نقاہت سے نظر نہیں اٹھتی۔ آنکھوں میں استقلال کی چمک آنسوؤں میں تابانی پیدا کر رہی ہے۔

ابرار "مرجان! کامل ایک ماہ گزر گیا۔ میں تجھ کو ہر طرح سمجھا چکا۔ دو ہفتے تو نے میرے محل کا آرام و آسائش دیکھ لیا۔ اب دو ہفتے سے تو زندان کی مصیبتیں، کوڑوں کی ضربیں اور فاقہ کی سختیاں بھگت رہی ہے۔ غرض ہر طرح تو نے میرے جاہ و جلال کا امتحان لے لیا۔ تجھ کو معلوم ہوگیا کہ تو ابرار ایک زبردست ڈاکہ کے ہاتھ میں ہے جس کے ہاتھ میں تیرے لئے بہشت و دوزخ دونوں موجود ہیں۔ بس اب فیصلہ کا آخری دن ہے۔ اگر آج بھی تو انکار ہی کریگی۔ تو تیرا خاتمہ ایک ایسا ہولناک خاتمہ ہوگا۔ جس کے خیال سے بھی روح لرزتی ہے۔ امید ہے کہ مصیبتوں اور تکلیفوں کی انتہا نے اب تیرا دماغ درست کر دیا ہوگا۔ اور تو میرے حکم پر عمل درآمد کے لئے بالکل تیار ہوگی۔"

مرجان (سر اٹھا کر اس طرح کہ آنسو اس کے گلابی رخساروں پر شبنم کے قطرے بنے ہوتے تھے) ابرار! اے بے رحم کتے!! خدا کے جلال سے ڈر، آہ! جس طرح تو نے مجھے فریب دیکر قید کیا ہے۔ وہ خدا دیکھ رہا ہے میں نے تیری جاہ و حشمت، دولت و ثروت پر ٹھوکر ماردی۔ میں نے ہر قسم کے ظلم بےجا بصد مسرت برداشت

کئے - ایک عورت، کمزور عورت کو تو نے دو لوں وقت آہنی سلاخوں سے زخمی کیا - اور وہ خدا کے فضل سے ثابت قدم ہے - مگر یاد رکھ! کہ خدا کے یہاں انصاف ہے - ایک دن آئیگا کہ میری عصمت کی فتح اور تیری نفس پرستی خاک میں مل جائے گی - یہ شان وشوکت، یہ جاہ وجلال خدانے چاہا - تو سب خاکستر ہوگا میں بھی آج آخری بار کہہ رہی ہوں - کہ میں موت کے لئے بخوشی تیار ہوں - خلیفہ کے نام پر جان دیدونگی - اور ہرگز راہِ وفا سے ایک قدم نہ ہٹونگی "

ابرار (غصہ سے گرج کر) "بہتر ہے - ذلیل بازاری عورت! اپنی سرزوری کی سزا بھگت (زور سے) کوئی ہے؟ "فہمید کو فوراً حاضر کرو!"

(فہمید اور خادم حاضر ہوتے ہیں)

ابرار (مرجان کو ٹھوکر سے گرا کر) "فہمید! اس ذلیل عورت کو لیجا کر اندھے کنوئیں میں الٹا لٹکادو، مطلق اسکی گریہ وزاری پر نظر نہ ڈالو - اور تین چار روز میں اسکی لاش سڑ جائے تو ہمارے حضور میں لاؤ - ہم بذات خود اسے جنگلی درندوں کو کھلا کر دل خوش کرینگے "

(فہمید مرجان کو گھسیٹتا ہوا لے جاتا ہے)

پانچواں منظر

خلیفہ کی خوابگاہ -

خلیفہ بستر پر اُداس لیٹے ہیں - کنیزانِ ادب دست بستہ ہیں -

خلیفہ (عالم خیال میں) "مرجان خائن! تجھ سے ایسی بیوفائی کی امید نہ تھی - تو نے میرے سیدھے دل کو بڑا دھوکا دیا - مجھے ہر طرح اپنا گرویدہ بنا کر اس طرح غائب ہوگئی - بے شک ایک گانیوالی عورت سے اور کیا امید ہوسکتی تھی - مگر افسوس! اتنا عرصہ کیوں میری نظروں پر پردہ پڑا رہا - آخر اس کے متعلق میں نے کوئی بُری افواہ کیوں نہ سنی، اس طبیعت کو کیا کروں ہر چند اس کا خیال، اسکی بے وفائی کا ملال، دل سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہوں - مگر طبیعت نہیں رکتی - قلب پر سخت صدمہ ہے - - - - " وغیرہ (نیند آجاتی ہے)

چھٹا منظر

ایک بھیانک وحشت ناک جنگل میں اندھا کنواں ایک گہرے مہیب سیاہ غار سے زیادہ خوفناک نظر آرہا ہے - رات کی پرہیبت سیاہی جنگلی پرندوں کی چیخ وپکار، عجب ہولناک عالم ہے - فہمید ایک شیر کی کھال میں لپٹا ہوا پہرہ دے رہا ہے - کنوئیں سے

غمناک آواز گانے کی آ رہی ہے!

"اے خدا! تیری قدرت زبردست اور طاقت بے مثل ہے۔ آہ! تو میرے حالِ زار کی اطلاع خلیفہ تک پہنچا دے ارحم الراحمین! تو جانتا ہے کہ میں نے اس عرصہ میں کتنی سختیاں اٹھائی ہیں۔ اس اندھے کنوئیں میں جہاں ہاتھ کو ہاتھ نظر نہیں آتا۔ میں ایک آہنی زنجیر میں الٹی لٹک رہی ہوں۔ مگر خلیفہ! ہائے وہ مجھے ایک عصمت فروش عورت سمجھ رہا ہوگا" (پکار کر) "اے محافظ فہمید! اگر تو میری مدد کرے۔ تو انشاء اللہ تیرے لئے بہت بہتری ہوگی"!

فہمید (چونک کر) "نہیں نہیں!! نازنین، مصیبت زدہ عورت! مجھ سے ایسی درخواست نہ کر۔ تجھے ابرار کے جلال و جبروت کا علم نہیں ہے۔ وہ مجھے مر کر بھی چین نہ لینے دیگا"

مرجان۔ "اچھا تو صرف پانچ منٹ کے لئے مجھ کو باہر نکال کر مجھ سے گفتگو کر لے۔ اگر تجھے اطمینان ہو جائے۔ تو فبہا۔ ورنہ میں اس کنوئیں میں واپس آ جاؤنگی!"

فہمید (سوچ کر) "خیر! میں تجھ سے بات کرنے کو تیار ہوں" (آہنی زنجیر اوپر کی طرف کو کھینچکر مرجان کو نکالتا ہے۔ مرجان کمزوری سے بیہوش ہو جاتی ہے۔ فہمید پانی چھڑک کر ہوش میں لاتا ہے۔ دونوں سرگوشیوں میں بات چیت کرتے ہیں)

فہمید (بلند آواز سے) "لڑکی! اس جنگل کے چاروں طرف دو ہزار ڈاکوؤں کا مسلح پہرہ ہے میں تجھے کسی طرح یہاں سے غائب نہیں کر سکتا۔ وہ سب ایک آن میں ہم دونوں کا خون پی جائینگے۔ تو یہ سمجھ رہی ہے کہ تو صرف میری حفاظت میں ہے ابرار ایسا احمق نہیں ہے۔"

مرجان (سوچ کر) "اچھا تو ایک ریچھ کا شکار کھیل اور مجھے اس کی پوستین میں چھپا دے۔ میں بآسانی ہزاروں ڈاکوؤں کے بیچ بیچ نکل جاؤنگی"

فہمید (حیران ہو کر) "خوب! یہ مناسب ترکیب ہے۔ میرے پاس کھال موجود ہے۔ میں ابھی تجھ کو دیتا ہوں" (کھال لا کر دیتا ہے)

ساتواں منظر

دربارِ شاہی۔

خلیفہ تختِ سلطنت پر بصد جبروت متمکن ہے۔ حاضرین باادب اپنی اپنی نشست پر موجود ہیں۔ خلیفہ کا چہرہ اداس ہے ابرار کی آنکھوں میں مسرت کی چمک ہے۔

چوبدار (حاضر ہو کر) "حضور والا! ایک تماشہ گر ایک "ریچھنی" کو لے کر حاضر ہوا ہے۔ اور عرضگزار ہے۔ کہ حضور چند لمحوں کو بچشم خود تماشہ ملاحظہ فرمالیں"

خلیفہ (اشارہ ابرو سے) "بلاؤ"

(تماشہ گر حاضر ہوتا ہے۔ ایک سیاہ "ریچھنی" پاؤں میں گھونگرو پہنے ہمراہ آتی ہے۔)

اجازت پاکر تماشہ گر ریچھنی کو اشارہ کرتا ہے۔ ریچھنی رقص شروع کرتی ہے۔ رقص کی عجب کیفیت، ندرت و دلکشی حاضرین کو محوِ حیرت کر دیتی ہے۔ خود خلیفہ سکتے کے عالم میں ہے

خلیفہ "سبحان اللہ کیا کمال ہے! اے تماشہ گر! تجھ کو آفرین ہے، کہ تو نے ایک حیوان کو انسان سے زیادہ تعلیم دی"، واہ! وا!!"

تماشہ گر "حضور! اب اس باکمال حیوان کی سپہ گری بھی ملاحظہ ہو"

[ایک تلوار خود لیتا ہے۔ ایک ریچھنی کو دیتا ہے۔ دونوں ہوا میں لڑتے ہیں۔ تماشائی حیرت میں آتے ہیں تماشہ گر بیٹھ جاتا ہے۔ صرف ریچھنی بے نظیر کرتب تلوار کے دکھاتی ہے۔ تلوار سے تماشہ کرتے ہوئے اچانک ایک زبردست وار ابرار کی جانب کرتی ہے۔ تلوار کی نوک ابرار کے سینہ میں پیوست ہو جاتی ہے۔ ابرار ہائے کر کے کرسی سے گرتا ہے۔ دربار میں غل پڑ جاتا ہے۔ لوگ ریچھنی کو پکڑنے دوڑتے ہیں۔ ریچھنی جسم کو ایک حرکت دیتی ہے۔ پوستین سے مرجان خانم نکلتی ہے]

سب (حیرت سے) "ایں مرجان خانم!"

ابرار (لڑکھڑاتی آواز میں) "ہائیں مرجان خانم! یہ دو ہزار ڈاکوؤں کے بیچ سے زندہ کس طرح نکل آئی"

مرجان دوڑ کر بادشاہ کے قدموں پر گرتی ہے۔ اور پھر قہر کی نگاہوں سے ابرار کو مخاطب کر کے کہتی ہے:-

"ابرار! آج وہ دن ہے۔ کہ تجھ کو تیری فرعونیت کا نتیجہ دیکھنا پڑا۔ تیرے وہ لفظ "تو ایک کمزور ترین ناچیز شے ہے۔ اور میرے ساتھی دو ہزار ڈاکو ہیں۔ آج تیرے سامنے آرہے ہیں۔ تو وہ جلاد ڈاکو ہے جس نے ایک نازک، کمزور اور کم مایہ عورت کی عصمت کا امتحان لیا۔ تو نے کس دھوکہ سے مجھے اسیر کرایا۔ کس کس طرح اپنے رنگین قصور و زریں محلات کے سبز باغ دکھائے۔ بیش بہا بہترین ہیرے اور نفیس و نایاب موتی میرے قدموں پر نثار کئے۔ مگر میں خدا کے فضل سے تیرے دام میں نہ آئی۔ آخر وہ وقت آگیا۔ کہ تو ظلم و زیادتی پر کمربستہ تھا۔ تو نے کیا کچھ ظلم نہ کئے۔ کوڑوں کی مار۔ بیدوں کی ضرب۔ آہنی زنجیروں کی سختیوں سے میرے بدن سے خون ٹپکایا۔ میں ہفتوں بھوکی پیاسی، ایک قطرۂ آب و ایک دانۂ گندم کو ترستی رہی۔ مگر تیرا کہنا نہ مانا۔ آخر وہ دن آگیا۔ کہ تو نے مجھے مہیب، سیاہ، بھیانک کنوئیں میں الٹا لٹکا دیا میرا دم تین دن میں آنکھوں کی پلکوں میں آکر اٹک گیا۔ تو وہاں بھی گیا۔ اور ایک دفعہ پھر اپنے محلات کے عیش و عشرت کا نقشہ کھینچ دیا۔ مگر شکر ہے کہ میں ثابت قدم رہی۔ تیرا حکم تھا کہ میں جب ایک سڑی ہوئی لاش بن جاؤں

سے نکالی جاؤں - تو جنگلی درندے میرے جسم کا دستر خوان چنیں!!

فہمیدہ کی مہربانی سے میں کنوئیں سے نکلی - اس سے ریچھ کی پوستین حاصل کی - اور ایک ریچھنی کی شکل میں تیرے دو ہزار ڈاکوؤں کی آنکھوں میں خاک جھونک دی -

ابرار! یہ ایک عورت پر سختی کا نتیجہ ہے - یہ خدا سے منحرف ہونے کا انجام ہے - کہ آج تو اس بیکسی میں میرے سامنے دم توڑ رہا ہے - یہ اُس ظلم کا بدلہ ہے جو تو نے ایک شریف دل عورت کی عصمت پر توڑا - ابرار! تو سمجھتا تھا کہ ایک مظلوم عورت کی آہ کوئی اثر نہیں دکھلائے گی مگر ؎

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن اجابت از درِ حق بہر استقبال مے آید"

مرجان خانم کی تقریر ختم ہوگئی - دربار میں جوشِ حیرت سے سکوت کا عالم ہے -

خلیفہ (ابرار کی تڑپتی ہوئی لاش سے) "افسوس ہے ابرار تیری نفس پرستی پر، اور آفرین ہے مرجان خانم کی ہمت و عصمت پر" ابرار منفعل نگاہ جھکا لیتا ہے - تڑپ تڑپ کر چند ساعت میں دم توڑ دیتا ہے - مرجان دوبارہ بادشاہ کے قدموں پر گرتی ہے بادشاہ بصد محبت اٹھا کر تخت پر برابر بٹھا لیتا ہے (پردہ گر جاتا ہے)

(بلقیس جمال بریلوی)

(بقیہ صفحہ ۶)

سوری، پروفیسر مشن کالج اور فرزندار جمند لالہ ادھورام صاحب اس کام کے کرنیوالے ہیں -

دی سٹوڈنٹس اون ایجنسی - پروپرائٹرز میسرز رام لال سوری اینڈ سنز لاہور - کالجوں کے کورسوں کی کامیاب فرم ہے اب ورنیکلر تعلیمی نصابوں کی طرف بڑی سرعت سے رجوع کر رہی ہے -

پنجاب سکول سپلائی ڈپو - لائبریری سیریز کے ایک کامیاب پبلشر ہیں - اب نصابی اشاعتوں کی طرف بھی توجہ دے رہے ہیں -

مولوی ممتاز علی اینڈ سنز - پھول بچوں کی لائبریری کے جنم دینے والے اور پنجاب کے بچوں کی کتابوں کے واحد پبلشر ہیں -

مولوی فیروز الدین اینڈ سنز - اردو گلوب کے مخترع اور تعلیمی نقشہ جات کے مجدد مولوی فیروز الدین اپنی شبانہ روز محنتوں سے اس وقت فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور کے مالک اور صوبہ بمبئی کی تعلیمی کتب کی چھپائی کے اجارہ دار ہیں - گورنمنٹ اُردو گزٹ پنجاب بھی انہیں کے پریس میں چھپتا ہے - اردو تعلیمی کتابوں کے ادبی سیریز بھی انہوں نے شائع کئے ہیں -

لالہ آتما رام اینڈ سنز - انارکلی میں کالجوں کی کتابوں کے سلسلہ میں خاص طور پر نامی ہیں - بعض کتب انگریزی و ریاضی متعلقہ مدارس کے بھی پبلشر ہیں -

ہمارے تعلیمی پبلشرز

اگر تعلیم و تعلّم کا یہ مدعا ہے کہ ہم اپنی روحانی طاقتوں کو سمٹ سمٹا کر اس طرح راہ راست پر لائیں کہ جس سے ہماری زندگی کامیاب ہو۔ تو یقیناً کاروباری زندگی ایک ایسی امتحان کُن صنعت ہے۔ کہ جس میں داخل ہونے سے ہی ہم اپنی قیمت کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے مندرجہ ذیل تعلیمی پبلشرز اپنی کامیابی کے لحاظ سے ہمارے روبرو روشنی کا مینار ہیں۔ جنہوں نے اپنی عملی زندگی کی جد و جہد میں کشمکشوں کے قلعے کو فتح کر کے اس پر کامیابی کا جھنڈا لہرایا۔

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور۔ وہ ابتدائی تعلیمی فرم ہے۔ جس کا آغاز محکمہ تعلیم کے ساتھ ہی ہُوا۔ کوٹ ادّو کے مدرس اور جغرافیہ پنجاب و ہند کے مصنّف منشی گلاب سنگھ اس کامیاب کاروبار کے بانی تھے۔ جن کی کمرِ ہمت نے کاروبار کے پُشتارے کو اس استقلال کے ساتھ اٹھایا۔ کہ آج ان کا نام اپنی مارکیٹ میں یگانۂ روزگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ آجکل اس فرم کا کاروبار ان کے برخوردار پوتے لالہ سوہن لعل صاحب کے ہاتھ میں ہے۔

میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز لاہور۔ یہ دوسری فرم ہے۔ جسے لالہ عطر چند صاحب مرحوم سٹور کیپر محکمہ کمسریٹ کے فرزند لالہ ایشر داس کی قسمت کے پانسے نے جنم دیا ہے۔ اس فرم کی بنیادوں میں بانیٔ فرم کے بھائی لالہ گلاب چند کپور اور دکان کے رکن اعظم لالہ ٹھاکر داس انند (جو آجکل ٹھاکر داس انند اینڈ سنز اندرون موری دروازہ لاہور کے نام سے اپنا تعلیمی کتابوں کا کام الگ کر رہے ہیں۔) کی ان تھک کوششوں کی بھرتی بھری ہوئی ہے۔ اب لالہ رام جوایا صاحب کپور فرزند بانیٔ فرم ہذا اس کاروبار کے کامیاب رہنماؤں میں سے ہیں۔

میسرز گلاب چند کپور اینڈ سنز لاہور۔ جو پہلے میسرز عطر چند کپور کے حصہ دار تھے۔ آپ گنپت روڈ پر اپنا الگ کاروبار کر رہے ہیں۔ نئے اردو کورسوں کے پبلشر ہیں۔

پنجاب پرنٹنگ ورکس لاہور۔ مرحوم پنڈت چرنداس سابق سائنس ماسٹر اس فرم کے بانی تھے۔ یہ فرم لانگ مین اینڈ کمپنی اور انڈین پریس کی واحد ایجنٹ ہے۔ کچھ عرصہ سے ورنیکلر تعلیمی کتابوں کی اشاعت بھی کر رہے ہیں۔ آج کل یہ فرم ان کے فرزند مسٹر پرمانند کے زیر اثر کام کر رہی ہے۔

میکملن اینڈ کمپنی۔ یہ ولائتی فرم پنجاب کے سکولوں کے بہت سے انگریزی کورسوں کی پبلشر ہے۔ پنجاب میں اس کے نمائندے لالہ مولراج صاحب بی اے۔ بی ٹی ایک ہر دلعزیز اور قابل کاروباری ثابت ہوئے ہیں۔

پنجاب کتاب گھر کا کاروبار موہن لال روڈ لاہور پر وسیع پیمانہ پر چل رہا ہے۔ لالہ امین چند برادر اصغر لالہ مہرچند ...

ٹھاکر مہیتہ پال سنگھ صاحب جرنلسٹ
اڈیٹر ناظر

ابوالفاضل راز چاندپوری

منشی سکھدیو پرشاد صاحب صنہا
بسمل الہ آبادی

ضیاءالملک صلّار مرزی

جناب خواجہ عبدالرؤف صاحب
عشرت لکھنوی
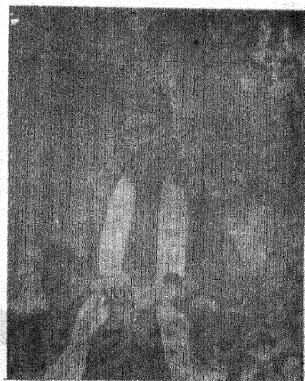
از مصور فطرت جناب
خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی